اُردُو

جنوری سنہ ۱۹۳۹ع

فہرستِ مضامین

اُرْدُوْ

اپریل سنہ ۱۹۳۹ع

فہرستِ مضامین

اُردُو

جولائی سنہ ۱۹۳۹ع

فہرستِ مضامین

اُرْدُو

اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ع

فہرستِ مضامین

شیکسپیئر کے چند بند کا ترجمہ

[نواب عابد نواز جنگ بہادر (خلف نواب عمادالملک مرحوم) نے شیکسپیئر کے ڈراما ہیملٹ کے مشہور اور مقبول بندوں کا ترجمہ بلینک ورس یعنی نظم عاری میں کیا ھے - اگرچہ اس سے قبل بھی اردو میں اس طرز کی چند نظمیں لکھی گئی ھیں لیکن جس خوبی اور سلیقے سے نواب صاحب ممدوح نے شیکسپیئر کے اصل مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کیا ھے وہ بہت لائق تحسین اور آیندہ لکھنے والوں کے لیے قابل قدر نمونہ ھے - اس قسم کے مضامین کے ادا کرنے کے لیے نظم عاری سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ھوسکتا - اگر صحیح ذوق کے ساتھ اس کی پیروی کی گئی تو اردو ادب میں ایك نیا اضافہ ھوگا - ھماری خواھش اور درخواست ھے کہ نواب صاحب پورے ڈرامے کا ترجمہ اسی طرز میں فرمادیں تو اردو زبان کی بڑی خدمت ھوگی - اڈیٹر]

ACT III SCENE I.

HAMLET. To be, or not to be ,— that is the question :	نہیں معلوم کیا بہتر ھے جینا یا کہ مرجانا۔
Whether 'tis nobler in the mind to suffer	شرافت کا ھماری اقتضا کیا ھے
The slings and arrows of outrageous fortune,	بنیں آماجگاہ تیر اس کم بخت قسمت کے
Or to take arms against a sea of troubles,	کہ لیں تلوار دریائے مصائب کے مقابل میں
And by opposing end them ? To die,— to sleep,—	اور ان کے ساتھ اپنا خاتمہ کردیں۔
No more; and by a sleep to say we end	ولے یہ موت ھے کیا شے۔ فقط اک نیند کا عالم
The heart-ache, and the thousand . natural shocks	مگر یہ آرزو دل کی کہ ھم اس نیند سے سوکر
That flesh is heir to,–'tis a consummation	مٹا دیں گے وہ ساری کلفتیں جو ارث آدم ھیں
Devoutly to be wish'd. To die, to sleep ;—	تمنا ھی تمنا ھے - زھے قسمت جو پوری ھو
To sleep ! perchance to dream ! ay, there's the rub ;	مریں، لیں نیند، سوجائیں۔ مبادا خواب آگھیریں
For in that sleep of death what dreams may come	یہی تو دل میں کھٹکا ھے۔ خدا جانے نظر آئیں ھمیں

When we have shuffled off this mortal coil,
Must give us pause : there's the respect
That makes calamity of so long life ;
For who would bear the whips and scorns of time,
Th' oppressor's wrong, the proud man's contumely,
The pangs of disprized love, the law's delay,
The insolence of office, and the spurns
That patient merit of th' unworthy takes.
When he himself might his quietus make
With a bare bodkin ? who'd fardels bear.
To grunt and sweat under a weary life,
But that the dread of something after death,—
The undiscover'd country from whose bourn
No traveller returns,—puzzles the will,—
And makes us rather bear those ills we have
Than fly to others that we know not of ?
Thus conscience does make cowards of us all ;
And thus the native hue of resolution
Is sicklied o'er with the pale case of thought;

کیا خواب وحشت ناك اس مرقد کے سونے میں
جدا ہو جائے جب روح رواں اس جسم فانی سے
یہی جائے تامل ہے۔ یہی خفقان تو بے بس سی
کر دیتے ہیں ساری زندگی اپنی
وگرنہ ہے غرض کس کو کرے برداشت
دنیا کی صعوبت، تازیانے بھی سہے اس کے
کہیں تو لعن و طعن خود پسنداں
اور کہیں پر ظلم ظالم کا
کہیں معشوق کے جور و ستم کا روئے وہ رونا
کہیں تاخیر انصاف عدالت سے کڑھے ہر دم
سہے کیوں جھڑکیاں حاکم کی کھائے
ٹھوکریں کب تک
کوئی معذور بیچارہ۔ کہ جب کہ ہے ید قدرت
میں اس کے
اپنا چھٹکارا فقط اک نوک خنجر سے
اٹھاتا کون جاں کاہی وبال زندگانی کی
اگر ہوتا نہ ڈر اس کا کہ بعد از موت کیا گزرے
پہنچ کر اس کنارے پر جہاں سے پھر کوئی آتا نہیں
جاتا جو یہاں سے ہے۔ اسی سے دنگ ہے انساں
اور آتا دل میں ہے اپنے بنالیں طوق گردن
شوق سے اس سب اذیت کو
(جو حصے میں ہمارے ہے)
نہ یہ کہ خود ہوں سر گرم تلاش ایسی بلاؤں کے
حقیقت جن کی نا معلوم، غایت جن کی نا پیدا
یوں ہی بن جاتے ہیں بزدل ہم اپنی عقل کے ہاتھوں
اور اصلی رنگ اڑ جاتا ہے سب اپنے ارادوں کا
جو پرتو ان پہ پڑ جاتا ہے مہر عقل و دانش کا

And enterprises of great pitch and moment,	اولوالعزی کے اور جو کام ہم نے دل میں ٹھانے ہیں
With this regard, their currents turn, awry,	اسی حجت میں وہ ہوجاتے ہیں زیرو زبر سارے
And lose the name of action.— Soft you now !	فقط بس نام رہ جاتا ہے عالی عزم و ہمت کا

ACT IV SCENE .

How all occasions do inform against me,	ہر اک موقع ہر اک شے کس طرح ہے طعن زن مجھ پر
And spur my dull revenge ! What is a man,	بھڑک اٹھتا ہے جس سے پھر خیال انتقام اپنا
If his chief good and market of his time	بھلا انسان وہ کیا ہے، مدار زندگی جس کا ہو کھانا اور سو رہنا
Be but to sleep and feed ? a beast, no more.	وہ تو بدتر ہے حیواں سے -
Sure, he that made us with such large discourse,	خدا جس نے ہے نفس ناطقہ انسان کو بخشا
Looking before and after, gave us not	کہ ڈالے وہ نظر غایت کی آیندہ و رفتہ پر
That capability and god-like reason	تو کیا یہ قوت ادراک یہ قدرت عطا کی اس لیے اس نے
To fust in us unused. Now, whether it be	کہ ہم اس کو معطل رکھ کے یوں ہی رائگاں کردیں
Bestial oblivion, or some craven scruple	خدا جانے بہیمی خلقت انسان کا نسیان اسے سمجھیں
Of thinking too precisely on th' event,—	کہ ہم کو طاعت ایماں کی پابندی کچھ ایسی ہے
A thought which, quarter'd hath but one part wisdom,	کہ خوگر ہوگئے ہر کام میں بےجا تامل کے،
And ever three parts coward,—I do not know	مگر تشریح اس طرز عمل کی کر کے ہم دیکھیں
Why yet I live say "This thing's to do';	تو اس میں عقل سے سہ چند بڑھ کر بزدلی پائیں
Sith I have cause and will and strength and means	نہیں معلوم کیوں زندہ ہوں میں یہ آج کہنے کو
	مجھے یہ کام کرنا ہے کہ جب ہے سبب موجود دل موجود
To do't. Examples gross as earth exhort me :	دم موجود اور عمدہ ذرائع بھی ہیں پورا اس کو کرنے کو
	نظائر پوچ ایسے جیسی دینا ہے مجھے آمادہ کرتے ہیں

Witness this army of such mass and charge,	ذرا دیکھو هجوم اس فوج کا اور طمطراق اس کا
Led by a delicate and tender prince;	هے جس کا پیشوا نازك سا کم سن ایك شهزاده یه هے آفت کا پرکاله
Whose spirit, with divine ambition puff'd,	بهرے هیں دل میں اس کے ولولے ایسے کہ هرگز وه
Makes mouths at the invisible event;	نهیں لاتا هے کچھ خطرے میں آفت هائے پنهاں کو
Exposing what is mortal and unsure	اور اپنی بے بقا هستی فانی کو
To all that fortune, death, and danger dare,	ذری سی بات پر وه ڈال دیتا هے خطر میں خوف میں جوکھم میں گرداب حوادث کے
Even for an egg-shell. Rightly to be great	حقیقی عظمت انسان اسی میں هے
Is not to stir without great argument,	کناره کش رهے هر ایک جھگڑے اور بکھیڑے سے مگر جب آبرو پر آکے بن جائے
But greatly to find quarrel in a straw	تو خود هر بات پر ڈھونڈے بهانه جنگ جوئی کا
When honour's at the stake.	یوں هی چل کر لڑائی کی جو ٹھن جائے تو تیور اس کے ایسے هوں که دشمن بھی هراساں هو کے اس سے الاماں مانگے

ACT I SCENE I.

MARC. Good now, sit down, and tell me, he that knows,	ذرا سب بیٹھ جاؤ اور بتاؤ تو
Why this same strict and most observant watch	که یه کثرت سے پهره بندیاں راتوں کی
So nightly toils the subject of the land;	یه هلچل
And why such daily case of brazen cannon,	نئے توپوں کا ڈھلنا روز و شب

And foreign mart for implements of war;
Why such impress of shipwrights, whose sore task
Does not divide the Sunday from the week.
What might be toward, that this sweaty haste
Doth make the night joint-labourer with the day?
Who is't that can inform me?

HORATIO. That can I;

At least, the whisper goes so. Our last King,
Who image even but now appear'd to us,
Was, as you know, by Fortinbras of Norway,
Thereto prick'd on by a most emulate pride,
Dared to the combat; in which our valiant Hamlet—
For so this side of our known world esteem'd him—
Did slay this Fortinbras; who, by a seal'd compact,
Well ratified by law and heraldry,
Did forfeit, with his life, all those his lands
Which he stood seized of to the conqueror:
Against the which, a moiety competent
Was gaged by our King; which had return'd
To the inheritance of Fortinbras,
Had he been vanquisher; as, by the same co-mart,

ھتیار کا آنا ممالك غیر سے، بننا جہازوں کا
کہ کاریگر کو دم لینے کی بھی فرصت نہیں
کیا جمعہ کیا ھفتہ
کھٹکتا ھے یہ کانٹا سا ھماری چشم بینا میں
بتاؤ تو یہ ھے کیا کیوں یہ سرگرمی ھے اپنے
شہر میں جاری
جسے معلوم ھو بولے۔
سنو ۔ افواہ تو یہ ھے، ھمارے پادشاہ آنجہانی کو
ابھی جس کی شبیہ آئی نظر ھم کو۔ کیا فارٹمبرس نے
ناروے کا پادشہ جو تھا، سراسر چھیڑ کر مجبور
لڑنے پر
اسی تیغ آزمائی میں، ھمارے پادشہ ھملٹ نے
کہ تھی مانی ھوئی جس کی شجاعت ساری دنیا میں
تھا شاہ ناروے کو جان سے مارا
دیا تھا قول جس نے اپنی دستخط سے کہ گر وہ
ھار جائے
ناروے کا ایك حصہ قبضۂ ڈنمارك میں جائے
وگر برعکس تو ڈنمارك اپنے ملك کی ایك سمت
شاہ ناروے کو دے
اسی پیماں کی رو سے قبضۂ فاتح میں آیا
ایك حصہ ناروے کا تھا
جو مستحکم بہ آئین شجاعت اور قانون تھا

And carriage of the article design'd,
His fell to Hamlet. Now, sir, young Fortinbras,
Of unimproved mettle hot and full,
Hath in the skirts of Norway, here and there,
Shark'd up a list of lawless resolutes,
For food and diet, to some enterprise
That hath a stomach in't; which is no other —
As it doth well appear unto our State—
But to recover of us, by strong hand
And terms compulsative, those foresaid lands
So by his father lost.

مکر اب نوجواں فارٹمبرس جوش جوانی میں
لگائے دانت ھے اس پر اور اس کی چال اب یہ ھے
کہ ملک ناروے میں جابجا بدمعاش جو مل جائے
فقط کھانے کو دے کر وہ شریك فوج کرتا ھے
یہ سب تیاریاں کیوں ھیں مصمم کیا ارادے ھیں
یہ تو مخفی نہیں تم سے ۔ کہ وہ ھم پر چڑھائی کر کے
اس حصے کو واپس لے جو اس کا باپ تھا ھارا

ACT I SCENE II

Th' unchariest maid is prodigal enough,
If she unmask her beauty to the Moon.
But, my good brother,
Do not, as some ungracious pastors do,
Show me the steep and thorny way to Heaven,
Whilst, like a puff'd and reckless libertine,
Himself the primrose path of dalliance treads,
And recks not his own read.

دوشیزہ ، عفت اپنی جس کو پیاری ھو
سراسر بیسوا ٹھیرے
نظر وہ چاند کی بھی حسن پر گر اپنے پڑنے دے
مگر اچھے مرے بھائی کہیں ایسے نہ ھونا تم
کہ جیسے بعض کٹ مُلّا ۔ بتائیں تو ھمیں وہ
باغ جنّت کی کٹھن راھیں
اڑائیں خود مزے رندانہ گلگشت تعیش میں۔

سنسکرت ڈراما

از

پنڈت ونشی دھر صاحب ودیالنکار لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن

جب سے ہمارے ملک میں انگریزی کی تعلیم رائج ہوی ہے ، انگریزی کے ادب کی جن چیزوں نے ہمارے دیس کے انشا پردازوں، ادیبوں اور اعلی دماغ کے لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے ان میں سے انگریزی ڈراما بھی ایک ہے ۔ مغل زمانے میں شعر و شاعری کی، موسیقی کی اور بہت سے فنون لطیفہ کی زبردست ترقی ہوی ۔ لیکن ڈراموں میں کوئی خاص اضافہ اور ترقی نہ ہوی ۔ مغل زمانے میں ہندوستان کے عوام کی زبانوں کو بھی فروغ ملا۔ اور اس زمانے میں یہاں کی بہت سی زبانوں کے ادب کی بنیاد پڑی ۔ برھمنوں نے سنسکرت کی پاکیزگی اور شستگی کو قائم رکھنے کے لیے اسے ایک بڑی حد تک محدود رکھا تھا ۔ وہ ھر ایک کو سنسکرت زبان نہیں پڑھاتے تھے ۔ جس وقت عوام کی زبانوں میں پرلطف اور پرصنعت ادب کی تخلیق شروع ہوئی تو اس وقت بہت سے ادیب ان زبانوں کی ترقی میں لگے ہوے تھے ۔ پھر یہ نئی ادبی تصانیف جب عوام میں مقبول ہوئیں تو لوگوں کے ذوق میں بھی فرق پڑا ۔ سنسکرت میں ادب کے تخلیق کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا ۔ سنسکرت ڈراما پڑھنے کی نہیں کھیلنے کی چیز ہے ۔ اس لیے سنسکرت ڈراموں کا اسٹیج پر لانا مشکل تھا ۔ چوں کہ اس زبان کا سمجھنا محدود سا ہوچکا تھا اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ سنسکرت ڈراموں کا کھیلا جانا ایک بڑی حد تک بند ہوگیا ۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ۱۷۸۹ع میں سر ولیم جونس نے کالی‌داس کے مشہور ڈراما «شکنتلا» کا انگریزی میں ٹوٹا پھوٹا ترجمہ کیا تو عالموں کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور انھیں یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ ہیں! سنسکرت زبان میں بھی ڈرامے ہیں! - سر ولیم جونس نے سنسکرت زبان کا جلدی میں آدھا کچا اور آدھا پکا جو علم حاصل کیا تھا اسی کے سہارے انھوں نے «شکنتلا» کا ترجمہ کیا - یوں بھی شاعری کا ترجمہ کرنا قریب قریب ناممکن ہے - پھر کالی‌داس کی شاعری کا - سر ولیم جونس کا سنسکرت کا علم بہت معمولی تھا - اس لیے یہ کیسے امید کی جاسکتی تھی کہ ان کا ترجمہ' ترجمہ کہلانے کے قابل بھی ہوسکتا - لیکن اس ٹوٹے پھوٹے ترجمہ کا یورپ کے ادیبوں پر بڑا گہرا اثر پڑا اور جرمنی کے سب سے بڑے شاعر گوئٹے نے جو اس کی تعریف کی اس سے اس کی مقبولیت اور بڑھ گئی - گوئٹے نے «شکنتلا» کی تعریف میں یہ سطریں لکھی تھیں :-

" Wouldst thou the young year's blosoms and the fruits of its decline;
And all by which the soul is charmed, enraptured, fed,
Wouldst thou the earth and Heaven itself in one sole none combine,
I name the O Shakuntala ! and all once is said "

شکنتلا! تو موسم بہار کی جوانی کا پھول ہے اور پورے وقت کا پکا ہوا پھل ہے : تجھ سے روح کو زندگی ملتی ہے' خوشی حاصل ہوتی ہے اور دل پر جادو کا سا اثر ہوتا ہے - تجھ میں دنیا اور بہشت دونوں کا سنگم ہوگیا ہے -

گوئٹے کی ان سطروں نے سنسکرت ڈرامے کے مطالعہ کو ترقی دینے میں بہت بڑا کام کیا ہے - ادبی دنیا میں سنسکرت ڈرامے کی عزت گوئٹے کی اس تعریف کی وجہ سے ہوئی - اس کے بعد سنسکرت ڈرامے کا مطالعہ ادیبوں کی دنیا میں شوق کے ساتھ کیا جانے لگا - اگر ہم یوں کہیں کہ آج کی ادبی دنیا میں سنسکرت ڈرامے کو سر ولیم جونس اور گوئٹے نے روشناس کرایا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اس کے بعد صاحب ذوق لوگوں کی توجہ بھی سنسکرت ڈرامے کی طرف ہوئی

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی سنسکرت ڈرامے کو جو اہمیت اور مقبولیت ملنی چاہیے تھی، وہ نہ ملی - سب پڑھنے والے گوئٹے نہیں تھے جو انگریزی یا دوسری زبانوں میں کیے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ترجموں سے اس کی اصلی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے - ترجمے آخر ترجمے ہی تھے - اس کے علاوہ سب لوگوں کا مذاق ایک قسم کا نہیں ہوتا - انھوں نے انگریزی ڈراموں کو اصلی شکل میں پڑھا تھا - اور بہت سوں نے اسے ایسے لوگوں سے پڑھا تھا جو اس کے ماہر تھے - ان ڈراموں کو پڑھنے کے بعد ان کے دلوں میں ڈرامے کا ایک معیار قائم ہوگیا تھا - اس کے خلاف انھوں نے سنسکرت کے ڈراموں کو ترجمے کے ذریعے پڑھا - اور پھر انھیں اس کی خوبیوں سے کسی نے اچھی طرح واقف نہیں کرایا - کہنے کو تو سنسکرت کے ڈرامے اور انگریزی کے ڈرامے دونوں ڈرامے ہی ہیں لیکن دونوں کی بناوٹ میں بہت بڑا فرق ہے - جو لوگ اس کی بناوٹ سے واقف نہیں تھے وہ اس کا پورا لطف کیسے اٹھا سکتے تھے - پھر یہ ڈرامے کھیلے بھی نہیں جا سکتے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت کے ڈراموں کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو انگریزی کے ڈراموں کو ہوئی - سنسکرت ڈراموں کو صرف کتابی شکل میں اور ترجموں میں پڑھنے کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں -

ویسے تو علم کی کسی باریک چیز کو سمجھنا آسان نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ فنون لطیفہ کی کسی باریک اور نازک چیز کو سمجھنا - اور پھر اس کی داد دینا تو اور مشکل ہے - علم کی دنیا کی چیز کو جہاں سمجھ لیا وہیں ہر ایک اسے صحیح مان لیتا ہے - لیکن فنون لطیفہ کی دنیا کی بات اس سے کچھ نرالی ہے - وہاں سمجھنے کے بعد بھی چیز پسند نہیں آنی چاہیے اور یہیں سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے - علم کی دنیا میں ماننے یا نہ ماننے کی آزادی نہیں ہے - وہاں تو ایک بات صحیح ہے، اس لیے ماننی ہی پڑتی ہے - لیکن فنون لطیفہ کی دنیا میں صرف صحیح ہونے سے کام نہیں چل سکتا - جب تک ایک چیز پسند نہ آجائے تب تک قبول نہیں ہوتی اور اس پسندیدگی کی وجہ سے اس میں پوری آزادی ہوتی ہے - اسی وجہ سے علم کے

میدان میں وہ آزادی نہیں ہے جو فنون لطیفہ کے میدان میں ہے - بات یہ ہے کہ فنون صرف ایک چیز کو پیش کرنا ہی کافی نہیں ہے اسے حسین بھی ہونا چاہیے۔ وہ ایسی سندر ہونی چاہیے کہ دوسروں کے دلوں کو موہت کرلے - ان پر اپنا سکہ بٹھا لے - اور جہاں حسن کا سوال آتا ہے وہاں کسی قسم کے معیار کو قائم کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ایک حماقت ہے - اگر دنیا میں کوئی ایسی چیز ہے جس کا نہ تو کوئی ایک نمونہ ہوسکتا ہے نہ کوئی ایک اصول ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ایک معیار ہوسکتا ہے تو وہ حسن ہے - حسن چیز ہی ایسی ہے جو تمام قاعدے قانونوں کو توڑ ڈالتی ہے - حسن کی دنیا کی چیزوں کو اگر آپ ایک اصول یا ایک معیار کے گز سے ماپنے لگیں تو آپ کبھی بھی پورا انصاف نہ کرسکیں گے - ادب اور فنون لطیفہ اور صنعت کی دنیا میں بھی اسی حسن کی وجہ سے ایک اصول یا معیار کا قائم کرنا ناممکن ہے - جب تک ان چیزوں کو فٹ‌رول سے ماپا جاتا رہا ہے تب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکا ہے - کبھی کبھی تو وہ بے انصافی ایسے ظلم کی صورت میں بدل جاتی ہے جس کے سامنے ایک ظالم کا ظلم کوئی حقیقت نہیں رکھتا -

یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کے ایک بڑے ناٹک نویس بھوبھوتی کو اپنے زمانے کے نقالوں سے تنگ آکر یہ کہنا پڑا تھا -

"ये नाम केचिदिह नः प्रथयन्त्यवज्ञाम्,
जानन्तु ते किमपि तान् प्रति नैष यत्नः ।
उत्पत्स्यतेऽस्ति मम कोऽपि समानधर्मा,
कालो ह्ययं निरवधिर्विपुला च पृथ्वी ॥"

"جو لوگ ہمارے کام کو پسند نہیں کرتے اور ہماری بدنامی پھیلاتے ہیں انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نے یہ کام ان کے لیے کیا ہی نہیں ہے - کوئی ایسا بھی شخص ہوگا جو ہمارے ہی خیالات کا ہوگا اور وہ ہمارے اس کام کو پسند کرے گا - اگر کوئی ایسا شخص آج نہیں ہے تو کل پیدا ہو جائے گا - دنیا وسیع ہے اور زمانہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے"-

اس بے انصافی کا پورا پتہ ہمیں تب چلتا ہے جب کہ ہم کسی ملک کے ادب کو یا صنعت کو کسی دوسرے ملک کے ادب یا صنعت کے معیار یا اصولوں سے پرکھنے لگتے ہیں ۔ جس طرح ہر ایک ملک کی آب و ہوا ایک جیسی نہیں ہوسکتی اور رہائش کے طریقے ایک جیسے نہیں ہوسکتے اسی طرح ہر ایک ملک کے ادب، اظہار خیالات اور جذبات کے طریقے وغیرہ کبھی ایک جیسے نہیں ہوسکتے ۔ اور اسی وجہ سے جب تک ہم کسی ملک کے حالات، واقعات اور خوبیوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوجائیں ہم دوسرے ملکوں کے ادب یا فنون لطیفہ کا کبھی پورا لطف نہیں اٹھا سکتے ۔ سنسکرت ڈرامے کے بارے میں بھی جو غلطفہمیاں پیدا ہوئی ہیں اور جو اس کی مقبولیت میں فرق پڑا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ سنسکرت ڈراموں کو انگریزی کے ادب کے اصول اور معیار سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ سنسکرت ڈراموں کو اگر آج بھی اسٹیج پر کھیلا جا سکتا تو ہمیں پورا یقین ہے کہ بہت سی غلطفہمیاں خود بخود دور ہوجاتیں ۔ جس طرح کسی دوسرے ملک کی موسیقی کو سمجھنے کے لیے اس کی خصوصیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے اسی طرح سنسکرت کے ڈراموں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کی خصوصیات کو پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ چوں کہ ہم سنسکرت ڈراموں کو دیکھ نہیں سکتے، صرف پڑھ سکتے ہیں اس لیے اس کے سمجھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے ۔ اگر ہم سنسکرت ڈراموں کی خصوصیات کو سمجھ کر ان کے اپنے اصولوں اور معیاروں سے پرکھیں گے تو ہم نہ صرف سنسکرت ڈراموں کا پورا لطف اٹھا سکیں گے بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ سنسکرت کے ادیبوں نے سنسکرت ڈرامے کو کس انداز پر فروغ دیا تھا اور اسے کس کمال تک پہنچایا تھا ۔

سنسکرت زبان میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جس سے ہمیں یہ سلسلہ وار کامل طور پر معلوم ہوسکے کہ سنسکرت ڈرامے کا آغاز کس طرح ہوا اور کس طرح آہستہ آہستہ اس کی ترقی ہوتی گئی ۔ وہ کون سے اصول تھے جن کی بنیاد پر پہلا سنسکرت ڈراما لکھا گیا تھا، کس نے اور کب اس میں سدھار کیے اور وہ کون سی

تبدیلیاں تھیں جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں ۔ یہ تو ہوھی نہیں سکتا کہ سنسکرت ڈرامے کے بھی تمام اصول جو کتابوں میں پائے جاتے ہیں، ایك ہی دن میں بن گئے ہوں۔ ان کے بننے میں اور اس کمالیت کو حاصل کرنے میں کافی وقت لگا ہے ۔ سنسکرت ڈرامے کے اصولوں کو اور اس کے ڈھانچے کو تفصیل سے سمجھانے والی بہت سی کتابیں ہیں لیکن ترتیب سے سلسلہ وار اس کے تمام پہلوؤں پر سائنٹفك طور پر پتہ دینے والی ایك بھی کتاب نہیں ہے ۔ اگر کوئی ایك بھی اس طرح کی کتاب مل جاتی تو سنسکرت ڈرامے کی تاریخ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ۔

اس طرح کی کتاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں جو کچھ کتابیں لکھی جارہی ہیں ان میں بہت زیادہ کھینچ تان سے کام لیا جا رہا ہے ۔ تحقیق کا کام کرنے والوں کو یہ ایك ایسا میدان مل گیا ہے جس میں وہ خوب کھل کر کھیل رہے ہیں اور اپنے قیاس کے گھوڑے ادھر ادھر دوڑا رہے ہیں۔ روز نئے نئے نظریے قائم ہوتے ہیں، موٹی موٹی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر حوالے دیے جاتے ہیں ۔ سب کچھ کیا جاتا ہے لیکن ان تمام زبردست کوششوں کے بعد بھی ابھی تك صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سنسکرت ڈراما کب اور کس طرح شروع ہوا ۔ کن حالتوں میں سے گزرتا ہوا یہ ایك ایسی شکل میں آ گیا جسے آخرکار سنسکرت کے ناٹك نویسوں نے اپنا لیا ۔ ابھی تك اس معاملے میں بہت سی الجھنیں ہیں اور محقق کسی ایك رائے کو قائم نہیں کرسکے ہیں ۔ میں یہاں ان اہم نظریوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس بارے میں عام طور پر مشہور ہیں ۔

سنسکرت ڈرامے پر سنسکرت میں جو سب سے پرانی اور مستند کتاب ملتی ہے وہ بھرت کا « ناٹیہ شاستر » ہے ۔ سنسکرت میں ناٹکوں کے اصولوں پر جو بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب اسی کی بنیاد پر ۔ اس میں ناٹك کس طرح شروع ہوے، اس پر یوں لکھا ہوا ہے ۔

« تریتا جگ میں سب دیوتا مل کر برھماجی کے پاس گئے اور کہنے لگے ۔ کوئی یك اور ایسا وید بنائیے جو سنا بھی جاسکے، دیکھا بھی جاسکے اور کھیلا بھی جاسکے۔

چاروں ویدوں کا لطف معمولی آدمی انپڑھ اور عورتیں نہیں اٹھا سکتیں - یہ پانچواں وید ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا لطف سب لوگ اٹھا سکیں - وہ سب کے لیے ایک جیسا ہو - برھما جی نے دیوتاؤں کی یہ بات مان لی اور انھوں نے ایک نیا وید بنایا - اور اس کا نام « ناٹیہ وید » رکھا اور کہا کہ اس وید میں تمام علم و فنون تاریخ اور کہانی کے ساتھ پیش کیے جائیں گے - اس میں چاروں وید ایک جگہ مل جائیں گے

"जग्राह पाठ्यमृग्वेदात्सामभ्यो गीतमेव च ।
यजुर्वेदादभिनयान् रसानाथर्वणादपि ॥"

«اس میں رگ وید سے خوش خوانی' سام وید سے موسیقی اور یجر وید سے ہاتھ پیر وغیرہ کی نازک حرکت نقل کرنے کا فن اور اتھرو وید سے جذبات اور دسوں کو لیا» اور اس طرح اس نئے وید کو بنایا - اس کے بعد برھما نے وشوکرما کو جو سورگ میں فن عمارت کے سب سے بڑے ماہر ہیں' بلایا اور کہا کہ ایک ناٹک گھر تیار کرو - بھرت کو ناٹک تیار کرنے کا حکم دیا گیا - جب ناٹک بن گیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ کھیلا کیسے جائے - اس پر برھما نے بہت سے دیوتاؤں کو اداکاری کا فن سکھلایا - بہت سی خوبصورت عورتوں کو بھی گانے اور ناچنے کا کام سکھایا گیا اور اس طرح سب تیاری ہونے کے بعد ناٹکوں کا کھیلا جانا شروع ہو گیا ہے - یہ ناٹک کس قسم کے تھے' اس پر بھرت نے اپنے ناٹیہ شاستر میں یہ لکھا ہے -

"त्रैलोक्यस्यास्य सर्वस्य, नाट्यं भावानुकीर्तनम् ।

❀ ❀ ❀

क्वचिद्धर्मः, क्वचित्क्रीडा, क्वचिदर्थः क्वचिच्छ्रमः ।
क्वचिद्धास्यं, क्वचिद्युद्धं, क्वचित्कामः क्वचिद्वधः ॥

❀ ❀ ❀

लोकवृत्तानुकरणं नाट्यमेतन्मया कृतम् ।
उत्तमाधममध्यानां नराणां कर्मसंश्रयम् ॥
सर्वोपदेशजननं नाट्यं लोके भविष्यति ॥

❀ ❀ ❀

दुःखार्तानां, श्रमार्तानां, शोकार्तानां तपस्विनाम् ।
विश्रान्तिजननं काले नाट्यमेतद्भविष्यति ॥

❀ ❀ ❀

न तज्ज्ञानं न तच्छिल्पं न सा विद्या न सा कला ।
नासौ योगो न तत्कर्म, नाट्येऽस्मिन् यन्न दृश्यते ॥

❀ ❀ ❀

योऽयं स्वभावो लोकस्य सुखदुःखसमन्वितः ।
सोऽङ्गाद्यभिनयोपेतो नाट्यमित्यभिधीयते ॥"

«ناٹک میں دنیا کے تمام لوگوں کے جذبات کو دکھایا جانے لگا ۔ کہیں مذہبی باتیں، کہیں کھیل، کہیں ہنسی، کہیں لڑائی، کہیں محبت، کہیں مارکاٹ، کہیں دھن دولت حاصل کرنا، کہیں دنیا کو ترک کردینا وغیرہ تمام باتیں اس کے اندر تھیں ۔ دنیا کے لوگ جن راستوں پر چلتے ھیں اور جو کچھ کرتے ھیں، اچھے آدمی معمولی آدمی، برے آدمی جو کچھ کرتے ھیں اس کو نقل میں اس طرح پیش کرنا کہ وہ اصلی معلوم ھو اور اس سے نصیحت بھی ملے اور لطف بھی آئے، یہ ناٹک کا مقصد تھا ۔ دن بھر کے تھکے ھوئے لوگوں کے، دکھیوں کے اور غمگین لوگوں کے دلوں میں یہ ناٹک تازگی، لطف اور خوشی پیدا کرتا تھا ۔ دنیا میں ایسا کوئی علم نہیں، ایسا کوئی فن نہیں، ایسا کوئی کام نہیں اور نہ کوئی ایسے جذبات ھیں جنھیں اس ناٹک میں پیش نہیں کیا جاتا تھا ۔ لوگوں کے تمام سکھ دکھ اور عادات کو جسمانی نازک حرکتوں سے بولنے سے، بنابولے، گانے کے اور اداکاری کے ساتھ دکھانے کو ناٹک کہا جاتا ھے» ۔ ان ناٹکوں کا زیادہ پرچار ھو، اس لیے اس کے کھیلنے اور دیکھنے کا ثواب بھی مقرر کردیا گیا ۔

"प्रयोगं यश्च कुर्वीत, प्रेक्षते चावधानवान् ।

या गतिर्वेदविदुषां, या गतिर्यज्ञयाजिनाम् ।
या गतिर्दानशीलानां, तां गतिं प्राप्नुयान्नरः ॥"

« جو اس ناٹک کو کھیلتا ھے اور جو اس کو غور سے دیکھتا ھے اس کو وھی ثواب ملتا ھے جو ایك ویدوں کے عالم کو ملتا ھے، جو یگ ھون کرنے والوں کو ملتا

ہے اور خیر خیرات اور دان دینے والوں کو ملتا ہے"۔

ہم نہیں کہہ سکتے یہ دیو کہانی (Legend) کہاں تک سچ ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے پہل بہت سے علم کے ماہروں نے مل کر ناٹک کو بنایا ہو ۔ ناٹک ایک ایسی چیز ہے جس میں بہت سے فن آ کر مل جاتے ہیں ۔ شاعری ' موسیقی ' رقص ' نقل جسم کی نازک ترین حرکات ' اداکاری' قصہ کہانی' تاریخ' مختلف قسم کے سین سینری کے پردے بنانا ۔ اس طرح ناٹک کے اندر بہت سے علم ایک جا ہوجاتے ہیں۔ اوپر کے قصے سے ایک تو یہ بات ثابت ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ ناٹک کو کھیلنا اور دیکھنا ناچنا ' گانا وغیرہ کو حقارت یا نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا ۔ اسی لیے ناٹک کھیلنے والوں اور اداکاروں کو وہی درجہ دیا گیا ہے جو ویدوں کے عالموں کو دیا گیا ہے۔

یہ تو ایک نظریہ ہوا ۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان میں پرانے آریہ لوگ ہون کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کئی یگ یا ہون بڑے بڑے ہوتے تھے اور کئی دنوں کے بعد ختم ہوتے تھے ۔ جس طرح آج کل بڑے بڑے جلسے کیے جاتے ہیں اسی طرح پرانے زمانے میں یگ ہون کیے جاتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے عالموں کو بلایا جاتا تھا اور اس طرح یہ ایک ایسا مجموعہ ہوجاتا تھا جس میں دور دور سے بڑے بڑے عالم اور ماہر فن آ کر شریک ہوتے تھے ۔ جب کئی دنوں کے بعد ــــ کئی دفعہ تو اس میں کئی مہینے لگ جاتے تھے ــــ ہون ختم ہوجاتا تھا اس وقت کچھ ایسے کام کیے جاتے تھے جن سے ان کی دل بہلائی ہو ۔ اس کے لیے پہلے سام وید کے گانے والے استاد بلائے جاتے ۔ چاروں ویدوں میں سام وید ہی ایسا وید ہے جس کو ترنم کے ساتھ گایا جاتا تھا اور جس کے گانوں کو بڑے شوق کے ساتھ سنا جاتا تھا ۔ یہ گانے تو ہوتے ہی تھے ۔ جب سنسکرت میں نظمیں بننے لگیں تو ان کو بھی گایا جانے لگا ۔ کچھ لوگ ان کو بہت اچھی طرح لے کے ساتھ پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ والمیکی نے رامائن لکھ کر اسے پہلے لو اور کش کو سکھایا تھا۔ رشیوں کی مجلسوں میں جب لو اور کش والمیکی کی رامائن کو گاتے تھے اس وقت تمام رشی باغ باغ

ہوجاتے تھے ۔ سنسکرت میں اداکاروں کے لیے ایک لفظ "کشی لو" بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کشی‌لو لفظ کش اور لو سے بنا ہے۔ اس طرح کی محفلوں میں گانے بجانے کے بعد ناچنا پھر نقل وغیرہ شامل ہوتی گئیں۔ اور اس طرح اسی نے آہستہ آہستہ ناٹک کی شکل اختیار کی۔ پہلے یہ گانے وغیرہ بڑے بڑے ہونوں کے بعد ہوتے تھے پھر انھیں مذہبی تیوہاروں اور میلوں میں بھی جاری کیا گیا۔ دھارمک میلوں کو یاترا یا جاترا کہا جاتا ہے۔ انھیں جاتراؤں میں گانے اور ناچنے وغیرہ سے ناٹک کا آغاز ہوا۔ سنسکرت کے بہت سے ایسے ڈرامے ہیں جو اسی طرح میلوں، تیوہاروں اور جاتراؤں کے موقعوں پر کھیلنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بہت سے ڈرامے بسنت کے تیوہار ہولی پر کھیلنے کے لیے لکھے گئے ہیں اور بہت سے کیلاش ناتھ یا مہادیو کی جاترا پر کھیلنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بہت سے ناٹک نویسوں نے اس قسم کے تیوہار، میلوں اور جاتراؤں کا ذکر اپنے ناٹکوں میں کیا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ یہ مانتے ہیں کہ ہندوستان میں ناٹک پہلے تیوہاروں، میلوں اور جاتراؤں میں کھیلے جاتے تھے اور بعد میں یہ دوسرے موقعوں پر بھی کھیلے جانے لگے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے اور یہ پچھم کے ماہر شرقیات کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سکندر اعظم نے اپنی فوجوں کے ساتھ سنہ ۳۲٦ ق۔م میں ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت یہی فوجیں شاید کبھی اپنے گریک ڈرامے بھی کھیلا کرتی تھیں۔ ہندوستانیوں نے ڈراما انھیں سے سیکھا۔ سنسکرت میں پردے کے لیے جہاں اور لفظ ہیں وہاں ایک لفظ "جونکا" بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ لفظ یون لفظ سے بنا ہے۔ اسی یون لفظ سے یونکا اور پھر اس سے بگڑ کر جونکا لفظ بن گیا۔ پہلے پہل یہ ڈرامے پنجاب میں اور پھر گجرات کے راجاؤں کے دربار میں کھیلے گئے۔

لیکن آج کے عالموں نے اس نظریے کو غلط ثابت کیا ہے کیونکہ گریک ڈراموں میں اسٹیج پر پردہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ پھر ان دونوں ڈراموں کی بنیاد میں بھی بڑا فرق ہے۔ اب یہ ثابت ہوتا جارہا ہے کہ سنسکرت ڈراما بالکل آزاد طریقے سے پیدا ہوا اور بالکل مختلف انداز پر ترقی‌پذیر ہوا۔ سنسکرت ڈراما بہت پرانا ہے

اور سکندر اعظم کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی یہاں بہت سے ڈرامے لکھے جاچکے تھے جن کا ذکر رامائن اور مہابھارت میں ملتا ہے ۔ اسی طرح کئی عالم جن میں Sylvan Lavy وغیرہ ہیں، یہ ثابت کرتے ہیں کہ سنسکرت کے ڈرامے پہلے پراکرت میں لکھے گئے اور بدھ مذہب کے راجاؤں نے جن میں کنشک وغیرہ بھی تھے، گریک لوگوں کے اثرات سے ڈراموں کو لکھوانا اور کھیلوانا شروع کرایا ۔ لیکن اس نظریے کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ ڈاکٹر میکڈونل، ڈاکٹر کیتھ، پروفیسر شل وغیرہ ماہر شرقیات اسے قبول نہیں کرتے ۔

اس کے بعد میں چوتھے نظریے پر آتا ہوں ۔ سنسکرت میں ڈرامے کو ناٹک کہتے ہیں ۔ یہ لفظ نٹ، دھاتو (Root) سے بنا ہے ۔ نٹ دھاتو کے معنی ناچنے کے ہیں ۔ سنسکرت میں اداکار کو نٹ کہا جاتا ہے ۔ نٹ کے معنی ہیں ناچنے والا ۔ جس میں نٹ اپنی اداکاری دکھاتے ہیں، اسے ناٹک کہا جاتا ہے ۔ پہلے زبان میں شاعری پیدا ہوتی ہے، شاعری کے بعد موسیقی، موسیقی کے بعد ناچنا رقص اور رقص سے اداکاری ۔ پھر مختلف قسم کے کردار، ان کی نقل، بات چیت اور اس طرح ڈراما کی تخلیق ہوتی ہے ۔ سنسکرت کے ڈراموں میں شاعری سنگیت اور ناچ ۔ ان کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ بھرت کے ناٹیہ شاستر کے مطالعہ سے یہ اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں ناچ ایک معمولی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی اور اس فن نے جو امتیاز حاصل کیا تھا وہ انتہائے کمال کا تھا ۔ ناچ کی جو ترقی ہندوستان میں ہوئی ہے وہ بہت کم ممالک میں ہوئی ہے ۔ اس زمانے میں بھی جاوا کا ناچ بہت مشہور ہے ۔ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ ناچ ہندوستان سے وہاں گیا ہے ۔ آج بھی جب کہ تھیٹر کا زمانہ بالکل جوبن پر ہے، اس ناچ کا مقابلہ مشکل سے ہو سکے گا ۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جسم کی حرکت، چڑھک بھڑک، طرح طرح کی بھنک ٹھنک، نازانداز، آنکھوں کی مٹکن، ہاتھوں کی لٹکن اور پیروں میں پازیبوں کی چھاچھم، بس ناچ شروع ہوگیا ۔ جس طرح اگر ایک نظم میں تک‌بندی بھی اچھی ہو، لفظ بھی میٹھے ہوں، بحر بھی عمدہ ہو، زبان میں روانی بھی ہو، لیکن کوئی

جذبات نہ ہو تو وہ چاہے جو کچھ بھی ہو سچی شاعری نہیں کہلا سکتی، اسی طرح جس ناچ میں سب ساز و سامان ٹھیک ہوں لیکن کسی جذبے کو پوری اداکاری کے ساتھ نمایاں نہ کیا گیا ہو تو وہ ناچ نہیں ایک قسم کی جسمانی نازک ورزش کہلاسکتی ہے - دل کے اندرونی جذبات کو جنھیں زبان ہزار کوشش کرنے پر بھی نہیں کہہ سکتی — ناچ — آنکھ کے اشارے میں ہاتھ اور پیر اپنی ایک ہلکی سی حرکت میں کہہ دیتے ہیں کہ جیسے دل کے جذبات نے گویا ایک مجسم آنکھ سے دیکھ جانے والی شکل اختیار کرلی ہو - سچ تو یہ ہے کہ ناچ سے بڑھ کر کوئی فن نہیں ہے جس میں خاموشی ایک ایسی زبان کی صورت میں بدل جاتی ہے جس کے مقابلے میں زبان کوئی حقیقت نہیں رکھتی -

بھرت منی نے اپنی کتاب « ناٹیہ شاستر » میں ایک سو آٹھ ناچوں کا پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے - اس بیان کے ساتھ ساتھ ان ناچوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں - ان تصویروں سے ان ناچوں کی خوبیوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے - ابتدا میں جو ڈرامے کھیلے جاتے تھے ان میں شاعری، گانا اور ناچ یہ تین چیزیں اہم تھیں - بعد میں اس ناچ کو تین حصوں میں بانٹا گیا - ناٹیہ، نرتیہ اور نرت - ناٹیہ اسے کہتے تھے جس میں بولنا اور جسمانی حرکات دونوں ہوتی تھیں - نرتیہ اسے کہتے تھے جس میں صرف جسمانی حرکات، اداکاری یا نقل کرنا وغیرہ تھے - اور نرت سے مراد ناچ یا رقص کا تھا - یہ ناچ خوبصورت عورتیں کیا کرتی تھیں - بعد میں اس میں مکالموں کو بھی شامل کرلیا گیا - ویدوں میں یم اور یمی، پوروروا اور اروشی وغیرہ کے مکالمے مشہور ہیں - اسی طرح اپنسدوں میں بھی بہت سے مکالمے ملتے ہیں - ان مکالموں کو جو اہمیت ملی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کالیداس نے اروشی اور پوروروا کے قصے کو ڈرامے کی شکل میں تبدیل کردیا - اس طرح شاعری، سنگیت، ناچ، اداکاری، ہاتھ وغیرہ کے حرکات، نقل اور بات چیت یہ سنسکرت ڈرامے کی بنیاد تھیں - ان میں کسی جذبے کو انتہائے کمال تک پہنچانا اور پلاٹ وغیرہ بنانے کے طریقے سب بعد کی چیزیں ہیں -

اس طرح میں نے ان تمام اہم نظریوں کا ذکر کردیا ہے جوکہ اس بارے میں مشہور ہیں اور جن کو لے کر مختلف مصنفوں نے بہت سی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ ان نظریوں میں سے آخری نظریے کو ہی زیادہ تر صحیح سمجھا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنسکرت ڈرامے کو کس زمانے میں لکھا گیا۔ سنسکرت کے ادب میں جتنے ڈرامے لکھے گئے ہیں اتنی شاید اور کوئی چیز نہیں لکھی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے ڈراموں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسی وجہ سے ان کی سلسلہ‌وار تاریخ بنانے میں بڑی کٹھنائیاں ہیں۔ جو ڈرامے ملتے ہیں ان کی تاریخوں میں بھی اتنا اختلاف ہے کہ کسی بات کو پورے دعوے کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

بہت سے ماہر فن سنسکرت ڈرامے کو سنہ ۴۰۰ع سے شروع کرتے ہیں۔ جب سے بھاس کے ڈرامے ملے ہیں تب سے بہت سے عالم سنہ ۳۰۰ ق۔م تک اس کو لے آئے ہیں۔ سنسکرت کے مشہور گرمیرین (قواعدداں) پاننی نے دو ڈراموں کے قواعد پر لکھنے والوں کے نام اپنے سوتروں میں دیے ہیں۔ ایک کا نام شلالی ہے اور دوسرے کا نام کرشاشو ہے۔ یہ بھرت کے ناٹیہ شاستر سے پہلے کے مانے جاتے ہیں۔ پتنجلی وغیرہ نے تو ڈرامے کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوے کہ جب ڈرامے کے قواعد موجود تھے تب ڈرامے تو اس سے بہت پہلے سے شروع ہوچکے تھے۔ بھرت کے ناٹیہ شاستر کے حساب سے ناٹکوں کی ابتدا تریتا جگ میں ہوئی اور جو پہلا ڈراما کھیلا گیا تھا وہ «امرت منتھن» تھا۔اس میں دیوتا ایک طرف تھے اور راکشس دوسری طرف اور سمندر کو بلویا گیا تھا۔ یہ سموکار تھا۔ سموکار اس ڈرامے کو کہتے ہیں جس میں دیوتا اور راکشس دونوں کھیل کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو ڈراما کھیلا گیا وہ «تری پردا» تھا۔ اس کا پلاٹ پرانوں کی کہانیوں سے لیا گیا تھا۔

سنسکرت کی شاعری کی سب سے پہلی کتاب رامائن سمجھی جاتی ہے۔ رامائن میں بھی ناٹکوں کا ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سنسکرت میں ناٹک کھیلے جاتے تھے۔

"वादयन्ति तथा शान्तिं लासयन्त्यपि चापरे ।
नाटकान्यपरे प्राहुर्हास्यानि विविधानि च ॥"

«اس شلوک سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رامائن کے زمانے میں بہت قسم کے پرہسن اور ناٹک کھیلے جاتے تھے» - اسی طرح مہابھارت میں بھی ناٹکوں کا ذکر آتا ہے -

"ननृतुर्नर्तकीश्चैव, जगुर्गेयानि गायका: ।
❀ ❀ ❀
नाटका विविधा: काव्या: कथाख्यायिककारिका: ॥"

«یعنی گویے گاتے تھے اور رقاصائیں ناچتی تھیں اور مختلف قسم کے ناٹک کھیلے جاتے تھے»۔

اوپر کے حوالوں سے کم سے کم اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت ڈراما بہت پرانے زمانے کی چیز ہے - یہ سچ ہے کہ اس کی تاریخ کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا لیکن اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ سنسکرت ڈراما گریک ڈراما سے بہت پرانا ہے اور وہ بالکل الگ انداز پر ترقی‌پذیر ہوا ہے -

اس سے قبل ذکر ہوچکا ہے کہ سنسکرت ڈراما کی بہت سی قسمیں تھیں۔ ڈراما صرف ایک قسم کا نہیں تھا - کئی ڈراموں کے پانچ ایکٹ ، کئی کے تین اور کئی کے سات اور کئیوں کے دس اور چودہ ایکٹ ہوتے تھے - کئی ڈرامے صرف ایک ہی ایکٹ کے ہوتے تھے - کئیوں میں صرف ہنسی مذاق رہتا تھا اور کئیوں میں صرف گانا ، کئیوں میں ناچ اور گانا اور کئیوں میں صرف ناچ ہی ہوتا تھا - کئی ڈراموں کے نایک (ہیرو) دیوتا ہوتے تھے اور کئی ڈراموں کے راجا اور کئی میں کوئی معمولی آدمی ، کئیوں میں رونا دھونا اور لڑائی دکھائی جاتی تھی - جس ڈرامے کی کہانی کا پلاٹ کسی پران سے رامائن ، مہابھارت یا تاریخ سے لیا جاتا تھا اور اس کا نایک ایسا ہوتا تھا جس کی عزت سب کے دلوں میں بسی ہوئی ہوتی تھی اور جس کے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس ایکٹ ہوتے تھے اس کو ناٹک کہا جاتا تھا - جس میں تین یا چار ایکٹ ہوتے تھے اور باقی سب باتیں یہی

رہتی تھیں اسے ناٹکا یعنی چھوٹا ناٹک کہتے تھے ۔ جس کی کہانی من گڑھت ہوتی تھی یعنی خود بخود بنائی جاتی تھی اور جس کا نایك بڑے سے لے کر چھوٹے تك، دیوتا سے لے کر معمولی آدمی تك بن سکتے تھے، اس طرح کے ڈرامے کو "پرکرنك" کہا جاتا تھا ۔ اس کے بھی پانچ سے لے کر دس تك ایکٹ ہوتے تھے ۔ جس کے تین یا چار ایکٹ ہوتے تھے اور باقی سب باتیں یہی رہتی تھیں اسے "پرکرنکا" کہتے تھے ۔ جس میں نایك آدمی یا دیوتا ہو اور نایکا (ہیروئن) سورگ کی حور ہو یعنی جس میں دیوتا اور آدمی دونوں کا ملاپ ہو اسے "تروٹك" کہتے تھے ۔ اس میں سب باتیں ناٹک جیسی ہوتی تھیں ۔ جس میں دیوتا اور راکشس دونوں ہوں ۔ جس کے کھیلوں میں تیرہ گھنٹے کے قریب لگتے تھے اسے سموکار کہتے تھے ۔ جس میں صرف مذاق رہتا تھا اسے پرھسن کہتے تھے، اس میں صرف ایک ہی ایکٹ ہوتا تھا ۔ اسی طرح جس میں ایک ہی کریکٹر (کردار) ہوتا تھا اور طرح طرح کی نقلیں جن میں ہنسی مذاق ہوتا تھا اسے "بھانڈ" کہتے تھے، اس میں بھی صرف ایک ہی ایکٹ ہوتا تھا ۔ اسی طرح جس میں دو کردار رہتے تھے اسے "ویتھی" کہا جاتا تھا ۔ جس ڈرامے میں عورتوں کا پارٹ نہیں ہوتا تھا اسے "ویایوگ" کہا جاتا تھا ۔ اس میں بھی ایک ہی ایکٹ ہوتا تھا ۔ جس میں کسی دیوتا یا پری یا دیو عورت کی کہانی رہتی تھی اسے "ریہامرگ" کہا جاتا تھا ۔ اسی طرح جس ڈرامے میں بھوت، پریت، پشاچ، بھان‌متی کے کھیل، مارپیٹ، لڑائی، کسی کا گھربار شہر وغیرہ کا جلا دیا جانا دکھایا جاتا تھا اسے "ڈم" کہتے تھے ۔ اس میں چار ایکٹ ہوتے تھے ۔ اسی طرح جس ڈرامے میں عورتوں کا رونا دھونا، سیاپا، ان کی دردناك حالت دکھائی جاتی تھی اسے "اتك" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ۔ اس میں بھی ایك ہی ایکٹ ہوتا تھا ۔ اس طرح بائیس قسم کے چھوٹے بڑے ڈرامے کیے جاتے تھے ۔ ہر ایك کی اپنی اپنی خصوصیات تھیں، اور ان میں سے ہر ایك وضع کے ڈرامے لکھے جاتے تھے ۔ ڈرامے کا میدان بہت وسیع تھا، اور شاید یہی سبب ہے کہ سنسکرت میں سب سے زیادہ ڈرامے ہی لکھے گئے ۔

یہ ڈرامے کہاں کھیلے جاتے تھے؟ بہت سے محققوں کی رائے ہے کہ ہندوستان میں تھیٹر ہال نہیں تھے۔ یہ ڈرامے کھلی جگہوں میں کھیلے جاتے تھے۔ جس طرح پہلوانوں کے اکھاڑے ہوتے ہیں یا جس طرح سرکس دکھایا جاتا ہے اسی طرح ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے۔ کئی لوگوں کی رائے میں اس قسم کی غاریں (Caves) بنالی جاتی تھیں جن میں ڈرامے دکھلائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ چھوٹا ناگپور رام گڈھ میں اس طرح کی ایک غار کے کھنڈر ملے ہیں۔ کئی لوگ اس خیال کے ہیں کہ یہ ناٹک مہاراجاؤں کے محلوں میں کھیلے جاتے تھے۔ مہاراجاؤں کے محلوں میں 'سنگیت شالہ' (Music Hall) اسی طرح 'چترشالہ' (Picture Hall) 'ترتیہ شالہ' (Dancing Hall) ہوتے تھے؛ اسی طرح کسی ایک بڑے ہال میں ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ محققوں کو یہ رائیں اس لیے قائم کرنی پڑی ہیں کہ ہندوستان میں کسی پرانے تھیٹر کے کھنڈر نظر نہیں آتے۔ کئی لوگوں کی رائے میں بڑے بڑے مندروں میں اس طرح کے بڑے بڑے کمرے بنائے جاتے کہ وہاں ڈرامے کھیلے جاسکیں کیونکہ ڈرامے اکثر میلوں تیوہاروں اور جاتراؤں کے موقعوں پر ہی کھیلے جاتے تھے۔

سنسکرت میں تھیٹر کو 'رنگ بھومی' یا 'رنگ شالہ' کہتے ہیں۔ کالیداس نے اپنے ناٹک 'مالویکا گنی متر' میں تھیٹر کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے 'پریکشا گرھہ' کہا ہے یعنی جہاں بیٹھ کر ڈراما دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح 'شکنتلا'، 'اپریہ درشکا' اور دوسرے ناٹکوں میں 'رنگ شالہ' کا ذکر آتا ہے۔ 'رنگ شالہ' کے معنی ہیں تھیٹر۔ اس سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تھیٹر ضرور بنائے جاتے تھے۔ بھرت نے اپنے 'ناٹیہ شاستر' میں اس بات پر بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ تھیٹر کیسے بنائے جانے چاہییں، ان کی چھت کیسی ہونی چاہیے، فرش کیسا ہونا چاہیے، دروازے کس طرح کے اور کتنے ہونے چاہییں۔ اس نے ان تھیٹروں کی بھی تین قسمیں لکھی ہیں۔ تھیٹر ہال کو دو حصوں میں بانٹا جاتا تھا۔ ایک میں اسٹیج ہوتی تھی اور دوسرے حصے میں دیکھنے والے بیٹھتے تھے۔ ہر ایک کی بیٹھنے کی جگہ کا رنگ برنگے کھمبوں سے پتہ لگتا تھا۔ جہاں برھمن بیٹھتے تھے وہاں بازو میں سفید کھمبا

ہوتا تھا جہاں کشتری بیٹھتے تھے وہاں لال کھمبا، جہاں ویش بیٹھتے تھے وہاں پیلا کھمبا۔ اور جہاں شودر یا معمولی آدمی بیٹھتے تھے وہاں نیلا کھمبا ہوتا تھا۔ بیٹھنے کی جگہ اونچی اور ترتیب‌وار ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، اس بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں ناٹک گھر بنائے جاتے تھے۔ یہ ناٹک گھر ہمیشہ ایک قسم کے نہیں ہوتے تھے۔

ان ناٹک گھروں میں بڑے خوب‌صورت اور طرح طرح کے پردے لگائے جاتے تھے۔ سنسکرت میں ہر ایک جذبے (Sentiment) کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ ان رنگوں کی بنیاد کیا ہے، اس کے بارے میں صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ جس جذبے کی اداکاری دکھائی جاتی تھی اسی رنگ کے پردے لگائے جاتے تھے۔ مثلاً "شرنگار رس" یعنی جذبہ محبت کا رنگ سانولا رکھا گیا ہے۔ ہنسی کے جذبے کا رنگ چمک‌دار سفید ہے۔ "کرونا" یعنی سوز و گداز کے جذبے کا رنگ کبوتری، غصے کے جذبے کا رنگ لال، بہادری کے جذبے کا رنگ سنہری پیلا، خوف‌ناک بھیانک ڈرانے والے جذبات کا رنگ کالا، حقارت کے جذبے کا رنگ نیلا اور شانتی یا سکون کے جذبے کا رنگ ہلکا سفید ہوتا تھا۔ جس ڈرامے میں جس جذبے کو انتہائے کمال تک پہنچایا جاتا تھا اسی رنگ کے پردے لگائے جاتے تھے۔

سین سینری بھی بہت قسم کی ہوتی تھی۔ کئی محققوں کی رائے میں تو دیکھنے والے صرف اس کے بیان سے اس کا تصور کرلیتے تھے۔ لیکن ہمیں یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیوں‌کہ اگر ٹھیک محل پیدا نہ کیا جائے تو اس کا اثر نہیں پڑسکتا۔ سین کے بغیر اداکاری کا اثر آدھے سے زیادہ جاتا رہتا ہے۔ ان میں رتھ کا بھاگنا، ہوائی جہازوں کا دوڑنا، چاند، سورج، پہاڑ، ندی موسلادھار برسات کا پڑنا، جنگلوں کی سینری، اٹھ‌منزلہ محلات، ہاتھی کا بھاگ نکلنا وغیرہ سب اس طرح دکھائی جاتی تھیں کہ اصلی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس فن میں انھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور اسی وجہ سے یہ ڈرامے اتنے مقبول ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ اداکار بھی کئی قسم کے ہوتے تھے۔ نٹ، بھرت، بھانڈ، چارن

کنشی‌لو ، شیلوش ۔ شوبھک ودوشک ، کنچکی وغیرہ تھے ۔ ان میں ہرایک کا اپنا اپنا پارٹ ہوتا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں ڈرامے میں ترقی ہوتی گئی اداکاری کے فن میں بھی ترقی ہوتی گئی ۔ یہ اداکار گانے والوں اور ناچنے والوں سے الگ تھے ۔ بڑے بڑے مہاراجا نہ صرف بڑے بڑے اداکاروں کو انعامات دیتے تھے بلکہ خود بھی اچھا اداکار بننے کی کوشش کرتے تھے ۔ جس طرح بہت سے مغل بادشاہ نہ صرف شاعری کے شوقین تھے بلکہ استادوں سے خود بھی شاعری سیکھتے تھے اور ان میں سے کئی ایک تو خود بھی بڑے شاعر تھے ، اسی طرح بہت سے بڑے بڑے مہاراجا اداکاری کے فن کو سیکھتے تھے اور خود بھی بڑے ناٹک‌نویس اور اداکار تھے ۔ ان میں سے مہاراجا اگنی متر کو جو کالیداس کے ایک ڈرامے کے نایک (Hero) ہیں ، اداکاری کا اتنا شوق تھا کہ وہ اس کے پیچھے اپنے راج پاٹ تک کو بھول گئے تھے ۔ کہتے ہیں کہ جب دشمن نے ان پر حملہ کیا تو وہ اداکاروں میں بیٹھے تھے اور وہیں قتل کیے گئے ۔ رگھوبنسی راجا دوسرے اگنی متر بھی جن کا بیان کالیداس نے اپنے 'رگھونش' میں سب سے آخر میں کیا ہے ، ایک بہت بڑے اداکار تھے ۔ وہ اس فن کے اتنے بڑے ماہر تھے کہ انھوں نے اپنے وقت کے تمام اداکاروں کو چنوتی دی تھی کہ کوئی ان سے بڑھ‌کر اس فن کا ماہر نہیں ہے ۔ اسی طرح مہاراجا 'وتس' جن کی اجین میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں ، بڑے اچھے اداکار تھے ۔ کئی بڑے بڑے شاعر بھی خود اداکار تھے ۔ کئی بڑے شاعروں نے ان اداکاروں سے اپنی دوستی کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے ۔ سنسکرت کے سب سے بڑے نثرنگار 'بان' نے اپنے 'ہرش چرت' میں اپنے دوستوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک اداکار اور ایک اداکارنی تھیں ۔ اسی طرح 'بھرتری‌ہری' نے لکھا ہے کہ کئی اداکار مہاراجاؤں کے بڑے بڑے دوست تھے ۔ کئی اداکار کسی شاعر کے ڈراموں کو کھیلتے کھیلتے اپنے فن میں اتنے ماہر ہوجاتے تھے اور کسی شاعر کے کلام کو اس گہرائی سے سمجھتے تھے کہ وہ اس بات کو پہچان جاتے تھے کہ امک نظم فلانے شاعر یا ناٹک‌نویس کی لکھی ہوئی ہے بھی یا نہیں ۔ کہتے ہیں کہ یہ اداکار اس خوبی سے اپنا کام دکھاتے تھے کہ ناٹک‌نویس بھی

جن کے ناٹکوں کو وہ کھیل کر دکھاتے تھے، دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ کچھ بھی ہو، ان تمام باتوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فن اداکاری نے وہ درجۂ کمال حاصل کرلیا تھا جس کی وجہ سے سنسکرت کے ڈرامے اتنے جان‌دار اور پر لطف بن گئے تھے کہ صدیوں تک ان کے کھیلنے کا سلسلہ جاری رہا اور وہ شاعری کی کتابوں سے بڑھ کر مقبول ہوئے۔

انگریزی ڈراموں کو عام طور پر دو حصوں میں بانٹا گیا طربیہ (Comedy) اور المیہ (Tragedy)۔ لیکن سنسکرت ڈراموں کو اس طرح نہیں بانٹا گیا ہے۔ ان کو رسوں کے بھید سے بانٹا گیا ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ (Sentiment) یعنی جذبہ کیا گیا ہے۔ سنسکرت میں نو رس ہیں۔ ایک ڈرامے میں کئی رس ہوسکتے ہیں۔ لیکن اہمیت ایک ہی رس کی ہوتی ہے اور اسی رس کے مطابق اس کی درجہ‌بندی کی جاتی ہے۔ مان لیجیے کہ کسی ڈرامے میں 'ویر' رس کو یعنی بہادری کے جذبے کو کمال تک پہنچایا گیا ہے۔ ایسی صورت میں اسے ویر رس کا یعنی بہادری کے جذبے کا ڈرامہ کہا جائے گا۔ اسی طرح جس میں 'کرن' رس یعنی سوز و گداز کا جذبہ انتہائے کمال تک نمایاں کیا گیا ہوگا، اسے کرن رس کا ڈراما کہا جائے گا۔ سنسکرت ناٹک لکھنے والوں کے خیال سے المیہ (Tragedy) کو بھی اسی میں شمار کیا جائے گا۔ اس طرح ڈرامے نو قسم کے ہیں، کیونکہ رس نو طرح کے ہیں۔ جس ڈرامے میں جو جو رس جذبہ انتہائے کمال تک پہنچایا جائےگا اس ڈرامے کا اسی رس کے درجہ میں شمار کیا جائے گا۔

اسی وجہ سے سنسکرت کے ڈرامے میں سب سے زیادہ اہمیت اگر کسی چیز کو دی گئی ہے تو وہ 'رس' ہے۔ سنسکرت ڈرامے میں کرداری یعنی (Characterisation) کو اور پلاٹ کی دوسری باریکیوں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی کہ ایک جذبے کو پورے طول تک آخری حد تک پہنچانے کو۔ اسی وجہ سے سنسکرت ڈرامے میں شاعری اور گانے کا حصہ کرداری اور دوسری چیزوں سے زیادہ ہے۔ سنسکرت کے ڈراموں میں ایک ہی جذبے پر اتنی گہری روشنی ڈالی جاتی ہے کہ اس کی چکاچوند

میں دوسری تمام چیزیں مدھم پڑ جاتی ہیں، پوری طرح نظر ہی نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ سنسکرت کے ڈرامے کے کسی ایک کردار کا نمونہ دیکھیں گے تو اس میں اسی قدر تفصیل آپ کو ملے گی جتنی کہ اس جذبے کے بیان میں جسے ایک ناٹک نویس دکھلانا چاہتا ہے۔ مثلاً وہ ایک ڈرامے میں ایک راجا کے کردار کو پیش کرتا ہے۔ اگر ناٹک کا لکھنے والا راجا کی محبت کو دکھا رہا ہے تو اسی جذبے کو اتنی باریکی اور تفصیل سے دکھائے گا کہ آپ کو وہ جذبہ ایسی لطف اندوز شکل میں نظر آئے گا جس کے سامنے اس کے راجاپن کی تمام شخصی تفصیلی خصوصیات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھیں گی۔ اسی وجہ سے بہت سے نقادوں نے سنسکرت کے کرداروں کو (Mere Types) یعنی حرف بے جان ہی کہہ دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ سنسکرت کا ایک ناٹک نگار کسی ایک شخص کی خصوصیت کو اتنی گہرائی سے نہیں دکھانا چاہتا جتنا کہ اس کے دل کے اس جذبہ کو دکھانا چاہتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے ڈرامے کو بناتا ہے اور جس کو کہ وہ انتہائے کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کسی سنسکرت ڈرامے کا پورا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ کو سنسکرت کے ڈراموں کا مطالعہ اس انداز کو مدنظر رکھتے ہوے کرنا پڑےگا۔ اگر یہ نقطہ آپ کے سامنے سے اوجھل ہوگیا تو آپ نہ تو سنسکرت ڈرامہ کی بنیاد کو ہی سمجھ سکیں گے اور نہ اس کا پورا لطف اٹھا سکیں گے۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ سنسکرت میں ڈراما کو بھی ایک قسم کی شاعری کہا جاتا ہے۔ سنسکرت میں دو قسم کے 'کاویہ' ہیں یعنی دو قسم کی شاعری ہے۔ ایک تو وہ جسے ایک انسان سنتا ہے اور سن کر اس کا لطف اٹھاتا ہے۔ اس کو سنسکرت میں 'شرویہ کاویہ' کہتے ہیں یعنی وہ شاعری جو سنی جاتی ہے۔ دوسری شاعری وہ ہے جو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے۔ اس طرح کی شاعری کو سنسکرت میں 'درشیہ کاویہ' کہا جاتا ہے۔ معمولی شاعری میں تو ایک شاعر کو دل کے اندرونی جذبات کو اس طرح پیش کرنا پڑتا ہے کہ وہ سنتے ہی سمجھ میں آجائیں اور پر اثر ہوں۔ لیکن ڈرامے کی شاعری میں دل کے گہرے جذبات کو اس طرح پیش کرنا پڑتا ہے کہ گویا آنکھیں انہیں ایک مجسم شکل میں دیکھ سکیں۔ پہلے تو دل کے اندرونی جذبات کو

سمجھنا ہی مشکل ہے اور پھر انھیں سمجھ کر اس طرح پیش کرنا کہ ان کا احساس دوسروں کو بھی ہوسکے، اس سے زیادہ مشکل ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ ان جذبات کو اس طرح پیش کرنا کہ نہ صرف انھیں محسوس کیا جاسکے بلکہ آنکھوں سے دیکھا بھی جاسکے ۔ سنسکرت میں کہا جاتا ہے 'काव्येषु नाटकं रम्यम्' یعنی تمام شاعریوں میں ناٹک کی شاعری سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑھ کر ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ سنسکرت کے ناٹک نگاروں نے اپنے ڈراموں میں اسی کام کو بڑی خوبی اور بڑی خوش تدبیری کے ساتھ کیا ہے لیکن چوں‌کہ سنسکرت زبان اب بول چال کی زبان نہیں رہی ہے (ایک تو اس زبان کو سمجھنے والے بہت نہیں ہیں، دوسرے، ایسے اداکار بھی نہیں ہیں جو اسے ٹھیک طور پر اسٹیج پر کھیل سکیں) اس لیے اکثر سنسکرت کے ڈرامے ترجموں کے ذریعے ہی پڑھے جاسکتے ہیں ۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، سنسکرت کے ڈرامے ایک قسم کی شاعری ہیں ۔ اور شاعری کا ترجمہ سچ تو یہ ہے کہ ناممکن سا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان ترجموں کو پڑھنے سے نہ تو پورا لطف آتا ہے اور نہ ہی ان سے اصلیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ اس کے سوا بہت سی جگہوں میں غلط فہمیاں بھی ہوجاتی ہیں ۔ ان ڈراموں کا لطف تو اب بھی آسکتا ہے جب کوئی شاعر خود شاعری کی تہ تک پہنچ کر اسے نئے ڈھانچے میں اپنی زبان میں پھر سے پیدا کردے ۔ بغیر اس کے سنسکرت ڈراموں کا اصلی لطف اٹھایا ہی نہیں جاسکتا ۔ خوشی کی بات ہے کہ اس طرح کی کوششیں شروع ہوگئی ہیں ۔ ابھی اس دن ایک کتاب ہماری نظر سے گزری جس کا نام Specimens of Sanskrit Dramatic Poems ہے ۔ اس کے مصنف نے سنسکرت کے مشہور ڈراموں کے ایک ایکٹ کو چن لیا ہے اور اس کو انگریزی میں اپنی طرز پر نئے ڈھانچے میں ادا کیا ہے ۔ اگرچہ اس میں بھی ابھی سدھار کی گنجائش ہے پھر بھی یہ ایک بڑی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ جو کوئی ان سنسکرت ڈراموں کی شاعری کے نمونوں کو پڑھےگا، وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہےگا اور اسے ایک ہلکا سا تصور ہو سکےگا کہ سنسکرت ڈرامے کی خوبیاں کیا ہیں ۔

ابھی تک سنسکرت ڈراموں کو انگریزی ڈراموں کے معیار سے پڑھا گیا ہے ۔ اگر

انگریزی ڈراموں میں ایک قسم کی خوبی ہے تو سنسکرت ڈراموں میں دوسری قسم کی خوبیاں ہیں ۔ سنسکرت ڈراموں میں جو شاعری ' جو موسیقی ' جو ناچ اور جو کلا ہے وہ انگریزی ڈراموں میں نہیں ہے ۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں انگریزی ڈرامے کو سنسکرت ڈرامے سے کم درجے کا سمجھتا ہوں ۔ انگریزی ڈراما اپنی جگہ ہے اور سنسکرت ڈراما اپنی جگہ ۔ سنسکرت ڈراما سنسکرت شاعروں کا ایک کمال درجہ کا کارنمایاں Achievement ہے ۔ ڈاکٹر کیتھ نے یہ بالکل ٹھیک لکھا ہے :—

"The Sanskrit Drama may legitimately be regarded as the highest product of Indian Poetry and as summing up in itself the final conception of literary art achieved by the very self-conscious creators of Indian literature..........."

سنسکرت ڈرامے کو ہندوستان کی شاعری کی سب سے بڑی اپج کہا جاسکتا ہے ۔ اس میں سنسکرت کے خودآگاہ ادیبوں نے فن ادب کے آخری خیالات کے تصور کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کردیا ہے ۔

سنسکرت ڈراما کو کن کن بڑے مصنفوں نے ادبی سانچے میں ڈھالا ، کون کون سے بڑے ناٹک نویس سنسکرت میں پیدا ہوے ' انھوں نے کون کون سے مشہور ڈرامے لکھے اور کس طرح ڈرامے کی لگاتار ترقی ہوتی رہی اور کون کون سے وہ ڈرامے ہیں جنھوں نے سنسکرت کے ادب پر اپنی امٹ مہر لگادی ' ان کی خوبیاں کیا تھیں اور کس وجہ سے انھیں یہ مقبولیت حاصل ہوئی ' یہ ایک بڑا دلچسپ اور لمبا مضمون ہے ۔ اگر کبھی موقع ملا تو میں آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ سنسکرت کے ان مشہور ناٹک نویسوں کے اور ان کے ڈراموں کے بارے میں اپنے خیالات پیش کروں گا ۔ اس تقریر میں تو میں نے آپ کے سامنے سنسکرت کے ڈرامے اور اس کی خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے ۔

یہ لکچر عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے کواپریٹیو ہال حیدرآباد میں دیا گیا تھا ۔

ہمارا رسم الخط

اردو، ناگری، اور لاطینی خطوں پر ایک نظر

از

(مولوی عبدالقدوس ہاشمی صاحب۔ حیدرآباد دکن)

اردو زبان جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد اس ضرورت کی بنا پر خود بخود پیدا ہوگئی کہ ہندو مسلمانوں کی اور مسلمان ہندوؤں کی زبان نہیں سمجھتے تھے، مسلمان انگریزوں کی طرح ہندوستان میں تجارت کرنے اور دولت بٹورنے نہیں آئے تھے۔ وہ یہاں آئے تھے بسنے اور اس دیس کو اپنا دیس بنانے کے لیے۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کی طرح لالاؤں اور ساہوکاروں کو واسطہ بناکر صرف انھوں نے دولت بٹورنے کا کام نہیں کیا، بلکہ جلد از جلد بہت ہی تھوڑی مدت میں گھل مل گئے، لازماً ایک ایسی زبان پیدا ہوگئی جو دونوں قوموں کے باہمی تعلقات میں کام آسکے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان نہ صرف ہندوستان کی عمومی زبان ہے بلکہ مختلف قوموں کے صدیوں کے اتحاد کی مقدس یادگار ہے، اردو پر نہ تو مسلمانوں کا اجارہ ہے اور نہ ہندوؤں کی ملکیت، یہ ہندوستان کی عام زبان ہے، ہندوؤں کی بھی، مسلمانوں کی بھی، پارسیوں کی بھی اور عیسائیوں کی بھی، اچھوتوں کی بھی، اور اعلیٰ ذات والوں کی بھی، غرض ان تمام انسانوں کی جو ہندوستان کی سر زمین پر بستے ہیں۔ ہندوستان میں بسنے والوں کے باہمی میل جول اور اتحاد و یکجہتی کا سب سے بڑا دشمن اور وطن کا سب سے بڑا غدار وہ شخص ہے جو اس مقدس یادگار کو چھوڑ کر کوئی دوسری زبان اس ملک میں رائج کرنے کی کوشش کرے۔

اردو کی پیدایش ہندوستان کے لیے کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، اس زمین پر پچھلے زمانے میں بھی بارہا دوسری قومیں آتی رہیں اور جب کوئی نئی قوم آئی تو کچھ دنوں کے بعد پرانی قوموں سے میل‌جول نے نئی زبان پیدا کردی، تاریخ کے سیاہ پردوں میں نہ جانے کتنی ایسی قوموں کی داستانیں چھپی پڑی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب سے ہندوستان آباد ہوا کتنی قوموں نے اس کو اپنا وطن بنایا۔ مگر جن دو چار قوموں کے حالات تاریخوں میں ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سب کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ تبتوبرمن شمال و مشرق سے ہمالہ کی برفستانی چوٹیاں پھاندتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ ان کی یادگار اب بھی ہمالہ کے دامن میں موجود ہے۔ کولارین ہمالہ سے اترے، بنگال میں آباد ہوئے، آسام کی وادیوں میں ان کے قبائل موجود ہیں۔ ڈراویڈین آئے، شمال سے حرکت کرتے ہوئے جنوب میں آکر آباد ہوگئے۔ یہ قومیں زبان مذہب، طرز معاشرت اور رسم و رواج میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، ان کے زمانوں میں بھی صدیوں کا فصل ہے۔ مسلمانوں اور آریوں کی طرح یہ بھی اپنی اپنی زبانیں ساتھ لے کر آئی تھیں۔ یہ زبانیں تبتی، کولاری ڈراویڈی وغیرہ کہلاتی ہیں۔ مگر دوسری قوموں سے میل‌جول نے ان کی زبانوں سے نئی زبانیں پیدا کردیں۔ اسی طرح آج سے کوئی ڈھائی تین ہزار سال پہلے آرین قوم بھی ایشیا کے مغربی شمالی حصہ سے اٹھ کر ہندوستان پہنچی، اپنے ساتھ ایک زبان بھی لائی، لیکن یہ زبان کوئی ادبی زبان نہ تھی، بول چال کی معمولی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ قوم اپنے مذہبی خزانوں کو دوسروں سے چھپانا چاہتی تھی اس لیے ایک رمزی قسم کی زبان بنائی گئی جو بولی تو نہ جاسکتی تھی لیکن ادبیات عالیہ اور مذہبی لٹریچر کے لیے وہ زبان کام آتی رہی، اس زبان کو سنسکرت کہا جاتا ہے۔

آریا قوم بہرحال یہاں بسنے آئی تھی اس لیے مجبور تھی کہ کوئی سبیل یہاں کی پرانی قوموں سے مفاہمت کی پیدا کرے اس لیے ایک نئی زبان ان کی رمزی زبان اور پراکرت سے ٹوٹ کر پیدا ہونے لگی۔ مختلف وقتوں میں اس زبان پر مختلف اثرات نے کام کیے یہاں تک کہ جب مسلمان ہندوستان میں آکر بسے اس وقت زبان ہندوستان

کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے مشہور تھی، دوآبہ میں برج بھاشا یعنی برج کی زبان اور مشرقی صوبوں میں مگدی کہلاتی تھی۔

مسلمانوں نے جب اس دیس کو اپنا وطن بنایا تو جبّہ و دستار ھی نہیں بلکہ اپنی مادری زبان بھی اس دیس کی نذر کردی۔ بڑے تعجب کی بات ھے کہ وہ مسلمان جنھوں نے مصر کی زبان بدل دی، ٹیونس و الجزائر کی زبانیں بدل دیں، افریقہ و ایشیا کی بہت سی زبانوں کو مٹا کر عربی کا سکہ چلایا، نہ جانے کیا بات تھی کہ ھندوستان میں اپنی زبان عربی و فارسی چھوڑکر برج بھاشا کے ھو رھے۔ اردو زبان اسی برج بھاشا کی صاف ستھری اور ترقی یافتہ شکل ھے۔ اگر کوئی مسلمان یا ھندو اس زبان کو لوٹا کر پچھلی شکل میں لانا چاھے تو اس کے یہ معنی ھیں کہ وہ ھوائی جہاز میں بیل جوت کر بیل‌گاڑی بنانا چاھتا ھے، یا نئی دھلی کی فلک‌بوس عمارتوں کو مسمار کرکے جھونپڑے تعمیر کرنا چاھتا ھے۔ ایسا شخص وطن کا غدار اور ملک کا دشمن ھے۔

ھم سب کا فرض ھے کہ اس زبان کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے کر دوسری ترقی‌یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑا کریں اور آسان سے آسان تر شکل میں اس کی تعلیم و طباعت کا انتظام کریں۔

زبان کی ترقی میں ایک اھم مسئلہ طباعت کا ھے۔ طباعت کی ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ رکاوٹ ثابت ھو رھی ھے وہ لیتھوگرافی یعنی پتھر کی طباعت ھے۔ دنیا میں فن طباعت نے اتنی ترقی کرلی ھے کہ ھم ان تمام جدید ترین آسانیوں سے فائدہ اٹھائے بغیر اپنی زبان کو ترقی‌یافتہ زبانوں کی سطح تک نہیں لاسکتے۔ روٹری پریس اور سلف کمپوزنگ مشینوں نے تو گویا پریس کی دنیا میں انقلاب ھی کردیا ھے۔ اگر ھم لیتھوگرافی کو خیرباد نہ کہہ‌دیں تو ان ایجادات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

پتھر کی طباعت میں جو دقتیں ھیں ان کا بار غلط‌فہمی کی وجہ سے رسم‌الخط کے سر تھوپ دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعض لوگوں نے اردو رسم‌الخط کو بدل دینے کا مشورہ پیش کیا، کسی نے ناگری کی مدح سرائی کی اور کوئی لاطینی کی تجویز پیش کرنے لگا۔

میں نے سنہ ۱۹۳۱ عیسوی میں رسم الخط کے متعلق ایک تفصیلی مضمون رسالۂ 'ندیم' میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سے سات آٹھ سال کی طویل و عریض مدت میں ناگری، اردو اور لاطینی خطوں پر مختلف حیثیتوں سے غور کرتا رہا۔ ناگری کتابوں اور رسالوں سے تو مجھے بچپن سے واسطہ ہے۔ رومن رسم الخط میں چھپی ہوئی کئی پرانی کتابیں بھی کتب فروشوں سے حاصل کیں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی ابتدا میں کچھ کتابیں رومن رسم الخط میں شائع کی تھیں، خوش قسمتی سے یہ کتابیں بھی مجھے مل گئیں۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اردو کا موجودہ رسم الخط بدل دینے کے بعد ہمارا اب تک کا سارا سرمایۂ ادب عجائب خانوں کی زینت ہوجائےگا، میں اپنے غور و فکر کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اردو زبان یہی زبان ہے جو ہندوستان میں رائج ہے تو اس کے لیے موجودہ رسم الخط سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا رسم الخط نہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اردو کا موجودہ رسم الخط اپنے اندر اصلاح کی گنجائش رکھتا ہے لیکن اسے چھوڑ کر ہم دوسرا رسم الخط اختیار کرلیں تو ہماری دقتیں کئی گنا زیادہ ہو جائیں گی۔

کسی زبان کا رسم الخط کبھی اتنا مکمل نہیں ہوسکتا جتنا کہ کوئی مفکر سوچ سکتا ہے۔ اپنے رسم الخط کے ناقص ہونے کی شکایت دنیا کی ہر زبان کو ہے اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کا ہر رسم الخط ناقص ہے بلکہ اردو رسم الخط کی بہ نسبت ناقص تر ہے۔ اگر کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے تو میری طرح اسی نتیجہ پر پہنچےگا کہ اردو رسم الخط اصلاح پذیر ہونے کے باوجود دنیا کا سب سے زیادہ مکمل رسم الخط ہے۔ اردو زبان کے لیے رسم الخط کے مسئلہ پر بحث کرنے میں ناگری و لاطینی رسم الخط کا سوال سامنے آتا ہے، اس وقت میں ان دونوں خطوں کا اردو رسم الخط سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے ناگری کو لیجیے۔

آج کل اردو ناگری رسم الخط کا مسئلہ اخبارات و رسائل میں بار بار زیر بحث آرہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار فرمانے والے یا تو ان میں سے ایک ہی رسم الخط سے واقف ہوتے ہیں یا پھر توجہ کے ساتھ غور فرمانے کی زحمت

گوارا نہیں فرماتے۔ اکثر اخبارات و رسائل میں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرمانے والے بعض وہ قابل احترام حضرات ہیں جو اگرچہ اپنی دوسری خصوصیات اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ہمارے واجب الاحترام رہنما ہیں مگر علم الاصوات و علم الحروف سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ وقیع رائے دینے کے اہل نہیں ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ سیاسیات پر اچھی نظر کے مالک ہیں یا اقتصادی معلومات کے بڑے گراں بہا خزانے اپنے دماغوں میں محفوظ رکھتے ہیں، مگر یہ بھی عجیب بات ہوگی کہ کسی مریض کی دوا اور غذا کے متعلق کسی ماہر فن انجینیر یا کسی عمارت کی تعمیر کے متعلق کسی تجربہ کار طبیب سے مشورہ کیا جائے۔

تیسری قسم اس مسئلہ پر رائے دینے والوں کی وہ ہے جو خود سوچنے یا سمجھنے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسرے شخص کے خیالات صرف اس لیے دہراتی رہتی ہے کہ ان کا رعب کسی وجہ سے اس پر طاری ہے۔ یہ حضرات اپنی طرف سے اس مسئلہ پر دوسروں کی رائے اس طرح پیش فرماتے ہیں جیسے آپ کی ساری عمر کے فکر و تجربہ کے نتائج ہوں حالاں کہ وہ مسئلہ سے اسی قدر ناواقف ہوتے ہیں جیسے ایک عامی انسان۔

رسم الخط ہر ملک میں اس ملک کی مروجہ زبان کی ضرورت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ چینی اور جاپانی رسم الخط میں بعض الفاظ و نقوش کچھ خاص آوازوں کے ادا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جن کے مقابل دوسری زبانوں میں کوئی نقش آپ کو نہیں ملے گا۔ بظاہر وہ غیر ضروری معلوم ہوں تو ہوا کریں، حقیقتاً ان زبانوں کو ان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی زبان کو .B. D وغیرہ کی۔ انگریزی ہی میں ملاحظہ فرمائیے: حرف X بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ K اور S کی مرکب آواز دیتا ہے اور K و S سے اس حرف کا کام لیا جاسکتا تھا۔ یہ حرف انگریزی رسم الخط میں بےضرورت اور زائد ہے۔ لیکن ذرا غور سے توجہ فرمائیں تو معلوم ہوگا ایسا نہیں ہے کیوں کہ K اور S کی مرکب آواز X کی آواز سے کسی حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ نقوش یا حروف کسی رسم الخط میں

نہیں پائے جاتے جن کی اس ملک کو ضرورت نہ ہو۔ مثلاً عربی میں ڑ، ڈ، ٹ، پ، چ، ژ، گ، وغیرہ کی تلاش عبث ہے۔ عربی زبان کو ان حروف کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی ز، ذ، ظ وغیرہ حروف سنسکرت میں نہیں مل سکتے۔

یہ ہے وہ فطری وجہ جس سے تمام دنیا کے رسم الخط بنے اور جاری ہوئے۔ تمدن کی روز افزوں ضروریات نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور آہستہ آہستہ وقتاً فوقتاً اس میں اصلاح و ترمیم بھی ہوتی رہی اور برابر دنیا کے مختلف رسم الخط میں یہ سلسلہ جاری ہے اور شاید ہمیشہ جاری رہے گا۔

ناگری خط

میں برسوں سے اردو اور ناگری رسم الخط پر غور کر رہا ہوں میں نے بہت سے مضامین بھی ہندی میں لکھے ہیں۔ ناگری خط سے مجھے کوئی عناد نہیں۔ لیکن پھر بھی میں یقین کرتا ہوں کہ ناگری خط ایک نامکمل اور تکلیف دہ رسم الخط ہے۔ میری رائے میں زبان اور خط کے مسئلہ پر جس نقطۂ نظر سے مسٹر گاندھی اور آنریبل سی راج گوپال چاریہ غور کرتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہے۔ زبان ہندوؤں یا مسلمانوں کی نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی ملک یا دیس کی ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ عراق کے مسلمان عربی اور عیسائی عبرانی یا کلدانی زبان بولتے ہیں اور نہ آپ کے تصور میں یہ بات آسکتی ہے کہ بنارس کے مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت بولتے ہوں گے کیوں کہ ایسا ہونا عقل کے خلاف اور فطرت انسانی کے اقتضا کے بالکل منافی ہے۔ ہر ملک کی زبان وہ ہوتی ہے جس میں اس ملک کے رہنے والے، چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بات چیت کیا کرتے ہیں اور وہی زبان ان کے لکھنے پڑھنے اور تمام ضروریات میں استعمال کی جاتی ہے۔ پھر یہ کیسا صاف جھوٹ اور کتنی غیر حقیقی بات ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی اور بھاشا کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا جائے۔ کیا آج کہیں ہندستان کے کسی حصے میں تلسی داس کی رامائن والی یا خان خاناں کے دوہروں والی زبان بولی جاتی ہے۔ ہندی کے رسالوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ ہندستان کے کسی حصے بلکہ کسی ایک گھرانے میں کہیں بولی نہیں جاتی۔ صدیاں گزریں کہ وہ زبان ہندستان سے رخصت ہوگئی بالکل اسی

طرح جیسے سرکاری دفاتر سے فارسی ختم ہوگئی۔ اب جو زبان ہندستان میں رائج ہے اس کے لیے کسی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں کہ وہ وہی زبان ہے جو ہندستان کے تمام شہروں میں اور شمالی ہندستان کے شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کلکتہ، بمبئی، یوپی، بہار، پنجاب، ناگپور جہاں جی چاہے بول کر، پوچھ کر دیکھ لیجیے آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ایک ہی زبان رائج ہے۔ لب و لہجہ کا معمولی فرق تو پایا جائےگا مگر زبان میں کوئی بنیادی فرق نہ ہوگا۔

ان علاقوں میں جہاں اردو یا ہندستانی زبان بولی جاتی ہے آپ جانتے ہیں کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، بدھ اور لامذہب سب ہی بستے ہیں لیکن سب کی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے جس سے اپنے دل کی دوسرے کو سناتے اور دوسرے کی کہی خود سنتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید آقا اور نوکر باپ بیٹے اور دو پڑوسیوں میں کبھی تبادلۂ خیالات ممکن نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں کوئی زبان یا رسم الخط کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہوسکتا بلکہ ہر زبان اور ہر رسم الخط کسی دیس یا ملک سے مخصوص ہوتا ہے۔ ہمارے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن مجید کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اگر تعصب اور تنگ ظرفی نہیں تو مہمل اور ناسمجھی کی بات ضرور ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ کوئی زبان کسی دوسری زبان سے رسم الخط لے کر کام چلائے۔ ایسا نہیں ہوسکتا دوسری زبان کے رسم الخط میں بہت سی اصلاحات اور اضافے کرکے اپنا بنانا پڑےگا۔ تیسری صدی ہجری میں جب فارسی نے عربی کا رسم الخط اپنی زبان کے لیے لیا تو اس میں کئی حروف کے اضافے کیے گئے۔ فارسی کے لیے پہلے سے جو رسم الخط رائج تھا وہ پیدا ہونے والی زبان کا ساتھ نہ دے سکا اس لیے مجبوراً اس کو چھوڑ کر دوسری زبان کے رسم الخط میں اپنی ضرورت کے مطابق اضافے کرکے اپنا بنانا پڑا۔ اسی طرح ترکی نے اپنا رسم الخط بدلا تو لاطینی رسم الخط میں ۹ - ۱۰

حروف نقطوں اور نشانوں سے بنانے پڑے -

آج جو رسم الخط دنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہیں وہ سب کے سب اپنی اصل کے اعتبار سے کسی نہ کسی مردہ زبان کے رسم الخط کی اصلاح یافتہ شکلیں ہیں - دنیا میں جس قدر زبانیں پیدا ہوئیں اتنے ہی رسم الخط نئے نئے پیدا نہ ہوئے بلکہ ایک رسم الخط دس زبانوں کے لیے تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ کار آمد بنایا گیا - لیکن یہ تھوڑا بہت تغیر اس قدر اہم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اصلاح شدہ رسم الخط اسی زبان کا مخصوص رسم الخط ہوجاتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی دو زبانیں بعینہ ایک رسم الخط میں نہیں لکھی جاتی ہیں بلکہ ہر زبان کسی قدیم رسم الخط کو اصلاح و ترمیم کرکے اپنی ضرورت کے موافق بنا لیتی ہے -

ہندستان میں بھی یہی ہوا - سنسکرت آپ جانتے ہیں کہ ہندستان کی بولی کبھی نہ تھی، مقدس اشلوکوں کی خاص علمی زبان تھی، عوام سے اس کا کبھی تعلق نہیں تھا - شمالی ہندستان میں عوام اس وقت ایک ملی‌جلی سی زبان بولا کرتے تھے جس کے پاس کوئی رسم الخط نہ تھا - مقدس نوشتوں کے لیے جو سنسکرت میں تھے، ایک رسم الخط رائج تھا جس کی اصلاح شدہ شکل موجودہ دیوناگری اور سادہ شکل بہار میں رائج کیتھی رسم الخط ہے - جب پالی نے رواج پایا، پالی رسم الخط بھی ساتھ آیا - جیسے سنسکرت کا رسم الخط قدیم سامری رسم الخط سے ماخوذ تھا، اسی طرح پالی کا رسم الخط ہندستان کے بعض قدیم رسم الخط کے اقتران سے پیدا کیا گیا - جب پالی رخصت ہوئی برج بھاشا نے اپنا بستر بچھایا - پالی رسم الخط سے کام نہ چل سکا - رسم الخط بھی ساتھ ساتھ رخصت ہوگیا - قدیم رسم الخط کی شکلیں درست کی گئیں، اصلاح و ترمیم ہوئی، دیوناگری کے نام سے ایک رسم الخط بنا - یہ بولی جب تک بولی جاتی رہی رسم الخط اس کے لیے کام آتا رہا - شیخ محمدجائسی اور عبدالجلیل بلگرامی کے دور تک چلے آئیے آپ دیکھیں گے کہ فارسی رسم الخط کے متعارف اور دفتری رسم الخط ہونے کے باوجود بھاشا کا سرمایۂ ادب سب کا سب ناگری میں لکھا جاتا رہا -

اردو یا کھڑی بولی جب دکن سے نکل کر شمالی ہندستان میں پھیلی تو اس کے

لکھنے کے لیے رسم الخط کا مسئلہ سامنے آیا اور ٹھیک وھی سوال پیدا ھوا جو برج بھاشا کے ابتدائی دور میں پیدا ھوا تھا۔ پالی رسم الخط جیسے برج کے لیے کار آمد ثابت نہ ھوسکا اردو کے لیے بھی بھاشا کے رسم الخط سے کام چلتا نظر نہ آیا۔ گرد و پیش نظر کی گئی تو سب سے زیادہ آسان اور متعارف رسم الخط فارسی کا نظر آیا۔ ٹ، ڈ، ڑ، وغیرہ بڑھاکر اپنا بنایا اور کام لیا اور جیسے بھاشا کے شاعروں نے تلسی‌داس اور سورداس نے اپنے دواوین کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کی کوشش نہ کی اسی طرح لعل چند رنگین اورنگ‌آبادی اور دیاشنکر نسیم لکھنوی نے اپنے کلام کا مجموعہ ناگری میں نہ لکھا۔ اگر خدانخواستہ ایسا کرتے تو ان کے پڑھنے کے لیے کچھ دنوں کے بعد شاید کسی ماھر فن خطوط کی ضرورت ھوتی اور جس زبان کے وہ شاعر تھے اس زبان کے لکھے پڑھے آدمی کے بس کی بات نہ رھتی۔

اردو رسم الخط اگرچہ فارسی رسم الخط سے لےکر بنایا گیا ھے لیکن اسے بعینہٖ فارسی کا رسم الخط نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اگر نسبت اصل کی طرف ھی منظور ھے تو ھندی رسم الخط کو بھی سنسکرت بلکہ اور قدیم سامری رسم الخط کہا کیجیے کیونکہ تاریخ کا وسیع علم رکھنے والے جانتے ھیں کہ ناگری میں اپنا اس سے زیادہ نہیں جتنا اردو رسم الخط میں اپنا اردو کا حصہ ھے۔

جب اردو کے لیے فارسی رسم الخط میں تغیر و تبدل کیا جارھا تھا تو اس وقت کے لوگوں نے بھی ان ھی خیالات کے ماتحت جو تجدد پسند مصلحین کے سامنے ھیں اس کام کو شروع کیا تھا۔ اور فارسی رسم الخط میں ضروری تغیرات کے بعد اس کی صلاحیت پیدا کردی کہ ھماری زبان کے تمام مروجہ الفاظ اور ان دوسری زبانوں کے الفاظ کو جن سے ھمیں اپنے فرھنگ کی تکمیل کے لیے الفاظ لینے پڑتے ھیں، نہایت آسانی کے ساتھ ادا کرسکے۔ ھمیں اس وقت دیکھنا یہ ھے کہ پچھلی صدیوں کے ھندوستانیوں کی یہ تجویز کس قدر کامیاب رھی۔ اگر واقعۃً وہ کامیاب رھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ھم اپنی نادانی اور کج فہمی سے یہ صدیوں کا سرمایہ اور ھندو مسلمانوں بلکہ کسی حد تک انگریزوں کا بھی یہ قرنوں کا نتیجۂ عمل برباد کردیں۔

اگر ہم نے اپنی نادانی سے کوئی انقلاب خط میں کردیا تو اب تک کا سارا کارنامہ آیندہ نسلوں کے لیے سرمایۂ ادب نہیں بلکہ آثار قدیمہ کے نشانات ہوجائیں گے اور کتابیں کتب‌خانوں سے نکل کر عجائب خانوں میں جگہ پائیں گی ۔ آیندہ صفحات سے آپ انشاءاللہ بہ آسانی سمجھ سکیں گے کہ یہ لوگ اس تجویز میں ناکام نہیں رہے اور جو زبان ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے لیے موجودہ اردو رسم‌الخط سے زیادہ آسان، مفید اور کارآمد کوئی دوسرا رسم‌الخط نہیں ہوسکتا ۔

ہاں اگر مردہ زبان سنسکرت یا مردہ بھاشا کو ہندستان میں زندہ کرکے تاریخ کا سب سے پہلا تجربہ کرنا ہے اور آہستہ آہستہ ہندستان کی روزمرہ کی زبان کو سنسکرت زبان بنانا چاہتے ہیں جو کبھی کسی زمانے میں روزمرہ کی زبان نہ تھی تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر کسی اور فرصت میں کچھ عرض کیا جاسکے گا ۔ لیکن اگر اسی زبان کو زندہ رکھنا ہے جیسے ہم آپ سب بولتے ہیں اور جسے گاندھی جی "ہندی ہندوستانی" کے مہمل مرکب سے یاد فرماتے ہیں تو آپ یقین فرمائیں کہ اس کے لیے ناگری یا لاطینی رسم‌الخط کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ क پر نقطہ لگاکر क़ اور ज پر نقطہ لگاکر ज़ تو بنا لیا جاسکتا ہے مگر ء کی آواز اور ن۔ھ، ل۔ھ کی مرکب آوازوں کے لیے کیا سبیل نکالی جائے گی ۔

فرض کیجیے کہ ان آوازوں کے لیے کچھ نقوش اور وضع کرلیے گئے ہیں تو کسی رسم‌الخط میں جو آسانیاں مد نظر رکھی جاتی ہیں وہ صرف نقوش اور آواز کی مطابقت ہی تو نہیں ہوتی بلکہ رسم‌الخط میں اور کئی چیزیں غورطلب ہوتی ہیں اور ایک رسم‌الخط پر کئی حیثیتوں سے غور کیا جاتا ہے ۔ آواز و حروف کی مطابقت کے سوا ۔

تعلیم کی آسانیوں کے اعتبار سے ۔

طباعت کی سہولت کے اعتبار سے ۔

جگہ، محنت اور وقت کے اعتبار سے بھی غور کیا جاتا ہے ۔

ضرورت ہے کہ ہم اردو اور ناگری دونوں رسم الخط پر ان تمام حیثیات سے غور کریں پھر دیکھیں کہ کون سا رسم الخط ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لیے مفید، آسان اور کارآمد ثابت ہوتا ہے ورنہ ضد اور ہال ہٹ میں پڑ کر ہم اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کے سوا کیا پائیں گے ۔ آج ہندی کے رسالوں کی جو روش ہے وہ اگر ایک اور نسل تک جاری رہی تو یقین فرمائیے کہ انگریزی زبان اور خط کو ہندستان میں ضروری بنانے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہوگا اور دو صوبوں میں نہیں بلکہ ایک ہی شہر کے دو آدمیوں میں خط و کتابت کے لیے انگریزی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا کیوں کہ وہ زبان جو ان رسالوں کے ذریعہ پیدا کی جارہی ہے، وہ ہندستان کی عمومی زبان انشاءاللہ کبھی نہ ہوسکے گی اور اردو سے دشمنی جو سمیلن کے جھمیلوں نے پیدا کی ہے وہ رسم الخط کو عوام سے چھڑانے میں اگر کامیاب ہوگئی تو بتائیے کہ ایک ہی شہر کے دو آدمی انگریزی کے سوا کس خط و زبان میں مراسلت کریں گے؟

دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے اور زندوں کی طرح اپنی زبان و قلم سے کچھ کام لینا ہے تو ٹھنڈے دل سے بغیر ضد اور غصے کے جذبات کی آمیزش کے سونچیے اور غور فرمائیے، ہٹ اور تنگ ظرفی سے، تعصب اور کینے سے بلند و بالا رہ کر سوچیے کہ اس قسم کی تحریکیں اور کوششیں بال ہٹ اور نقصان دہ ضد سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتی ہیں؟

اردو اور ناگری دونوں خطوں پر مختلف حیثیتوں سے غور فرمائیے ۔ تفصیل بڑی فرصت اور وسعت چاہتی ہے اس لیے صرف بعض حیثیتوں اور وہ بھی بہت غیر تفصیلی طور پر اس صحبت میں کچھ عرض کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیے ۔ ان میں بہت ہی تھوڑے نمونے پیش کیے گئے ہیں ۔ اس سے زیادہ کے لیے نہ تو مجھے فرصت ہے اور نہ گنجائش۔

آواز و حروف سب سے پہلے نقوش اور آوازوں کی مطابقت کو لیجیے ۔ لاطینی رسم الخط کا ذکر آگے آئے گا ۔ پہلے ناگری رسم الخط کو لیجیے ۔ یہ رسم الخط بھی باوجود ترمیم و اضافہ کے ہماری زبان کی تمام آوازوں کو ادا نہیں کرسکتا ۔ بلاشبہ یہ تلسی داس جی کی رامائن اور عبدالرحیم خان خانان کی ست سئی

کی آوازیں کسی حد تک ادا کرسکتا ہے، مگر سوچیے تو آج ہندستان کی وہی زبان ہے جو اس وقت تھی۔ آج اس باغ میں کیتکی اور کدم کے پھولوں کے ساتھ ساتھ گلاب و یاسمین بلکہ کہیں کہیں ولایتی کروٹن بھی موجود ہیں۔ انھیں نکال کر الگ پھینک دینے کا خیال نادانی ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ضرورت اور حالات کے مطابق دوسری زبانوں کے الفاظ ملتے رہتے ہیں، کوئی زبان انھیں یک دم نکال نہیں سکتی۔ ترکی میں جس کے بارے میں عربی وفارسی کے الفاظ نکال دینے کی بڑی کوشش کی گئی، ہزاروں اس کے اپنے ہوکر باقی رہ گئے۔ کوئی ترکی اخبار پڑھ کر دیکھ لیجیے، سینکڑوں الفاظ دوسری زبانوں کے ملیں گے۔ عربی جس پر دوسری زبانوں کا اثر نسبتاً کم پڑا ہے، فارسی اور دوسری زبانوں کے بیسیوں الفاظ اپنے ذخیرۂ لغات میں رکھتی ہے۔

غرض کہ اردو سے بڑی وہ اجنبی الفاظ جو اب اجنبی نہیں رہے بلکہ اس کے اپنے ہوچکے ہیں، نکالے نہیں جاسکتے؛ تو ضرورت ہے ایسے رسم الخط کی جو ان تمام آوازوں کو جو اندرونی اور بیرونی الفاظ کے اس مجموعہ کے لیے ملک میں رائج ہیں، آسانی سے ادا کرسکے۔ اس ضرورت کے لیے ناگری رسم الخط کافی نہیں ہے۔

ناگری میں ۳۷ حروف صحیح وینجن، ۱۶ حروف علت سور اور ۱۶ ماترائیں یعنی اعراب ہوتے ہیں، یہ کل ٦۹ نقوش ہوئے۔ ان پر ۵ ان حروف کا اضافہ کیجیے جو خ، ز، غ، ف، ق کی آوازوں کے لیے نقطے لگاکر بنائے گئے ہیں، کل (۷٤) حروف تہجی ہوئے۔ اس اتنے بڑے مجموعہ میں ل، ہ اور ن، ہ کی مرکب آواز کے لیے کون سی ترکیب ہے؟ مثلاً لفظ ننھا اور لفظ کولھو میں ل کے ساتھ ھ کی اور ن کے ساتھ ھ کی مرکب آواز پیدا ہوتی ہے۔ ناگری میں باوجود اس قدر کثیر حروف تہجی کے اس کے لیے کوئی سامان نہیں ہے۔ آج کل جس طرح لکھتے ہیں وہ چندویدی دوارکا پرشاد شرما کی ڈکشنری ہندی شبدارتھ پاریجات سے نقل کرتا ہوں۔ کولھو اور ننھا नन्हा لیکن ان سے جو آواز پیدا ہونا چاہیے وہ کول‌ہو اور نن‌ہا कोल्हू ہے، مرکب آواز نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اسی لغت میں हिन्दी ہندی اور تلپ तल्प بمعنی بستر کے لیے وہی ٹکڑے استعمال کیے گئے ہیں۔ اصل میں ناگری حروف کے

ٹکڑے صرف ان حروف کے ساکن ہونے کو بتاتے ہیں، مرکب آوازوں کے لیے الگ الگ حروف ہوتے ہیں ۔ جیسے کھ ख گھ घ وغیرہ، مگر لام اور نون کی اس طرح ہ سے مرکب آواز کے لیے کوئی حرف موجود نہیں ہے ۔

اسی طرح دکھاؤ، بلاؤ یعنی اردو میں جو آواز ہمزہ اور واو سے ادا کی جاتی ہے اس کے لیے ناگری میں کوئی نقش موجود نہیں ہے ۔ ہمزہ اور واو سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ یقیناً الف اور واو کے مرکب سے مختلف ہے لیکن ناگری رسم الخط میں کوئی سبیل اس کے ادا کرنے کی موجود نہیں 'بلااو' یا 'دکھااو' لکھنا پڑے گا ۔

س، ص، ث کی آوازیں اردو میں اگرچہ مختلف نہیں ہیں مگر ان میں معانی کے اعتبار سے بڑا فرق ہے ۔ اگر اس فرق کو ختم کرکے ناگری حرف स سے کام لیا گیا تو ہم اثیر اور اسیر کے باہمی فرق معانی سے محروم ہوجائیں گے ۔ اردو رسم الخط میں ص، ث، س وغیرہ کے موجود ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے ابتدا سے اب تک بڑی آسانیاں رہی ہیں اور ہماری فرہنگ میں بہت سے الفاظ دوسری زبانوں سے اس آسانی کے ساتھ منتقل ہوگئے کہ آج ہر اردو داں جو فارسی یا عربی سے بالکل ناواقف ہو وہ بھی ان الفاظ کی وجہ سے اپنے خیالات خوب‌صورت سلیس اور سلجھی ہوئی عبارت میں ادا کرنے پر قادر ہے ۔ بظاہر اگرچہ یہ ہم آواز حروف غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مگر معانی کی وسعت اور الفاظ کی فراوانی کا جو صلہ ہمیں ان کی وجہ سے ملتا ہے وہ رسم الخط میں ان حروف کے بوجھ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے ۔

یہ اردو زبان میں انوکھا عیب نہیں ہے بلکہ دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے ۔ ہمارے ایک فاضل انشاپرداز نے ابھی کچھ دن ہوئے لکھا تھا کہ وہ اب‌تک بعض الفاظ کا املا صحیح نہیں لکھ سکتے اور ص کی جگہ س لکھ دیتے ہیں ۔ لیکن شاید ان کو یاد نہیں رہا کہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں الفاظ کے لیے مخصوص املا ہوا کرتا ہے انگریزی میں تو یہ بہت زیادہ ہے ۔ کہیں TURE کی آواز دیتا ہے اور کہیں CHAR، CH، KH کی ۔ ناگری میں بھی یہ بات اردو سے

کچھ زیادہ پائی جاتی ھے श، ष، ण، न وغیرہ حروف ایک دوسرے کی جگہ نہیں استعمال کیے جاسکتے اور جیسے صندوق کے بجائے سندوق اردو میں غلط سمجھا جاتا ھے ناگری میں بھی कृष्ण کے بجائے करीशन غلط سمجھا جائےگا ۔ اور انگریزی میں بھی STATION کے بجائے STESHAN غلط سمجھا جائےگا ۔ یہ کسی زبان کا عیب نہیں ھے بلکہ اس کی خوبی ھے ۔ ان آوازوں کے علاوہ اور بھی بہت سی آوازیں ھیں جو ادا نہیں ھوسکتی ھیں مگر ان کی فہرست طویل ھے اور شاید پڑھنے والوں کے لیے بار ھوجائے گی ۔ اس لیے میں نے انھیں چھوڑ دیا ھے ۔ غور کرنے سے ھر اس شخص کو معلوم ھو سکتی ھیں جو دونوں کے رسم الخط سے واقف ھے ۔

تعلیم

ھمارے سامنے دوسرا مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ھے ۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ھے ۔ میں نے اپنے بعض احباب سے جو ناگری رسم الخط سے ناواقف ھیں، بارھا یہ سنا ھے کہ ناگری دو دن میں سیکھی جا سکتی ھے ۔ لیکن ان کا یہ فرمانا بطور واقعہ نہیں بلکہ محض لطیفہ کی طرح ھوتا ھے ۔ ان میں سے بعض نے دس بیس دن تک محنت کی لیکن لکھنے پڑھنے پر قادر نہ ھوسکے ۔ اس وقت انھیں معلوم ھوا کہ وہ جو سمجھ رھے تھے وہ ناواقفیت اور غلط فھمی تھی ۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ھے کہ میرے ایک دوست کے ساتھ یہی قصہ ھوا اور ان کو تقریباً ۳ ماہ تک محنت کرنے کے بعد یہ اقرار کرنا پڑا کہ ناگری خط کے سیکھنے کے بارے میں وہ غلط فھمی میں مبتلا تھے ۔

اصل بات یہ ھے کہ اردو رسم الخط جب ھم نے سیکھا تھا، ھم بچے تھے اور ظاھر ھے کہ اس وقت رفتار ترقی اور سمجھنے کی صلاحیت پختہ عمر سے بہت کم تھی ۔ اب جوان ھونے کے بعد دو چار حروف ناگری کے جب ھم جلدی سے سیکھ لیتے ھیں اور اپنا نام لکھنے کے قابل ھو جاتے ھیں تو اس مدت کا مقابلہ بچپن کی مدت تعلیم سے کرتے ھیں اور فیصلہ صادر فرماتے ھیں کہ اردو رسم الخط سیکھنے میں زیادہ دقت اور محنت صرف ھوتی ھے ۔ حالانکہ اس وقت جب کہ ھم نے اردو خط سیکھا تھا نہ تو ھمیں اتنی سمجھ تھی اور نہ اتنا دھیان سیکھنے پر دیتے تھے

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ ایک صاحب نے اردو کے لیے لاطینی رسم الخط تجویز کرتے ہوئے اپنی دانست میں بڑا سخت اعتراض اردو رسم الخط پر کیا تھا کہ وہ اب تک کبھی کبھی س کی جگہ ص لکھ دیا کرتے ہیں - میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ اعتراض اردو رسم الخط پر عاید ہوتا ہے یا ان کے علم و فضل پر - ان حضرت کو یاد نہ رہا کہ ابتدائے تعلیم میں انھوں نے انگریزی الفاظ کا املا کتنی بار غلط لکھا تھا اور آج تک کتنی بار ڈکشنری کی مدد لیے بغیر ان کو صحیح املا لکھنا نصیب ہوتا ہے - افسوس کہ شاید وہ بیچارے ناگری سے حرف شناس نہیں ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ ناگری میں اردو سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ ह ، ब ، ण ، न کا فرق قایم رکھنا پڑتا ہے اور جب تک صحیح املا معلوم نہ ہو کوئی شخص ایک سطر صحیح عبارت نہیں لکھ سکتا - اور لکھنا تو الگ رہا اگر صحیح املا معلوم نہ ہو تو ایک سطر پڑھ بھی نہیں سکتا - اگر خدانخواستہ اس میں مبالغہ معلوم ہو تو ناگری حروف صحیح ۳۷، حروف علت ۱۶، ماترا ۱۶ اور پانچ خ، غ وغیرہ والے منقوط حروف کل ۷۴ نقوش جو ناگری کے پورے حروف ہجا ہیں، کسی سے ایک بڑے تختہ کاغذ پر لکھوا لیجیے؛ پھر ان کی مدد سے کسی ہندی رسالہ کی صرف سرخیاں ہی پڑھنے کی کوشش فرمائیے - معلوم ہوجائے گا کہ حروف ترکیب کے وقت اتنی طرح طرح کی شکلیں بدلتے ہیں کہ سیکڑوں جگہ ان کی اصلی شکلوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا - اردو میں قاعدہ ہے کہ کوئی حرف جب کسی دوسرے حرف سے ملتا ہے تو ملنے والے حرف کا ابتدائی حصہ آخری کشش کو نکال کر قائم رکھا جاتا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی اصلی شکل یاد دلاتا ہے - مثلاً جسم میں ج کا اور س کا ابتدائی حصہ اور میم کامل موجود ہے - لیکن ناگری میں یہ ضروری نہیں ہے حرف र ،ر، جب مرزا मिर्ज़ा میں لکھا جائے اپنی اصلی شکل اس طرح بدل دے گا کہ لفظ کے آخری حصے پر اوپر کو ایک قوس نما نشان بن جائے گا - ملاحظہ فرمائیے کہ حرف र سے (ˆ) اس نشان کو کیا نسبت ہے اور جب کوئی شخص صحیح املا نہ جانے کیسے پڑھ سکتا ہے -

اردو میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا قاعدہ، خواجہ حسن نظامی دہلوی کا

قاعدہ اور ہندی میں ہندی پہلی پستک رام نرائن لال الہ آباد ، ہندی پرائمر اور ہندی اردو مالا مصنفہ فاضل پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج سنسکرت جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اس وقت میرے سامنے ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کرنے پر جو نتائج ناگری اور اردو رسم الخط کے متعلق نکلتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ میں کوئی ماہر فن تعلیم نہیں ہوں اور نہ مجھے بچوں کی تعلیم کا کوئی عملی تجربہ ہے مگر ظاہری نظر سے جو معلوم ہو سکا ہے وہ پیش ہے۔ آپ خود غور فرما کر فیصلہ کرسکتے ہیں کہ دونوں رسم الخط میں سے کون سا رسم الخط آسانی سے سیکھا سکھایا جا سکتا ہے۔

اردو رسم الخط کے سکھانے کا یہ طریقہ عام طور سے مقرر ہے۔ سب سے پہلے اردو کے ۳۴ حروف تہجی کی شکلیں ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ یہ شکلیں بہت ہی آسان اور سادے ہندسی خطوط سے بنی ہوئی ہیں کسی تختی یا کاغذ کے چار رخ ہوسکتے ہیں :- (۱) | (۲) — (۳) / (٤) \ اور نقطے کی تین شکلیں ■ ● ❤ ہوتی ہیں۔ اردو کے سارے حروف تہجی ان ہی چار قسم کی لکیروں اور نقطوں سے مرکب ہیں۔ اس لیے بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ میں نے بعض ننھے بچوں کو بھی جو ذرا ذہین تھے دو ایک گھنٹوں میں یاد کرتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد ان نو حروف کو چھوڑ کر جو کبھی کسی دوسرے حرف سے نہیں ملتے بلکہ دوسرے حروف ان سے ملتے ہیں بقیہ ۲۵ حروف کو ٤ گروہوں میں تقسیم کرلیا گیا ہے۔ اور ہر گروہ میں سے دو ایک حرف کو تمام حروف سے ملاکر ٹکڑوں کی شکلیں ذہن نشین کرا دی جاتی ہیں۔ ان ۳٤ حروف میں سے ۱٤ حروف تو وہ ہیں جن کی شکلیں الگ نہیں ہوتی ہیں بلکہ صرف نقطوں کے فرق سے بنتی ہیں۔ اس یکسانی کی وجہ سے شکلوں کے یاد رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو حرفی، سہ حرفی، چار حرفی الفاظ اور جملے پڑھا کر مشق کرادی جاتی ہے۔ اور چھوٹی تقطیع کے ۱٦ صفحات کا ایک قاعدہ ختم کر لینے کے بعد جو ایک جوان آدمی کے لیے دو تین دن اور بچے کے لیے دس بیس دن کی محنت چاہتا ہے، ایک طالب علم اردو کی تمام صاف لکھی ہوئی عبارتیں پڑھنے لگتا ہے۔ اب اس کے آگے مشق و روانی

کا درجہ ہے جو عادت و کام پر منحصر ہے۔

دوسری طرف ناگری رسم الخط کو لیجیے۔ سب سے پہلے ۱۶ حروف علت سکھائے جاتے ہیں جن کی شکلیں نہایت غیر متناسب اور الجھی ہوئی ہیں۔ بچہ تو بچہ کسی جوان آدمی کو بھی جلدی یاد نہیں ہو سکتی ہیں۔ شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں اس لیے یہ حروف لکھے جاتے ہیں :—

अ आ इ ई उ ऊ ऋ ॠ ऌ ॡ ए ऐ ओ औ अं अः

یہ ہیں ناگری حروف میں سور یعنی حروف علت۔ ان شکلوں کو یاد رکھنا ایک بچے کے لیے ا ب ج د کی بہ‌نسبت کس قدر مشکل ہے۔ اس کے لیے خود ان شکلوں سے زیادہ قوی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حروف صحیح یاد کرائے جاتے ہیں جو ۳۷ اصلی اور ۵ منقوط جدید حروف یعنی کل ۴۲ ہیں۔ یہ حروف ایک دوسرے سے اس قدر مختلف شکل و صورت کے ہیں کہ یادداشت کے لیے ان کی گروہ‌وار تقسیم ممکن نہیں۔ شکلیں ان کی بھی حروف علت کی شکلوں کی طرح الجھی سی ہیں۔ نمونے کے لیے دو تین حروف لکھے جاتے ہیں :-

جھ झ کش क्ष گین ज्ञ

اس کے بعد ۱۶ ماترا یعنی اعراب بتائے جاتے ہیں۔ پھر ان کے حروف کے ساتھ استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ لیکن چوں‌کہ یہ اعراب تمام حروف صحیح کے ساتھ ایک ہی طرح نہیں لگائے جاتے بلکہ بعض کے ساتھ لگانے کے خاص طریقے ہیں اس لیے ان کو ہر ہر حرف کے ساتھ لگاکر مشق کرائی جاتی ہے۔ مثلاً धूप دھوپ میں پیش کا نشان حرف ध کے نیچے لگایا گیا ہے۔ مگر रूप روپ میں یہی نشاں حرف र کے وسط میں ایک چھوٹی سی لکیر کے ذریعے جوڑا گیا ہے۔ اس کے بعد حروف کی شکلوں اور ان کے ایک دوسرے سے ملنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ایسے حروف کو ہندی میں سنجکت انچھر کہتے ہیں۔ یہ مرحلہ طالب‌علم

کے لیے بہت ہی مشکل اور نہایت پریشان کن ہے - اور سنجگت انچھر کا وجود ناگری رسم‌الخط کے عیوب میں سب سے بڑا عیب ہے - اکثر اساتذہ نے صرف اس کے لیے سو سو صفحات کی الگ مستقل ریڈریں لکھی ہیں اور کم از کم میں نے تو آج تک بیسیوں ریڈریں ہندی کی دیکھیں مگر کسی میں یہ نہ پایا کہ پہلی ریڈر میں اسے بتا دیا گیا ہو - سب سے اچھی شکل ان ٹکڑوں کے مشق کرانے کی فاضل پروفیسر ہری‌ہر شاستری عثمانیہ یونیورسٹی نے اختیار کی ہے - مگر ظاہر ہے کہ رسم‌الخط کی بنیادی خرابی کو دفع کردینا پروفیسر موصوف کے بس کی بات نہ تھی اس لیے پروفیسر صاحب کو بھی اس کے لیے اپنی کتاب کا پورا دوسرا حصہ وقف کردینا پڑا - اس میں فاضل مصنف نے تقریباً پونے دو سو شکلیں مختلف حروف کے ان ٹکڑوں کی بتائی ہیں جو ان کے کسی دوسرے حرف سے ملنے یا کسی دوسرے حرف کے ان سے ملنے سے پیدا ہوتی ہیں - میں بھی فاضل پروفیسر کے اس بیان کی تصدیق کرتا ہوں کہ ہندی کی پوری لیاقت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان حروف صحیح کے ملاپ سے اچھی طرح واقف ہو جائے - بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ تمام شکلیں اچھی طرح یاد نہ ہوں نہ ایک سطر عبارت لکھ سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے -

نظر ثانی کرنے میں غالباً فاضل پروفیسر کو بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ بعض شکلیں سنجگت حروف کی اتنی لمبی فہرست میں بھی درج ہونے سے رہ گئی ہیں - مثلاً ابتدا بہ سکون اور التقائے ساکنین کی جو شکلیں سنجگت حروف میں ہوتی ہیں وہ اس میں درج نہیں ہو سکی ہیں - مثلاً धृष्ट دھرشٹ، ध्रपद وغیرہ -

اس کے بعد نون کی آواز اور غنہ کی آواز کی مشق کرائی جاتی ہے کیوں‌کہ ناگری میں یہ دونوں آوازیں کئی جگہ کئی طرح سے ادا کی جاتی ہیں اور اس کے لیے بہت مخصوص قسم کے قاعدے مقرر ہیں، اگرچہ وہ قاعدے بھی کلیات نہیں ہیں - ان آوازوں کے لیے جو مخصوص طریقہ کسی لفظ کے لیے مقرر ہے، دوسرے لفظ میں اسے غلط سمجھا جایا جائے گا - مثلاً چاند، चाँद پتنگ، पतङ्ग ہندی हिन्दी، ڈنڈا، डण्डा ، وینجن व्यञ्जन وغیرہ وغیرہ - ان سب مرحلوں کے بعد بھی اردو کے ص، س، ض، ظ کی طرح

श ' ष ' क्ष ' ण ' न وغیرہ کے استعمال کا فرق باقی ہی رہ جاتا ہے جو الفاظ کے صحیح معنی کی یاد اور صحیح املا کی مشق پر منحصر ہے -

میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کوئی رائے پیش کرنے کی ضرورت ہے - ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اردو اور دیوناگری رسم‌الخط میں سے کون‌سا رسم‌الخط ہماری تعلیمی ضرورت کے لیے مفید اور سہل ہے - میں جس زمانے میں پاٹ‌شالہ میں پڑھتا تھا، میں نے دیکھا ہے کہ ابتدائی عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے کے باوجود طلبہ آسانی سے ہندی لکھنے پڑھنے پر قادر نہ تھے اور خود گرو جی بھی غالباً اپنی یہ کم‌زوری چھپانے کے لیے ہر عبارت کو لحن سے گا گا کر پڑھایا کرتے تھے -

طباعت

دوسرا اہم سوال طباعت کی آسانیوں کا ہے - جدید دنیا میں مطابع کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور آج ہر ملک اپنے مطابع کو قوی سے قوی‌تر بنانے پر تلا ہوا ہے - ہندستان میں جب پہلے پہل مطابع کا رواج ہوا تو ہماری ساری کوششیں متداول درسی کتابوں تک محدود تھیں - مانوس اور متعارف خط نستعلیق خط تھا - اسی خط میں لیتھو کی طباعت نے رواج پکڑا - حتیٰ کہ عربی کتابیں بھی خط نسخ کے بجائے نستعلیق میں چھپنے لگیں اور ہم نے اس پر اتنا زور دیا کہ پچھلی صدی کے نصف آخر میں جب‌کہ مصر کا مشہور مطبع امیری بولاق ٹائپ میں عربی کتابیں چھاپ رہا تھا، ہم نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں میں لیتھو سے کتابیں چھاپا کرتے تھے - اردو تو اردو، عربی کے لیے بھی ہندوستان میں اب تک لیتھو گرافی رائج ہے اور ٹائپ کا کام بہت تھوڑا ہے -

لیتھو گرافی کو بعض وجوہ کی بنا پر ترجیح دی جا سکتی ہے - لیکن بحیثیت مجموعی یہ ٹائپ کی بہ نسبت دقت طلب ہے - میرا مشورہ یہ ہے کہ اردو کو ٹائپ کی طباعت اختیار کر لینا چاہیے - لیتھو گرافی کو فائن آرٹ پرنٹنگس تک محدود رکھا جائے تو ہرج نہیں، مگر عام مطبوعات کے لیے اسے رائج رکھنا نقصان دہ ثابت ہوگا -

نسخ و نستعلیق کا قصہ ایک ہی رسم‌الخط کے مختلف نمونوں کا قصہ ہے - ہمیں اس جگہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ دیوناگری اور اردو رسم‌الخط میں سے کس

رسم‌الخط کی طباعت زیادہ آسان ھے ۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہمارے سامنے کئی سوال آتے ھیں جن میں سب سے اھم ٹائپ رائٹر مشین کی کامیابی اور ٹائپ کے مطبعی حروف کی کامیابی کا مسئلہ ھے ۔ ناگری حروف میں چوں‌کہ ماترائیں یعنی اعراب حروف کے اوپر نیچے اور بغل میں تینوں جگہ لگائے جاتے ھیں اور ٹائپ رائٹر مشین میں اوپر اور نیچے نشان لگانے کی کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی اس لیے ٹائپ رائٹر مشین ناگری رسم‌الخط کے لیے کامیاب نہیں ہوسکی ۔ اس کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں مگر جو مشین بن کر تیار ہوئی وہ ایسی ھے کہ خط ٹائپ کرنے کے بعد ماترائیں قلم سے لگانی پڑتی ھیں ۔ میرے پاس متعدد دوستوں کے خطوط کبھی کبھی ھندی ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیے ہوئے آئے ھیں ۔ ان سب کا یہی حال ھے ۔ کئی سال ہوئے، ایک مرتبہ میں نے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ارادہ کیا اس سے پہلے ھندی ٹائپ رائٹر کے دیکھنے بلکہ کچھ ٹائپ کرنے کا اتفاق مجھے بارہا ہوچکا تھا ۔ میں نے سوچا کہ ایسے ٹائپ رائٹر سے زیادہ آسان قلم سے ہی لکھنا ھے ۔ پھر بھی میں نے متعدد اداروں سے خط و کتابت کی کہ شاید کوئی صورت اصلاح کی نکل آئی ہو ۔ مگر مجھے جو جوابات ملے وہ حد درجہ مایوس‌کن تھے ۔ معلوم ہوا کہ اس‌میں کامیابی کی کوئی امید نہیں کیوں‌کہ اس کی راہ میں ماتراؤں سے بھی بڑی رکاوٹ سنجگت حروف کی ھے ۔ چوں‌کہ یہ ٹکڑے حروف سے اوپر، نیچے، بیچ میں اور بغل میں طرح طرح سے ملتے ھیں اس لیے ضرورت ھے کہ اتنے تمام ٹکڑے ٹائپ رائٹر میں لگائے جائیں اور ظاھر ھے کہ اس‌قدر کثیرالتعداد ٹکڑوں کی گنجائش ٹائپ رائٹر مشین میں نہیں ہوسکتی اس لیے کارآمد اور صحیح ٹائب رائٹر مشین ناگری رسم‌الخط کی نہیں بن سکتی ۔ اس وقت جو ناکام مشین موجود ھے وہ صرف بڑے بڑے اداروں میں بطور دلچسپی موجود ھے؛ نہ تو اس سے کام لیا جاتا ھے اور نہ وہ کام دے سکتی ھے ۔

اردو کی ٹائپ رائٹر مشین ھر جگہ صحیح کام دے رہی ھے ۔ اس کے متعلق کسی بیان کی ضرورت نہیں ۔ ھر شخص جانتا ھے کہ بڑے بڑے دفتری اور نجی کام اس سے بے تکلف لیے جاتے ھیں ۔

ٹائپ کے مطبعی حروف کی کامیابی کا دار و مدار ان کے ٹکڑوں کی کمی، تعداد کمپوز کی آسانی اور کاغذ کی کفایت پر ہے ۔ اردو حروف ناگری سے بہت ھی کم جگہ لیتے ھیں ۔ ان کی باھمی نسبت تقریباً ٦۳ اور ۱۵۰ کی پڑتی ہے ۔ یعنی ایک عبارت جو اردو حروف میں ٦۳ سطروں میں آسکتی ہے وہ ناگری حروف میں ۱۵۰ سطروں میں آتی ہے ۔ کمپوز کی آسانی کے لیے ٹکڑوں کا کم سے کم ھونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمام ٹکڑے یکساں ایک طرح کے ھوں؛ ایک دوسرے کے نیچے اوپر لگائے جانے والے نہ ھوں ورنہ کمپوزیٹر کی دقتیں بڑھ جانے کے علاوہ غلطیوں کا احتمال بھی بڑھ جاتا ہے اور پروف ریڈر کی محنت بھی بڑھ جاتی ہے، وقت زیادہ صرف ھوتا ہے اور کام کی رفتار سست ھوکر مطبوعات کی لاگت میں اضافہ ھو جاتا ہے ۔

اردو میں بشمول ھمزہ و لا کل ۳٤ حروف تہجی ھوتے ھیں جن میں سے ا، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، و، لا ۹ حروف کبھی کسی حرف سے نہیں مل سکتے اس لیے ان کی صرف دو شکلیں ھوتی ھیں ۔ (۱) جب وہ مفرد استعمال ھوں (۲) جب ان میں کوئی دوسرا حرف ملے ۔ بقیہ ۲۵ حروف کی چار چار شکلیں ھوتی ھیں ۔

(۱) جب وہ کسی حرف سے ملیں ۔

(۲) جب وہ کسی لفظ کے بیچ میں واقع ھوں ۔

(۳) جب وہ کسی لفظ کے آخر میں واقع ھوں ۔

(٤) جب وہ مفرد استعمال کیے جائیں ۔

یہ سب کل ۱۱۸ ٹکڑے ھوئے ۔ کچھ ٹکڑے حسن و خوب‌صورتی قائم رکھنے کے لیے بنا لیے جاتے ھیں، کچھ مرکب ٹکڑے سہولت کے لیے تیار کرلیتے ھیں ۔ غرض ۱۸۰ ٹکڑوں میں پورا ٹائپ ھو جاتا ہے ۔ اس وقت تک جدید ترین صورت جو تیار ھوسکی ہے وہ ۱۸۰ ٹکڑوں میں ہے اور بہت ھی خوب‌صورت اور ضرورت کے لحاظ سے مکمل ہے ۔ اس میں جوڑوں کی مختلف شکلیں جو جاری اور حسن خط کے لیے ضروری ھیں، سب موجود ھیں ۔

اب ذرا ناگری ٹائپ کو لیجیے ۔ اس کے مندرجہ ذیل ٹکڑے ہوتے ہیں :—

۳۷ حروف صحیح

۱۶ حروف علت

۱۶ ماترائیں

۲۳۰ سنجگت کے ٹکڑے یعنی حروف کی وہ شکلیں جو مختلف جوڑوں میں استعمال کی جاتی ہیں ۔

۲۹۹

یہ ۲۹۹ ٹکڑے تو حروف کے ضروری ٹکڑے ہوئے ، مگر چوں کہ کمپوزیٹر کی آسانی کے لیے زیادہ استعمال ہونے والے مرکب ٹکڑے بھی ضروری ہیں ۔ اس لیے اکھنڈ یعنی مرکب شکلیں جنھیں انگریزی میں لیگچر کہا جاتا ہے ، ناگری ٹائپ کے لیے بہت سی رکھی جاتی ہیں اس طرح پورا سٹ تقریباً ۶۰۰ ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔

پھر ایک دقت ناگری رسم الخط میں یہ بھی ہے کہ اکثر ماترائیں حروف کے نیچے یا اوپر لگائی جاتی ہیں اور کمپوزنگ میں یہ صورت ممکن نہیں ہوتی اس لیے بیشتر حروف مع حرکات کے ڈھال لیے جاتے ہیں ۔ اگرچہ کیکا بھائی ٹائپ فاونڈری بمبئی اور گجراتی ٹائپ فاونڈری بمبئی کے رائج ٹائپوں میں اس کا حل نکالا گیا ہے اور تقریباً ہر ٹائپ فاونڈری نے اپنے ٹائپوں میں اسے اختیار بھی کرلیا ہے ، مگر اس سے کمپوزیٹر کی محنت بہت بڑھ جاتی ہے اور وقت کا خون ہوتا ہے ۔ وہ حل یہ ہے کہ ایک ٹائپ کو ۳ غیر متساوی ٹکڑوں میں تقسیم کردیا گیا ہے ۔ مثلاً اگر پریم प्रेम لکھنا ہو تو اس کے پہلے حرف प्र میں کئی ٹکڑے جوڑے جائیں گے اور اگر ۱۲ پوآئنٹ کے حروف کمپوز کیے جارہے ہوں تو ۹ پوآئنٹ کا ٹکڑا اور ۳ پوآئنٹ کا سادہ نیچا ٹکڑا ملاکر مرکب حرف اور اس کے اوپر ۹ پوآئنٹ کا ٹکڑا حرکت کا اور اس کے بغل میں ۳ پوآئنٹ کا سادہ نیچا ٹکڑا لگایا جائے گا ۔ اس سے کمپوزیٹر کا کام تقریباً پانچ گنا بڑھ جاتا ہے اور رفتار کارگزاری کم و بیش $\frac{4}{5}$ کم ہوجاتی ہے ۔ ان دقتوں کی وجہ سے عموماً حروف مع حرکات استعمال کیے جاتے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں

سے زیادہ ہوتی ہے ۔ اگر وہ حروف مرکب صورت میں استعمال نہ کیے جائیں تو جن الفاظ میں تین تین ٹکڑے جوڑے جاتے ہیں ان کی کمپوزنگ عموماً غلط ہوجاتی ہے ۔ مجھے خود بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے اور صرف دو دو صفحوں کے مضامین میں اصلاح کرتے کرتے پریشان ہوگیا ہوں ۔

ان کثیرالتعداد ٹکڑوں اور کمپوزنگ کی ان دقتوں کی وجہ سے کمپوزنگ پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے اور کارگزاری بھی کم ہوتی ہے ۔

عام ضرورت

تیسرا سوال ہماری روزمرہ کی دفتری اور نجی ضروریات کا ہے ۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کیا جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم ناگری رسم الخط اختیار کرلیں تو ہماری دقتیں کچھ زیادہ تو نہیں ہوجاتی ہیں ۔

جو خط آسانی سے صحیح لکھا جاسکتا ہو اور تیزی سے صحیح پڑھا جاسکتا ہو وہ کامیاب خط سمجھا جائے گا ۔ اردو رسم الخط ایک قسم کی مختصر نویسی ہے، ناگری سے بہت جلد لکھا جا سکتا ہے اور ناگری سے دگنی تیزی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے ۔ لکھنے کا قاعدہ نہایت مکمل طور سے مرتب ہے ۔ ہر طرح کی خط و کتابت اور تحریر میں کم وقت اور کم محنت سے کام نکالا جاسکتا ہے ۔ بہ خلاف اس کے ناگری رسم الخط میں خود سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ لکھنے کا قاعدہ تک پوری طرح مرتب نہیں ہے ۔ اس وقت میرے سامنے ایک بہت بڑے فاضل سنسکرت داں کی مطبوعہ کتاب موجود ہے ۔ اس میں ایک لفظ پنڈت کو تین جگہ تین طرح سے لکھا گیا ہے ۔ (۱) पन्डीत (۲) पंडित (۳) पण्डित اسی طرح اس کتاب میں لفظ دکن کو کہیں दक्कन، کہیں दक्खिन اور کہیں दक्षिन لکھا گیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے کہ املا کا یہ فرق صرف ایک مصنف کی ایک ہی کتاب سے لیا گیا ہے ۔ اس رسم الخط کے متعلق کوئی کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ صحیح ہے اور جو وہ پڑھ رہا ہے وہ غلط نہیں ہے ؟

آپ یقین فرمائیں کہ فاضل مصنف کے فضل و کمال کا انکار آفتاب نور اور شب

کی سیاہی کا انکار ہوگا ۔ چوٹی کے سنسکرت دانوں میں یہ مصنف بھی ہے ۔ سنسکرت میں ایم ۔ اے پاس کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، بالکل صحیح لکھا ہے ۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ اس رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا قاعدہ صحیح طور سے مرتب نہیں ہے ۔

دوسری دقت جس کی وجہ سے لکھی تو لکھی ناگری میں چھپی ہوئی تحریر بھی تیزی سے صحیح طور پر پڑھی نہیں جاسکتی، یہ ہے کہ حروف کے ٹکڑے جہاں پر لکھے جاتے ہیں وہاں پر پڑھے نہیں جاتے ۔ مثلاً سپردھا सपर्धा کہ اس میں ترتیب حروف س، پ، د ھ، ا، ر ہے اور ترتیب صوتی س، پ، ر، د ھ، ا ہونی ہے ۔ اسی طرح اعراب جب مرکب حروف پر لگائے جاتے ہیں تو لگائے کسی کے ساتھ جاتے ہیں اور پڑھے کسی کے ساتھ ۔ مثلاً क्लेश کلیش کہ اس میں زیر کا نشان جو بظاہر क پر لگا ہوا ہے ल پر پڑھا جائے گا جس کا ایک ٹکڑا क کے نیچے جوڑ دیا گیا ہے ۔

کسی عبارت کے پڑھنے میں آنکھیں اپنا کام زبان سے کچھ پہلے انجام دیتی ہیں اور جب پڑھنے والا کسی عبارت کے پہلے لفظ کو پڑھتا ہے تو اس اثنا میں کہ وہ لفظ اس کی زبان سے ادا ہو آنکھ دو تین لفظ آگے کے دیکھ کر دماغ کو پہنچا دیتی ہے اور دماغ اسے زبان سے جاری کراتا ہے ۔ نقوش اور اصوات کے اختلاف ترتیب کی وجہ سے یہ بات ناگری رسم الخط میں نہیں ہوسکتی اس لیے ناگری میں لکھی ہوئی عبارت تیزی سے نہیں پڑھی جاتی ہے ۔

کسی عبارت کو جلد لکھ لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے الفاظ کے لیے کم سے کم نقوش بنائے جائیں ورنہ جتنی زیادہ خدمت قلم کو انجام دینی پڑے گی اتنی ہی کم رفتار کتابت کی ہوگی ۔ اب ذرا لفظ «رہبر دکن» ناگری میں لکھیے रहबरे दाक्वन مقابلہ فرمائیے کہ قلم کو اردو کی بہ نسبت کتنا زیادہ کام کرنا پڑا اور کاغذ کا کتنا زیادہ حصہ صرف ہوا ۔ کتنی بڑی نادانی ہوگی کہ ہم اپنی روز مرہ کی ضروریات میں یہ رسم الخط استعمال کریں ۔

یہ ہے ناگری رسم الخط کی دقتوں کا مختصر بیان۔ زیادہ تفصیل کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ موقع۔ خدا نخواستہ اس بیان سے میرا مقصد صرف عیوب گنوانا نہیں (ورنہ فہرست اس سے بہت زیادہ طویل ہوتی) بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بعض اردوداں احباب جو یہ سمجھتے ہیں کہ ناگری رسم الخط آسان ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ ان پر واضح ہوجانا چاہیے کہ ناگری رسم الخط اس قابل ہرگز نہیں کہ اسے ہندستان کی عام زبان کا رسم الخط قرار دیا جاسکے۔ مجھے معلوم ہے کہ اردو رسم الخط میں باوجود بیش بہا خوبیوں کے کچھ عیوب بھی ہیں جن کی اصلاح کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیے۔ مگر اس کا یہ حل کسی طرح نہیں ہے کہ اس سے زیادہ مشکل اور نا کام رسم الخط اختیار کرکے اپنی دقتوں میں اضافہ کر لیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو کی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے اور جو شخص ان میں سے کسی ایک رسم الخط کی حمایت کرتا ہے وہ فرقہ‌پرست ہے۔ مجھے اس بیان کے دوسرے جز سے اتفاق نہیں کیوں‌کہ اگر یہ کلیہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مہاتما گاندھی جی مہاراج کی ہندی ساھتیہ سمیلن کے متعلق مساعی جمیلہ کو کیا کہا جائے گا؟

میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زبان اور اس کے رسم الخط پر محض رسم الخط کے حسن و قبح کی بنا پر لکھا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت قوموں کی روایات اور ان کے رجحانات کا کوئی سوال نہیں ہے اگرچہ میں ان سوالوں کو جواہرلال جی کی طرح نا محدود اور غیرضروری نہیں سمجھتا کہ واقعات اور حقائق کی دنیا تصورات اور لکچروں کی دنیا سے بہت مختلف واقع ہوئی ہے۔ چند افراد کو روایات و رجحانات سے الگ کرکے دوسری جگہ کھڑا کیا جا سکتا ہے، مگر پوری قوم کو اس کی روایات اور اس کے رجحانات سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ لیکن پھر بھی کم از کم اس وقت میرے پیش نظر صرف آسانی اور خوبی کا سوال ہے۔ حمایت اور مخالفت دونوں میری حد نظر سے اس وقت باہر ہیں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ہندستان کے تمام ہندی ادارے اس رسم الخط کو سنسکرت کا مخصوص رسم الخط قرار دیں اور مذہبی تعلیم کا لازمی

جز سمجھیں جیسا کہ ہمیشہ سے یہ ہندستان میں رہا ہے۔ میں اس رسم‌الخط کو ہندوؤں کے لیے اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا ان کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی زبان کو کہ مذہب مشرق کے لیے چھوڑ دینے کی چیز نہیں۔ باقی رہی ہندستان کی مروجہ بولی تو اس کے لیے اردو رسم الخط سب سے اچھا رسم الخط ہے۔

لاطینی خط

دوسرا سوال لاطینی رسم الخط کا ہے؛ بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ اردو کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا جائے تاکہ طباعت میں آسانی ہوجائے اور حرکات کی دقت سے بھی چھٹکارا ملے۔ اس میں بھی وہی ہوا ہے کہ پتھر کی طباعت کا سارا بوجھ اردو رسم الخط پر ڈال دیا گیا ہے ورنہ کوئی دقت ہی نہ تھی۔ مصریوں کی طرح ہمارے پریس بھی ترقی یافتہ ہوتے، جاپان کی طرح ہمارے اخبار بھی ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں چھپ سکتے۔ لیکن لاطینی رسم الخط انگریزی اور دوسری یوروپین زبانوں کے لیے کارآمد ہوگا، ہماری زبان کے لیے کارآمد نہیں۔ میں اس رسم الخط کے بارے میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ خود ملاحظہ فرما لیجیے کہ اردو کے لیے لاطینی رسم الخط بہتر ہوگا یا نہیں؟

آواز و حروف

خط لاطینی جب کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یوروپین زبانوں کا موجودہ رسم‌الخط ہوتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ لاطینی زبان مدت ہوئی کہ ختم ہوگئی۔ آج دنیا کے کسی حصے میں کہیں بولی نہیں جاتی۔ کہتے ہیں کہ روما کے گردو نواح میں کوئی قبیلہ لاطین نام کا آباد تھا؛ یہ زبان اصل میں اسی قبیلے کی زبان تھی۔ رومن سلطنت کی ترقی کے ساتھ پھیلی، پھلی اور پھولی۔ رومن شہنشاہیت کے پارہ پارہ ہو جانے کے ساتھ ہی زبان بھی پارہ پارہ ہوگئی اور آج بر اعظم یورپ کی تمام زبانوں میں لاطینی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لاطینی زبان ختم ہوگئی۔ اب رہی سہی جو کتابیں اس زبان میں رہ گئی ہیں ان کا یہ حال ہے کہ انگریز انگریزی تلفظ میں پڑھتے ہیں اور فرانسیسی فرنچ تلفظ میں۔ اطالیہ کو اصرار ہے کہ ان حروف کا صحیح تلفظ اطالوی زبان میں ہے اور یونانی مدعی ہیں کہ صحیح ہم ادا کرتے ہیں۔ ایک

حرف علت O کو لیجیے - انگریز گولائی لیے ہوئے بلند آواز نکالتے ہیں، کبھی محض زبر کی اور کبھی ان دونوں سے مختلف محض واو ماقبل ضمہ کی؛ لیکن اطالوی کہتے ہیں کہ اس کی صحیح آواز الف مقصورہ کی ہے - چناں چہ ان کے یہاں اس کی یہی آواز رائج ہے - اسی طرح حرف V انگریزی میں صرف واؤ کی آواز دیتا ہے اور جرمن میں 'ف' کی - H انگریزی زبان میں کبھی (ہ) کی آواز دیتا ہے اور کبھی بےآواز رہتا ہے مگر اطالوی زبان میں یہ حرف 'کاف' کی ذرا پُر آواز دیتا ہے - اس لیے یہ کہنا کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا جائے اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک یہ واضح نہ کردیا جائے کہ یورپ کی موجودہ زبانوں میں سے آواز کے بارے میں کس کا طریقہ اختیار کیا جائےگا اور اگر ایسا نہیں تو یہ طے کردیا جانا چاہیے کہ ہم اپنی زبان کے لیے حروف کی آوازیں خود متعین کریں گے؛ اس بارے میں کسی زبان کی پیروی نہیں کی جاے گی کیوں کہ لاطینی رسم الخط، لاطینی زبان کی آوازیں کھو چکا ہے اور ایک ہی حرف مختلف بولیوں میں مختلف آوازیں دیتا ہے -

میں سب سے پہلے، پہلی شکل کو لیتا ہوں - یعنی اردو کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرتے ہوئے ہم انگریزی، اطالوی، فرانسیسی، جرمن، اسپینش یا یونانی زبانوں میں سے آواز کے بارے میں کسی ایک کی پیروی کریں - مثلاً انگریزی زبان کو نمونہ بنائیں اور اسی پابندی کے ساتھ اردو زبان کو لکھا جائے تو ہمیں دیکھنا پڑےگا کہ حروف اور آواز کے درمیان صحیح تطابق بھی رہتا ہے یا نہیں کیوں کہ انگریزی زبان میں جتنی آوازیں ہیں اردو زبان میں اس سے کہیں زیادہ آوازیں پائی جاتی ہیں - انگریزی میں حروف صحیح کل اکیس (۲۱) ہیں مگر آوازیں چونتیس (۳۴) ہیں - باقی تیرہ (۱۳) آوازوں کے لیے مختلف قسم کے مرکبات سے کام لیا جاتا ہے مثلاً Ch چ، Sh ش، Th ت یا د وغیرہ - اور پانچ حروف علت ہیں جن سے سولہ (۱۶) آوازیں پیدا کی جاتی ہیں - ان کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے بلکہ تلفظ کے بارے میں صرف سماعیات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جیسے
A- Father ‘ Fan اور Day میں ۔ E- Me ‘ Mend اور Here میں I- Tide ‘ Pin
اور Machine میں O- Pot ‘ Bold اور Storm میں U- Tube ‘ Put ‘ Tub اور Burn

میں ۔ ان آوازوں کو ممتاز کرنے کے لیے تین طرح کے نشانات ڈکشنریوں میں رائج ہیں لیکن U پر ایک چوتھی طرح کا نشان بھی استعمال کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ حرف مختلف الفاظ میں چار آوازیں دیتا ہے ۔

انگریزی کے تین حروف C ' X اور V کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن چ کی آواز کے لیے C کو رکھنا پڑے گا ۔ اس طرح کل (۲۴) حروف ہم کو ملیں گے ۔ ان میں غ ' خ ' ت ' ش ' ڑ اور د کے لیے چھے حروف کا اور اضافہ فرمائیے؛ کل (۳۰) حروف ہوتے ہیں ۔ ان (۲۹) حروف سے اردو زبان کی تمام آوازیں ادا نہیں ہوسکتیں ۔ اردو زبان میں (۸۲) آوازیں ہیں جو ہمارے موجودہ رسم الخط سے مفرد و مرکب صورتوں میں ادا کی جاتی ہیں اور بعض میں حرکات سے کام لیا جاتا ہے ۔ مفرد جیسے با ' مرکب جیسے بھا اور حرکات سے جیسے آ ' بھ ' پھ وغیرہ کے لیے تو انگریزی حروف میں بھی حرف H ملا کر مرکب تیار کیا جائے گا ' مگر حرکات کے لیے رومن تحریر کے نشانات کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور اس صورت میں ہم اردو حروف پر اعراب لگانے سے کم دقت میں نہیں پڑتے ۔ پھر رسم الخط بدلنے سے ہمارا کیا فایدہ ہوا؟ ہم لکھنے پڑھنے اور طباعت میں اس سے کم ٹکڑوں سے کام نہیں لے سکتے ۔

اگر رسم الخط بدل کر ٹھیک اسی طرح لکھا گیا جیسا کہ آج رومن تحریر میں لکھا جاتا ہے تو موجودہ رسم الخط کی بہ نسبت زیادہ مشتبہ اور دقت طلب رہے گا ۔ اگر آپ اس کا نمونہ دیکھنا چاہیں تو لاطینی رسم الخط میں چھپی ہوئی کتاب ملاحظہ فرمائیں ۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں ایک کتاب Aenimal Maenejment کے نام سے شائع ہوئی تھی' اس کا ایک نسخہ اس وقت میرے سامنے ہے ۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۳ پر ایک عبارت اس طرح لکھی ہوئی ہے :—

yeh bara chhota bedaul ya maddham hota hai
یہ بڑا چھوٹا بےڈول یا مدھم ہوتا ہے

اسی کتاب میں مندرجۂ ذیل الفاظ اس طرح لکھے ہوئے ہیں :—

Zakhm, Kharab, Ghora, Ghaur, Khub, Chhup, Abdulhai
زخم خراب گھوڑا غور خوب چھپ عبدالحي

اس سے قطع نظر کرکے کہ مندرجہ بالا تحریر میں جگہ، محنت اور وقت زیادہ صرف ہوا ہے۔ صرف اس بات پر غور فرمائیے کہ آوازیں تمام ادا ہوگئیں یا نہیں؟ اور التباس لفظی کی کتنی گنجائش رہتی ہے۔ ت ٹ، د ڈ، ر ڑ، کھ خ، گھ غ، واؤ ماقبل ضمہ اور صرف ضمہ سب ایک دوسرے سے مل گئے۔ نام عبدالحی کو اس طرح لکھا گیا کہ جملہ خبریہ «عبدل ہے» اور نام عبدالحی میں کوئی فرق باقی نہ رہ سکا۔

اگر اردو کے لیے لاطینی رسم‌الخط اختیار کرنے کا یہی مطلب ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا پڑھنا تو غیر اردوداں، بلکہ اچھے اردوداں کے سوا دوسروں کے لیے بہت زیادہ مشکل ہے۔ مندرجۂ بالا کتاب ۴۱۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر ہر صفحہ بلکہ ہر سطر ایسے التباس سے بھری پڑی ہے جس کے پڑھنے کے لیے اردو کے الفاظ و معانی کا یاد رہنا ضروری ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ حروف و آواز میں تطابق ہم خود قائم کریں۔ کسی دوسری زبان کی آوازوں کا خیال ہی نہ آنے دیں تو اس کے لیے لاطینی رسم‌الخط کی ہی کیا تخصیص ہے چینی و جاپانی، عبری و سریانی خطوں سے بھی یہی کام لیا جا سکتا ہے، بلکہ تمام دنیا کے خطوں کو چھوڑ کر ایک بالکل نیا اور اچھا رسم‌الخط بھی ایجاد کیا جا سکتا ہے جس میں لاطینی حروف کی طرح التباسات نہ ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ ہم جو خط بھی بنائیں گے اس کے حروف کی تعداد ۸۲ سے کم نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد تعلیم و تحریر وغیرہ میں جو دقتیں ہوں گی وہ ظاہر ہیں۔

دنیا کی کسی زبان کی آوازوں پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ آوازوں کی ابتدائی اور بڑی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو حروف صحیحہ کی آواز کہلاتی ہے، جیسے ب، پ، یا P, B وغیرہ کی آوازیں۔ دوسری وہ آوازیں جو جوف دہن سے نکالی جاتی ہیں اور حروف علت کی آوازیں کہلاتی ہیں، جیسے اَو، اُو اِی، اَے، آ وغیرہ۔ حروف صحیحہ کی آوازیں حنجرہ کی کسی نہ کسی جگہ سے شروع ہوتی ہیں لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ان کو دوسری قسم کی آوازوں سے ملائے بغیر ادا کیا جاسکے۔ ان کی ادائی دو طرح پر ہوتی ہے؛ اول حرف علت کی آواز سے شروع

ہو کر حرف صحیح پر ختم ہوتی ہے، جیسے اب، آب وغیرہ دوسری طرح حرف صحیح سے شروع ہوکر حرف علت پر ختم ہوتی ہے، جیسے بِ با وغیرہ۔

اب ذرا غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ مختلف زبانیں صحیح حروف کی آوازوں میں بہت زیادہ اختلاف رکھتی ہیں، مثلاً ع، ح، ض، ظ وغیرہ آپ کو آرین گروپ کی زبانوں میں نہیں ملتے، اسی طرح پ، چ، ژ، گ، ٹ، ڈ، ڑ آپ سامی زبانوں میں نہیں پاسکتے۔ مگر جوف دہن سے پیدا ہونے والی آوازوں یعنی حروف علت کے معاملہ میں کم و بیش تمام زبانیں برابر ہیں۔ سب کے ہاں معمولی اختلاف کے ساتھ یہ آوازیں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے حروف صحیحہ کی کمی بیشی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی کیوں کہ کوئی زبان اپنے ان حروف میں اختصار نہیں کرسکتی، چار و ناچار ان حروف کو رکھنا ہی پڑے گا۔ مثلاً اردو کے لیے اگر آپ لاطینی رسم الخط اختیار کرلیں تو بھی نون غنہ کے لیے آپ کوئی نہ کوئی نشان بنانے پر مجبور ہیں۔ رسم الخط میں تمام تر اہمیت ان ہی حروف علت اور ان کی آوازوں کو دی جاتی ہے کہ تمام دوسرے حروف کی آوازوں کی ادائی کا دارومدار ان ہی حروف کی آوازوں پر ہے۔

ان حروف کے لیے مختلف خطوں میں مختلف قاعدے بنائے گئے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کسی زبان کا قاعدہ بھی پوری طرح مکمل و درست نہیں۔ بعضوں نے اس کے لیے حروف مقرر کیے ہیں، جیسے لاطینی رسم الخط میں پانچ واواز (Vowels) ہیں۔ لیکن دقت یہ پڑتی ہے کہ ان حروف میں ہر ایک سے کئی کئی آوازیں پیدا کیے بغیر کام نہیں چلتا بلکہ بڑی حد تک سماعیات اور تقالید پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حرف (U) Put، Tube اور Burn میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف آوازیں دیتا ہے اور اس اختلاف کے لیے کوئی کلی قاعدہ موجود نہیں۔ بعض خطوں میں ان کے لیے نشانات مقرر کیے گئے ہیں جیسا کہ ناگری میں ہے۔ لیکن ان میں بھی وہی دقت پیدا ہوتی ہے، نقوش آواز کا اور آواز نقوش کا ساتھ نہیں دیتی۔ تلنگی، کنڑی، ملیالم اور برمی میں بھی یہی عیب ہے۔ اب سب سے کم بری

شکل یہی رہ جاتی ہے کہ ان آوازوں میں سے موٹے موٹے فرق کے لیے تو نشانات مقرر کر لیے جائیں اور اس کی پابندی کی جائے کہ نقوش اور آواز کی ترتیب میں فرق نہ ہونے پائے۔ باقی اختلافات کے لیے کسی حد تک سماعیات پر بھروسہ کیا جائے۔ اس میں کئی طرح کے فائدے ہیں۔ لکھنے اور پڑھنے میں محنت کم صرف ہوتی ہے۔ کاغذ اور قلم کی خدمت بھی نسبتۃً کم رہ جاتی ہے۔ اس وقت یہی طریقہ تمام ان زبانوں میں رائج ہے جو سامی خط میں لکھی جاتی ہیں، مثلاً عبری، آرامی، سریانی، عربی، اردو، فارسی، پشتو، کمک، کردی، ملائی، نوبین وغیرہ۔

تعلیم

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاطینی حروف مفرد صورت میں لکھے جاتے ہیں، اس لیے اس کی تعلیم اردو حروف کی تعلیم سے زیادہ آسان ہوگی، اور یہ آسانی ہوگی کہ بچوں کو بہت ہی کم شکلیں یاد کرنی پڑیں گی، حالانکہ واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ اگر اردو کے لیے لاطینی رسم‌الخط اختیار کرلیا گیا تو بچوں کو اردو مفرد حروف اور جوڑوں سے کہیں زیادہ اشکال یاد کرنی پڑیں گی۔ اس وقت لاطینی حروف کی تعداد (۲۶) ہے۔ ان میں کم سے کم غ، خ، ت، ژ، د، ش چھے حرفوں کا اضافہ کیجیے تو ان کی تعداد ۳۲ ہوگئی، دو حرف C، X ہمارے بےکار ہیں ان کو نکال دیجیے۔ باقی رہ گئے (۳۰) ان میں حروف علت کے ۱۶ نشانات کا اضافہ کیجیے کل (۴۶) اشکال ہوئیں۔ ہر ایک کے چھوٹے Small اور بڑے Capital حروف ہوں گے، (۹۲) شکلیں ہوگئیں، اس کے بعد لکھنے کے حروف اور ہوں گے اور طباعت کے اور، تو یہ تعداد (۱۸۴) ہوتی ہے؛ ہر ہندوستانی بچے کو ۱۸۴ شکلیں حروف کی یاد کرنی پڑیں گی۔ پھر یہ شکلیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوں گی کہ آپ یکسانی کا خیال بھی نہیں کرسکتے۔ D اور d، G، g میں جو اختلاف ہے وہ دیکھ لیجیے۔

آپ کسی بچے کو اردو کا قاعدہ پڑھادیں اس کے بعد کوئی خوش خط لکھی تحریر دے دیں، صاف پڑھ دے گا۔ لیکن اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں عمروں کے تفاوت کو خیال میں رکھنا چاہیے، بڑی عمر کے افراد انگریزی حروف اگر آسانی سے سیکھ سکتے ہیں تو اردو حروف اس سے کہیں زیادہ آسانی سے سیکھ لیتے ہیں؛ اردو میں

حروف کے جو جوڑ استعمال ہوتے ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا جوڑ ہو جو اپنے اصل مفرد حرف سے بہت زیادہ مشابہت نہ رکھتا ہو ۔ اس کی وجہ سے یاد کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، اس کے سوا اردو حروف کی شکلوں میں نمایاں یکسانی پائی جاتی ہے، ج، ح، خ، ب، پ، ت، ٹ، ث وغیرہ میں دیکھ لیجیے یہ یکسانی تعلیمی نقطہ نظر سے بڑی گراں قدر چیز ہے ۔ حافظہ پر بہت ہی کم بار ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بچہ آسانی سے حروف کی شکلیں یاد کرلیتا ہے، اس کے برخلاف لاطینی رسم الخط میں اس قسم کی یکسانی آپ نہیں پاسکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اردو حروف کو انگریزی حروف کی بہ‌نسبت جلدی اور آسانی سے یاد کرلیتے ہیں ۔

میں نے کچھ دنوں خوش‌نویسی کی مشق کی ہے ۔ اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں انہیں بھی دیکھا ہے ۔ آپ بھی ملاحظہ فرما لیجیے ۔ صرف چار طرح کی مختلف لکیروں اور تین قسم کے نقطوں سے اردو کے سارے حروف بن جاتے ہیں ۔ مسٹر یشور چندر ودیاساگر مشہور بنگالی معلم نے اپنی کتاب میں انگریزی حروف کی مشق کے لیے اسی طرح کے خطوط سے کام لینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکے ۔ ۱۹ قسم کے خطوط قایم کرنے پڑے، مگر پھر اس کے ذریعے انگریزی کے تمام حروف کی مشق ممکن نہ ہوئی ۔

لاطینی حروف میں ایک بات یہ بھی تعلیمی اعتبار سے قابل لحاظ ہے کہ ان کی شکلیں اردو حروف کی بہ‌نسبت زیادہ الجھی ہوئی ہیں، جو یاد رکھنے میں خاصی تکلیف‌دہ ثابت ہوتی ہیں ۔ ش اور Sh‘ ز، Z‘ گ اور G میں جو فرق اس اعتبار سے ہے، ملاحظہ فرما لیجیے ۔

طباعت

طباعت کی آسانیوں کا خیال کرکے لاطینی رسم الخط اختیار کرلیے جانے کی تجویز جب پیش کی جاتی ہے تو پیش کرنے والے احباب کی نیتیں خیر کی ہوتی ہیں، اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ انگریزی طباعت کی طرح اردو میں بھی طباعت کا کام آسان ہوجائے اور اردو زبان کی ترقی میں اس کا جو ہاتھ ہوگا وہ ظاہر ہے ۔ لیکن اس مسئلہ پر بھی غور کرلینا چاہیے کہ حروف کی تعداد اردو کے لیے اتنی ہی نہیں رہے گی جتنی انگریزی زبان کے لیے مستعمل ہے

اردو کا پریس بلا شبہ بہت ہی بری حالت میں ہے۔ جدیدترین آلات طباعت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ اردو کا رسم الخط نہیں، بلکہ لیتھو کی طباعت ہے۔ پتھر کی طباعت کو چھوڑ دیجیے۔ نسخ ٹائپ خوبصورت سے خوبصورت ہر طرح کے دنیا میں تیار ملتے ہیں، خود ہندستان میں بھی بیسیوں جگہ تیار ہوتے ہیں؛ ان سے فائدہ اٹھائیے، ساری دقتیں ختم ہو جائیں گی۔ لینو ٹائپ، انٹر ٹائپ، روٹری پریس سب کچھ آسانی سے تیار ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے رسم الخط بدلنے کی ضرورت نہیں۔ مصر کو دیکھیے پریس نے کس قدر ترقی کرلی ہے۔ مصور اخبارات و رسائل، ۱۶ بلکہ ۱۸ بڑے بڑے صفحات کے روزنامے ہزاروں سے متجاوز تعداد میں چھپتے ہیں۔ اسی عربی رسم الخط میں تمام جدید سے جدید آلات طباعت سے کام لیا جا رہا ہے۔ اسی طرح جاپانی پریس کی حالت پر غور فرمائیے۔ رسم الخط ناقص ترین، مگر لاطینی رسم الخط اختیار کیے بغیر فن طباعت نے وہاں اتنی ترقی کرلی ہے کہ ایشیا تو ایشیا یورپ کے بھی کم ممالک مقابلہ میں پیش کیے جاسکیں گے۔

اردو طباعت کے متعلق شکایت ہے کہ دو چار ہزار فرمے نکالنے کے بعد حروف چھن جاتے ہیں۔ بڑی تعداد میں کچھ چھاپنا ممکن نہیں، تصحیح اچھی طرح نہیں ہو سکتی، کہیں پر سے کوئی سطر یا پیرا گراف نکالنا ہو تو آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا، تصاویر مضامین کے ساتھ نہیں چھپ سکتیں، جلد کتابت نہیں ہوتی، کتابت میں یکسانی نہیں رہتی، سلف کمپوزنگ مشینوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ان شکایتوں پر غور فرمائیے، شکایتیں بالکل درست ہیں۔ لیکن ان کا بار پتھر کی چھپائی پر پڑنا چاہیے نہ کہ رسم الخط پر، رسم الخط کا اس میں کوئی قصور نہیں، اگر لاطینی رسم الخط کو بھی آپ لیتھو میں چھاپیں تو یہی دقتیں رہیں گی۔

اگر اردو کے لیے نسخ اردو ٹائپ کی طباعت اختیار کرلی جائے تو لاطینی حروف کی بہ نسبت زیادہ کارآمد اور مفید ہوگی، نسبۃً سستی بھی پڑے گی، کاغذ کم صرف ہوگا، کمپوزیٹر کو کام کم کرنا پڑے گا، مثلاً ایک لفظ «بشیر» کو لیجیے اس کے لیے اردو میں کمپوزیٹر کو چار مرتبہ ہاتھ چلانا پڑے گا،

ر	ی	ش	ب
۴	۳	۲	۱

مگر

لاطینی میں سات بار حرف اٹھانا ہوگا

B	A	S	H	E	E	R
۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱

ظاہر ہے کہ محنت اور کاغذ زیادہ صرف ہوں گے اور کتاب گراں پڑے گی۔

میں نے ایک مشہور پریس سے ایک رسالہ کی طباعت کے متعلق اخراجات کا تخمینہ طلب کیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ رسالہ اردو ٹائپ میں طبع کیا جائے تو اخراجات کیا ہوں گے اور اگر اسے لاطینی (رومن) میں چھاپا جائے تو کیا خرچ ہوگا؟ معلوم ہوا کہ اردو ٹائپ کی بہ نسبت رومن میں ۳۷ فی‌صدی اخراجات بڑھ جائیں گے، کچھ تو کاغذ زیادہ صرف ہوگا اور کچھ اجرت تسطیر حروف (کمپوزنگ) زیادہ ہوگی۔ تسطیر کی اجرت کارندے کی کارگزاری پر ہوتی ہے اور جو عبارت اردو کے ایک صفحہ میں آتی ہے، وہ رومن کے تقریباً دو صفحات میں آئے گی۔ چونکہ انگریزی حروف کی اجرت تسطیر نسبۃً کم ہوتی ہے اور اردو کی زیادہ، اس لیے اضافہ صرف ۳۷ فی‌صدی ہوا ورنہ کہیں اجرتیں برابر ہوتیں تو لاگت تقریباً ۷۵ فی‌صدی بڑھ جاتی۔ اس کمی بیشی کا خیال رکھتے ہوئے غور فرمائیے کہ ہمارے لیے تجارتی حیثیت سے کون سا رسم الخط مفید ثابت ہوگا اور کس میں کتابیں سستی تیار ہو سکیں گی؟

عام ضروریات

عام ضروریات تمدن کا لحاظ کرتے ہوئے بھی کسی رسم الخط پر غور کیا جانا چاہیے، مثلاً رسم الخط میں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ تیزی کے ساتھ لکھا اور پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں، آپ کو معلوم ہے کہ مختصر نویسی کی ابتدا صرف اسی ضرورت کی بنا پر ہوئی۔

کسی خط کے لکھتے وقت قلم کو جتنا زیادہ کام کرنا پڑے گا اتنا ہی زیادہ وقت محنت اور کاغذ صرف ہوگا۔ دنیا میں مختصر نویسی کی بنیاد اسی اصول پر ہے اور ہمیشہ مختصر نویسی میں بڑے بڑے الفاظ تک کے لیے چھوٹے سے چھوٹے نقوش بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو اور لاطینی رسم الخط کا اس حیثیت سے مقابلہ کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جو دونوں رسم الخط

سے واقف ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ لاطینی حروف زیادہ جگہ، زیادہ محنت اور زیادہ وقت لیتے ہیں، اس لیے کہ اردو کی بہ‌نسبت لاطینی حروف لکھنے میں قلم کو دوگونہ خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر اخبار «رہبر دکن» کے نام کو دیکھ لیجیے۔ رہبر دکن Rahbar-i-Dakkan.

عام ضروریات کے سلسلے میں ایک سوال ہندستان کے ہمسایہ ممالک سے تعلقات کا بھی آتا ہے۔ ہندستان کے ہمسایہ ممالک میں سے اکثر میں عربی رسم الخط رائج ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ بابو سوباش چندر بوس صدر کانگریس نے اپنے خطبۂ صدارت میں اسی بات کو لاطینی رسم الخط اختیار کیے جانے کی دلیل میں پیش فرمایا۔ آپ نے ہری پورہ کانگریس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوے فرمایا کہ ہمیں بہرحال اپنے گرد و پیش کے ممالک سے تعلقات قایم کرنا ہیں اس لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرلینا چاہیے۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ ہمسایہ ممالک سے مادی و معنوی، تجارتی و اقتصادی تعلقات کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال ہمیں ایک زندہ قوم کی طرح زندہ رہنا ہے اور زندہ قومیں دوسرے ممالک سے ہر زمانے میں بہت کچھ لیتی دیتی رہتی ہیں۔ سینکڑوں الفاظ، بیسیوں قواعد، ہزاروں عادات اور لاکھوں قسم کی اشیائے تجارت اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی قوم اپنے ہمسایہ ممالک سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے گرد و پیش کے وہ کون سے ممالک ہیں جہاں لاطینی رسم الخط رائج ہے، شام میں، عراق میں، لبناں میں، ایران میں، افغانستان میں، سواحل خلیج فارس میں، تبت میں، چین و جاپان میں، یہی وہ ممالک ہیں جو ہندستان کے قریب ترین ممالک کہے جاسکتے ہیں؛ ان میں سے کہیں بھی لاطینی رسم الخط رائج نہیں بلکہ اکثر جگہ عربی رسم الخط جاری ہے۔

بلا شبہ اس وقت تمدن کا مرکز یورپ ہے اور یورپ کا رسم الخط لاطینی ہے، لیکن افریقہ و ایشیا کے آزاد و نیم آزاد ممالک میں وطنی احساسات جس تیزی کے ساتھ انقلابات پیدا کر رہے ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ ایران نے فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کا استعمال قلمرو میں ممنوع قرار دیا۔ مصر میں دوسری زبانوں کا استعمال دفاتر میں

ممنوع ہے، حتی کہ نہر سویز کے دفتر کو بھی عربی میں مراسلات کرنے پر مجبور کیا گیا۔ عراق میں دفاتر سے دوسرے حروف و زبان رخصت کردی گئی؛ شام و لبنان میں عربی کے علاوہ دوسری زبان کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہی حال افغانستان کا ہے کہ سرکاری طور پر فارسی کے سوا دوسری زبان مسلم نہیں۔ حبشہ کی سرکاری زبان عربی قرار پائی، طرابلس، برقہ، اور سمالی لینڈ میں پہلے ہی سے تھی۔ غرض کہ تمام وہ ممالک جہاں عربی رسم الخط رائج ہے، لاطینی کو بدر کر رہے ہیں۔ ہم سے قریب ترین براعظم افریقہ ہے جہاں کا عمومی رسم الخط عربی ہے، ایشیا میں شمال مشرقی ایشیا کے علاوہ تمام عربی رسم الخط رائج ہے، روس کے ایشیائی مقبوضات کے بڑے حصے میں یہی رسم الخط ہے۔ اس وقت مندرجہ ذیل زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔

عربی، فارسی، اردو، پشتو، بلوچی، سندھی، امہری، کریمی، ہوسنہ، جاوی، قازانی (روس)، کمک، کردی، ملالی، میندنیکو، نوبین اور نوکائی۔

ان میں سے ایک عربی ہی کو لیجیے، مغربی ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھائی ہوئی ہے ان ممالک میں یوروپین کمپنیاں بھی ہیں لیکن اشتہارات اور مقامی کاروبار عربی میں کرتی ہیں۔ اس لیے ہمارا یہ خیال صحیح نہیں ہوسکتا کہ لاطینی حروف اختیار کرلینے سے ہمسایہ ممالک سے تعلقات قایم کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی، بلکہ اس حیثیت سے تو موجودہ اردو رسم الخط کا باقی رکھنا ہی سب سے بڑی دانائی ہوگی۔

---

*

*

بسمل فیض آبادی

اور

اودھ کی سب سے قدیم مثنوی

از

(مولوی عبدالباری صاحب آسی)

اصناف سخن میں جس پر اہل عجم کو ایجاد و اختراع کا فخر حاصل ہے وہ مثنوی کی صنف ہے - یہی وہ چیز ہے جو عرب کی شاعری میں نہیں ہے اور ایرانیوں کے یہاں اس کثرت کے ساتھ موجود ہے کہ اسی میں ان کے تمام علمی و اخلاقی جواہر کا خزانہ محفوظ ہے - رہی اردو کی شاعری وہ درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند کے ذیل میں ہے - یعنی جو کچھ فارسی میں ہے وہ اس میں بھی ہے - اس لیے کوئی وجہ وجیہ نہیں تھی کہ اس میں بھی مثنوی نہ کہی جاتی - کہی گئی اور اتنی کہ اب اردو میں اس صنف کا اتنا ہی سرمایہ موجود ہے جتنا کہ فارسی میں تھا - یہ اور بات ہے کہ فارسی زبان کی عمر سے اردو کی عمر بہت کم ہے - اس لیے ایرانیوں کو اپنا خزانۂ ادب معمور کرنے کا زیادہ موقع ملا اور اردو والوں کو کم، مگر اصولی طور پر حساب کیا جائے تو دونوں کی میزان برابر آئے گی - اس طرح ایرانیوں نے اس صنف کی وسعت اور گنجایش پر نظر کرتے ہوئے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا - چنانچہ اخلاقی، تاریخی، معاشرتی، مزاحی، عاشقانہ سب قسم کے مضامین کی مثنویاں لکھی گئیں - حدیقۂ حکیم سنائی، منطق الطیر، جوہرالذات فریدالدین عطار، شاہنامہ فردوسی،

بوستان سعدی، یوسف زلیخائے جامی وغیرہ کو ایک تاریخی تبصرہ کرنے والا یا نقاد قیامت تک نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔

ہندوستانی شعرا کی کارپردازیوں پر جب نگاہ ڈالی جاتی ہے تو سب سے پہلے وہ خرابی نظر آتی ہے جو اصولاً ہونا چاہیے۔ یعنی یہاں کے بزرگوار با کمال اول اول تو فارسی ہی میں شعر کہا کیے اس واسطے ان کی تمام عرق‌ریزیاں دوسری زبان کی نذر عقیدت ہوگئیں اور ہر چند کہ آج نلدمن فیضی، مثنوی غنیمت، مثنوی ناصرعلی، مثنویات بیدل وغیرہ اپنی جگہ پر ان‌مول موتی ہیں اور ہم ان کو دیکھ کر گاہے گاہے خوش بھی ہو جاتے ہیں، مگر اپنا مال نہیں کہہ سکتے اسی واسطے وطنیت کے اظہار کمال کا جوش و خروش دل سے زبان تک نہیں آتا۔ اس بلا سے جو کوئی اس دور میں بچا بھی تو وہ ہندی بھاشا کی زد میں آگیا۔ چنانچہ ملک محمدجایسی کی پدماوت اور قاسم‌شاہ کی ہنس‌جواہر اب ہمارے کسی کام نہیں آسکتیں۔ اور اردو کے ذیل میں‌داخل کرنے کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی۔ اور ہرچہ از دزد ماند، رمال برد کہہ کر ماتم کیے بغیر کام نہیں چلتا۔

اس اتفاق کو بدقسمتی بھی کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے قدیم ترین اور دور اول کے شعرا کا کلام برباد ہوگیا اس لیے اب یہاں سے بحث کرنا ہی بےکار ہے ورنہ یہ مسئلہ کچھ تاریکی میں نہیں ہے کہ 'ولی' جو ایک حیثیت سے شعرائے اردو کا ابوآلابا تسلیم کیا جاچکا ہے، دلّی آکر شاہ سعداللّٰہ گلشن دہلوی کو اپنی استادی اور رہنمائی کے لیے منتخب نہ کرتا۔ خدا معلوم اس سے پہلے کتنے شعرا ملکی زبان مین شعر کہتے ہوئے دلی کے وسیع قبرستانوں میں دفن ہوچکے ہوں‌گے تب کہیں سعداللّٰہ گلشن سے لوگ پیدا ہوئے ہوں‌گے جن سے ایسے بڑے بڑے لوگ مستفید و مستفیض ہونے کے خواہش‌مند ہوئے۔ بہرحال یہاں اس قضیہ نامرضیہ کو چھیڑنا کچھ موزوں نہیں اس لیے سلسلہ کلام پھر وہیں سے شروع ہوتا ہے کہ جیسے اصناف ریختہ کے تمام آثار قدیمہ دکن میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح مثنوی کا بھی وہیں سراغ ملتا ہے، اور وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقاں سنہ ۱۰۱۵ ھ اور محمدقلی قطب شاہ

بادشاہ گولکنڈہ کی نعتیہ مثنوی سنہ ۱۰۱۸ ھ کی تصنیف ہونے کی وجہ سے سب سے پہلی مثنویاں مانی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سیف‌الملوک و بدیع‌الجمال، خاور نامہ، علی نامہ، پھول بن، بنگاب نامہ وغیرہ مختلف مضامین پر تصنیف ہوتی رہیں۔

دکن کی تصانیف کے بعد دلی کی نوبت آتی ہے۔ اگر افضل‌خان کی بکٹ کہانی کا کوئی ذکر نہ کیا جائے تو دلی میں اس وقت تک کی تحقیقات کی موافق شاہ مبارک آبرو اور مولوی سید محمد صاحب کی مثنویاں قابل ذکر ہیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس دور میں مشہور بھی ہوئیں۔ مگر اب ان کا کہیں پتا نہیں۔ اسی طرح ان کے دوسرے معاصرین کی تصانیف بھی نایاب ہیں اور یہاں مثنوی کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے یہ بڑی دشواری ہے کہ امتداد زمانہ نے اس کڑی کی کڑی کو غایب کر دیا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس دور میں کتنی مثنویاں لکھی گئیں، کتنی مشہور ہوئیں اور کتنی مصنفوں کے بستوں میں رکھی رکھی سڑ گئیں۔

حاتم کے عہد آخر کے ساتھ ساتھ میر و سودا کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اور اسی کے لگ بھگ مصحفی، رنگیں، انشا، جرات وغیرہ کا دور ہے۔ یہ زمانہ مثنویوں کی گرم بازاری کا ایک زریں زمانہ ہے۔ میر، سودا، مصحفی، میر حسن، قایم، رنگیں، جرات وغیرھم نے مختصر مختصر مثنویاں کہیں اور نہ صرف کہیں بلکہ ان میں کامیابی کی جھلک بھی نظر آئی۔ تنقیدی نگاہ ڈالنا اور نظر غایر سے مطالعہ کرکے کوئی رائے قایم کرنا تو مثنوی کے تذکرہ نویس کے لیے زیادہ موزوں ہے؛ ہم کو اس سے زیادہ کہنے کا حق نہیں کہ اپنی اپنی جگہ پر سب اچھی ہیں۔ ہاں میر صاجب کی مثنویوں کو کئی وجہوں سے ترجیح ہے اور وہ بہ حیثیت غزل‌گو ہونے کے اس صنف میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں اور مثنویاں بھی قابل ذکر ہیں۔ مگر مجھے کچھ اور کہنا ہے اس لیے یہ راستہ اختیار کرنا زیادہ موزوں نہیں۔

بد قسمتی نے جب طوایف‌الملوکی پھیلا کر دلی کو اجاڑا تو فیض‌آباد کا نصیبہ چمکا۔ یعنی وزیرالممالک نواب شجاع‌الدولہ کی قدردانی اور ذرہ‌نوازی نے بڑے بڑے اہل‌کمال کو یہیں کھینچ بلایا اور دلی کا پرتو یہیں نظر آنے لگا۔ ہر قسم کے

صنّاع، ہر طرح کے پیشہ‌ور، ہر صنف کے ہنرمند آ پہنچے - انھیں کے ساتھ سخن گویان و سخن سنجان بھی تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ بنتے بنتے فیض‌آباد چھوٹی سی دلی کہے جانے کا مستحق ہوگیا - سخن گوئی کی محفلیں گرم ہوئیں - گوشہ گوشہ سے آفرین و احسنت، واہ وا سبحان‌اللہ کے نعرے بلند ہوئے، کونے کونے سے شاعر ابلنے لگے - قصہ کوتاہ دلی والوں نے اودھ والوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا - اور یہ رنگ ایسا چڑھا کہ ہر کس و ناکس شاعر ہر قابل و ناقابل مدعی بن گیا - مگر تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل ہی تک یہ جوش و خروش رہا - دوسرے اصناف تک کسی کا خیال نہیں بڑھا کیوں‌کہ یہاں کوئی شاعرانہ قصیدہ گو دکھائی دیتا ہے نہ نثّار نہ مثنوی‌نویس، نہ کوئی مثنوی ہی ایسی ملتی ہے جسے اس دور کی یادگار سمجھ کر مثنویوں کی فہرست میں داخل کیا جائے - شدہ شدہ شجاع‌الدولہ بہادر کا زمانہ ختم ہوکر دور آصفی شروع ہوا - انھوں نے فیض‌آباد کی بجائے لکھنؤ کو اپنا مسکن قرار دیا اس لیے فیض‌آباد کے ذی‌ہنر بھی یہیں سکونت گزیں ہوئے - ان میں وہ شعرا بھی تھے جن کا مولد خاک پاک دہلی تھا اور وہ بھی تھے جو خاک اودھ ہی سے پیدا ہوئے -

مثنوی کی بحث ہے اس لیے مثنوی ہی کے متعلق لکھنا ہے جس کے متعلق سب سے ضروری بات یہ ہے کہ فضایل علی خاں تبعید نے ایک مثنوی لکھی جس میں اپنی بیتی حسن و عشق کی داستان نظم کی - سیدھا طرز بیان، جابجا صحیح جذبات کی ترجمانی - محبت کی کار پردازیوں کی تصویریں تھیں اس لیے خوب چمکی، لوگوں کے دل پر اثر کیا اور مقامی طور پر ادھر سے ادھر تک مشہور ہوگئی - کہتے ہیں کہ میر حسن دہلوی کے قلم میں بھی اسی کی شہرت نے جنبش پیدا کی اور انھوں نے بھی مثنوی سحرالبیان لکھی اور سنہ ۱۱۹۹ھ میں تمام بھی کردی - اس کی وہ شہرت ہوئی کہ گلی گلی اور کوچے کوچے میں یہی چرچا سنا جانے لگا - یوں تو اس مثنوی کا آغاز و اختتام لکھنؤ ہی میں ہوا، مگر ہندستان بھر میں اس کی دھوم مچ گئی - فصحائے زمانہ نے متفق‌اللفظ ہوکر صفائی، بلند پائیگی، محاورات کی برجستگی، روانی، صحت زبان، سلاست، اجزائی تناسب، تشبیہات و استعارات،

رسوم و رواج کے صحیح کی قدرت، خارجی اور داخلی پہلوؤں کی صحیح نقشہ کشی کا اس کو سارٹیفکیٹ دےدیا۔ انتہا یہ کہ کہنے والوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایک اس مثنوی کی بدولت وہ کمی پوری ہوگئی جو ریختہ میں مثنوی کے نہ ہونے سے پائی جاتی تھی۔ سب سے بڑی داد مصنف کو یہ ملی کہ بڈھے سے بچے تک اور مبتدی سے منتہی تک اس کی تعریف و توصیف میں رطب‌اللسان ہوتے ہوئے اسی طرز و انداز کی مثنویاں لکھنے لگے۔ جیسا کہ مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں صغیر علی مروت کے حال میں لکھا ہے:۔

"در هماں ایام که به رام پور بود یک دو داستان به رویۂ مثنوی میرحسن در سلک نظم کشیده با خود داشت و می‌خواست که آنها را به نظر مومی‌الیه میرحسن بگزراند۔ چوں در هماں ایام میر موصوف را سفر ناگزیر پیش آمد بسیار تاسف خورد و رفته رفته هماں چند فقره‌اش در یاد گردیدند یعنی در عرصۂ پنج شش سال روزهائے که از سفر بنارس در شهر بازآمد جواب مثنوی میرحسن را به معنی‌هائے مهیا گردانیده و بعد اتمام قصه به عرصۂ قلیل به هم‌سایگی اورا نویسانیده و صاف نموده اورا در معرض شهرت افگند۔ اکثر دوستانش نقل گرفتند۔ نازش شاعری او برهمیں مثنویست"۔

اس کے علاوہ اور مثنویاں بھی ہوں‌گی۔ گم‌نامی کی آندھی سب کو اڑا لےگئی اور اب ایک ورق بھی کسی کا باقی نہیں۔ پھر بھی اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سحرالبیان کو چراغ ہدایت بناکر اودھ والے بھی راہ بلاغت طے کرنے لگے اور مثنویوں پر مثنویاں لکھی گئیں۔ اگرچہ اس وقت تک جستجو کرنے کے بعد بھی کوئی مثنوی مل نہیں سکی جس کی وجہ سے اس قیاسی عمارت کے استحکام میں مدد مل سکے اور اس کو اس دور کی یادگار صحیح تسلیم کیا جائے کہ لکھنؤ و فیض‌آباد کے لیے سرمایۂ نازش بہم پہنچے۔ مثنوی سحرالبیان میر و سودا کی مثنویاں، جرات و انشا و مصحفی کی صناعیاں اگرچہ یہیں معرض ظہور اور عالم وجود میں آئیں مگر وہ یہاں کے خزانۂ ادب میں داخل نہیں ہو سکتیں بلکہ دھلی ہی کی طرف منسوب کی جائیں گی۔

مجھے مدت سے اس خلش نے بےتاب کر رکھا تھا کہ کیا قیامت ہے کہ ناسخ سے پہلے کا کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جو اودھ کا رہنے والا ہو اور اس کی کوئی مستقل تصنیف یا دیوان بھی موجود ہو جسے دیکھ کر اس وقت کے مذاق طبیعت کا اندازہ کیا جاسکے کیوں کہ ناسخ مرحوم کی اس سعی بےجا نے جسے یہاں کے لوگ صفائی زبان کہتے ہیں، اردو شاعری کا رنگ بدل کر اس کو حقیقت سے اتنا دور کر دیا کہ اس صناعی پر تباہ کاری کا دھوکہ ہونے لگا، پھر اگر ان کی عمل‌داری اور سکہ بیٹھنے کے بعد کی کوئی چیز ملے بھی تو کیا فائدہ۔ اصل مقصد کا اس سے کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس سعی پیہم کا اتنا تو نتیجہ ضرور ہوا کہ بعض فارسی کی چیزیں ملیں مگر وہ خارج از بحث تھیں۔ آخرکار سخت دشواریوں اور بےانتہا کوششوں کے بعد سنہ ۱۹۳۷ع کے ماہ دسمبر میں دو مثنویاں دست‌یاب ہوئیں جن میں ایک کا نام «پارسا نامہ» اور دوسری کا «حسن و عشق» ہے۔ پارسا نامہ اسی انداز اور اسی بحر میں لکھا گیا ہے جس میں میرحسن مرحوم کی مثنوی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۳ ہجری ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مثنوی میرحسن سے چودہ برس بعد لکھی گئی۔ دوسری مثنوی سنہ ۱۲۰۳ھ کی ہے۔ ہم بےتکلفانہ اور بےدھڑک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ اس دور کی خالص یادگار اور سب سے پہلا نقش اگر کوئی ہے تو وہ یہی مثنویاں ہیں۔ اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ان سے پہلے کوئی مستقل تصنیف اس وقت تک دست‌یاب نہیں ہوسکی۔

یہ مثنویاں بسمل فیض‌آبادی کی لکھی ہوئی ہیں اور اس لیے ضروری ہے کہ بسمل کے حالات سپرد قلم کرکے ان کی حیثیت شاعرانہ کا اظہار کردیا جائے

(بسمل فیض‌آبادی)

کون روئے ان بدقسمتوں کے طالع ناسپاس کو جنھوں نے اپنی پوری عمر کسی خاص فن کی کاوش ترقی میں صرف کردیں اور پھر بھی

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ‌اند کز ہستیش بروئے زمیں یک نشاں نماند

کی زد میں آ گئے ۔ دور کیوں جائیے، قضیہ زمین برسر زمین کی مصداق یہیں دیکھیے کہ چھوٹے بڑے سیکڑوں تذکرے اردو میں موجود ہیں اور بسمل تخلص کے دو چار شعرا کا ذکر بھی ہر ایک میں موجود ہے مگر بسمل فیض‌آبادی جو اس مضمون کا زیب عنوان ہے، کہیں بھی نہیں۔ بقولے :-

بزم میں یوں تو ہیں سبھی اپنے بھی اور غیر بھی
جس کی مجھے تلاش ہے اس کا کہیں پتا نہیں

ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے میرحسن نے فیض‌آباد کے دو بسمل پیش کیے بھی تو کون ایک گداعلی بیگ جن کی نسبت فرماتے ہیں کہ " شعر بلندش بہ سمع نرسیدہ "۔ مگر اس کے ساتھ ہی دیمک نامہ کے کچھ شعر بھی دے‌دیے ہیں جو ان کی کوئی بوسیدہ تصنیف ہوگی۔ اسی طرح خم‌خانہ جاوید جو تذکرہ کیا شعرائے قدیم و جدید کی فہرست ہے، عنایت‌علی بسمل فیض‌آبادی کا ذکر کرتے اور ان کو شاگرد آتش قرار دیتے ہیں مگر اس بسمل کا کہیں ذکر بھی نہیں جس کا ادب اور زبان پر کافی احسان ہے اور جس پر فیض‌آباد کے ساتھ ہی اودھ کو ممنون ہوکر ان کو اس اولیت کی داد دینا چاہیے۔

مٹے ہوئے ناموں کو ڈھونڈنے اور کھوئے ہوئے ناموروں کو تلاش کرنے کا سوائے تذکروں کے اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے ۔ اور تذکرے اس قدر بے‌کار ثابت ہوئے تو بڑی فکر ہوئی کہ کیا صرف نام لکھ کر خاموش ہو جانا چاہیے۔ مگر اسے میری کاوش جستجو کہیے یا حسن اتفاق کہ ان کا کشکول جو زیادہ تر انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، مجھے دست‌یاب ہوگیا جس سے بسمل کے بعض مفید حالات معلوم ہو سکے اور ذوق تلاش میں ایک حد تک سکون پیدا ہوگیا۔ بہر حال

ان کا نام محمد جواد ، مرزا لالن عرف اور بسمل تخلص تھا ۔ مذہب شیعی کے پیرو اور فن طب کے ماہر تھے۔ اسی لیے ہر جگہ اپنے نام کے ساتھ حکیم کا لفظ بھی شامل کرتے تھے ۔ چناں‌چہ ان کے کشکول میں جتنی جگہ ان کے دستخط ملتے ہیں سب میں یہی دستور رکھا ہے اور اسی کے ساتھ ہرجگہ عرفیت کو بھی قلم‌بند کیا ہے ۔ ان کے والد کا نام حکیم علی‌حسین خاں تھا جو اس زمانے کے نامی اور شاہی طبیب تھے ۔ بیگمات وغیرہ کا

علاج ان سے متعلق تھا ۔ چناں‌چہ بسمل نے جو ان کے بعض معمول مطب نسخے نقل کیے ہیں ان میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ نسخہ کس بیگم کے لیے لکھا تھا ۔ بسمل کی شادی اپنے چچا حکیم محمد خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ۔ یہ اس وقت کے بے نظیر طبیب تھے جن کے لیے خود بسمل ہی کی گواہی موجود ہے چناں‌چہ ان کے بعض مجربات کو نقل کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔ «ایں چند نسخہ از مجربات معمولی حکیم غفران پناہ در فن طبابت از ہمہ استادان عالی جاہ اعنی عمو صاحب قبلہ مغفور مرحوم خسر ایں روسیاہ حکیم محمد خاں صاحب بہ طریق تیمن و تبرک قلمی یافت ۔ از دستخط خاص اوشاں تحریر نمودہ شد» ۔ اسی طرح حکیم محمدعسکری خاں بہادر کو جابجا اپنا بھائی لکھ‌کر ان کے مجربات نقل کیے ہیں ۔ ان کے نام کے ساتھ امیدگاہ اور دو ایک جگہ سلمهٗ لکھا ہے ۔ دستور ہے کہ سلمهٗ چھوٹے کو لکھتے ہیں ہرچند کہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے ۔ دوسرے چچا کا نام حکمت‌حسین خاں لکھا ہے ۔ یہ بھی غالباً مشہور طبیب تھے ۔ اسی طرح اور دو ایک طبیبوں کے نام بھی درج ہیں۔ ان سب باتوں سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکل آیا کہ وہ ایک اعلے خاندان کے رکن تھے اور ان کا آبائی پیشہ طبابت تھا ۔ ممکن ہے کہ اول میں یہ بھی مطب کرتے ہوں ۔ مگر نہ معلوم کیا اسباب ہوئے کہ وہ دربار آصفی تک پہنچے اور بزمرۂ ملازمین و مصاحبین منسلک ہوئے ۔ وہاں شعر و شاعری بھی جاری تھی اور نہ صرف جاری تھی بلکہ خود بادشاہ ان کی نکتہ رسی اور فن کے مداح اور معرف تھے اور اس وقت کے شعرا ان پر رشک کرتے تھے ان سب باتوں کا ایک ایسے واقعے سے پتہ چلتا ہے جو ایک معرکے کی صورت میں پیش آیا اور جو خود اپنے قلم سے انھوں نے کشکول میں نقل کیا ہے ۔ اس کو دیکھ کر خودبخود یہ رائے قائم ہوجاتی ہے کہ وہ معزز مصاحبین اور ماہرین فن میں سے تھے ۔ لکھتے ہیں :۔

«فردوسی کہ برائے بادشاہ خود شاہ‌نامہ گفت زبان ہمہ شاعران و عالماں را لال کرد ۔ روزے روبروئے شاہ گفت کہ در تمام شاہ‌نامہ یک لفظ عربی نیست ۔ غور باید کرد کہ عجب کارے از من شدہ ۔ عقل کہ ومہ

اگر دریں مقدمہ فرارسند حیران خواهد شد ۔ همه‌ها شنیدند و خاموش شدند ۔ چندے برایں گزشت ۔ می‌گویند روزے بادشاه در جلوت بود ۔ عنصری و غزالی و فردوسی و دیگر شاعراں با همه ارکان دولت حاضر بودند ۔ شاه‌نامه خوانده شد ۔ از اتفاق ایں بیت برآمد :۔ فلک گفت احسن ملک گفت زه ۔ و زه کلمهٔ عربی‌ست ۔ شاعران وقت یافتند ۔ و فردوسی روبروئے شاه دست بسته حاضر بود ۔ شاعراں عرض کردند که جهاں پناه از حضرت استاد زمان فردوسی عالی مکان باید پرسید که احسن و زه کدام زبان است ؟ ۔ بادشاه متوجه فردوسی شد و گفت ۔ در حضرت بادشاهاں سخن دروغ گفتن سر برباد می دهد ۔ احسن و زه کلمهٔ عربی‌ست و شما اقرار کرده بودید که کلمهٔ عربی در تمام شاه‌نامه نه گفته‌ام ۔ احسن و زه اگر کلمهٔ عربی نیست کدام زبان است ؟ فردوسی گفت واقعی من نه گفته ام ۔ فلک و ملک گویند درایں کدام تقصیر فدوی است ۔ فلک گفت احسن ملک گفت زه ۔ ایں خود در شاهنامه بر نیامده که فردوسی گفت ۔ احسن و یا زه ۔ بادشاه فردوسی را در آغوش گرفت و عاطفت کرد ۔ شاعراں ذلیل و خفیف گردیدند ۔ بعینه همیں اتفاق ایں عاجز هیچ‌مداں حکیم محمدجواد متخلص به بسمل را روبروئے نواب عالی‌شان والامنزلت نواب وزیرالممالک وزیر هند نواب آصف‌الدوله بهادر شد ۔ وقتے که بحضور بار یافتم و در ندمائے آن وزیر زمان علیه الرحمه والغفران داخل شدم یک پهیلی بموجب ارشاد خواندم که پهیلی افیون و پوست خشخاش بود (پهیلی)

اچرج کا اک بروا دیکھا آپا موه ادهک پریکها
ایک هے ڈالی پهل هیں تین دو هیں کڑوے اک شیرین

باربار نواب غفران پناه دست خود برزانو می‌زدند و ایں کمترین را می‌گفتند ۔ ایک هے ڈالی پهل هیں تین ' بسیار خوب گفتید ۔ باز بخوانید ۔ هفت بار خواندم ۔ مورد تحسین شدم و آداب بجا آوردم ۔ ناتوان بیں بسیار می باشند ۔

مرزا مسیتا نامی کہ مصاحب نواب سراج‌الدولہ بودند و بسیار زیرک و هوشیار و در ندما داخل بودند و پانصد روپیہ در ماہ می یافتند، گفتند ۔ واقعی پہیلی بسیار خوب گفتہ‌اند علےالخصوص پھل خوب بستہ اند ۔ فہمیدم کہ کنایہ کردند ۔ افیون و خشخاش و پوست پھل نیست ۔ مشہور است کہ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد و وقت جنگ یاد آمدن سرحریف را می شکند ۔ ہماں زماں تائید از جناب ایزدی یافتم و ہمیں کلمہ گفتم ۔ واقعی درست ارشاد می فرمایند لیکن ایں از صاحب عجب پھل یافتم ۔ آں مرد عزیز سر پائیں کرد و نواب وزیرالممالک بسیار بسیار توصیف و تعریف ایں ہیچ‌مداں کردند و فرمودند جواب شما بہتر از پہیلی است ۔

اس قصے سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ یہ ایک وقت تک حاشیہ‌نشینان دربار آصفی سے تھے ۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کتنے زمانے تک اس سے وابستہ رہے ۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ یہ صحبت برآر نہیں ہوئی اور یہ دربار سے علیحدہ ہوکر آصف‌الدولہ کے مخالفین سے ملے اور انہیں کے خوان کرم کے ریزہ‌چیں ہوگئے ۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ان کی مثنوی حسن و عشق میں جواہرعلی خاں خواجہ‌سرا کی انتہائی تعریف موجود ہے اور جواہرعلی خاں وہ شخص تھا کہ نواب آصف‌الدولہ ان سے اور ان کے ساتھی بہارعلی خاں خواجہ‌سرا سے صاف نہ تھے علی‌الخصوص اس زمانے میں جب کہ آصف‌الدولہ کی عیش پسندیوں اور کامرانیوں نے ان کو روپیہ کا بےحد ضرورت‌مند بنا دیا تھا اور وہ بار بار بہوبیگم یعنی اپنی والدہ کو تنگ کرکے رقم وصول کرنا چاہتے تھے اور بہت کچھ وصول کر بھی چکے تھے ۔ خصوصاً جب ان کو بعض ذریعوں سے یہ پتہ معلوم ہوا کہ تمام روپیہ بہارعلی خاں اور جواہرعلی خاں کے قبضے میں ہے تو نہایت برافروختہ ہوگئے اور اسی سلسلے میں ان پر طرح طرح کی سختیاں روا رکھی گئیں بلکہ تقریباً ایک ڈیڑھ سال تک دونوں کو محبوس و مقید رکھا گیا ۔ ماں بیٹے کے سمجھوتے کے بعد ان کی سختیاں دور ہوئیں اور دونوں بدستور فیض‌آباد میں آکر رہنے لگے ۔ یہ دونوں بہوبیگم کے نہایت جاں نثار اور مقرب الخدمت تھے اور

ان کی محالات میں وہ علاقہ تھا جو قصبہ سلون کے قریب اور لکھنؤ سے غرب کی جانب متصل علاقہ اسماعیل گنج واقع تھا۔

اپنے زمانے کے تمام خواجہ‌سراؤں سے ان کا مرتبہ بلند تھا۔ جواہرعلی خاں بہت حسین، ذکی، فریش اور ہوشیار تھے۔ ان کے خیالات بلند تھے۔ شعرا و ادبا کا ان کے یہاں مجمع رہتا تھا اور فیض‌آباد میں متصل حویلی ہی کہیں رہتے تھے۔ ان کے نصب کا صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ نواب محمدعلی خاں جو نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے چچا زاد بھائیوں میں سے تھے اور نادرشاہ کے حملۂ ہندوستان کے بعد سے خیرآباد کے حاکم تھے، ایک مرتبہ اس ضلع کے زمینداروں نے تمرد کرکے سرکاری زر واجب‌الادا روک لیا اور جنگ کی نوبت پہنچی۔ سخت معرکہ ہوا۔ نواب نے خوب خوب داد شجاعت دی یہاں تک کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ اگرچہ خود بھی خطرناک طور پر زخمی ہوئے مگر پھر بھی فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ اکثر ہندو مارے گئے اور ان کی عورتیں اور بچے گرفتار ہوئے۔ نواب نے اپنے غسل صحت کے بعد بچوں کو خواجہ سرا بنایا۔ ان میں سے ایک لڑکا مرگیا، باقی زندہ رہے۔ انھیں میں سے جواہرعلی خاں، نشاط‌علی خاں، بہارعلی خاں، عنبرعلی خاں وغیرہ خواجہ‌سرا تھے۔

جواہرعلی خاں اور آصف الدولہ سے اگرچہ بہوبیگم کے معاملات طے ہونے کے بعد ظاہرا صفائی ہوگئی مگر باطناً ہمیشہ کدورت کارفرما رہی۔ غرض کہ بسمل سنہ ۱۲۰۳ھ میں جواہرعلی خاں کے یہاں رہتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آصف الدولہ (جو سنہ ۱۲۱۲ھ تک زندہ رہے) کے یہاں سے ان کی زندگی ہی میں کچھ دن دربار میں رہنے کے بعد دربار سے علیحدہ ہوئے اور جواہرعلی خاں کے یہاں متوسل ہوئے۔ بہرحال وہ جواہرعلی خاں کے انتہائی مداح ہیں اور ان کی قدردانی کے بھی معترف ہیں۔ چنانچہ مثنوی حسن و عشق میں جس کے متعلق آگے چل کر ہم مفصل ذکر کریں گے، جواہرعلی خاں کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں :—

ہوا جب حمد و مدح و نعت ارقام	لگا دل دینے بسمل کو یہ پیغام
خدا کے دوستوں کا اک محب ہے	نہ کرنے مدح ایسے کی، عجب ہے

کیا شرع نبی کو اس نے برپا
اور اعدا سے کیا اس نے تبرّا
یقیناً اس زمانے کا ولی ہے
وہ محبوب نبی ہے اور علی ہے
خدا رکھے اسے سرسبز و شاداں
کہ ہیگا وہ سراپا لطف و احساں
فلک نے کر جہاں‌آباد برباد
کیا ہے اس سے فیض‌آباد آباد
اسے کہنا بجا فخر جہاں ہے
کہ وہ نام خدا عالی مکاں ہے
کروں در پردہ تا کے وصف ارقام
جواہرخان ذی‌شاں اس کا ہے نام
کرم کے بحر کا یکتا ہے وہ در
لقب نواب ناظر ہے بہادر
ہے اپنے قصر میں وہ رونق افزا
لکھوں کیا وصف مجھ میں تاب ہے کیا
میں رہتا اس کی خدمت میں تھا دن رات
نہ تھی بندہ سے پوشیدہ کوئی بات

مدحیہ اشعار بہت سے ہیں مگر یہ چند اشعار نقل کرنے کے بعد ہم ان شعروں کا درج کرنا بھی ضروری جانتے ہیں جو بسمل نے جواہرعلی خاں کے حسن کے متعلق کہے ہیں - وہ بھی بہت سے ہیں مگر چند نذر ناظرین ہیں :-

کروں کیا وصف حسن اس کا میں تحریر
کہ حیراں جس پہ ہے ہر ایک تصویر
غرض اس کا ہے بے ہمتا جمال اب
وہ رکھتا ہے جمال بے مثال اب
جو گلشن میں قدم رنجہ وہ فرمائے
تو پابوسی کو شاخ گل بھی جھک جائے
کرے نرگس طلب حق سے سعادت
کہ دیکھوں میں کسی صورت یہ صورت
کہے سوسن زباں ہو میری گویا
یہ ظاہر تو کروں کچھ وصف اس کا
نہیں کچھ سرو سے آزاد قمری
اسی پر ہیں فدا شمشاد و قمری
اسی گل کے لیے حیراں ہے بلبل
کرے غنچہ نثار اس پر زر گل
جو ہو منظور اس کو نذر لانا
کرے فوّارہ بھی خالی خزانا
جو بوئے پیرہن تک غنچہ پاوے
نہ پیراہن میں پھر پھولا سماوے
چمن میں اس سے یہ شادی ہے یارو
کہ شہنائی بجاوے گل زشبو
جو دیکھے اس کی صورت شب کو ناگاہ
کرے ٹکڑے جگر مثل کتاں ماہ
پری بھی دیکھ کر دیوانہ ہوجائے
جو دیکھے شمع تو پروانہ ہوجائے

فروغ بزم مہرویاں ہے گویا　　　سراج محفل خوباں ہے گویا

اس کو جواہرعلی خاں کی ملازمت اور مصاحبت کا اثر سمجھیے یا دربار آصفی سے علیحدگی کا تلخ انجام کہیے مگر ہم کو ایک آدھ اور بھی شہادت ایسی ملتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آصف‌الدولہ سے صاف نہ تھے اور ان کے دل میں اس محبت و خلوص نیازمندانہ کی گنجایش نہ رہی تھی جو ایک آقائے نعمت یا محسن و ممدوح کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چناں‌چہ آصف‌الدولہ کی تاریخ رحلت انھوں نے ان الفاظ میں کہی ہے :—

بست و پنجم ربیع اول بود　　　آصف‌الدولہ انتقال نمود
بود یوم الخمیس وقت زوال　　　روئے او در جناں نمود ورود
داشت او ملک و مال خیل و سپاہ　　　از قیاس و خیال ہم افزود
وقت رفتن کسے نیامد کار　　　جز خدا کس رفیق و یار نبود
شدہ تاریخ فوت لفظ غریب　　　چوں‌کہ غربت بر او ہویدا بود

اسی طرح مثنوی حسن و عشق میں بے ثباتی دنیا کا حال تحریر کرتے ہوئے آصف‌الدولہ کا بھی ذکر کر گئے ہیں مگر وہ الفاظ بھی ایسے ہیں جن سے محبت تو کجا اور الٹا نفرت کا گمان ہوتا ہے۔ کہتے ہیں :—

ابھی تھا آصف‌الدولہ جہاں میں　　　تھا اس کا نام سب ہندوستاں میں
لرزتے تھے سبھی سو ہوگیا خاک　　　اب اور آبیٹھا اس جاگہ پہ بیباک

غرض اس بات میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہتی کہ بعد دربار آصفی کے وہ جواہرعلی خاں کے مصاحب ہوئے اور اس جگہ ان کی قدر بھی ہوئی۔ مگر تعجب‌خیز یہ امر ہے کہ سنہ ۱۲۰۳ھ میں جب انھوں نے مثنوی حسن و عشق لکھی ہے اس وقت وہ اپنی بےکاری کا اظہار کرتے ہیں اور مثنوی کے آخر میں یہ شعر لکھتے ہیں

خداوندا تری ہے ذات عالی　　　تو میرا اور سب جگ کا ہے والی
بحق مصطفے اور مرتضے کے　　　بحق فاطمہ خیر النساء کے
بحق شبر و شبیر و سرور　　　بحق عابد و باقر و جعفر

بحق موسی کاظم رضا کے نقی کے اور تقی پارسا کے
بحق عسکری و مہدی دیں جو سب ہیں نیک طینت نیک آئیں
مجھے تو آبرو حرمت سے رکھنا مجھے تو عزت و فرحت سے رکھنا
الٰہی جلد میں ہوجاؤں نوکر یہ عسرت جائے میری رب داور

اور یہی نہیں بلکہ مثنوی کے خاتمے پر جو نثر عبارت لکھی ہے اس سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پریشانی کے گرداب بےپایاں میں ایسے پھنسے کہ مدتوں نکل نہیں سکے - انھیں کے قلم کے یہ فقرے نقل کردینا کافی ہیں " تمت بالخیر در بلدۂ فیض‌آباد روز دو شنبہ ۱۳ صفرالمظفر سنہ ۱۲۰۳ھ در عین پریشانی صورت اتمام یافت " اسی صورت سے پریشانی کا اظہار مثنوی پارسانامہ کے آخر میں بھی کیا ہے جو پورے دس برس بعد یعنی سنہ ۱۲۱۳ھ کی تصنیف ہے - ان کی پریشانی انھیں دونوں مثنویوں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ ان دونوں کتابوں کے علاوہ بھی اس درمیان میں جو کچھ لکھا ہے سب میں وہی الفاظ ہیں جن سے ان کی عسرت اور کربت کی طویل داستان مرتب ہوتی ہے -

اس کے بعد سنہ ۱۲۱۹ھ تک ان کی زندگی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ انھوں نے اس سنہ تک اپنے بعض دوستوں یا معاصرین کی تاریخیں کہیں جن میں سے ایک دو ہم نقل کرتے ہیں :—

مرزا سجاد رواں گشت چو در باغ عدن بعد تصدیع و تعب درد و الم رنج و محن
سال تاریخ ملک گفت چنیں آہ غریب بود او زاھد مرتاض بہ اخلاق حسن
۱۲ ۱۹

بود ماہ جمادی الاولے یوم اثنا سیم بوقت مسا
جعفر ابن حسین صد افسوس از جہاں کوچ کرد در عقبا
بود از جان و دل نثار حسین مرثیہ خوان سیدالشہدا
آہ ذاکر حسین ابن‌علی شدہ تاریخ فوت او انشا
۱۹ ۱۲

بسمل کا ذوق علمی

اگلے زمانے کے لوگ علمی کمالات اور مختلف قابلیتوں کا مجموعہ ہوا کرتے تھے۔ اور ان میں بعض تو ایسے ہوتے تھے کہ ان سے جس موضوع پر گفتگو ہوتی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام عمر اسی فن میں صرف کی ہے۔ اور بعض ایسے کہ ان کو کسی ایک خاص اور علم پر زبردست دسترس ہوتی۔ مگر ساتھ ہی اس قابلیت میں ایک قسم کا تنوع شامل ہوتا تھا اور اسی طرح سے وہ تھوڑی تھوڑی مہارت ہر چیز میں پیدا کرکے 'نہ تنہا شاعرم اندک طبیبم' کی مثال ہو جاتے تھے۔ اور ابطال ضرورت کسی چیز میں کبھی بند نہ ہوتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے بسمل بھی تھے۔ وہ اطبائے شاہی کے خاندان کے ایک معزز رکن ہونے کی حیثیت سے ایک ماہر فن طبیب تو تھے ہی اور کیوں نہ ہوتے یہ فن ان کا اور ان کے اسلاف کا ذریعۂ معاش تھا۔ رہے دوسرے علوم و فنون، ان کا پتہ ان کے مرتب کردہ کشکول سے چلتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ طبیب ماہر تھے تو ایک طرف باکمال شاعر۔ علم نجوم کے بھی دل‌دادہ تھے، اور علم سرود ہے میں بھی کافی مہارت تھی۔ ہرچند کہ یہ علم ہنود سے مخصوص ہے، مہادیوجی سے اس کی ابتدا بتائی جاتی ہے اور اب بھی بعض بعض اس کے ماہرین موجود ہیں مگر مسلمان زیادہ تر اس سے ناواقف ہیں۔ مگر بسمل نے اس فن میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کو بہت عمدہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر پھر بھی بعض ابتدائی اصولوں کا حاوی ہے۔ عملیات اور وظایف کے ساتھ نجوم کی کچھ چیزیں بھی ہیں۔ اگرچہ ان چیزوں کے پائے جانے سے ان کو عامل و کامل کہنا تو ایک قسم کی خطرناک غلطی ہے مگر ان کے ذوق کا اس سے پتہ ضرور چلتا ہے۔ عروض و معانی و بیان کے وہ بےحد شوقین ہیں۔ چناں‌چہ میر شمس‌الدین فقیر کے دو نایاب رسالوں کو کہیں سے بہم پہنچا کر انھوں نے خود نقل بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے ان کو اپنے لیے لکھا ہے اور نہ صرف لکھا بلکہ اس کی تصحیح بھی خود ہی کی ہے۔

فارسی شعرا کے اشعار کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے ذوق بلند ہی پر رروشنی پڑتی ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ قدما کا کلام بہت

کچھ ان کے حافظے میں محفوظ و مصئون تھا۔

علم ریاضی سے ان کو ایسا لگاؤ تھا کہ معلوم ہوتا ہے اس میں انھیں خاص ملکہ ہوگا۔ ان کے متعلق بہت سی نایاب چیزیں اپنی اور اساتذہ کی اختراعی جمع کی ہیں جن کا نقل کرنا طوالت کے خوف سے ہم ملتوی کرتے ہیں۔

معما اور پہیلی اگرچہ آج متروک سی چیزیں ہیں مگر بسمل کے زمانے تک یہ خاص چیزیں تھیں اور ان چیزوں کو کملا مایہ افتخار جانتے تھے۔ ان دونوں چیزوں کے وہ زبردست استاد تھے جن پر آگے چل کر ہم مفصل بحث کرتے ہوئے بسمل کی جودت طبع کے نمونے پیش کریں گے۔ چوں کہ یہ دونوں اصناف شاعری میں سے ایک ایک مستقل فن ہیں اس لیے فی الحال ان کی شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں اور آیندہ اسی کے ضمن میں اس کا ذکر کریں گے۔

بسمل بحیثیت شاعر

ہر زمانے میں چھوٹے بڑے، ادنے و اعلے شاعر ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس لحاظ سے بسمل کو بڑے شاعروں میں شامل کرنے کی کوشش کرنا کچھ مفید مطلب بات نہیں ہے کیوں کہ وہ خود ایسے لوگوں میں نہیں تھے جن کے اوصاف پیدا کرنے میں قوت تخییل کو زحمت اٹھانا پڑے۔ وہ بجائے خود پختہ مشق شاعر بلکہ اپنے زمانے کے مستند شعرا میں سے تھے۔ چناں چہ ہمارے اس بیان کی زبردست شہادت اس حُکم یا اس فرمایش سے ملتی ہے جو مثنوی حسن و عشق لکھواتے وقت جواہرعلی خاں نواب ناظر نے کی تھی اور بسمل نے اس کا اپنے الفاظ میں ذکر کر دیا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ لکھنے کے لیے قصہ خود نواب ناظر کو یاد تھا مگر نظم کا جامہ پہنانے کے واسطے بسمل کو تجویز کرکے یہ الفاظ ادا کیے تھے:—

یہ فرما کر کیا بسمل کو ارشاد کہ فن شعر کا تو ہے گا استاد

یہ قصہ ہے گا یوں کر اس کو تحریر کہ سب شعرا میں تیری ہوگی توقیر

حالانکہ اس وقت اسدالدولہ آغا محمدتقی خان 'ترقی' خلف سید محمدامین خاں شاگرد سوز بھی موجود تھے جو فیض‌آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے میر کی مثنوی پڑھ کر سنائی تھی جو حسن و عشق کے لکھوانے کی محرک ہوئی۔ 'ترقی' اپنے وقت

کے اساتذہ صاحب دیوان میں سے تھے جن کی استادی کی سند تذکروں کے علاوہ بسمل کے ان اشعار سے بھی ملتی ہے:-

به فن شعر ہے استاد عالم نہیں کوئی ویسا کامل اور آدم
جو اس کا شعر دیواں میں ہے مقطع سر دیوان وہ سب کے ہے مطلع
مضامین خانہ زاد اس کے جہاں میں بیاں کا علم سب اس کی زباں میں

مگر ان کے ہوتے ہوئے بھی بسمل ہی منتخب ہوئے جس میں عجب نہیں کہ خود ان کا بھی اشارہ ہو۔ اس معتبر شہادت کو اگر نظرانداز بھی کردیا جائے تو خود بسمل کا کلام اس کا شاہد عادل ہے۔ ان مثنویوں کو ہم ابھی نہیں چھیڑتے جن پر پورے مضمون کی بنا ہے مگر بسمل کی غزلوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو انھیں مثنویوں سے دستیاب ہوئی ہیں۔ اتنا افسوس ضرور ہے کہ ہم کو ان کا پورا مجموعہ کلام نہ مل سکا ورنہ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کرتے:-

غنیمت ہے کوئی دم یہاں عندلیب کہاں پھر یہ گلشن کہاں عندلیب
ستا مت اسے باغباں باغ میں کوئی روز ہے میہماں عندلیب
زباں اس کی جل جائے میری طرح کرے ٹک جو شور و فغاں عندلیب
اثر گل پہ کرتا ہے کس کا سخن مرے ساتھ ہو نغمہ خواں عندلیب
جو بسمل کے نالوں کی ہے تو حریف
تو چل اب کریں امتحاں عندلیب

غنیمت جانو جو دم ہیں میاں ہم کوئی دم کو کہاں پھر تم کہاں ہم
تمھارے ڈر سے گونگے ہو رہے ہیں نہیں تو منہ میں رکھتے ہیں زباں ہم
نہ گل ہم کو دیا نے کچھ ثمر ہی کسی لایق نہ تھے اے باغباں ہم
نگہ کرنا نظر آوے پہاڑ اب یہاں تک ہوگئے ہیں ناتواں ہم
بغیر از گریہ جو آتا ہے گاہے نہیں رکھتے ہیں کوئی مہرباں ہم
نہ وعدہ وصل کا نے قتل کا قول سو کس امید پر ہوں شادماں ہم
عجب ہی شغل میں کٹتی ہیں راتیں کریں کیا تجھ سے اے بسمل بیاں ہم

کبھی سوتے ہیں آنکھیں مند کر کر کبھی چونک اٹھتے ہیں کر کر فغاں ہم
کبھی دیتے ہیں اس دل کو تسلی کبھی رو رو کریں آنسو رواں ہم
کبھی قاتل کی باتیں یاد کرکے خوشی ہوتے ہیں دل میں یک‌زماں ہم
کبھی کرکر خیال اے جان تیرا
بیاں کرتے ہیں اپنی داستاں ہم

دل بیمار کو میرے نہ کر صید کہ قابل ذبح کے ہووے نہ ہر صید
یہ انساں اور وحش و طیر کیا ہیں فرشتے کو کرے تیری نظر صید
پھرا تیری گلی سے پھر نہ افسوس ہوا شاید کہ مرغ نامہ بر صید
کرے دونوں پہ تیغ عشق جب کار ادھر صیاد تڑپے اور ادھر صید
گرفتار الم ہے کب سے بسمل
نہیں تو نے کیا اس کو مگر صید

گریباں سے مرے کچھ تار لےجا اگر عاشق کو ہے زنار کا شوق
سلامت ہی رہے یہ داغ دل کا بھلایا جس نے سب گلزار کا شوق
ہمارے استخواں سے نے بناؤ اگر ہے درد کے اظہار کا شوق
لگا دو کشتیاں رونے پہ یارو ہوا ہے دیدۂ خونبار کا شوق
حوالے کردیا ہم نے تو دل آہ جو لے کر پھر نہ دے تو یار کا شوق
دم آخر اسے دیتے ہیں ظالم چلے جس چیز پر بیمار کا شوق
اٹھا سب سے سخن کا شوق بسمل
رہا ہے ہاں مگر دو چار کا شوق

تری لکنت کا ہے کیا خوشنما لفظ قیامت اک ادا سے ہو ادا لفظ
نہیں تو مجھ سے کرتا آج کیوں بات پھرے تھا گرد منہ کے بارہا لفظ
بہت مشتاق ہے سننے کا ...
کوئی تو منہ سے کہہ بہر خدا لفظ

غزل ابتدا سے جن مراحل اور راستوں سے گزری ہے ان کو تفصیل‌وار بیان کرنا

طوالت محض کے سوائے یہاں کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا ' مگر یہ کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ خواجہ میر درد، حضرت میرزا جان‌جاناں مظہر ' میرتقی‌میر ' میرزا رفیع سودا ' میر سوز وغیرہم نے آرایش ظاہری اور تکلفات لاطایل سے پاک کرکے غزل کو درد و اثر اور جذبات محبت سے بھر دیا تھا اور سوز و تاثیر کے وہ وہ سرتیز نشتر اس میں پنہاں کر دیے تھے جن کو سن کر سننے والے کے لیے آہ کرنا لازمی تھا - میر کے زمانے کی سب سے بڑی بلندی اور معراج غزل کے لیے یہی تھی اور یہی چیز اگر کسی کے کلام میں نہ ہوتی تھی تو اس کی نہ کوئی وقعت ہوتی تھی اور نہ وہ مقبول طبایع ہوتا تھا - اسی شے کا وجود معیار کمال اور اسی کی عدم موجودگی انتہائی نقص تھا - کلام میں گداز ' بیان میں برجستگی، جذبات میں وارفتگی' اسی کے ساتھ حاضرالعہد زبان کی سلاست اور روانی کا خیال رکھنا بھی اسی قدر ضروری تھا - تخییل کی بلندی اور ندرت اور بیان کی معانی‌آفرینی نہ بھی ہوتی تو چنداں کمی نہ تھی - اسی معیار اور محک پر جب بسمل کے کلام کو کسا جاتا ہے تو وہ زر کامل العیار کی طرح نظر آتا ہے جس میں ذرہ بھر غل و غش نہیں - میر کے کلام سے اس قدر مشابہ ہے کہ اگر اس کو میر ہی کا کلام بتا دیا جائے تو کوئی اس کی تصدیق کی ضرورت نہ پڑے گی - چناں‌چہ کئی غزلیں آپ دیکھ چکے ہیں - ایک غزل ہم اور پیش کرتے ہیں جو ایسے ردیف و قوافی میں ہے کہ ان میں میر کی غزل بھی موجود ہے اور اتفاق سے بعض ایسے بھی قوافی ہیں جو دونوں کے یہاں موجود ہیں - ملاحظہ ہو :-

میر تقی‌میر   زمیں‌پر‌میں جو پھینکا خط کو کر بند   بہت تڑپا کیا جوں مرغ پر بند

بسمل   جو مرغ نامہ‌بر میں یہاں سے بھیجا   کیا قید اس کو تونے کرکے پر بند

میر تقی‌میر   سب اس کی چشم کے نیرنگ پر محو   مگر کی ان نے عالم کی نظر بند

بسمل   جو کوئی لے گیا پیغام میرا   کیا وو‌ہیں اسے تونے نظر بند

باقی بسمل کی اور ان کی غزل کے قوافی الگ الگ ہیں - اس لیے پہلے بسمل کی غزل نقل کیے دیتے ہیں جو مسلسل ہے :-

محبت کا ہوا رستہ مگر بند   کہ ہے خط و کتابت سربسر بند

دلوں کی راہ تو جاری ہے باہم — نہ کردیویں جہاں کی رہ‌گزر بند
سو تیرا دل نہیں ہے صاف مجھ سے — کہ اس دل پر ہے اس دل کی خبر بند
لکھا تھا تو نے خط جو یہاں نہ پہنچا — یہ سن کر آگے ہی مجھ کو نہ کر بند
صبا کو گر کیا قاصد میں اپنا — تو بیٹھا رخنۂ دیوار کر بند

جو پہنچا نامہ‌بر خود ہو کے بسمل
کیا اس کی صدا کو سن کے در بند

میر کے کلام سے اس قدر تشابہ کی ایک خاص وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ بسمل میر کے عقیدت‌مند معلوم ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب سے ان کے کافی اور مضبوط تعلق بھی رہے ہیں ۔ اس کا سراغ یوں ملتا ہے کہ بسمل نے اپنی مثنوی پارسا نامے میں ایک جگہ لکھا ہے :—

یہ بسمل جو ہے شمع محفل فروز — لکھیں کتنی بتیں ہیں یہ سینہ سوز
سو دس پانچ ہیں میر کے دوستاں — نہاں نہیں کیا کردیا وہ بیاں

اس بیان سے دو ہی نتیجے نکلتے ہیں کہ یا تو میر صاحب نے ان کی مثنوی کے لیے کچھ شعر کہے اور یا میر صاحب کی مثنویوں سے انھوں نے حسب موقع انتخاب کرکے اپنے یہاں داخل کرلیے ۔ اصلیت کچھ بھی ہو، مگر یہ حقیقت بہر صورت ظاہر ہو جاتی ہے کہ میر صاحب سے اگر ان کے تعلقات نہ بھی ہوں پھر بھی وہ ان کے گہرے عقیدت‌مندوں میں سے تھے ۔ اول تو یہی کسی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ دونوں ایک دربار میں بہ حیثیت ندما بہ صورت خواجہ تاش ہوں اور تعلقات نہ ہوتے ہوں ۔ اس سے بھی زیادہ تعجب اس صورت میں ہوتا ہے جب ہم بسمل کی مثنوی پارسانامے کی کئی غزلوں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کو بسمل کے تخلص سے مزین پاتے ہیں ۔ پھر جب میر صاحب کا کلیات نگاہ کے سامنے آتا ہے تو اس میں بادنے تغیرالفاظ میرصاحب کے مقطع سے قریب پاتے ہیں ۔ چناں‌چہ جس غزل کا یہ مطلع ہے

مطلع — محبت نے کھویا کھپایا ہمیں — بہت ان نے ڈھونڈھا نہ پایا ہمیں
مقطع — کوئی دم کل آئے تھے بسمل یہاں — بہت اس غزل نے رلایا ہمیں

اس میں بسمل کے یہاں آٹھ شعر ھیں اور آٹھوں میر صاحب کے یہاں دیوان دوم صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۹۲۱ع مطابق سنہ ۱۳۳۵ھ میں بھی موجود ھیں بلکہ ایک شعر زاید ھے یعنی نو شعروں پر غزل تمام ھوئی ھے - مگر میرصاحب کے یہاں مقطع اس طرح ھے :-

کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میر بہت اس غزل نے رلایا ھمیں

تغیرات کم ھیں مگر ھیں ضرور - چانچه ایک شعر بسمل کے یہاں اس طرح پر ھے :-

بسمل نه ھوئی اس کے کوچے میں مٹی عزیز ھے اس نے به خواری اٹھایا ھمیں

میر ھوئی اس گلی میں تو مٹی عزیز ولے خواریوں سے اٹھایا ھمیں

یه شعر میر صاحب کے یہاں زیادہ ھے جو بسمل کے یہاں نہیں ھے :-

جوانی دوانی سنا کیا نہیں حسینوں کا ملنا ھی بھایا ھمیں

اسی طرح دوسری غزل جو اسی کے بعد اسی صفحه پر میر صاحب کے یہاں دیوان دوم میں موجود ھے اور اس میں بھی نو شعر ھیں :-

جنوں نے تماشا بنایا ھمیں رھا دیکھ اپنا پرایا ھمیں

مگر بسمل کے یہاں اس میں آٹھ شعر ھیں اور ویسے ھی ادنے تغیرات بھی ھیں جیسے که :-

میر سدا ھم تو کھوئے گئے سے رھے کبھو آپ میں تم نے پایا ھمیں

بسمل یوں ھی ھم تو ....

میر یوں ھی تا دم مرگ بےتاب تھے نه اس بن تنک صبر آیا ھمیں

بسمل .... بن کبھی ....

میر شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رھا انھیں نے کنارے لگایا ھمیں

بسمل ... ... انھوں ... ...

میر ھمارا نہیں تم کو کچھ پاس رنج یه کیا تم نے سمجھا ھے آیا ھمیں

بسمل .... بہت تم نے ھیکا دکھایا ھمیں

میر رہا تو تو اکثر المناک میر ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

بسمل رہا تو تو اکثر ہے بسمل بہ غم ... ...

میرصاحب کے یہاں یہ شعر زاید ہے :—

جلیں پیش و پس جیسے شمع و پتنگ جلا وہ بھی جن نے جلایا ہمیں

اسی طرح دوسری غزل

چمن میں ترا عاشق زار تھا گل سرخ اک زرد رخسار تھا

میرصاحب کے یہاں موجود ہے اور اس میں چھے شعر ہیں۔ بسمل کے یہاں اس میں تین شعر ہیں اور ایک شعر میں تغیر بھی ہے۔

میر قد یار کے آگے سرو چمن کھڑا دور جیسے گنہگار تھا

بسمل ترے قد کے آگے تو سرو چمن ... ...

سمجھ میں نہیں آتا کہ بسمل نے میر کے شعر لے ہی لیے تھے تو انھیں اس تبدیلی کا کیا حق تھا۔ اور خاص کر میر کا تخلص محو کرکے اس کی بجائے اپنا تخلص رکھ دینا تو ستم بالائے ستم کا مرادف معلوم ہوتا ہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ جیسا کہ بسمل نے ظاہر کیا ہے مثنوی پارسانامہ کہتے وقت میر ان کے شریک حال تھے اور اس وقت انھون نے وہ غزلیں بسمل کے نام سے کہیں مگر پھر وہ غلطی سے ان کے کلیات میں بھی آ گئیں۔ ہم مثنوی کے اشعار نقل کرتے ہوے اور بھی ثبوت پیش کریں گے کہ میر ان کے شریک کار رہے۔ اس وقت صرف یہ کہنا کافی ہے کہ ان کے تمام کلام پر میرصاحب ہی کا پرتو پڑا ہے اور یہ اسی رنگ کے کہنے والے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب میر سے اس قدر تعلقات ہوں کہ وہ ان کی مثنوی کہنے میں معین رہے ہوں تو میر کے رنگ کلام کا ان پر کیوں نہ اثر ہوتا۔ بہرحال بسمل کے نمونہ کلام کے لیے جو غزلیں نقل کی گئیں وہ کم نہیں اور اس ثبوت کے لیے کہ وہ پختہ مغز اور میر کے ساتھیوں میں سے تھے، کافی ہے۔ بیان کی سادگی، کلام کی ہمواری، جذبات کی تراوش غزلوں میں موجود ہے۔ مگر بسمل صرف غزل گو نہ تھے بلکہ ان لوگوں میں سے تھے جو شعر گوئی کے ساتھ ہی زبان ریختہ کو علمی خزانے سے معمور کرنا چاہتے اور اس میں

گونا‌گوں اختراعوں اور ایجادوں کا ذخیرہ جمع کرکے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ ساتھ دیکھنا چاھتے تھے۔ میر و مرزا کے زمانے میں جب‌کہ زبان اردو گھٹنیوں بھی نہ چلی تھی، اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس کے الفاظ کو جمع کرکے لغت کی تدوین کی جائے۔ اور دراصل یہی سعی ترقی کی جان تھی۔ چناں‌چہ خان آرزو نے ایک لغت اس قسم کا لکھا اور بعض دوسرے بہی‌خواھان ریختہ نے بھی اس کوشش میں سر کھپایا۔ بسمل نے بھی ایک نئے انداز سے اپنے ذمہ اس خدمت کو لیا تھا جس کی کوئی نظیر اُس وقت تو خیر کیا اِس وقت بھی موجود نہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ھے کہ انھوں نے نظم میں ایک ایسے لغت کی بنیاد ڈالی تھی جس کے اندر وھی الفاظ لائے جائیں جن کے کئی کئی معنے موجود ھیں اور کئی کئی معنوں میں مستعمل ھوتے ھیں اور چوں‌کہ وہ پہیلیوں اور معما کے استاد تھے اس‌لیے پہیلیوں کی صورت ھی میں اس کی بنیاد ڈالی تھی اور کوئی شک نہیں کہ اگر یہ لغت پورا بھی ھوجاتا تو وہ لاجواب چیز ھوتی۔ افسوس کہ یہ پورا نہ ھوسکا اور یا ھوا تو ھم تک نہیں پہنچ سکا۔ بہرحال اس کا ایک مختصر حصہ ان کے کشکول کے ذریعے سے ھم تک پہنچا جس میں سے صرف دو چار الفاظ کو ھم نقل کرتے ھیں۔ اس کی ترتیبی صورت یہ ھے کہ پہلے وہ لفظ لکھتے ھیں اس کے بعد معنے لکھتے ھیں اور پھر اس کو نظم کردیتے ھیں جس میں تذکیر و تانیث کا بھی اظہار ھوتا ھے۔

بعض جگہ کاغذ کے خراب ھوجانے کی وجہ سے اور بعض معنوں کو کوتاھی معلومات کے سبب سے میں نہیں سمجھ سکا جس کو پہلے ھی ظاھر کیے دیتا ھوں۔ لغت کے بعض الفاظ یہ ھیں۔

بار

بارہ معنی میں مستعمل ھے

(۱) نام خدا (۲) رخصت (۳) بارکھ (۴) پھل (۵) مرتبہ، دفعہ (۶) کار (۷) غم (۸) حمل (۹) نصیب (۱۰) باراں (۱۱) چولھا (۱۲) دربار

نظر آئے پرکھ بارہ۔ سبھی نرجی زمیں اوپر۔ جو پوچھو نام تم ان کا۔ سو ھیکا ایک تو سرور ھے۔ پہلے رام وہ سب سے۔ دوم رخصت اجازت میں۔ سوم وہ جائے غروشاں۔ چہارم باغ میں یکسر

ہے پنجم وہ مراتب میں۔ ہے ششم فعل میں اوے۔ جو ہفتم ہے سنو حضرت۔ جو وہ ہووے خوشی جاوے
جو ہشتم ہو کسی زن کو۔ خوشی اس کا خصم پاوے۔ نہم قسمت نصیب اس کا۔ دہم وہ سرک* سے جاوے
وہ دیک پر سے بھو جن لو۔ دہ و دو نصف در حق ہو۔ جو نام اس کا کوئی پوچھے۔ تو تم بارہ پُلہ کہہ دو
بڑی مشکل سے اے حضرت یہ اچرج ہے کہا بسمل۔ تمہارا وہ غلام ہیگا۔ اسے خدمت میں تم رہ دو

بند

چودہ معنوں میں آتا ہے

(۱) مکر (۲) زنجیر دیوانہ (۳) بند مفصل (٤) قفل (۵) کمربند (٦) پیچ داؤ (۷) بند مقام (۸) علی بند (۹) بند ازار (۱۰) بند کاغذ وغیرہ (۱۱) بند ترجیع (۱۲) اسبند (۱۳) در بند (۱٤)...

اعجوبہ ہے یہ کونسا۔ بوجھو اسے اے سامعاں۔ بسمل کہے ہے فکر سے۔ لاکر ذرا اپنا خیال۔
آئے نظر ہیں ناری نر۔ ہیں چودہ اے اہل ہنر۔ نرجی سبھی ہیں سر بسر۔ اک نام کا ہیگا مقال۔
پہلے دغا میں ہے علم۔ ہووے دوم چیز ستم۔ اعضا میں ہوتا ہے سیم۔ انسان ہو حیوان ہو۔
چوتھے سے محفوظ ہو مکاں۔ پنجم سے مستحکم میاں۔ ہووے ششم از پہلوان جس وقت در میداں ہو۔
ہفتم ہے وہ عالی مقام ہشتم ہو منت میں مدام۔ پوشاک میں ہو وے نہم۔ دفتر میں دسویں کا قیام۔
ہو گیارھواں کئی جا رقم۔ ہو بارھواں در ہر صنم۔ ہو تیرھواں وہ جائے قلب۔ ہو چودھواں جلتا مدام۔

بر

سات معنے اس کے لیے جاتے ہیں

(۱) اوپر (۲) شوہر (۳) بغل (٤) برگد (۵) میوہ (٦) پہلو (۷) عرض۔

کون ہیں اس دہر میں سات بتا ناری نر۔ نام انھوں کا ہے ایک کہ گئے اہل خبر۔
ایک وہ سب سے بلند۔ دوسرا جو کی پسند۔ تیسرا ہے وہ چرند۔ چوتھے کا بن میں انند۔
پانچواں گلبن میں ہے۔ باغی وہ مشہور ہے۔ اور چھٹی بوس و کنار مانگتی بھر پور ہے۔
ساتویں کو میں کیا کہوں۔ اس کی جوبن آئی ہے۔ جگ کو دکھاتی سدا اپنی وہ چوڑائی ہے۔
اور سنو طرفہ تم الٹے سے کرتا رہے۔ کرتا یہ بسمل ہے عرض آپ سے اظہار ہے۔

---

* میں یہ نہیں سمجھ سکا۔ اور نہ معنی نمبر ۱۲ کی تشریح سمجھی جاسکی۔

توڑہ

نو معنی میں مستعمل ہوتا ہے

(۱) هجر (۲) گل (۳) که برسربندند (٤) شکستگی (٥) روپیه (٦) گلو (یعنی زیور گلو) (۷) که در جمع مردماں افتد (۸) کمیاب (۹) توڑہ بندوق

پرکھ ایسے نظر آئے ، عدد میں نو ؛ سبھی بےجاں ۔ سنا ہے نام ان کا ایک بسمل نے کیا ارقام
ہے پہلے هجر میں آتا ؛ دوم لینے هوا جاتا ۔ سیم سر پرچمکتا ہے ، هوا ہے اس کا یہ انجام
چہارم ہےشکست اندر؛ ہےپنجم وہ تو کثرتمیں۔ کہاوے هیگاوہ کمتر؛ ہے ششم در گلو یکسر
ہےهفتم فصل وہ رہ کی؛ ہے هشتم وہجو ہے کمیاب ۔ نہم وہ هیگا ہے احباب ماریں رن جلاّ کر

نمونے کے لیے یہ چار الفاظ بہت کافی ہیں ۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جس قدر معنے لکھے گئے ہیں وہ سب درست اور صحیح بھی ہیں اور ان کے اندر اب قیل و قال کی گنجایش نہیں یا اور کوئی معنے باقی نہیں رہے ؛ اتنا کہنے کی جرات البتہ بےجا نہیں ہے کہ اگر اسی طریقہ کا پورا لغت مرتب ہوجاتا یا ہوا اور وہ دستیاب بھی ہو جاتا تو ایک نئی چیز ہونے کے علاوہ اردو کے لیے بہت مفید ہوتا اور آج چراغ ہدایت کا کام دیتا جب کہ ہم کو یہ معلوم ہوا کہ اس وقت یہ لفظ اتنے معنوں میں مروج تھا اور اب اتنے معنے متروک قرار پا گئے ۔

ریختی کی ایجاد کا سہرا سعادت یار خاں رنگیں کے سر باندھا جاتا ہے اور انشا کو ان کا مد مقابل اور جان صاحب لکھنوی کو اس فن میں ان کا متبع مانتے ہیں۔ ایسا ہی ہوگا ۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ بسمل کو ریختی گوئی میں بھی یدطولے حاصل تھا ۔ چنانچہ ان کے کشکول میں ان کا کہا ہوا ایک دگانا نامہ ملتا ہے جس کی تصنیف کی وجہ انھوں نے اپنے قلم سے یہ لکھی ہے « دگانا نامه من تصنیف ظفر حسین خاں بن مظفر حسین خاں و مرزا آقا جان دوسه بند گفته بودند و برائے تفریح تمام بابں عاصی نموده و نامۂ اعمال خود سیه کرده» ۔ اس میں ظاہر کیا ہے کہ اس کے دو تین بند تھے مگر موجودہ صورت میں اس کے تیس بند ہیں اور آخر میں بسمل کا مقطع بھی

ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان دو تین بندوں کو سنگ بنیاد سمجھ کر اس کو ان کی فکررسا نے مکمل کیا۔ اس دوگانا نامے کو دیکھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ریختی کے فن کے بھی استاد کامل الفن تھے۔ ہر چند کہ رنگین یا انشا کے درجہ پر ان کو نہیں پہنچایا جاسکتا پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ ان کے تنوع مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ تمام و کمال فحش اور دور از اخلاق باتوں سے بھرا ہوا ہے اور نقل کی گنجایش نہیں رکھتا۔ مگر ہم نہایت احتیاط سے بعض وہ شعر جو اس آلودگی سے پاک ہیں، نقل کرتے ہیں اور وہ اول و آخر کا بند ہے:—

بیگم مری خانم مری بی جان دگانا آ جام مےء وصل کو پی جان دگانا

میں واری گئی تیرے مری جان دگانا میں نبڑا ہوں اور تو ہو بنی جان دگانا

... ...

اس نظم کے کرنے سے یہ بسمل کو ہے منظور

اور پردہ عصمت میں ہر اک زن کے ہے مستور

تا سحق کی لذت کو یہ عورات کریں دور

دل حشر کے با عصمتوں کے چہرے پہ ہو نور

باہم نہ کریں پھر کبھی غلیان دگانا

پہیلیاں

پہلے زمانے میں معما کا فن اس قدر مقبول اور مطبوع تھا کہ دوسرے علوم کے ساتھ اس کو بھی سیکھنا ضروری تھا۔ لوگ مدتوں اس کی مشق کرتے اور اپنی عمریں اس میں صرف کرتے تھے۔ مولانا جامی، بصیرائے ہمدانی وغیرہ نے اس فن میں مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ امیرخسرو اور فیضی بھی اس کے ایک زبردست استاد مانے گئے۔ زمانۂ آخر میں مولانا صہبائی دھلوی نے اس میں اپنا کمال دکھایا۔ اسی فن کی نقل جو ہندی میں کی گئی اس کا نام پہیلی تھا۔ ہندوستان میں اس کا بڑا رواج تھا۔ بچوں کو پہیلیاں یاد کراکے ان کے ذہن کو تیز کیا جاتا اور اس کو ایک زبردست فن

مانا جاتا تھا ۔ امیرخسرو کے زمانے سے لے کر اب تک اس کا تھوڑا بہت رواج چلا آتا ہے۔ اگرچہ اب وہ گرماگرمی باقی نہیں ہے پھر بھی کہیں کہیں آج بھی اس کا نام آہی جاتا ہے ۔ مگر بسمل کے زمانے تک یہ ایک بڑی چیز تھی اور اس کے بڑے بڑے مشاقوں کو زبردست استاد مانا جاتا تھا ۔ چناں‌چہ خود بسمل نے بعض اساتذہ کی نسبت بڑے مداحانہ الفاظ استعمال کرکے اس فن خاص میں ان کو استاد زمانہ مانا ہے اور خود بھی ایک پہیلی نامہ تصنیف کیا ہے جس کے ساتھ فارسی کی پہیلیاں بھی شامل ہیں اور انھیں کا اردو ترجمہ بھی ۔ اور اس میں اگرچہ ہماری رائے کوئی وزن نہ رکھتی ہو پھر بھی سمجھ میں یہی آتا ہے کہ وہ بھی اس کے بڑے استاد تھے کیوں‌کہ اصل کا ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ بہت ہی رواں، سلیس اور با محاورہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ فارسی کے وہ معمے یا پہیلیاں جو ان ہندی اردو والی پہیلیوں کے ساتھ دی گئی ہیں انھیں کی ہیں یا کسی دوسرے استاد کی۔ بہرحال جس‌قدر ہیں، خوب ہیں اور وہ عبارت جو اس پہیلی‌نامہ کو شروع کرتے ہوئے انھوں نے لکھی ہے، مجمل سی ہے جو یہ ہے "چند پہیلی در ایں اوراق از تالیف خود ایں عاصی بہ تحریر آورد" بعد کو فارسی کو سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے اور ہندی یا اردو کو سیاہ سے ۔ ذیل میں چند پہیلیاں مع اصل درج کی جاتی ہیں تاکہ ان کے اس ذوق کا صحیح اندازہ ہوسکے جس کو سن کر آصف الدولہ بھی پہروں جھومتے رہے تھے جیسا‌کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ۔

(۱) پہیلی باسم محمد (ف) ثنا کردہ شدہ نامش عیاں‌ست منوّر بر زمین و آسمان است
(اردو) کون ایسا پرکھ ہوا پیدا جس کا دونوں جہان ہے شیدا
ہے وہ سلطان سب خدائی کا اور محمود کبریائی کا

(۲) پہیلی کنکوا (ف) چیست آں چیز می‌پرد بہ فلک نام آں گوش زاغ داں بےشک
(اردو) کاں کا کاگا اس کا ہیگا ناٗنوں کہہ‌دو تم‌ارتھ‌یا‌کہ چھانڈو‌گانوں

(۳) پہیلی چادر (ف) عجائب زنے دیدہ ام آشکار کہ دراسم‌آں زن حروفند چار
اگر کم نمائی دو حرف اخیر ہماں چار ازاعداد‌آں زن بہ‌گیر

چو حرف سیم را بر آری ازاں — بماند ہماں چار ازو بے گماں
از اول دو وز آخرش گر یکے — کنی حذف ماند ہماں بیشکے
وگر چار را دور سازی ازاں — ہماں چار می‌ماند از وے بداں
(اردو) اچرج کی اک دیکھی نار — حرف تو اس کے چار بچار
چار سے گر ہو ایک قلم — چار کا اس پر ہووے رقم
کم ہوں اگر دو حرف آخر — چار عدد ہوں تب بھی ظاہر
کردو اول آخر ایک — کم ہوں تب بھی چار ہوں لیک
دور اگر تو کردے چار — پھر بھی اس دم چار بچار

یہ پہیلی تشریح طلب ہے جس کی شرح یہ ہے :— یعنی اگر دو حرف آخر کے (دال اور رے) اڑادیں تو چا باقی رہے گا جس کے ابجد کے حساب سے وہی چار عدد لیے جائیں گے ۔ اور اگر حرف سیم (دال) کو دور کریں تو چار خود باقی رہتا ہے ۔ اور اگر چار نکال دیں تو صرف د باقی رہے گی اس کے بھی چار عدد ہیں ۔ اور اگر دال کو دور کریں تو بھی چار باقی رہے ۔ اور اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ۔ ایک یہ لفظ دال دور کریں؛ دوسرے یہ کہ عدد دال دور ہو ۔

(٤) پہیلی عدد ۹ (ف) آن کدامی عدد بود بہ جہاں — کہ کنی ہر قدر مضاعف آں
بار بار آن عدد کنند تکرار — صورت اولیں بیارد بار
ثانیش نیست ہرچہ گوئی اوست — ہرکہ فہمید آفریں براوست
(اردو) طرفہ اچرج وہ کونسا ہے عدد — کردو دو چند پھر وہی ہو بہ کد
اس عدد کو جوتا ہزار ہزار — کرو دونا تو اس کی ہو تکرار

تشریح اس کی یہ ہوسکتی ہے کہ نو کو جہاں تک دونا کیجیے اور اس پر نو کے عدر کا اضافہ کرتے جائیے نو ضرور باقی رہیں گے ۔ مثلاً نو کو دونا کریں تو اٹھارہ ہوگا اور آٹھ ایک سے نو کی صورت پیدا ہوگی ۔ پھر نو بڑھائیں تو ۲۷ ہوجائیں گے اور وہی دو اور سات نو باقی رہیں گے ۔ پھر چھتیس ہوں گے جس میں تین اور چھے مل کر نو ہوں گے غرض اسی طرح ارب اور کھرب تک یہ حساب چلاجائے گا ۔

(۵) پہیلی چھچھوندر (ف.) چیست آن هر دو چیز دو ده رنگ　　اسم یک آن یکے است شوخ و شنگ
می تپد بر زمیں به سوز و گداز　　آں زماں بر فلک کنند پرواز
واں دگر همچو صور تے دارد　　طبع از وے کراهتے دارد
(اردو) نام هے ایک اور هیں دو نار　　اک بےجاں هے اک جان دار
دیکھو تو اس کو شعله پیشه هے　　بیستوں وه شرار تیشه هے
هے تڑپتی وه داغ کر پاوے　　هے پتنگا چراغ کر پاوے
دوجے دیکھو تو یه حکایت هے　　دل کو نفرت هے کیا قیامت هے

اسی طرح کی بسمل کی حسابی پہیلیاں هیں جو بہت سی هیں اور جن میں ریاضی نکتے حل کیے گئے هیں مگر نمونه کلام کے لیے اس سے زیاده ضرورت نہیں معلوم هوتی لهذا اب هم ان کی اس صنف خاص کی طرف توجه کرنا چاهتے هیں جس میں ان کو کم از کم اپنے معاصرین سے امتیازی شان حاصل هے اور اودھ میں جس کے آغاز کا سهرا انهیں کے سر هے ـ وه صنف مثنوی هے جس پر هم ایک تفصیلی بیان دے کر اس کے نمونے پیش کریں گے :-

مثنوی کے لیے آٹھ ضروری هدایات

(۱) دوسری قوم و زبان کی دیکھا دیکھی همارے ملک کے با کمال نقادوں کو بھی یه شکایت پیدا هوگئی هے که هندوستانی مصنفین اپنی مثنوی کے قصے کی بنیاد جن باتوں پر رکھتے هیں وه دور از کار فوق العادت یا خرق عادات سے کم نہیں هوتیں ـ ممکن هے که یه خیال صحیح بھی هو؛ مگر غور سے دیکھا جائے تو هر قوم اور ملک کی ادبیات میں اس قسم کی چیزین ملیں گی، صرف هندوستانی شاعر هی گناه‌گار نہیں ـ مگر اس پر بھی اگر اس خیال کی پابندی کی جائے تو اور بھی اچھا هے ـ

(۲) دوسری بات جس پر سب عقلا اور اُدبا کا اجماع رها هے اور جس سے کسی کو بھی انکار نہیں وه یه هے که کسی جگه پر مثنوی میں ربط کلام اور تسلسل کم نه هوجائے ورنه نقاد یه کہنے پر مجبور هوگا که مثنوی‌نگار اپنے فرض سے عہده‌برآ نہیں هوا ـ

(۳) مبالغہ کہیں کہیں زینت کلام بن جاتا ہے مگر غلو اور اغراق کی سرحد میں پہنچتے ہی سب بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے ۔ ہر چند کہ مثنوی‌نگار کے لیے مورخ کی طرح مبالغہ حرام نہیں، مگر یہ نہ ہو کہ اصل مقصد غایب ہوکر مبالغہ ہی مبالغہ باقی رہ جائے ۔

(٤) بادشاہ کی زبان سے فقیروں کی اوچھی اور چھوٹی باتیں اور ایک چھوٹے آدمی سے امرائے عالی‌شان کی سی ڈینگیں کبھی اچھی نہیں معلوم ہوتیں ۔ ایک جوان بڈھوں کی سی باتیں کرکے اور ایک بڈھا جوانوں کی مانند شیخی بگھار کے کبھی حق بجانب نہیں ٹھہرسکتا اس واسطے حسب موقع گفتگو اور جذبات کو کبھی اور کہیں نظرانداز کردینا کوتاہیٔ بیان کا مرادف ہوگا ۔

(٥) محاکات کے فرایض بہ احسن وجوہ و طرق انجام دینا ۔ یعنی کسی داخلی جذبہ اور خارجی امر کی الفاظ کے رنگ اور بیان کے روغن سے ویسی ہی تصویر کھینچ دینا جیسی کہ وہ دراصل ہے تاکہ پڑھنے والے کی نگاہ میں وہی منظر پھر جائے ۔

(٦) تجربے اور مشاہدہ کو کبھی نظرانداز نہ کیا جائے اور جو کچھ کہا جائے وہ اسی‌طرح جیسے ہوتا آیا ہے اور جیسے دیکھا گیا ہے ۔

(۷) بہت سی باتیں صاف کہنے میں کہیں کہیں بےمزگی اور کہیں عریانی پیدا ہوجاتی ہے اس لیے کنایہ کو تصریح پر ترجیح دینا چاہیے کیوں‌کہ ایسی جگہ رمز و کنایہ ہی اچھا معلوم ہوتا ہے ۔

(۸) ایک کہی ہوئی بات کو اس‌طرح مدنظر اور یاد رکھا جائے کہ آیندہ کوئی بات بھول‌کر بھی اس‌کے خلاف نہ نکل جائے کہ‌ساری باتوں کی تردید ہو جائے ۔

(۹) بیان میں اغلاق اور گنجلکیں نہ ہونا چاہییں ۔ کلام میں روانی، زبان مین سلاست اور محاوروں کی چاشنی ضروری چیزیں ہیں، مگر خیال رکھا جائے کہ اس صفائی اور سادگی کے پھیر میں اتنا نہ پڑ جائے کہ خود مصنف کی زبان دائرۂ شرفا سے نکل‌کر اراذل کی حدود میں جا پہنچے ۔ اور ایک خوبی برائی پیدا کرکے متانت کو رکاکت‌خیز بنادے ۔ اور یہ سب سے بڑا نقص ہوجائے ۔ وقت نہیں اور ایک خاص مضمون

پر قلم اٹھایا جارھا ھے ورنہ بتایا جاتا کہ بہت سے خوش‌گو محض زبان کی فکر میں پڑکر عامیانہ روش اختیار کرتے ہوئے گمراہ ہوگئے اور ان کے بلند خیالوں کو یہ رکاکت پرستی سیلاب کی‌طرح بہا لے گئی۔

بسمل کی مثنویاں دو ھیں جن میں ایک کا نام حسن و عشق ھے اور یہ مثنوی سنہ ۱۲۰۳ھ میں لکھی گئی۔ اور دوسری کا نام پارسانامہ ھے جو اس مثنوی کے پورے دس برس یعنی بعد سنہ ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی۔ جب دونوں مثنویوں میں ان صفات کو ڈھونڈھا جاتا ھے تو وہ ایک ایک کرکے نظر آنے لگتی ھیں جن کو آگے چل‌کر ہم تفصیلی طور پر بیان کریں گے۔ فی‌الحال دونوں کے عالم وجود میں آنے کے اسباب لکھتے ھیں۔

جیسا کہ لکھا گیا مثنوی حسن و عشق سنہ ۱۲۰۳ھ میں لکھی گئی اور مصنف نے اس کے متعلق یہ بیان دیا ھے کہ میں جواھرعلی خاں خواجہ‌سرا نواب ناظر کی خدمت میں رھتا تھا اور شب و روز وھیں گزرتی تھی۔ اس بات کا اکثر ذکر ھوتا تھا کہ عشق میں بڑی تاثیر ھے، عاشق کی فریاد و زاری اور تکلیف کا معشوق پر ضرور اثر پڑتا ھے اور آخرکار عشق حسن کو بھی اپنے رنگ میں شرابور کرلیتا ھے۔ ھوتے ھوتے ایک روز میر کی مثنوی دریائے عشق پڑھی گئی۔ اور مرزا محمدتقی خاں (ترقی) نے پڑھی جو نہایت عمدہ پڑھنے والے بھی تھے اور شاعری کے بھی استاد کامل تھے۔ جب نواب ناظر نے اس کو سنا تو افسانہ کی بڑی تعریف و توصیف کی بلکہ یہاں‌تک تعریف میں مبالغہ فرمایا کہ میرصاحب خوب فرماتے ھیں اور اب اس سے اچھی مثنوی کوئی کیا کہے‌گا۔ اس‌کے ساتھ ھی مجھ سے یہ فرمایش کی کہ تو شعر و شاعری میں اپنے وقت کا استاد کامل ھے۔ میں تجھے ایک قصہ سناتا ھوں تو اس کو لکھ اور ایسا لکھ کہ قیامت تک تیرا نام رھے۔ مگر نہایت درد انگیز طریق پر لکھنا۔ مجھے تعمیل ارشاد کرنا پڑی اور آخر میں یہ مثنوی کہنے لگا۔ ورنہ مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا۔ وجہ تالیف کا یہی خلاصہ ھے۔ اب ذرا بسمل کی زبان سے اس موقع کے اشعار سن لیجیے جو ملخص کے طور پر لکھے جاتے ھیں:—

کروں در پردہ تا کے وصف ارقام　　جواھر خان ذی‌شان اس کا ھے نام

کرم کے بحر کا یکتا ھے وہ در ۔۔ لقب نواب ناظــر ھے بہــادر
میں رہتا اس کی خدمت میں تھا دن رات ۔۔ نہ تھی بندے سے پوشیدہ کوئی بات
ھمیشہ لوگ یہ کرتے تھے تقریر ۔۔ عجائب عشق کی دیکھی ھے تاثیر
کتاں کا چاک گر ھوتا ھے دل آہ ۔۔ تو سینہ پر رکھے ھے داغ اک ماہ
جو بلبل بےکلی سے نوحہ‌گر ھو ۔۔ تو غنچے کا وھیں ٹکڑے جگر ھو
یہ ھے تاثیر عشق کاہ درپے ۔۔ کہ اب تک کہربا تنکے چنے ھے

چناں‌چہ ایک شب کا ھے یہ مذکور ۔۔ پڑھی گئی مثنوئ میر مشہور
ھوا تھا اس میں بحر عشق جاری ۔۔ اسی میں نام تھا تھی خوب ساری
عجائب داستاں تھی وہ الم کی ۔۔ کہ عاشق اس کے نے راہ عدم لی

پڑھی اس نے ھے پڑھنا جس سے ایجاد ۔۔ بفن عاشقی مجنوں و فرھاد
بہ فن شعر ھے استاد عالم ۔۔ نہیں کوئی ویسا کامل اور آدم
سبھی اس مثنوی کو بولے سن کر ۔۔ نہیں یہ مثنوی ھے گنج گوھر

یہ سن نواب ناظر نے حکایت ۔۔ وھیں اٹھ بیٹھے تب از خواب راحت
یوں فرمایا کہ افسانہ ھے یہ خوب ۔۔ ھے دریا عشق کا یہ سب کا مرغوب
نہیں ھے کوئی کہتا ھے اس سے بہتر ۔۔ غلط ھے یہ گماں سب کا سراسر
* میاں جب عاشقوں نے کچھ نہ چھوڑا ۔۔ تو منہ مے خانۂ ھستی سے موڑا
سناؤں اس سے بہتر تم کو سرکار ۔۔ کرو تم قدرت حــق کا نہ انــکار
ھنوز آن ابر رحمت درفشان است ۔۔ مے و میخانہ بــا نــام و نشان است
یہ فرماکر کیــا بسمل کو ارشــاد ۔۔ کہ فن شعر میں تو ھیگا استاد
یہ قصہ ھیگا یوں کر اس کو تحریر ۔۔ کہ سب شعرا میں تیری ھوگی توقیر
زباں سے وہ سخن کردے سر انجام ۔۔ رھے محشر تلک جس سے ترا نام
خم دل میں شراب درد بھردے ۔۔ پیالے چشــم کے لبــریز کــردے

* حریفاں بادہ‌ھا خوردند و رفتند ۔۔ تہی خمخانہ‌ھا کردند و رفتند ۔۔ جامی

بموجب حکم انور کے یہ بسمل لگایا کہنے پر اس قصے کے دل
خیال اس مثنوی کا مجھ کو کب تھا محرک ہونے کا ان کے سبب تھا

یہ معلوم کرنے کے بعد چند باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ (۱) میر کی مثنوی دریائے عشق سنہ ۱۲۰۳ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ (۲) میر کی مثنوی دریائے عشق بہت مشہور تھی اور لوگ اس زمانے میں بھی اس کو مانتے تھے۔ (۳) یہ مثنوی اتنی مقبول ہوئی تھی کہ لوگوں نے اس کے انداز میں دفتر لکھے۔ چناں چہ اگر مان لیا جائے کہ مثنوی مصحفی کی مثنوی بحرالمحبّت یا قائم کی وہ مثنوی جس کا یہ مطلع ہے اور غلطی سے کلیات سودا میں داخل ہوگئی ہے

الٰہی شعلہ زن کر آتش دل تب دل دے بقدر خواہش دل

اسی کے طرز پر لکھی گئیں تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

میر صاحب نے اس مثنوی میں یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک جوان نہایت حسین تھا مگر اس کو حسن سے ایسا لگاؤ تھا کہ ہر جگہ اور ہر حال میں اسی فکر میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک کوچے میں اس کا گزر ہوا؛ وہاں کوئی حسینہ نگاہ سے گزری؛ دل و دین کھوکر مجنوں ہوگیا اور اس قدر رسوا ہوا کہ سب جگہ بدنام ہوا اور اس بدنامی کا اس عفیفہ پر بھی کافی اثر پڑا اور اس کی بھی بدنامی ہوئی۔ لڑکی کے اقربا نے اس کو مار ڈالنا چاہا مگر پھر یہ مناسب نہ خیال کرتے ہوئے اس خیال سے باز رہے۔ جب بہت زیادہ بدنامی ہوئی تو یہ تدبیر ٹھہری کہ ایک مکار دایہ کے ساتھ اس کو دریا کی طرف روانہ کیا۔ یہ سودائی بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔ زارنالی کے ساتھ معشوق کی تغافل کیشی کا گلہ کرتا ہوا جارہا تھا کہ دایہ نے ازراہ فریب اس کو تسلی دے کر خاموش کیا یہاں تک کہ دریا پر پہنچ کر کشتی پر عبور کرنے کے لیے سب سوار ہوئے۔ منجدھار میں آئے تو دایہ نے ایک جوتی اس حسینہ کی دریا میں پھینک اور پھر نوجوان سے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے تیری معشوقہ برہنہ پا رہ گئی؛ جا دریا سے جوتا نکال لا۔ یہ بچارہ دریا میں کودا اور وہیں ڈوب گیا۔ جب اس مخمصہ سے نجات حاصل کرکے دایہ اس کو گھر لے آئی تو ایک ہفتہ کے بعد اس حسینہ

نے فرمایش کی کہ اب تو وہ غرق ہو ہی گیا، بدنامی کا بھی کوئی ڈر نہیں، چلو ذرا دریا پر جی بہلائیں کیوں کہ مجھے ایک الجھن سی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دریا پر گئی اور پوچھا کہ وہ آدمی کہاں ڈوبا تھا ۔ اس نے بتا دیا ۔ سنتے ہی یہ اس جگہ کود پڑی اور ڈوب گئی ۔ بعد کو دونوں کی لاش دست و بغل ملی ۔

یہ قصہ اتنا ہی ہے مگر میر صاحب نے اپنی قوت بیان سے اس مثنوی میں بہت سے گوشے پیدا کر لیے ہیں ۔ چناں چہ تمہید کے طور پر عشق کے حالات بیان کرتے ہوئے تقریباً بتیس شعر لکھے ہیں ۔ اس طرح جوان کی عشق‌پسندی اور عاشق‌مزاجی کے نو شعر اور جوان کی حسینہ پر نگاہ پڑنے کے بعد کے ۱۹ شعر، جوان کی حالت مجنونانہ کے بیس اکیس شعر، تاثیر جذب عشق کے آٹھ نو شعر، جوان عاشق کے شکوے اور معشوق کے تغافل کے ۱۳ شعر نظر آتے ہیں اور چوں کہ درد انگیز قصہ ہے اس واسطے اول سے آخر تک جذبات ہی جذبات ہیں ۔

بسمل نے بھی دوسرے شعرا کی طرح اسی مبحث پر قلم اٹھایا ہے ۔ ہر چند کہ یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس میں میر صاحب سے کچھ زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا گیا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ یہ قصہ اس سے بڑا ہے اور اس میں بیان کو بہت زیادہ وسعت دی ہے اور مختلف مواقع بیان کی قدرت دکھانے کے نکال لیے گئے ہیں ۔ پہلے قصہ سن لیجیے، اس کے بعد اندازہ کرنا چاہیے کہ ان کو اس بیان میں کتنی کامیابی ہوئی ۔ قصہ یہ ہے جو مختصراً بیان کیا جاتا ہے ۔

ایک سوداگر کا لڑکا نہایت حسین و جمیل تھا لیکن نہایت خود رفتہ، عاشق‌مزاج تھا اور عشق کی کہانی سننے کے سوا اس کو کوئی کام ہی نہ تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ میں عشق کو خود دیکھوں اور سمجھوں ۔ اسی لیے عشق سے مدد چاہتا تھا ۔ ایک دن عشق کو جب واسطے دلائے تو عشق نے اس سے کہا کہ تو بڑا آدمی ۔ میری اور تیری صحبت برآر نہیں ہوسکتی ۔ اگر تو چاہتا ہے کہ مجھ سے کوئی لطف اٹھائے تو سب ساز و سامان چھوڑ کر دیوانہ ہوجا اور کوچہ بہ کوچہ، صحرا بہ صحرا پھرا کر ۔ سوداگر پسر نے عشق کی اس نصیحت پر عمل کیا اور دیوانہ ہوکر گھر سے نکل گیا ۔

ماں باپ نے بہت کچھ کیا مگر سودمند نہ ہوا ۔ اور یہ مارا مارا پھرنے لگا یہاں تک کہ بالکل بے طاقت ہوگیا۔ عشق نے کہیں اس کو دم نہیں لینے دیا۔ پھرتے پھرتے ایک جنگل میں آیا جو بہت شاداب تھا ۔ یہاں اس کے دل میں یہ بات آئی کہ مزارات اولیا پر چل کر رہیں۔ چناں‌چہ وہ ایک روضہ پر پہنچا اور فاتحہ پڑھا ۔ یہیں اس کو نیند آگئی اور ایک خواب دیکھا جس میں اس کو ایک حسین نظر آیا اور اس نے کہا کہ تجھے میرا عشق ہے مگر کچھ میری بھی خبر ہے کہ تیری وجہ سے میں کس قدر بےقرار ہوں۔ خدا کا شکر کہ میں نے تجھے دیکھ لیا ۔ میں بھی تیرے غم میں مارا مارا پھرتا ہوں، ملوں گا تو اپنا حال کہوں گا ۔ اس نے معشوق کا نام پوچھا تو اس نے کنایتاً منوھر نام بتایا ۔ پھر کسی نے اس کو جگا دیا اور یہ اسی طرح آوارہ پھرتا رہا ۔

دوسری طرف کا یہ حال ہے کہ ختن کے ملک میں چنپاپٹن کوئی جگہ تھی۔ وھاں ایک راجا تھا جو نہایت ذی‌شان تھا یہ شہر آباد تھا۔ اور یہاں کی رعایا انتہائی دل‌شاد تھی ۔ اس راجا کا ایک لڑکا تھا جس کا نام منوھرچند تھا ۔ چناں‌چہ ایسا ہی خواب اس نے دیکھا اور شوریدگی کا عالم اس میں بھی پیدا ہوگیا ۔ نہایت بےقرار ہوا اور دل بہت بےتاب رہنے لگا تو باپ کو ساتھ لے کر سیر کے لیے نکلا ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں پھرنے لگا ۔

سوداگر بچہ جس کا مہجور نام تھا، مارا مارا پھرتا رہا۔ اسی روضہ کے قریب ایک گانو تھا ۔ وھاں سے قریب ہی ایک جوگی یا بیراگی رہتا تھا اور اس نے اپنا تکیہ بنا رکھا ۔ شدہ شدہ یہ وھاں پہنچ گیا ۔ بیراگی نے اس کو دیکھ کر حال پوچھا اور اس پر مہربان ہوکر کہا کہ تو ہمارے پاس رہ، یہیں تیرا مقصد حاصل ہوگا ۔ یہ وہیں رہنے لگا اور کچھ جنون میں افاقہ ہوگیا ۔

یہ جوگی بہت ہی مقبول خلایق اور ہردلعزیز تھا ۔ اتفاقاً اُتّم‌چند راجا مع اپنے لڑکے منوھرچند کے اس نواح میں آیا ۔ اس کو یہ خطہ بہت پسند آیا اور وہ شدہ شدہ اس بیراگی کے پاس پہنچا۔ نذر پیش کرکے کہا کہ آپ ہمارے دھرم آتما ہیں، مجھے اس وقت

بڑی پریشانی ہے ۔ میرا لڑکا بیمار ہے ۔ وہ ہر وقت نہ معلوم کیوں رنجیدہ رہتا ہے ۔ اس کے لیے کچھ دعا کیجیے ۔ اگر حکم ہو تو اسے بلاؤں ۔ اس نے اجازت دے دی ۔ منوہرچند کو بلایا گیا ۔ اتفاق سے کوئی طوایف بھی کسی ضرورت کے لیے جوگی کے پاس آئی تھی اور مجرا کررہی تھی ۔ محفل نشاط برپا تھی، سماں بندھا ہوا تھا ۔ منوہرچند سلام کرکے بیٹھ گیا اور اپنا حال کہا ۔ جوگی نے دعا دے کر کہا کہ خدا بھلا کرےگا ۔ دیوانہ مہجور بھی کسی گوشہ میں پڑا ہوا تھا ۔ آج جو اس نے یہ چہل پہل اور یہ شور و غل سنا تو گھبرا کر اٹھا اور محفل میں آیا ۔ دیکھا کہ ناچ ہو رہا ہے اور وہ فتنہ عالم بھی موجود ہے جس کی لو لگی ہوئی تھی ۔ منوہر اور مہجور کی آنکھ چار ہوئی ۔ یہ دونوں بے ہوش ہوگئے ۔ منوہر کے نوکروں اور ساتھیوں کو گمان ہوا کہ جوگی نے منوہر پر کوئی جادو کردیا ۔ مگر جوگی نے سمجھایا کہ یہ عشق کے اسرار ہیں، عوام کی سمجھ سے باہر ہیں ۔ اور اس کے بعد پورا واقعہ سنا دیا اور کہا کہ گھبراؤ نہیں، اب دونوں ہوش میں آجائیں گے ۔ اب تو جا، منوہر کو بھی لےجا اور مہجور کو بھی، دونوں کو ساتھ رکھنا؛ کبھی جدا نہ کرنا ورنہ خطا پائےگا ۔ راجا مہجور اور منوہر کو ساتھ لےکر اپنے وطن پہنچا ۔ دونوں ساتھ رہنے لگے اور دونوں بےحد خوش و خرم تھے کہ دراندازوں نے مہجور سے راجا کو بدگمان کرکے اس کو وہاں سے نکلوا دیا ۔ اس کے جاتے ہی منوہرچند پھر بیمار ہوا اور باوجود دوادوش کے بھی سنبھل نہ سکا ۔ آخر کار مدقوق ہوگیا ۔ اس وقت راجا کو جوگی کی نصیحت کا خیال آیا اور پھر مجہور کو بلایا، مگر کام حد سے گزر چکا تھا؛ اب اس تدبیر سے کچھ فائدہ نہ ہوا اور منوہر مرگیا ۔ اور سب اس کو جلانے کے لیے لے گئے ۔ منوہر کو چتا میں رکھکر جلا دیا تو راجا نے سوچا کہ اب مہجور کو ساتھ رکھوں کہ اس سے منوہر کی یاد تازہ رہے اور غم غلط ہو ۔ دیکھا تو وہ ایک درخت سے لگا کھڑا تھا اور خود بخود جل‌کر خاک ہوگیا تھا ۔

قصہ صرف یہی ہے جس کو ۱۴۱۴ اشعار میں لکھا گیا ہے ۔ اور بخلاف میر صاحب کے کہ انھوں نے اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے، بسمل نے بہت سے گوشے نکال کر

جس قدر محاکات اور مناظر کے موقعے آتے گئے ہیں، کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چناں چہ مندرجہ ذیل جگہیں ہیں جہاں پورے طور پر ان کا زور قلم صرف ہوا ہے اور داستان کو ساقی نامے سے شروع کیا گیا ہے جو بجائے خود صنعت براعۃالاستہلال کا کام دے رہا ہے۔ تفصیل مناظر و محاکات و زور بیان:—

(۱) حمد (۲) نعت (۳) مدح نواب ناظر (۴) وصف جمال ممدوح (۵) تعریف محمد تقی خاں بہادر، ترقی (۶) تاجر پسر مخمور یا مہجور کی وارفتہ مزاجی (۷) حق سے تولا اور طلب عشق (۸) عشق کی صفات (۹) مخمور کی روانگی اور بےتابی (۱۰) ماں باپ کا اضطرار (۱۱) ایک رات کے مصایب (۱۲) مخمور کی آوارہ گردی (۱۳) بہار باغ (۱۴) سراپا (۱۵) طوائف کا ناچ (۱۶) عاشق و معشوق کی بےہوشی (۱۷) عشق کے صفات (۱۸) منوہر اور مخمور کی بےقراریاں (۱۹) گردش زمانہ (۲۰) عبرت۔

یہ ہیں وہ مقامات جہاں مصنف نے شاعرانہ زور صرف کیا ہے اور نہ صرف یہ کوشش ہی کی ہے بلکہ وہ کامیاب بھی ہوگئے ہیں۔ اب ہم نعت و حمد اور وصف کے اشعار چھوڑ کر ان کے بعض بعض جگہ کے اشعار پیش کرتے ہیں۔

تاجر پسر مخمور ہر چند کہ گھر سے خوش حال تھا مگر اس کی وارفتہ‌مزاجی کا یہ عالم تھا کہ حسن کے کسی ادنے سے ادنے منظر کو دیکھ کر بھی وہ بےاختیار ہوجاتا تھا۔ وہاں لکھتے ہیں:—

نہ لگتا تاجری میں دل تھا اس کا — وہ ایسے کاموں سے رہتا بری تھا
رہائی سے نہ تھا کچھ اس کے تئیں کام — سدا رکھتا تھا مرغ دل کو در دام
تھا درد اک دل میں اور تھا سوز جاں میں — مثال نے تھا نالہ استخواں میں
کوئی گر گلبدن دیتا دکھائی — تو وہ بلبل نمط ہوتا فدائی
کہیں گر دیکھتا وہ اچھی صورت — صنم کی طرح بن جاتا تھا مورت
اگر چشم سیہ آتا نظر تھا — تو وہ دن شب سے بدتر تیرہ تر تھا
اگر آتا نظر غنچہ دہاں تھا — تو دل تنگ اس کا ہوتا غنچہ ساں تھا

یوں تو حسن کی حالت سے عشق کا تقابل ھر جگہ دکھایا ھی ھے مگر تیسرا شعر ازروئے تشبیہ جس قدر مکمل ھے، اس کی مثال شعر کے بڑے بڑے دفتروں میں بھی نہ ملے گی۔ نے کی طرح نالے کا استخواں میں بھر جانا بالکل نئی بات ھے۔

خدا سے طلب عشق کرتے ھوئے مصنف کو اک جوش سا آگیا ھے۔ سادگی، روانی اور جوش شاعری کی بہترین اور اجماعی تعریفیں ھیں۔ اس میں اگر معنی آفرینی اور بلاغت بھی ھو تو سبحان اللہ! ھم سمجھتے ھیں کہ مصنف نے اس جگہ ھر اس چیز کی کوشش کی ھے اور پھر بھی آمد کی شان کو قایم رکھا ھے۔ ملاحظہ ھو:—

دعا کرتا تھا نت حق سے وہ شیدا — کہ عشق و حسن ھیگا تجھ سے پیدا
تو ھے سر چشمہ فیض و فتوت — تو ھے کان سخا بحر مروت
مجھے کر عشق کی مے سے تو مخمور — ولے وہ عشق صادق ھیگا منظو
امڈ آیا ھے ابر از غرب تا شرق — مجھے بھی بحر مے میں کردے تو غرق
پھر حضرت عشق کی جانب کیا رو — قسم پر سو قسم دینے لگا وو
سیہ مستی گھٹا کی تو نظر کر — یہ آتی ھے چلی دوش ھوا پر
تو آجلدی کہ اب مجھ میں نہیں تاب — قدح کر دے لبالب لا مئے ناب
تجھے مہر درخشاں کی قسم ھے — تجھے اس ماہ تاباں کی قسم ھے
روا مت رکھ تو میری تشنہ کامی — قسم تجھکو بہ مولانائے جامی
قسم ھے تجھکو اپنے زلف و رو کی — قسم ھے تجھکو گل کے رنگ و بو کی
قسم اپنے دہان تنگ کی ھے — قسم غنچے کے آب و رنگ کی ھے
تجھے اپنی ملاحت کی قسم ھے — مرے دل کی جراحت کی قسم ھے
تجھے شیشہ ڈھلکنے کی قسم ھے — تجھے ساغر چھلکنے کی قسم ھے
قسم ھے نالۂ مے کی تجھے عشق — قسم ھے نشۂ مے کی تجھے عشق
قسم ھے تجھکو میری چشم تر کی — قسم ھے میری آہ بے اثر کی
قسم ھے میرے فریاد و فغاں کی — قسم ھے عندلیب بوستاں کی
مری الحاح و زاری کی قسم ھے — مری بے اختیاری کی قسم ھے

تجھے یوسف زلیخا کی قسم ہے | تجھے ان دونوں شیدا کی قسم ہے
قسم ہے تجھ کو نل کی اور دمن کی | قسم فرہاد و شیریں کے ذقن کی
قسم ہے لیلی و مجنوں کی تجھ کو | اور ان کے دیدۂ پرخوں کی تجھ کو
تجھے گل اور بلبل کی قسم ہے | تجھے مل اور قلقل کی قسم ہے
تغافل کو جو اب فرمائیے تو کام | مرا بھی عشق سے بھردے تو اب جام
مرے اس حال پر ٹک تو نظر کر | میں کشتہ ہوں مجھے دے جام بھر کر

کسی شعر میں نہ جوش و سادگی کی کمی ہے نہ مبالغہ ہے نہ اغراق ہے؛ نہ وہ بدعت ہے جو ناسخ نے اودھ کی شاعری میں بھرکر ایک نیا اسکول قایم کیا اور بالآخر اسے اتنا پست بنا دیا کہ وہ آج تک دنیائے ادب میں نہ صرف قابل تضحیک بلکہ قابل نفرت بھی ہے -

عشق کے صفات خود عشق ہی کی زبانی اس قدر سبک اور لطیف کرکے بیان کیے ہیں کہ باید و شاید - انداز بیان میں استعاوات کا زیادہ استعمال ہے مگر جو بات ہے وہ کھبتی ہوئی اور پھبتی ہوئی - مبالغہ ہے مگر مبالغہ معلوم نہیں ہوتا - دیکھیے :-

عجب یہ راہ ہے سن اے دوانے | کہ تھک جاتے ہیں اس جا جانے والے
عجب وہ باغ ہے استغفر اللہ | کر اس کی سیر دل ارزے ہے باللہ
جھکا دیتا ہے وھاں بار ثمر شاخ | نشے سے جھوم جھوم آتی ہے ہر شاخ
ہوا سے شاخ گل یوں جھومتی ہے | کہ آ کر وہ لب جو چومتی ہے
بھریں ہیں لوٹتے اس مے سے دن رات | چمن میں کیا ثمر کیا شاخ کیا پات
نسیم صبح بھی اتنی ہے ماتی | کہ پھرتی ہے چمن میں لڑکھڑاتی
گل مخمل پہ بیداری ہے نایاب | جہاں دیکھو تو ہے آلودۂ خواب
کھلے داؤدی کے غنچے چمن میں | وہ کف لائے ہیں مستی سے دھن میں
اٹھا سکتی نہیں سر ہوکے بے حس | جھکی جاتی ہے دیکھو چشم نرگس
قبا گل پھاڑتا ہے ہوکے سرشار | رہے ہے لٹپٹی سوسن کی دستار

کسی لاڈلے بیٹے کا اپنے ماں باپ سے جدا ہونا اور خاص کر بےوجہ اور پھر وہ بھی مجنوں و مخبوط الحواس ہوکر؛ نہایت رقت‌خیز اور دل‌شکن ہوتا ہے ۔ مگر کوئی قادرالکلام بیان کردے تو دلوں پر غم و الم کا پہاڑ گرنے لگتا ہے ۔ بسمل نے اس منظر کو مختصراً یوں پیش کیا ہے :ـــ

اسے تو عشق کی تب نے تھا مارا پڑا دھکے تھا روز و شب بچارا
تھا رنگ سرخ سے چہرہ ہوا زرد نسیم آسا وہ بھرتا تھا دم سرد
کبھی آنکھوں سے تھا آنسو بہاتا کبھی ہنس ہنس کے تھا ان کو تپاتا
تھا ساری رات رھتا بےخور و خواب کہ جیسے چودھویں شب کا ہو مہتاب
سبھی ہمدم تھے اس سے عرض کرتے خدا کے واسطے اک دم تو سو لے
بنی تھی دم پر اس کے سو‌ے کیوں کر انی برچھی کی تھی ہر موسے تن پر
نگہ جب پیرہن پر اپنے جاتی تو خاکستر نظر وہ تن پر آتی
اسے تب دور کرکے اپنی بر سے پہن کفنی چلا وہ اپنے گھر سے
گریباں چاک کرکے تا بہ داماں لی اس نے آخرش راہ بیاباں

یہ حالت دیکھ کر ماں چلچلائی پکڑ دست پسر کو تلملائی
ہوا تھا رنگ چہرہ اس کا کاھی سراپا تھیں علامات تباھی
علم آرا ہوئی دیوانگی تھی شکیب و صبر سے بیگانگی تھی
نظر کرتا تھا حیرت سے یہ ہر سو حباب آنکھیں تھیں گویا بر لب جو
نہ فکر روزی و نے خواھش قوت ہوا تھا عشق میں ایسا وہ مبہوت
لگا یوں عرض اپنی ماں سے کرنے قدم پر اس کے لا کا سر کو دھرنے
لگی ہے آگ میرے تن بدن کو میں چھوڑا زندگانیِ وطن کو
کروگی میرے گر جانے کا انکار تو مرجاؤں کا گھٹ کر آخرکار

ہوئی تحقیق کرنے کے وہ درپے کہ سمجھے اس کو وہ احوال کیا ہے
لگی وہ پوچھنے اس سے بہ تکرار نہ تھا جز خامشی اس کو سروکار

طلب کر اپنے ہر ایک ہمنشیں کو رکھ ان کے پانو کے اوپر جبیں کو
یہی کہتی تھی ان سے کھینچ کر آہ عزیزو جاتا ہے میرا یہ دل خواہ
اگر سنبھلے تو تم اس کو سنبھالو اسے چاہ محبت سے نکالو
پدر مادر سے رخصت ہو وہ برنا خدا کا دیکھو کیا ہوتا ہے کرنا

اول سے آخر تک ایک رنگ ہے اور یہ یک‌رنگی اور کلام کی ہمواری صاف گواہی دے رہی ہے کہ وہ مشاق ہی نہیں بلکہ قادرالکلام تھے۔ زبان بالکل وہی ہے جو میرتقی‌میر، میرحسن، مصحفی، جرات، قایم کے یہاں ہے۔ کمال ہے کہ اودھ میں اردوئےمعلّے کی زبان کا ابتدائی دور ہو اور ایک یہاں کا باشندہ اس طرح اپنے مافی‌الضمیر کو صاف صاف بیان کرجائے کہ دلی والوں کو بھی نظر اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ کاش اگر لکھنؤ اور فیض‌آباد کانپور وغیرہ کی شاعری اسی شاہراہ پر آنکھیں بند کیے چلی جاتی تو نہ یہ ہفتاد و دو ملت کی طرح تفریقیں پیش آتیں اور نہ اس طرح ٹھوکریں کھاتی جیسی کہ کھاتی رہی اور ہر شخص کی نظر میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگی۔

مخمور جس رات کو دیوانہ بن کر نکلا ہے ذرا اس شب تاریک کا حال سن لیجیے اور ان تشبیہات و استعارات پر بھی نگاہ ڈالیے کہ کیا استعارات و تشبیہات کو اس سے زیادہ سہل کر کے کہا جا سکتا ہے اور کیا ایسی سلاست اعجاز بیاں سے کچھ کم ہے۔

نظر آتا نہیں ہے ہات کو ہات شب ہیگی تیرہ و بدتر ز ظلمات
پرندے اور درندے کو خطر ہے چھپا اس وقت ہر کوئی اپنے گھر ہے
بنا ہے شیر بھی اب شیر قالیں نہیں پائیں سے چڑھ سکتا وہ بالیں
گھٹا کالی ہے اور چلتی ہے اب لوں برستا ہے کا باراں حد سے افزوں
شب دیجور سے بدتر تھی وہ شب تھی کالی جوں دوات اندر مرکب
ہوئی تھی چشم انجم تیرہ و تار تھے بھولے سبعہ سیارہ بھی رفتار
بیاں کیوں کر کروں اس رات کا طول فلک شاید گیا تھا صبح کو بھول

ہم نے قدیم و جدید اردو کی بہتر سے بہتر مثنویاں دیکھی ہیں لیکن یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ وہ بھی اگر اس سے کم نہیں تو اس سے زیادہ بھی نہیں۔ ہمارے قول کو

نہ ماننا آسان ہے مگر اس کی تردید میں کوئی دوسری مثنوی پیش کرنا دشوار تر ہے -

مناظر کی نقشہ کشی اور محاکات سے عہدہ برآئی اگر فرایض شاعری ہیں تو بسمل نے اس فرض کو نہایت خوب‌صورتی سے ادا کیا ہے جس کا اندازہ ایک ہرے بھرے جنگل کے نقشے سے ہو جائےگا جس‌میں بہار کے ساتھ ایک رنجیدہ دل کا پاس کرتے ہوئے غم کا بھی لحاظ رکھا ہے :-

غرض بعد از مشقت‌ہائے بسیار ‏ اک ایسے صحرا میں آیا دل افکار
تھے‌خودرو گل اُگے جنگل‌میں ہرسو ‏ تھا سبزہ زار بہتی تھی وہاں جو
تر و تازہ تھا ہر خس اور خاشاک ‏ تھا ہاموں صحن اور گنبد تھا افلاک
زمرد گوں تھا وہ سارا بیاباں ‏ تھا قمری فاختہ کا شور و افغاں
کہیں شبنم کا قطرہ تھا در گوش ‏ کہیں جعد بنفشہ زیب بر دوش
کہیں تھی زلف سنبل کی پریشاں ‏ قبائے گل کہیں تھی چاک داماں
کہیں تھی چشم نرگس کی خماری ‏ تھی خمیازہ کش اک سو اپنی باری
قد آزاد سے تھا سرو استاد ‏ وہاں تھا قمریوں کا شور و فریاد
کہیں شمشاد نے کی سرکشی تھی ‏ اور اس‌جا ارغواں نے آگ دی تھی
کہیں خونی کفن لالہ کھڑا تھا ‏ اور اس نے داغ کی صف باندھی تھی آ

اس کے پاس ہی ایک باغ ہے، ذرا اس میں بھی گلگشت کرتے چلیے -

سنے ہے ساقیا ٹک آن کر یہاں ‏ مری آنکھوں سے کر سیر گلستاں
ز بس باد بہاری میں نشا ہے ‏ پڑا کیا بےخبر تاک اینڈتا ہے
غرض اہل چمن ہیں اس‌قدر مست ‏ کہ بہکے بولتے ہیں مرغ یک دست
ز بس کھینچے ہے باد تند جاروب ‏ ہوا صحن چمن آئینہ آشوب
پڑا ہے جس روش پر عکس گلزار ‏ بچھی ہے اس جگہ قالین گل‌کار
صفا نے ہر طرف کی ہے یہ امداد ‏ در و دیوار پر ہے کار بہزاد
نظر آتا ہے اب دونا پھل اور پھول ‏ مضاعف ہو گیا ہے باغوں‌کا محصول
برودت یاں تلک ہے کر تو باور ‏ کہ اوڑھی سنگ نے تختے کی چادر

ہوی ہے سبز اس روضہ پہ ہرسو شجر کی شاخ سے تا شاخ آہو

منوہر چند کے باپ اتم چند کی راجدھانی کا اجمالی بیان دیا ہے مگر اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

عجائب تھا نگر وہ رونق افزا مُذَہّب اور منقش وہ بنا تھا
مثال مہر و مہ اس میں چمک تھی نمط لعل درخشاں کے دمک تھی
تھی کوچے کوچے میں جاری وہاں نہر مثال بحر اس نے پائی تھی لہر
شجر تھے میوہ دار اس میں یہ ہرسو گل اور بوٹوں کی تھی وہ بھی عجب بو
تھے دوکانوں پہ وہاں بیٹھے دکاں دار ہوئے تھے جمع اس جاگہ خریدار
ہر اک اطراف میں تھا شور و غل تھا گردش میں ز بسکہ ساغر مل
تماشہ بیں تھے وہاں کے زن و مرد کوئی پڑھتا غزل اور کوئی تھا فرد

منوہر چند کے سراپا اور پوشاک و زیور وغیرہ کی تعریف میں ایک سو پچیس شعر لکھے ہیں اور بالیقین بسمل نے مثنوی کے ایک ایسے قدیم فرض کو پورا کیا ہے جسے میرصاحب نے اپنی مثنوی میں نظرانداز کردیا تھا حالانکہ ان کو مواقع حاصل تھے۔ میرحسن کو چھوڑ کر اور جگہ ایسا سراپا شاید نہ مل سکے۔ اس میں سے منتخب کرکے ایک چھوٹا سا سراپا پیش کیا جاتا ہے۔

موےسر
ہیں اس کے مو سراسر رشتۂ جان درازی دے خدا ان کو ہر اک آن
جو ہے عشاق پر ان کے تباہی سو دیتی ہے شب یلدا گواہی
جو جوڑا باندھ لے بالوں کا وہ ماہ پڑیں عقدے ہزاروں دل میں ناگاہ
سماں ایسا ہی ہو اس وقت یارو پس خورشید جوں ابر سیاہ ہو
ازل کے باغباں کا ہے عجب کھیل کہ سنبل کی یہاں نکلی ہے اب بیل

جبین
جبیں اس کی یہ وہ ماہ فلک ہے کہ اس میں مہر سے افزوں چمک ہے
کرے جو اس پہ ٹیکے کا نظارا تو گویا چاند پر دیکھے وہ تارا

ابرو
جو ٹک ان ابروؤں کو دیکھ پایا ہلال اپنے تئیں مہ نے نہ پایا
مہ نو ابروئے پیر فلک ہے کہاں ان میں جوانوں کا نمک ہے

خال ابرو
دو ابرو میں جو ہے اک نقطۂ خال — سن اب تفسیر اس کی مجھ سے فی الحال
جو سیدھا کر کے اس کے خط کو پڑھیے — تو اک پڑھنے میں رے آتا ہے اک زے
وہ ابرو دیکھ کر جاتے رہیں ہوش — کمانیں ہیں کشیدہ گوش تا گوش

گوش
وہ گوش اس کے ہیں ایسے غیرت گل — چراغ گل ہے جن کو دیکھ کر گل
کسی سے ان کو دوں میں کیونکہ نسبت — کہ اس کے کان ہیں کان ملاحت

در
نہیں اب تھرتھری جاتی ہے خور کی — چمکتے دیکھے ان کانوں کے موتی
در گوش اس کا تھا ایسی چمک پر — نہ چمکے صبح کا تارا فلک پر
وہ ایسا بےبہا ہے کیجو باور — کہ جیسے ہو صدف میں ایک گوہر

چشم
بنی نرگس سے گر میری قلم ہو — تو ان آنکھوں کی خوبی کچھ رقم ہو
سیاہی اور سفیدی سب دل افروز — بہم یک جا نظر آئے شب و روز
بلائے سحر مردم چشم بد دور — کہ پیدا ہووے ہے ظلمات سے نور
کہے ان کے اشارے کی وہی بات — پڑھے جو حکمت العین اور اشارات

بینی
وہ بینی ایسی اس رخ پر ہے یارو — کہ برگ گل پہ غنچہ گل کا جوں ہو
غلط ہے چہرہ اس کا گلستاں ہے — وہ بینی چیدہ غنچہ درمیاں ہے
جو پوچھو مجھ سے تو سوجھا ہے کچھ اور — کہ اوپر لب کے بینی کا ہے یہ طور
کہا چاہے تھا کچھ عاشق سے مطلب — کہ لایا حسن لب انگشت تا لب

لب
ولے غنچہ بھی کیا اور اس کے کیا لب — وہ لب ہیں حسن و خوبی سے لبالب
جو لب اخگر صفت اس یار کا ہے — اسی میں دوستو آب بقا ہے
کہوں یاقوت یا گل یا کہ صہبا — ہوئے ہیں آب و آتش باہم اس جا

دہن
نہ تنگیِ دہاں کا کچھ بیاں ہو — دہن میں غنچہ ساں گر سو زباں ہو
چمن میں بات کچھ اس کی چلی تھی — تو پھر ہر اک کلی کو بےکلی تھی

زنخ
بلے بہ سے ہے بہتر وہ زنخداں — کہ خوان حسن کا ہے یہ نمکداں
نہیں وہ چاہ چشمہ حسن کا ہے — نہیں ہے چشمہ گرداب بلا ہے

گردن
وہ گردن گردن مینا ہے یارو — کرے خم گردن گردن کشاں کو

صفائی اس کی یوں دیوے دکھائی صراحی بن کے جوں خود صبح آئی
نمایاں رنگ پاں یوں اس گلے سے کہ جیسے ڈانک گوہر کے تلے سے
لگی ہے دھکدھکی اک اس سے اچرج کہ گویا چھاتی سے لاگا ہے سورج
ساعد ہے اس کا غیرت گلزار ساعد کہ ہے شاخ گل بے خار ساعد
سنی جو ٹک نزاکت اس کی ہم سے وگیں گل کی نکل آئی ہیں غم سے
سرانگشت کہوں اوصاف کیا رشک چمن کے سرِانگشت پر اس گلبدن کے
حنا کا رنگ تھا ایسا ہویدا کہ جوں غنچہ ہو شاخ گل سے پیدا
بہار سینہ و پشت و دو پہلو کہوں کیا رشک گلشن ہے وہ گل رو
یہی اب چار سو رہتی ہے تکرار کہ باغ حسن کے ہیں یہ چمن خار
کمر اب اس موئے میاں کا کیا بیاں ہو بیاں جب ہو کہ کچھ بھی درمیاں ہو
ولے کیا کہیے اس کا وصف یارو عدم کی بات ہے معلوم کس کو
ساق رکھے ہے معجزہ ایسا ہی وہ ساق عصائے موسوی ہے جس کا مشتاق
کف‌پا کف‌پا ایسے ہیں گے چھچے لال کیا ہے خون ابھی گویا کہ پامال
کہوں کیا فندق انگشت پا سرخ نہیں دیکھا کسی نے موگرا سرخ

منوہرچند کا باپ راجہ انم‌چند اپنے لڑکے کو اسی بیراگی کے پاس لے گیا ہے اور منڈھی یا تکیہ میں راجا کا شہرۂ کرم سن کر ایک باکمال رقاصہ بھی پہنچ گئی ہے۔ مہاراجہ مع اپنے حواشی کے اور جوگی جی مع اپنے چیلوں کے موجود ہیں۔ ایسے موقع پر رقاصہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے کمالات اور موسیقی دانی کا مظاہرہ کرکے زیادہ سے زیادہ انعام حاصل کرے۔ اک ذرا اس کا مجرا دیکھ لیجیے اور غور کیجیے کہ بسمل کے قلم کی گردش کیا رنگ دکھاتی ہے۔ میرحسن نے سحرالبیان میں ایک ایسا ہی سماں دکھایا ہے اور بےباک نقادوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرحسن نے عمر بھر اسی فن کو حاصل کیا تھا۔ ہم اتنی جرات نہیں کرتے مگر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ایک تجربہ کار اور مستند شاعر کا مشاہدہ اتنا ہی عمیق ہونا چاہیے کہ وہ وقت پر جب اس منظر کا نقشہ کھینچنے بیٹھے تو خود بھی اسی جگہ کا باشندہ یا اس

گروہ اور اہل فن کا ایک فرد معلوم ہو:—

عجائب نغمہ کا اس جا تھا عالم ہوئے تھے محو وحشی اور آدم
تھی اک دلبر وہ جب گانے پہ آئی کہوں کیا عالم نغمہ سرائی
تھی ہر اک تان اس انداز کے ساتھ چلا جاتا تھا دل آواز کے ساتھ
یہاں اس کی زباں پر تان سن کر فلک پر دیدۂ زہرہ تھا واں تر
نہیں گر راست، کرتا میں یہ مذکور تو کیوں غل کررہے تھے تار طنبور
یہ کیفیت دکھائی اس صنم نے کیے دل کھول نالے زیر و بم نے
سنے گر سات سر کی تان کا چھل عجب کیا سرستی بھی جائے بل بل
تھا علم موسیقی ایسا اسے یاد جو ہوتا دیوتا تو کرتا استاد

یہاں تک اس کے کمال موسیقی دانی کی تعریف ہے۔ مگر رقص کا سماں اب دیکھیے اور داد فن کی داد دیجیے:—

سرود ایسا کہوں کیا رقص کی بات بیاں کیا ہوسکیں مجھ سے وہ حرکات
کہ مرغ روح سن گھنگرو کی آواز دل صد چاک سے کرتا تھا پرواز
جو گھونگٹ میں منہ اس کا ٹک نہاں ہو تو گویا مہر زیر سائباں ہو
ادا ٹھوکر سے تھی ایسی نکالی کہ تھا دیکھ اس کو حیراں نقش قالی
غرض لگتی تھی ٹھوکر اس ادا سے عیاں محشر تھا گھنگرو کی صدا سے
یہ وقت رقص سمجھے ہو جو ماہر ہے اس کے بھاؤ بتلانے سے ظاہر
خریداروں کو کہتی ہے کہ اب جاؤ متاع حسن کا ہے کچھ کڑا بھاؤ
لچکنا ہاتھ کا کیا کہیے یارو نہ لغزش شاخ گل کی پہنچے اس کو
کبھی جاتا جو تھا تا سوئے سر ہات تو پھر دیکھے تھی خود اس کی نظر ہات
یہ بےباکی تھی اس کے دل کو بھی آہ کہ سینہ ہاتھ سے تھا نیے تھی وہ ماہ
کبھی گردش میں یوں آتا تھا داماں کہ اس پر گردش گردوں ہو قرباں
جو دیکھے رقص کی گشت آ کے یارو تو اندر کا اکھاڑا بھی خجل ہو

آخر میں بے ثباتی دنیا کا عالم ہم اور لکھتے ہیں اور حسن و عشق کے تفصیلی بیان کو

ختم کرتے ہوئے ایک مجمل اور عام رائے دیتے ہوئے مضمون کو تمام کرتے ہیں۔

بے ثباتی عالم کے مضمون بہت سی مثنویوں میں ہیں اور سب سے زیادہ مثنوی زہر عشق میں اس کا حق ادا کیا گیا ہے مگر زہر عشق اس وقت کی تصنیف ہے کہ زبان کافی ترقی کرچکی تھی اور ان کے سامنے بہت سے ایسے خاکے موجود تھے جن کو رنگ دے کر وہ ایک رنگیں تصویر بنا کر پیش کرسکتے تھے؛ بخلاف ان کے یہ مثنوی اس زمانے کی تصنیف ہے جب کہ اودھ میں کوئی مثنوی تصنیف نہ ہوئی تھی اور میدان بالکل صاف تھا۔ اس وقت بسمل کی کوشش یقیناً قابل داد ہے۔ کہتے ہیں:—

الا اے ساقیء میخانۂ ناز — نہ رکھ ہے کو لب ساغر سے تو باز
غنیمت ہے ارے ظالم کوئی دم — ہے عرصہ زندگانی کا بہت کم
کہ شمع بزم ہستی آہ فریاد — سدا رہتی ہے زیر دامن باد
ذرا اٹھ اور سر انجام سفر کر — صبوحی سے لب ساغر کو تر کر
مجھے کریک دو پیمانے میں تو لال — کہ لکھنا ہے مجھے مخمور کا حال
اری اے گردش افلاک بے مہر — ملائے خاک میں کیا کیا نہ تو چہر
وہ کس سبزے نے ایسا سر اٹھایا — نہ جس کو خاک میں تونے ملایا
کوئی پاکیزہ گوہر یہاں نہ چھوڑا — جسے سنگ جفا سے تو نہ توڑا
ترے ہاتھوں سے بلبل نالہ کش ہے — تجھے بھی آج گل آشفتہ وش ہے
دی تونے جان شیریں آہ بر باد — ترے سر پر ہے ثابت خون فرہاد
یہ جتنا تختۂ روئے زمیں ہے — ہر اک جا پر یہاں اک نازنیں ہے

جو آیا اس گزرگہ میں سو گزرا — نہ وامق ہی رہا آخر نہ عذرا
نہ جان اشکال عالم دیرپا ہیں — یہ سب سیلی خور دست قضا ہیں
نہ سودا ہی رہا ہے اب نہ یہاں درد — ملے جا کیسے کیسے خاک میں مرد
یہ کل ہونا ہے اے فرصت سے غافل — کہ ہم مطلق معطل ہوں نہ کل
یہی خورشید ہووے اور یہی ماہ — یہی وضع زمانہ اور یہی راہ
کچھ اشیا سے یہاں کی کم نہ ہوویں — یہ سب کچھ یوں ہی ہوں اور ہم نہ ہوویں

اس مثنوی میں ابھی اور بھی ایسے مقامات ھیں جو نقل کیے جانے اور بروئے کار لانے کے قابل ھیں مگر مضمون کافی طویل ھوچکا اور ھم کو صرف نمونے دکھانا اور یہ بتانا مقصود تھا کہ یہ مثنوی اودھ کی سب سے پہلی مثنوی ھے جس کو ختم ھوئے اور لکھے ھوئے آج ایک سو چون برس اور کچھ مہینے گزر گئے کیوں‌کہ مصنف نے اس کی تاریخ اختتام ۱۳ صفرالمظفر سنہ ۱۲۰۳ ھ لکھی ھے۔ ظاھر ھے کہ اس وقت زبان اردو سے مراد صرف دلی کے شعرا کی زبان تھی اور اودھ والے اس کو سیکھ رھے تھے۔ اس وقت ایک استاد مسلم کی مثنوی کے مقابل میں ایک مثنوی لکھنے کی جرات کرنا ھی بڑا کام تھا اور پھر اس ارادہ کا ایک فیض آباد کے رھنے والے سے انجام پانا کتنا حیرت‌ناک ھے۔ زبان کی حدوں میں رھنا اور اس کو اتنی صفائی سے لکھنا کہ آج بھی اس میں کوئی تغیر نہیں آنے پایا، ایک ایسا کام ھے جو زندۂ جاوید اور یادگار قدیم بننے کے قابل ھے نہ کہیں آورد کا نام نہ مبالغوں کی بےجا بھرتی نہ صنایع بدایع کا جال بچھا ھوا۔ ایک ایک شعر صاف، ایک ایک بیاں مستحکم، یقیناً بےمثل کار نامہ ھے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مثنوی بھر میں غلطی نہیں، ھیں اور اکثر جگہ ھیں۔ کہیں ترکیب کی بےربطی، کہیں عروض و تقطیع کے رو سے حروف کا سقوط، کہیں قدیم زبان کے ایسے الفاظ جو موجود اب بھی ھیں اور سمجھے بھی جاتے ھیں مگر فصحائے حال نے ان کو متروک قرار دیا ھے؛ کہیں موجودہ قواعد تذکیر و تانیث سے انحراف؛ یہ سب کچھ اس میں ھے مگر اس مثنوی اور اس کے منصف کو مورد الزام بناتے ھی سودا، میر تقی میر، اثر، قائم، جرات، مصحفی پر بھی الزام آجاتا ھے اور کوئی اس سے نہیں بچ سکتا۔

ھم چاھتے تھے کہ ان کو مثال کے طور پر لکھیں مگر یہ طوالت کلام کے ھوتے ھوئے بھی ایک لا حاصل سا کام ھوگا۔ اگر چند الفاظ بھی ایسے ملتے جو اب تک رائج نہ ھوتے یا چند اغلاط بھی ایسے ھوتے جو معمولی سے ادھر کے درجہ پر ھوتے تو ھم ضرور اس پر آمادہ ھوجاتے کہ ان کو لکھیں۔

دوسری مثنوی پارسا نامہ ھے جو میر حسن کی بحر اور اسی انداز میں ھے اور جس میں میر تقی میر کا ھاتھ بھی ھے؛ جس کے لیے ھم ایک جگہ اشارہ کرکے آئندہ بیان کا وعدہ کر آئے ھیں؛ عنقریب کسی دوسری فرصت میں ناظرین کی نذر کی جائے گی۔

مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری

از

(نورالحسن ہاشمی صاحب، ایم-اے علیگ)

آج میں شایقین ادب و قدردانان نثر اردو کو ایک ایسی چیز سے تعارف کرانا چاہتا ہوں جو اردو ادب میں اب‌تک دست‌یاب نہیں ہوئی تھی اور جو ممکن ہے نثر اردو کی کم‌مائگی کو کافی حد تک دور کرنے میں کامیاب تصور کی جائے - یہ مولوی سید مظہرعلی سندیلوی کی ڈائری ہے جو ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ع سے تقریباً پینتالیس سال یعنی ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع مولوی صاحب موصوف کے یوم وفات تک ہر روز بلاناغہ لکھی گئی اور جو مولوی صاحب کے خاندان میں تمام و کمال موجود ہے -

قبل اس کے کہ مولوی صاحب اور ان کی اس پینتالیس سالہ ڈائری کا ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ سندیلہ کا مجملاً ذکر کردوں تاکہ ماحول اور وہاں کی سوسائٹی پیش نظر رہے - قصبہ سندیلہ ایک بہت پرانا قصبہ ہے جو لکھنؤ سے تیس میل کے فاصلہ پر لکھنؤ سے دہلی جانے والی میں (خاص) لائن پر واقع ہے - قدامت کا اس کی یوں پتہ چلتا ہے کہ تاریخ فیروز شاہی میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے اور ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں بھی - عہد مغلیہ میں پورب کا ایک مشہور ضلع سمجھا جاتا تھا جس کا ذکر عالم‌گیر نے بہت صراحت سے کیا ہے - نوابان اودھ کے زمانہ میں بھی اس کو کافی وقعت حاصل تھی اور حکومت کا خاص چکلہ‌دار (ڈپٹی کمشنر)

یہاں رہا کرتا تھا اور اس کے ساتھ فوج بھی۔ جن لوگوں نے دریائے فصاحت انشاءاللہ خاں کی پڑھی ہے ان کو سندیلہ کے وہ مولانا یاد ہوں گے جن کے علم و فضل کا ان کے زمانے میں بےانتہا چرچا تھا۔ لیکن یہاں کے رہنے والے کچھ ایسے قناعت‌پسند واقع ہوا کرتے ہیں کہ باوجود علم و فضل میں دست‌گاہ کافی رکھنے کے اس سر زمین سے نقل و حرکت کرنا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قصبہ سندیلہ نے باوجود ملیح آباد' کاکوری' بلگرام (جو اس کے بہت قریب قریب واقع ہیں) سے بڑے ہونے کے ادبی دنیا میں کوئی شہرت نہیں پائی۔ سندیلہ اب بھی اپنی پرانی حیثیت قائم کیے ہوئے ہے اور یو-پی کے بہت معروف و مشہور قصبوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ سڑکیں کشادہ' عمارات بلند؛ کوئی اٹھارہ ہزار کی آبادی ہے اور میونسپلٹی بھی قائم ہے۔

ڈائری دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قصبہ سندیلہ میں اس وقت دو راجہ اور تین تعلق‌دار رہتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے زمیندار تھے اور جن میں آپس میں پھوٹ کی وجہ سے ہمیشہ مقدمہ‌بازی ہوا کرتی تھی۔ مولوی مظہرعلی ان میں ایک تعلقہ‌دار کے سگے خالہ‌زاد بھائی تھے اور انھیں کے پڑوس میں ایک مشترکہ مکان میں بہ دقت تمام اپنی گزر کیا کرتے تھے۔ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۳۹ ع کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی مظفرعلی صاحب مدرسہ ریاست جودھپور کے صدر معلم تھے۔ لیکن تنخواہ قلیل تھی اور وہ بھی کئی کئی مہینے کے بعد ملا کرتی تھی اس لیے عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ لیکن مظہرعلی کی قسمت چوں‌کہ یاور تھی ان کے خالہ‌زاد بھائی فضل‌حسین کو ان کے باپ سید فضل رسول نے جو اس وقت تعلقہ‌دار تھے' سیتاپور انگریزی پڑھنے کے لیے بھیجا اور اپنے لڑکے کی تنہائی کے خیال سے مولوی مظہرعلی کو بھی ساتھ کردیا اور ان کا نام بھی اسی اسکول میں لکھوا دیا۔ اس زمانہ میں کمشنری سیتاپور ہی میں تھی (اب لکھنؤ میں ہے۔ ن) اس لیے اودھ بھر کے تمام تعلقہ‌داروں اور راجاؤں کے لڑکے وہیں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ لیکن راجاؤں اور تعلقہ‌داروں کے لڑکے پڑھتے لکھتے ہی کب ہیں۔ چناں‌چہ مولوی صاحب ان سب لڑکوں میں اول رہتے تھے۔ لیکن مڈل پاس کرنے کی ہنوز نوبت نہیں آئی تھی

کہ فضل‌حسین واپس بلا لیے گئے - انھیں کے ساتھ ان کو بھی واپس آنا پڑا - سندیلہ آ کر یہاں کے انگریزی اسکول میں سیکنڈ ماسٹر ہو گئے اور رفتہ رفتہ ہیڈ ماسٹری تک ترقی کی - لیکن اسی عرصہ میں لکھنؤ سے سندیلہ اور ہردوئی تک ریل بن رہی تھی چناں‌چہ محکمہ ریلوے میں بعہدہ خزانچی بہ مشاہرہ ایک سو پچھتر روپیہ ماہوار مامور ہوئے - اسی سلسلہ میں ان کو حصول ریاست کا شوق پیدا ہو گیا چنانچہ معاملات رہن و بیع کرنا شروع کیے - یہاں تک کہ ایک معقول جائداد پیدا کرلی - تھوڑے عرصہ کے بعد جب ریلوے کا محکمہ ٹوٹ گیا تو انھوں نے اسی زمینداری پر بہ فراغت زندگی بسر کرنا شروع کر دی - لیکن اسی عرصہ میں فضل‌حسین صاحب اپنے باپ کے مرنے پر تعلق‌دار ہوئے - انھوں نے مولوی مظہرعلی صاحب کو اپنا نایب ریاست سو روپیہ ماہوار پر مقرر کر لیا - اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کو آنریری مجسٹریٹی درجہ دویم کی مل گئی - ساتھ ہی میونسپل کمیٹی کے آنریری سکریٹری بھی ہو گئے - یہ زمانہ مولوی‌صاحب کے بہت عروج کا زمانہ تھا - چناں‌چہ ایک بہت بڑی کوٹھی تعمیر کرائی، اپنے دو لڑکوں کو بیرسٹر کروا دیا (جن میں سے ایک بقید حیات ہیں اور اب ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں، دوسرے بھوپال ریاست کے جج ہائی‌کورٹ ہو گئے تھے لیکن تھوڑا عرصہ ہوا کہ اچانک وفات پائی) اور بیشتر باغات، دوکانات و مکانات تعمیر کرائے - تھوڑے عرصہ کے بعد کام کی زیادتی کی وجہ سے نائبی سے مستعفی ہوگئے، لیکن اپنی چوں‌کہ جائداد کافی تھی یعنی پانچ چھے سو روپیہ ماہوار کی، اس لیے آخر عمر تک اطمینان سے با فراغت زندگی بسر کرتے رہے - آخر عمر میں آنریری منصف ہو گئے تھے - چوں‌کہ ان کا کام بہ‌حیثیت سکریٹری میونسپل کمیٹی بہت عمدہ تھا اور جس کو بہ آنریری طور پر انجام دیتے تھے اس لیے یو - پی گورنمنٹ سے برابر سندیں اور شکریے بذریعہ ڈپٹی کمشنران ان کو پہنچتے رہتے تھے - تیس سال آنریری سکریٹری رہ کر اس عہدے سے مستعفی ہو گئے -

مولوی‌صاحب کی ڈائری ایک ادیب کی ڈائری نہیں ہے بلکہ ایک نہایت مشغول و مصروف آدمی اور ایک نہایت مستعد زمیندار کی ڈائری ہے - لیکن اس کے ساتھ ہی

چوں‌کہ عربی فارسی میں لیاقت کافی تھی اور انگریزی میں بھی دست‌گاہ اچھی خاصی پرائیویٹ طور پر محنت کر کے حاصل کرلی تھی اس لیے اکثر و بیشتر ان کی تحریر میں ادبی رنگ آجاتا ہے ۔ اس کے علاوہ دنیا کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو ان کے زمانے میں ہوا ہو اور ان کی ڈائری میں درج نہ ہو۔ ان وجوہات کی بنا پر مولوی‌صاحب کی محنت کی بڑی حق‌تلفی ہوتی اگر یہ چیز معرض گم‌نامی میں پڑی رہتی ۔ اس ڈائری کے علاوہ مولوی‌صاحب نے اپنی ایک سوانح عمری بھی دو جلدوں میں چھوڑی ہے جس میں کی ایک جلد ان کے زمانے ہی میں چھپ گئی تھی؛ دوسری کے چھپنے کی ابھی تک نوبت نہیں آئی ۔ لیکن چوں‌کہ یہاں ہمیں ان کی ذاتی زندگی سے سروکار نہیں ہے بلکہ ان کے ماحول، ان کے زمانہ اور ان کے زمانہ کی سماجی، معاشرتی اور تاریخی حالت سے، اس لیے اب ہم صرف ان کی ڈائری سے بحث کرتے ہیں۔

ڈائری دراصل مولوی‌صاحب نے سنہ ۱۸۶۷ء میں پہلے فارسی میں شروع کی تھی لیکن سنہ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے محسوس کیا کہ فارسی کی وقعت اب کم ہوتی جاتی ہے اور اردو کا دور دورہ ہوچلا ہے اس لیے اس وقت تک جو کچھ لکھا تھا اس کو اردو میں ترجمہ کر ڈالا اور اس کے بعد سے پھر برابر اردو میں لکھتے رہے ۔ ڈائری کی تحریر عموماً رات کو جب سب کاموں سے فراغت ہوجاتی، لکھا کرتے تھے اور ایک ہفتہ یا ایک مہینے کے بعد یا اکثر دوسرے دن ایک کاتب مسمی منشی سید محمد ذکی درگاہی سے ایک دوسری جلد پر صاف کروا لیتے کیونکہ مولوی صاحب کا خود اپنا خط بہت شکست تھا۔ تمام ڈائری اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے جس میں سے سولہ تو کاتب کی صاف کی ہوئی ہیں، دو جلدیں صاف نہیں ہیں ۔ ان میں سے ایک تو مولوی‌صاحب کے خود ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اکثر جگہ پڑھی نہیں جاتی، دوسری یا آخری ایک منشی کے ہاتھ کی لکھی ہے اور اکثر و بیشتر اپنے لڑکوں سے بھی لکھوا لی ہے کیوں‌کہ اس سال مولوی صاحب سال بھر بیمار رہے ۔ ڈائری تمام فل اسکیپ سائز پر ہے جن کے صفحات کی تعداد حسب ذیل ہے :—

۱ ۲۱ جنوری ۱۸۶۷ء لغایت ۳۱ دسمبر ۱۸۷۱ء ۲۴۴ صفحے

نمبر	از		لغایت		صفحات	
۲	یکم جنوری ۱۸۷۲ء	لغایت	۳۱ دسمبر	۱۸۷۷ء	۳۲۳	صفحے
۳	" ۱۸۷۸ء	"	"	۱۸۸۷ء	۶۳۹	"
٤	" ۱۸۸۸ء	"	"	۱۸۹۰ء	۵۱۸	"
۵	" ۱۸۹۱ء	"	"	۱۸۹۳ء	۸۳۸	"
٦	" ۱۸۹٤ء	"	"	۱۸۹۵ء	٦۱۸	"
۷	" ۱۸۹٦ء	"	"	۱۸۹۷ء	۵۸٤	"
۸	" ۱۸۹۸ء	"	"	۱۸۹۹ء	٤۱۸	"
۹	" ۱۹۰۰ء	"	"	۱۹۰۱ء	۵۷۵	"
۱۰	" ۱۹۰۲ء	"	"	۱۹۰۳ء	٦۰۷	"
۱۱	" ۱۹۰٤ء	"	"	۱۹۰٤ء	۳۳۰	"
۱۲	" ۱۹۰۵ء	"	"	۱۰۰۵ء	۳٤٦	"
۱۳	" ۱۹۰٦ء	"	"	۱۹۰٦ء	۲۹۵	"
۱٤	" ۱۹۰۷ء	"	"	۱۹۰۷ء	۳۲۳	"
۱۵	" ۱۹۰۸ء	"	"	۱۹۰۸ء	۳٤۱	"
۱٦	" ۱۹۰۹ء	"	"	۱۹۰۹ء	۲۰۲	"
۱۷	" ۱۹۱۰ء	"	"	۱۹۱۰ء	۲٤۷	"
۱۸	" ۱۹۱۱ء	"	۲۳ دسمبر	۱۹۱۱ء	۳۵۲	"

کل تعداد ۷۷۹۹ صفحے

تمام جلدوں میں التزام سن عیسوی و ھجری و ھندی معہ دنوں کے نام کے ھے۔ حاشیہ پر الفاظ ولادت، وفات، شادی، عقیقہ وغیرہ موٹے حروف میں لکھے ھوئے ھیں تاکہ اس قسم کی یادداشت ڈھونڈنے میں آسانی ھو۔ اب دیباچہ ڈائری کا ملاحظہ ھو۔ بعد بسم اللہ لکھتے ھیں:-

" بعد حمد خدا و نعت حضرت سرور کائنات محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم احقر العباد سید مظہر علی ابن مولوی سید مظفر علی صاحب مرحوم ساکن سندیلہ محلہ اشراف ٹولہ

عرض کرتا ہے کہ اس ہیچ میرز کو عرصہ سے اس امر کا خیال ملحوظ خاطر تھا کہ ایک روزنامچہ بقید تواریخ مروجہ زمانہ حال لکھنا شروع کروں اور اس میں کل حالات صحیحہ بالمرہ لکھتا رہوں اور ایسا اہتمام کروں کہ کسی حالت میں اس کو ناغہ نہ کر سکوں تاکہ عامہ خلایق کو بہ وقت ضرورت اس سے فائدہ و نفع پہنچے چناں چہ کئی سال کے خیال و فکر کے بعد میں نے اس کام اہم کو اپنے ذمہ همت پر قبول کیا اور ۲۱ جنوری ۱۸۶۷ع سے اس کتاب روزنامچہ کا زبان فارسی میں آغاز ہوا ۔ اس میں حالات جدید صحیحہ عام اس سے کہ ان کا تعلق کسی شہر و قصبہ وده و ملک سے ہو، بالمرہ درج ہوتے رہے اور ایسا التزام کیا کہ کسی سفر و حضر میں اس کا ترک جائز نہیں رکھا ۔ نومبر سنہ ۱۸۸۷ع میں دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ زبان فارسی کی وقعت اب رزز بروز گھٹتی جاتی ہے اور چند ہی روزوں میں طلباء اسکول بباعث کم علمی کتب فارسیہ کو دفتر پارینہ سمجھ کر بالکل نظرانداز کر دیں گے اور اس حالت میں میری اس قلم فرسائی کی (جس کو بہ کمال دقت میں نے مرتب کیا ہے اور حالات نو بہ نو اس کے عام پسند مفید اور خالی از تجربہ نہیں ہیں) کچھ قدر نہ ہوگی ۔ پس بنظر مصلحت وقت میرے خیالات کو روز بروز استحکام ہوتا گیا ۔ آخرش دسمبر سنہ ۱۸۸۷ع میں میں نے سید محمد ذکی ولد سید احمد بخش صاحب مخدوم زادہ درگاہ سے اس کا ترجمہ اردو میں لکھانا شروع کیا اور شکر خدا کا کہ اپریل سنہ ۱۸۸۸ع میں روزانہ محنت شاقہ سے اس کا تکملہ حسب مراد ہوا ۔ چوں کہ دریافت شادی و مرگ و ولادت وغیرہ تقریبات کی انسان کو ضرورت زاید داعی ہوتی ہے اس وجہ سے رنگ سرخ سے شادی، ختنہ و عقیقہ و سیاہی سے وفات و سبز سے ولادت حواشی کتاب پر درج کیے ۔ یہ ذریعہ واسطے تلاش ایسی ضروریات کے آسان و کارآمد ہے اور ہر متلاشی کو اس سے بہت مدد مل سکتی ہے ۔ لہذا مجھے امید ہے کہ ناظرین کتاب اگر کسی موقع پر کوئی مضمون اپنے خلاف ملاحظہ فرماویں تو اس پر اظہار ناراضگی کا نہ کریں کہ راقم نے کوئی حال غلط اور نفسانیت سے درج کتاب هذا نہیں کیا ہے“۔

چناں چہ مقصد اس روز نامچہ کا ظاہر ہوگیا کہ فائدہ عوام الناس متصور تھا خصوصاً

سندیلہ کی پبلک کے لیے - چناں‌چہ اب بھی جب کبھی نزاعی معاملات مابین ہندو مسلمان سندیلہ میں آ پڑتے ہیں تو مولوی‌صاحب کی ڈائری میں اس کی نظیریں تلاش کی جاتی ہیں لیکن اس روزنامچہ کا انجام دینا واقعی ایک اہم اور نہایت دقت طلب کام تھا اور اس کا انھیں پورا احساس بھی تھا چناں‌چہ اس بات کا اعادہ بار بار اپنی ڈائری میں کیا ہے -

۳ فروری سنہ ۱۸۸۸ع | آج کل میں تمام دن اپنی کتاب روزنامچہ سید محمد ذکی درگاہ سے صاف کراتا ہوں اور وہ بھی نہایت مستعدی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے ہیں - یہ میرا ذخیرہ بائیس سال کا ہے - اگر کل مکمل ہو گیا تو مجھے اور بعد میرے ہر شخص کو بوقت ضرورت مدد کامل اس سے حاصل ہو سکتی ہے - یہ کام بہت اہم تھا جس کو میں انجام دے رہا ہوں - خدا اس مشکل کو آسان فرمائے -

۵ فروری سنہ ۱۸۸۸ع | آج ایک جلد روزنامچہ اول جو ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ع لغایۃ ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۷۲ع تک تھی محمد ذکی نے بکوشش تمام صاف کردی - خدا کرے ایسے ہی اور جلدیں بھی مرتب ہوجائیں -

۱۱ اپریل سنہ ۱۸۸۸ع | میرا چار مہینہ گزشتہ سے صبح سے شام تک یہ ہی شغل رہتا ہے کہ کتاب یادداشت روزنامچہ کو سید محمد ذکی درگاہی سے اردو میں صاف کراتا ہوں - ان دنوں مجھے اکثر کھانا بارہ بجے کھانے کا اتفاق ہوتا ہے اور میرے تمام کار و بار میں فرق آگیا ہے لیکن میں اس کام کو جو اکیس سال کی میری محنت ہے سب پر مقدم تصور کرتا ہوں کہ ایسا وقت فرصت مجھے کمتر حاصل ہوگا - خدا اس میرے ارادہ کو پورا کرے کہ میری یہ یادگاری روز آئندہ بہت کارآمد ہوگی -

۳۰ اپریل سنہ ۱۸۸۸ع | ہزاراں ہزار شکر پروردگار عالم کہ آج میری چار مہینہ کی محنت بوجہ احسن تکمیل کو پہنچی - یہی یادداشت روزنامچہ جس‌کو میں چار مہینہ گزشتہ سے بکوشش مالایطاق محمد ذکی سے صاف کرا رہا تھا آج من ابتدائے ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ع لغایۃ ۳۰ اپریل سنہ ۱۸۸۸ع

بہمہ وجوہ صاف و مرتب ہو گیا۔ اس بارہ میں محمد ذکی کی محنت قابل تعریف ہے کہ انھوں نے میری خاطر سے اس کے صاف کرنے میں بلا لحاظ شدّت گرمی کوئی دقیقہ اپنی کوشش کا فر و گذاشت نہیں کیا جس کا میں ممنون ہوں۔

۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۸۸ع | شکر ہے کہ آج کتاب روزنامچہ راقم لکھنے تقریظ و بنانے نشانات شادی و غمی وغیرہ رنگ‌ہائے مختلف سے بہمہ وجوہ مرتب ہوگئی جس کا آغاز ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ع و اختتام دسمبر سنہ ۱۷۸۷ع تک ہے۔ یہ تین کتابوں میں مجلد ہیں اور چوتھی کتاب جنوری سنہ ۱۸۸۸ع سے بالمرہ لکھی جاتی ہے۔ میں اس کا تکملہ بہت مشکل جانتا تھا اور اپنے علم و یقین میں اس کو غیر ممکن تصور کرتا تھا۔ بہرحال شکر ہے اس خدا کا کہ جس نے اس مشکل سخت کو آسانی کے ساتھ پورا کرا دیا ورنہ جب اس کی ضخامت و طوالت پر نگاہ کرتا تھا تو ہرگز ہمت اس کام اہم کے آغاز کی نسبت نہیں پڑتی تھی۔

چونکہ خود ہی لکھتے پھر خود ہی لکھواتے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ کس‌قدر محنت اس کے لکھنے میں انھوں نے برداشت کی ہوگی، اس کا حال ذیل کی تحریر سے معلوم ہوسکتا ہے۔

۵ دسمبر سنہ ۱۸۹۳ع | آج محمد ذکی میری کتاب روزنامچہ صاف کرنے کو آئے اور میں نے ۸ بجے صبح سے اس کا لکھنا شروع کیا اور ۵ بجے شام تک لکھانے میں صرف ایک مہینہ ہوا لیکن اس مشقت سے مجھے فی‌الجملہ ماندگی پیدا ہوگئی اور شب کو درد سر رہا۔

۱۶ دسمبر سنہ ۱۸۹۳ع | اگرچہ میں ۷ بجے صبح سے ۵ بجے شام تک اپنا روزنامچہ محمد ذکی درگاہ سے اپنے بالاخانہ پر جس جگہ دوسرے شخص کے جانے کو بنظر ہرج کام مجاز نہیں ہے، صاف کراتا ہوں لیکن ہنوز چند مہینہ لکھنے کو باقی ہیں۔ اگرچہ مجھے لکھانے روزنامچہ میں تمام روز کی محنت سخت تکلیف دہ ہے لیکن مجبوری ہے کہ بدوں میرے ان حالات کو بہ ترمیم مناسب کوئی لکھا نہیں سکتا ہے۔ اور چوں‌کہ سوائے حوائج ضروری اور تناول طعام کے

یک لخت بیٹھا رھنا پڑتا ھے اور چلنے پھرنے کا اتفاق نہیں ھوتا ھے پس میں نے بعد دوپہر کے جب محمد ذکی روٹی کھانے جاتے ھیں بہ غرض جذب رطوبت معدہ و تحلیل ھونے غذا کے یہ تدبیر نکالی ھے کہ بعد پڑھنے نماز ظہر کے اپنے بالاخانہ سے وظیفہ پڑھتا ھوا چند بار اوپر سے نیچے کو چڑھتا اترتا رھتا ھوں تا کہ یہ ورزش بدل میرے تمام دن بیٹھے رھنے کے ھو اور کوئی سقم میری تحلیل غذا میں نہ پیدا ھو ۔

۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۹۳ء | آج بعنایت خدا و کوشش سید محمد ذکی درگاہ کے جو تیرہ ورق میرے روز نامچہ کے کل باقی رہ گئے تھے وہ آج ٤ بجے شام کو ختم ھوے؛ میں نے خدا کا نہایت شکر ادا کیا کہ میری سولہ روز کی کوشش کامیابی کے ساتھ پوری ھوئی ۔

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۹۹ء | چونکہ میں اپنا روز نامچہ سید محمد ذکی ولد سید احمد بخش درگاہ سے آٹھ روز کا تحریر کیا ھوا ھر اتوار کو صاف کراتا ھوں جس میں چند گھنٹے صرف ھوتے ھیں اس وجہ سے مجھے اتوار کو بھی فرصت آرام کرنے کی نہیں ملتی ھے ۔ صبح سے گیارہ بجے تک میں اپنا کاروبار معمولی بدستور کرتا رھتا ھوں اور بعد نوش کرنے کھانے کے بارہ بجے دوپہر سے صفائی روز نامچہ کی طرف رجوع کرتا ھوں ۔

۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۰۳ء | آج ساڑھے سات بجے صبح سے ٥ بجے شام تک میں اپنا روز نامچہ سید محمد ذکی ولد سید احمد بخش صاحب مرحوم درگاہ سے لکھاتا رھا جو ایک مہینہ لکھنے کو رہ گیا تھا ۔ درمیان میں صرف کھانا کھایا اور نماز ظہر و عصر پڑھی ۔ اس قدر محنت شاقہ میرے ایسے سن کے لیے بہت زاید ھے ۔

حالات اس روز نامچہ میں جیسا کہ مولوی صاحب نے خود اپنے دیباچہ میں لکھا ھے عام اس سے کہ ان کا تعلق کسی شہر و قصبہ و دہ و ملک سے ھو، بالمرہ درج ھوتے رھے ۔ سندیلہ کے حالات تو انھیں خیر میونسپلٹی کے سکریٹری ھونے کی وجہ سے برابر معلوم ھوتے رھتے تھے ۔ ھندوستان اور سمندر پار کی خبریں انھیں اودھ اخبار سے

معلوم ہوتی تھیں جسے وہ کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو پڑھا کرتے تھے۔ یوں تو مولوی صاحب کی ڈائری ہر قسم کے واقعات سے پر ہے لیکن ذیل میں صرف وہی حالات پیش کیے جاتے ہیں جو تاریخ ہند، واقعات بیرون ہند اور معاشرت زمانہ اور خود ان کی ذاتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

واقعات ہند

جولائی ۱۸۶۷ع — میں سخت ہیضہ چلتا ہے۔ مولوی صاحب کی ڈائری کا حاشیہ 'وفات' ہی 'وفات' سے پر نظر آتا ہے۔

۲۵ جولائی سنہ ۱۸۶۷ع

آج ریڈ صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی وارد سندیلہ ہوئے اور انھوں نے حکم قطعی صادر کیا کہ ایک محلہ کا آدمی دوسرے محلہ میں نہ جاوے بلکہ جابجا راستوں میں پہرے تلنگوں کے مقرر کردیے۔ اور کیفیت یہ ہے کہ چھے سات آدمی روزمرہ مرتے ہیں۔ انگریزی ڈاکٹر ہردوئی سے آیا؛ وہ ہر مریض کو دیکھنے جاتا ہے اور علاج کرتا ہے۔

۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۷ع

خلایق سندیلہ شدت وبا سے از حد پریشان ہے۔ بعض لوگ بیرونجات کو چلے گئے ہیں۔ ۲۵ آدمی روز ہیضہ سے مرتے ہیں۔

۲۰ اگست سنہ ۱۸۶۷ع

سندیلہ سے اب ہیضہ بالکل دفع ہوگیا اور لغایۃ ۱۷ اگست قریب چھے سو آدمیوں کے باشندگان سندیلہ سے نذر ہیضہ ہوے۔ اکثر ان میں قابل یادگار ہیں۔ بابو جوالا پرشاد صاحب ہیڈماسٹر بسواں کی تحریر سے معلوم ہوا کہ قصبہ خیرآباد میں اس مرتبہ عارضہ ہیضہ سے ایک ہزار آدمی فوت ہوے۔

۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۷ع

آج جناب قاضی وجیہ الدین صاحب نے اعلان کیا کہ عنقریب بلائے آسمانی ہیضہ سے سخت تر آنے والی ہے۔ سب لوگوں کو چاہیے کہ استغفار و توبہ کریں اور خیرات دیویں (جو کبھی نہ آئی - ن)

سفر کی مدت

۲۹ فروری سنہ ۱۸۶۸ع — آج اہلخانہ حافظ کرم احمد صاحب و والدہ وغیرہ سید عابد علی اکیس دن سفر کے بعد ساگر سے سندیلہ پہنچے۔

۳ مارچ سنہ ۱۸۶۸ع منشی فہیم الزماں صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے ۔ کیفیت شہر بمبئی کی ان کی زبانی مفصل معلوم ہوئی؛ واقعی شہر مذکور قابل سیر ہے ۔

پہلے پہل ریل کا سفر

۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۸ع ــ چونکہ میں اس وقت تک ریل پر سوار نہیں ہوا تھا شوقیہ ریل پر سوار ہوکر کانپور گیا ۔ چوک میں شیخ امجدعلی فرخ آبادی جوتہ فروش کی دوکان پر ٹھہرا ۔ باوصف نہ ہونے ملاقات کے بہت خلق سے وہ پیش آئے اور بوقت معاودت محمد یسین ان کے بیٹے کو میں نے آٹھ آنے واسطے شیرینی کے دیے ۔

رہس

۲۴ مئی سنہ ۱۸۶۸ع ــ آج شب کو احاطہ تقی میاں میں منشی فضل رسول صاحب نے ناچ رہس کا کرایا ۔ یہ رہس لکھنؤ سے آیا تھا ۔ اخیر شب کو جوگن نے بہت لطف کیا ۔ مجمع بہت کثیر تھا ایسا ناچ پہلی مرتبہ میرے ہوش میں ہوا ۔

سماجی رسم

۲۵ مئی سنہ ۱۸۶۸ع ــ اس بات سے مجھے سخت ملال ہوا کہ والد کے سیوم کے روز منشی فضل رسول صاحب کے یہاں ناچ کرایا گیا ۔ اگرچہ اس محلہ میں تین دن سے زاید ماں داں نہیں ہے لیکن قرابت قریبہ ہرگز مقتضی ایسے جلسہ کی نہ تھی ۔

مردم شماری

٤ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ع ــ تمام ہندوستان میں مردم شماری ہونے والی ہے ۔ سندیلہ کے ایک محلہ کا کام مردم شماری محمدکریم خاں تحصیلدار نے میرے تفویض کیا ہے ۔

٦ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ع ــ آج نمبر خانہ شماری قصبہ سندیلہ دینا شروع ہوے ۔ اکثر رئیس سندیلہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں ۔

رہس

۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ع ــ آج شادی میر ابوالحسن فرزند ڈپٹی محمدحسن منڈلی کی تھی ۔ رہس لکھنؤ و رہس جواہر طوایف سندیلہ سے ناچ وغیرہ میں مقابلہ ہوا ۔ رہس سندیلہ کو ترجیح رہی ۔

شکار

۲۲ فروری سنہ ۱۸۷۰ع—آج سید فضل حسین لکھنؤ سے آئے ۔ ان سے دریافت ہوا کہ شاہزادہ ایڈنبرا واسطے شکار کے جنگل نیپال کو تشریف لائے ۔

وفات

۳۰ نومبر سنہ ۱۸۷۱ع—نواب علی نقی خاں سابق وزیر اعظم لکھنؤ نے بعارضہ ہیضہ نواب محسن الدولہ لکھنؤ کے مکان پر قضا کی اور لاش ان کی کربلا بھیجی گئی ۔

وفات

۱۷ فروری سنہ ۱۸۷۲ع—اس خبر کی تصدیق ہوئی کہ ۸ فروری ۱۸۷۲ع کو جناب نواب میو صاحب گورنر جنرل بہادر بہ تقریب دورہ جزیرہ انڈمان میں بہ طرف جیل خانہ سیر کناں تشریف لے گئے ۔ دفعتاً شیر علی خاں قیدی دایم الحبس نے ایک چھرا صاحب ممدوح کو ایسا کاری مارا کہ جاں بر نہ ہوے اور انتقال فرمایا ۔ یہ شخص خیبر کا رہنے والا تھا ۔

سرخ بخار

۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ع—آج کل بخار فصلی جس کو سرخ بخار کہتے ہیں، اس گرد و نواح میں خصوصاً اور تمام ہندوستان میں عموماً اس کثرت سے پھیلا ہے کہ کمتر لوگ اس سے محفوظ ہیں ۔ تین دن تک شدت زیادہ رہتی ہے بعد اس کے کم ہو جاتا ہے ۔ اکثر شخصوں کے بدن پر دانے سرخ بھی پڑ جاتے ہیں جو خارش ہوکر زایل ہو جاتے ہیں ۔

دربار دہلی

۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۶ع—چوں کہ یکم جنوری کو دہلی میں دربار ہونے والا ہے اور ملکہ وکٹوریہ شاہنشاہی خطاب حاصل کریں گی اس وجہ سے جملہ راجہ و رؤسا کمال تزک و احتشام سے شرکت دربار کے واسطے جاتے ہیں ۔ یہ دربار بھی قابل یادگار ہوگا۔ ریلوے کمپنی کو آج کل بہت فایدہ ہو رہا ہے ۔

یکم جنوری سنہ ۱۸۷۷ع—آج ملکہ وکٹوریہ نے شہر دہلی میں خطاب شاہنشاہی قیصرہ ہند کا حاصل کیا ۔ جلسہ عظیم ہوا ۔ ہندوستان کے سب بڑے بڑے راجہ شریک دربار تھے ۔ اکثروں کو خطابات بھی حاصل ہوئے ۔ ۲۲ لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا ۔ اور تاریخ امروزہ میں ہردوئی خاص میں بھی بڑا جلسہ ہوا جس میں تعلقہ داران ضلع و دیگر معزز اشخاص شریک تھے ۔

چیچک

۱۷ اپریل سنہ ۱۸۷۷ع—آج دس بجے دن کو مسماۃ اچھن دختر سید فضل حسین کہ جس کی عمر چار برس کی تھی، عارضۂ چیچک میں فوت ہوئی - یہ مرض آج کل حکم ہیضہ وبائی کا رکھتا ہے - کوئی دن ایسا نہیں گزرتا ہے کہ دو چار لڑکے ضایع نہ ہوتے ہوں -

۲۱ اپریل ۱۸۷۷ع— منشی فضل رسول لکھنؤ سے تشریف لائے - مسماۃ اچھن دختر فضل حسین کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ قبل سے چونسہ (ایک گانو کا نام - ن) بھیج دی جاتی تو عارضہ چیچک سے نہ ہلاک ہوتی - مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ شاید جناب ممدوح کو آیت قرآن شریف اذا جاء اجلہم....الخ پر عمل نہیں ہے' جو ایسا کلمہ فرماتے ہیں- قضا کی روک کچھ نہیں ہوسکتی ہے -

۱۱ جون سنہ ۱۸۷۷ع—نقشہ تولید وفات تحصیل سندیلہ سے معلوم ہوا کہ سال حال میں ایک ہزار پانچ سو لڑکے چیچک میں مبتلا ہوئے اور منجملہ اس کے دو سو پینسٹھ ضایع ہوئے -

وفات

۲۷ جون سنہ ۱۸۷۷ع—کل میر کرم صفی چوبھٹی کا انتقال ہوگیا - یہ پہیلی بنانے میں مشہور تھے اور ابھی تک ان کے قویٰ درست تھے - ۱۷ اگست سنہ ۱۸۷۷ع بہ عمر ٦۵ سال قضا کی -

سنہ ۷۷ع کا قحط

گرانی امساک باراں کے باعث شب کو بہ کثرت چور آتے ہیں اور اکثر رہزنی بھی ہوتی ہے - خدا اپنا جلد فضل فرمائے کہ بارش ہو - آج نماز استسقا بہ طلب بارش تالاب شیرہ حوض پر پڑھی گئی - حافظ شوکت علی صاحب امام تھے -

۱۸ اگست—آج پھر نماز استسقا میدان میں متصل تالاب شیرہ حوض پڑھی گئی - چار سو آدمی شریک نماز تھے - بہ ظاہر آسمان بالکل صاف ہے - آثار بارش نمایاں نہیں اور دوپہر کو مثل مہینہ جیٹھ لو چلتی ہے -

۱۹ اگست—آج پھر نماز استسقا بہ جمعیت پانچ سو آدمی کے میدان شیرہ حوض میں پڑھی گئی اور طلب باراں میں بہت گریہ و زاری ہوئی لیکن دعا مستجاب نہ ہوئی-

۲۱ اگست—آج کل چوری بہ کثرت ہوتی ہے۔ غلہ گراں ہوتا جاتا ہے دن کو لو اور شام کو ہوا سرد چلتی ہے۔ آسمان بالکل صاف ہے۔ آثار بارش بالکل نمایاں نہیں یہ ہی کیفیت تمام ہندوستان میں ہے۔

۲۲ اگست—فصل کنوار بالکل تلف ہوگئی۔ اگر کوئی شخص تنہا کہیں باہر جاتا ہے تو رہزنوں سے محفوظ نہیں رہتا ہے۔ بالفعل ایک عجیب آفت خشک سالی سے ہے کہ جس کا اظہار نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۳ اگست—دیہات میں کاشتکار سخت پریشان ہیں۔ نوبت فاقہ‌کشی پہنچی ہے اور اکثر اہالی سندیلہ کا بھی یہ ہی حال ہے۔ معلوم نہیں کہ اب کی سال کیونکر لوگوں کی زیست ہوگی۔

۲۷ اگست—لوگ مشہور کرتے ہیں کہ لارڈ لٹن صاحب گورنر جنرل ہندوستان اور کوپر صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ (یعنی موجودہ یو۔پی۔ن) کی نیت اچھی نہیں ہے۔ یہ ہی امر باعث خشک سالی ہے۔ یہ دونوں صاحب ان عہدوں پر جدید مقرر ہوئے ہیں۔

۵ ستمبر—غلہ روز بہ روز گراں ہوتا جاتا ہے۔ آج نرخ گندم کا ۱۴ سیر نمبری اور چنے و جو ۱۵ سیر نمبری تھا۔ بارش مطلقاً نہیں ہوتی۔ خلق‌اللہ کو ہراس و ناامیدی بہ درجہ غایت ہے۔

۱۶ ستمبر—ہوا گرم مثل بیساکھ و جیٹھ کے چلتی ہے۔ اخیر شب کو سردی ہوتی ہے۔ پانی کے آثار بالکل معلوم نہیں ہوتے۔ نرخ غلہ کا بالمرہ گھٹتا جاتا ہے۔ خلایق از حد پریشان اور کاشتکار اپنے موبشی اتّر لیے بھاگے جاتے ہیں۔

۲۳ ستمبر—خشک سالی کی شکایت ترقی‌پذیر ہے۔ آثار قحط بہ ہمہ وجوہ پیدا ہیں۔ صدہا آدمیوں نے گداگری اختیار کی۔ خدا اپنا فضل فرمائے۔

۲۷۔ نومبر ....جب کہ بباعث خشک سالی اسامیاں فاقہ کر رہے ہیں تو وصول ہونا مال گزاری کا سخت دشوار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ سرکار کوئی عذر سماعت نہیں کرتی۔

۳۰ - دسمبر - آج کل اکثر لوگ ساکنان سندیلہ بوجہ عدم پیداوار فصل خریف و گرانی غلہ کے کمال پریشان ہیں اور دو دو روز تک ان کو کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ خداوند کریم اس حالت نازک کو جلد دور فرمائے -

۳۱ - دسمبر - اگرچہ کچھ بارش ہوئی ہے لیکن چوں‌کہ ہنوز غلہ تیار نہیں ہے اس وجہ سے شکایت گرانی بدستور سابق ہے - خدا سے امید ہے‌کہ ایک وہ بھی دن ہوگا کہ یہ شکایت دفع ہوگی - دروازہ پر آج کل اس قدر محتاج آتے ہیں‌کہ ان‌کو اگر تھوڑی تھوڑی بھی بھیک دی جاتی ہے تو اس کی ایک مقدار کثیر ہوجاتی ہے -

۱۲ - فروری سنہ ۱۸۷۸ع :—چند عرصہ سے نرخ غلہ حسب ذیل ہے جس سے لوگوں کو از حد تکلیف ہے - روز دو چار آدمی تلف ہوتے ہیں :—

گندم	جو	ماش	کاکن	جوار خورد	جوار کلاں
۱۰سیر	۱۳سیر	۸سیر	۱۱سیر	۱۲سیر	۱۳سیر
قند سیاہ	نخود	برنج	روغن زرد	مسور	مونگ
۷½سیر	۱۲سیر	۸سیر	۲سیر	۱٤سیر	۱۰سیر
دال ارھر	مٹری عظیم‌آبادی	باجرہ	روغن سیاہ		
۱۱½سیر	۱۳سیر	۱۱½سیر	٤سیر		

یہ وزن نمبری سیر سے ہے -

۱۳ - فروری سنہ ۱۸۷۸ع :—بباعث گرانی غلہ اعلی و ادنی سب کو پریشانی ہے - اکثر آدمی بوجہ فاقہ‌کشی پہچانے نہیں جاتے - بباعث ہجوم محتاجین مجھے اپنی نشست‌گاہ بیرونی میں بیٹھنا دشوار ہے -

۱۷ - مارچ - بفضل یزداں بباعث آنے غلہ جدید کے شکایت گرانی کی کم ہوتی جاتی ہے - چوں‌کہ پیداوار بافراط ہے لہذا خدا سے امید ہے کہ نرخ غلہ کا روز بروز ارزاں ہوتا جائےگا -

ادبی خبریں

۳- اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ع :—مولوی غلام‌امام صاحب متخلص شہید متوطن الہ‌آباد آج تشریف لائے..........شہید صاحب مولود خوب پڑھتے ہیں

اور وقت پڑھنے کے عشق آنحضرت میں بےچین ہو جاتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آواز اچھی نہیں۔ بالفعل ان کی عمر ستر برس کی ہے۔ قرنائی لگا کر سنتے ہیں۔

انگریزوں کی تعلیم

۱۶۔ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع:- آج کیڈی صاحب نے دو کتابیں اردو ایک کی نوطرز مرصع دوسری حلوائے بےدود مجھ سے لیں اور فرمایا کہ کل کوئی وقت اپنے پڑھنے کا مقرر کروں گا۔

۱۰ جنوری ۱۸۷۳ع:- بوقت ملاقات کیڈی صاحب اسسٹنٹ انجینیر کانپور کو دو کتابیں مفیدالمبتدی اور معلم‌المبتدی پیش کیں۔ بعد ملاحظہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھے بوقت فرصت ان کو پڑھا دیا کرو بلکہ چند باتیں متعلقہ کتاب مجھ سے دریافت کیں۔ میں نے اس کا بہت صراحت سے جواب دیا کہ جس سے بہت خوش ہوئے۔

مشاعرہ

۱۴۔ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع۔ بمقام لکھنؤ:- آج منشی مظفرعلی اسیر کے مکان پر مشاعرہ تھا۔ میں بھی بہ ہمراہی منشی فضل‌رسول صاحب شریک ہوا۔ شام تک یہ صحبت رہی۔ چودھری عبدالباقی سندیلہ نے بھی اپنی غزل فارسی کی پڑھی۔ مجمع شاعروں کا بکثرت تھا۔ لطف خوب ہوا۔ لیکن سہ پہر کو بارش نے بے لطفی کردی۔

ادب

۶۔ مارچ سنہ ۱۸۷۴ع:- آج میں نے کتاب سروش سخن مصنفہ شیخ فخرالدین حسن صاحب دہلوی کو معائنہ کیا واقعی یہ کتاب فسانہ عجائب کے مقابلے میں خوب تیار ہوئی ہے اور بہت خوب ہے۔

مشاعرہ

۲۶۔ فروری سنہ۱۸۷۶ع:- آج شب کو میرے مکان پر مشاعرہ ہوا۔سید فضل‌حسین و چودھری عبدالباقی و دیگر شاعر شریک جلسہ تھے۔ عصمت شاعر کی ریختہ گوئی سے حاضرین کو کمال حظ حاصل ہوا۔ بعد بارہ بجے رات کے صحبت برخاست ہوئی۔

علیگڈھ

۲۹۔ دسمبر سنہ ۱۸۷۸ع:- منظور ہے کہ برخوردار-کو واسطے تحصیل علم مدرسۃالعلوم علیگڈھ کو روانہ کروں.........کہ وہاں کی تعلیم اچھی ہوتی ہے۔ اس میری رائے سے منشی-و منشی-نے بھی اتفاق رائے کیا ہے۔ منظور ہے کہ جنوری آئندہ سے ان کی تعلیم کا بندوبست مدرسہ مذکور میں کیا جائے۔

۱۷۔ جنوری سنہ ۱۸۷۹ع:- صبح کے دس بجے مدرسہ علیگڈھ میں پہنچا۔ مولوی

محمد اکبر صاحب منیجر مدرسہ مذکور سے ملاقات کرکے برخوردار۔و۔کو داخل بورڈنگ ہوس کے کیا اور مبلغ ۱۵ روپے ۱۲ آنہ بابت فیس مدرسہ و کرایہ مکان و صرفہ طعام٘ من ابتدائے جنوری سنہ ۱۸۷۹ء لغایہ مارچ مولوی صاحب منیجر کو حوالہ کیے..........

۱۸۔ جنوری سنہ ۱۸۷۹ء :--مقام علیگڈھ واسطے خرید اسباب ضروری میز و کرسی وغیرہ متعلقہ برخودار۔بازار علیگڈھ کو گیا۔ اول مولوی فریدالدین احمد صاحب صدر اعلی سے ملاقات کی۔ یہ رئیس کٹرہ مانکپور کے ہیں اور مبلغ ۷۰۰ روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ اس کے بعد مولوی محمد اسمعیل صاحب سے ملاقات کی۔ یہ نہایت ذی علم شخص ہیں..........بعد مولوی لطف اللہ صاحب مدرس جامع مسجد سے ملاقات کی۔ یہ مولوی صاحب فاضل زبردست ہیں اور بہت سے منتہی طالب علم ان کے پاس پڑھتے ہیں.. ....مولوی صاحب کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ ہے۔ مجھ سے بہ کمال تپاک پیش آئے۔ جامع مسجد میں میں نے نماز ظہر کی ادا کی۔ یہ مسجد نہایت مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ شب کو میں بورڈنگ ہوس مدرسۃالعلوم میں لوٹ آیا اور مولوی اکبر صاحب منیجر کو چھے آنے پیسہ دے کر بورڈنگ ہوس میں کھانا کھایا.......... ......

۲۲۔ جنوری سنہ ۱۸۷۹ء:۔مقام سندیلہ۔ حسب تحریک آج چودھری خصلت حسین صاحب سے ملاقات کی اور حالات تعلیم مدرسۃالعلوم بیان کیے جس سے نہایت درجہ خوش ہوئے۔ ان کا ارادہ ہے کہ اپنے پوتوں میں سے کسی کو واسطے تعلیم کے علیگڈھ کو بھیجیں۔ یہ مدرسہ سید احمد خاں صاحب نے قایم کیا ہے۔ بہت وسیع اس کا رقبہ ہے اور حکمت عملی یہ کی ہے کہ جو شخص ۲۰ روپے سید صاحب کو دیوے تو اس کا نام احاطہ دیوار کے ایک جزو میں کندہ کر دیا جاتا ہے اور جو شخص مقدار زاید دیوے اس کے نام کا پھاٹک بنایا جاتا ہے اور اس پر اس کا نام کندہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کارروائی سے اکثر لوگ بہ غرض ابقاء نام روپیہ دیتے ہیں اور دیواروں اور پھاٹکوں پر ان کے نام کندہ ہیں۔ اسی طور سے جو کالج زیر تعمیر ہے اس کی کارروائی بھی ہو رہی ہے اور صدہا آدمی اس چندے میں شریک ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔

تپ و لرزہ

۲۶ اکتوبر سنہ ۱۸۷۹ء :- بمعاینہ اخبارات واضح ہوتا ہے کہ بیماری تپ و لرزہ عالم‌گیر ہے۔ کوئی شہر و قصبہ و دہ اس سے محفوظ نہیں ہے (روزنامچہ 'وفات' کی وارداتوں سے اس موقعہ پر پُر پڑھیے)۔

۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۹ء :- آج کل سندیلہ خاص اور دیہات نواحی میں تپ و لرزہ کی از بس شکایت ہے۔ کوئی گھر نہیں ہے کہ جس میں چار پانچ بیمار نہ ہوں بلکہ کثرت اس پر ہے کہ اس علالت سے کوئی آدمی گھر میں محفوظ نہیں ہے۔ میرے مکان میں بھی چار آدمی مبتلا تپ و لرزہ ہیں۔

ادب

۲ اکتوبر سنہ ۱۸۷۹ء :- مولوی غلام امام شہید نے جو رشتہ میں منشی فضل‌رسول کے ماموں ہوتے تھے اور مولود شریف تصنیف‌کردۂ خود بہت اچھا پڑھتے تھے، بہ عمر ۷۵ سال الہ‌آباد میں انتقال کیا۔ یہ بزرگ بڑے نامور شخص تھے اور ریاست‌ہائے حیدرآباد و رام‌پور سے کچھ ماہواری ان کے صرف کے لیے مقرر تھے۔ صاحب تصنیف بھی تھے اور بباعث عارضہ ثقل سماعت کان میں قرنائی لگا کر باتیں سنتے تھے۔ مولوی صاحب لاولد فوت ہوئے۔

ہیضہ

۳۰ جولائی سنہ ۱۸۸۰ء :- اس سال دیہات نواحی میں بھی ہیضہ شروع ہوگیا ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی موضع ہو کہ جس میں اس کی شکایت نہ ہو۔

۱۲ اگست سنہ ۱۸۸۰ء :- بباعث ایام گرما شب کو اتفاق خواب کا سقف بالاخانہ پر ہوتا ہے اور متوفیان کے ورثا کی گریہ و زاری سے رات کو نیند نہیں پڑتی اور ایک نوع کا ہول پیدا رہتا ہے۔

مردم شماری

۱۷ فروری سنہ ۱۸۸۱ء :- آج مردم شماری بوقت ۹ بجے شب کے تمام ہندوستان میں شروع ہوئی اور ۳ بجے صبح کے ختم ہوئی۔ بعد چندے شمار ان کا معلوم ہوگا۔

ادب

۷ فروری سنہ ۱۸۸۲ء :- آج دوپہر کو منشی مظفرعلی اسیر شاعر نامی لکھنؤ نے بمقام لکھنؤ بعمر ۸۰ سال انتقال کیا۔ یہ منشی فضل‌رسول صاحب واسطی مرحوم کے شاعری میں استاد تھے اور ہزارہا آدمی مرحوم کے شاعری میں شاگرد

ھیں - عہد واجد علی شاہ میں مرحوم نے بہت بڑا اعزاز حاصل کیا تھا بلکہ بادشاہ بھی ان کے شاگرد تھے - .

مشاعرہ

۱۷ اگست سنہ ۱۸۸۳ع :-مکان منشی فضل حسین صاحب پر شام کو تقریب مشاعرہ ھوئی - شیخ ظہورالحسن شاعر لکھنؤ و راجہ غلام حسین خاں بہرائچ بھی شریک صحبت تھے - دیر تک اس کی گرم بازاری رھی -

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۸۳ع :-آج منشی فضل حسین نے صحبت مشاعرہ اپنے مکان پر منعقد کی جس میں شعرائے لکھنؤ و سندیلہ شریک تھے - بی بی عصمت شاعرۂ لکھنؤ کی غزل گوئی سے لوگ بہت محظوظ ھوئے - میں شریک صحبت نہ ھوسکا -

۱۹ اکتوبر سنہ ۱۸۸۲ع :-آج پھر مشاعرہ منشی فضل حسین کے مکان پر ھوا لیکن یہ امر میرے خلاف ھے کیوں کہ اس کا زیادہ چرچا اچھا نہیں ھے اور تجربے سے اس کا انجام بخیر ھوتے نہیں دیکھا -

۱۱ جنوری سنہ ۱۸۸۳ع :-شب کو پھر صحبت مشاعرہ منشی فضل حسین صاحب نے منعقد کی - دو بجے صبح کو فراغت ھوئی - چوں کہ یہ امر میرے خلاف ھے اس وجہ سے شریک نہ ھوسکا -

آتش زدگی و چیچک

۸ مئی سنہ ۱۸۸۲ع :-اب کی سال ہندوستان میں آتش زنی بہ کثرت ھوئی - بڑے بڑے کارخانے جل کر خاکستر ھوگئے اور تمامی ہندوستان میں شکایت چیچک بھی بہت ھوئی - ہزارھا لڑکے اس عارضہ میں فوت ھوئے -

اندرسبھا

۱۸ نومبر سنہ ۱۸۸۲ع :-شب کو رقص اندرسبھا کا منشی فضل حسین صاحب کے مکان پر ھوا - میں بھی شریک جلسہ تھا -

گورنر جنرل

۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۸٤ع :-۱۹ دسمبر کو لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل ہند کلکتہ سے ولایت کو روانہ ھوئے اور لارڈ ڈفرن صاحب نے چارج گورنر جنرل کا لیا - صاحب اول الذکر نے ہندوستانیوں کے ساتھ رضامندی کا اچھا برتاؤ کیا -

مشاعرہ

۲۹ جنوری سنہ ۱۸۸۵ع :-منشی فضل حسین صاحب کے مکان پر صحبت مشاعرہ قرار پائی - کلام منشی ظہورالحسن شاعر لکھنؤ بہ مقابلہ منشی محمدحسن نامی

شاعر باندہ بہت خوب تھا۔ کوئی شعر خالی استعارہ سے نہ تھا۔ واقعی خوب غزل کہتے ہیں۔

ستارے

۲۸ نومبر سنہ ۱۸۸۵ع :- شب کو آٹھ بجے سے ۱۲ بجے تک ہزاروں ستارے آسمان سے اترتے نظر آئے۔ یہ کیفیت تمامی ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ لوگوں نے بہ نظر حیرت اس کو مشاہدہ کیا۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا انجام ہو۔

برھما

۲۹ نومبر سنہ ۱۸۸۵ع :- آج سرکار انگلشیہ نے شہر مانڈلے دارالسلطنت ملک برھما پر فتح حاصل کی۔ شاہ ھتیبا نے اطاعت اختیار کی اور اپنی جان و مال کو انگریزوں کے سپرد کیا۔ شاہ موصوف بہ جانب رنگون بہ ذریعہ جہاز بھیجے گئے۔ شاید ہندوستان کے کسی ٹاپو میں اب ان کا قیام ہوگا۔

دربار جوبلی

۱۶ فروری سنہ ۱۸۸۶ع : مقام ہردوئی :- آج گیارہ بجے دن کے شریک دربار جشن جوبلی ہوا۔ میری کرسی بزمرہ آنریری مجسٹریٹان دوسری تھی۔ نمبر اول حاجی محمد حسین خاں شاہ آباد کا تھا۔ ھارس فورڈ صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع ہردوئی بہ لباس شاہانہ ھاتھی پر سوار ہوکر ۱۲ بجے تشریف لائے اور کرسی نقرئی جو بالائے تخت بچھی ہوئی تھی، متمکن ہوئے۔ اول چودھری محمد عظیم نے بہ زبان اردو اڈریس پڑھا۔ اس کے بعد قصیدہ منشی فضل حسین صاحب کا پیش ہوا، مگر پڑھا نہیں گیا۔ پھر منشی نظیر حسن صاحب وکیل کاکوروی نے چند اشعار مدح میں پڑھے۔ اس کے بعد پنڈت تربھون ناتھ بی۔اے منصف بلگرام نے من جانب انسٹیٹیوٹ بلگرام اسپیچ انگریزی میں دی۔ اس کے بعد صاحب بہادر نے بہ زبان اردو جواب اڈریس کا دیا۔ بعد تقسیم عطر و پان جلسہ برخاست ہوا۔ تین بجے گھوڑدوڑ و کشتی و شب کو روشنی و آتشبازی و ناچ طوایفوں کا ہوا اور اظہار مسرت میں ۱۱۸ قیدی فوجداری اور دو دیوانی کہ جن کی میعاد ۲۰ جون سنہ ۱۸۸۷ع تک ختم ہونے والی تھی، جیل خانہ ہردوئی سے رہا ہوئے۔

واجدعلی شاہ

۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۸۷ع :- کل واجدعلی شاہ سابق بادشاہ اودھ نے بہ مقام مٹیا بُرج کلکتہ بہ عمر ۷۰ سال قضا کی۔ مرحوم کے ۱۹ لڑکے اور ۳۸ لڑکیاں ہیں۔

(باقی آیندہ)

یاد وطن

از

(مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی، سشن جج حیدرآباد دکن)

اے اہل وطن پوچھ نہ تو مجھ سے خدا را   «دلی کا بھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا»

ہے یادِ وطن ہی میرے جینے کا سہارا   اس شہر کا ہر گوشہ ہے یوں تو مجھے پیارا

آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

یہیں سدا آنکھوں میں ہے جمنا کا کنارا

رات

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا   رہ رہ کے وہ پھر باد سبک سیر کا جھونکا

پانی کا وہ عالم کہ ہو آئینہ کا دھوکا   اس منظر خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اس عکس رخ ماہ سے پانی کا وہ دھارا   پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہوا پارا

اور سطح کو کچھ موج ہوا نے جو ابھارا   پھر لہروں کا اٹھ اٹھ کے بُلانے کا اشارا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

فالیز کے ایک کونہ سے رائیں[1] کی وہ آواز   جس نغمۂ بے ساز پہ قربان ہوں سو ساز

ان دھیمے سروں میں وہ کبھی تان کی پرواز   مدھم میں جو تھی سحر تو پنچم میں تھی اعجاز

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

---

۱ ۔ دہلی میں باغبانوں کی یہ ایک شاخ ہے جو ہمیشہ فالیز بوتی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ «راعی» کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔

اس جائے طرب خیز میں یاروں کا وہ جلسا دنیا کی خبر اور نہ اندیشہ عقبیٰ
بیٹھا ہے کوئی جھومتا اور کوئی ہے گاتا وہ بے سری آواز وہ ٹوٹا ہوا باجا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور سامنے ہی قلعہ کا وہ منظر مایوس وہ شمع زباں‌دانی کا ٹوٹا ہوا فانوس
ایک حسن کہ ہے چادر ویرانی میں ملبوس تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکز ناموس
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

صبح

وہ صبح کو مشرق کے چمک‌دار کنارے اور ان میں وہ کرنوں کے پر از نور شرارے
مغرب میں اترتے ہوئے وہ ماند ستارے دریا کی وہ بیداری وہ موجوں کے طرارے
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارہ

ہر گھاٹ پہ دلی کے حسینوں کا وہ جمگھٹ وہ ساڑھیاں ہر رنگ کی دو ہاتھ کے گھونگٹ
وہ حسن خداداد نہیں جس میں بناوٹ قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور ان کا وہ پھر گھاٹوں پہ ڈبکی کا لگانا گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑھی میں بدن کا وہ چرانا جھک‌جھک کے وہ جل ہاتھوں سے سورج کو چڑھانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بڈھوں کا وہ پایاب کنارے پہ اترنا اور جوش عقیدت سے وہ جل گھنڈی میں بھرنا
بند آنکھیں کیے دل میں دعائیں یہی کرنا "ہے رام ہمارا تو یہیں جینا ہو مرنا"
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

سادھو کا کہیں بیٹھنا مارے ہوئے آسن دنیا کی تمناؤں سے کھینچے ہوئے دامن
خاموش مگر ہاتھ میں پھرتی ہوئی سمرن اور ٹوٹنا لوگوں کا وہاں کرنے کو درشن
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ایک سمت وہ جلتی ہوئی دو چار چتائیں شعلوں کی لپک اور دھنویں کی وہ گھٹائیں
وہ نالہ و فریاد کی دل‌دوز صدائیں سن کر جنہیں دشمن کے بھی آنسو نکل آئیں
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

برسات

برسات کے عالم کا نہ کچھ پوچھ فسانہ　　دریا پہ امنڈ آتا تھا سارا ھی زمانہ
لہروں کی زبانوں پہ وہ ساون کا ترانہ　　سنگت میں وہ گرداب مےء چنگ و چغانہ
آنکھوں میں وھی پھرتا ھے جمنا کا کنارا

†وہ بیلہ کے ہر کونہ سے موروں کی جھینکاریں　　اور آموں پہ کوئل کی وہ کوکو کی پکاریں
وہ ابر کے رنگوں کے بدلنے کی بہاریں　　ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں
آنکھوں میں وھی پھرتا ھے جمنا کا کنارا

دریا کی روانی کا کہوں تجھ سے میں کیا رنگ　　تھا قافیہ ہر تیرنے والے کا وھاں تنگ
تیرا کوں میں اور پانی میں آپڑتی تھی جب جنگ　　چڑھ بھی گئے دھارے پہ تو کھاتے تھے قلاجنگ
آنکھوں میں وھی پھرتا ھے جمنا کا کنارا

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ　　چلتا تھا کہیں یاروں میں دور مےء گل رنگ
اڑتا تھا کہیں گانجہ تو چھنتی تھی کہیں بھنگ　　تھا سب کا غرض شوق جدا اور جدا رنگ
آنکھوں میں وھی پھرتا ھے جمنا کا کنارا

امواج کے دھاروں پہ جھاگوں کے وہ پرچم　　پھر پل سے وہ ان فوجوں کے ٹکرانے کا عالم
پانی کا وہ سناٹا وہ گردابوں کا اودھم　　وہ چیخیں ستونوں کی وہ دیواروں کا ماتم
آنکھوں میں وھی پھرتا ھے جمنا کا کنارا

وہ قسمت بیدار کے دن اور وہ راتیں　　وہ کشمکش دھر کے جھگڑوں سے نجاتیں
اور لطف جوانی کا اٹھانے کی وہ گھاتیں　　فرحت کو نہ بھولی ھیں نہ بھولیں گی وہ باتیں
یاد آئے گا ھر وقت وہ جمنا کا کنارا

---

† - جمنا کے کنارے کنارے جو جنگل چلا گیا ھے اس کو بیلہ کہتے ھیں -

ادبی معلومات

مرتبۂ «نا خدا»

چیخوف

از

گورکی

[گورکی مرحوم کی ڈائری بڑی دلچسپ کتاب ھے جو بدقسمتی سے اب نایاب ہے ۔ اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔ دنیائے ادب نے مختصر افسانہ نویسی میں چیخوف کا ثانی اب تک پیدا نہیں کیا ۔ گورکی اس کا عزیز دوست تھا ۔]

بوڑھے اخبار نویس 'سوورن' کو ایک خط میں چیخوف نے لکھا تھا: "روٹی کی بےرنگ لڑائی سے زیادہ بےلطف اور غیر شاعرانہ چیز کوئی نہیں ۔ یہ زندگی کو وبال جان بنا دیتی ھے اور انسان کو بےحس بننے کے لیے مجبور کر دیتی ھے"۔

یہ الفاظ ایک خالص روسی رجحان کی ترجمانی کرتے ھیں اور میری رائے میں فقط چیخوف کی ذات تک محدود نہیں ھیں ۔ روس میں یوں سب کچھ ھے لیکن لوگوں میں محنت کی محبت نہیں ھے ۔ ان کی اکثریت یہی سوچتی ھے ۔ روسی محنت کی تعریف کرتا ھے لیکن اس پر ایمان نہیں رکھتا ۔ مثلاً جیک لونڈن جیسا عمل پرست مصنف روس میں پیدا نہیں ھوسکتا، حالانکہ وہاں اس کی کتابیں بہت مقبول ھیں لیکن وہ روسیوں میں ترغیب عمل پیدا نہیں کرتیں ۔ وہ صرف ان کے تخیل کو جوش میں لاتی ھیں ۔

لیکن اس نقطۂ نگاہ سے چیخوف 'خالص روسی' نہیں ھے ۔ اس نے جوانی کے اولین دور میں روٹی کی لڑائی شروع کر دی تھی ۔ روزمرہ کی اکتا دینے والی زندگی اور روٹی کے ایک ٹکڑے کی تلاش اسے وراثت میں ملی ۔ اور یہ ٹکڑا چھوٹا موٹا نہ تھا کیونکہ اس کا کنبہ بڑا تھا ۔ اس کی جوانی کو ان افکار نے سلب کرلیا اور

حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود اس کی خوش مذاقی باقی رہی۔ اس نے دیکھا کہ امن اور اطمینان کی جستجو کا نام زندگی ہے۔ آئے دن کی چھوٹی موٹی باتوں نے اس کے لیے بڑے بڑے واقعات پر موٹی سی چادر ڈال دی تھی۔ ان واقعات کی تہ پر توجہ کرنے کی فرصت اسے اس وقت ملی جب وہ فکر معاش سے کسی حد تک آزاد ہوگیا۔

مجھے اب تک ایسا کوئی آدمی نہیں ملا جو چیخوف سے زیادہ اس رمز کو سمجھا ہو کہ سارے تمدن کی بنیاد محنت پر ہے۔ یہ جذبہ اس کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ میں کارفرما تھا۔ اس کی عادات، انتخاب اور انسان کی تخلیقی قوت سے محبت——یہ سب باتیں اس امر کی شاہد ہیں۔ اسے عمارت‌سازی اور باغبانی سے الفت تھی۔ وہ محنت کی شاعری کا رسیا تھا۔ اپنے باغ میں اس نے جو خوب‌صورت پیڑ پودے لگائے تھے ان کی باڑھ کو وہ کس شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ اپنے مکان کی تعمیر کے منصوبے باندھتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ "اگر ہر آدمی اپنی تھوڑی سی زمین کو سنوارنے کی پوری کوشش کرے تو یہ دنیا کتنی حسین ہو جائے"۔

ایک مرتبہ میں نے اسے اپنے ایک نامکمل ڈرامے کا ایک منظر سنایا جس میں ایک کسان فخریہ کہتا ہے :-

"اے کاش مجھ میں اور بھی زیادہ طاقت ہوتی تو میں ایسا گرم سانس کھینچتا کہ برف بھی پگھل جاتی!"

میں ساری دنیا کا چکر لگاتا اور زمین کے جگر تک ہل چلاتا۔ میں عمر بھر گشت لگاتا اور شہروں کی قطار لگا دیتا؛ بے‌شمار کلیسا بناتا اور ہر طرف باغ ہی باغ لگا دیتا۔ دنیا کو میں دلہن کی طرح سجاتا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیتا اور اسے لیے ہوئے خدا کے حضور میں پیش ہو جاتا۔

یارب! دیکھنا کہ تونے جو مٹی کا ڈھیلا آسمان سے پھینک دیا تھا اس میں میں نے کیسی چمن‌بندی کی ہے۔ دیکھ اور میرے ساتھ مسرور ہو۔ تیرے دیے ہوئے سنگ پارہ کو میں نے الماس بنا دیا ہے اور وہ دھوپ میں جگمگا رہا ہے۔ میں یہ تحفہ تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں——————ارے نہیں نہیں——مجھے تو یہ جان سے زیادہ عزیز ہے!"

چیخوف کو یہ خودکلامی ازحد پسند آئی تھی اور جوش میں آکر وہ کہنے لگا ۔ "یہ بہت ہی خوب ہے ! ۔ یہ حقیقت اور فطرت پر مبنی ہے ۔ یہی سارے فلسفے کی بنیاد ہے ۔ انسان نے دنیا بسائی ہے اور اس کا فرض ہے کہ اس سے آرام کے سامان پیدا کرے "۔ پھر وہ بار بار سر ہلا کر کہتا تھا ۔ "یقیناً یہ ہوکر رہے گا"۔ اس نے مجھ سے کسان کی لنترانی سنانے کی دوبارہ فرمائش کی ۔ غور سے سننے کے بعد اس نے کہا :۔ "آخری دو سطریں غیر ضروری ہیں ، انہیں نکال دو "۔

*　　*　　*　　*

اپنی ادبی تصانیف کے متعلق وہ بہت کم باتیں کرتا تھا اور وہ بھی اپنی مرضی کے خلاف ۔ ان باتوں میں معصومیت ہوتی تھی اور وہ اپنے متعلق اتنی ہی احتیاط برتتا تھا جتنی کہ ٹالسٹائے کے بارے میں ۔ مزے کی کسی کیفیت میں وہ ہنستے ہنستے اپنے ایک نئے خیال کا ذکر کرتا تھا اور یہ خیال اکثر پر لطف ہوتا تھا : "سنا بھئی ۔ میں ایک استانی کا قصہ لکھنے والا ہوں ۔ وہ مذہب کو نہیں مانتی ۔ ڈارون کی پرستار ہے اور عوام کے اوہام کی دشمن ہے ۔ اس کے باوجود آدھی رات کو اپنے غسل‌خانے میں کالی بلی کو زندہ ابالتی ہے تاکہ اس کی ایک ہڈی سے محبت کا جادو جگائے" ۔

اپنے ڈراموں کو وہ " دل خوش کن " کہا کرتا تھا ۔ ادب کے ہر رجحان پر وہ بڑی سنجیدگی سے غور کرتا تھا اور نوآموز ادیبوں پر اس کی خاص شفقت رہتی تھی ۔ ان کے مسودوں کی اصلاح وہ بڑی محنت سے کرتا تھا ۔ کہا کرتا تھا کہ " ہمارے مصنفوں کی تعداد بڑھنا چاہیے ۔ ادب ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے لیے بھی نئی چیز ہے ۔ ناروے میں ۲۲۶ آدمیوں میں سے ایک مضمون‌نگار ہے لیکن روس میں دس لاکھ میں صرف ایک "۔

*　　*　　*　　*

بیماری بسا اوقات اس میں بیداری پیدا کر دیتی تھی ۔ ایسے موقعوں پر وہ لوگوں کو مایوسی کی نظر سے دیکھتا تھا اور من‌مانی باتیں کرتا تھا ۔ ایک دن دیوان پر لیٹے لیٹے کھانستے ہوئے کہنے لگا : " مرنے کے لیے زندہ رہنا نہایت بےلطف چیز ہے ۔ لیکن یہ جانتے ہوئے جینا کہ ہم وقت سے پہلے مر جائیں گے ، قطعاً بیہودہ امر ہے "۔

دوسری مرتبہ کھڑکی سے وسیع سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے یک بیک وہ غصے سے تھرتھراتی ہوئی آواز سے بولا: "ہمیں عمدہ موسم' اچھی فصل' دولت مندی' آمد محبوب یا بڑے عہدے کے انتظار میں جینے کی عادت ہوگئی ہے۔ لیکن مجھے اب تک ایسے لوگ نہیں ملے جو دنیا سے کچھ سیکھنے کی توقع کرتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ نئے زار کے عہد حکومت میں حالات بہتر ہو جائیں گے اور دو سو سال میں دنیا بہشت بن جائے گی۔ لیکن اپنے فردا کو امروز سے بہتر بنانے کے لیے کوئی کوشاں نہیں۔ زندگی میں روز پیچ پر پیچ پڑتے جاتے ہیں اور وہ بے لگام بھاگی جاتی ہے۔ ادھر لوگ روز بروز زیادہ احمق ہوتے جاتے ہیں اور زندگی کے اردگرد لوٹتے رہتے ہیں۔ چند منٹ کچھ سوچنے کے بعد ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگا:- "کلیسا کے جلوس میں لنگڑے بھکاریوں کی طرح!"

چیخوف ڈاکٹر تھا۔ اور معمولی مریض کی بنسبت ڈاکٹر کو اپنی بیماری زیادہ تکلیف دیتی ہے۔ مریض صرف محسوس کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ان حالات کو جانتا ہے جو اس کے جسم کو برباد کر رہے ہیں۔ ان صورتوں میں علم موت کی مدد کرتا ہے۔

* * * *

جب وہ مسکراتا تھا تو اس کی آنکھیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں نسوانی آنکھوں کا تبسّم اور حلاوت ہوتی تھی۔ اور اس کی ہنسی جو بہت خاموش ہوتی تھی' عجیب و غریب تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح ہنس رہی ہے۔ میں نے اب تک کسی کو ایسی "روحانی" ہنسی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن کوئی پھبتی اسے خوش نہ کرسکتی تھی۔

ایک مرتبہ ہنستے ہوئے اس نے مجھ سے کہا: "جانتے ہو کہ ٹالسٹائے کی رائے تمھارے متعلق کیوں بدلتی رہتی ہے؟۔ وہ جلتا ہے کہ 'سارینز کی' اس سے زیادہ تمھیں پسند کرتا ہے۔ ساری بات یہی ہے۔ کل ٹالسٹائے نے مجھ سے کہا: "میں گورکی سے خلوص کا برتاؤ نہیں کرسکتا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ کیوں۔ مجھے یہ معلوم کرکے تکلیف ہوئی کہ 'سولر' اس کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ سولر کے لیے اچھا نہیں۔ گورکی بڑا

بے مہر ہے ۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک ایسے دینی طالب علم کا خیال آتا ہے جو اپنی مرضی کے خلاف کلیسا میں ڈال دیا گیا ہو اور اس وجہ سے دوسروں سے نفرت کرنے لگا ہو ۔ اس کی روح جاسوس ہے ۔ وہ کنعان میں آ تو گیا لیکن اپنے آپ کو اکیلا پاتا ہے ۔ وہ سب کو غور سے دیکھتا ہے اور اپنے دیوتا سے ان کی رپٹ کیا کرتا ہے ۔ اور یہ دیوتا کوئی جن یا دیو ہے" ۔

یہ کہتے کہتے چیخوف کا ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ پھر کہنے لگا : "میں نے ٹالسٹائے سے عذر کیا کہ گورکی تو بہت ہی بامروّت ہے ۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور بولا کہ نہیں نہیں' میں اسے خوب سمجھتا ہوں ۔ اس کی ناک بطخ کی سی ہے اور ایسی ناک والے بڑے بے مہر اور جلے تن ہوتے ہیں ۔ عورتیں اسے نہیں چاہتیں اور تم جانتے ہو کہ عورتیں کتّوں کی طرح انسان کو بھانپ لیتی ہیں ۔ سولر اس سے بالکل الگ ہے ۔ اس کی محبّت بے لاگ ہوتی ہے ۔ وہ اس فن میں کامل ہے ۔ جو محبّت کی رمز کو سمجھا' وہ سب کچھ جان گیا ۔"

ایک لمحہ رک کر چیخوف نے کہا: "ہاں بڈھا جلتا ہے ۔ لیکن وہ کیسا عجیب و غریب انسان ہے ! "............

وہ ٹالسٹائے کا ذکر ایک خاص انداز میں کرتا تھا ۔ اور اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک غیرمبہم فکرمند تبسّم آ جاتا ہے ۔ اس کی آواز اتنی دھیمی ہوجاتی تھی گویا وہ کسی ایسے پر اسرار واقعہ کا ذکر کر رہا ہے جو دھیمی آواز کا مقتضی ہے ۔ وہ اکثر شکایت کرتا تھا کہ ٹالسٹائے کو ایسا ہمراز نہ ملا جو گویٹے کو نصیب تھا (ایکرمان) جو بوڑھے جادوگر کے انوکھے خیالات کو قلمبند کرتا جاتا ۔ سلریزکی سے اس نے کہا کہ "تمھیں یہ کام کرنا چاہیے ۔ ٹالسٹائے تم سے اس قدر محبت کرتا ہے اور کھل کر باتیں کرتا ہے ۔"

* * * *

ایک مرتبہ ٹالسٹائے نے خوشی کے عالم میں چیخوف کے ایک افسانے کی تعریف ان الفاظ میں کی: "یہ ایک کنواری کے کاڑھے ہوئے کشیدہ کی طرح ہے ۔ پرانے

زمانے میں ایسے کشیدہ کاڑھنے والے ہوتے تھے کہ اپنی ساری زندگی کی تصویر کشیدے میں بنا دیتے تھے ۔ وہ اپنے دبے ہوئے ارمانوں اور خاموش خوابوں کو کشیدے کے دھاگوں میں پرونے کی قدرت رکھتے تھے ۔

یہ کہتے کہتے ٹالسٹائے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اسی دن چیخوف کا بخار تیز ہوگیا تھا ۔ وہ وہیں سر جھکائے بیٹھا تھا ۔ اس کے گالوں کی چھپک بڑھ گئی تھی ۔ دیر تک چپ رہ کر چیخوف نے ایک گہرا سانس کھینچا اور شرمائی ہوئی آواز میں دھیرے سے کہا: " اس میں چھاپے کی کئی غلطیاں رہ گئیں ۔ "

چیخوف کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے قلم میں نکتہ‌رسی اور نزاکت چاہیے جو مجھے میسّر نہیں ۔ لیکن ایسے آدمی کا خیال زندگی میں تازگی پیدا کرتا ہے اور اسے بامعنی بناتا ہے ۔

اپنی کوتاہیوں اور گمراہیوں کے باوجود انسان کائنات کا سرتاج ہے ۔ ہم اپنے ہمجنسوں کی ہمدردی کے بھوکے ہیں ۔ اور جب بھوک ہو تو ادھ‌کچی روٹی بھی بھلی لگتی ہے ۔

نئی ترکی زبان

از

سر ڈینی‌سن راس

جمہوریۂ ترکیہ کی زبان اس بولی سے نکلی ہے جو سنٹرل ایشیا کے ترکوں میں رائج ہے ۔ یہ خطۂ زمین تمام ترکوں کا اصلی وطن ہے ۔ 'ترک' اس بولی میں 'مضبوط' کو کہتے ہیں ۔

ترکی زبان کے قدیم ترین خطبے وہ " رونی " (Runic) نشانات ہیں جو بیکال جھیل کے قریب سنگی ستونوں پر کندہ تھے ۔ یہ ستون آٹھویں صدی کے ہیں ۔ ترکی عبارت کا ترجمہ چینی میں کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے خطبے کو پڑھنے میں بڑی آسانی

ہوئی - اس میں اس ترکی حکومت کا ذکر ہے جو کوہ التائی اور دیوار چین کے درمیان قایم کی گئی تھی -

عروج اسلام سے پہلے جو قبیلہ ترکوں میں سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ تھا اس کا نام «اوئی غور» تھا - اس کی راجدھانی 'ترفان' تھی - حال ہی میں سنٹرل ایشیا میں ان کے ادب کا سارا ذخیرہ حاصل ہوا ہے جو بودھی' عیسائی اور منیچی دوروں میں پھیلا ہوا ہے - ان میں سے زیادہ ترکی عبارت قبیلے کے مخصوص رسم‌الخط میں ہے مگر چند نوشتے «رونی» میں بھی ہیں -

جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ترکوں کے مختلف قبیلے چینی ترکستان میں بستے گئے - ان کی زبان نے ان انڈو جرمانی بولیوں کی جگہ چھین لی جو اب تک وہاں رائج تھیں - کچھ عرصے بعد ترک مشرقی سائیبریا' جنوبی روس اور وادیء ڈینیوب میں آباد ہو گئے - دسویں صدی میں جب ان کی ٹکر اسلامی حکومتوں سے شروع ہوئی تو وہ شمالی ایران اور ایشیائے کوچک میں پھیلنے لگے - کچھ دنوں بعد بائزنتائین سلطنت کے خرابوں پر ترکوں کا راج قائم ہوا -

اس ادل بدل اور افراتفری کے باوجود مقام حیرت ہے کہ تمام ترکوں کی زبان میں وہی پرانی یگانگت باقی رہی اور وہ اپنے اجداد کی زبان کو آج تک نہیں بھولے - اناطولیہ' سمرقند اور چینی ترکستان کے ترکوں کی زبان میں نسبتاً بہت کم فرق ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ زمان و مکان کے اتنے وسیع فاصلے کے باوجود ترکی زبان میں اتنا کم تغیر کیوں ہوا -

مشرق بعید کے ترک کا منگولی چہرہ جس طرح اناطولیہ میں آکر بدل جاتا ہے اسی طرح ترکی زبان مغرب سے جس قدر قریب ہوتی ہے' اتنی ہی حلیم اور معتدل ہوتی جاتی ہے-

مذہب اسلام اختیار کرنے کے بعد جب ترکوں نے عربی رسم‌الخط کو اپنایا تو ساتھ ہی ساتھ بہت سے عربی الفاظ اور محاورے بھی ان کی زبان میں داخل ہو گئے - جب شاعری شروع کی تو انھوں نے فارسی شاعروں کو اپنا استاد بنایا اور وہاں سے بھی ہزاروں الفاظ اپنی زبان میں لے لیے -

کمال اتا ترک کی اصلاح

اتا ترک کی اصلاحوں میں رومن رسم الخط کا رواج سب سے زیادہ اهم اور دوررس هے ۔ عربی رسم الخط کے دیس نکالے کے بعد غیر ملکی (عربی، فارسی اور فرانسیسی) الفاظ کو نکالنے کی تحریک لامحالہ شروع هوئی تهی ۔ رسم الخط کو بدلنا تو آسان تها؛ اس کے لیے ایک حکم نامہ کافی تها البتہ ذخیرۂ الفاظ کو بدلنا مشکل تها ۔ لیکن اتا ترک نے ایسی مستعدی سے یہ کام کیا جو ان کی تمام اصلاحوں سے مخصوص هے ۔

ایک انجمن برائے مطالعۂ زبان (ترک دلی تتلک جمعیت) قائم کی گئی ۔ اس کا فرض یہ تها کہ ترک زبان کے تمام ادب اور لغات کی چهان بین کرے ۔ سنٹرل ایشیا کے قدیم نوشتوں اور خطبوں کی تفتیش بهی اس کے ذمہ تهی ۔ دو سو کتابوں اور لغات کے عمیق مطالعہ کے بعد غیر ملکی الفاظ کی ایک فهرست ان کے هم معنی ٹهیٹ ترکی الفاظ کے ساتھ مرتب کی گئی ۔

یہ فهرست ترکی زبان کے ملکی اور غیر ملکی فاضلوں کو تبصرے کے لیے بهیجی گئی کیوں کہ صحیح هم معنی الفاظ کا انتخاب بہت دشوار هے ۔ چنانچہ اس فهرست میں ایک ایک غیر ملکی لفظ کے لیے بسا اوقات تیس تیس ملکی الفاظ تجویز کیے گئے هیں! ۔ «اللہ» کے لیے ۱۷ الفاظ دیے گئے هیں جن میں سے کئی سنٹرل ایشیا سے مستعار هیں ۔ مثلاً: ، ادی ، (حاکم) منکو (غیر فانی) اور ، تنری، (آسمان)! ۔ لطف تو یہ هے کہ قرآن کے جدید ترجمہ میں جهاں عربی کے الفاظ سے حتی الامکان احتراز کیا گیا هے وهاں ،اللہ، کو جوں کا توں رهنے دیا هے ۔

جب یہ فهرست مکمل هو گئی تو اخباروں نے قصداً ان نئے الفاظ کا استعمال شروع کیا ۔ ابتدا میں انهیں سمجهنے میں اتنی دقت هوتی تهی کہ ان کا مطلب فٹ نوٹ میں سمجهانا پڑتا تها ۔ رفتہ رفتہ لوگ عادی هو گئے ۔ اب تو سرکاری احکام هی میں نهیں بلکہ ناولوں اور روزمرہ کے مضامین میں ان کا استعمال بےتکان هوتا هے ۔

تعلیم یافتہ طبقے نے تو آسانی سے اس اصلاح کو قبول کر لیا ۔ مگر کسانوں اور عامیوں کو بدلنا کهیل نهیں ۔

اب تک اس انجمن کے تین جلسے اصلاح کو مقبول بنانے کے لیے ہو چکے ہیں۔ دو جلسوں میں جو سوچ بچار ہوا وہ ایک نئی لغت کی صورت میں شایع کیا گیا۔

مگر سنہ ۱۹۳۶ع کے تیسرے جلسے میں ایک نئی بات ہوئی۔ یہاں 'سورج بھاشا' کا نظریہ پہلی بار پیش کیا گیا۔ اس نظریہ کے مطابق دنیا کی سب سے پرانی زبان ترکی ہے۔ اس وجہ سے دنیا کا کوئی لفظ اس کے لیے نیا نہیں ہو سکتا۔ چناں‌چہ غیر ملکی الفاظ کو زبردستی نکالنے کی تحریک سست پڑ گئی۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ادبی زبان میں ان کی تعداد تین چوتھائی سے کم نہ تھی اور ان کا اثر کسانوں پر بھی کم نہ تھا۔

تاہم اس جلسے سے پہلے ہزاروں پرانے الفاظ رخصت ہو چکے تھے اور نئے نئے محاورے لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ اور ان کی تعداد روز افزوں ہے۔ یہ کام اتنا تغیرپذیر ہے کہ کسی یورپین عالم کو کوئی ترکی زبان کی گرامر یا ڈکشنری بنانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

اب ترک عالم نئے طرز میں لکھتے ہیں اور قدیم ادب رومن رسم‌الخط میں شایع ہونے لگا ہے۔ یہ قطعی امر ہے کہ آنے والی ترک نسلیں محض ریسرچ کی خاطر عربی رسم‌الخط سیکھا کریں گی۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ عربی رسم‌الخط ترکی کے لیے بالکل غیر موزوں تھا۔ وہ صرف تین حروف علت کی آوازیں پیدا کرتا تھا اور اس کے برعکس رومن رسم‌الخط میں آٹھ آوازیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

جو عربی الفاظ رہ بھی جائیں گے نئے رسم‌الخط میں ان کی صورت اتنی بدل جائے گی کہ کچھ عرصہ بعد ان میں کوئی انفرادیت نہ رہے گی۔

ترکی ادب

از

حسن علی یوچل

ہمارا ادب اتناہی پرانا ہے جتنی کہ ہماری تاریخ — پہلی صدی عیسوی کی چینی تصانیف میں ہمیں ایسے گیت ملتے ہیں جو کہ ترکی رزمیہ نظموں سے مستعار ہیں۔ ترک قاید «اتلاّ» کے ذکر میں لیٹن مورخوں نے یہ لکھا ہے کہ اس کے سپاہیوں کے پاس بہت سی کہانیوں اور گیتوں کا ذخیرہ تھا جو لکھی تو نہ گئی تھیں لیکن انھیں زبانی یاد تھیں۔ آٹھویں صدی کے اورخانی خطبے یہ بتلاتے ہیں کہ ہمارے اجداد کو اپنے خیالات کے اظہار کا اسلوب خوب آگیا تھا۔

یہ تو طے ہے کہ پرانے ترکوں نے 'عامی ادب' پیدا کیا لیکن ہمیشہ نقل مکان کرتے رہنے کی وجہ سے یہ ادب ضایع ہوگیا۔ تاہم اس زمانے کے بہت سے نوشتے دریافت ہوئے ہیں جو 'اوئیغور' رسم الخط میں ہیں اور ہنوز پڑھے نہیں جاسکے۔ آٹھویں دسویں صدی کے جو مسودے پڑھ لیے گئے ہیں، یہ ثابت کرتے ہیں کہ ترکوں کا لسانی اور ادبی ذوق کتنا اچھا تھا۔

مسلمان ہونے کے بعد ترک علما اور فلسفیوں نے عربوں سے بھی زیادہ اسلام کی تبلیغ کی۔ ایک طرف تو وہ اسلام کے اصولوں کو پھیلاتے تھے اور دوسری طرف قدیم بت پرست 'عامی گیتوں' کی اسپرٹ کو مٹنے نہ دیتے تھے۔ ہماری زبان میں جو «پہاڑوں کی حمد» ہے وہ دنیا کے مناجاتی ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ التائی ترکوں کے گیتوں میں اب تک وہی پرانی شان اور حسن باقی ہے۔ «دیوان لغت الترک» میں جو گیارھویں صدی میں مرتب ہوا تھا، قدیم شاعری کے نمونے موجود ہیں۔

عہد اسلامیہ میں ہمارے آگے ایرانی اور عربی شاعری کے نمونے تھے۔ اس دور کا سب سے پرانا ادبی کارنامہ «کداد کو بلک» ہے جو گیارھویں صدی میں لکھا گیا تھا۔

چودھویں صدی تک ترکی زبان کی 'جکتئی'، 'ازرمی' اور 'عثمانی' بولیوں نے

اپنے اپنے لیے الگ الگ سانچے بنا لیے تھے ۔ انھوں نے اس مشہور « ادب دیوان » کی پرورش کی جو عربی سے زیادہ فارسی کا منت‌پذیر تھا ۔ لیکن یہ درباروں اور امیروں کا ادب تھا، عوام پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے گیت گاتے رہے اور اپنی ہی کہانیاں سنتے سناتے رہے ۔ البتہ 'تکیے' (یعنی خانقاہوں) کا ادب ان میں بہت مقبول تھا ۔ « ادب دیوان » کا جسم ایرانی اور روح 'باطنی' تھی ۔ اس کا درس یہ تھا کہ دنیا فانی اور اللہ باقی ہے ۔

اس قسم کے ادب کا غلغلہ انیسویں صدی کے نصف تک رہا ۔ مگر سنہ ۱۸۳۹ع کی سیاسی اصلاحوں نے ایک نئے دور کا آغاز کردیا تھا اور زندگی یورپ کی طرف کروٹ بدل رہی تھی ۔ پڑھے لکھے لوگ شیکسپیر اور وکٹرھیوگو کے پرستار بنے ہوئے تھے ۔ ان اسباب نے ادب کو بھی بدلنا شروع کیا اور « تنظیمت ادب » کا دور شروع ہوا ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نظم و نثر میں یورپین رنگ غالب ہونے لگا، ناٹک اور ناول لکھے جانے لگے اور مذہبی مضمونوں کی جگہ سماجی اور وطنی موضوع نے لے لی ۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دور ایشیائی اثرات سے بالکل آزاد ہوگیا ۔

سنہ ۹۶-۱۸۹۵ع میں ایک نیا ادبی دور شروع ہوا جسے «ثروت فنون» کہتے ہیں ۔ دراصل یہ ایک جریدہ کا نام تھا ۔ اس رجحان کے نمایندے سرتا سر مغرب‌پرست تھے اور عبدالحمید کے مظالم سے بچنے کے لیے اپنا مقصد اشاروں (Symbols) میں ظاہر کرتے تھے ۔ وہ سب آزادی اور ترقی کے پرستار تھے ۔ لیکن وہ مشرقی تمدّن سے ناآشنا تھے اور اس وجہ سے ملک کو ایسا ادب نہ دے سکے جو دونوں تمدّن کا صحیح امتزاج ہو ۔ چند سال کے اندر عبدالحمید نے ان ادیبوں کا منہ بند کردیا ۔

'ثروت فنون' کی تحریک نے ان لوگوں کو بھڑکا دیا جو اب بھی قدیم «ادب دیوان» کے شیدا تھے ۔ لیکن یہ لوگ مغرب سے اتنے ہی بیزار تھے جتنا کہ وہ لوگ مشرق سے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بھی ترکوں کی روح اور تاریخ کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور چند روز میں ان کا اثر زایل ہوگیا ۔

سنہ ۱۹۰۸ع کے دستور کے بعد ترکی ادب میں ایک 'تراجی' عہد کا ظہور ہوا ۔

جنگ بلقان کی شکست نے اس بےراہ‌روی کو مایوسی اور مذہب پرستی کی طرف لگا دیا ۔ اس قسم کے ادیبوں کا خیال تھا کہ ایک مذہب کے ماننے والے لوگ ایک ہی قوم میں رہ سکتے ہیں ۔ ان کا ادب عوام میں مقبول ہوا ۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نیا فلسفہ پیدا ہوا جس کا مقصد لوگوں کو «ترک، مسلمان اور ترقی پسند بنانا» تھا ۔ جنگ عظیم کے زمانے میں یہ ادبی رجحان زوروں پر رہا ۔

شکست کے بعد پھر انحطاط کا دور آیا ۔ لیکن کمال اتاترک کی حکومت میں اس کے لیے جگہ نہ تھی ۔ جمہوریۂ ترکیہ نے ہر طرف ترقی کے راستے کھول دیے ہیں ۔ تاریخ اور لسانیات میں انقلاب ہوچکا ہے ۔ ہمارے ادب میں سماج اور قوم کا قلب دھڑک رہا ہے اور اسے دیکھنے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ہمارے ادب کا مستقبل بہت روشن ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ جب دور جدید کے ادبی کارناموں کو یورپ میں منتقل کیا جائے گا تو وہاں کے ادیب ہماری ترقی کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے ۔

نئی فرانسیسی انسایکلوپیڈیا

(«ٹایمس لٹریری سپلیمنٹ» کا تبصرہ)

اب تک اس انسایکلوپیڈیا کی جو نو جلدیں شایع ہوچکی ہیں، انہیں دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ انگریزی یا کسی بھی دوسری زبان کی انسایکلوپیڈیا سے بالکل مختلف ہے ۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی بدل نہیں ہوسکتی ۔ اس میں نہ مشاہیر کے حالات ملیں گے اور نہ مشکل الفاظ کے مطالب ۔ بلکہ اس کا مقصد ہے انسان کے خیال و عمل کی الجھی ہوئی دنیا کو سلجھانا اور انسان کی کارگزاریوں کا جائزہ خوردبین کی طرح لینا ۔

اس وسیع کارنامے کی داغ بیل سنہ ۱۹۳۲ع میں فرانس کے وزیر تعلیم موسیے اناطول دمونزی نے ڈالی ۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نگاہ کو ایک لفظ میں ظاہر کیا تھا:

«سمجھانا» ۔ اس کے برعکس دوسری انسایکلوپیڈیاؤں کا مقصد ہوتا ہے «سکھانا» اس میں ماضی کی چیرپھاڑ کا جتن نہیں کیا گیا بلکہ حیات انسانی کے موجودہ نظام کو اس کے ہر پہلو سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ کتاب ۲۱ جلدوں میں مکمل ہوجائیے گی اور اس کی مجموعی قیمت دس سے بیس پونڈ تک ہوگی ۔ آخری جلد کی اشاعت کے بعد بھی انسایکلوپیڈیا کا دفتر کھلا رہےگا اور فرانس کے بہترین عالموں کی مدد سے تازہ ترین معلومات کو شامل کرکے اسے مکمل بناتا رہےگا ۔

اس کتاب میں ملک کے بڑے بڑے عالموں کے علاوہ وہاں کے مقتدر سیاسی و اقتصادی قائدوں کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں ۔ «جدید ریاست» کے زیرعنوان جو جلد شایع ہوئی ہے اس میں لیون‌بلوم اور کیلو جیسے صاحب رائے لیڈروں کے مقالے ہیں ۔ ادب جدید کے مسائل پر مختلف اور متضاد رجحانوں کے نمایندوں سے مضامین لکھوائے گئے ہیں جس میں ایک طرف تو ژین رشاوبلوک جیسا کمیونسٹ ادیب ہے اور دوسری طرف 'مورا' جیسا شاہ پرست ۔ ہر مضمون اس طریقے سے الگ الگ چھاپا گیا ہے اور جلد بھی ایسی بنائی گئی ہے کہ ضرورت ہوتے ہی جلد کھول کر کوئی پرانا مضمون نئے مضمون سے بدل دیا جاسکتا ہے ۔ غرض کہ سماجی تغیر کے اقتضا کو کہیں فراموش نہیں ہونے دیا ۔

انسایکلوپیڈیا کی جدت آفرین اسکیم فرانسیسیوں کی نفاست اور ذوق تعمیر کی شاہد ہے ۔ اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ہم‌عصر 'مہذب سماج' کا مقصد رفتہ رفتہ علم و شعور کی روشنی کو اس طریقے سے بڑھانا ہے کہ انسان کی حاصل کی ہوئی روحانی طاقتیں سارے کاینات پر حکمراں ہوسکیں ۔ چناں‌چہ انسایکلوپیڈیا کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی ہے جس میں سے ہر ایک میں نو نو جلدیں ہوں گی:
(۱) علم اور تشریح ۔ (۲) آلات اور حصول ۔

پہلے حصے کی نو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں ۔ ان میں علم کے ہر شعبے کے متعلق کافی اور بالکل جدید معلومات جمع کی گئی ہیں ۔ آخری جلد میں انسانیت کے ارتقا کے مختلف دوروں کا تاریخی تجزیہ ہے اور ایک مفصل باب میں ہماری موجودہ

وراثت پر زبردست تنقید ہے۔

دوسرے حصے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ علم و خیال کی اس مشعل کو لے کر انسان نے اب تک کیا کیا اور کاینات پر کس حد تک فتح حاصل کی اور نظام حیات انسان کو کس حد تک جسمانی و روحانی اطمینان پہنچا سکتا ہے۔ یعنی ان جلدوں میں سماج کے سیاسی، اقتصادی اور معاشی نظام کا تجزیہ ہوگا۔ دو جلدوں میں موجودہ حکومت کی مختلف شکلوں اور کارگزاریوں پر بحث ہوگی۔ کئی جلدیں پیداوار اور تقسیم کے ذرایع اور انسانی دلچسپیوں (ریڈیو، فلم وغیرہ) اور تعلیمی اداروں کے لیے وقف ہوں گی۔ دو جلدیں ادب اور آرٹ کے لیے ہوں گی اور ایک میں مذہبوں اور فلسفوں کا ذکر ہوگا۔ آخری جلد میں اعداد و شمار، فوٹو اور نقشے ہوں گے۔

ان نو جلدوں کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ گو انسان کے خیال و عمل کی دنیا بہت وسیع ہے، لیکن اس کا ایک ترکیبی بیان تیار کرنا محال نہیں ہے۔ البتہ اس نقص کا کوئی علاج نہیں کہ اس قسم کے کارنامے کا تھوڑا بہت حصہ ایسا ضرور ہوگا جس سے عوام فایدہ نہ اٹھا سکیں گے کیوں کہ اگر ہر عالمانہ نکتے کی تفسیر کی گئی تو ان نو جلدوں کو نو سے ضرب دینا ہوگا۔

ضیاءالدین

از

ڈاکٹر ٹیگور

[ضیاءالدین مرحوم شانتی نکیتن میں اسلامی تمدن کے استاد تھے۔ وہ متعدد کتابوں کے مولف تھے اور اردو ادب ٹیگور کے کلام کے مترجم کی حیثیت سے انھیں یاد رکھے گا — صرف ۳۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہاں ہم اس تقریر کا ترجمہ کرتے ہیں جو ٹیگور نے تعزیت کے جلسے میں کی تھی۔]

اس خیال سے میرا گلا رندھتا ہے کہ مجھے ضیاءالدین کی ناگہانی موت پر اظہار غم کرنا ہے۔ ہم یہاں کوئی فرض ادا کرنے کو جمع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے دل

کی کیفیت خلوص اور حسرت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

ضیاءالدین کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوگئی وہ جلد پوری نہ ہوگی، کیوں‌کہ وہ حقیقت شناس تھے۔ دنیا کا سفر تو ان‌گنت لوگ کرتے ہیں لیکن کم ہوتے ہیں جو اس راستے پر کوئی امٹ نقش قدم چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے دل میں ایک خاص مرتبہ حاصل کرکے وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں‌گے یہ کیا معلوم تھا۔ انہیں سچائی اور کھرے‌پن سے محبت تھی۔ ہمارے آشرم سے چھٹی لےکر وہ اپنے وطن (امرت‌سر) گئے تھے۔ یہ کیسے یقین تھا کہ یہ ان کی آخری رخصت تھی۔ یہ سچ ہے کہ آج وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن آشرم کی ہوا میں ان کی بو بسی ہوئی ہے۔

آشرم سے ان کا تعلّق اس وقت شروع ہوا جب وہ طالب‌علم کی حیثیت سے یہاں آئے تھے۔ اس وقت وہ ہماری زندگی سے زیادہ آشنا نہ ہوسکے تھے۔ لیکن اب ہم نے ان کا دماغ ہی نہیں بلکہ دل بھی لےلیا تھا اور ان کی دل‌چسپی کا تنہا مرکز یہی آشرم تھا۔ اسی آب و ہوا میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ اور وہ ان معدودے چند احباب میں سے تھے جنھوں نے پھلنے پھولنے کے لیے یہیں کی دھوپ اور یہیں کی ہوا تلاش کی۔ اس آشرم میں اگر کچھ وسعت اور حقیقت ہے تو وہ یقیناً ضیاءالدین کو بھی ملی تھی۔ یہ وہ وسعت ہے جو اپنی خودی کو ماحول میں تقسیم کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہی حقیقی انسانیت ہے۔ یوں اپنے مذہبی نقطۂ نگاہ اور طرز عمل میں بہتوں سے وہ الگ ہوں تو ہوں لیکن سب سے ان کے دل کا میل تھا۔ ان کی موت سے شانتی نکیتن کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ گو وہ بڑے مخلص تھے لیکن ان کی طبیعت میں بڑا ضبط تھا جس کی وجہ سے لوگ ان سے جلدی کھل نہ سکتے تھے۔ لیکن وہ ایک ہی فرض شناس تھے اور اپنے دوستوں پر دم دیتے تھے۔ وہ کیا گئے، میرا ایک عزیز مرگیا۔

عرصے کی لگن اور دھن کے بعد اب جب آشرم کے ماحول سے وہ بالکل مانوس ہوگئے تھے اور ان کی شخصیت کا ارتقا اپنے کمال کو پہنچ رہا تھا تو مجھے بڑی آس بندھی تھی کہ ابھی وہ بہت کچھ اور کریں‌گے۔ وہ جس میدان کے سپاہی تھے

ہم میں سے کوئی اسے نہیں جانتا ۔ آشرم کے دل میں انھوں نے جو جگہ پائی تھی اب اسے کون پورا کرے گا ۔

لیکن میں خواہ مخواہ کف افسوس کیوں مل رہا ہوں ؟ ۔ ایک ایسے عزیز کی مرگ ناگہانی جو میری ہی منزل کا مسافر تھا، میرے دل میں بیزاری اور شکایت کے جذبات پیدا کرتی ہے لیکن یہ سوچ کر چپ ہو جانا پڑتا ہے کہ وہ خود بہت خاموش اور شاکر تھے اور آشرم کو اپنی زندگی میں اسی کا درس دیتے رہے تھے ۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ان کی سنجیدگی اور شرافت کا فیضان ہم میں رہا ۔

ہم میں ہر آدمی کے لیے کشش نہیں ہے ۔ لیکن ضیاءالدین ہمارے ہاتھوں کا سینچا ہوا پودا تھا ۔ یہاں کی ہوا اور مٹی نے اس میں ولولہ پیدا کیا تھا ۔ اس کے بدلے ہمیں وہ جس دولت سے مالامال کرگئے اس کی یاد ہم کبھی نہ بھولیں گے ۔

اپنی طرف سے میں اس کے سوا کیا کہوں کہ ایسا دوست ملنا مشکل ہے ۔ یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے کہ اس دوستی کے گھنے سایہ میں میں نے راحت کے بہت سے لمحات گزارے تھے ۔ حواس اسے محسوس نہ کرسکیں لیکن دل سے وہ بہت قریب رہے گا ۔

بنگال میں ہندی کی مخالفت

ہندی کو ملک کی قومی زبان بتلانے کی جو مصنوعی تحریک وردھا سے شروع ہوئی ہے، اس کی مخالفت صرف اردوداں طبقہ ہی نہیں کر رہا ہے ۔ مدراس میں ہندی کے جبری نفاذ کے خلاف جو ستیاگرہ ہو رہی ہے اس کی اطلاعیں ناظرین کو ملی ہوں گی ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندی کی سخت ترین مخالف بنگالی زبان ہے ۔

کلکتہ میں اس زبان کی ایک ادبی انجمن ہے جس کا نام « روی واسار » ہے ۔ اس کے ارکان میں ڈاکٹر ٹیگور، شرت چندر چٹرجی مرحوم اور مسٹر رامانند چٹرجی جیسے مشہور بنگالی اہل قلم ہیں ۔ اس نے اپنے ایک حالیہ جلسے میں حسب ذیل تجویز پیش کی ہے :

(۱) یہ انجمن ہندی کو قومی زبان بنانے کی تحریک کی سخت مخالفت کرتی ہے اور بنگالیوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس مخالفت کو عملی جامہ پہنائیں -

(۲) جب تک ہندی یا کوئی دوسری ہندستانی زبان قومی زبان کا مرتبہ حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائے، تب تک ہندستان میں تبادلۂ خیالات کا کام انگریزی سے لیا جائے -

(۳) کانگریس کے اجلاس کی کارروائی یا تو انگریزی میں ہو یا اس صوبے کی زبان میں، جہاں اجلاس ہو رہا ہو -

رسالہ ماڈرن ریویو نے دبی زبان میں ان تجاویز کی تائید کی ہے - بنگال کے بڑے بڑے جریدوں میں ہندی کے خلاف مضامین نکل رہے ہیں - وہاں کا سب سے بڑا اخبار 'آنند بازار پتریکا' لکھتا ہے: "جسے ہندی کہا جاتا ہے وہ کوئی ایک زبان نہیں ہے - بہار کی ہندی اور راجپوتانہ کی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہے - بہت سی بولیوں کو خواہ مخواہ 'ہندی' میں شامل کر لیا گیا ہے -" بنگالی زبان کی سب سے بڑی لغت "بنگیہ مہا کوش" کے ایڈیٹر مسٹر گوسوامی لکھتے ہیں: "مرہٹی، گجراتی اور پنجابی زبانیں ہندی کی بنسبت بنگالی سے قریب تر ہیں!"

ماڈرن ریویو لکھتا ہے: "ہماری ذاتی رائے ہے کہ قومی زبان کے مرتبہ کے لیے صرف بنگالی موزوں ہے" -

کلکتہ کا روزنامہ "ہندستان اسٹینڈرڈ" کہتا ہے: "ہندی میں بابا تلسی‌داس کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے!"

لسانیات کے مشہور عالم پروفیسر کھگیندرسین کی رائے ہے: "مصنوعی ذرائع سے کسی تمدن کو سرفراز بنانے کی کوشش نہایت خطرناک ہے - 'راشٹر بھاشا' کی

تحریک کو فوراً بند کر دینا چاہیے۔"

"تامل ماتا پر ہندی کی چھری!"

தமிழ்த்தாய் மீது ஆச்சாரியார்
ஹிந்திக் கத்தி வீச்சு

ایک تامل اخبار کا کارٹون

مسٹر راج گوپالاچاریہ 'تامل ماتا' کو ہندی کی چھری سے قتل کرنا چاہتے ہیں

ایک نئے رسم الخط کی تجویز

از

"امرت وسنت"

['امرت وسنت' گجرات کے ایک مشہور مصنف کا فرضی مضمون ہے۔ ذیل میں ان کے ایک مقالے کے اقتباس کا ترجمہ کیا جاتا ہے جو انہوں نے کاکا کالیلکر صاحب کے جواب میں لکھا ہے۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ جناب کالیلکر نے حال میں ایک تجویز پیش کی تھی جس کا مقصد یہ ہے کہ گجراتی رسم الخط میں ایسی ترمیم کی جائے کہ وہ ناگری سے قریب تر ہو جائے۔]

کاکا صاحب نے صرف لنوٹایپ کی ضرورت کو پیش نظر رکھا ہے جس کی وجہ سے

دوسری فوری اصلاح طلب چیزوں کو وہ بھول گئے۔ وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو میں کہوں اس پر عمل کرو، پھر دیکھا جائےگا ۔ اس خود پسندی کی وجہ سے گجرات میں ان کی اسکیم کھٹائی میں پڑگئی ۔ لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ گجراتی اور ناگری کی بدمزہ کھچڑی پکائی جائے ۔ ایک طرف اس سے کوئی فایدہ نہیں ، علاوہ بریں دونوں کا فطری حسن الگ زایل ہو جائےگا ۔ تاہم گاندھی‌جی کی دھائی دے کر وہ اس خام تجویز کو گجرات کے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔

ہندی اور اردو کے درمیان جو قضیہ پیدا ہوگیا ہے، اس نے اصل سوال کو پس‌پشت ڈال دیا اور قومی زبان کے پرچار کو روک دیا ۔ کوئی کہتا ہے کہ سنسکرت‌آمیز ہندستانی ہندی ہے اور فارسی‌آمیز ہندستانی اردو ہے ۔ میں اس تقسیم کا قایل نہیں۔ عدالتوں میں جس زبان کا استعمال ہوتا ہے اسے معمولی لوگ نہیں سجھ سکتے۔ کیا ہندی رسم‌الخط میں ہونے کی وجہ سے اس کا نام ہندی ہے ؟ ادھر پنجاب میں ہندو مذہب پر صدھا کتابیں سنسکرت‌آمیز زبان میں لکھی جاتی ہیں اور فارسی عبارت کی وجہ سے ان کا شمار اردو میں ہوتا ہے ۔ میری دانست میں یہ قضیہ رسم‌الخط کا ہے ۔ اگر ایک ایسا مشترک رسم‌الخط تیار ہوسکے جس میں ہندی اور اردو کی کتابیں یکساں آسانی سے شایع ہوسکیں تو یہ جھگڑا مٹ جائے۔ اس نقطۂ‌نگاہ سے میں ناگری یا کسی بھی دوسرے رسم‌الخط کو ترجیح نہیں دے سکتا کیوں‌کہ ان کے ساتھ کسی نہ کسی فساد کی بیخ لگی ہوئی ہے۔ گجراتی بنگالیوں کو ناپسند ہے تو مدراسیوں کو بنگلہ سے چڑ ہے۔ اردو اور ہندی تو خیر سوتیں ہیں ہی، ان سب کو خوش کرنے کے لیے کچھ یہاں سے اور کچھ وہاں سے لے کر کوئی دوغلا رسم‌الخط بنانے کے بجائے یہ کہیں بہتر ہے کہ سائنٹفک اصولوں پر ایک نیا رسم‌الخط بنایا جائے ۔ اس میں ان خصوصیات کا ہونا ضروری ہے: (۱) خوب‌صورت ہو ۔ (۲) جلد لکھا جاسکے۔ (۳) ہر قسم کی آواز کو آسانی سے ادا کرسکے ۔ (٤) مشینری یعنی پریس، لنو ٹایپ، ٹایپ رایٹر وغیرہ کے لحاظ سے دقت طلب نہ ہو ۔

هندستانی

از

ڈاکٹر تاراچند

[رایل ایشیاٹک سوسایٹی کے جریدہ میں موصوف نے ایک فاضلانہ مقالہ اس موضوع پر لکھا ہے کہ ملک کی قومی زبان کے لیے 'ہندستانی' کا نام کب سے چلا آ رہا ہے -]

قرون وسطی میں ہندستان کی عام زبان کا نام 'ہندستانی' کیوں کر پڑا اور اس نام کو کب اور کیسے چلن ملا، اس کے متعلّق قطعیت سے کچھ کہنا ناممکن ہے - آج کل کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ 'ہندستانی'، 'اردو' کا دوسرا نام ہے لیکن یہ قیاس واقعات کے خلاف ہے - 'ہندستانی' کا استعمال اردو اور ہندی دونوں کے معنی میں ہوتا تھا - اس سے وہ زبان مراد تھی جسے ہندو اور مسلمان دونوں سمجھتے تھے - فرنگیوں کی خط و کتابت اس مسئلہ پر دلچسپ روشنی ڈالتی ہے -

جب اکبر نے اپنے دربار میں مختلف مذہبوں کے نمایندوں کو جمع کیا تو اس کی دعوت پر گوا سے چند عیسائی پادری بھی پہنچے - ان کے خطوط پرتگال کے کتب‌خانوں میں محفوظ ہیں - ان میں سے ایک خط پادری ایکوا ویوا کا ہے جو اس نے سنہ ۱۵۸۲ع میں بھیجا تھا - خط گوا کے صوبہ‌دار کے نام تھا - اس میں یہ پادری مشورہ دیتا ہے کہ گوا میں ایک مدرسہ قایم کیا جائے جس میں مسلمانوں کو فارسی اور دوسرے لوگوں کو 'ہندستانی' پڑھانے کا انتظام کیا جائے - ظاہر ہے کہ یہاں ہندستانی سے مراد وہ زبان ہے جسے ہندو بولتے تھے - ایکوا ویوا کے سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب وہ اپنے مترجم ڈومنگو پیریز کا نکاح ایک ہندستانی سے پڑھانے لگا تو اسے فارسی کا استعمال کرنا پڑا - اکبر بادشاہ بھی اس شادی میں شریک تھا اور وہ فارسی کے جملوں کا ترجمہ ہندستانی میں کرتا جاتا تھا -

سنہ ۱۶۰۴ع میں ایک پرتگالی' پادری کو اسی بارے میں لکھتا ہے : "اس نے فارسی سیکھ لی ہے اور ہندستانی سیکھنی شروع کردی ہے جو اس ملک کی زبان ہے" -

سنہ ۱۶۱۵ع کے ایک خط میں دےکراستو لکھتا ہے : "آگرے کے پادری عیسائیوں سے ہندستانی زبان میں اعتراف گناہ کراتے ہیں"۔

سنہ ۱۶۱۶ع کے واقعات کا ذکر ٹیری ان الفاظ میں کرتا ہے : "اس کے بعد ٹام کوریاٹ نے ہندستانی یعنی عوام کی زبان میں بڑی مشق حاصل کرلی - ایلچی کی دھوبن بڑی منہ‌پھٹ تھی اور صبح سے شام تک لوگوں سے گالی‌گلوچ کرتی اور ہرگز چپ نہ ہوتی تھی - ایک روز کوریاٹ نے اسی زبان میں اس کی بری طرح خبر لی اور گھنٹوں اسے باتیں سناتا رہا یہاں تک کہ اس عورت کا ناطقہ بند ہوگیا -"

اس زبان کے متعلق ٹیری نے لکھا ہے کہ وہ بائیں سے داہنے طرف لکھی جاتی ہے -

سنہ ۱۶۷۳ع میں فرائر لکھتا ہے : "دربار کی زبان فارسی ہے اور عوام میں جس زبان کا چلن ہے وہ ہندستانی ہے" -

سنہ ۱۶۷۷ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈایریکٹروں نے یہ اطلاع فورٹ سینٹ جارج بھیجی : "جو شخص ہندوؤں کی زبان یعنی ہندستانی میں لیاقت دکھائےگا، اسے بیس پونڈ انعام دیا جائےگا" -

والینیٹن سنہ ۱۶۹۷ع میں ہندستانی زبان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "حبش کا ایلچی اس میں بات‌چیت کرتا تھا" -

گارساں‌دتاسی نے اپنی سوانح‌عمری میں بینجمن شولز کی ہندستانی گرامر کا ذکر کیا ہے جو سنہ ۱۷۴۵ع تیار ہوئی تھی -

زاکمو کے خطوط میں جو سنہ ۱۸۳۰ع میں لکھے گئے تھے، یہ جملہ آتا ہے : "عوام کی یہ زبان ہندستانی، جو یورپ میں میرے کسی کام نہ آئےگی، بہت مشکل ہے"-

---

آرٹ کی سب سے بڑی تاریخ

جرمن زبان میں حال ہی میں Propylean-Kunstgeschichte کے نام سے ۲۳ جلدوں میں ایک عجیب و غریب کتاب شایع ہوئی ہے۔ در اصل یہ دنیائے مصوّری کی تاریخ بھی ہے اور فرانس، اطالیہ، جرمنی، اسپین اور برطانیہ کے بہترین تصویرخانوں میں جتنی تصویریں ہیں ان کا مجموعہ بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ گمنام اور چھوٹے موٹے مجموعوں سے بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تصویریں جمع کی گئی ہیں۔ کُلّہم ان کی تعداد ۱۲ ہزار ہے!! تقریباً سب تصویریں پورے صفحوں پر چھاپی گئی ہیں اور اصلی رنگوں میں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے خوب‌صورت مجسموں اور عمارتوں کے فوٹو بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ بلاشبہ، آرٹ کی دنیا نے آج تک ایسی نادر کتاب نہیں دیکھی تھی۔ ہر زمانے اور ہر ملک کے آرٹ کے نمونے اس میں ملیں گے۔ سہولیت کے لیے ہر جلد کا تعلق ایک خاص دور سے رکھا گیا ہے اور وہ فرداً فرداً خریدی جاسکتی ہیں۔ ہر جلد کی قیمت تین پونڈ ہے یعنی ایک تصویر دو آنے میں پڑتی ہے۔ اس امر کا اندازہ لگاتے ہوئے کہ کتاب کی اشاعت اور تصویروں کی فراہمی میں لاکھوں پونڈ صرف ہوئے ہیں، یہ تصویرخانہ ان داموں بہت سستا ہے۔

مفصل معلومات کے لیے ذیل کے پتے پر خط لکھا جاسکتا ہے:

PROPYLAEN—VERLAG,
BERLIN SW 68—GERMANY.

ادبی اطلاعیں

'اسکربنر' (Scribner's) نامی امریکن رسالہ میں ایک شاعرہ نے حال میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ وہ برسوں سے کوشاں تھی کہ اخباروں میں اس کی نظمیں چھپیں اور ان کا معاوضہ بھی ملے۔ لیکن معاوضہ تو درکنار کوئی مفت میں بھی اس کی نظم لینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ تنگ آکر اس نے خودکشی کی کوشش

کی۔ گو اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی لیکن بےہوشی کے عالم میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی روح جنت کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ اتنے میں اندر سے آواز آئی کہ براہ‌کرم تم جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ کیوں‌کہ یہاں بھی بےکاری کا مسئلہ درپیش ہے اور اللہ میاں کی کوئی حکمت اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتی!

ہم مکمل نظم کی تلاش میں ہیں ۔ ملتے ہی اس کا ترجمہ پیش کریں گے ۔

انگریزی اخباروں میں بحث ہو رہی‌ہےکہ دنیا کا سب سے بڑا پرنویس کون ہے۔ ظاہر ہے کہ اس 'صنف' میں سنسنی پیدا کرنے والے ڈکیتیوں اور جاسوسوں کے قصے لکھنے والے سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مسٹر اوپن‌ہیم نے ابھی اپنا ۱۵۱ واں ناول شروع کیا ہے لیکن وہ مسٹر فلیچر سے بہت پیچھے ہیں جو ۲۳۰ ناول لکھ چکے ہیں۔ مگر ان کا پلہ ناٹ‌گولڈ سے ہلکا ہے جو تین سو قصے لکھ چکا ہے ۔ لیکن آج کل کے یہ مصنف ہسپانوی ڈرامہ نویس لوپ د واگا (Lope-de-Vega) کے آگے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ سترھویں صدی کے اس مصنف نے ۴۳ سال کی ادبی زندگی میں سب ملا کر ۱۵ سو ڈرامے لکھے تھےجو چار سو نقلوں اور نوٹنکیوں کے علاوہ ہیں ۔ ان میں سے سات سو ڈرامے اب تک باقی ہیں اور کئی ضخیم جلدوں میں شایع ہوئے ہیں ۔ پر نویسی میں اب تک اس کا ثانی کہیں پیدا نہیں ہوا ۔

تبصرے

ادب

بیوہ

از منشی پریم چند۔ مکتبۂ جامعہ دھلی ۔ قیمت مجلد ایک روپیہ

اس زمانے میں جبکہ اردو افسانہ نگاری مغربی افسانوں کی طرح طرح تقلید کررھی ھے اور ھندستان کی زندگی سے دن بدن دور ھوتی جا رھی ھے منشی پریم‌چند کا دم بہت غنیمت تھا۔ ان کے ساتھ ھی اردو افسانہ نگاری کا وہ دور ختم ھوتا ھے جس کی نشو و نما زیادہ تر ھندستانی عناصر سے ھوئی تھی ۔ زیر۔نظر ناول مسئلہ بیوگان سے متعلق ایک بہت دلچسپ قصہ ھے ۔ ھندو معاشرت کو مصنف نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ھے ۔ قصہ کی روداد بہت ھی سیدھی سادی ھے اور مصنف اکثر پہلے ھی سے آنے والے واقعات کی طرف اشارہ کرکے محض روداد کو دلچسپی کا باعث نہیں رھنے دیتا ۔ بجائے اس کے نہایت اعلی درجے کی کردار نگاری اور اسلوب بیان کی بےتکلف روانی اس قصے کی دلچسپی کا اصلی باعث ھین ۔

سب سے زیادہ قابل غور بات اس ناول مین یہ نظر آتی ھے کہ مصنف کو ناول کے تقریباً تمام کرداروں سے ھمدردی ھے ۔ یہ وہ خصوصیت ھے جو نذیراحمد کے افسانوں میں

پائی جاتی ھے۔ مغربی یورپ کے ناولوں میں باوجود نفسیاتی تجزیوں کے یہ چیز مفقود ھے۔ کرداروں کو اس ھمدردی کی روشنی میں دیکھنے کا اثر یہ ھے کہ افسانہ نگار ان کی برائیوں کو سماج کی خرابیوں کا نتیجہ قرار دیتا ھے اور ان کی کمزوریوں کو انسانی کمزوریوں پر محمول کرتا ھے۔

پورنا کی آزمایش اور اس کا نفسیاتی تجزیہ ھر طرح مصنف کے کمال فن کی دلیل ھے کہ اسے انسانی نفسیات کے مطالعے پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ امرت رائے کے کردار میں وہ مشرقیانہ پراسرار "ھیروپن" ھے جس سے منشی پریم چند کے اکثر ناولوں کے ھیرو ممتاز ھیں۔ جب اس کا دوست دان ناتھ اس سے پوچھتا ھے کہ کیوں اس نے حسب وعدہ شادی نہیں کی اور اپنی زندگی بیوگان کے لیے آشرم بنانے میں صرف کردی تو

امرت رائے کے ھاتھ رک گئے۔ انھیں ڈانڈ چلانے کا ھوش نہ رھا۔ بولے «یہ تمھیں اسی وقت سمجھ لینا چاھیے تھا جب میں نے پریما کی پرستش چھوڑی۔ پریم سمجھ گئی تھی۔ چاھے پوچھ لینا» -

زمین پر تاریکی پھیل رھی تھی اور بجرا لہروں پر تھرکتا ھوا چلا جاتا تھا۔ اسی بجرے کی طرح امرت رائے کا دل متحرک ھو رھا تھا۔ مگر دان ناتھ ساکت بیٹھے ھوئے تھے گویا کوئی تیر لگ گیا ھو۔ دفعتاً انھوں نے کہا «بھیا، تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا» -

اور اس جملے پر کتاب ختم ھو جاتی ھے۔ وہ ھمدردی جس سے قابل ناول نگار اپنے کرداروں کو سمجھتا ھے، رائگاں نہیں جاتی۔ اسی ھمدردی سے اس کے کردار بھی ایک دوسرے کو سمجھتے ھیں ایک دوسرے کی خوبیوں کی قدر کرتے ھیں اور کمزوریوں کو معاف کر دیتے ھیں۔ (ع)

ریاض رضواں

ریاض خیرآبادی امیر مینائی کے شاگرد تھے اور لکھنؤ کے قدیم رنگ غزل کو انھوں نے زندہ رکھا۔ ان کی غزل گوئی بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جس کا سب سے بڑا

علمبردار اقبال تھا، تضاد کا سا اثر رکھتی ہے۔ یہ زمانہ ریاض اور ان کے ہم خیال و ہم‌اسلوب شعرا کے خلاف شدید رد عمل کا زمانہ ہے۔ پھر بھی ریاض کا کلام بڑی آب وتاب سے شایع ہوا ہے۔ شروع میں پیشکش، قدرافزائی، تقریظ، پیش لفظ، تقریب، مقدمہ اور اعترافات ہیں۔ ضخامت سات سو صفحات سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں سے قطع نظر جنھیں ریاض کے کلام سے خاص عقیدت ہے، غالباً ہر ناظر کو یہ خیال آتا ہوگا کہ بجائے پورا کلام شایع کرنے کے صرف دسواں حصہ بطور انتخاب شایع کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ حضرت ریاض بہت پرگو شاعر تھے اور پرگو شعرا کے کلام میں رطب و یابس ہمیشہ یکجا رہتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ان کے ہنر کو مکمل مجموعۂ کلام سے زیادہ نمایاں کر سکتا ہے۔

ریاض کی توجہ زبان پر تھی اور انھوں نے پامال مضامین کو بار بار زبان کی چاشنی دے کر بڑی خوبی سے باندھا ہے۔ رندی، جو مشرقی شاعری کا موضوع رہ چکی ہے، ریاض کے کلام میں بار بار انوکھے پن سے اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ کبھی کبھی حقیقت کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

کہتی ہے اے ریاض درازی یہ ریش کی
ٹٹی کی آڑ میں ہے مـــزا کچھ شکار کا

یہ میرے خیال میں «ریاض رضواں» کے بہت اچھے شعروں میں ہے۔ کبھی کبھی ریاض کے کلام میں پرانے طرز کی جدت اور نازک خیالی کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔

تیغ نے کاہے کو خون شہدا دیکھا تھا ڈر کے لپٹی ہے وہ قاتل کی کمر سے کیا کیا
بادل امڈے ہوئے تھے رات کے میخانے پر مہر خم ٹوٹتے ہی ٹوٹ کے برسے کیا کیا

جہاں «ریاض رضواں» کی طباعت و کتابت کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے وہاں اس خیال سے بھی خوشی ہوتی ہے کہ اس قسم کی شاعری کو جو اب اردو زبان اور ہندستان سے ناپید ہو رہی ہے بڑی خوش‌اسلوبی، شوخی اور لطف زبان کے ساتھ نبھایا ہے۔

(ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قیمت چھے رپے) (ع)

مکاتیب مہدی

(ملنے کا پتہ:- بسنت پور - گورکھپور - یو-پی)

یہ مہدی حسن افادی کے خطوط کا مجموعہ ہے - خطوط میں کہیں کہیں اس قسم کی بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان خطوط کو اشاعت کے لیے نہیں لکھا گیا تھا - پھر بھی ان کی " ادبیت " ضرور کسی قدر کھٹکتی ہے - مہدی حسن میں مغرب اور مشرق دونوں کے اثرات نمایاں تھے مگر اچھی طرح ایک دوسرے میں حل نہیں ہونے پائے - نتیجہ یہ ہے :- " لیبان کی 'نفسیات تعلیم' پر آپ نے کچھ نہیں لکھا - نہ تعلیم و تربیت کے نازک فرق اور مصطلح امتیازات پر نظر ڈالی - " اور " کائنات میں ایجابی قوتوں کے ساتھ سلبی عناصر بھی وقف کار رہتے ہیں یعنی ردعمل جاری رہتا ہے.......... " وغیرہ -

اس سے قطع نظر خطوط نہایت درجہ دلچسپ ہیں - مہدی‌حسن کا ادبی ذوق ان کے اکثر خطوط سے واضح ہوتا ہے - زندہ دلی اور شگفتگی تقریباً ہر خط سے ظاہر ہوتی ہے - بے تکلف دوستوں کے نام جو خطوط ہیں ان میں ظرافت کی چاشنی بہت پرلطف ہے -

> " سلیمان اعظم تو اس طرح گئے جیسے کسی کے سر سے سینگ - کعبہ سے پہلے عزم لندن کا - ان سے یہ پوچھنا رہ گیا کہ تنہا آئیں گے یا وہاں سے بھی لائیں گے - مولویوں کے لیے تعدد حرم ناجایز نہیں ہے - کیا اچھا ہوتا اگر یہ اپنے مغربی سفر کے مستحضرات روزنامچے کی صورت میں مرتب کرتے جاتے - اگر یہ اپنی مولویت سمندر پار چھوڑ آئے تو کام کے آدمی ہوجائیں گے - " (ع)

سبد چین

(مکتبہ جامعہ دھلی - قیمت چھے آنے)

غالب کا جو کلام ان کی فارسی کلیات میں چھپنے سے رہ گیا تھا اسے انھوں نے اس پر لطف نام کے ساتھ ———— کتابوں اور مجموعوں کے نام رکھنے میں غالب کو کمال حاصل تھا ———— شایع کیا تھا - یہ کتاب بہت کمیاب تھی اور اب مکتبۂ جامعہ دھلی نے اسے دوبارہ شایع کیا ہے -

اس مجموعے میں زیادہ تر تو وہ قصاید ھیں جو انھوں نے گورنر جنرلوں کی تعریف میں لکھے ھیں ۔ اگر غالب کو کسی چیز کا سلیقہ نہیں تھا تو خوشامد کا ۔ ان کے اردو قصاید میں بھی یہی بات نظر آتی ھے ۔ جس‌قدر شعر وہ تشبیب کی نذر کرسکتے ھیں، کرتے ھیں اور اس کے بعد جلدی جلدی ممدوح کی خوبیاں کا ذکر کرکے قصیدے کو ختم کر دینا چاھتے ھیں ۔ کبھی کبھی اردو مدحیہ اشعار میں مدح اس طرح کرتے ھیں کہ اس میں تمسخر کا جزو بھی شامل رھتا ھے ۔ غدر کے بعد جب دنیا ھی بدل گئی اور انتہائی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو غالب نے فارسی میں قصیدہ خوانی کرکے اپنے آپ کو الزامات سے بری اور حکومت انگریزی کا سچا خیرخواہ ظاھر کرنا چاھا ۔ باوجود اس کے ان قصیدوں سے برابر یہی ظاھر ھوتا ھے کہ شعر نہیں کہہ رھے ھیں مجبوراً فرض اتار رھے ھیں :-

ز غیب آنچه فرو ریختند در خاطر		نخست از رہ پرسش بہم دگر گوئیم
کہ بےمبالغہ فرزانہ لارڈ الگن را		وزیر اعظم سلطان بحر و بر گوئیم

بعض قصیدوں میں انوری کا رنگ جھلکتا ھے :-

وقت آنست کہ خورشید فروزاں ھیکل		گردد آیندہ گرایندہ بفرگاہ حمل

قصیدوں کے علاوہ وہ بےنظیر ترکیب بند بھی اس مجموعے میں شامل ھے جو غالب نے اپنی اسیری کے زمانے میں لکھا تھا ۔ ترکیب بند میں درد و اثر ھے اور اس مجموعے کی بہترین نظم غالباً وھی ھے ۔ بعض بعض شعر نہایت درجہ بلند پایہ ھیں اور ان میں وہ طنز پایا جاتا ھے جو غالب کی شاعری کا خاص جوھر ھے مثلاً :-

یار دیرینہ قدم رنجہ مفرما کاینجا		آں نگنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
اھل زنداں بسر و چشم خودم جا دادند		تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

اور

شمع ھر چند بہر زاویہ آساں سوزد		خوشتر آنست کہ بر نطع در ایواں سوزد
عود من ھرزہ مسوزید وگر سوختنی‌ست		بگزارید کہ در مجمر سلطاں سوزد

اس کے علاوہ کئی قطعات اور غزلیات بھی شامل ھیں ۔ (ع)

قوم کی فریاد

نظامی بدایونی نے حالی کے مشہور قصیدے پر تضمین کی ہے۔ نمونہ یہ ہے:

وہ دین مبیں جس نے دکھائی رہ عرفاں وہ دین کہ جس نے ہمیں دی مشعل قرآں
جو کفر کی ظلمت میں بنا ماہ درخشاں وہ دین ہوی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

کتاب و طباعت بہت اچھی۔ (ع)

حالی بک ڈپو کی مطبوعات

حالی بک ڈپو نے علیحدہ علیحدہ حالی کی طویل نظمیں شایع کی ہیں۔ «تحفۃالاخوان»۔ «چپ کی داد»۔ «مناجات بیوہ»۔ «حقوق اولاد»۔ اور «حب وطن»۔ (ع)

مکتبۂ جامعہ دہلی کی اور مطبوعات

مکتبۂ جامعہ دہلی نے دہلی کے متعلق دو چھوٹے چھوٹے رسالے شایع کیے ہیں ان میں سے ایک دلی کی دو سو برس کی تاریخ ہے جسے سیدحسن برنی صاحب نے لکھا ہے اور دوسری کتاب « دہلی » (قیمت چار آنے) شہر کی عمارتوں وغیرہ کی رہنما ہے۔ دونوں کتابیں بہت دل‌چسپ ہیں اور باوجود اختصار کے شہر کے متعلق ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔

بچوں کے لیے جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں « قصہ طلب ضرب‌الامثال » (قیمت آٹھ آنے) بہت دل‌چسپ ہے، خواجہ محمد عبدالمجید صاحب نے بہت دل‌چسپ پیرائے میں ان ضرب‌الامثال کی سرگزشت بیان کی ہے۔ « انعامی مقابلہ » (قیمت تین روپے) اور « پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی » (قیمت دو آنے) چھوٹے بچوں کے لیے دو افسانے ہیں۔ قصوں کی

طرح ان دونوں کتابوں کی لکھائی چھپائی بھی بہت عمدہ ہے۔ مذہبی معلومات کے لیے "قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا" (قیمت چھ آنے) بہت مفید ثابت ہوگی۔
(ع)

تاریخ و سیر

مختصر تاریخ عالم۔ جلد اول

اردو میں اس کی بہت شدید ضرورت ہے کہ ایک عام فہم اور پراز معلومات مختصر سی تاریخ عالم لکھی جائے۔ ایچ۔جی۔ویلز کی "تاریخ عالم" کا نمونہ ہمارے سامنے ہے جس نے انگریز پبلک کے بہت سے تعصبات رفع کیے اور تاریخ کو عوام الناس میں مقبول کرایا۔ لیکن اس قسم کی کوششوں میں چند در چند دقتیں ہیں۔ مثلاً اصطلاحات کا اردو ترجمہ، جدید ترین معلومات اور انکشافات سے واقفیت، انتہا درجے کی بے تعصبی۔

سید حکیم احمد صاحب نقوی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایچ۔جی۔ویلز کے علاوہ اور کئی مصنفین سے بھی مدد لی ہے۔ لیکن مصنف کا بیان جابجا الجھا ہوا ہے اور جہاں ضرورت نہیں تھی وہاں بھی آیات قرآنی سے جدید انکشافات کی تائید کی ہے۔ اگر مصنف صاحب مذہب اور سائنس پر کوئی کتاب قلم‌بند کرتے تو یہ سب مناسب تھا لیکن ایک مختصر سی تاریخ عالم میں اس کی گنجایش کہاں۔ اگر صرف واقعات اور معلومات کی حد تک اکتفا کرتے تو کافی تھا۔

اس کے علاوہ جدید انکشافات اور جدید معلومات سے بھی مصنف صاحب بڑی حد تک بے نیاز سے معلوم ہوتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ جلد دوم میں ان تمام جزوں کا لحاظ رکھا جائے۔ (ع)

ذکر غالب

(از مالک رام ایم - اے - مطبوعۂ مکتبۂ جامعہ دہلی - قیمت آٹھ آنے)

مرزا غالب کی ایک مختصر سوانح عمری کی اردو میں بہت شدید ضرورت تھی - مالک رام صاحب کی کتاب نے اس کمی کو پورا کردیا - مرزا غالب کی زندگی کے حالات، ان کے خاندانی حالات اور ان کی تصانیف کے مختصر ذکر پر یہ کتاب مشتمل ہے اور اپنے مقصد کو بڑی خوبی سے ادا کرتی ہے - (ع)

تذکرۃ الصالحین

قاری محمد عبدالحلیم صاحب نے مولانا قاری عبدالرحمن صاحب محدث انصاری پانی پتی کے حالات اور ان کی روحانی زندگی کے وقایع شایع کیے ہیں - کتاب کی ترتیب بہت محنت سے کی گئی ہے - کتابت و طباعت بہت اچھی، قیمت فی جلد دو روپیہ، مطبوعۂ دارالاشاعت رحمانیہ پانی پت - (ع)

سائنس

ابتدائی نباتیات

روی سنگھ صاحب نے نباتیات کے متعلق یہ کتاب لکھکر ایک وقتی ضرورت کو پورا کیا ہے - کتاب جو طلبائے انٹرمیڈیٹ و بی-اے کے لیے لکھی گئی ہے، نقشوں اور خاکوں سے آراستہ ہے - اصطلاحات وہی ہیں جو جامعۂ عثمانیہ میں مستعمل ہیں - روی سنگھ صاحب کی یہ کوشش مستحق تعریف ہے - (ع)

سیاسیات

مسلمانان ہند کی سیاست وطنی

(مرتبۂ محمدامین زبیری، مطبوعہ عزیزی پریس، آگرہ۔ ۲۱۹ صفحات، قیمت ۱۰ آنے)

یہ عجیب بات ہے کہ ہندستانی مسلمان علمی طور پر اپنی گزشتہ سو برس کی تاریخ سے خاص کر پچھلے پچھتر برس کی تاریخ سے جو شدید ترین انقلاب کی حامل رہی ہے، بڑی حد تک بےخبر ہوگئے۔ ان کی تصویر اوروں کی قلم سے کھنچتی تھی اور لوگ اسے دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اوروں کو اس تصویر کی خوبی میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تصویر میں بدصورتی اور بدوضعی کے جتنے لوازمات تھے سب بھر دیے گئے اور آج اس کا یہ اثر ہے کہ مسلمان بھی ان تصویروں کو دیکھ کر پہلی نگاہ میں تو ضرور دھوکا کھا جاتے ہیں اور اس بھونڈی تصویر کو اپنی ہی تصویر سمجھتے ہیں۔

لیکن زمانے کی ڈگر ہمیشہ ایک سی نہ رہی ہے نہ رہے گی۔ یہ جو انگارے جل چکے تھے اور بہ ظاہر ان میں سوائے راکھ کے اور کچھ باقی نہیں تھا، آج زمانے نے ہوا دے کر لوگوں پر ظاہر کردیا کہ ابھی اس بھوبل کے نیچے چنگاری دبی ہوئی ہے۔ مسلمان پھر اپنی تاریخ کے آئینے میں اپنی بنائی ہوئی صورت دیکھنا چاہتے ہیں اور ان میں ایک علمی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے نام سے چھپی تھی اور اس میں انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے حالات بڑی خوبی سے پیش کیے گئے تھے۔ لیکن گزشتہ پچاس سالہ دور کے متعلق فاضل مصنف نے تاریخ کی عینک اتار کر ایک خاص سیاسی عینک چڑھا لی اور اسی کے اثر سے مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ بعض وقت ایسی بھول بھلیوں میں پڑ گئے جس سے ان کا نکلنا مشکل ہوگیا۔

اب انیسویں صدی کے دوسرے پچاس سال اور پھر سنہ ۱۹۳۸ع تک کے حالات محمدامین زبیری صاحب نے تاریخ کی روشنی میں مرتب کیے ہیں اور ان پر بےلاگ تبصرہ بھی کیا ہے۔

گو جدید کی بنیاد کافی پہلے پڑ چکی تھی مگر سنہ ۱۸۵۷ع کا فساد اور دہلی کی تباہی قدیم و جدید کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔ فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ کس طرح سنہ ۱۸۵۷ع کے فساد میں انگریزوں نے اپنی گزشتہ پالیسی کے مطابق سارا الزام مسلمانوں کے سر ڈالا اور پھر ان کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا ۔ اس تباہی میں سرسید مسلمانوں کے کام آئے اور ان کو نیست و نابود ہو جانے سے بچالیا۔ اپنی کتاب « اسباب بغاوت ہند » میں انھوں نے سنہ ۱۸۵۷ع کے فساد کی بنیاد انگریزی افسروں کی کم نظری اور ہندستانیوں کے جایز مطالبات سے ناواقفیت بتائی ۔ سرسید کا نظریہ بعد کو تسلیم کرلیا گیا اور مسلمانوں پر سے بڑی حد تک وہ الزام رفع ہوگیا۔ آج یہ عجیب بات معلوم ہوگی کہ سرسید کی یہ کتاب انڈین نیشنل کانگریس کی بانی ہونے کا جائز طور پر فخر کر سکتی ہے کیونکہ اس کتاب میں بتایا گیا تھا کہ انگریز کس طرح اہل ہند کے جائز مطالبات سے واقف ہوسکتے ہیں۔ ڈیوڈ ہیوم کو جو بظاہر کانگریس کے بانی کہے جاتے ہیں، اول اول کانگریس کا خیال سرسید کی اسی کتاب کو پڑھ کر آیا اور اس کا انھوں نے ایک مشہور ہندستانی سے لندن میں اعتراف بھی کیا۔ لیکن خود سرسید کانگریس سے الگ رہے ۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ ان کا خیال تھا کہ کہیں نکتہ چینی کی شدت سے انگریزوں میں خاص کر جب برادران وطن دوسری طرف مسلمانوں سے کھلم کھلا مغایرت پر تل گئے تھے، سنہ ۱۸۵۷ع کا احساس پھر بیدار نہ ہوجائے - پھر اس وقت مسلمانوں کے شیرازہ کو درست کرنا نہ صرف مشکل بلکہ محال ہو جائےگا ۔ لیکن ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مسلمان سیاست میں کبھی حصہ نہ لیں۔ مسلمانوں کی گزشتہ تیس برس کی سیاسی زندگی نے خود اس کی تردید کردی اور بتادیا کہ وہ وطن کے اسی طرح خادم ہیں جیسے اور کوئی ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کی باقاعدہ سیاست بحیثیت فریق کے سنہ ۱۹۰۶ع سے شروع ہوتی ہے جب آغاخاں کی رہنمائی میں مسلمانوں کے ایک وفد نے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی اور جداگانہ انتخاب کی خواہش کی۔ مسلمانوں کی یہ خواہش منظور ہوگئی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج کل کے ہندو مسلم جھگڑوں کی بنیاد اسی جداگانہ انتخاب کو بتایا جاتا ہے۔ ابھی کانپور کے فساد کا الزام بنارس کے مشہور عالم ڈاکٹر بھگوان داس نے اسی جداگانہ انتخاب پر رکھا ہے۔ گویا ہندستان کی قوموں میں نفاق اور دشمنی کا بیج بونے کا ذمہ‌دار یہی جداگانہ انتخاب ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ برادران وطن کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ مسلمانوں نے آخر جداگانہ انتخاب کیوں طلب کیا۔ کیا یہ صرف انگریزوں کے اشارہ سے تھا؟ افسوس ہے کہ زبیری صاحب نے بھی اس مسئلہ پر اس کتاب میں سیرحاصل بحث نہیں کی اور نہ اپنی کتاب «انتخاب جداگانہ» کے کچھ اقتباسات ہی نقل کیے۔ سنہ ۱۸۹۲ع میں جب اول اول انڈین کونسل ایکٹ منظور ہوا تو اس کی رو سے ہندستانیوں کو نمایندگی کا حق ملا۔ انتخاب کا طریقہ مخلوط تھا۔ سنہ ۱۸۹۲ع سے لےکر پورے بارہ برس تک جس میں کئی دفعہ انتخابات ہوئے، کوئی ایک بھی مسلمان ہندستان کے کسی حصے سے وائسرائے کی کونسل کے لیے برادران وطن کے ووٹوں سے منتخب نہیں ہوا۔ جو دو ایک مسلمان کونسل میں تھے وہ براہ راست نامزدگی کی وجہ سے تھے۔ یہ حیرت انگیز نتیجہ اس قوم نے پہلی بار دیکھا جو ہندستان میں سیاسی قوت کا استعمال صدیوں تک کرچکی تھی اور دھلی کی تباھی کے پچاس برس کے اندر ھی اس کو معلوم ہوا کہ اگر اس نے کوئی موثر طریقہ اختیار نہ کیا تو مستقبل یقیناً خطرناک ہے۔

یہ گویا موجودہ جمہوریت کے خواب پریشاں کی پہلی تعبیر تھی جس کی رو سے کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ اس کی طاقت، اثر اور روایات پر نہیں تھا بلکہ صرف تعداد پر۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندو مسلم مغایرت کی بنیاد انتخاب جداگانہ نہیں ہے بلکہ برادران وطن کے ایک موثر طبقے کی خواہش ہے کہ نظام حکومت کی بنیاد صرف تعداد پر ہونی چاہیے اور جو تعداد میں کم ہے وہ زندہ رہنے کی

صلاحیت نہیں رکھتا، گویا زندگی بھی ایک حساب کا مسئلہ ہے جس کو کیف سے نہیں بلکہ کم سے دیکھا جائے۔

غرض ہندستان کی اس دو رخی سیاست کے ایک رخ کو جس میں مسلمانوں کا حصہ رہا ہے زبیری صاحب نے کاغذات، دستاویزات، لیڈروں کے بیانات، گول میز کانفرنس، صدارتی تقریروں اور مختلف واقعات اور حالات سے کافی واضح کیا ہے۔ لیکن بعض بعض جگہ انھوں نے واقعات کی اہمیت پر تبصرے میں کوتاہی کی ہے۔ مثلاً تحریک خلافت سے ہندستان کی سیاست پر کیا اثر پڑا، مسلمانوں نے کانگریس کو ایک زندہ جماعت بنانے میں کیا کیا قربانیاں کیں۔ یہ چیزیں اگر زیادہ روشن ہوتیں تو اچھا ہوتا۔ بعض جگہ عبارت انمل بے جوڑ اور بےمعنی ہوگئی ہے۔ مثلاً نہرو رپورٹ کے سلسلے میں زبیری صاحب لکھتے ہیں کہ «اس سلسلہ میں یہ انکشاف دلچسپی سے دیکھا جائےگا کہ صوبہ سرحد کی بحث میں پنڈت مالوی‌جی نے جب کچھ مطالبات پیش کیے تو ایک مسلمان نمایندہ نے کہا کہ آپ جو مطالبات کریں وہ بند لفافے میں پیش کریں، چناں‌چہ وہ لفافہ پیش ہوا اور مسلمان نمایندہ نے اس‌کو دیکھے بغیر منظور لکھ دیا۔ جب پنڈت موتی‌لال نہرو نے لفافہ کھول‌کر پڑھا تو اس میں ہندو «میناریٹی» کے لیے پچاس فی‌صدی کی نمایندگی مطلوب تھی اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ دیوانی فوجداری کے وہ مقدمات جن میں کوئی فریق ہندو ہو، صرف ہندو یا یوروپین جج کے سامنے پیش ہوں۔ پنڈت موتی‌لال نے اس کاغذ کو فوراً چاک کردیا»۔ اس سے سمجھ میں نہیں آتا کہ موتی‌لال نہرو نے اس کاغذ کو کیوں چاک کردیا۔ کیا وہ پنڈت مالوی کے مطالبات کو چھپانا چاہتے تھے؟ یا ان کے خیال میں یہ مطالبات بہت زیادہ تھے اس لیے انھوں نے پھاڑ دیا۔ دونوں میں سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ راقم‌الحروف نے بھی اس واقعہ کو سنا ہےاور وہ اس طرح ہےکہ مسلمان نمایندہ نے اپنی منظوری اس شرط پر دی تھی کہ جو مطالبات ہندو اقلیت کے لیے ہندو سرحد میں کریں‌گے وہی مطالبات دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو بھی دینے ہوں‌گے۔ پنڈت موتی‌لال کے کاغذ چاک کردینے کی یہ وجہ تھی کہ وہ دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کو وہ مطالبات دینے

پر رضامند نہ تھے اور اس سے پہلے تو وہ سرحد میں اصلاحات جاری کرنے کے بھی خلاف تھے۔

لیکن ایک چیز اور ابھی باقی ہے ۔ ہندستان میں سیاست کا رخ صرف دو رخا ہی نہیں ہے۔ یعنی ہندو مسلم قضیہ پر آکر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس مثلث کا تیسرا زاویہ بھی ہے جو برطانیہ کا سیاسی اور معاشی اقتدار ہے ۔ مسلمانوں کے یہ دونوں زاویے حریف ہیں اور ان دونوں سے خاطرخواہ عقدہ کشائی ان کی تاریخ اور سیاست کا اہم‌ترین ورق ہے جو ابھی کھلنے کو باقی ہے ۔ زبیری‌صاحب نے اس زاویے کے متعلق کچھ نہیں کہا اور یہ اس کتاب کی سب سے بڑی کمی ہے ۔ تاہم یہ کتاب مسلمانوں کی سیاست کا ایک بڑا آئینہ ہے اور ہر شخص کو جس کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے دل‌چسپی ہے، ضرور پڑھنا چاہیے۔ (ر-ح)

متفرقات

صحیفۃ التکوین

ہزھائینس محمدناصرالملک صاحب مہتر چترال کی یہ فارسی مثنوی اس زمانے میں بہت دل‌چسپ ہے ۔ مذہب اور سائنس یا مذہب اور فلسفے کو ہم آہنگ کرنے کی کوششیں ہر تبدیلی کے دور میں دنیا کے ہر حصے میں کی گئیں۔ تامس اکوی‌ناس اور فخرالدین رازی سے لیے کر سر سید اور سر جیمزجین سب ہی نے اس پر قلم اٹھایا ۔ شاعروں نے بھی اس مسئلے کو چھیڑا ۔ ہزھائینس محمدناصرالملک کی مثنوی کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسلام میں اور جدید سائنس میں بڑی حد تک کوئی تضاد نہیں اور محض غلط فہمی سے سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کا مد مقابل ٹھیرایا گیا ہے۔

صوبۂ سرحد، افغانستان اور ایران میں جہاں یہ کتاب پڑھی جائے گی، ضرور مفید ثابت ہوگی۔ کتاب کی زبان کی حد تک مصنف نے جو کچھ اپنے "تعارف" میں لکھا ہے اس قابل ہے کہ ایرانی اسے غور سے پڑھیں ۔ " بعضے از ناصحان نکتہ چیں چنیں

می‌فرمایند که در نظم خود الفاظ عربیه به‌کثرت استعمال نمودید که فارسی جدید ایران حمل آں انقال نتواند کرد ۔ التماس احقر آنست که فارسی اختصاصے بایران ندارد بلکه اکثر اقطاع ماوراءالنهر و بدخشان و افغانستان به آن تکلم می‌کنند و فارسی در بلاد هندوستان هم ازیں ممالک شیوع یافت نه که از ایران.........پس اگر الزام لغت ایران نکرده شود چنداں حرج نخواهد بود " ۔ زبان کے علاوہ، خیالات اور اسلوب بیان پر بھی اقبال کا بہت بڑا اثر ہے ۔ شاعر نے جابجا اقبال کا حوالہ دیا ہے اور اقبال کا ذکر عزت و عقیدت سے کیا ہے ۔

ایسے موضوع کے لیے سادگی اور سلاست کی بہت ضرورت تھی اور یہ " صحیفة التکوین " میں بڑی حدتک موجود ہے ۔ اپنا مقصد شاعر نے خود دیباچے میں صاف صاف لکھ دیا ہے ۔

مطلب تو کشف اسرار است و بس　　رہبر تو فکر طرار است و بس
تو نداری ذوق شعر و شاعری　　کے کنی وصف بتان آذری
قول دانایاں نویس اندر کتاب　　بازگو واللّٰہ اعلم بالصّواب

طباعت و کتابت بہت اچھی اور دیدہ زیب ۔ جابجا تصویریں، خاکے اور نقشے بھی شامل ہیں ۔　(ع)

اردو کے جدید رسالے

ہندستانی

(یہ ماہانہ رسالہ پٹنے سے نکلتا ہے، اڈیٹر سہیل عظیم آبادی ہیں ۔
سالانہ قیمت تین روپے ہے ۔)

اس کا مقصد قابل اڈیٹر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ "اس کی زندگی کا مقصد ایک ایسی سادہ زبان کی بناوٹ اور سجاوٹ میں حصہ لینا ہے جو سچ مچ ہندستان کی قومی زبان کہی جاسکے "

ہندستانی زبان کے متعلق الجھن ہوئی تو اڈیٹر نے مولانا ابوالکلام آزاد سے رجوع کی ۔ مولانا نے فرمایا کہ «سہل سے سہل اردو لکھیے، آپ کا مقصد پورا ہوجائے گا» ۔ گویا ہندستانی کے معنے سہل اردو کے ہیں اور یہ رسالہ اسی پر کاربند ہے ۔

مضامین میں زیادہ تر چھوٹے افسانے اور نظمیں ہیں ۔ البتہ ایک مضمون ڈاکٹر محمد اشرف کا «آج کی اسلامی دنیا» اور دوسرا یحیی نقوی صاحب کا «کارل مارکس» پر ہے ۔ شروع میں «دو دو باتیں» اور آخر میں «حال چال» کے عنوان سے اڈیٹر نے موجودہ حالات کے بعض امور پر مختصر تبصرہ کیا ہے ۔

ہندستانی اکیڈیمی کی طرف سے «ہندستانی» نام کا سہ ماہی رسالہ پہلے سے جاری ہے ۔ معلوم نہیں یہ نام اس نئے رسالے کا کیوں رکھا گیا ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندستانی زبان کو خاص طور پر رواج دینا چاہتا ہے ۔

ہدایت

(یہ ہفتہوار رسالہ لاہور سے نکلتا ہے ۔ خاص طور پر بچوں کے لیے ہے ۔
اس کے اڈیٹر شیدا کشمیری اور عبداللہ قریشی صاحب ہیں ۔)

لکھائی چھپائی بہت اچھی اور خط جلی ہے ۔ مضمون بھی سادہ عبارت میں بہت دلچسپ اور مفید ہیں ۔ کچھ قصے اور نظمیں ہیں، کچھ نئی ایجادات کا حال سلیس زبان میں بیان کیا ہے ۔ فوٹو بھی ہیں ۔ دستکاری سکھانے کے لیے بھی بعض چیزیں رکھی گئی ہیں اور نقشے اور تصویریں دے کر نمونے بتائے گئے ہیں ۔

بچوں کے لیے بہت اچھا رسالہ ہے ۔ قیمت سالانہ پانچ روپے ہے ۔

هونهار

یه بهی بچوں کا رساله هے اور هر مهینے پستک بهنڈار (لهریا سرائے) سے شایع هوتا هے ۔ سالانه چنده تین روپے هے ۔

اس کا مقصد بهی هندستانی زبان کی ترقی هے اور بچوں کے لیے اس زبان میں چهوٹے چهوٹے قصے، کام کی اور یاد رکهنے کی باتیں، ملک کے بڑے لوگوں کے حالات اور نظمیں لکهی جاتی هیں ۔ فوٹو بهی هوتے هیں ۔ لڑکے لڑکیوں کے لیے اچها رساله هے ۔

مووی لینڈ

(یه ماهانه رساله فلم اور سنیما سے متعلق محمدحسام‌الدین صاحب غوری کی نگرانی اور ایل ۔ سی بهله صاحب کی ادارت میں سکندرآباد دکن سے شایع هوتا هے ۔ سالانه قیمت دو روپیه آٹھ آنے هے ۔)

اس میں سنیما اور فلم کے متعلق مضامین اور خبریں هوتی هیں ۔ اور اس کے علاوه دوسرے دلچسپ مضامین، نظمیں اور غزلیں بهی ۔ رساله اچها بڑا هے اور اس قیمت میں سستا هے ۔ سنیما کے متعلق یه رساله سب سے بهتر معلوم هوتا هے ۔

ایشیا

(یه ماهانه رساله لاهور سے نکلتا هے اور سالانه چنده صرف ایک روپیه هے ۔)

مختلف قسم کے مضامین اور قصے درج هوتے هیں ۔ یه رساله وقت کاٹنے کے لیے اچها هے ۔ مضامین معمولی هیں مگر دلچسپ ۔ بهت سستا رساله هے ۔

خاص نمبر

ساقی

ساقی کا یہ نمبر پورا مےخانہ ہے جو رنگ برنگ مضامین سے سجا ہوا ہے - لکھنے والے بھی اسے خوب ملے ہیں - شروع میں ۵۸ صفحوں کا مولوی عنایت‌اللہ صاحب کا ترجمہ کنگ‌لیر ہے جو شیکسپیر کا بہت پُر درد اور بہترین المیہ ڈراما ہے - مولوی عنایت‌اللہ اعلی درجے کے مترجم ہیں اور اس ڈرامے کا ترجمہ انھوں نے بڑی خوبی اور سلاست سے کیا ہے - یہ ڈراما ضرور مقبول ہوگا، ایک تو ترجمے کی خوبی کی وجہ سے اور دوسرے اس لیے کہ یہ اہل ہند کی طبائع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے -

ڈاکٹر شادانی صاحب کا مضمون بھی بڑی تحقیق سے لکھا گیا ہے - ان کے علاوہ بہت سے مختصر فسانے بہت دلچسپ ہیں - یہ پورا نمبر جو دو سو اسی صفحوں پر ہے، بہت دل‌کش اور مطالعہ کے قابل ہے -

---

ادب لطیف

ادب لطیف کا یہ نمبر اسم مسمی ہے - اور اس کے دوسرے سالناموں کی طرح یہ بھی قابل قدر ہے - پہلا مضمون حضرت کیفی (پنڈت برجموہن دتاتریہ) کا خواجہ حالی مرحوم پر ہے - پڑھنے کے قابل ہے - اس کے علاوہ اور بھی کئی ادبی مضمون ہیں - سالنامے کا زیادہ تر حصہ مختصر افسانوں، لطیف مضامین اور نظموں کے نذر کیا گیا ہے لیکن سب اپنی اپنی حیثیت میں خوب ہیں - اردو رسالوں کے یہ سالنامے اردو ادب اور زبان کے فروغ کا باعث ہیں -

---

کالیداس کی شکنتلا

از

پنڈت ونشی دھر صاحب ودیالنکار عثمانیہ یونیورسٹی کالج حیدرآباد (دکن)

کالیداس کی شکنتلا، شاعر کے دل کے نازک‌ترین جذبات اور دردبھرے احساسات کا ایک خوب‌صورت مرقع ہے جس میں اتنی صدیاں بیت جانے کے بعد بھی پہلے دن کی سی تازگی ہے اور ابھی تک وہی سادگی، کشش اور گہری کسک موجود ہے۔ گویا کہ شاعر نے اپنی مسحورکن آنکھیں اس دنیا میں ابھی پہلی بار کھولی ہیں۔ اتنا زمانہ گزر جانے اور اتنے انقلابات کے بعد بھی جب آج پرانے زمانے کی روزن سے کالیداس کا کلام اس نئے زمانے کو جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے اپنی دنیا اور اس دنیا میں جذبات و احساسات کے بدلتے جانے اور وقت و زمانہ کے گزرتے جانے کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔

سری کرشن‌جی نے گیتا کے دسویں باب کے آخری شلوک میں ارجن سے کہا ہے « میں اس تمام دنیا کو اپنے صرف ایک جز سے سنبھالے ہوئے ہوں »۔ اگر اس بات کو دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں‌گے کہ اس تمام عالم میں ان کی قدرت کاملہ کا ہمیشہ ایک حصہ ہی نظر آتا ہے۔ بڑے آدمی، بڑے شاعر اور جتنی بھی بڑی چیزیں ہیں ان سب کا اپنی مرئی اور واقف دنیا میں صرف ایک جز ہی نظر آتا ہے۔ ان کا باقی جز تو غیر مرئی رہتا ہے اس لیے ہم اس سے واقف نہیں ہوسکتے۔ کوئی انسان فضا کو مٹھی میں بند کرکے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے ساری فضا کو اپنی

مٹھی میں بند کر لیا ہے ۔ اس طرح وہ زمانہ جس میں بڑا آدمی یا بڑا شاعر جنم لیتا ہے، اپنی مٹھی میں اس کی بڑائی کے ایک تھوڑے حصے ہی کو پکڑ سکتا ہے، اس کی ہمہ گیر شخصیت تو اس سے باہر بھی اپنی پوری وسعت میں موجود رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بڑا آدمی، بڑا شاعر اور اس کا بڑا کارنامہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اس پر زمانے اور دوسرے انقلابات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کالیداس بھی اس طرح کا بڑا شاعر ہے اور اس کی شاعری ایک ایسا ہی کارنامہ ہے جو دنیا کے وسیع حدود کے اندر بھی کسی طرح سما نہیں سکتی اور اس کا فیض ہر زمانے میں جاری رہےگا۔

امریکہ کے مشہور سنسکرت کے عالم پروفیسر آرتھر ڈبلیو رائڈر، جنھوں نے سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، کالیداس کی کتابوں کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، "ایسے[1] شخص کبھی اپنی زندگی میں اس رتبہ اور بلندی کو حاصل نہیں کرسکتے جو انھیں حاصل ہونا چاہیے، ہاں ان کی موت کے بعد ان کی شہرت بلند سے بلندتر ہوجاتی ہے"۔ اگر ہم ان لفظوں کو ذرا بدل کر کہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایسے بڑے شاعر اپنی زندگی ہی میں ختم نہیں ہوسکتے گویا موت کے ہاتھوں ان کی بڑائی زمانے کے قید و بند سے نکل کر دنیا میں جاری و ساری ہوجاتی ہے۔ جس وقت پہلی مرتبہ کالیداس کی شکنتلا ترجمہ کی ناقص زبان میں یورپ پہنچی تو وہاں کے بڑے شاعروں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی زبان میں انھیں اپنے ہی دل کی راگنی اور اپنے ہی دل کا نغمہ سنائی دے رہا ہے۔ اس ایک کتاب نے ہندستان کے اس سب سے بڑے حسن‌کار کا ایسا تعارف کرایا کہ جس سے دنیا کے سارے فن‌کار مبہوت ہوکر رہ گئے اور اس ملک کی تہذیب و تمدن کی بلندی سے متاثر ہونے لگے۔ اب تو سنسکرت زبان کا مطالعہ دنیا کے ہر حصے میں آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کالیداس کے اسی ایک ناٹک نے ہندستان کی عظمت اور بڑائی کا احساس دنیا کی بڑی شخصیوں کو اس وقت دے دیا جب کہ انھیں

---

1 Such men are never fully appreciated during their life, they continue to grow after their death.

ہندستان کی تہذیب و تمدن کا جو کچھ بھی علم تھا وہ ایک سایہ کی تاریکی اور غلط اوہام سے زیادہ نہ تھا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

سنسکرت زبان کی یہ خوش‌نصیبی ہے کہ اس میں کالیداس جیسے بڑے شاعر نے جنم لیا ۔ اس کی شاعری کا جائزہ لینے والوں کو شاعر کے دل کی یک‌رنگی اور یگانگت کا جو احساس ہوتا ہے اس سے دل میں مسرت کے ساتھ غرور کے جذبات ترک ہو جاتے ہیں۔دنیا کی بڑی چیزیں آسانی سے حاصل ہوکر بھی بالکل حاصل نہیں ہوتیں' اصل میں یہ ہماری نفسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے ہم دور رہ‌کر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جس بڑی چیز کے حصول میں ہم کوشاں تھے اسے ہم نے پالیا مگر جوں جوں ہم اس چیزسے قریب‌تر ہوتے جاتے ہیں تو وہ ہمالیہ کی اونچی سے اونچی چوٹی سے بھی بلند نظر آتی ہے اور ہمارا فریب نظر آشکار ہو جاتا ہے ۔ بڑی شاعری بھی ایسی ہی ہوتی ہے؛ اسے سنتے ہی اس کی معمولی سی آہٹ سے ہمیں احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا اور پوری طرح حاصل کرلیا ۔ مگر جب ہم اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وسیع مملکت کو اگر ساری دنیا بھی چاہے تو حاصل نہیں کرسکتی اور اس کی کوششوں کا حاصل سمندر سے ایک چلو بھر پانی لینے کے برابر ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ ہم اس شاعری کو بار بار پڑھتے ہیں اور بار بار اس کا مزہ لیتے ہیں مگر ہماری سیری نہیں ہوتی اور نہ اس کی تھاہ ہمیں ملتی ہے ۔ بعض وقت شاعر کی زبان پر ہمیں اپنی زبان کا دھوکا ہوتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی اسی طرح بیان کرسکتے ہیں مگر جب بیان کرنے بیٹھتے ہیں تو زبان چلتی نہیں' وہ بالکل خاموش ہوجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت گویائی سلب ہوگئی ہے۔

کالیداس کی شکنتلا کی شاعری دل اور آنکھوں' جذبات اور زبان کا ایک حیرت‌انگیز اور کبھی الگ نہ ہونے والا آسمان اور انسانی عناصر کا میل ہے۔ کالیداس محاکات کا بادشاہ ہے' اس کے الفاظ بولتی آنکھیں ہیں' آنکھوں کی اپنی زبان ہے اور وہ زبان صاف آئینہ کی طرح ہے جس میں اس کے دل کا عکس جھلکتا رہتا ہے جیسا کہ چیت

کے مہینے میں پونم کی چاندنی درختوں کی ڈالیوں اور پتوں پر گر کر ان کے نقش زمین پر بناتی ہے، اسی طرح شاعر کے دل کی روشنی جن چیزوں پر پڑتی ہے، ان کی لفظی شکلیں شاعر کے کلام میں اتنی واضح نظر آتی ہیں کہ بالکل حقیقی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

آج کل سائنس داں عکس ریز (Xrays لاشعاعیں) سے جسم کی اندرونی چیزوں کو دکھا دیتے ہیں۔ لیکن اس بڑے شاعر کی عکس ریزی ایسی ہے جس سے وہ انسانی دلوں کی گہرائیوں کا نمایاں عکس پیش کر دیتی ہے۔ شکنتلا کو پڑھتے ہوئے اکثر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر دشینت کی شکل میں چھپا ہوا شکنتلا کے مختلف جسمانی اور دماغی رخوں کی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ پہلے اور دوسرے ایکٹس میں یہ تصویریں زیادہ نمایاں ہوگئی ہیں اور شاعر اپنے فن کے سہارے جہاں شکنتلا کی تصویریں کھینچتا ہے وہاں راجہ دشینت کے دل کی گہرائیوں کا عکس بھی پیش کرتا جاتا ہے۔

سنسکرت ڈراموں میں جذبات نگاری کی جیسی مکمل تصویریں نظر آتی ہیں ویسی کردارسازی کی بلندی دکھائی نہیں دیتی۔ مغربی ڈراموں میں ماہر شخصیت کا کردار اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ اندرونی جذبات اور بیرونی تفصیلات کا مظہر ہوتا ہے۔ ان ڈراموں میں جن جذبات کا اظہار ہوتا ہے وہاں ہر شخصیت کے کردار میں اس کی ذاتی خصوصیات ایک انفرادی رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لیے ان ڈراموں کی ایک شخصیت کے کردار کی جگہ اگر ہم کسی دوسری شخصیت کے کردار کو لانا چاہیں تو بڑی دقت ہوگی اور کسی ایسی شخصیت کو ڈھونڈھنے میں بڑی مشکل ہوگی جس کے کردار میں اسی طرح کی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ لیکن سنسکرت کے ڈراموں میں کردار کی جزیات پر اتنی گہری روشنی نہیں ڈالی جاتی۔ یہاں شاعر کردار کے انہیں رنگوں کو واضح کرتا ہے جو جذبات کی مصوری میں اس کے ممد و معاون ہوسکیں۔ اس لیے اگر ان کرداروں کی جگہ کوئی اسی حیثیت کا دوسرا کردار رکھ دیا جائے اور نام بدل دیا جائے تو ڈرامے کے قصے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا۔

شکنتلا میں اگر راجہ دشینت کی جگہ کسی اور طاقت‌ور بادشاہ کو بٹھا دیا جائے اور شکنتلا کی جگہ کسی اور حسین دوشیزہ کو لایا جائے تو مہابھارت کے لکھے ہوئے واقعات میں فرق پڑجائےگا، لیکن ناٹک کی کہانی، جذبات‌نگاری اور تاثر میں شاید کوئی خاص فرق ظاہر نہ ہوگا ۔ اس لیے سنسکرت کے ڈراموں میں مختلف افراد کے کرداروں میں تنوع نہیں پایا جاتا ، صرف اندرونی جذبات کی گہرائیوں کا عکس سامنے آتا ہے ۔ جذبات کی اہمیت کی وجہ سے ان ڈراموں میں ڈرامے سے زیادہ شاعری کا لطف آتا ہے اور اکثر جگہ تو ڈرامائی خصوصیات بالکل غائب ہوجاتی ہیں اور صرف شاعری باقی رہ‌جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامے کی کسی شخصیت کی شکل میں شاعر اپنے آپ کو ظاہر کررہا ہے ۔ ان ڈراموں کے کردار اور ان کے الفاظ میں وہ یگانگت نہیں پائی جاتی جو مغربی ڈراموں میں ہوتی ہے ۔ مغربی ڈراموں کی کردارسازی میں تمثیل‌نگار کی ذات اجاگر نہیں ہونے پاتی لیکن ہندستانی ڈراموں میں شاعر کی ذات نمایاں ہوجاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبات کو کامل طور پر نمایاں کرنا ہی سنسکرت کے شاعر اپنا کمال سمجھتے ہیں ، باقی کردار تو ضمنی چیز ہے اس لیے ان میں کردارسازی کی اتنی اہمیت نہیں جتنی جذبات نگاری کی ہے ۔ ہاں اس بات کا ضرور دھیان رکھا جاتا ہے کہ جس فرد کے ذریعے اس جذبہ کا اظہار کرایا جارہا ہے وہ اس کے لیے موزوں ہے یا نہیں ۔

بعض مصنف اور شارح شکنتلا کو سنگاررس (Erotic Sentiments) کا ناٹک کہتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سنگاررس کے علاوہ بھی اور کچھ ہیں یعنی یہ زیادہ‌تر المی جذبات (Pathos) کی تمثیل ہیں ۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ سنسکرت زبان میں شاعر اعظم بھوبھوتی کا « اتررام چلت » المی جذبات کا سب سے اچھا ڈراما ہے ۔ لیکن ہماری ناقص رائے میں شکنتلا صرف درد بھرے جذبات ہی کا آئینہ‌دار نہیں بلکہ یہ انتہائی المیہ ہے ۔ ہم نہیں سمجھتے کہ درد کی ایسی انتہائی صورت دنیا کے کسی ڈرامے میں پیش کی گئی ہو ۔ اگرچہ اس ڈرامے کو شاعر نے ' طربیہ ' ہی بنایا ہے مگر طربیہ کی شکل میں یہ ایک المیہ ہے ۔ المیہ کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے

کہ ایسا ڈراما جس کا خاتمہ ہیرو یا ہیروئن کے قتل یا خودکشی پر کیا گیا ہو۔ یورپ کے اکثر ادیب المیہ کی بھی تعریف کرتے ہیں لیکن ڈرامے کو المیہ بنانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہیرو یا ہیروئن کسی طرح مار ڈالے جائیں۔ جس طرح ایک شخص زندہ رہ‌کر بھی اپنی زندگی ان حالات میں بسر کرتا ہے کہ وہ موت سے زیادہ دردناک تاثرات کی حامل ہوتی ہے، اس طرح المیہ میں بغیر موت کے بھی ایسے درد کی تخلیق کی جاسکتی ہے جو موت سے بھی زیادہ دردانگیز اور مایوس کرنے والا ہو۔ کالیداس نے شکنتلا کو طربیہ بناکر جس درد کی تخلیق کی ہے وہ اتنا شدید ہے کہ سکھ کا پردہ پڑجانے پر بھی اس کا اثر زایل نہیں ہوتا۔ اس ڈرامے کا طربناک انجام اگرچہ ہیرو اور ہیروئن کے بہشت میں ملاپ سے ہوگیا ہے، مگر اس بہشت کی کھڑکی میں سے ماضی کا سہمادینے والا دکھ جھانکتا نظر آتا ہے اور وہ ایک ایسے سوال کی صورت میں انسان کے دل کے سامنے آتا ہے جس کا جواب دینا ناممکن‌سا معلوم ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کا پردہ گرا تو سکھ ہی پر ہے لیکن جہاں وہ پوری طرح سے اٹھا ہے، وہاں تو صرف دکھ ہی دکھ نظر آتا ہے۔

عام طور پر سارے نقاد اس ڈرامے کے چوتھے ایکٹ کو سب سے اچھا اور متاثرکن سمجھتے ہیں کیوں‌کہ اس میں کالیداس نے بیٹی کی جدائی کے درد بھرے نظارے کو اپنی پوری قوت سے نمایاں کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیٹی کی جدائی کی گھڑی بہت ہی دردناک ہوتی ہے۔ ایک طرف ماں باپ ہمیشہ اپنی زندگی کے ایک جز سے جدا ہوتے ہیں، دوسری طرف لڑکی اپنے ماں باپ، اپنی سہیلیوں اور ساتھ رہنے والوں اور اس گھر سے جہاں اس نے اپنا لڑکپن گزارا ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتی ہے۔ زندگی کی یہ ایسی کٹھن اور سخت گھڑی ہوتی ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا پتھر دل ہوگا جس کی آنکھوں سے ایسے موقع پر آنسوؤں کی قطار نہ بہنے لگے۔ کالیداس نے بیٹی کی جدائی کے نظارے کو اسٹیج پر جس فطری جوش سے نمایاں کیا ہے ویسے کوئی دوسرا شاعر شاید ہی کر سکےگا۔ لیکن ہماری رائے میں اس ایکٹ میں شاعر نے درد کا وہ درد بھرا نظارہ نہیں دکھایا جو

اس نے اس ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں دکھایا ہے) شکنتلا کا چوتھا ایکٹ تو درد بھرا ہے ہی لیکن پانچویں ایکٹ میں تو درد کی انتہا ہوگئی ہے۔

ماں باپ سے جب لڑکی بچھڑتی ہے تو جدائی کے غم کے ساتھ اس کے دل کے ایک گوشے میں مسرت کی لہریں بھی اٹھتی رہتی ہیں، لڑکی کو شوہر کے گھر یعنی اپنے گھر جاتا دیکھ کر وہ اپنا غم بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح لڑکی کو بھی جہاں ماں باپ سے الگ ہونے کا دکھ ہوتا ہے، اس کے دل کی گہرائیوں میں شوہر کے پاس جانے کے خیال سے مسرت کا جذبہ بھی امنڈ آتا ہے اور اس جذبۂ مسرت میں اتنی شدت ہوتی ہے کہ وہ اس تمام دکھ میں ایک فراواں راحت کا محرک ہوتا ہے۔ اس درد میں ایک شاعرانہ تلذذ حاصل ہوتا ہے۔ ماں باپ سے جدائی کا یہ دکھ ایسا ہے جس کا کنارہ صاف طور سے دکھائی دیتا ہے لیکن پانچویں ایکٹ میں جس سہما دینے والے دکھ کو اسٹیج پر نمایاں کیا گیا ہے، اس کا کم سے کم ان حالات میں تو کہیں خاتمہ ہی نہیں ملتا۔ شاید اس دنیا میں اس دکھ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے شاعر نے اس دکھ کا خاتمہ بہشت میں کرایا ہے۔

پانچویں ایکٹ میں شکنتلا اپنے شوہر کے گھر پہنچتی ہے۔ وہی شوہر جس نے اسے اپنے دل کی رانی بنایا تھا؛ جو اسی کے لیے ایسا ہوگیا تھا جیسے دوسرے جسم میں سانس لینے والی اس کی اپنی ہی روح۔ شکنتلا "تپوبن" سے اپنے رشی باپ کے دو شاگردوں اور گومتی کے ساتھ راجہ دشینت کے دربار میں پہنچتی ہے۔ اس کے دل میں محبت کی ترنگیں اٹھ رہی ہیں اور وہ راستے بھر اپنی دنیا کو ایک جنت میں بدلتے دیکھ رہی ہے مگر جب وہ راجہ کے سامنے پہنچتی ہے تو اس کے کمزور اور بھولے بھالے دل پر پہلی ہی ضرب اس طرح پڑتی ہے کہ راجہ اسے پہچاننے سے انکار کرتا ہے۔ دشینت شکنتلا کو دیکھ کر سونچ میں پڑ جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ابھی کچھ دن پہلے وہ راج پاٹ چھوڑ کر محبت کی لوریاں گاتا پھرتا تھا، اب وہی

اسے بھول جاتا ہے ۔ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے ۔ شکنتلا کے دل میں اسی نے اپنی محبت کا بیج بوکر اور اپنے راجہ ہونے کی وجہ سے شکنتلا کے باپ کی رضامندی حاصل کیے بغیر راز میں نکاح کر لیا تھا ۔ آج جب شکنتلا راجہ کے "جز" کو اپنے اندر لیے ہوئے اس کے سامنے آتی ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ یہ کون ہے ۔ جو راجہ چھپ چھپ کر اس پر اپنی آنکھیں گڑوتا پھرتا تھا آج اس کے اپنے سامنے آنے پر مسرت کے اظہار کی بجائے اجنبیت اور بیگانگی کا اظہار کرتا ہے ۔ وہ سارا لہراتا ہوا پریم کا سمندر اتنی جلدی ایسا سوکھ گیا کہ اس میں ایک بوند بھی باقی نہیں رہی ۔ اپنا ہی دل اپنے کو پہچان نہیں سکتا اور اب اس کا تعارف کرانا پڑتا ہے ۔ رشی کے چیلے جو شکنتلا کو پہنچانے کے لیے آئے تھے، راجہ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ آپ کی بیوی شکنتلا ہے ۔" مگر راجہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہیں اور پوچھتا ہے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے ؟ شکنتلا اپنے دل میں کہتی ہے کہ یہ بول رہا ہے یا آگ برسا رہا ہے ۔ شکنتلا کے ساتھ آئی ہوئی آشرم کی منتظمہ یہ سمجھتی ہے کہ شاید شکنتلا کے منہ پر نقاب پڑا ہونے کی وجہ سے راجہ اسے پہچان نہ رہا ہو ۔ وہ گوشۂ نقاب کو ہٹا دیتی ہے ۔ اسے کیا خبر کہ اصل میں پردہ تو راجہ کے دل پر پڑا ہوا ہے ۔ شکنتلا کے منہ سے نقاب ہٹنے کے بعد بھی راجہ اسی طرح بغیر کسی جذبے کا اظہار کیے بیٹھا رہتا ہے ۔ اب شکنتلا مایوس ہوکر سونچتی ہے کہ راجہ جب اسے پہچانتا ہی نہیں تو اسے گزرے ہوئے محبت کے دنوں کی یاد دلانے سے کیا حاصل ! مگر پھر اس کا دل اسے ایک آخری کوشش پر اکساتا ہے اور وہ ہمت کرکے اپنی گزری ہوئی داستان محبت کے ایک ایک واقعہ کو سنانے لگتی ہے ۔ راجہ اب بھی بت بنا بیٹھا رہتا ہے اور آخر میں کہنے لگتا ہے "یہ سب تمھاری بنائی ہوئی باتیں ہیں ۔"

آشرم کی منتظمہ سونچ میں پڑ جاتی ہے کہ کیا کرنا چاہیے، رشی کے چیلے کہتے ہیں «ہمارا کام تو شکنتلا کو یہاں پہنچا دینا تھا، اس کا شوہر اسے رکھے یا نہ رکھے یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے» اور یہ کہہ کر وہ چل پڑتے ہیں ۔ مایوس شکنتلا ان کے

پیچھے جانا چاہتی ہے' وہ اسے دھمکا کر اور ڈانٹ بتا کر کہتے ہیں "بےحیا! تو تو اپنے خاندان کے لیے ایک لعنت ہے' اب تیرا باپ تجھے لےکر کیا کرے گا - اگر تو پاک دامن ہے تو تیرے لیے اپنے شوہر کے گھر خادمہ بن کر رہنا بھی اچھا ہے" -

کالی‌داس نے یہاں درد کے ارتقا کو جس طرح دکھایا ہے' شاید ہی کوئی دوسرا شاعر دکھا سکے - پہلے تو راجہ' شکنتلا کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیتا ہے' پھر اس سے تعارف کرایا جاتا ہے' اس وقت بھی وہ نہیں پہچانتا - شکنتلا کے منہ سے اس امید پر نقاب ہٹالی جاتی ہے کہ شاید وہ پہچان لے' مگر وہ چپ رہتا ہے - پھر شکنتلا اپنی محبت کی کہانی اسے سناتی ہے' مگر راجہ کا جذبۂ محبت اسی طرح بےحس رہتا ہے اور وہ شکنتلا کو اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیتا ہے اور آخر میں رشی کے چیلوں کا شکنتلا کو واپس اس کے اپنے گھر لےجانے سے انکار کر دینا ــــــــ درد کو مکمل کر دیتا ہے - ان میں سے ایک ایک سیڑھی طے کرکے گویا درد کا دریا اوپر اٹھتا آتا ہے اور آخر میں اپنے اندر سب کو ڈبو دیتا ہے - باپ کے گھر کے لوگوں کے انکار نے تو سخت دلی کی انتہا کردی ہے - اس آخری ضرب کے بغیر تو شاید درد اتنا مکمل نہ ہوتا - اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب سے بڑھ کر بےدردی تھی یعنی اس ضرب نے شکنتلا کے دل کے ٹکڑے کردیے اور وہ اب اس جگہ کھڑی تھی جہاں رنج اور غم کی بھیانک شکل کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا - وہ حاملہ تھی ــــــ اس کا شوہر اسے ٹھکرا چکا تھا اور باپ کے گھر کے لوگ بھی بےمہری کی انتہا کر چکے تھے - اب اس کے لیے دنیا میں کیا باقی رہا تھا! - وہ پتی کے ہوتے ہوئے بھی بےشوہر اور ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہوگئی -

ہم نہیں جانتے کہ کسی اور شاعر نے اسٹیج پر ایک معشوقہ کے اس طرح بےرحمی سے ٹھکرائے جانے کا درد بھرا نظارہ پیش کیا ہو - شکنتلا کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی' جب اس دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہ رہا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی - معلوم ہوتا ہے کہ درد کو اس درجہ مکمل بنا کر شاعر بھی اس نظارے کی تاب نہ لا سکا اور اس نے شکنتلا کی ماں کے ذریعے جو آسمان پر رہتی تھی' اسے اٹھوا دیا -

* * * *

شاعر نے اپنی ہیروئن کو رشی کے آشرم سے اس لیے چنا ہے کہ اس کا بھولاپن اور پاکیزگی اور شہری زندگی سے ناواقفیت اس درد بھری کہانی کو اور بھی پُردرد بنادیے ۔ شکنتلا کے حسن کا بیان اور پھر راجہ کا اس پر عاشق ہونا اور ان دونوں کے اتھاہ جذبۂ محبت کی مصوری، شکنتلا کا حاملہ ہونا، پانچویں ایکٹ کی بےدردی کو اور بھی پُرتاثیر بنا دیتا ہے ۔

درواسا کی بد دعا نے اس بےدردی کو مشین کی طرح سخت کر دیا ہے، اگر راجہ کو اپنی بےدردی کا ذرا سا بھی علم ہوتا تو شاید درد کی یہ تصویر اتنی مکمل نہ ہوتی ۔ ہم نے اس واقعہ کو اس لیے تفصیل سے لکھا ہے کہ ہم اپنے خیال کو کامل طور پر واضح کرسکیں یعنی ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ چوتھے ایکٹ میں جس درد کا اظہار کیا گیا ہے وہ پانچویں ایکٹ کے درد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اور وہ درد تو اصل میں اس درد کی تمہید ہے ۔

چھٹے ایکٹ میں جب راجہ کو انگوٹھی ملنے کے بعد شکنتلا کی یاد آئی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آنسوؤں میں شاعر کے آنسو بھی مل گئے ہیں ۔ ایک جگہ پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر خود دشینت کے منہ سے کہہ رہا ہے "میں نے شکنتلا کو ٹھکرایا ہی تھا، باپ کے گھر کے لوگ تو اسے مل‌جاتے مگر ان بےرحموں نے بھی اسے ٹھکرا دیا ۔ تب اس بےچاری نے پھرکر مجھ سنگ‌دل پر جو نظر ڈالی وہ نظر زہر سے بجھے تیر کی طرح میرے دل کو جلارہی ہے" ۔

یہی 'آنسوؤں سے بھری ہوئی نظر' کالیداس کی شکنتلا ہے اور یہی شوہر اور ماں باپ کے گھر سے ٹھکرائی ہوئی شکنتلا صنف نازک کی انتہائی بےبسی اور بےچارگی کی مکمل تصویر ہے ۔ اس آنسوؤں سے بھری نظر کو دیکھکر کالیداس کے دل سے درد کا جو سیلاب بہہ نکلا ہے وہی اس تمثیل کی شکل میں تبدیل ہوگیا ہے ۔ قدرت نے صنف نازک کی سرشت میں کچھ ایسی کمزوریاں رکھ دی ہیں جن سے مرد فایدہ اٹھاتا رہتا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ عورتیں اپنی اس کمزوری پر اب بھی پوری طرح فتح پاسکتی ہیں یا نہیں ۔ جس کمزوری کو کالیداس نے اس ڈرامے میں مصور کیا ہے وہ

بےچارگی اور بےبسی کی آخری مد ھے ۔ اکثر نقاد اس پر یہ اعتراض کریں گے کہ شکنتلا کو نہ پہچاننے میں دشینت کا کوئی قصور نہ تھا ' یہ تو ' درواسا ' رشی کی بددعا تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی معشوقہ کو پہچان نہ سکا ۔ اس مضمون میں دشینت کا قصور تھا یا نہیں ' ہم اس پر بحث کرنا نہیں چاھتے اگرچہ کہ مہابھارت کو پڑھنے سے دشینت قصوروار معلوم ھوتا ھے ۔ مہابھارت میں لکھا ھے کہ دشینت شکنتلا کو پہچان گیا تھا ' مگر پہچان کر بھی انجان بنا بیٹھا رھا ۔ اس مضمون میں ھم قصور کے سوال کو اٹھانا نہیں چاھتے؛ سوال یہ ھے کہ کیا اس محبت پر جس کی ابتدا اس زور سے ھوئی تھی پردہ ڈالا جاسکتا ھے اور کیا محبت کی ان گزری داستانوں کی یاد دلانے کے لیے انگوٹھی جیسی حقیر چیز کی ضرورت ھے ؟ اس کی مثال تو ایسی ھی ھوگی کہ ایک روشن شمع دکھانے کے لیے ایک دوسری شمع کی ضرورت ھو ۔ اس سے زیادہ حیرت اور دکھ کی بات کیا ھوگی کہ شکنتلا کو دیکھ کر بھی راجہ اسے پہچانتا نہیں اور انگوٹھی کو دیکھ کر اسے شکنتلا کی یاد آتی ھے گویا وہ انگوٹھی کو تو پہچانتا تھا مگر شکنتلا کو نہیں ۔ اس محبت کو یاد دلانے کے لیے ذرایع کا مہیا کیا جانا خود اس داستان کو دردناک بنا دیتا ھے ۔ کالیداس نے ' درواسا ' کی بددعا کے ذریعے داستان کو دردناک بنایا ھے ' مگر انگوٹھی کی مدد سے دشینت کو شکنتلا کی یاد دلاکر اسے اس گناہ سے بچالیا ھے ۔ اور اس وجہ سے اپنے ڈرامے کو سکھ پر ختم کرکے وہ زندگی کی سانس لے سکا ھے ۔ لیکن جو المناک واقعات گزرچکے ھیں' ان کی طرف وہ اشارہ کیے بغیر نہیں گزر سکا ۔ چھٹے ایکٹ میں سانومتی حور کے منہ سے شاعر چپ چاپ کہہ رھا ھے ۔ " اس بات پر حیرت نہیں کہ اب تمھارے دل پر سے پردہ ھٹ گیا ھے اور تم شکنتلا کو یاد کررھے ھو ' حیرت تو اس بات کی ھے یہ پردہ پڑھی کیسے گیا تھا ! "

ساتویں ایکٹ میں بہشت کے ھیم کوٹ پہاڑ پر حوروں کے یہاں جب راجہ دشینت اپنے بیٹے کو اور پھر کھلے بالوں والی ' دکھی دل شکنتلا کو دیکھتا ھے تو اس کے پیروں پر گر کر معافی مانگتا ھے ۔ شکنتلا اسے اس کی بےدردیوں کی یاد دلاتی ھے اور پوچھتی ھے " آخر میں بد نصیب آپ کو یاد کیسے آگئی؟ " اس وقت اس کی نظر

اس انگوٹھی پر پڑتی ہے جو اس کی انگلی سے گرگئی تھی - راجہ تمام حالات سناتا ہے اور پھر شکنتلا سے اصرار کرتا ہے کہ وہ اس انگوٹھی کو پہن لے - مگر شکنتلا جو کچھ اس کے جواب میں کہتی ہے وہ ایک پرمعنی طنز ہے "مجھے اب اس کا یقین نہیں رہا، آپ ہی اسے پہنے رہیے"۔ اس طرح اس نے اس انگوٹھی کو سزا دےدی حالانکہ اگر یہ انگوٹھی نہ ملتی تو درواسا کی بد دعا بھی نہ ٹلتی - مگر جب دل پر پردہ پڑ سکتا ہے تو پھر ایسی حقیر چیزوں کا کیا شمار ہے - جو محبت دل میں پہنچ کر زندگی کی طرح اپنے آپ کو محسوس نہ کرائے وہ محبت ہی کیا ہے، اسے تو کسی اور نام سے پکارا جانا چاہیے - محبت کی جگہ دل کی گہرائیاں ہیں اور معشوقہ کی یاد ایک کانٹا ہے جو دل میں کھٹکتا رہتا ہے، اس محبت کو انگوٹھی جیسی چیز کے ذریعے یاد دلانا محبت کی توہین ہے - محبت کے اظہار کے لیے کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں یہ طوفان تو دل کی گہرائیوں سے اٹھتا ہے - یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ عطر کی مست خوشبو کو عطر نہ بتاسکے اور عطّار بتائے، اگر ایسا ہو تو اس سے زیادہ محبت کی بےحرمتی اور دردبھری کہانی کیا ہوسکتی ہے -

محبت سے تعلق مہاتما اور مہاکوی کبیر کے مندرجہ الفاظ بالکل سچے ہیں :-

پریم چھوپایا نا چھپے جا گھٹ پر گھٹ ہوئے
جو پئے مُکھ بولے نہیں نین دیت ہیں روئے

چاہے اس محبت کے بھلائے جانے کا سبب درواسا کی بددُعا ہو یا دشینت کا اپنا شاہانہ کردار، مگر اس درد کی انتہا میں کسی طرح کی کمی باقی نہیں ہے اور محبت کی اس بےحرمتی کا کچوکے دینے والا درد جس انتہائی صورت میں پیش ہوا ہے اسے شاعر نے درواسا کی بددُعا کے سہارے سکھ میں تبدیل کردیا ہے - مگر اس سانحہ سے دل پر جو چوٹ لگتی ہے، اس کے اثر کو یہ سکھ کسی طرح کم نہیں کرسکا - ہماری زندگی کے واقعات میں قسمت کا جو سہارا لیا جاتا ہے اس کی بہترین مثال درواسا کی بددعا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس وسیع دُکھ ساگر سے پار ہونے کے لیے درواسا کی بددُعا کی ایک محفوظ کشتی بنالی ہے اور اس کشتی کے سہارے وہ اس پار بہشت میں

پہنچتا اور سکھ کی تخلیق کرتا ہے مگر یہ ایسا سکھ ہے جو اس طرف زمین پر شاید تخلیق نہیں کیا جا سکتا تھا ۔

اس سکھ بھرے بہشت کے ملاپ میں ایک طرف درد مجسم شکنتلا اور دوسری طرف ندامت کے احساس سے بےچین دشینت ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ان کی محبت کا حاصل ان کا بیٹا ہے جو اس ملاپ کا ذریعہ بنتا ہے اور جس کے سہارے نے شاعر ماضی کے درد اور دکھ کے تیر کو دلوں سے نکال باہر پھینک دیتا ہے ۔ مگر یہ داستان زمین پر تو درد سے بھری ہوئی ہے اور آسمان پر جاکر کہیں اس میں دکھ کی بجائے سکھ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس طرح یہ ڈراما آسمانی فضا میں سکھ کی تخلیق کرسکا ہے ورنہ زمین پر تو وہ ایک پُردرد داستان ہی بنا رہتا ہے ۔ گویا سکھ کا عنصر بہشت سے اس زمین کی دکھ بھری اور بےدرد داستان کو روشن کردیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامے کے سکھ بھرے خاتمہ پر بھی اس کچوکے دینے والے درد کا اثر کسی طرح کم نہیں ہوتا اور اس کی غمگین آواز برابر دلوں سے ٹکراتی رہتی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شکنتلا اور دشینت کے ملاپ کے بعد بھی دنیا میں اس دردناک واقعات کے ہونے کا امکان باقی ہے اور یہی احساس آخر میں خوف طاری کر دیتا ہے ۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ اگر وہ انگوٹھی نہ ملتی تو صنف نازک کی بےچارگی اور بےبسی کی تصویر مکمل ہو جاتی ۔ کالیداس نے اس ڈرامے کو طربیہ بناکر بھی ایسے المیہ کی تخلیق کی ہے جس کو دیکھ کر طرب بھی الم ہی نظر آتا ہے اور اس کے رگ و پے میں جو درد جاری ہے اس کے اثر کو وہ کسی طرح کم نہیں کرسکا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کا جسم تو سکھی ہے مگر اس کے اندر جو روح ہے وہ انتہائی دکھی ہے اور جس کی ہر سانس میں ایسی سسکیاں بھری ہوئی ہیں جنہیں انسان کے دل کے آنسو کسی طرح بھی ظاہر نہیں کرسکتے ۔

جذبۂ عشق

مصحفی نے اردو میں کتنی مثنویاں لکھیں، اس کا صحیح جواب مشکل ہے، لیکن اس وقت جو مثنویاں مجھے ملی ہیں ان کی تعداد بیس ہے۔ ان کا مختصر حال 'معیار' بانکی پور بابت مارچ سنہ ۱۹۳۶ع میں درج ہے۔ شعلۂ شوق، بحرالمحبت اور گلزار شہادت معرض طبع میں آچکی ہیں اور جذبۂ عشق رسالۂ اردو میں شائع ہو رہی ہے۔ اس کی جو نقل اردو کو بھیجی جا رہی ہے وہ دو نسخوں کے مقابلے سے تیار ہوئی ہے، لیکن اس پر بہت سے مقامات مشتبہ ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس یہ مثنوی موجود ہو براہ کرم اغلاط و اختلافات سے مجھے آگاہ فرمائیں، میں نہایت ممنون ہوں گا۔ مثنوی جذبۂ عشق دیوان اول اور دیوان پنجم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور کے یہ نسخے ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔ دیوان اول اور دیوان پنجم کے دوسرے نسخے جو میری نظر سے گزرے ہیں یا جن کے متعلق میں نے تحقیق کی ہے وہ اس مثنوی سے خالی ہیں۔

دیوان اول ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ مرتب ہوا ہے اور اس میں کل وہ غزلیں اور مثنویاں شامل ہیں جو مصحفی نے دھلی میں لکھی تھیں۔ بعد کے دیوان تمام و کمال زمانۂ قیام لکھنؤ کی تصنیف ہیں۔ میری رائے میں یہ مثنوی مصحفی نے دھلی میں لکھی تھی۔ اس لیے ۱۱۹۸ھ یا اس سے قبل کی تصنیف ہے۔

قاضی عبدالودود

اگزی بیشن روڈ۔ پٹنہ

عشق ہے جوہر محیط جہاں
عشق ہے جسمِ آدمی میں جاں

عشق ہے کائنات کا مفہوم
گر نہ ہو عشق تو ہیں سب معدوم

عشق ہے شمعِ انجمن افروز
عشق سے ہے یہ گرمیِ شب و روز

عشق سے ہے زمین کا کوہساں
تا قیامت بہ زیربار گراں

عشق سے کوہ پائے برجا ہے
عشق سے اضطرابِ دریا ہے

عشق سے آسماں ہے سرگرداں
عشق سے ہے یہ گردشِ دوراں

عشق سے ہے سرِ فلک پر شور
عشق سے جن و انس کا ہے ظہور

عشق سے ہے دوام عالم کا
عشق سے ہے نظام عالم کا

عشق ہے باعث قوام جہاں
عشق ہے چاشنیِ شیرۂ جاں

عشق سے آب بحر جاری ہے
عشق طوفان بے قراری ہے

عشق کی ہر جگہ ہے شان نئی
عشق رکھتا ہے آن بان نئی

عشق ہے آشنائے خستہ دلاں
عشق ہے مدعائے خستہ دلاں

عشق سے ہے محبتِ زن و مرد
عشق ہے درمیاں میں جوہرِ فرد

عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
عشق خود آہ سرد ہوتا ہے

عشق سے سینہ چاک ہے گلِ صبح
عشق سے ہے فغانِ بلبلِ صبح

عشق سے ہے فروغ لالۂ باغ
عشق سے سینۂ چمن ہے داغ

عشق سے یار ہوئے بیگانہ
عشق ہر شمع کا ہے پروانہ

عشق سے آشنا نگاہ ہوئی
عشق سے دل کو دل میں راہ ہوئی

عشق سے کافر آ کے ہو دیں‌دار
عشق سے پہنے اہلِ دیں زنار

عشق سے دیدہ ہو تماشائی
عشق سے جائے عقل و دانائی

عشق سے خونِ مردہ کھائے جوش
عشق سے ہوشیار ہو بےہوش

عشق میں گبر بھی مسلماں ہے
عشق عاشق کا دین و ایماں ہے

عشق ہے وہ بلائے خانہ خراب
جس سے طاقت کا زہرہ ہوئے آب

عشق وہ زخم تیغ خوش خم ہے
جس کا الماس سودہ مرہم ہے

عشق سے ہے نظارۂ در و بام
عشق ہے عہدِ صبح وعدۂ شام

عشق سے ذوق کوچہ گردی ہے
عاشقی اور پائے مردی ہے

گرچہ جلاد عشق ہے سفاک
قابل عشق کب ہے ہر ناپاک

عشق کب سب کے تیغ مارے ہے
عشق عاشق کا سر اتارے ہے

عشق میں مرد سر لگاتے ہیں
عشق میں جی پہ کھیل جاتے ہیں

عشق سے قیس سر پٹک کے موا
عشق سے کوہ‌کن کا خون ہوا

عشق گر جی کسی کا لیتا ہے
اس کو پھر جان تازہ دیتا ہے

زندہ و مردہ زندہ ہے عاشق
پر وہ جو عاشقی میں ہو صادق

عشق ہے جانِ طالب و مطلوب
عشق ہے جذبِ جاذب و مجذوب

عشق کے جذب ہیں یہ چندیں طور
وہی سمجھے جو دیکھے کر کے غور

نہ فقط خس کو اینچ لیتا ہے
عشق لوہے کو کھینچ لیتا ہے

برسر مطلب اب میں آتا ہوں
عشق کا جاذبہ سناتا ہوں

خاک دہلی میں ایک جوان حسیں
صاحب وضع صاحب تمکیں

تھا شکار خدنگ کاری عشق
دل میں رکھتا تھا بےقراریِ عشق

رات دن اشک جاری رہتے تھے
اس کی چشموں سے چشمے بہتے تھے

دل میں رکھتا تھا بس کہ پنہاں درد
گل سرخ اس کا ہوگیا تھا زرد

گرچہ تھا جوہری وہ پاک نژاد
عشق تھا اس میں جوہر فولاد

عاشق زار اپنی زن پر تھا
بلبل اُس خانگی چمن پر تھا

نہ وہ زن تھی رقم جواہر کی
کیا کروں وصف اس کے زیور کی

حسن ایسا کہ کہیے لعبتِ چیں
نور ایسا کہ جو نہ ہوئے کہیں

سطح سینہ تھا مثل آبِ تنک
چھاتیاں اس میں دو حبابِ تنک

رنگ کندن سا جو دمکتا تھا
جس میں جوبن پڑا جھلکتا تھا

دی تھی یہ نازکی نے اس کو بہار
جس سے ہر عضو اس کا تھا گلزار

پنجہ مرجاں سے باج لیتا تھا
گل سے عارض خراج لیتا تھا

کیا کہوں غبغب اور گلو کی صفا　　جس کا روکش نہ تھا ید بیضا
بس کہ ساعد میں تھی صفائے بلور　　باج دیتی تھی جس کو ساعدِ حور
دیکھ کافر کی شوخیِ رفتار　　دنگ رہتے تھے مردمِ بازار
اس کی چتون کی وہ نگاہ تھی قہر　　جس کو کرتا سلام سارا شہر
نس پہ وہ برچھیاں نگاہیں تھیں　　جس سے مژگاں تمام آہیں تھیں
تھی وہ اس خوبی و صفا کے ساتھ　　ہوتی میلی نظر سے جس کی گات
دیکھ اس کے وو گوہر دنداں　　تھا بہت اپنے کام میں حیراں
جاکے بیٹھی تھی لعل سے لب پر　　لعل سے اٹھ گئی تھی اس کی نظر
گھر سے بازار تک اگر جاتا　　دو قدم چل کے ووھیں پھر آتا
دل نہ لگتا تھا جب کہ اور کہیں　　قبلہ کرتا تھا اس صنم کے تئیں
گاہ جاتا لپٹ گلے سے وھیں　　چومتا لب کبھہ اور گاہ جبیں
گاہ پاؤں پہ سر کو رکھ دیتا　　کبھہ لپٹ کر اسے لٹا دیتا
گاہ کرتا وو جو کہ ھے دستور　　چومتا گاہ نرگس مخمور
گاہ اس لب سے بوسہ پاتا تھا　　گاہ دشنام تلخ کھاتا تھا
دل سے کاڑھے تھا اپنے عشق کی چوز　　اس طرح محو حسن تھا شب و روز
عشق کی طبع میں مدارا تھیں　　گالی کیا دھولیں بھی گوارا تھیں
عرصہ کرتا تھا بس کہ اس پہ تنگ　　دیکھ زن اس کے چاھنے کے ڈھنگ
گاہ ناخوش تو گاہ خوش ھوتی　　گاہ ھنستی تو گاہ پھر روتی
اس سے کہتی کہ کیا بلا ھے تو　　کیوں بلا سا مجھے لگا ھے تو
جوں جوں اس سے لگا چلا جاتا　　وصل میں ھجر کا مزہ پاتا
بحر الفت میں تھا جو یک سر غرق　　وصل اور ھجر میں نہ پایا فرق
وصل کی اس پہ جو گھڑی گزری　　ساعت ھجر سے کڑی گزری
مثل ماھی کے گرچہ تھا بے تاب　　پر نہ تھا اس کی تشنگی کا حساب
دن بہ دن چاہ بڑھتی جاتی تھی　　مرگ دیکھ ان کو مسکراتی تھی

لیک فارغ ز فتنه سازیِ چرخ
غافل از کار حیله بازیِ چرخ

عیش و عشرت میں پا کے ان کے تئیں
کیا دونوں په چشمِ بد نے کمیں

یوں جدائی اگر نه ٹھہرائے
سبب ہجر موت ہو آئے

زوجهٔ جوہری تھی نرم اندام
پنبه لیتی تھی جس سے نرمی وام

گر ہوا اس بدن کو لگ جاتی
برگ گل کی طرح وو تھرّاتی

نازکی کے سبب سے زہره جبیں
پاؤں رکھتی نه تھی به روے زمیں

کبھی گر چلتی جوں نسیمِ بہار
تہِ پا اس کے سبزه تھا سرِ خار

اس نے جب خوب سا فشار دیا
اس نے گرمی میں آبخار دیا

لب په تبخالے یوں ہوئے اس دم
جس طرح برگ گل په ہو شبنم

ووہیں کمھلا گئی وو جیسے پھول
گئی کمھلا کے اپنی سدھ بدھ بھول

حال اپنا سبھوں کو دکھلا کر
بسترِ غش په گر پڑی جا کر

چشمِ بیمار اس کی ہو کے نزار
ہوگئی رشک نرگس بیمار

حلقے آنکھوں کے سب نکل آئے
دیدے کچھ بے خطر اُگل آئے

رنگ ہلدی سا ہوگیا پیلا
چہره آنے لگا نظر نیلا

گل عارض په پھر گئی سبزی
زہر الفت نے یه سرایت کی

اس کی ماں بہنیں اور ہمسائیں
دیکھ کر اس کو سخت گھبرائیں

کوئی بولی ہے اس کو درد جگر
کوئی بولی اسے لگی ہے نظر

کوئی بولی که اس کو سکته ہوا
کوئی بولی کسی نے سحر کیا

کوئی بولی کھڑی تھی کوٹھے پر
پڑ گئی ہے کسی کی اس په نظر

کوئی بولی پری کے سایے تلے
آگئی ہے کہیں یه بال کھلے

کوئی بولی بلاؤ سیانے کو
کوئی بولی اسے فلیتا دو

کوئی بولی که دوڑ ہی جاؤ
مرچیں جا کر کہیں پڑھا لاؤ

کوئی بولی که صدقه دو فی الحال
کوئی بولی دکھاؤ جا کر فال

کوئی بولی که بید کو لاؤ
اس کی ناڑی تو اس کو دکھلاؤ

الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار　　نہ کھلے تھا کسی پہ یہ اسرار

کہ یہ نازک بدن جو کمھلائی　　یک بہ یک اس پہ کیا بلا آئی

بس کہ ہے نت مزاجِ حسن غیور　　نہیں راضی بہ یک نظارۂ دور

نہ کہ یہ اختلاط چسپاں ہو　　یک دگر دامن اور گریباں ہو

وہ جو خلقت میں زن ہیں نرم اندام　　جام صحت سے کم ہیں مے آشام

دیکھ شوہر نے اس کا حال زبوں　　کیا آنکھوں کو غرقِ لجّۂ خوں

جو دوائی کسی نے بتلائی　　ووہیں بازار سے وو منگوائی

فال جا کر کہیں دکھاتا تھا　　نقش لکھوا کہیں سے لاتا تھا

کبھی بامھن سے پوچھتا کہ یہ ماہ　　آ گیا کیوں کسوف میں ناگاہ

کبھی رمال کے کنے جاتا　　اس سے ہر بار قرعہ پھنکواتا

کبھی جوگی کوئی جو پاتا تھا　　گھر میں لاکر اسے دکھاتا تھا

بہرِ تیمارِ آں مہ دل کش　　تھی بہت اس کی گیر پا آتش

الغرض جو جتن تھے وو کیے　　لیک بیمار مرگ کیوں کے جیے

بعد یک‌چند وہ زنِ بیمار　　اسی حالت میں مر گئی یک بار

طائرِ روح کر گیا پرواز　　ہوگیا صعوہ صیدِ چنگلِ باز

صرصر مرگ ناگہاں آئی　　چمن حسن میں خزاں آئی

چہرہ اس کا جو رنگ میں تھا ورد　　ہو گیا بر مثال لالۂ زرد

لعلِ لب تھے جو شکلِ لعلِ مذاب　　جوں وہ پژمردہ ہوگئے بے آب

دست رنگیں جو اس کا تھا دل کش　　دی لگا اس نے اور ہی آتش

دُرِ دنداں میں وہ صفا نہ رہی　　چشم و ابرو کی وہ ادا نہ رہی

ہو گئی چشم سے نظر رخصت　　چھا گئی اس میں صورتِ حیرت

غنچے خندق کے تھے سو مرجھائے　　پھول رنگِ حنا کے کمھلائے

کرکے پابوس رہ گئی رفتار　　ہاتھ ہلنے سے رہ گئی یک بار

بن گئی جعد اس کی صورتِ آہ　　ہو گیا روز زلف کا بھی سیاہ

گات میں اس کی وہ نہ لوچ رہا — نور یہ دیکھ اس کو سوچ رہا

اور سے اور ہوگئی صورت — بن گئی جیسے کاٹھ کی مورت

دیکھ یہ شکل اس کی آخر کار — تھی عروسی جو اس کی ہار سنگار

سن کے فریاد و گریہ و زاری — صرف ماتم ہوئی بہ یک باری

بن گئی میل سرمہ صورت آہ — ہوگیا سرمہ‌داں کا روز سیاہ

سر پہ مسی نے اپنے ڈالی خاک — برگ پاں نے کیا گریباں چاک

پڑے آویزۂ طلائی ٹوٹ — لی وہیں اُرسی نے چھاتی کوٹ

بالیاں کانوں سے جو لی تھیں اتار — چشم حیراں بنی تھی نرگس‌وار

گونج سی کھا کے دل پہ نیش الم — نتھ کا حلقہ تھا حلقۂ ماتم

تھے کرن پھول وہ جو مثلِ چراغ — غمِ فرقت میں ہو گئے تھے داغ

جھومکے وہ جو جگمگاتے تھے — سر افسوس کو ہلاتے تھے

اک طرف دست بند بازو بند — حلقۂ غم میں تھے اسیر کمند

اک طرف کانوں کی وو چودانیں — پڑی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں

آنکھیں چھلّو کی بھربھر آئی تھیں — دل پہ بانکوں نے بانکیں کھائی تھیں

انگلیاں ہوگئی تھیں یوں عریاں — جیسی شاخیں گلوں کی وقتِ خزاں

وہ جو ہوتا ہے زیوراک اُدراج — سر بسر اٹ گیا تھا اس کا راج

دیکھ چمپاکلی کو خوں روتی — سر پٹکتے تھے مانگ کے موتی

تھا جو تعویذ سر کے بالوں پر — کسی کونے پڑا تھا خستہ جگر

چاند رہتا تھا وہ جو زیبِ جبیں — نعلِ ماتم بنا تھا ہوکے حزیں

آرہی تھی جو رونق ابہام — بن گئی تھی وو غم سے داغ تمام

جگنی جگنو سے جو چمکتے تھے — اشک خوناب ہو ٹپکتے تھے

تھے کڑے ہاتھ کے جو ہیرا نما — پیس کر کھا گئے تھے وہ ہیرا

جوڑی اک اور تھی جو شیر دہاں — دستِ شیرِ اجل سے تھی نالاں

کرکے پاؤں کی انگلیوں کو یاد — بچھوے کرتے تھے دم بہ دم فریاد

تس پہ انوٹ کا تھا جو حال زبوں
ہوگیا تھا بہ رنگ حلقہ نگوں

گل ماتم کھلے تھے شاخ بہ شاخ
مُرکیوں کے ہوئے تھے دل سوراخ

نہ وہ توڑے رہے تھے نہ وہ چھڑے
روتے تھے لگ بہم گلے سے کڑے

جیسے کنگن گیا تھا ہاتھ سے چھوٹ
موتیوں کی پڑی تھی مالا ٹوٹ

وہ جو پاؤں کی اس کے تھی خلخال
سوکھ کر ہوگئی تھی رشکِ ہلال

اس سوا اور بھی جو تھا زیور
میری حد شمار سے باہر

اس کے ماتم میں گرم شیون تھا
سینہ ہر ایک کا شکل روزن تھا

زر و زیور کو جب ہوا یہ غم
اور کھنچا دور نازنیں ماتم

گھر میں اس جوہری کے دھوم پڑی
تھی جو غم کی گھٹا وہ جھوم پڑی

پہنچی گھر گھر برادری میں خبر
کہ گئی آج اس کی حور و مہر

تھیں زنیں قوم کی جو پیر و جوان
آئیں سر پیٹتی بہ آہ و فغاں

سر سے چادر اُتار کر روئیں
ہو کھڑی ڈاڑھیں مار کر روئیں

سن کے مردوں نے بھی سر اپنا دُھنا
جب خبرگو سے حرف کال سنا

تھے جو واں خویش و قوم یک دیگر
چلے کپڑے پہن کے اس کے گھر

بڑے چھوٹے بہ رسم قوم ہنود
آ کے دروازے پر ہوئے موجود

اتنے میں ارتھی کا جو تھا سامان
لے کلاوے سے تا بہ بیڑۂ پان

ہوا حاضر وہیں بہ یک باری
کی اٹھانے کی اس کی تیاری

ڈال ارتھی پہ اس پری رو کو
سروِ گل رو بتِ سمن بو کو

لے چلے کر کے جب کہ اطلس پوش
یک دگر خویش و قوم دوش بدوش

نالہ فریاد دل خراشی تھی
آنسوؤں سے گلاب پاشی تھی

دم بہ دم رام رام ست کی صدا
جاتی تھی تا بہ گنبد خضرا

قدم اس دھج سے ان کے پڑتے تھے
گویا بخت اور اجل سے لڑتے تھے

اس کی ارتھی کو چار دن پڑاں
لیے جاتے تھے مثل تخت رواں

پہنچے جمنا سے جب کہ ہوکر پار
بیچ مرگھٹ کے با دل افگار

اس دم اس نازنیں کو نہلا کر
غوطے پانی میں کتنے دلوا کر

ڈھیر میں لکڑیوں کے رکھوایا
آگ دی اور اُن کو بھڑکایا

شعلہ اک گرم آسماں کو گیا
نہیں معلوم وہ کہاں کو گیا

بعد شعلے کے اک دھواں سا اٹھا
اس زمیں سے وہ آسماں سا اٹھا

کیا کہوں میں غرض وہ رشک قمر
ہوگئی جل کے ووہیں خاکستر

آگ نے جو اسے جلایا تھا
اپنے تئیں شعلہ اک بنایا تھا

یعنی حسن اس کا آگ میں جو جلا
آگ کا شعلہ تھا ید بیضا

آگ کی لو جو اس کی لٹ کو گئی
وہ بدن سے لپٹ کے اس کے جلی

گرچہ خود شمع تھی وہ جانانہ
جل گئی لیک مثل پروانہ

شوہر اس کا کُمہار کرما کر
یک دگر جب نہا کے آیا گھر

آکے بیٹھا خمش بہ شکل حزیں
تھا اسی کا خیال اس کے تئیں

تھے جو اعیان وہ تسلّی کر
گئے سب اٹھ کے اپنے اپنے گھر

شب نہ گزری کہ دل ادھر جو کھنچا
جاکے بستر پہ وہ مریض گرا

بارے جوں جوں بہ تعزیت داری
صرف جو تھا بہ حال بیماری

تھی جو اس کی رسوم ماتم کی
بارہ دن تک وو رسم پیہم کی

تیرھواں دن ہوا جوہیں یکبار
آئی پھر ووہیں مرگ عاشق زار

کیا کہوں اس جواں کا میں احوال
عشق تھا بس کہ اس کے نت دنبال

جوہیں ماتم سے ٹک فراغ ہوا
سینہ فرقت سے داغ داغ ہوا

سو بھی فرقت سو کس مصیبت کی
ہو نہ امید جس سے وصلت کی

جی رُکا جان پر بلا آئی
جی میں مرنے کی اپنے ٹھہرائی

اپنے یاروں سے یوں کہا جاکر
اک غریبی سے ہو کے دست بہ سر

کہ میں ہوتا ہوں تم سے رخصت آج
تھے مرے دل پہ داغ حسرت آج

اپنے معشوق پاس جاتا ہوں
تم سے یہ بات کہہ سناتا ہوں

مجھ کو اب زیست خوش نہیں آتی
نظر آتی ہے جان ہی جاتی

ہے خبر شرط کہہ چلا تم سے
کہیو جو پوچھے ماجرا تم سے

کہہ کے یہ بات اپنے گھر کو گیا
تھا جدھر روے دل اُدھر کو گیا

آ کے اس خواب گہ میں با دل زار
تان چادر کو سو رہا یک بار

کھنچ گئی روح جانب محبوب
ہو گئے ایک طالب و مطلوب

نہ جدائی کا کچھ رہا دھڑکا
ہوگیا صبح وصل کا تڑکا

اس میں سوتے ہوئے جو دیر ہوئی
بولی ماں یوں اسے جگادے کوئی

اک نے جاکر کے جو میں منہ کھولا
نہ ہلے لب نہ منہ سے کچھ بولا

مردنی رخ پہ آشکار ہوئی
دوڑیو دوڑیو پکار ہوئی

اک تو ماتم سرا وو خود گھر تھا
ماتم ایک اور بھی ہوا اس جا

دیکھ اس جوہری کا مردہ جمال
ہوگیا سب جواہروں کا یہ حال

نیلم اس غم سے داغ درد ہوا
رنگ پکھراج کا بھی زرد ہو

ہوکے ماتم میں اس کے اشک فشاں
خاک پر لوٹا گوہر غلطاں

سرخ یاقوت تھے سو خون ہوئے
موتی سب اشک آب گون ہوئے

تھا جو وہ تانبڑا بہ حال تباہ
ہوگیا رنگِ سرخ اس کا سیاہ

رنگ لہسنیے کا سیاہ ہوا
کھا کے فیروزہ زہر غم کو موا

سر پہ اپنے صدف میں ہو غمناک
ڈالی دُر یتیم نے بھی خاک

کلفت غم کی جو تھی کمیدک پر
جلوہ کرتا تھا وہ بہ رنگ دگر

اشک مونگوں کے کچھ نہ تھے گلگوں
بعضے چھرے کا بھی جگر تھا خون

جس طرح اشک حرف کے ہمراہ
خون کی اک پٹھ نمود ہو ناگاہ

روئیں سر جوڑ موتیوں کی لڑیں
عقد اشکوں کے ٹوٹ ٹوٹ پڑیں

تھا جو الماس کا بڑا دانہ
آپ وہ زہر کا تھا پیمانہ

کہ اسے پی کے ووھیں مر جاے
قصہ کوتاہ کرے گزر جائے

لعل لوٹیں تھے خوں میں جوں بسمل
چنیّوں کے چھدے پڑے تھے دل

یشم کی تھی جو واں کوئی تختی
بن گئی تھی وہ لوحِ بد بختی

سن کے یہ ماجرائے جاں کاھی
رنگ یاقوت زرد تھا کاھی

تھی ترازو جو وزن گوہر کی
چھاتی کر لی تھی اس نے پتھر کی

لیکن اس گل کا جب یہ حال سنا — سوکھ کر غم سے ہو گئی کانٹا
سب جواہر کو تھا جو اس کا غم — بن گئے تھے وہ صورت ماتم
پتھروں کا ہو جب یہ حال تباہ — آدمی کیوں کے ہو نہ جامہ سیاہ
الغرض جب خبر یہ سب کو ہوئی — کہ موا وہ بھی جس کی جورو موئی
سن کے اس واقعے کو پیر و جواں — شکل تصویر رہ گئے حیراں
بڑے چھوٹے سب اس میں گھبرائے — تھے جو نزدیک ووہیں گھر آئے
کوئی بولا کہ زہر کھا کے موا — کوئی بولا کہ یہ تو قہر ہوا
سن کے اس ماجرے کو آخرکار — ہوگیا بند جوہری بازار
جوہری سارے ہوکے خستہ جگر — تیرہویں دن پھر آئے اس کے گھر
گھر سے مردے کو اس کے اٹھوا کر — ارتھی کو ہاتھوں ہاتھ لے جا کر
اسی صورت بہ شکل زودا زود — جاکے مرگھٹ کے بیچ کرکے فرود
اس کو بھی آگ کے حوالے کیا — ہر بن استخواں نے نالہ کیا
آگ میں جس طرح جلے ہے شمع — جل گیا یہ بھی واں میان جمع
سچ ہے واں عشق کی ہے وہ آتش — جس کا شعلہ ہے تند او سرکش
ذرہ اس کا پڑے جو خارا پر — جل کے ہوجائے وہ بھی خاکستر
آئے پھر گھر کو خویش و بیگانہ — جل گئے تھے جو شمع و پروانہ
قصہ یہ شہر میں ہوا مشہور — آیا سب کی زباں پہ یہ مذکور
بات مجھ تک بھی یہ جو ہیں پہنچی — حد کُڑھا اس گھڑی تو میرا جی
ایک انجام عشق تھا جو یہی — اس کی ہمت پہ آفریں میں کہی
عاشقی میں یہ تازہ تھا مضموں — میں نے اس کے تئیں کیا موزوں
کوئی عاشق جو اس کو دیکھے گا — دیوے گا طبع مصحفی کو دعا
کہ عجب قصہ مختصر ہے یہ — لعل بل پارۂ جگر ہے یہ

ہوئی یہ مثنوی جو مجھ سے تمام
جذبۂ عشق میں نے رکھا نام

"رنگیلا شاعر"

ایک مختصر کھیل —— ایک ایکٹ اور تین مناظر میں

از

ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم۔اے

لکچرار انگریزی (سابق لکچرار اردو) سٹی کالج حیدرآباد دکن

کردار

'ولی'۔	اورنگ آباد کا سورگ باشی شاعر۔
ابو المعالی۔	گجرات کا سیدزادہ۔ 'ولی' کا دوست۔
امرت لال۔	ایک خوش گلو۔ نوجوان۔ 'ولی' کا شاگرد۔
چھبیلی۔	ایک رنگین مزاج عورت۔ شاعرہ۔
شانتی۔	ایک گجراتی پجارن۔ 'ولی' کی من میت۔
نرملا۔	اس کی ایک سہیلی۔
شیخ پیراں۔	'ولی' کا ایک منہ لگا اور راز دار ملازم۔
حشمت بی۔	'ولی' کی ماما۔
گوبندلال۔	ایک ملازم چھوکرا۔

قصہ

اس ڈرامے کا « پلاٹ » محض خیالی نہیں بلکہ (بڑی حد تک) شاعر کی زندگی اور اس کے کلام کی داخلی شہادت پر مبنی ہے۔ جابجا ایسے اشعار پیش کیے گئے ہیں جو شاعر کے سحر حلال کے آئینہ‌دار ہیں۔ البتہ دو کرداروں (چھبیلی اور شانتی) کے منظوم مکالمے میرے موزوں کردہ ہیں۔ زبان بھی « ٹھیٹھ ولایتی » یعنی ولی کے عہد کی زبان ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ (بصورت تمثیل) اس ڈرامے کے مختلف کرداروں کی زبان اور لہجے میں « مدراسی لٹک » پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ مانا کہ مدراس دکن سے خارج نہیں۔ لیکن جو متانت قدیم حیدرآبادی لہجے میں ہے وہ مدراسی لہجے میں نہیں۔

پہلا سین

('ولی' کا گھر)

منظر:—

[ایک مفلس شاعر کا مکان ، لیکن صاف ستھرا اور ہر چیز سلیقے سے جمی جمائی۔ دالان میں ایک تخت اور اس پر ایک اجلی چاندنی بچھی ہوئی - نام کو کہیں سلوٹ نہیں - کونوں پر میر فرش رکھے ہوئے ، تخت کے اوپر دیوار کی سمت ایک گاؤ تکیہ لگا ہوا - تخت کے سامنے دائیں بائیں دو مونڈھے رکھے ہوئے -

ایک وجیہ آدمی (کوئی ۳۵ سال کا سن) تکیے کو ٹیکا دیے بیٹھا ہے - برابر سے ایک مرادابادی پاندان دھرا ہے - منہ سے حقے کی سٹک لگی ہوئی ہے - وقفے وقفے سے مشک بو تمباکو کا دھواں گھر کی فضا کو معطر کر رہا ہے -

شاعر کے جسم پر ہلکے تنزیب کا ایک کرتہ ہے اور اس پر ہلکے نیلے یا فیروزی رنگ کا ایک چغہ ہے جس کے کناروں پر خوش وضع بیل ٹکی ہوئی ہے - سر پر مرزا غالب کی سی ایک طرحدار کلاہ پاپاخ ، مگر نہ اتنی اونچی - صورت شباہت بھی مرزا غالب سے ملتی جلتی ہوئی ، کچھ اسی طرح آزاد مشرب ، شگفتہ دل اور رنگین مزاج بھی -

دیوار پر جابجا حافظ و خیام کے اشعار کے قطعات اور خود اپنے بعض اشعار بھی قطب شاہی تاجداروں کے عہد کے "خط نسخ" میں لکھے ہوئے ، سلیقے سے آویزاں ہیں -]

ولی - [پکارتا ہے] پیراں ، او شیخ پیراں !!

پیراں - [اندر سے] آیا استاد،........ابھیچ آیا (ابھی آیا) - ہاناں (ہاتھ) بھرکو ہیں (کام میں لگے ہیں) -

ولی - کیا باوا ، یو (یہ) خالی پیلی کب لگ (کب تک) بیٹھوں - ذرہ لے کے آنا پرتگالی خانم کوں (کو) -

پیراں - کیا استاد !! ... ارے ، دونوں وقتاں (وقت) ملتیں نا (ملتے ھیں نہ) ؟ ذرہ صبوری کرو -

ولی - ارے ، کیا فضولی باتاں (باتیں) کرتا رے چھوکرے - میں کیا نماز پڑنے (پڑھنے) بیٹھوں (بیٹھا ھوں) ؟ پینے کوں (کو) مغرب کیا ، عشا کیا ؟

پیراں - اب آپس کی (آپ کی) مرضی -

ولی - لا ، باوا.....لا - نہیں تو یو (یہ) گھڑی قضا ھو جائینگی - کئیں (کہیں) انے (وہ) سید کا بچہ آگیا تو پھر ایک گھونٹ بھی نہیں پینے دینگا (دیگا) - [پیراں جاتا ھے]

ولی - [خود سے] انتظاری کرتے کرتے ناک میں دم ھوگیا - پیئوں نکو (نہیں) تو یو (یہ) غم کا پہاڑ کٹنا کیسا ؟ اب انھوں کی مرضی ، جب چاھے آن دیو (آنے دو) - جب لگ (جب تک) یو پری خانم سوں (سے) شغل کرتوں (کرتا ھوں).....ارے ، شیخ پیراں ، کِتّی (کتنی) دیر باوا ؟ [شیخ پیراں داخل ھوتا ھے]

پیراں - کیا استاد ، اپس کی جلدی کوں بھی کیا بولوں .... وہ ایک ھیچ (ھی) آبخورہ تھا سو وہ بھی جواب دیا ... اب ؟

ولی - آبخورہ کیسا ؟ میرے گھر میں آبخورہ کائیکو (کاھے کو) ؟....میں نمازی کیا ؟

پیراں - کیا استاد ، آپ خدا رسول کے سنگ (ساتھ) بھی ٹھٹول کرنا چھوڑتے نہیں — ارے ، آپس کے پرتگالی خانم رھتے سو ، وہ آبخورہ !!

ولی - تو بھی بڑا دِوانہ (دیوانہ) رے ، باوا - ارے ، وہ آبخورہ کیا ؟

شیخ پیراں - وہ آبخورہ نہیں تو پھر کیا ؟

ولی - یو (یہ) تخفیف تصدیعہ بس !! ارے باوا ، تو خود نماز پڑتا (پڑھتا) سو پڑتا - منجے (مجھے) بھی نمازی بناتا کیا ؟ نکو (نہیں) باوا ، یو تیرے ڈھنگاں (ڈھنگ) تیرے کوچ (تجھی کو) مبارک !

شیخ پیراں - کیا ھوندی (اوندھی) سیدی (سیدھی) باتاں (باتیں) کی، استاد ! ....میری عقل کام نہیں کرتی....صاف بولو، نا....اپس کا (اپنا) مافی‌الضمیر -

ولی - ارے باو ، وہ آبخورہ نہیں نا ، رے !

شیخ پیراں - پھر کیا اُجڑا ، سو ؟

ولی - ارے ، باوا اس کوں (کو) آبخورہ نہیں بولتے....جام بولتیں (بولتے ھیں) !

شیخ پیراں - کیا ھے کی استاد...جام کی آم کی...اب بولو ، نا....کے میں (کاھے میں) گزرانوں ؟

ولی - ارے ، نیک بَخت، کیا گھر میں کٹھورا (کٹورا) بھی نہیں اُجڑیا (اُجڑا) ؟ لا اِسی مَیں (میں) زھر مار کر لیتاؤں (لیتا ھوں) - لا ، بیگی (جلدی) ! (دستک کی آواز) اےلیو (اےلو) ارے باوا ، تیری کٹ کُھچّتی میں کیا نا وقت !!....دیکھ کون ھے....چھبیلی آئی کیا ؟ (پیراں جاتا ھے)

ولی - (خود سے) نِشا (نشہ) نہیں سو، وہ بھی جینا ؟ آج رین (رات) کیسی کٹتی کی، دیکھو - اُنے (وہ) چھیل چھبیلی — مَیں سُکّا (سوکھا) مُکّا (گونگا) ولی !! (پیراں داخل ھوتا ھے)

پیراں - امرت‌لال آیائے (آیا ھے) -

ولی - چل ، بلالے ، باوا - میں اس سے پردہ کرتوں (کرتا ھوں) کیا ؟ (امرت داخل ھوتا ھے - پیچھے پیچھے شیخ پیراں)

امرت - استاد کوں آداب -

ولی - جیو....جُگ جُگ جیو !! بیٹھ بیٹا بیٹھ - (مونڈھے پر بیٹھ جاتا ھے) کچھ سنا باوا ، اللہ بھی کیسا رزاق ھے !!

امرت - کیا بات استاد...آج آن‌داتا کیسے یاد آگئے ؟

ولی - کیوں باوا ، اب لگ (اب تک) برائے بدنام کرتے تھے سو کرتے تھے - اب شاگرداں بھی چھیڑخانیاں (چھیڑ چھاڑ) شروع کیے کیا ؟ کیا شرابی بندہ خدا کا بندہ نہیں ؟

امرت ۔ استاد خفا کائے کو (کاھے کو) ھوتیں (ھوتے ھیں) میں چپکا چپی (یونہی) بولا تھا ۔ مگر استاد، آج کیا مغرب کا وقت ٹل گیا ؟

ولی ۔ کیا بولوں باوا، اب جان دیو نا (جانے بھی دو) وہ مذکوراں (ذکر اذکار)۔ ارے، شراب سوں (سے) پیراں محروم کری (کرھی) دیا تھا، اب تو اپنے گانے سوں محروم کرینگا (کریگا) کیا ؟ چل، سنا۔ مُنہ ستی (سے) پینے کا وقت ٹل گیا تو کیا کاناں (کانوں) ھَور (اور) انکھاں (آنکھوں) سے پینے کی گھڑی بھی ٹل گئی ؟

امرت ۔ کیا سناؤں، استاد؟

ولی ۔ کچھ بھی سنا، بیٹا....جو تیرے من میں آئے ۔

امرت ۔ استاد پرسوں کھیم‌داس پر غزل لکھے تھے سو سناؤں ؟

ولی ۔ ارے تو اِتّا (اتنا) بیگی (جلدی) یاد کر لیا کیا ؟

امرت ۔ ھَو، استاد۔ اپس کی (آپ کی) دُعا سوں (سے) یاد کرلیا۔

ولی ۔ اچھو، (اچھا) سنا دے باوا، [شیخ پیراں سے] ھَور (اور) شیخ پیراں تو ذرّہ بھار (باھر) بیٹھ۔ چھبیلی بیگم کی سواری آئی تو بیگی آکے میرے سوں بول۔ (امرت سے) امرت!، اب گا باوا۔ [پیراں چلا جاتا ھے]

امرت ۔ [کھڑے ھوکر گاتا ھے]۔

ھے بس کہ آب و رنگِ ھوا کھیم‌داس میں — آتا نہیں کِسوں کے خیال و قیاس میں
ھے اس کے مکھ سُوں جلوہ‌نما موجِ آفتاب — موتی کے مثل گرچہ ھے سادہ لباس میں
بیراگیوں کے پنتھ میں آکر وہ مہ‌جبیں — بیراگ کوں اٹھا کے چڑھایا اکاس میں
لگتا ھے اس گروہ میں وہ سرو نازنیں — گویا گُلِ گلاب کیا جلوہ گھاس میں
آوے فلک سُوں زھرہ اتر، گر وہ مہ‌جبیں — اک تان گاوے «رام‌کلی» یا «بھیاس» میں
جاتا ھوں باغ یاد میں اس چشم کی 'ولی' — شاید کہ بوئے اس کی ھو نرگس کے باس میں

ولی ۔ امرت، جیو....جُگ جُگ جیو ۔ تیری ایک ایک تان سوں یو (یہ) دل بندھ گیا:—

لعل تیرے بھرے ھیں امرت سُوں — نام تیرا بجا ھے «امرت‌لال»

امرت۔ استاد، اپس کی دعا ہے۔ [پیراں داخل ہوتا ہے]

پیراں۔ چھبیلی بیگم کی سواری تو براجمان ہوگئی……اب کیا کروں؟

ولی۔ [ہکّا بکّا ہوکر کھڑا ہو جاتا ہے] کیوں؟۔ کیا ہوا؟

پیراں۔ سواری دروازے پر لگی ہے۔ مگر……مگر، حشمت بی گئی بزار (بازار) بھاجی ترکاری لانے۔ وہ ینٹّا (لونڈا) گوبندلال بھی آج آیا نہیں……چدّر (چادر) کون پکڑنا؟

ولی۔ ارے باوا، چھبیلی کوں (کو) بول ایسا بھی پردہ کیا؟ ارے استاد سوں پردہ نہیں تو شاگرداں سوں کیسا پردہ؟ جا، بول میری طرف سُوں ایسائی (ایسا ہی)۔ [پیراں جاتا ہے]

ولی۔ [امرت سے] بیٹا، تو بھی وہ پچھّے کے دروازے سوں نِکس (نکل) جا۔ عورت کی ذات بڑی بدگمان۔ ایک دفع بیچارے مرزا کوں دیکھ لی تھی۔ تو کیا کیا گماناں (گمان) کی تھی۔ نکو، (نہیں) باوا……تو جا۔ کائے کو (کاھیکو) بیٹھے بٹھائے نہیں سو ایک حرارت۔

امرت۔ اچھا، استاد! [پچھلے دروازے سے چلا جاتا ہے] [چھبیلی داخل ہوتی ہے]۔

چھبیلی۔ ولی صاب (صاحب) کیسا ہے اپس کا مزاج؟

ولی۔ مزاج پوچھتے سو کیا۔ کب سُوں انتظاری میں ہوں:—

کس در کا ہوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پہ بھل* بچھڑاٹx ہے
اک باٹ† گئے ہوں گے سجن، یاں جیوؑ‡ بارہ باٹ ہے

چھبیلی۔ [بیٹھ کر] اھو!! اب اپس کا دماغ بھی تانا شاہی ہوگیا؟

ولی۔ [بیٹھے ہوئے] کیوں نہیں ہوں گا……انھوں (وہ) عالمگیر کے پنجے منیں (میں) پھنس کر جیتے جیو قید ہوے۔ ہَور (اور) میں تُمنا کی لٹاں (لٹوں) میں پڑکر ڈوبکیاں لے رہوں:—

مجھ گھٹ میں اے نکھر گھٹ؎ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا
دیکھے یوں لٹ گیا دل، تیری زلف کا لٹکا

* بہت x مصیبت † راستہ ‡ جان ؎ مرجائی

چھبیلی ۔ اچھو (اچھا) اب بہت بکواس ہوئی......کچھ شعراں (اشعار) سناؤ ۔ مگر ایس بیتی ہونا ۔

ولی ۔ یَو (یہ ۔ اس) شرط پر کہ تم بھی سُر میں سر ملانا ۔

چھبیلی ۔ منظور !

ولی ۔ اچھو، لیو سُنو........[گاتے ہوئے]

کدھی میری طرف لالن! تم آتے نہیں سو کیا باعث
چھبیلا مکھ ایس کا ٹک دکھاتے نہیں سو کیا باعث ؟

چھبیلی ۔ ولی تو چھیڑخوانیاں* کرکے یاں مرتا سو ہیچ‡ باعث
نگوڑے تو ایس گھردار نہیں رکھتا سو ہیچ باعث ؟

ولی ۔ جدائی کے پھنسا ہوں دام میں یارو کہوں کس سوں
کہ مجھ اس دکھ کے پھاندے سے چھوڑاتے نہیں سو کیاباعث ؟

چھبیلی ۔ جدائی کائے کی ؟ ہَور کس کی ؟ تو سچ مچ دوانہ ہے
ترس میرے کوں ذرّہ تجھ پر نہیں آتا سو ہیچ باعث ؟

ولی ۔ کیا سب زندگانی کوں فدا تیری محبت میں
اَچھو باتاں ایس دل کی سناتے نہیں سو کیا باعث ؟

چھبیلی ۔ کیا سب زندگانی کا خرابا بوالفضولی میں
تو اک سید معالی پر بھی ہے مرتا سو ہیچ باعث ؟

ولی ۔ ہوا ہے دل مرا مخمور سے غم سوں اے ساجن
ایس کی نین سوں پانی پلاتے نہیں سو کیا باعث !

چھبیلی ۔ مرے مخمور آنکھاں کی یہ دارو تیرے کوں کائے کو ؟
شراب پُرتگالی روز تو پیتا سو ہیچ باعث ؟

ولی ۔ ولی یو بات کا افسوس ہے مجھ دل منیں ساجن
کہ میری بات کوں خاطر میں لاتے نہیں سو کیا باعث ؟

---

* چھیڑچھاڑ ‡ یہی

چھبیلی - نگھر گھٹ! ٹھور تیرا کیئں نہ باتاں کا ٹھکانا کچھ
تری باتاں کوں میں خاطر میں نہیں لاتا سو ہیچ باعث ؟

[پیراں داخل ہوتا ہے]

پیراں - استاد، سیدابوالمعالی کی پینس دروازے پر ہے -

ولی - [بوکھلا کر] بیٹا تو سید کو باتاں میں ذرّی دیر لگا... هور چھبیلی! تم ذرہ -

چھبیلی - بس بس، اب لگ (تک) بہت مردمی دکھائے!! میں کدھی (کبھی) نہیں جاؤں گی - دیستی (دیکھتی) ہوں وہ سید کا بچہ کیسا راوت رستم ہے - بس -

ولی - [اٹھکر] نہیں چھبیلی، تُمنا کوں نہیں معلوم - دیکھو... میری لاج -

چھبیلی - [برھمی میں اٹھتے ہوئے] چل اورنگ آبادی موئے! یہیچ (یہی) تھا تو عالمگیر بادشاہ کی نگری چھوڑ کر گجرات میں مرنے کوں (کو) کائے کو آیا؟

ولی - چھبیلی!...تمنا کوں نہیں معلوم چھبیلی - چلو بیگی کرو - اودھر کے دروازے سوں نِکس (نکل) جاؤ—چلو بیگی!! [چھبیلی جاتی ہے-ابوالمعالی داخل ہوتا ہے]

معالی - آداب ہے استاد کوں! کیسا ہے مزاج؟ مکھڑے پر یو ہوائیاں اُڑ رہیں (رہی ہیں) کائے کو؟

ولی - کچھ نہیں سید - تمھاری انتظاری میں جیو بارہ باٹ تھا - آخر کوں بیٹھے بیٹھے مراقبے منیں (میں) دو غزلاں لکھ ڈالا -

معالی - سناؤ - استاد، سناؤ -

ولی - تم ذرہ آرامی سوں مسند کوں پیٹھ لگا کر براجمان ہو جاؤ - میں ایدھر مونڈھے پر بیٹھ جاتاؤں (جاتا ہوں) -

معالی - نہیں استاد، ایسا کیسا؟

ولی - نہیں باوا، تو سیّد ہور (اور) پھر میرا من موھن!

معالی - یو باتاں سُوں استاد—

ولی - تو پاک باش برادر، مدار از کس باک　زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

معالی - اچھا استاد، اب سناؤ -

ولی - ایک غزل تیرے سراپا پہ لکھا ہوں -

معالی - اچھو، سناؤ -

ولی - (تحت اللفظ پڑھتے ہوئے)

ترا قد دیکھ کر سید معالی ہوئی روشن دلاں کی فکر عالی

ترے پانواں کی خوبی پر نظر کر ہوئے ہیں گل رخاں جیوں نقش قالی

شفق لوہو میں ڈوبا سر سوں پگ لگ تو باندھا سر پہ جب چیرا گلالی

معالی - (بناتے ہوئے) چیرا اگالی؟ واہ استاد واہ.... یو تو میرے چیرے کی توہین ہے - لال چیرے کوں پان کے اگال سوں تشبیہ دے کر ساری تشبیہ کوں بدمزہ ہَور جھوٹی کر دیے!

ولی - نہیں باوا، اگالی نہیں.... گلالی' یعنی گلنار سرلیکا (کی طرح) سرخ -

معالی - اچھو، یَو بات؟ خیر، خیر، بخشو آگے پڑھو!

ولی - باوا، میں تیری نظراں میں بھکاری کیا؟

معالی - نہیں استاد.... ایس جگت استاد، نا؟ ایسی گستاخی کروں گا؟

ولی - تو بڑا گرو گھنٹال رے باوا - اچھا سن -

ہوا تیرے خیالاں سوں سیہ مت مرا دل مثل فانوسِ خیالی

معالی - سب بے خیالی کے باتاں.... ارے استاد، میں دو بچے والا، نا؟

ولی - ہَو (ہاں) میں بھی تیرا بچہ!! اب سنتا، کیا بیاض بند کروں؟

معالی - نہیں استاد، سناؤ سناؤ -

ولی - تری انکھیاں دسیں مجھ کوں سیہ مست پیا گویا شراب پُرتگالی

گیا ہے خوف سوں اُڑ، لعل کا رنگ ترے یاقوت لب کی دیکھ لالی

معالی - (شوخی سے) میرے لب کی لالی کائے کو (کا ہے کو)؟ امرت لال کے لب کی

ولی - (جھینپ کر دوسرا شعر پڑھنے لگتا ہے)

خیال اس خال کا از بس ہے دلچسپ نہیں دنیا میں یک لب اس سوں خالی

معالی - استاد! «اس سوں خالی» کی جاگہ (جگہ) «اس سوں حالی» ہوتا تو بہت اچھا تھا -

ولی - هَو (هاں) باوا تو جیتا میں هارا - اب تین شعراں هور سن لے - کائے کو مغز کھپاتا -

معالی - اچھا ' یو شرط پر که وہ دوجی (دوسری) غزل سنا کر بھیجا نہیں چاٹنا -

ولی - اچھا باوا ' اچھا - (پڑھنے لگتا ھے)

تری انکھیاں میں ڈورے دیکھ کر سرخ بنائی خلق نے ریشم کی جالی
ھوئے معزول خوباں جگ کے جب سوں ھوا تو حسن کے کشور کا والی
ولی تب سوں ھوا ھم کارِ فرھاد سنا جب سوں تری شیریں مقالی

معالی - استاد ' میرے حُسن کی بھی کیسی کرامت ھے !

ولی - وہ کیسا ' باوا ؟

معالی - اس کے طفیل میں تمنا کوں جگت استادی ھور (اور) مہا شاعری مل گئی !! (تخت سے اتر کر دوسرے مونڈھے پر بیٹھ جاتا ھے)

ولی - هَور تمنا کوں زندۂ جاوید کیتا (کیا) سو کچھ بھی نہیں ؟

معالی - ٹھیک استاد — زندہ جاویدی هَور بدنامگی (بدنامی) ایک ھیچ (ھی) بات !!

ولی - بس باوا ' اب تخفیف تصدیعہ !!

معالی - لیو (لو) چلا !! (جانے لگتا ھے)

ولی - ارے میرا یو (یہ) مطلب نہیں تھا ' بچے -

معالی - بس بس..... وھی تخفیف تصدیعہ ' !!!

ولی - ارے سن تو باوا !

معالی - خدا حافظ - (چلا جاتا ھے)

ولی - (کچھ دور معالی کے پیچھے جاتے ھوئے) معالی !.....معالی !.....سن تو — (خود سے) چلا ئی (ھی) گیا.....سب ایک ایک کرکے چل دئے ! (اداس ھوکر) ع
ولی سنگھم بنا ایسوں کوں (کو) پھر آدھار کرنا کیا '

—: پردہ :—

سین دوسر

(بھوانی کا مندر)

[گھاٹ سے کچھ دور ایک اونچا سا ٹیلہ ہے جس پر ایک بڑا سا پیپل سایہ کیے ہوئے ہے۔ اس پوتر درخت کی آنند بھری چھانوں میں بھوانی کا ایک چھوٹا سا مندر ہے۔

گجرات کی سہانی شام کچھ اپنا سایہ ڈال چکی ہے۔ ایک کمسن گجراتی ناری (۱۷ ، ۱۸ سال کا سن) بائیں ہاتھ میں پیتل کی تھالی لیے، اینڈتی اور بل کھاتی ہوئی مندر کی طرف آ رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جھکتی اور آٹے اور شکر کے چھڑکاؤ سے چیونٹوں کا دل بھی موہتی جاتی ہے۔

اس وقت مندر میں کوئی نہیں۔ بالکل سناٹا ہے اور چاروں طرف ایک سکوت کا سنسار چھایا ہے۔ لڑکی مندر میں داخل ہوتی ہے اور پہلے بھوانی‌جی کے گرد چکر لگا کر گھنٹہ بجاتی ہے۔ پھر پھولوں اور پوجا کی تھالی چڑھا کر سیوا اور سمرن میں لگ جاتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد چونک کر اور ایک گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح چاروں طرف نگاہیں دوڑاتی ہوئی، بھوانی مہارانی سے اپنے من کا بھید بتاتی ہے]۔

لڑکی۔ مہارانی، تمھیں کچھ اس اندھی چاہت کے دکھ سیتی (سے) مجھے سکھی بناؤ......مائی کیا کروں، میں اپنا من دے چکی ہوں......میری، اور ایک ترک کی پریم کا حال سن کر یو جات (ذات) والے کیسا وسواس کریں گے......اور اس گریب (غریب) کی کیسی درگت بنائیں گے......مائی‌جی نہ بولوگی؟ ......کچھ بولو!! [بھوانی کے چرنوں پر سر رکھ دیتی ہے]۔

[ولی داخل ہوتا ہے]

ولی ۔ شانتی !! یَو (یہ) پاپی کی طرف سوں بھی بھوانی‌مائی کوں پرنام !!!

شانتی ۔ [مڑ کر] کون ؟ میرا ولی !!!

ولی ۔ ہاں سجنی ، تمھارا گُنی ولی !! [گاتے ہوئے] ع

اے بت کی پجن ھاری، یو بت کوں پجانی جا !!

شانتی ۔ ولی ! سچ مچ بڑا پاپ کرتے ہو ۔ پنگھٹ ہَور (اور) اشنان گھاٹ پر شیام سار (شیام کی طرح) چھیڑا کرتے تھے ۔ اب مندر پر بھی تُمنا کا پھیرا سروع (شروع) ھوا ؟ ۔

ولی ۔ کیوں نہیں شانتی ؟ ولی ھوں نا ؟ ۔ ہَور پھر شیام ولی !! ھے ٹھیک ؟

شانتی ۔ ٹھیک ھے ۔ پر مِنجھے (مجھے) وسواس ھوتا ھے تم اپنے سنگ مِنجھے بھی اچھوت کروگے ۔

ولی ۔ ٹھیک ھے شانتی ، میں مسجد کا اچھوت ھوں ۔ اِس ولی کے پریم میں سجنی ! تُمنا کوں بھی مندر کی اچھوت بننا پڑیں گا (پڑے‌گا) ۔

شانتی ۔ یَو گھردار اور کٹم کبیرے (عزیز و اقارب) کوں تج کر کہاں رھیں گے ؟ ۔

ولی ۔ یَو اندھیر نگری اور گندے دھنداں (دھندوں) کوں چھوڑ کر کِسو (کسی) ہَور جا گہ (جگہ) دھونی رمائیں‌گے ۔ ع

کہ ھے عشاق کا مسکن کدھی (کبھی) صحرا کدھی پربت

شانتی ۔ [کچھ دیر گم صم اور پھر آب‌دیدہ ھوکر] دھونی رمائیں گے......کدھی صحرا......کدھی پربت ؟ ۔

ولی ۔ ھائیں ؟......سجنی یَو انجھواں (آنسو) کیسے ؟ شانتی ، تُمنا کوں مُنجھ سوں (مجھ سے) پریم نہیں کیا ؟ ۔ موھنی شانتی روؤ نکو !......[چھیڑ کر ھنسانے کی کوشش کرتے ہوئے] وہ کل والا دوھا تو یاد کرو جو تم نے باڑا گھاٹ پر امرت بھری آواز سوں گائے تھے ۔ ......ھاں وہ ۔ [گاتے ہوئے]

موھے پن‌گھٹ پر نندلال گھیر لینو رے

موری نـاجک کلیاں مرور لینو رے

(نازک)

شانتی - (محبوبانہ برهمی کے ساتھ) نہیں...میں نہیں گاتی -

ولی - کیوں ' رِسائے (خفا) گئیں ؟

شانتی - (شرارت سے) هوں !!

ولی - (گاتے هوئے)

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں ' نہیں دل هے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ' ٹک بھاؤ بتاتی جا

شانتی - (بے ساختگی کے عالم میں پیروں کو جنبش دےکر بچھوؤں سے ایک لطیف نغمہ پیدا کرتی هوئی) ع

« توهے (تجھے) ناهیں شرم رے....توهے ناهیں شرم رے !! »

ولی - (اس معشوقانہ عشوے سے بیباک هوکر ' نقل کرتے هوئے)

اس رین اندھیری میں مت بھول پروں تس سوں
ٹک پانوں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑیا[1] هے تری لٹ نے
یو کام دھرم کا هے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

شانتی - (مسکرا کر) دھرم کاج ؟ جھٹا (جھوٹا) کہیں کا....بڑا ولی هَور گسائیں بنا هے !!

ولی - نہیں شانتی ' ٹھٹھول بس....کچھ گاؤ -

شانتی - نہیں تم آگے (آگے - پہلے) گاؤ...پچھے (بعد) میں گاؤں گی -

ولی - اچھو ' منظور - (گاتا هے)

براگی جو کہاتے هیں ' انھیں گھر بار کرنا کیا
هوئی جوگن جو کُنئی[2] پی کی ' اسے سنسار کرنا کیا

شانتی - تو کلجگ کا ولی هے تجھ سوں جوگن کوں هے کرنا کیا
موئے ! مسجد میں مَر جاکر ' تجھے مندر میں مَرنا کیا

---

۱ پکڑا ۲ کو لی

ولی - جو پیوے پرت کا پانی اسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن دکھ کا کرتے ھیں انھیں آدھار کرنا کیا

شانتی - وہ دھاری دھرم کے ھیں ھَور بن پانی جو جیتے ھیں
لگن سائیں کی جب من میں نہ ھو، جیو سوں گزرنا ہَے

ولی - آگے[۱] جب سوں نہ آنے کی تھی منسا[۲] من میں تمنا کے
تو مجھ سے دکھ بھرے سوں، پھر جھٹا اقرار کرنا کیا

شانتی - ارے مانَس پریمی ! بات کا تیرے پتیارا نہیں
آدھرمی پن سوں تیرے ، یَو برا میرا مکرنا کیا

ولی - ترے آنے کی باٹ اوپر، بچھایا ھوں انکھاں اپنی
تو بیگی[۳] آ کہ تجھ بن مجکوں یو گھر بار کرنا کیا

شانتی - نگھرگھٹ جو سدا کا ھو ، ادھرمی جو کنھیا ھو
بناکر میت[۴] ایسے کوں پچھے[۵] پچھتاؤ کرنا کیا

ولی - جو کئی[۶] جاے پرت کی آگ میں تن من کو یوں اپنے
ولی سنگھم[۷] بنا ایسے کوں پھر آدھار کرنا کیا

شانتی - جو تن من کا جلانا ھی بسا تھا من میں تمنا کے
جنم بھومی آپس کی چھوڑ کر سورت میں مرنا کیا
(نرملا داخل ھوتی ھے)

نرملا - اوھو، شانتی بائی ! یَو بھوانی مہارانی کے بہانے تُرک ھنومان کی سمرن ھو رھی ھے ؟ (ولی سے) کہو ھنومان مہاراج ! لنکا ڈھائے کے آئے ھو گجرات میں پھاگ کھیلنے ؟

ولی - پُتری ! بالی عمر میں یو چاتُر بول تجھے نہیں سجتے -

نرملا - اور تجھے سجتے ھیں !!! کبر (قبر) میں پانوں لٹکائے کے چلا ھے - رادھا کے کھوج میں ! (شانتی سے) پریم ! پریم ! پریم !....گنونتی بائی ، گھر چلو تو پریم کا مزہ چکھواؤں-

---

۱ پہلے سے　۲ منشا　۳ جلدی　۴ عاشق　۵ بعد　۶ کوئی　۷ دوست

ولی - بچی ، اپنے سن سوں اونچی بات نہ کر...تو نے خود نہیں چکھا، اس کوں کیا چکھوائے گی ؟ (شانتی سے) شانتی ، ڈرو نہیں....پرماتما بلونت ہیں !!

[چلا جاتا ہے]

نرملا - شانتی ! یہ پاپ کا « پراسچت » نہیں -

شانتی - (اداس اور بوکھلائی ہوئی) نہیں ؟...ہاں نہیں...میں پاپن ہوں...پریم پاپ ہے...میں پاپن ہوں -

[دونوں جانے لگتی ہیں]

-: پردہ :-

سین تیسرا

(ولی کا گھر)

(ساز و سامان وهی جیسا که پہلے سین میں، البته صاحبِ خانه ندارد۔ شاعر کی جگه اس کا «من موهن» اس کے سنگھاسن پر براجمان هے۔ دیر تک انتظار کرتے کرتے، ابوالمعالی ایک لمبی انگڑائی لیتا هے۔ پھر گوبندلال کو بلا کر، اس سے استاد کے کلام کی بیاض منگواتا هے)

معالی۔ (خود سے) واہ استاد، خوب انتظاری کرائے! (پکارتا هے) گوبند! او گوبند!!

[گوبند داخل هوتا هے]

گوبند۔ کیا حکم؟

معالی۔ گوبند، اندر کے کمرے سوں ذرہ استاد کے شعراں کی بیاض لا۔

[گوبند جاتا هے]

معالی۔ (خود سے) ع آج دِستائے حال کچھ کا کچھ آج استاد آخر کیدھر (کدھر) (نظر آتا) گئے هوں گے؟

[گوبند داخل هوتا هے]

گوبند۔ یو لیو (لو) حضور!!

(کتاب دے کر گوبند چلا جاتا هے۔ معالی کچھ دیر بیاض کی اوراق گردانی کرتا هے اور اِدھر اُدھر سے جسته جسته اشعار پڑھ کر جھومنے لگتا هے۔ پھر گوبند کو پکارتا هے)۔ [گوبند داخل هوتا هے]

معالی۔ گوبند، استاد کی یو غزل بر زبانی یاد هے؟ ارے، یو شعراں والی:—

آج دِستائے حال کچھ کا کچھ کیوں نہ گزرے خیال کچھ کا کچھ

گوبند۔ یو غزل یاد نہیں......وہ، تماشے کی غزل سناؤں؟

معالی۔ کون سوں تماشے کی ؟۔

گوبند۔ آخر میں سب تماشائی (تماشه هی) تماشه! سناتاؤں، سنو :-

[نہایت بےباکی سے گاتا ہے - کبھی کبھی معنی خیز انداز میں معالی کی طرف بھی اشارے کرتا جاتا ہے]

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشه
نہیں دیکھتا سورج کی جھلکار کا تماشه
اے رشک باغ جنت جب سوں جدا ہوا ہوں
دوزخ ہے تب سوں مجھ کوں گلزار کا تماشه

معالی۔ (کسی قدر برہم ہوکر) لڑکے! تو بڑا ہی شوخ ہے۔ استاد نے تم لوگوں کو منه لگا کر بدتمیز بنا دیا ہے۔

گوبند۔ (سہم کر) نہیں حضور، میرا کیا قصور۔ استادی (استاد ہی) بولے تھے یوں بھاؤ بتا کر پڑتا (پڑھنا) بول کے۔ میرے کو کائیکو۔ اب صاف سیدھا پڑتاؤں :-

اس مکھ کا رنگ اڑ کر قوس قزح کوں پہنچا
دیکھا جو تجھ بھواں کی تروار (تلوار) کا تماشه
رشتے کوں بندگی کے ڈالیا (ڈالا)، اپس (اپنے) گلے میں
دیکھا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشه
تب سوں ولی کا مطلب، جا پیچ میں پھنسا ہے
دیکھا ہے جب سوں تیری دستار کا تماشه

معالی۔ (بیاض دیتے ہوئے) اچھا اب جاؤ۔

(گوبند چلا جاتا ہے۔ معالی تخت سے اٹھ کر مونڈھے پر بیٹھتا ہے۔)

[ولی داخل ہوتا ہے]

معالی۔ (تعظیماً کھڑا ہوکر) کہو استاد......کہاں گئی تھی سواری ؟

ولی۔ جہنم میں۔

معالی - یَو کیا؟

ولی - یہی -

معالی - یہی؟

ولی - ھاں!

معالی - کچھ تو

ولی - نہ خدا ھی ملا نہ وصال صنم -

معالی - کون صنم؟

ولی - سیدانی صنم -

معالی - کون سیدانی؟

ولی - برھمن سیدانی -

معالی - استاد، یَو کیا بھید ھے - میرے چہرے کی قسم!

ولی - سید! تو ناحق کوں پریشان کرتا - اب لگ (تک) نہیں بولیا (بولا) تو اب کیا بولوں -

معالی - بولو استاد، آخر بھید کیا ھے - خدا کی قسم میں برا نہیں مانوں گا - صاف بولو -

ولی - اب بُرا کی بھلا کی - لیو سنو:—

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

معالی - پھر پہیلی؟

ولی - زندگی پہیلی ھے -

معالی - کب سوں؟

ولی - سدا سوں -

معالی - استاد پریشان نکو (نہ) کرو، بولو، کچھ تو؟

ولی - کچھ نہیں -

معالی - [بگڑ کر] استاد، اب یو (اس) دوستی ہور (اور) استادی کی خیر نہیں -

ولی - [جبر کرکے، اور رک رک کر بتاتے ہوئے] میں....ایک....برھمن ناری....
سوں....پریم....کرتا ہوں-

معالی - کون ؟....شانتی ؟

ولی - سید، تجھے کیسا معلوم ؟

معالی - اُستاد، تُمنا کا کون سا گن منجھے (مجھے) نہیں معلوم -

ولی - آخر ؟

معالی - آخر، نہ اول - اب میں بولا سو کرو -

ولی - کیا ؟

معالی - یہاں سوں ٹل جاؤ - نہیں تو—

ولی - نہیں تو کیا ہونگا ؟

معالی - کیا ہونگا ؟....استاد، یو (یہ) اورنگ آباد کے برھمناں نہیں - گجرات کے
چھاکٹے ہیں - تُمنا کی خیر نہیں -

ولی - پھر، شانتی ؟

معالی - بس ہیچ (یہی) شانتی !....میں زبردستی تُمنا کوں یہاں سوں لے جاؤنگا -

(ابوالمعالی اس موقع پر لفظ "شانتی" کے معنوی ابہام سے کھیلتا ہے
اور اپنی مصلحت آمیز دروغ گوئی یا چالبازی سے استاد کو گجرات
چھوڑنے پر آمادہ کرتا ہے)

ولی - کہاں ؟

معالی - جہاں شانتی ہے -

ولی - سید، تو سچ بولتا کیا ؟

معالی - بالکل سچ....جاؤ آرامی سوں بیٹھو - کھانا کھاؤ - میں تھوڑی دیر سوں
پھر آتاؤں (آتا ہوں) ذرہ بازار لگ (تک)—

ولی - سچ بولتا، سید ؟ میرے کوں وہاں لے جانا جہاں شانتی ہے ؟

معالی - [عجلت کے ساتھ] ہو استاد، ہو - خدا حافظ - [چلاجاتا ہے]

ولی۔　جیو۔ جُگ جُگ جیو۔ [پکارتا ھے] پیراں، او شیخ پیراں!! (گوبندلال داخل ھوتا ھے)

گوبند۔　استاد، پیراں گیا....آج شام سوں بابا وجیہ الدین کا عرس ھے نا؟ چراغاں دیکھنے گیا۔

ولی۔　کس سوں پوچھ کر گیا؟ میں تو اجازت نہیں دیا تھا۔

گوبند۔　حشمت بی سوں پوچھ کر گیا....استاد کوں آئے تو بول دیو (دو) بول کے۔

ولی۔　کھانا تیار ھے؟

گوبند۔　ھو، استاد....تیار ھے۔

ولی۔　حشمت بی کوں بول، دستر (دسترخواں) ساجو (سازو۔ تیار کرو) ھور بچے! تو ذرّہ چلم بھر دینا۔

گوبند۔　اچھا استاد۔　　(جاتا ھے)

ولی۔　(کچھ دیر سر جھکائے دالان میں ٹہلتے ھوئے۔ اور پھر ایک آہ سرد بھر کر) ع

سب کام اَپس کے سونپ کے حق کوں، نچنت رہ
یَـو ھے تمـام مقصـدِ گفت و شنید یـاں

(گھر کے اندر جاتا ھے)

[شاعر کے جانے کے کچھ دیر بعد حشمت بی داخل ھوتی ھے۔ اپنی ذات اور پیشے والیوں کے مقابلے میں ذھین اور سگھڑ معلوم ھوتی ھے۔ ھاتھ میں ایک رومال ھے جس سے تخت اور دوسری اشیا کو جھٹک جھٹکا کر قرینے سے جما دیتی ھے۔ پھر پاندان کھول کر گلوریاں بنانے لگتی ھے]

[گوبند داخل ھوتا ھے]

گوبند۔　[حقہ لائے ھوئے] کیوں بیٹھیں آرامی سوں! اجی بیگم صاب، استاد خاصہ کھاکر دانتاں (دانتوں) میں خلال کر رھیں۔ بیگی پاناں تیار رکھو، نا!!

حشمت۔　چل موئے، تجھے اپس کی چوٹی پرسوں واروں۔ بڑا آیائے (آیا ھے) میرے کوں سلیقہ سکھانے!

گوبند۔ اُھو، ذرہ دیکھو مسی کی بہار!! [چڑھا کر بھاگ جاتا ھے]

حشمت۔ ھت، تیری کی—ماٹی ملے۔!! [پاندان کو اپنی جگہ رکھکر اور گلوریوں کو قرینے سے جما کر چلی جاتی ھے]

[ولی داخل ھوتا ھے۔ ھاتھ میں قلم اور کاغذ ھے۔ کچھ گنگناتا بھی جاتا ھے]

ولی۔ [تخت پر بیٹھکر، حقے کے دو ایک کش لینے کے بعد] گوبند، او گوبند!! [گوبند کے اندر سے آنے کے بعد] ذرہ پانی لا کر پلا۔

[امرت‌لال داخل ھوتا ھے]

امرت۔ استاد کوں آداب… کیا بابا وجیہ‌الدین کے عرس کوں گئے تھے استاد؟ ایک دفعہ آکر بھارسوں (باھر سے) پلٹ کے چلا گیا… کیسا ھے اب کا عرس؟

ولی۔ باوا، میرے کوں عرس کائے‌کو، مرشدان کائے‌کو۔ع

عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

امرت۔ وہ کاغذ کیسا؟ کچھ نئی غزل لکھے کیا اُستاد؟

ولی۔ ھو، باوا۔ گاتا کیا؟ لے گا۔

[گوبند ایک نفیس کٹورے میں پانی لا کر پلاتا ھے اور پھر چلا جاتا ھے]

امرت۔ [کچھ بغور پڑھ کر گانا شروع کرتا ھے]

عالم کوں تیغ ناز سوں بے جاں نکو کرو
غمزے سوں اپنے غارت ایماں نکو کرو
آئینۂ جمال منور کوں کر عیاں
خوبانِ خود پرست کوں حیراں نکو کرو

ولی۔ واہ واہ، بچے! تیری کیسی امرت بھری آواز ھے۔

امرت۔ آداب اُستاد! مگر اُستاد، آج کے شواں بھی کچھ من موھنے ھیں۔ استاد کیا، نئی واردات؟—

ولی۔ واردات نہیں ھوئی سو ایسائی… ارے باوا چوٹ کھا کے ھی لکھا ھوں خیر، خیر، آگے پڑھ باوا۔

امرت۔ [گاتا ھے]

ھے روز حشر روز مکافات ھر عمل
ھریک کوں قتل خنجر مژگاں نکو کرو
درکار ھے نیاز کوں گوھر، اے عاشقاں
انجھواں کوں حرف گوشه داماں نکو کرو
مدت سوں تجھ نگاہ کا مشتاق ھے ولی
کن نے کہا غریب په احسان نکو کرو

ولی۔ باوا، خوش رہ'.....دل خوش ھوگیا۔ ایک غزل ھور سناتا؟

امرت۔ اب بہت دیر ھوگئی استاد.....اجازت دیے تو اچھا تھا۔

ولی۔ اچھا، باوا۔ [امرت چلا جاتا ھے] [گوبند داخل ھوتا ھے]

گوبند۔ استاد، معالی سرکار آرھیں۔

ولی۔ آنے دے۔

معالی۔ اُستاد، سفر مبارک!

ولی۔ کیسا سفر باوا؟ سفر' وہ بھی مبارک سفر؟ سید تو بھی کیسے شگوفے چھوڑتا باوا۔

معالی۔ دھلی سوں شاہ گلشن کا خط ابھی ابھی آیا۔ بہت قسماں دے کر بلائے ھیں۔ میں کل گجردم چلا۔ آپ بھی چلو۔

ولی۔ ھور شانتی؟

معالی۔ شانتی وھیں ملیں گی۔ آپ سنے نہیں؟ اس کے ماں باپ بدنامگی کے ڈر سوں اس کو وھیں ایک رشتہ‌دار کے پاس بھیج دیے ھیں۔ اب کیا ھے استاد۔ ایک پنتھ دو کاج!! چل کے شاہ صاب (شاہ صاحب) سوں روحانی فیض بھی حاصل کرو ھور شانتی بھی!

ولی۔ نکو باوا، میرے کوں شانتی بس' روحانی فیض نکو۔

معالی۔ کیا باتاں استاد!.....انھوں بڑے عامل بھی ھیں۔ چل کے اپنے "من میت" کوں حاصل کرنے کا کوئی تعویذ مانگ لیو۔

ولی ۔ یو بات چلتاؤں (چلتا ھوں) شانتی کوں رام کرنے کا تعویذ گٹھ گیا تو بہت اچھا!

معالی ۔ استاد، رام کرنے کا نہیں....سیتا کرنے کا!!

ولی ۔ وہ ایک ھیچ بات ۔ اے ولی گر وصل خواھی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ، با برھمن رام رام!

[سید معالی، مصرعوں کے آخری اجزا کو ولی کے ساتھ دھراتا ھے]

—: پردہ :—

مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری

(نمبر ۲)

(از نورالحسن صاحب ایم۔اے، علیگ)

نولکشور

۵ جنوری سنہ ۱۸۸۸ع — منشی نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار کو بھی خطاب سی۔آئی۔ای کا گورنمنٹ سے حاصل ہوا ان کو بھی میں نے خط مبارکبادی بھیجا ہے۔

کانگریس

۱۶ جولائی سنہ ۱۸۸۸ع — آج نو بجے صبح کے کانگریس اور بنگالیوں کے خلاف ایک جلسہ چودھری محمد عظیم صاحب کے مکان پر منعقد ہوا جس میں صاحبان ذیل شریک تھے اور بعد فراغت جلسہ تین تار مخالفت کانگریس بہ پریسیڈنٹی چودھری محمدعظیم صاحب بنام مہتمم اخبار پانیر و اکسپرس لکھنؤ و منشی امتیازعلی صاحب وکیل لکھنؤ کو بھیجے گئے اور پانچ اسپیچیں ارباب ذیل کی طرف سے منظور کی گئیں اور بعد پاس ہونے رزولیوشن کے جلسہ برخاست ہوا۔ اسپیچیں انگریزی اور اردو میں طبع ہوں گی اور رزولیوشن پاس شدہ مطبع آزاد لکھنؤ کے کسی پرچہ آیندہ میں طبع کیا جائے گا۔ تفصیل حاضرین جلسہ:— چودھری محمد عظیم صاحب، چودھری جاویدعلی صاحب، راجہ درگاہ پرشاد صاحب، کنور نریندر بہادر صاحب، شیخ احمدعلی صاحب شوق مالک مطبع آزاد لکھنؤ، سید نجم‌الدین و قمرالدین۔ لچھمن پرشاد بزاز، دلالتا پرشاد بزاز، مہاراج شیوسہائے، راقم تحریر ہذا۔ صراحت ان اشخاص کی جن کی

اسپیچیں منظور ہوئیں : چودھری محمد عظیم صاحب ' چودھری نصرت علی صاحب ' راجہ درگاپرشاد صاحب ' کنور نریندر بہادر صاحب' راقم‌الحروف۔

تعداد فوج

۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۸۸ء ــ بمعاینہ پرچہ جریدہ روزگار مدراس مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۸۸ء کے واضح ہوا کہ ہندستان میں کل فوج انگریزی بقید گورہ و ہندستانی حسب ذیل ہے :ــ فوج گورہ ۷۱۳۷۹ - فوج ہندستانی ۱۳۴۴۷۱ - کل ۲۰۵۸۵۰ - سرکار انگریزی ایسی منتظم ہے کہ اس قلیل فوج سے کل ہندستان اور بنادر کا خوش‌اسلوبی کے ساتھ بندوبست کررہی ہے - عہد شاہی میں قریب دو لاکھ کے فوج لکھنؤ میں رہتی تھی - لیکن اس سے صرف اودھ کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہوسکتا تھا -

سرحد و تبت

۳ نومبر سنہ ۱۸۸۸ءــ بالفعل جو جنگ مابین فوج برٹش و حسن زئی وغیرہ فرقہ ہزارا سے ہورہی ہے اس میں متواتر فتح فوج انگریزی کو ہوئی - اگرچہ کپتان بیلی صاحب و دیگر افسران فوج ضایع ہوے لیکن انگریزوں نے اکثر دہات ان کے اُجاڑ دیے اور قلعے منہدم کردیے - اب اہل فرقہ بحالت مجبوری اطاعت قبول کرتے جاتے ہیں اور جرمانہ مجوزہ برٹش ادا کرتے جاتے ہیں - غالباً قریب زمانے میں فوج انگریزی بعد عہد و مواثیق ضروری مظفر و منصور واپس ہو - صاحب اقبال سے مقابلہ جن کا ستارہ ترقی اوج پر ہے' نہایت مشکل و دشوار ہے - انگریزوں نے معاملات سکّم تبت والوں کو بھی شکست‌فاش دی اور ان کی فوج مفرور ہوگئی -

کانگریس

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۸۸ء ــ آج میرے نام ایک خط مرسلہ کنور پرنام‌سنگھ صاحب‌بہادر سی-آئی-ای آنریری سکریٹری انجمن ہند تعلقہ‌داران اودھ محررہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۸۸ء بدیں مضمون موصول ہوا کہ حسب تجویز کمیٹی انجمن ہند مورخہ ۵ نومبر یہ امر قرار پایا ہے کہ ۲۲ نومبر کو ایک جلسہ عام اہل ہنود و اہل اسلام و دیگر مذاہب و اقوام خیرخواہان ملک و بہی خواہان انگلش گورنمنٹ کا واسطے تصفیہ چند مقاصد مفید ملک و گورنمنٹ کے شہر لکھنؤ مقام بارہ‌دری قیصر باغ میں کیا جاوے - اسی جلسے میں ترتیب دستورالعمل انڈین یونائٹیڈ پیٹریاٹک

کمیٹی کی بھی عمل میں آوے اور تقسیم کارھائے ضروری متعلقہ اینٹی کانگریس بھی ھوجاوے ....میرا خیال ھے کہ بشرط امکان اس جلسے میں شریک ھوں کیوں‌کہ یہ جلسہ خلاف کانگریس منعقد ھوگا اور مجھے اس سے مخالفت ھے بلکہ قبل اس کے میرا ایک بیان متعلقہ اینٹی کانگریس انگریزی میں ترجمہ ھوکر شایع ھوچکا ھے......

لینس‌ڈاؤن و لارڈ ڈفرن

۴ دسمبر سنہ ۱۸۸۸ع— واقعہ ۳ دسمبر سنہ ۱۸۸۸ع کو مارکوئس لینس‌ڈاؤن صاحب‌بہادر جدید گورنر جنرل کشور ھند داخل بمبئی ھوے اور ٦ ماہ حال کو کلکتہ جاکر ۱۰ دسمبر کو چارج وایسرای لارڈ ڈفرن صاحب سے حاصل کریں‌گے۔ لارڈ صاحب جدید کی عمر ۴۳ سال کی ھے۔ قبل اس کے ملک کینیڈا کے گورنر جنرل تھے۔ آدمی ذی‌علم لایق اور صاحب تجربہ ھیں۔ دیکھا چاھیے کہ رعایا کے حق میں کیا سلوک کرتے ھیں۔ لارڈ ڈفرن صاحب اگرچہ بہت بڑے مدبر زیرک ھوشمند و تجربہ‌کار تھے اور ان کے عہد میں برھما فتح ھوا، شکم اور ھزارا میں کامیابی کے ساتھ جنگ ھوئی لیکن رعایا کو ان کی وجہ سے نفع نہیں ھوا بلکہ قانون ٹیکس انھوں نے جاری کیا جس سے عموماً ھر پیشہ‌ور ملازم وغیرہ کو پریشانی لاحق ھے۔ لارڈ ڈفرن صاحب کی عمر ٦۰ سال کی ھے۔ ایکٹ لگان اودھ یعنی ایکٹ نمبر ۲۲ سنہ ۱۸۸٦ع حضرت ھی کے وقت میں پاس ھوا جس سے زمینداروں کی بالکل بےاختیاری ھوگئی۔ باب بےدخلی کاشتکاران مطلقاً مسدود ھوا۔

لینس‌ڈاؤن

۸ اپریل سنہ ۱۸۸۹ع— آج ٦ بجے شام کے خاص ریل‌گاڑی میں لارڈ اور لیڈی لینس‌ڈاؤن صاحب مع مصاحبین وغیرہ لکھنؤ سے براہ سندیلہ روانہ شملہ ھوے۔ چوکیدار و کانسٹبل ایک ایک میل کے فاصلے پر واسطے حفاظت ریل‌گاڑی کے مامور۔ یہ گورنر جنرل نہایت سلیم‌الطبع اور لایق شخص ھیں۔

شہزادہ وکٹر

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۸۹ع— ۹ نومبر کو شہزادہ وکٹر خلف پرنس آف ویلز ولی‌عہد انگلستان بطور سیر و سیاحت داخل شہر بمبئی ھوے۔ ھندستان کے کل نامی شہروں کو ملاحظہ فرمائیں‌گے۔

۱۸ جنوری سنہ ۱۸۹۰ع— آج صبح شہزادہ البرٹ وکٹر نبیرۂ ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند رونق افروز شہر لکھنؤ ہوے - کل تعلقہ‌داراں سندیلہ واسطے معاینہ جلسہ دعوت و روشنی و آتشبازی جو منجانب انجمن ہند لکھنؤ آج رات کو ہوئی، روانہ لکھنؤ ہوے - راقم نہیں گیا کہ صرف بےجا تھا -

زکام و بخار

یکم اپریل سنہ ۱۸۹۰ع— قصبہ سندیلہ اور اس کے نواح و نیز تمام ہندستان میں آجکل بیماری زکام و بخار کی بشدت تمام ہے - کوئی گھر ایسا نہیں ہے کہ جس میں اس کی شکایت نہ ہو لیکن محل شکر ہے کہ اس بیماری سے اب‌تک کوئی ضایع نہیں ہوا -

انفلوئنزا

.......بخار انفلوئنزا انگلستان سے یہاں آیا ہے وہاں یہ بڑا مہلک تھا - یہ سرد ملک کا عارضہ ہے جس کو جوشاندہ سے فایدہ ہوتا ہے - سرد چیزیں مضر ہیں - فاقہ و علاج نہ کرنا اس کی عمدہ دوا ہے - ہندستان کے سرد ملکوں میں یہ مہلک قرار پایا ہے - سنا گیا ہے کہ جبل‌پور میں نو سو آدمی ہلاک ہوے -

بارش

۱۰ اگست سنہ ۱۸۹۰ع—بمعائنہ اودھ اخبار وغیرہ واضح ہوتا ہے کہ امسال تمامی ہندستان میں اس‌قدر بہ‌کثرت بارش ہوئی جس سے مکانات خام و پختہ و سڑک ریلوے و فصل خریف وغیرہ کو ازحد نقصان ہوا - اشخاص مسن کا بیان ہے کہ ایسی بارش ان کی عمر میں شاید کبھی ہوئی ہو - سڑک ریل کانپور و اناؤ کو ایسا صدمہ پہنچا کہ تین ہفتہ تک وہ جاری نہیں ہو سکتی اور یہ ہی کیفیت بریلی ریل کی رام‌گنگا نے کر رکھی ہے - آمد و شد مطلقاً بند ہے - مغل‌سراے بنارس ہوکر ڈاک کانپور، الہ‌آباد اور لکھنؤ کو آتی ہے - تحقیق سے سنا گیا کہ جس مقام پر ریل کانپور کی بگڑی ہے اس مقام پر تیس فٹ اونچا پانی سڑک پر آ گیا ہے -

ایجوکیشن کانگریس علی‌گڈھ

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۹۰ع آج شب کو —— و —— و —— و مولوی فریدالدین‌احمد صاحب رئیس کڑا حال سب جج پنشن یافتہ میری عیادت کو تشریف لائے - مولوی صاحب نے استدعا کی کہ ایجوکیشن کانگریس علیگڈھ کے جس کے سرپرست مولوی سیداحمد خاں صاحب ہیں،

آپ ممبر تجویز ہوے اور آپ سے ممبری کی فیس پانچ روپیہ چاہیے ۔ پس آپ زر مذکورہ داخل کریں ۔ چناں‌چہ راقم نے بہ‌پاس خاطر مولوی صاحب بلا لحاظ طمع ممبری اسی وقت مبلغ مطلوبہ پیش کیے ۔

۱۳ دسمبر سنہ ۱۸۹۰ع—آج ایک خط سر سیداحمد خاں صاحب سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانگریس الہ‌آباد بدیں مضمون بنام راقم موصول ہوا کہ من ابتداے ۲۸ دسمبر سنہ ۱۸۹۰ع لغایۃ ۳ ماہ مذکور اجلاس کانگریس بہ‌مقام الہ‌آباد قرار پایا ہے چوں‌کہ آپ اس جلسہ کے ممبر ہیں اگر شرکت کریں تو پیشتر سے مطلع فرمائیں کہ ریلوے اسٹیشن پر سواری بھیجی جاوے اور انتظام مکان و قیام اور سامان مہمان‌داری ہر قسم کا بہ‌غرض آسائش و آرام آپ کے مہیا کیا جاوے ۔

مردم شماری

۲۶ فروری سنہ ۱۸۹۱ع—آج نو بجے رات کو کل ہندستان و تمامی جزائر و ممالک محروسہ گورنمنٹ انگریزی کی مردم شماری ہوئی ۔

طریقہ تعلیم

۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۹۱ع—میرا تجربہ ہے کہ ملا مکتبی اپنے طریقہ قدیمہ کی تعلیم سے لڑکوں کو کودن کر دیتے ہیں ۔ میں نے بہ‌چشم خود مشاہدہ کیا کہ سات برس کے تعلیم‌یافتہ لڑکے کو اس قدر مادہ حاصل و متواصل نہ تھا کہ وہ خط و کتابت بلا تکلف کرسکتا ۔ لہذا اس تعلیم سے مجھے تنفر کامل ہوگیا ہے..........

انگریزوں کی طمع

........................اب انگریزوں کو بھی طمع زیادہ ہوگئی ہے اور بہ‌مقابلہ اپنے فائدہ کے ان کو تحریراً و تقریراً غلط بیان کرنے میں ان کو کوئی تکلف نہیں ہوتا ۔ سچ یہ ہے کہ روپیہ دنیا میں عجب چیز ہے جس سے سب تمنائیں بہ‌آسانی پوری ہو سکتی ہیں ۔

وفات

۱۵ جنوری سنہ ۱۸۹۲ع—کل واقعہ ۱۴ جنوری کو شاہزادہ البرٹ‌وکٹر خلف اول پرنس آف ویلز نے بہ‌مقام لندن بہ‌عمر ۲۸ سال عارضہ بخار میں رحلت کی ۔ ان کی شادی عنقریب ہونے والی تھی ۔ سال پیوستہ میں ہندستان کو تفریحاً تشریف لائے تھے ۔ اگر زندہ رہتے تو بعد اپنے باپ کے وہی شاہنشاہ انگلستان وغیرہ کے ہوتے ۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے پوتے تھے ۔

وفات

۳۰ جنوری سنہ ۱۸۹۲ع—بہ‌معائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ سے واضح ہوا کہ حکیم محمود خاں طبیب دھلی نے واقعہ ۲۴ جنوری کو بہ‌عمر ۷۰ سال عارضہ فالج میں قضا کی - یہ بڑے نامور و حاذق حکیم تھے - دور دور ملکوں میں ان کا نام تھا اور مریض معالجہ کو آتے تھے - مرحوم کا اکثر کشتہ‌جات پر عمل تھا اور نہایت دولت‌مند طبیب تھے مگر اپنا جانشین بھی بہت لایق چھوڑا جو ان کا پورا یادگار رہےگا -

ہیضہ

۲۶ مئی سنہ ۱۸۹۲ع—گرمی بہ شدت ہوتی ہے - خلایق کو ازحد انتشار ہے ، خدا رحم کرے - ہندستان کے اکثر حصص میں شکایت ہیضہ وبائی پیدا ہے ، کابل میں ۱۹ اپریل سے ۲۹ اپریل تک ۵۵ > ۵ آدمی ہیضہ سے ضایع ہوے -

۱۰ جون سنہ ۱۸۹۲ع—معائنہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جب سے سنہ ۱۸۹۲ع شروع ہوا ہے صدہا جلیل‌القدر و معزز اشخاص یوروپین اور بیسیوں راجہ و مہاراجہ و نواب ہندستانی بہ‌عوارض مختلف راہ‌گزائی عالم بقا ہوے اور شکایت بیماری ہیضہ وغیرہ ہر مقام پر بہ‌کثرت ہے جس سے اوسط و ادنی درجہ کے اشخاص ہزارہا ضایع ہو رہے ہیں اور ہنوز موسم بارش آغاز نہیں ہوا ہے جس میں انواع اقسام کی بیماری کا خروج ہوتا ہے اور واقعات طرح طرح کے پیش آتے ہیں - دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے - میری یاد میں ایسا سال ناقص کمتر وقوع پذیر ہوا - خدا اپنا رحم فرمائے -

۲۸ جون—بہ‌معائنہ اودھ اخبار (جو اس زمانے میں اعلی درجہ کا روزانہ اخبار ہے اور مطبع منشی نول‌کشور لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے) واضح ہوا کہ کسی شہر و قصبہ وغیرہ میں ہنوز کماحقہٗ بارش نہیں ہوئی اور سخت پریشانی پیدا ہو رہی ہے دیکھا چاہیے کہ انجام اس کا کیا ہو جس کا آغاز ایسی ناقص حالت سے ہو رہا ہے -

مردم شماری

۶ اگست سنہ ۱۸۹۲ع—بہ‌معائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ بہ‌حوالہ کانپور گزٹ مورخہ ۲۳ جولائی کے واضح ہوا کہ جو مردم‌شماری

واقعہ ۲۶ فروری سنہ ۱۸۹۱ع کو ہوئی تھی اس کی رو سے حسب ذیل تعداد مختلف مذاہب کے پیرووں کی ہے :—

ہندو ۲۰ کروڑ ۷ ۱/۲ لاکھ ـ مسلمان ۵ کروڑ ۷ ۱/۲ لاکھ ـ بودھ ۷ کروڑ

عیسائی ۲۵ لاکھ ـ آبادی جنگلات ۹ لاکھ ـ پارسی ۸۹۸۸۹ ـ

یہودی ۱۷۱۸۸ ـ ملحد ۲۸۹ ـ برھمو ۳۴۰۱ ـ

آریا ۴۶۰۰ ـ مذہب نامعلوم ۳۹۷۶۵ ـ تعداد ہنود سب قوموں میں زاید ہے ـ

سردی

۲۱ فروری سنہ ۱۸۹۳ع—بہ‌معائنہ اخبارات واضح ہوتا ہے کہ امسال کی ایسی سردی چند سال گزشتہ میں نہیں ہوئی جس کی تصدیق مسن لوگوں سے ہوتی ہے ـ کشمیر میں پیالوں کی چاء جم جاتی ہے اور بیضہ مرغ اگر زمین پر پھینکے جاتے ہیں تو مثل لکڑی کے ان میں آواز آتی ہے ٹوٹنے پھوٹنے کا کچھ خیال ھی نہیں گزرتا ـ کل سے ابر و باد گھٹ گیا ہے جس سے فی‌الجملہ ژالہ زدگی سے اطمینان پیدا ہوا اگر پھر اعادہ نہ کرے ـ

موسم

۸ مئی سنہ ۱۸۹۳ع—اگرچہ مہینہ جیٹھ کا رواں ہے لیکن فصل میں کچھ ایسا غیرمعمولی انقلاب ہے کہ شب و روز بہ‌شدت ہوا مشرقی چلتی ہے اور شب کو سردی ہوتی ہے چنانچہ آج جب میں بوقت شب زیر سائبان سو رہا تھا تو مجھے لحاف اوڑھنے کی ضرورت داعی ہوئی اور یہ ھی غیرمعمولی کیفیت تمامی ہندستان میں دیکھنے اخبارات سے ظاہر ہوتی ہے ـ میرے ہوش میں ایسا حال کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ـ

ٹیکہ ہیضہ

۱۴ مئی سنہ ۱۸۹۳ع—ڈاکٹر ایم ہیفکن شہر پیرس ملک فرانس کے رہنے والے ہیں اور حسب اجازت وزیراعظم سلطنت لندن وارد ہندستان ہوکر کلکتہ میں تشریف لائے ـ ان کا تجربہ ہے کہ جیسے ٹیکہ لگانے سے چیچک نہیں نکلتی اسی طور سے عارضہ ہیضہ بھی ٹیکا دینے سے نہیں عارض ہوتا ـ زخم ٹکہ کے ذریعہ سے جسم میں پہنچاتے ہیں ایک عرق مرکب کو جو ہر رگ و پے میں اثر کرجاتا ہے اور صاحب ٹیکا بیماری ہیضہ سے محفوظ رہتا ہے اور اس ٹیکا دینے

سے اور استعمال دوا سے چنداں تکلیف نہیں ہوتی چنانچه بالفعل آگرہ ، علیگڈھ اور جھانسی وغیرہ میں فوجی لوگوں کو ٹیکا دے رہے ہیں۔ دیکھا چاہیے که موسم هیضه میں اس کا کیا اثر ظاهر ہوتا ہے۔

آم

۹ جولائی سنه ۹۲ ع......فصل آم کی امسال ایسی افراط ہے که ایک سو آم ۳ پائی کو ملتا ہے جیسی ارزانی کبھی دیکھی اور سنی نہیں گئی۔ غربا نے روٹی کھانا موقوف کردیا جب که ۱½ پائی میں ان کو سیری ہوجاتی ہے۔

هندو مسلم فساد

۱۷ اگست سنه ۹۳ ع—آجکل جہاں تک میں خیال کرتا ہوں تو کوئی اهل دنیا خالی از فکر و تردد نہیں ؛ کسی نه کسی رنج میں ضرور مبتلا ہے۔ چنانچه بمعائنه اودھ اخبار مطبوعه امروزہ سے واضح ہوا که بوجه نزاعات اهل اسلام و هنود ریاست جوناگڈھ کاٹھیاوار و نیز شہر بمبئی میں جو ایک نہایت مہذب شہر ہے واقعه ۱۱ اگست سنه رواں کو درمیان هندو اور مسلمانوں کے سخت لڑائی ہوئی، ۴ قتل اور ۵۰ زخمی ہوئے اور مسٹر وینسنٹ کمشنر پولس بر وقت انسداد حمله زخمی ہوئے۔ مقام غور ہے که ایسا تسلط اور اس میں ایسے مناقشات کا پیش آنا نہایت تعجب‌خیز ہے علی‌الخصوص بمبئی میں جو نہایت مہذب شہر ہے اور جہاں سو برس سے زاید عملداری سرکار کو گزر چکے ہیں۔

مردم شماری

۲۱ ستمبر سنه ۹۳ ع—مردم شماری ۱۸۹۱ ع سے واضح ہوا که تمامی هندستان میں ۲۷ کروڑ ۴۲ لاکھ ۳۷ هزار آبادی ہے۔ کل فرقه کے آدمیوں سے حسب ذیل از کار رفته ہیں۔ بیوقوف و خراب دماغ کے آدمی۔ ۷۴۲۸۹

بہرے و گونگے۔ ۱۹۶۴۶۱ اندھے۔ ۴۵۸۸۶۸

زلزله

۲ جنوری سنه ۹۴ع......آج بوقت ۵½ بجے شام کے زلزله محسوس ہوا۔ چونکه فی‌الجمله شدید تھا اور تمام کوٹھی میری جنبش کرنے لگی تھی لهذا میں اندیشه‌ناک ہوکر باهر صحن کے چلاگیا تھا اور قیام اس کا تقریباً دو منٹ تک رہا بعدہ چار منٹ کے بعد پھر محسوس ہوا جو نصف منٹ سے زاید نہیں رہا۔

انفلوئنزا

۲۲ مارچ سنہ ۹۴ ع—آج میں بعد دوپہر بخار و کھانسی میں مبتلا ہوگیا۔ اعضا شکنی اور درد سر کی شکایت بڑھی ۔ شب کو غذا نہیں کی اور بےخوابی کے ساتھ نیند آئی ۔ نفخ نے اور بھی تکلیف دی ۔ یہ ایک انگریزی بخار انفلوئنزا ھے جس کی آج کل عام شکایت ھے ۔

گرہن

۶ اپریل سنہ ۹۴ ع—مجھے اپنے ہوش میں ایسے مشاہدہ کا کمتر اتفاق ہوا کہ چندر گرہن اور سورج گرہن ایسے زمانہ قریب میں پڑے ھوں جیسا کہ سنہ ۱۸۹۴ ع میں چندر گرہن ۲۱ مارچ ۶½ بجے شام کو اور سورج گرہن آج صبح کے ۶½ بجے پڑے تھے ۔ ۱۷ دن میں دونوں قسم کے گرہن پڑے ۔ دیکھا چاھیے کہ اس کا پھل کیا ھو ۔ ھندو لوگ تو ناقص بتلاتے ھیں ۔ انگریزی قاعدہ سے جب زمین درمیان چاند و سورج کے آجاتی ھے اس وقت چندر گرہن ھوتا ھے اور جب چاند درمیان سورج و زمین کے آجاتا ھے اس وقت سورج گرہن ھوتا ھے واللہ اعلم بالصواب ۔

غدر کا گمان

۱۴ جون سنہ ۹۴ع—صوبہ بہار ، بنگالہ اور اضلاع گورکھپور ، بلیا و اعظم گڈھ وغیرہ میں آم کے درختوں میں مٹی کے چھوپے لگائے جارھے ھیں جس کا حال باوصف تحقیقات پولیس ھنوز کچھ منکشف نہیں ھوا ۔ بعض حکام گمان کرتے ھیں کہ اس کی حالت سنہ ۱۸۵۷ ع کی ٹکیاں کے موافق ھے جس کا حال ابتداءً کچھ ظاھر نہیں ھوا اور آخر کو غدر ھوگیا ۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو اس حال سے ازبس پریشانی ھے ۔ اکثر یوروپین کا ظن غالب ھے کہ عید قربان میں کچھ نہ کچھ نزاع مذھبی ضرور برپا ھوگی ۔ خدا امن رکھے ۔

ھیضہ

۱۷ جولائی سنہ ۹۴ ع......مجھے چند سال کے تجربہ سے یہ بات تحقیق ھوئی کہ زمانہ بیماری ھیضہ میں جس روز بارش زاید ھوتی ھے اس روز بہت سے آدمی بیمار اور ضایع ھوتے ھیں جس کی وجہ بظاھر یہ ھی معلوم ھوتی ھے کہ رطوبت فضاییہ باعث ترقی مرض و ھلاکت ھے ۔

۱۸ جولائی سنہ ۹۴ ع......میر نظرحسین خلف حسین‌علی اشراف ٹولہ نے آج دوپہر کو ھیضہ میں قضا کی جو کل ۱۱ بجے رات کو مبتلا ھوئے تھے ۔ متوفی خوش تقریر

اور کارندہ گری میں بہت ہوشیار فاسی‌داں لایق شخص تھے............ان کی ایک کہاوت ضرور قابل یادداشت ہے کہ متوفی ہیضہ میں مبتلا ہونے کے تین گھنٹہ قبل حکیم ظہورالحسن صاحب طبیب میونسپل سے براہ تعلی بیان کرتے تھے کہ ہیضہ میں وہی لوگ مبتلا ہوا کرتے ہیں جو غذا ثقیل اور دیر ہضم چکھتے ہیں اور کثرت سے پانی پیتے ہیں اور ہم ایسے لوگوں کے پاس بیماری ہیضہ ہرگز نہیں آتی جو مرغن گوشت اور سپید دھلی ہوئی دال ماش کی کھاتے ہیں لیکن یہ بیان ان کا برعکس ثابت ہوا اور تین گھنٹے کے بعد وہ مبتلا ہیضہ ہوئے اور رحلت کر گئے۔ سچ یہ ہے کہ جب قضا آتی ہے تو اس کے وہی سامان پیدا ہوجاتے ہیں۔ سریع‌الہضم اور دیر ہضم غذا ہرگز اسے روک نہیں سکتی۔ میرے خیال میں جب اس قسم کی بیماری کا خروج ہو تو جن لوگوں کے مزاج میں خفقانیت کا دخل ہو ان کو ایسے ہولناک اخبار نہ سنانا چاہیئے کیوں‌کہ بعض اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ بعض وقت خوف کے باعث بھی دست آنے لگتے ہیں۔

۲۳ جولائی سنہ ۹۴ع۔ شب گزشتہ کو دختر خورد لالہ دیاشنکر متوفی نے ہیضہ سے قضا کی۔ جو لوگ لاش دیاشنکر متوفی کی گنگا لے گئے تھے ہنوز واپس نہیں آئے کہ دوسرا واقعہ پیش آیا۔ گھر میں سوائے بیوہ اور سالگ‌رام برادر خورد متوفی کے دوسرا نہیں ہے ہر چند کوشش کی گئی کہ کوئی ایک شخص از قوم ہنود اُجرت دے کر واسطے تجہیز و تکفین متوفیہ کے بھیجا جاوے لیکن یہ وقت ایسا ہولناک ہے کہ کوئی شخص اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ ایں الم بالاے الم است۔

۲۴ جولائی سنہ ۹۴ع۔آج دس بجے کی ریل گاڑی میں راجہ درگاپرشاد صاحب کا کل خاندان لکھنؤ چلاگیا۔ راجہ صاحب تو چار دن پیشتر جاچکے تھے اب رؤسا کی دیکھا دیکھی غربا بھی جہاں جس کا سوبیتا ہے بیرونجات کو جارہے ہیں۔ اشراف محلہ میں میری نقل حرکت کے رکھنے سے بہت لوگوں کو دلاسا پیدا ہے اور وہ یہاں میرے ہونے کو خیال کرکے اپنی تشفی کرتے رہتے ہیں، اس وجہ سے اشراف محلہ کی رونق بمقابلہ دوسرے محلوں کے بخوف ہیضہ کم نہیں ہوئی۔ میں اپنے خدا پر پورا بھروسہ

کیے ہوئے اور اپنے اعزا کو طمانیت دیے ہوئے بیٹھا ہوں اور سمجھ لیا ہے کہ اگر قضا اسی حیلہ سے لکھی ہے تو اس سے گریز نہیں ہوسکتا اور اگر یہاں موت بھی آوے گی تو چار بھائی بند مل کر تجہیز و تکفین بہت خوش عنوانی کے ساتھ کردیں گے اور اگر باہر جانے پر یہ واقعہ پیش آیا تو مشکل ہے کوئی شرکت بھی نہ کرے گا کیوں‌کہ عموماً لوگ اس مرض اور اس کے مریض اور جو اس میں فوت ہوا ہو بہت خوف کرتے ہیں - پس میں نے اسی پر قناعت کی کہ سندیلہ نہ چھوڑوں - آج اٹھارہ آدمی قصبہ ہذا میں ضایع ہوئے -

۲۵ جولائی سنہ ۹۴ع—آج تو ہیضہ میرے مکان کے ہر چہار جانب گشت لگارہا ہے جس میں پڑوسی لوگ مبتلا ہیں - پورب: منیر حجام و مرتضے خاں چپراسی تحصیل سندیلہ - پچھم: اہل‌خانہ حکیم امجدعلی - اوتر: محمدشعیب - دکھن: نتھا نداف - خداوندکریم سب کو بچاوے اور اطمینان بخشے - ہرایک کی جان سوکھ رہی ہے - بےنمازی نمازی ہوگئے - توبہ و استغفار ورد زبان ہے -

۹ اگست سنہ ۹۴ع......اب کی سال کوئی مقام ایسا نہیں چھوٹا جہاں حضرت ہیضہ صاحب کا دورہ نہ ہوا ہو - سچ یہ ہے کہ جہاں یہ ہولناک بیماری ہوتی ہے چاہے جیسا مستقل مزاج آدمی ہو لیکن اس کا قلب اس کے خطروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا - اللہ اس کو دور کرے - آمین - ہیضہ عجب ہولناک مرض ہے کہ کوئی شخص مریض کی بخواہش دل قربت پسند نہیں کرتا اگرچہ مرتبہ عزیزالقلوبی اسے حاصل کیوں نہ ہو - میں نے تجربہ کیا ہے کہ احباب و اعزا خاص اس سے دوری چاہتے ہیں اور ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ شاید مریض سے دور رہنے میں میری جان بچ جاوے - حشر میں نفسی نفسی کی خبر کلام شریف میں تھی لیکن میں نے دنیا میں اس مرض کے خروج پر وہ کیفیت بچشم خود مشاہدہ کرلی - اللّٰھم احفظنا من بلاء الدنیا و عذاب الآخرہ -

ہندو مسلم فساد

۱۶ ستمبر سنہ ۹۴ع—اودھ اخبار لکھنؤ سے معلوم ہوا کہ ۱۳ ستمبر کو مابین ہندو اور مسلمانوں کے شہر پونا میں سخت

لڑائی ہوئی که ہندو باجا بجاتے ہوئے مسجد کے دروازے سے نکلے جبکه مسلمان قرآن شریف پڑھ رہے تھے -

وفات ۱۹ فروری سنه ۹۵ع--آج چار بجے صبح کو منشی نولکشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار نے دفعتاً بمقام لکھنؤ قضا کی - بڑے مشہور ' لائق و دانشمند شخص تھے - اپنی ذاتی لیاقت و قابلیت سے ایک بہت بڑا مطبع لکھنؤ حضرت گنج میں قایم کیا جس میں ہزارھا آدمی کار پرداز ہیں - مرحوم نے کارخیر میں به اظہار اپنی لیاقت و خوش رکھنے حکام وقت صرف زر کو جائز رکھا جس سے گورنمنٹ میں بہت بڑا رسوخ پیدا ہوا اور خطاب سی-آئی-ای گورنمنٹ نے عطا کیا اور متعدد دیہات میں زمینداری پیدا کرنے سے تعلقه‌دار بھی ہوئے جس کی سند انجمن ہند لکھنؤ سے حاصل ہوئی اور لکھنؤ بنچ کے آنریری مجسٹریٹ بھی تھے - غرض که دنیوی امور میں ہر قسم کی ترقی نمایاں کیں - متوفی نے کوئی اولاد ذکر نہیں چھوڑی - عمر متوفی ۶۷ سال تھی -

سرحد ۱۱ اپریل سنه ۹۵ع--جو فوج برٹش گورنمنٹ به تعداد ۱۴ ہزار بغرض اعانت چترال واسطے مقابله عمراخاں والی باجور کے بھیجی گئی تھی اس کا مقابله سوانی لوگوں سے بمقام شاه‌کوٹ ۱۴ اپریل کو ہوا - ۵ گھنٹه تک سخت لڑائی رہی - اگرچه سرکاری فوج زیاده کام آئی لیکن مقام مذکور فتح ہوگیا - اس بیان کی تصدیق اودھ اخبار مطبوعه ۱۰ اپریل ترجمه اخبار پانیر انگریزی الهٰ‌آباد مورخه ۶ اپریل سے ہوئی - اول لڑائی گھاٹی مالاکانڈ میں ۳ اپریل کو ہوئی تھی ......

۷ مئی سنه ۹۵ع--دیکھنے اخبارات سے واضح ہوا ہے که عمراخاں باجوری تاب مقابله انگلش گورنمنٹ نه لاکر مفرور ہوئے اور شیر افضل‌خاں اور ان کے ہمراہیوں کو جو قلعه چترال کا محاصره کیے ہوئے تھے محمد شریف‌خاں خان‌دیر نے گرفتار کرکے سپرد فوج انگریزی کیا - اب فوج اعانت چترال سے کوئی مقابله کرنے والا باقی نہیں رہا - سچ یه ہے که انگریزی قواعدداں فوج کا گروه افغانی کیا مقابله کرسکتے ہیں

جن کے پاس ہتھیار تک نہیں -

وفات

۱۳ ستمبر سنہ ۹۵ع—آج ۸ بجے شام کو بمقام مرادآباد گنج جناب مولوی فضل‌الرحمان صاحب نے بعارضہ پیرانہ‌سالی قضا کی - آپ کے فیض و برکت کا اس قدر شہرہ تھا کہ تمام ہندستان کے لوگ جوق جوق آپ کی زیارت و شرف حصول بیعت کو تشریف لاتے تھے حتی کہ سر چارلس کراسویٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و اودھ جب سنہ ۹۵ع بتقریب دورہ وارد ملانواں ہوئے تو مرادآباد جاکر آپ کی ملازمت سے شرف اندوز ہوئے..........

قحط

۷ فروری سنہ ۹۶ع—آج کل بہ‌باعث سقامت فصل ازحد گرانی ہے- لوگ مصیبت سخت میں مبتلا ہیں - دو دو تین تین روز تک دانہ میسر نہیں آتا حتی‌کہ اکثر بے دین ہوگئے - دوسروں کی غلامی اختیار کی - بعض نے اپنی اولاد کچھ لے کر جدا کر ڈالی چنانچہ چند لڑکیاں مختلف قوم کی جو اسی نہج سے حاصل ہوئیں میرے گھر میں موجود ہیں......یہ ہی کیفیت تمام ہندستان کی ہے جس کی تصدیق اخباروں سے ہوتی ہے- میرے خیال میں یہ حالت خشک‌سالی سنہ ۷۷ع سے بڑھ کر ہے جو صرف ایک فصل خریف کی عدم پیداوار سے رونما ہوئی تھی اور حالت موجودہ تین سال زیادتی بارش و سال حال کی کمی بارش سے پیدا ہو رہی ہے- یہ حالت سخت نازک ہے - خدا آبرو رکھے - آج کل نرخ غلہ بازار مانی‌گنج سندیلہ حسب ذیل ہے :-

گندم	بجھڑا	نخود	باجرہ	جوار کلاں
۱۱ $\frac{1}{2}$ سیر	۱۵ $\frac{1}{2}$ سیر	۱۵ سیر	۱۴ سیر	۱۶ سیر
جوارخورد	دھان	چانول	ماش	مونگ
۱۵ $\frac{3}{4}$ سیر	۲۳ سیر	۱۴ سیر	۱۳ سیر	۱۱ $\frac{1}{2}$ سیر

زلزلہ

۲۰ جون سنہ ۹۶ع—آج رات کو بوقت ۱۱ بجکر ۵۵ منٹ پر سخت زلزلہ آیا- میری چارپائی کو جنبش ہوئی اور میں سوتے سے جگ پڑا- چھت کی کھڑکیاں ہلنے لگیں - قریباً ایک منٹ تک اس کا قیام رہا - اس قدر سخت

زلزلہ میری یاد میں کبھی نہیں آیا ۔

قحط

۶ اگست سنہ ۹۶ء—تین ہفتہ سے بارش نہیں ہوئی جس سے جوار کلاں بالکل خشک ہوگئی اور رقم دھان نصف رہ گئی ۔ ہنوز کپاس اور جوار خورد کی حالت اچھی ہے اگر دو چار روز میں بارش ہوگئی ۔ کاشتکاران دیہات کی حالت قابل بیان نہیں جو فاقہ پر فاقہ کر رہے ہیں اور خرابی فصل کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں ۔ جو سڑک سندیلہ بانگر مئو بغرض رفاہ عام درست ہو رہی ہے اس پر سات سو آدمی کام کرتے ہیں......حسب ذیل اجرت مرمت سڑک کی ملتی ہے : مرد ۵ پیسہ عورت ۴ پیسہ لڑکا ۳ پیسہ۔ اور جو لوگ بوجہ شدید ضعف جسمانی بوجہ فاقہ کشی کے کام نہیں کر سکتے ہیں ان سب کو کھانا دیا جاتا ہے جن کی تعداد قریب ۱۳۲ کے ہوگی ۔ پکی ہوئی روٹی و دال فی کس تین پاؤ کے حساب سے ان کو مفت ملتی ہے اور لڑکوں کو پاؤ سیر سے آدھا سیر تک ۔ ان لوگوں کی حالت ایسی تباہ ہے کہ چند قدم نہیں چل سکتے ۔ ان کی صورتیں خوفناک معلوم ہوتی ہیں ۔ صرف ہڈی اور چمڑا جسم میں باقی ہے ۔ امید ہے کہ گورنمنٹ کی بدولت ان کی زندگی ہوجاوے ۔

۲۴ ستمبر سنہ ۹۶ء........یہ عجیب وقت ہے کہ آج کل تمامی ہندستان میں بہ باعث امساک باراں و عدم پیداوار فصل سخت گرانی و نوبت قحط کی پہنچ گئی ہے کہ صدہا آدمی فاقہ سے مر رہے ہیں ۔ فقیروں کی یہ کثرت ہے کہ تمام دن اور ۱۱ بجے رات تک ان کے سوالوں سے نجات نہیں ملتی ۔ حالاں کہ میں نے اپنے گھر کا بندوبست کر رکھا ہے کہ کچھ غلہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھوا لیا ہے اور ملازموں پر تاکید ہے کہ جو سائل آوے وہ خالی نہ پھیرا جاوے لیکن کہاں تک دیا جاوے ۔ بعض وقت نوکر بھی تنگ آکر جواب دینا جائز رکھتے ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ‌السلام کے عہد میں تین قسم کی صعوبتیں نازل ہوئی تہیں ۔ اول حاکم ظالم، دوسرے ہیضہ وبائی کی شدت، تیسرے قحط کی صعوبت جس سے خلق اللہ کو سخت پریشانیوں کا سامنا ہوا ۔ آج کل میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو وہی کیفیت تمامی ہندستان

کی ہو رہی ہے اور جابجا لوٹ مار ڈاکہ‌زنی شروع ہوگئی ہے ۔ آج کی تاریخ میں نرخ غلہ بازار سندیلہ کا حسب ذیل ہے :—

گندم	نخود	بجھرا	جو	مکائی
۸½ سیر	۱۱½ سیر	۱۰¾ سیر	۱۱ سیر	۱۲¼ سیر

مکاکن	دھان	منڈوی سرخ	ماش
۱۴ سیر	یک من یعنی ۱۶ سیر	۱۳ سیر	۱۰½ سیر

یہ گرانی سنہ ۷۷ع سے بھی بڑھ گئی جب‌کہ گیہوں کا نرخ ۱۰ سیر تھا ۔

۲ اکتوبر سنہ ۹۶ع—کیفیت امساک بارش بدستور ہے ۔ آسمان بالکل صاف بہ ظاہر کوئی آثار بارش کے نظر نہیں آتے ۔ رقم خریف و کنوار و اگھن جاتی رہی ۔ اب اگر خدا نخواستہ ہفتہ عشرہ میں پانی نہ ہوا تو کاشت ربیع بھی غیر ممکن ہوجاوے گی اور سخت قحط کا سامنا ہوگا جو ناقابل برداشت متصور ہے ۔ ابھی سے لوٹ مار شروع ہوگئی ہے ۔ شہر آگرہ کی غلہ کی منڈی کنگلوں نے لوٹ لی اور انتظام پولس کچھ کارگر نہ ہوا ۔ جب لوگ بھوکوں سے مر رہے ہیں تو جو کچھ کر نہ گزریں تعجب ہے بقول مشہور مرتا کیا نہ کرتا ۔ ہیضہ بھی بہت سے مقاموں پر تیزی کے ساتھ چل رہا ہے جس سے ہزاروں بندہ خدا ضایع ہو رہے ہیں ۔ اس زمانہ سخت قحط سالی میں لارڈ ایلنگن وایسرائے ہند ہیں اور سر اینٹنی میکڈانلڈ صاحب ہمارے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر و مسٹر سوئل صاحب و مسٹر مکنتاش صاحب قایم مقام ڈپٹی کمشنر ہردوئی و لکھنؤ ہیں اور ہماری تحصیل کے تحصیل‌دار شیخ رحمت‌اللہ ساکن شہر الہ‌آباد ہیں ۔ مشہور عام ہے کہ اعلی سے ادنی تک جملہ حکام خوش‌نیت نہیں بلکہ جابر و بدنیت ہیں ۔ ایسی حالت میں اللہ رحم کرے ۔

۱۶ اکتوبر سنہ ۹۶ع کو سنہ ۱۷۷۰ع سے سنہ ۱۸۹۶ع کے قحطوں کی فہرست و کیفیت درج ہے ۔

زلزلہ

۱۲ جون سنہ ۹۷ع....آج ساڑھے چار بجے زلزلہ شدید آیا جس کا قیام قریباً ایک منٹ رہا ۔ میں اپنی کوٹھی میں بیٹھا ہوا آمدنی آکڑائی کی

جانچ کررہا تھا۔ میرے پاس چند آدمی اور بھی بیٹھے تھے جو یہ کیفیت دیکھ کر باہر نکل گئے۔

۱۶ جون سنہ ۹۷ع......جو زلزلہ ۱۲ جون کو آیا تھا اس سے کلکتہ اور آسام میں بہت کچھ ضرر پہنچا۔ صدھا جانیں ضایع ہوئیں اور بڑے بڑے مکانات گرگئے۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کو کبھی ایسا ضرر نہیں پہنچا جو اس مرتبہ زلزلہ سے کیفیت ویرانی پیدا ہے۔ مکانوں کے گرنے سے علاوہ خانہ بربادی کے اکثر لوگ ہندستانی اور یورپین ضایع ہوئے۔

قحط

۷ جون سنہ ۹۷ع—ہفتہ مختمہ ۲۹ مئی میں حسب ذیل آدمی کارہائے رفع تکلیف ہندستان میں تھے۔ مدراس ۴۰۰۸۶۱، بمبئی ۳۵۰۰۰۲، بنگال ۸۳۳۴۴۷، ممالک مغربی و شمالی و اودھ ۱۵۴۴۴۳۵، پنجاب ۹۶۳۶۶، ممالک متوسط ۶۹۷۴۵۸، برھما ۱۸۲۷۷، برار ۳۰۴۷۲، حیدرآباد ۴۰۵۳۷، وسط ہند ۱۲۸۴۵۴، راجپوتانہ ۲۰۶۵۰، کل ۲۱۶۱۲۴۹۔

سرحد

۲۵ اگست سنہ ۹۷ع—آج کل سرحد مالاکنڈ وٹوچی پر انگریزوں سے سخت لڑائی ہو رہی ہے اور ہندستان کی فوج بغرض مقابلہ برابر جارہی ہے۔ اگرچہ امید نہیں تھی کہ مجاھدین لوگ ظفریاب ہوں گے جن کے پیشوا......ہیں۔ لیکن یہ بات اخباروں سے ضرور معلوم ہوتی ہے کہ سرکاری فوج کو بہت نقصان پہنچا۔

۲۸ نومبر سنہ ۹۷ع—جو سرحدی لڑائی آفریدیوں اور برٹش گورنمنٹ سے ابتدائے جنوری سنہ ۹۷ع شروع ہوئی تھی وہ اب تک بدستور قایم ہے اور ۶۵ ہزار فوج سرکاری مقامات سرحد پر موجود ہے۔ سرکاری فوج اور اس کے افسر بہت سے مارے گئے۔ بالفعل یہ مقابلہ تیراہ میں ہو رہا ہے اور اب برف پڑنا شروع ہوگیا ہے اس وجہ سے سرکاری فوج کا اب زیادہ قیام وہاں مشکل نظر آتا ہے۔

۷ دسمبر سنہ ۹۷ع—۱۹ نومبر کو مہاراجہ پرتاب سنگھ وزیر اعظم ریاست جودھپور جنگ سرحدی میں زخمی ہوئے۔ ہاتھ میں گولی لگی۔ یہ جنگ انگریزوں اور آفریدوں سے ہو رہی ہے اور مہاراجہ صاحب انگریزوں کی کمک پر گئے تھے۔

۱۲ دسمبر سنہ ۹۷ع — یکم دسمبر کے پرچہ ہندستانی اخبار لکھنؤ سے واضح ہوا کہ ۱۹ جون سے ۱۵ نومبر تک جنگ سرحدی آفریدیوں میں حسب تفصیل ذیل برٹش افسر اور سپاہی مقتول و مجروح ہوئے :—

	ہلاک	مجروح
ملٹری سررشتہ اسٹاف کے افسر	۲ ہلاک	۶ مجروح
رجمنٹ کے افسر	۲۷ "	۶۰ "
برٹش عہدہ‌دار و سپاہی	۵۹ "	۲۴۰ "
دیسی افسر	۶ "	۲۲ "
دیسی عہدہ‌دار سپاہی	۲۳۶ "	۶۵۸ "
شاگرد پیشہ	۹ "	۲۲ "
کل	۳۳۹ "	۱۰۰۸ "

اگرچہ قتل و مجروح بہت سے لوگ ہوئے لیکن یہ لڑائی کا اصول ہے کہ تعداد کم کرکے لکھی جاتی ہے۔

وفات

۳۰ مارچ سنہ ۹۸ع — آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ مارچ یوم یکشنبہ ۱۰ ½ بجے رات کو سرسید احمد خاں صاحب بانی علی‌گڈھ کالج نے بعمر اکیاسی سال رحلت کی۔ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۸۱۷ع میں پیدا ہوئے تھے اور مسلمانوں میں اس قدر ذی وقعت شخص زمانہ حال میں کم گزرے ہیں۔ آپ کے کالج کے ملاحظہ کے لیے اکثر لفٹنٹ گورنر و وایسرائے کشور ہند تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا کہ مرحوم مسلمانوں میں آفتاب ہند تھے۔

قحط

۱۲ ستمبر سنہ ۹۹ع — کئی روز سے ابر محیط آسمان ہے لیکن پانی نہیں برستا۔ رقم وہاں خشک ہوئی جاتی ہے......آثار قحط پیدا ہیں۔ یہ حالت تو اودھ کی ہے لیکن اور حصہ ہندستان میں کام قحط شروع ہوگیا ہے۔ میں نے ایسا جلد قحط تو تاریخ ہندستان میں کہیں نہیں دیکھا۔ ایک کو ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ دوسرا نمودار ہوگیا۔ پروردگار عالم اپنی خلقت پر رحم کرے

مردم شماری

۲۱ ستمبر سنہ ۹۹ ع ــ ۲۶ فروری سنہ ۱۸۹۱ ع کو تمام ہندستان کی مردم شماری ہوئی ۲۸ کروڑ دس لاکھ مرد و عورت ہیں۔ منجملہ ان کے انگریزی عملداری میں ۲۲ کروڑ پانچ لاکھ اور ریاستوں میں ۶ کروڑ پانچ لاکھ آباد ہیں۔ جو سنہ ۱۸۸۱ ع میں مردم شماری ہوئی تھی اس کے مطابق دو کروڑ ۹ لاکھ آدمیوں کی ترقی ہوئی۔

بارش وقحط

۷ اکتوبر سنہ ۹۹ ع ــ دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ دارجلنگ متصلہ کلکتہ میں اس‌قدر شدید بارش ہوئی کہ پہاڑ کو جنبش ہوگئی جس سے چار سو جانیں تلف ہوئیں اور صدہا مکانات گر گئے اور اس کے رہنے والے اسی کے اندر دفن ہوگئے۔ راستہ آمد و شد ہنوز بند ہے۔ عجب حال دنیا کا ہے کہ کہیں تو اس قدر بارش ہو رہی کہ لوگ اس سے امان مانگ رہے ہیں اور کہیں اس قدر اس کی کمی ہے کہ عدم پیداوار غلہ و گھاس سے بغرض رفاہ عام کام قحط کا جاری ہے۔ عجب کارخانہ ایزدی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

۱۲ اکتوبر سنہ ۹۹ ع ــ چوں‌کہ ریاست‌ہائے راجپوتانہ میں اور نیز بعض حصص ممالک مغربی و شمالی میں کمی بارش سے قحط پیدا ہے لہذا اکثر ڈاکہ‌زنیاں بوجہ گرانی غلہ ہو رہی ہیں۔ ڈاکوؤں نے جس موضع کو تاکا فوراً وہاں رات کو پہنچ گئے اور جو پایا لوٹ لے گئے۔

۱۹ اکتوبر سنہ ۹۹ ع ــ چوں‌کہ جودھپور وغیرہ راجپوتانہ میں قحط پڑا ہوا ہے لہذا بہت سے مارواڑی اپنا وطن چھوڑکر اس ضلع میں آگئے ہیں اور شب و روز بھیک مانگ کر اپنا گزر کرتے ہیں۔ نرخ وہاں کا حسب ذیل ہے:ـ گندم ۴½ سیر نخود ۵½ سیر جو ۵½ سیر مکائی ۵½ سیر جوار ۵¼ سیر باجرہ ۴ سیر، روغن زرد ½ سیر۔ عمدہ صاف شدہ پانی فی روپیہ ۲۵ گھڑے۔ میلا و گندلا پانی فی روپیہ ۵۰ گھڑے۔

طاعون

۱۹ فروری سنہ ۹۹ ع ــ تین برس ہوچکے ہیں مگر اس وقت تک عارضہ طاعون بمبئی سے دور نہیں ہوا بلکہ وہ مختلف شہروں۔ مدراس کراچی لاہور وغیرہ میں پھیلتا جاتا ہے اور کوئی تدبیر۔ اس کے دفع ہونے کی موثر نہیں

ہوتی باوجودیکہ جرمن، فرانس، لندن اور بہت سے یوروپین سلطنتوں کے تجربہ‌کار ڈاکٹر بمبئی میں آئے اور ہر قسم کی جانچ کی لیکن کوئی دوا مفید ثابت نہیں ہوئی اور وہ بدستور بمبئی میں اپنی شورش کررہا ہے۔

وفات

۱۰ مارچ سنہ ۹۹ ع............۶ مارچ کو مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی نے بعوارض چند در چند رحلت کی۔ مرحوم بہت بڑے عالم متقی تھے اور دو سو روپیہ ماہوار ریاست رامپور سے وظیفہ پاتے تھے۔ مولوی صاحب کی شہرت تمام ہندستان میں تھی۔

کانگریس

۴ جنوری سنہ ۱۹۰۰ ع............مسٹر کاکس صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ہردوئی حسب منشا گورنمنٹ بذریعہ پولیس سندیلہ اس بات کی تفتیش کرا رہے ہیں کہ رؤسا سندیلہ سے کون کون لوگ شریک جلسہ کانگریس لکھنؤ ہوئے جو میدان درگاہ شاہ مینا صاحب میں ۲۷ دسمبر سے ۲۹ دسمبر تک ۳ روز منعقد رہا اور جس کے پریسیڈنٹ مسٹر دت بنگالی تھے جو اس کام کے لیے ولایت لندن سے آئے تھے جہاں وہ کسی مدرسے کے پروفیسر ہیں۔ ان کی اسپیچ آج اور کل کے اودھ اخبار میں میں نے دیکھی جو نہایت پر مضمون تھی۔

طاعون اور مشہور فساد کانپور

۱۲ اپریل سنہ ۱۹۰۰ ع ــ آج کل کانپور میں طاعون نے خروج کیا ہے اور بوجہ کارروائی انسدادی کہ اشخاص مبتلا شدہ شہر کے باہر جھونپڑوں میں رکھے جاویں وہاں کے متمول لوگوں کو خلاف ہو اور ہندو و مسلمانوں نے باہم اتفاق کرکے چند پولیس‌مین اور ایک ہیڈ کانسٹبل کو جو محافظ جھونپڑوں کے تھے مار ڈالا اور ان کو اسی جھونپڑوں میں آگ لگاکر جلادیا جس سے ایک عام بلوہ ہوگیا اور ہزاروں آدمی متفق ہوگئے کہ ہم ایکٹ نمبر ۳ سنہ ۹۷ ع قانون طاعون کی شرائط کو قبول نہیں کرسکتے کہ ہماری اولاد اور عورتیں بحالت بیماری شہر کے باہر رکھی جاویں اور کیفیت غدر کی پیدا ہوگی۔ بظہور اس امر کے فوراً لفٹنٹ گورنر بذریعہ خاص ٹرین نینی‌تال سے کانپور تشریف لائے، کارروائی دفعیہ غدر میں مصروف ہوئے اور قواعد طاعون کے ترمیم فرمائے جس کا

یہ منشا ہے کہ جو لوگ مبتلا طاعون ہوں وہ اپنے مکان کے کسی علیحدہ حصہ میں رکھے جاویں اور جن لوگوں سے ان کا عقیدہ ہو اس کا علاج کریں اور اگر اس مکان میں گنجائش ایسی نہ ہوئی کہ مریض علیحدہ رکھا جاسکے تو کسی اور علیحدہ مکان میں وہ رکھا جاوے اور اگر ایسا مکان بہم نہ پہنچے تو جنرل ہسپتال میں قیام کرے اور اپنی مرضی کے موافق جس شخص کا چاہے علاج کرے پولس و ڈاکٹر کوئی مزاحمت نہ کریں گے۔

ناگری

۱۶ مئی سنه ۱۹۰۰ع — گورنمنٹ نے جو رزولیوشن اپنے گزٹ مورخہ ۱۸ اپریل میں نسبت رواج حروف ناگری کے جاری کیا ہے اس کی وجہ سے کل بڑے بڑے شہروں میں کمیٹیاں ہو رہی ہیں اور لفٹنٹ گورنر و گورنمنٹ ہند کو میموریل بھیجے جا رہے ہیں کہ ناگری کا دفاتر سرکاری میں جاری ہونا مناسب نہیں ہے جس کی وجہ سے تکلیف زاید ہوگی۔

وفات

۱۹ اکتوبر سنه ۱۹۰۰ع — منشی امیراحمد صاحب امیر مینائی لکھنوی نے ۱۳ اکتوبر سنه ۱۹۰۰ع کو حیدرآباد میں قضا کی۔ مرحوم اردو زبان کے ایک مسلم‌الثبوت اور بےبدل شاعر تھے۔ سنه ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوے تھے اور بعمر ۷۳ سال قضا کی اور پانچ بیٹے یادگار چھوڑے۔

علی گڈھ

۱۵ جون سنه ۱۹۰۱ع — علی گڈھ کالج سر سیداحمد خاں مرحوم میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام انجمن القرض ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ چندہ ہر شہر و دیار سے وصول کرکے محتاج طلبا کے خورد و نوش کی کفالت میں صرف کیا جاے۔ چناں‌چہ کالج مذکورہ کے چار طالب‌علم سید ابومحمد اور واجدحسین وغیرہ کل وارد سندیلہ ہوے اور آج انھوں نے ایک جلسہ کمیٹی میونسپل ہال میں منعقد کیا جس میں بہت سے رؤسا شریک جلسہ ہوے۔ انھوں نے اسی قسم کی اسپیچیں کیں جس کا منشا میں اوپر ظاہر کرچکا ہوں۔ بعد ختم ہونے ان اسپیچوں کے فہرست چندہ کھولی گئی۔

وفات

۱۴ جولائی سنہ ۱۹۰۱ع تاریخ ۱۱ جولائی کو حکیم عبدالمجید خاں صاحب مشہور طبیب دھلی نے عارضہ صرع میں انتقال کیا ۔ چوں کہ حکیم حاذق تھے اس وجہ سے رؤسائے اعظم ان سے علاج کرانے کو دھلی جایا کرتے تھے ۔ اور اگر وہ حسب طلب کسی راجہ مہاراجہ کے باہر جاتے تھے تو بہت بڑی فیس یومیہ لیتے تھے ۔ مرحوم حکیم محمود خاں صاحب نامی طبیب دھلی کے فرزند تھے ۔ افسوس کہ ایسے نامی طبیب کی وفات سے دھلی خالی ہوگئی ۔ حکیم صاحب بہت متمول آدمی تھے ۔

یو-پی

۲۹ مارچ سنہ ۱۹۰۲ع بموجب اشتہار گورنمنٹ محکومہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۰۲ع بحوالہ اشتہار ہوم ڈیپارٹمنٹ کلکتہ مورخہ ۲۲ مارچ اضلاع مغربی و شمالی و اودھ کا نام تبدیل ہوکر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ رکھا گیا اور یہ تبدیلی بزمانہ وایسرائے لارڈ کرزن صاحب بہادر لفٹنٹ گورنری سر لاٹوش صاحب وقوع میں آئی جو قابل یادگار ہوگی ۔ اب اضلاع مغربی و شمالی پیشاور کے اضلاع قرار دیے گئے ہیں ۔

طاعون

۲۷ اپریل.........اب شکایت بیماری طاعون برابر ترقی کرتی جاتی ہے ۔ بڑے بڑے شہروں میں تو عرصہ سے اس کی شکایت پیدا ہے لیکن اب بہت سے اور مقامات میں اس بیماری کی مداخلت پیدا ہوتی جاتی ہے ۔ جو شہر یا قصبہ کنارے دریا کے واقع ہے وہاں اس کا قیام مدت تک رہتا ہے اور جب کسی قصبہ یا شہر میں اس بیماری کا خروج ہوتا ہے تو سب سے پہلے مرے ہوے چوہے نظر پڑتے ہیں ۔ ایسا ہونے پر اگر مکان فوراً خالی نہ کردیا گیا اور ایک بھی آدمی اس گھر کا مرا تو اس گھر والوں میں سے کسی کی خیریت نہیں ۔

صوبہ برار

۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ع— گورنمنٹ انگریزی نے نظام حیدرآباد کو مجبور کرکے ایک اقرارنامہ پر دستخط کرالیے جس کا منشا یہ تھا کہ گورنمنٹ موصوفہ ۲۵ لاکھ سالانہ بعوض صوبہ برار دواماً نظام حیدرآباد کو دیتی رہےگی ۔ سنا جاتا ہے کہ فی‌الحال صوبہ مذکور کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ سال کی ہے ۔ سنا گیا کہ نظام کو اس قدر موقع نہیں ملا کہ اس بارہ خاص میں اپنے وزرا سے پورے طور پر

صلاح کریں -

نمک

۱۹ مارچ سنہ ۱۹۰۳ع......آج کے اخبار پانیر سے معلوم ہوا کہ کرزن صاحب وایسراے کشور ہند کی کونسل کی راے ہے کہ نمک پر ڈھائی روپے فی من سے محصول گھٹا کر دو روپے فی من کردیا جاوے اور انکم ٹیکس جو پانچ سو روپیہ سالانہ کے منافع پر لیا جاتا ہے اب ہزار روپیہ کے منافع پر لیا جائےگا اور جن لوگوں کا منافع پانچ سو روپیہ ہے وہ بری کیے جاویں گے - غالباً ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۰۳ع کی کمیٹی سے اس کی بابت حکم صادر ہوجاوے -

سرخی شفق

٦ اپریل سنہ ۱۹۰۳ع— میں دیکھتا ہوں کہ تھوڑے زمانے سے بوقت طلوع و غروب آفتاب جو سرخی شفق کی عموماً ہوا کرتی ہے اس کا قیام ڈیڑھ دو گھنٹہ سے کم نہیں ہوتا حالانکہ اس قسم کی سرخی وقت طلوع و غروب آفتاب کے ۱۵ یا ۲۰ منٹ میں فرو ہوجاتی تھی - کتاب مہابھارت میں لکھا ہے کہ کورو و پانڈو کی لڑائی کے قبل بھی ایسی ہی سرخی وقت طلوع و غروب آفتاب کے نمودار ہوا کرتی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ دونوں میں سخت لڑائی ہوئی اور لاکھوں آدمی کا کشت و خون ہوا کہ دریا خون کے بہے لہذا میں خیال کرتا ہوں کہ جب سے اس سرخی کو ترقی ہوئی بیماری طاعون سے کئی لاکھ آدمی ضایع ہوگئے اور جو ہفتہ ۲۸ مارچ کو ختم ہوا ہے اس میں تمامی ہندستان میں تعداد کشتگان ۳۰۰۷۸ آدمیوں کی فی ہفتہ ہے - پس مقام غور ہے کہ آغاز طاعون سے جس نے سنہ ۱۸۹٦ع سے بمبئی میں خروج کیا ہے اس وقت تک کس قدر لوگ ضایع ہوے ہوں گے - لیکن اب دو چار روز سے وقت طلوع و غروب آفتاب قیام سرخی کا کم رہتا ہے - کیا عجب ہے کہ بیماری مذکور گھٹ جاوے - خدا ایساہی کرے -

طاعون

٦ مئی سنہ ۱۹۰۳ع...... اودھ اخبار مورخہ امروزہ سے بحوالہ اخبار ٹیلی گراف انگریزی محررہ ۳ اپریل سنہ ۱۹۰۲ع واضح ہوا کہ جب سے طاعون ہندستان میں شروع ہوا ہے اس کی سالانہ اموات حسب ذیل تمامی ہندستان میں

وقوع پذیر ہوئیں :—

سنہ ۱۸۹۷ع	سنہ ۱۸۹۸ع	سنہ ۱۸۹۹ع	سنہ ۱۹۰۰ع
۵۶ ہزار	ایک لاکھ ۱۸ ہزار	ایک لاکھ ۳۳ ہزار	ایک لاکھ ۹۳ ہزار
سنہ ۱۹۰۱ع	سنہ ۱۹۰۲ع	ششماہی سنہ ۱۹۰۳ع	صرف ماہ مارچ سنہ ۱۹۰۳ع
دو لاکھ ۷۴ہزار	۵لاکھ ۷۳ہزار	۳لاکھ ۱ ۳ہزار	ایک لاکھ ۳۶ ہزار

کل ۱۶ لاکھ ۷۳ ہزار -

وفات ۱۳ مئی سنہ ۱۹۰۳ع.........۸ مئی کو مسٹر سید محمود بیرسٹر-ایٹ‌لا کا بمقام سیتاپور انتقال ہوگیا - متوفی سر سیداحمد صاحب بانی کالج علی‌گڈھ کے بیٹے تھے اور امتحان بیرسٹری لندن میں پاس کرکے ہندستان میں وکالت شروع کی تھی - چند سال تک وہ جج ہائی‌کورٹ بھی رہے تھے جنھوں نے بڑے بڑے پیچیدہ مسایل قانونی اپنی قابلیت و عالی دماغی سے حل کیے - بعدہ عہدہ ججی سے بحصول پنشن ۶۰۰ ماہوار کنارہ‌کش ہوکر پھر اپنا کام بیرسٹری شروع کیا - مگر افسوس کہ وہ شراب بکثرت پینے لگے جس سے ان کا دماغ خراب ہوگیا، آخرش انتقال ہوا - متوفی ۲۲ مئی سنہ ۱۸۵۰ع میں پیدا ہوے تھے - ایک لڑکا خورد سال جس کی عمر ۱۶ سال ہوگی یادگار چھوڑا - مسٹر محمود کی لاش علی‌گڈھ بھیجی گئی جہاں اپنے باپ کے پہلو میں مدفون ہوے -

طاعون ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۰۴ع— معائنہ پائنیر اخبار محررہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ ہفتہ مختتمہ ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۰۴ع میں کل ہندستان میں ۴۵۲۷ آدمی طاعون سے فوت ہوے جس میں بڑا حصہ اموات بمقابلہ دیگر صوبہ‌جات کے پنجاب کا ہے - اللہ‌اکبر یہ کس‌قدر تعداد ہے اس بیماری سے اب کیسے دنیا قایم رہےگی -

کرزن ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع—۹ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع کو لارڈ کرزن صاحب وایسراے انگلستان سے داخل بمبئی ہوے یہ ان کا دوبارہ انتخاب ہے اور جس‌قدر وایسراے اب تک ہندستان کو آئے یہ سب سے کم‌سن ۴۵ برس کے ہیں -

علی گڈھ

۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع۔ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ اہل تشیع شاہزادگان و نواب‌زادگان لکھنؤ نے ایک جلسہ خلاف کانفرنس علی گڈھ کے امام‌باڑہ آصف‌الدولہ میں ۱۸ دسمبر کو منعقد کیا تھا جس میں علماء فرنگی محل اہل تسنن و مجتہدان شیعہ کے فتوے مشعر بدیں خلاصہ پیش ہوے کہ کالج علی گڈھ کے لوگوں کے عقاید خلاف دین اسلام ہیں کہ وہ عربی میں نماز پڑھنا لازمی نہیں سمجھتے ہیں اور نہ پانچ وقت کی نماز کی پابندی اور نہ عیدالضحی کی قربانی اور نہ روزہ رکھنا وغیرہ وغیرہ تو ایسی حالت میں اطلاق کفر کا ان پر لازم آتا ہے ان کی اعانت کسی نہج سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر بہت‌سی تقریریں ہوئیں۔ اس جلسے میں اہل سنت جماعت معزز شریک نہیں ہوے تھے۔ چوں‌کہ علی گڈھ کالج نے طریقہ تعلیم کا ایک عمدہ نوعیت پر جاری کیا ہے اب اس کی مخالفت ہورہی ہے۔

۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع—آج کی تاریخ سے کانفرنس علی گڈھ کالج بمقام لکھنؤ کیننگ کالج شروع ہوا جو ۲۹ دسمبر تک قایم رہےگا۔ بہت سے معززین قصبہ ھذا واسطے شرکت کے لکھنؤ گئے ہیں۔ میں بھی اس کا ممبر تھا لیکن بوجہ اس کے کہ طبیعت کو اب کوئی لطف باقی نہیں اور بحالت تنہائی و خاموشی ایام زندگانی بسر کرنا پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں لہذا فسخ عزیمت کی۔

۳۰ دسمبر آج معلوم ہوا کہ سید التفات رسول تعلقدار جلال‌پور سندیلہ نے چندہ کانفرنس علی گڈھ منعقدہ ۲۷ لغایۃ ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع کیننگ کالج لکھنؤ مبلغ پانچ ہزار روپیہ بنابر تعمیر کمرہ علم سائینس کالج علی گڈھ کو دینا تجویز کی جس کمرہ کا نام ان کے والد (فضل‌حسین) کے نام پر رکھا جاوےگا۔

زلزلہ

۴ اپریل سنہ ۱۹۰۵ع آج بوقت ۶ بج کے ۱۵ منٹ پر زلزلہ آیا۔ میں اپنی کوٹھی میں بیٹھا تھا جس کی جوڑیاں اور چھت ہلنے لگی اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں چھت گر نہ پڑے۔ قریب ۲۰ سکنڈ اس کا قیام رہا۔ دھرہ‌دون، منصوری اور لاہور میں بہت سے نقصانات ہوئے چھتیں گرگئیں جس سے بہت سے آدمی فوت اور مجروح ہوے۔

کرزن

۹ مئی سنہ ۱۹۰۵ع.............لارڈ کرزن صاحب وائسرائے ہند کے عہد حکومت میں مصائب ذیل باشندگان ہندستان کے حق میں وقوع پذیر ہوئے۔ اول تو طاعون کی شدت سے بہت سے لوگ ضایع ہوئے۔ دوسرے پالہ زدگی سے فصل ربیع سنہ ۱۳۱۲ فصلی کو بہت ضرر پہنچا۔ تیسرے زلزلہ جوالامکھی سے ہزاروں جانیں اور املاک ضایع ہوئیں۔ چوتھے ان کی اسپیچ کلکتہ متعلقہ تعلیم سے عوام اور تعلیم‌یافتہ کو سخت ناراضگی پیدا ہوئی کہ انھوں نے ہندستانیوں کو برے نام سے یاد کیا اور تعلیم کو سخت کردیا۔

ایجاد

۱۳ اگست سنہ ۱۹۰۵ع—آج راجہ درگاپرشاد صاحب نے مجھے تحفۃً ایک سفیتہ کی پیالی بھیجی ہے جس میں ایک قسم کا اسپنج رکھا ہوا ہے جس کی یہ تاثیر ہے کہ اگر انگلی سے اسے چھو کر لفافہ بند کریں تو اس کے لس سے لفافہ وغیرہ بند ہو جاوے‌گا اور گوند وغیرہ کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ ایک نئی ایجاد یورپ کی ہے۔ ایسی ہی ایجادوں سے ہندستان کا روپیہ یورپ کو چلا جاتا ہے کیوں‌کہ رؤسا لوگ ایک نئی اور عمدہ چیز کو دیکھ کر شوق سے اس کی خریداری کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

سودیشی تحریک

۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ع.............اہل بنگالہ نے جو سودیشی کار روائی شروع کی ہے یعنی اپنے ہی ملک ہندستان کی اشیا کا استعمال کریں اور یورپ کی ساختہ اشیا کو ترک کریں اس کے جلسے ہندستان کے تمام شہروں میں ہو رہے ہیں اور کوشش ہے کہ ہندستان کی بنی ہوئی چیزیں کام میں لائی جاویں۔ چوں‌کہ عموماً ہر مقام پر کوشش ہو رہی ہے عجب نہیں کہ یہ کارروائی تکمیل کو پہنچ جاوے۔

کرزن

۲۲ نومبر سنہ ۱۹۰۵ع—آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۸ نومبر کو لارڈ منٹو داخل بمبئی ہوے۔ یہ پچیسویں گورنر جنرل ہند کے ہیں اور ۱۸ نومبر کو لارڈ کرزن کنارہ‌کش واپس بہراہ بمبئی روانہ ولایت ہوئے۔ آخرالذکر کا انتظام ہند تو بہت اچھا تھا لیکن بعض بعض باتیں ان سے ایسی ظہور میں آئیں

جس سے زیادہ حصہ ہندستانیوں کا کبیدہ خاطر ہوا اور ان کے زمانہ وائسری میں چند قسم کے مصائب مفصلۂ ذیل ہندستان پر نازل ہوئے ۔ طاعون کی شدت رہی جس سے لاکھوں آدمی ضایع ہوئے ۔ آتش‌زنی سے بہت نقصان ہوا ۔ زلزلہ کانگڑا سے بیس‌ہزار جانیں تلف ہوئیں ۔ پالہ زدگی فصل ربیع سے سنہ ۱۳۲۲ف کو سخت نقصان پہنچا کہ زمیندار اور کاشتکار تباہ ہوگئے ۔ فصل خریف سنہ ۱۳۱۲ف کمی بارش سے بہت ہی کم ہوئی اور ربیع آیندہ کی بھی حالت بہت ہی خراب ہے اور ہزاروں بیگہ اراضی کاشت ہونے سے رہ گئی ۔ شاید بہ‌مشکل تمام زر مال‌گزاری وصول ہوسکے ۔

شاہزادہ ویلز

۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۰۵ع — شاہزادہ ویلز نے ۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۵ع کو اپنی دادی ملکہ وکٹوریہ کی شبیہ برنجی کا افتتاح کیا جو آگرہ کے میکڈانلڈ پارک میں نصب ہوئی ۔ اس کی طیاری میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ صرف ہوا ۔ یہ برنجی شبیہ ملک اطالیہ کی بانوئرس کمپنی نے طیار کی ہے ۔

کمبھ میلا

۳ جنوری سنہ ۱۹۰۶ع ... میلہ کمبھ الہ‌آباد میں جو ابھی ختم ہوا ہے ۲۰ لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا ۔ ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۰۶ع کو کثرت ازدحام سے دس آدمی ہلاک ہوئے اور ۱۸ سخت مجروح ہوئے ۔

شاہزادہ ویلز

۱۳ مئی سنہ ۱۹۰۶ع — شاہزادہ ویلز کے دورہ ہندستان میں جو سنہ ۶ - ۱۹۰۵ع میں ہوا گورنمنٹ ہند کا ۱۶½ لاکھ روپیہ صرف ہوا ۔ دیکھا چاہیے کہ جب شاہزادہ موصوف بادشاہ ہوتے ہیں تو رعایا ہندستان کو کیا نفع پہنچاتے ہیں ۔

کانگریس

۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۶ع — آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سرانذرناتھ بنرجی مشرقی و مغربی دونوں بنگالوں کے شاہ کی حیثیت سے انھیں تاج پہنایا گیا اور انھوں نے غیر ملک کی ساخت کی چیزوں پر سخت اعتراض کیا اور ملک کی کارروائی جائز رکھنے کے لیے مذہبی مدد حاصل کی اور انگریزی کپڑے پر اسی وجہ سے اعتراض کیا کہ وہ سور کی چربی سے گھوٹا جاتا ہے ۔ لہذا ہندو اور مسلمان دونوں کو ناگوار ہے ۔ اس جلسہ میں ہزاروں بنگالیوں کا مجمع تھا ۔ میری

راے میں بہ ظاہر ان کار روائیوں کا انجام بہ‌خیر نظر نہیں آتا۔

اخبار

۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۰٦ع...آج کل ھندستان میں ۱۳۷۱ اخبار نکلتے ھیں تعداد کے لحاظ سے بمبئی کو درجہ اول اور پنجاب کو درجہ دویم حاصل ھے۔

وفد

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۰٦ع...مسلمانوں کے ایک ڈیپوٹیشن نے بہ‌سرغنائی آغا سلطان محمد شاہ آغا خاں صاحب جی-سی-آئی-ای بمبئی جن کے ساتھ سربرآوردہ معزز اھل اسلام ھندستان شریک تھے۔ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰٦ع کو بہ‌مقام شملہ حضور میں لارڈ منٹو صاحب بہادر وائسراے ھند حاضر ھوکر اڈریس پیش کیا کہ جو انتظامات نسبت تقرر ججان ھائی‌کورٹ وغیرہ آئندہ ھونے والے ھیں اس میں مسلمانان ھند کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا جاوے جس کا جواب وایسراے نے قابل اطمینان دیا۔ اس کی کیفیت مفصل اودھ اخبار مورخہ ۸ اکتوبر میں درج ھے۔

لاجپت رائے

۲۱ مئی سنہ ۱۹۰۷ع...لالہ لاجپت‌راے ایک نامور متمول وکیل لاھور قلعہ مانڈلے واقع ملک برھما میں بہ‌طور سلطانی قیدی مقید ھیں۔

۷ جون سنہ ۱۹۰۷ع—آج کے اخبارات سے واضح ھوا کہ اجیت سنگھ پنجابی نائب لالہ لاجپت‌راے امرت‌سر میں گرفتار ھوا جو عنقریب کسی مقام پر جلاوطن کیا جائےگا۔ اجیت‌سنگھ گورنمنٹ کے خلاف اسپیچیں لاھور وغیرہ میں دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس پر وارنٹ گرفتاری بصد تا پانچ سو روپیہ انعام کے جاری تھا۔

۱۹ جون—آج کے اودھ اخبار سے واضح ھوا کہ لالہ لاجپت‌راے ملک برھما میں قلعہ مانڈلے کے ایک آراستہ بنگلے میں مقیم ھیں جو لب سڑک واقع ھے۔ ان کے واسطے کتابیں مہیا کی گئی ھیں اور بگھی اور ایک جوڑی گھوڑے کی ان کی سواری کے واسطے ھے۔ دو افسروں کے ھمراہ وہ باھر نکل سکتے ھیں۔ جو ھندستانی ان کو دیکھنا چاھتے ھیں وہ دیکھ سکتے ھیں۔ ان کے صرفہ سالانہ کے واسطے گورنمنٹ نے ۴۸ ھزار منظور کیا ھے۔ دوسری روایت یہ ھے کہ ان کو ۴۰ روپیہ یومیہ ملتا ھے۔ بہرحال ان دونوں میں سے ایک رقم ان کو ملتی ھے۔ غالباً آخیر رقم صحیح جس کی تعداد ماھواری ۱۲۰۰ ھے۔

اِکنّی

یکم اگست سنہ ۱۹۰۷ع—آج یکم اگست سنہ ۱۹۰۷ع سے ایک آنہ کا نکل کا سکہ جاری ہوا ہے - اس سکہ کا کناره پہلودار ہے جس سے یہ غرض ہے کہ اس پر چونّی کا دھوکا نہ ہو - اگرچہ چونی سے کسی قدر بڑا اور موٹا ہے مگر چونی سے کچھ مشابہ ہے - پہلودار بنانے سے دنیا کے سکوں میں یہ نرالا سکہ ہے کیوں کہ اس وقت تک کسی ملک میں ایسا سکہ مسکوک نہیں ہوا ہے - اس کے سامنے کے رخ پر بادشاہ کا تاجدار چہرہ ہے -

دمدار ستارہ

۱۶ اگست سنہ ۱۹۰۷ع—آج کل ۳ بجے اخیر رات کو ایک دمدار ستارہ نکلتا ہے جو پورب میں کہکشاں کے قریب اوتر کو دکھلائی دیتا ہے - یہ ستارہ زمانہ غدر بعدہ سنہ ۱۸۷۷ع زمانہ خشک سالی میں نکلا تھا، اب پھر نکلتا ہے - دیکھنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے - بارش کی کمی اور خریف کا نقصان تو ظاہر ہو رہا ہے -

وفات

۲۰ اکتوبرسنہ ۱۹۰۷ع.....نواب محسن‌الملک سکریٹری مدرسة‌العلوم علیگڈھ نے ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ع بمقام شملہ قضا کی - مرحوم لایق و قابل شخص تھے - ان کی اسپیچ میں ایسی سحربیانی تھی کہ حاضرین جلسہ ان کے منشا سے فوراً متاثر ہوجاتے تھے اور ان کے مقاصد کی پوری تعمیل ہوتی تھی - محسن‌الملک ۹ دسمبر سنہ ۱۸۳۷ع کو پیدا ہوئے اور ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ع یوم چہار شنبہ کو فوت ہوئے اور ۱۹ اکتوبر یوم شنبہ کو مدرسة‌العلوم علیگڑھ متصل قبر سر سیداحمدخاں کے مسجد میں مدفون ہوئے - حساباً ان کی عمر ۶۹ سال ۹ ماہ ۲۳ روز کی ہوئی -

ہڑتال

۲ نومبر سنہ ۱۹۰۷ع—ملازمان یوریین و ہندستانی ایسٹ انڈیا ریلوے نے ہڑتال کردی کہ یہ زمانہ قحط سالی ہے - اگر ہماری تنخواہوں میں اضافہ نہ ہوگا تو-ہم ریل نہیں چلاویں گے چنانچہ ۱۸ نومبر سے کلکتہ سے کالکا تک ریل بند ہے اور مسافروں اور مال کی آمدو شد رکی ہوئی ہے -

علی گڈھ

۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ع..............آج کی کمیٹی علی‌گڈھ سے وقارالامرا سکریٹری علی‌گڈھ کالج بجاے محسن‌الملک نواب مہدی‌علی خاں متوفی

سکریٹری مقرر ہوئے۔

وفات

یکم جون سنہ ۱۹۰۸ع ـ ۲۶ مئی سنہ ۱۹۰۸ع کو غلام احمد قادیانی جنھوں نے ایک جدید اسلامی فرقہ قایم کیا تھا بعارضہ ہیضہ لاہور میں قضا کی۔

مسٹر تلک

۲۵ جولائی سنہ ۱۹۰۸ع......مسٹر تلک مرہٹہ رئیس پونہ کو بمبئی کے جج صاحب نے چھ سال قید سخت کی سزا دی اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا۔

مسٹر تلک اپنی قوم میں نہایت معزز و پراثر شخص تھے۔ قیدی نے اپنے اخبار مرہٹی زبان میں تین دفعہ گورنمنٹ کی کچھ شکایت اور توہین چھاپی تھی اس وجہ سے ان کو حسب منشا دفعہ ۱۲۴ حرف الف و دفعہ ۱۵۳ تعزیرات ہند سزا ہوئی۔ مسٹر تلک عدن میں جلا وطن کیے گئے اور جس وقت وہ جہاز لے جارہے تھے تو ان کے ہمدرد لوگوں نے بہت کچھ یورش کی اور گارد کے سپاہیوں کو اینٹ اور پتھر مارے۔ کئی افسر زخمی ہوئے اور ادھر سے فوج نے گولیاں چلائیں۔ چار آدمی ہلاک ہوئے اور ۳۲ آدمی زخمی ہوئے۔ کیفیت غدر کی اس وقت تھی۔

جشن جوبلی

۷ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع ـ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جشن قیصری جوبلی ۲ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع کو تمامی ہندستان میں ہوا تھا اس کا یہ منشا تھا کہ برٹش سلطنت میں براہ راست قدیم انڈیا کمپنی سے حکومت ہندستان کی زمام اپنے ہاتھ میں لےلے جس کو زمانہ پچاس سال کا ہوا جو زمانہ امن و امان سے ختم ہوا۔

بنگال میں حادثہ

۱۴ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع ....آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ایک جلسہ کلکتہ میں سر انڈروفریزر صاحب لفٹنٹ گورنر کی پریسیڈنٹی میں ۷ نومبر کو بوقت شام منعقد ہوا تھا۔ جوتندرناتھ چودھری نے ایک ریوالور تپنچہ سے لفٹنٹ گورنر پر دو مرتبہ فیر کرنا چاہا لیکن تپنچہ نے خطا کی اور چودھری مذکور گرفتار کرلیا گیا جس کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نندولال بنرجی انسپکٹر تحقیقات فوجداری کو کسی نے ۱۰ نومبر کو تپنچہ کے دو فیروں سے قتل کیا۔ قاتلوں کی تفتیش ہو رہی ہے' ہنوز کوئی سراغ نہیں لگا

۲۸ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع ـ آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ جوتندرناتھ

چودھری جس نے سر انڈروفریزر لفٹننٹ گورنر بنگال کو ھلاک کرنا چاھا تھا اس کو دس سال قید سخت کی سزا ملی ۔ اگر مہاراجہ بردوان لفٹننٹ گورنر اور قاتل کے درمیان میں نہ آجاتے تو ضرور تپنچہ سر ہونے سے ہز آنر ھلاک ھو جاتے ۔

ندوۃ

۲ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ع ـ ۲۸ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع کو سر ھیوٹ صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے سنگ بنیاد دارالعلوم ندوۃالعلما کا بمقام لکھنؤ رکھا ۔

گاڑیوں کا تصادم

۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ ع ـ آج کے اودھ اخبار سے واضح ھوا کہ ۳ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ ع کو قصبہ مصطفیٰ‌آباد متصلہ لاھور میں دو ریل گاڑیاں لڑگئیں جس سے ۱۸ آدمی ھلاک و ۲۵ مجروح ھوئے ۔

تـار

۱۳ فروری .... یکم جنوری سنہ ۱۹۰۹ ع سے ٹیلی‌گرام بھیجنے کا حسب ذیل انتظام ھوا ۔ معمولی تار جو ایک روپیہ میں جاتا تھا وہ اب چھ آنے میں جائےگا لیکن شرط یہ ھے کہ معہ نـام کا پتہ و مکتوب‌الیہ و عہدہ مکتوب‌الیہ بارہ لفظوں سے زاید نہ ھوں اور اگر زاید الفاظ ھوں گے تو فی لفظ ٦ پائی مزید دینا ھوں‌گی اور جو تار ضروری دو روپیہ میں جاتا تھا وہ ایک روپیہ میں جاوےگا مگر اس میں بھی یہ شرط ھے کہ مع نـام کاتب و مکتوب‌الیہ وغیرہ کے بـارہ لفظوں سے زاید نہ ھوں ۔ اگر ھوں‌گے تو فی لفظ ۱ آنہ مزید دینا ھوگا ۔

آگرہ

۲۲ فروری سنہ ۱۹۰۹ع .... آگرہ کے تاج محل میں ایک لمپ عطیہ لارڈ کرزن صاحب سابق وایسرائے ھند ١٦ فروری سنہ ۱۹۰۹ ع وقت سوا سات بجے رات کے سر ھیوٹ صاحب‌بہادر لفٹننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے آویزاں کیا ۔ یہ نہایت عمدہ لمپ ھے ۔ مصر کے تدروس مدبّر نے دو سال میں اس لمپ کو تیار کیا ھے ۔ یہ لمپ کسی تقریب ضرورت میں روشن کیا جایا کرےگا ۔

قتل

۱۰ جولائی سنہ ۱۹۰۹ ع ـ یکم جولائی سنہ ۱۹۰۹ ع کو کرنیل کرزن ویلی اور ڈاکٹر لال کاکا کو مسمی مدن‌لال طالب‌علم سکنہ امرتسر نے بمقام لندن تپنچہ کی گولیوں سے قتل کر ڈالا جس کی وجہ سے مدن‌لال قاتل نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا

ہے۔ غالباً اس کو سزا پھانسی کی ہوگی۔ مقدمہ کی تحقیقات لندن کورٹ میں ہو رہی ہے۔

۲۷ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع۔آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ لارڈ اورسٹوں نے مدن‌لال قاتل سر کرزن ویلی کو پھانسی کی سزا دیتے ہوئے کہا کہ میں جو بات کہوں‌گا اس کا ملزم پر کچھ اثر نہ پڑےگا۔ جب مدن‌لال حکم سزا سن چکا تو اس نے فوجی سلام کیا اور کہا کہ مائی لارڈ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ مجھے میرے وطن کے لیے مرنے کا یعنی شہید ہونے کا فخر نصیب ہوا۔

علی گڈھ

۸ فروری سنہ ۱۹۱۰ع...... ....معلوم ہوا کہ سر آغا خاں خوجوں کے پیر بذریعہ اسپیشل ٹرین ۵ فروری بوقت ۱۱ بجے دن لکھنؤ تشریف لائے۔ اھالی لکھنؤ نے ان کی نہایت قدر و منزلت کی اور گھوڑے کھول کر خود اسٹیشن سے قیصر باغ تک لے گئے۔ اسٹیشن سے قیصر باغ تک جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ ان کی تشریف آوری کا یہ سبب ہے کہ علی‌گڈھ کالج کو یونیورسٹی قرار دینا چاہتے ہیں جس کا تخمیہ تیس لاکھ روپیہ ہے۔ منجملہ اس کے دس لاکھ روپیہ وصول ہوچکا ہے۔ اب صرف دس لاکھ چندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ غالباً لکھنؤ میں فہرست چندہ کھولی جائے اور متمول لوگ حسب حیثیت چندہ دیں جس کی تعداد میں آیندہ کسی تاریخ میں درج روزنامچہ ھذا کروں گا۔

۵ مارچ سنہ ۱۱ع.. ......اودھ اخبار مورخہ ۴ مارچ سنہ ۱۱ع سے واضح ہوا کہ سر آغا خاں صاحب‌بہادر قوم خوجہ آج کل تمامی ہندستان سے بنا بر قایم کرنے یونیورسٹی علی‌گڈھ مسلمانوں سے چندہ وصول کررہے ہیں اور بیس لاکھ سے زاید وصول کرچکے ہیں اور بالفعل لاھور (پنجاب) میں ہیں۔ وہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۷۷ع کو بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۳۳ سال کی ہے۔ آدمی نہایت لایق، خطاب یافتہ، فرقہ خوجہ کے........ ہیں اور ہزاروں روپیہ کی ان کی آمدنی ہے۔ یقین ہے کہ ان کی کوشش موجودہ سے تیس لاکھ سے زاید چندہ وصول ہو جاے۔ یہ پہلے شخص ہیں جو بعد سر سید احمد خاں بانی علی‌گڈھ اپنی قوم کے لیے یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے اس قدر کوشش کر رہے ہیں۔

وفات

۳ مئی سنہ ۱۹۱۱ع......... شب گزشتہ کو سیدعلی بلگرامی مقیم ہردوئی نے بعارضہ رُکنے حرکت قلب کے قضا کی - عمر ۶۵ سال تھی - یہ بڑے نامی گرامی بلگرام کے رؤسا میں تھے اور باہر ملازمت حیدرآباد دکھن میں انھوں نے بہت کچھ کمایا - سنا جاتا ہے کہ پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ ان کا بینک میں جمع ہے - اور اسی ہزار روپیہ کا کتب‌خانہ حیدرآباد میں ہے - شراب‌خوار اکثر رُکنے حرکت قلب کے مر جاتے ہیں، چوں‌کہ متوفی بھی شراب‌خوار تھے لہذا دفعتاً اسی عارضہ میں فوت ہوئے - کئی لڑکے اور لڑکیاں اور ایک بی‌بی یادگار چھوڑیں - متوفی علاوہ زبان انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت کے فرانسیسی اور جرمنی زبان کے بھی ماہر تھے - کوئی شک نہیں کہ ان کو بہت بڑی قابلیت حاصل تھی اور جلیل‌القدر حکام ان کو نگاہ وقعت سے دیکھتے تھے -

تاجپوشی

۲۴ نومبر سنہ ۱۱ع..... آج کل دھلی میں بڑے بڑے انتظامات ہو رہے ہیں - پچیس میل ربع میں خیمہ وغیرہ نصب ہیں کہ ہمارے شاہنشاہ جارج پنجم و ملکہ میری ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع کو رسم تاجپوشی بمقام دھلی ادا فرمائیں گے اور بہت سے والیان ملک شریک دربار رسم تاجپوشی ہوں‌گے - ہمارے ضلع سے – و – مطلوبہ گورنمنٹ شریک دربار ہوں‌گے - یہ بہت بڑا جشن دھلی میں ہوگا کہ لاکھوں آدمی شریک ہوں‌گے، شاید ایسا کبھی ہوا ہو -

۱۰ دسمبر سنہ ۱۱ع – ۱۲ دسمبر کو جب ملک معظم نے تخت نشینی بمقام دھلی اختیار فرمائی تو لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے حسب ذیل اسپیچ فرمائی کہ (۱) دھلی بجائے کلکتہ کے دارالسلطنت قرار پائے (۲) بعہد لارڈ کرزن صاحب جو تقسیم بنگالہ کی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے بنگالیوں میں ایک شورش پیدا تھی وہ منسوخ کی جاتی ہے - (۳) پچاس لاکھ روپیہ واسطے تعلیم کے دیا گیا - (۴) ملازمان سول و فوجی جن کی تنخواہ ۵۰ روپیہ ماہوار تھی.......... آج کی تاریخ میں اعزاز تقسیم ہوئے جس میں تعداد کثیر انگریزوں اور والیان ملک وغیرہ کی ہے -

سید شاہ کمال الدین

کرم کنڈوی قدس سرہ

از

سخاوت مرزا صاحب، بی۔اے، ایل ایل۔بی

اسم گرامی کمال الدین۔ سادات حسنی الحسینی۔ ابن سید جمال الدین۔ وطن آبائی بخارا۔
وطن ثانی شانور بلگاؤں (بیجاپور) اس کے بعد کڑپہ و کرنول میں توطن پذیر ہوئے۔
شجرۂ خاندانی کے متعلق صرف ایک قطعہ[1] منظوم دست‌یاب ہوا ہے:—

آں‌که از آل محمد مصطفےٰ　　آں که اولاد علی مرتضیٰ

از بخارا اولین از خاندان　　آمد ایں جانب کمال الدین شاہ

جد امجد نے حضرت خواجۂ بندہ‌نواز قدس سرہٗ کے خاندان[2] میں شادی کی۔
آپ کے تفصیلی حالات ہم‌دست نہیں ہوئے۔ البتہ مختصر و ضروری حالات تذکرۂ
گلزار اعظم[3] (مؤلفۂ نواب والاجاہ غلام‌غوث خاں المتخلص بہ اعظم) میں اس طرح نقل
کیے ہیں " تخلص سید کمال الدین است از اجلۂ سادات ہند بود و در شانور بلگاؤں سکونت
می نمود۔ در تدریس کتب فارسیۂ متقدمین فارس یدطولیٰ داشت و شعر ہندی و فارسی
ہر دو می نگاشت۔ اولاً عقد بیعت و ارادت با شاہ میر درست بست و ثانیاً وارد ایں طرف گشتہ
در حلقۂ خادمان خواجہ رحمت‌اللہ قدس سرہ نشست۔ ہمیں قدر از احوالش اطلاعے دارم
و آنچہ در صبح وطن بزبانی والد رحمۃاللہ علیہ مرقوم است بعینہ می نگارم۔ یک بیت او بایں

۱،۲　شجرۂ خاندانی موجودہ شاہ احمد حسین حیدرآبادی۔
۳　تذکرہ گلزار اعظم شعرائے ادب فارسی (کتب‌خانہ آصفیہ حیدرآباد)

خوبی اظہار کمالش می کند:—

لب و ابروئے تو درکشتن و جاں بخشیدن
ذوالفقــار اســداللّٰہ و دم روح اللّٰہ

نیز اسی قسم کے تقریباً ۵۴ شعر صنایع بدایع میں دیوان مطبوعه سنه ۱۳۱۸ھ حشمت الاسلام بنگلور کے صفحه آخر پر درج ھیں۔

سید محمد شاہمیر المتخلص به میر مصنف اسرارالتوحید[1] آپ کے برادر معظم تھے جن کے آپ تربیت یافته اور خلیفه تھے۔ مقطعوں میں اکثر شاہمیرؒ کا نام ضرور لیتے ھیں۔ پیر کے سچے جاں نثار اور فدائی تھے۔ کہتے ھیں:— ع

نقش رسم پیر سر تا پا مری تصویر ھے

آپ کے اساتذہ کا پته نهیں چلتا اور نه یه محقق ھے که شاعری میں کس سے تلمذ تھا۔ بلکه یه مشہور ھے که آپ وھبی شاعر تھے۔ کمال علوم ظاھری و باطنی کلام سے خود ظاھر ھے۔ آپ کا کلام زیادہ تر متصوفانه ھے۔ ایک تو خود آپ صوفی المشرب تھے دوسرے یه که ماحول بھی ایساھی تھا۔ آپ کے دیوان میں عربی فارسی الفاظ کے علاوہ ھندی الفاظ بھی کافی ھیں۔ فارسی محاورات[2] کے ترجمے بھی داخل کیے ھیں جس کے نمونے متقدمین شعرائے اردو کے کلام میں بھی پائے جاتے ھیں۔ تصوف کی اصطلاحات بھی وضع کی ھیں۔ چند الفاظ درج کیے جاتے ھیں: ھندی:— نور نرنجن۔ (جان کا) کھنجن۔ (گیان کا) انجن۔ (پائے) برنجن۔ (من و ما کا) رنجن[3]۔ عربی: تبین۔ تزین۔ تحسن۔ تحزن۔ تسمن۔ سدید۔ عدید۔ قدید۔ ثرید۔ اصطلاحات: ھےپن[4]۔ مین پن۔ یک پن۔ دوپن۔ ملذوذات۔ مشمومات۔ مسموعات۔ عبدیات۔ عینیت۔ بےعینیت۔ غیریت، بےغیریت۔ محویت، بلامحویت۔ تنزیه، بلاتنزیه۔ تشبیه، بےتشبیه۔ وحدت، بلاوحدت۔ کثرت، بلاکثرت۔ وحدۃ الوجود، بلاوحدۃ الوجود۔ نیست نمائی۔ ھست نمائی۔ جنون جوش۔ جنون جوشی۔

---

۱ تذکرۂ اردوئے قدیم حکیم شمس اللّٰہ قادری (باب نثر)   ۲ آبحیات۔ آزاد۔
۳ یعنی مٹی کا وزنی گھڑا جو عموماً دیہات میں استعمال ھوتا ھے۔
۴ اصطلاحات علمیه وحیدالدین سلیم جس میں الفاظ بنانے کے قواعد درج ھیں۔

موحد کے لیے توحید پیشہ۔ اشعار کے ترجمے بھی خوب کیے ھیں۔

فارسی شعر یہ ھے :—

موحد را کہ وحدت در شہود است　　نخستیں دیدہ بر نور وجود است

کمال :　نگاہ عارف توحید پیشہ
جمال حق پہ ھے اول ھمیشہ

قاضی محمود بحری (عروس عرفاں) :۔ قال را صد مایہ باشد اے جواں
حال بس مفت است نزد عارفاں

کمال :　قال کو چاھیے ہزار فنوں
حال کو بس ھے یک جنوں جوشی

محمود شبستری (گلشن راز) :—　دل یک قطرہ را گر برشکافی
بروں آید ازو صد بحر صافی

کمال :　صد ہزاراں کوہ ھیں یک کاہ میں
بوند میں یک نم کے یم کے مندرج

غالباً پیر(ح) کے وصال کے بعد یعنی سنہ ۱۱۸۶ھ کے بعد آرکاٹ، نیلور موضع رودگیر تشریف لے گئے۔ حضرت خواجہ رحمت اللہ[1] الملقب بہ نایب رسول اللہ قدس سرہٗ سے بےحد خلوص و اتحاد تھا جن کو شاہ کمال جیسا فاضل اجل و عارف۔ کامل اپنے فن کا امام مانتا ھے۔ کہا ھے :—

ھے خواجہ رحمت اللہ صاحب ولا یہی　ھے نایب نبیل نبی انور کی یہی
اس وقت کے مشایخ عالی مقام کا　قدوہ یہی، امام یہی، مقتدا یہی

روایت ھے کہ مثنوی[2] چکی نامہ آپ ھی کے حرم محترم کی فرمایش پر لکھی گئی تھی جو بلحاظ تاثیر آپ کے کلام کا ایک شاہکار ھے اور جس کو ھم بجنسہ آخر

۱　تذکرہ اولیاے دکن عبدالجبار خاں ملکاپوری۔
۲　حضرت کمال اللہ شاہ حیدرآبادی جو اسی سلسلے کے بزرگ تھے۔

میں نقل کردیں گے — اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب موصوف سے آپ کے قدیم روابط تھے - یہ مثنوی حضرت شاہ میر کی زندگی کے زمانے میں لکھی گئی ہے -

شاہ عبداللطیف عرف غلام محی الدین ویلوری فرزند سید ابوالحسن قربی[1] قدس سرہ سے بھی آپ کے روابط تھے - بعض متصوفانہ غزلیں ویلوری صاحب کی تصانیف جواھرالسلوک[2] و فصل الخطاب[3] بین الخطا و الصواب میں سنداً نقل کی ھیں - یہ کتابیں تصوف و علم کلام میں بہت خوب ھیں -

ھمعصر شعرا :— غالباً ولی دکنی[4] کا آخری زمانہ اور آپ کا ابتدائی زمانہ ھے - البتہ سراج دکنی' سید محمد خاکی[5]' عارف الدین خاں عاجز' عبدالولی عزلت[6] کی غزلوں پر آپ نے غزلیں کہی ھیں - نیز چوں کہ بحیثیت صوفی آپ وسیع المشرب تھے' دکن کے شعرا کی آمد و رفت شمالی ھند سے شروع ھوگئی تھی - قیاس غالب ھے کہ میر' سودا' خواجہ میر درد کا کلام بھی آپ تک ضرور پہنچا - چنانچہ خواجہ میر درد دھلوی کی بعض غزلوں پر غزلیں اور ایک رباعی پر رباعی کہی ھے - ولی دکنی کی نعتیہ غزل پر ایک مخمس تضمین کیا ھے - مگر اپنے خاص ماحول اور مذاق کے لحاظ سے آپ کی غزلیات میں تصوف غالب ھے - ھم اس کا آگے موازنہ کریں گے -

امرا :— نواب معین الدین خاں قطب الدولہ اور دیگر امرا بھی آپ کے معتقد تھے جن کا ذکر آپ نے بعض غزلوں میں مدحیہ طور پر کیا ھے -

اخلاق و عادات:— نہایت ذکی' فہیم' طباع' حلیم' سادگی پسند' متوکل' متواضع شفیق' صاف گو اور اپنے مسلک کے پکے تھے— وحدۃالوجود کے خلاف لوگ آوازے کستے ھیں' ملحد و زندیق کہتے ھیں - مگر آپ نے ھمیشہ ان کو دعا دی ھے :—

راہ ھدیٰ دکھا تو اس بےخبر کو جس نے
یہ قال و قیل سن کر مجھ کو خلیل بولا

---

۱ تذکرۂ اولیائے دکن ملکاپوری - ۲ فن تصوف فارسی کتب خانہ آصفیہ-
۳ فن کلام فارسی کتب خانہ آصفیہ۔ ۴ ولی دکنی المتوفی سنہ ۱۱۱۸ھ یادگار ولی نمبر مرتبۂ سید محمد ایم اے۔
۵ تذکرہ میرحسن دھلوی و سالنامہ رہبر دکن سنہ ۳۸ف۔ ۶ ولی نمبر مرتبۂ سید محمد ایم اے-

اپنے اعتقادات کو نہایت صاف گوئی اور استدلال اور شریعت و حقیقت کی جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ھیں :—

حیثیت وجود سے عین خدا ھوں میں
ملحد کہو مخالف ایمان کچھ کہو

ذاتی تعین اپنے کے ھوں اعتبار غیر	مشرک کہو، دربیں کہو نادان کچھ کہو
ایماں سے کفر کفر سے ایماں کیا ھوں ضم	کافر کہو یا مجھ کو مسلمان کچھ کہو

آخر کا شعر بجنسہ حضرت جامی قدس سرہ کی رباعی کے ایک شعر کا ترجمہ ھے:—

تا ایمان کفر کفر ایمان نشود	یک بندۂ حق بحق مسلمان نشود

عالی ظرفی	پی کر شراب شوق کیا خم تہی کمال
ھشیار ھے ھنوز و لیکن نہ مست ھے

شریعت کے سخت پابند تھے - کہتے ھیں:—

استقامت بشرع مصطفوی	ھے کرامت بزرگ کشف کلاں
بے تفقہ جسے تصوف ھے	وہ تصوف نہیں تصلّف ھے

تصلّف یعنی بیہودہ گوئی و لاف زنی ھے -

بے تعصبی و رواداری :— حصول علم کے معاملے میں خواہ وہ کسی فرقہ کا ھو تعصب نہیں برتتے - نصیرالدین طوسی کا ایک قول نقل کرتے ھوئے فرماتے ھیں:—

« خرد بخرد ھر دکانیکہ باشد » -

تعلیم:— قال صحیح کے علم بردار تھے — قال صحیح اس کو کہتے ھیں جس سے حال دایمی حاصل ھو جس کا نتیجہ وصل مطلق و رویت مطلق و فنائے مطلق ھو— اشغال و اذکار مقیدہ سے عارضی کیفیت طاری ھوتی ھے جو اھل استدراج کو بھی حاصل ھے -

(۲) زھد حقیقی ترک خودی ھے نہ کہ دنیا۔ حقیقی زندگی ارادت سے مرنا ھے۔ ع
جینا یہی ھے اپنی ارادت سے مر کمال

(۳) اسرار خودی و بےخودی:— بےخودی عین خودی بےخبری عین خبر ھے۔ یہ مستی عین ھوشیاری ھے۔

(۴) اضداد کو جمع کرنے کا نام معرفت ھے جو انتہائی کمال ھے۔

وصال:— آپ کا وصال[1] سنہ ۱۲۲۴ھ میں ھوا۔ کورم کونڈہ ضلع کڑپہ میں اپنے جد امجد کے پہلو میں دفن ھوئے۔ وصال کی متعدد تاریخیں دستیاب ھوئیں جن میں سے دو یہ ھیں:—

مرشد حق بیں و حق داں حق نیوش   شہ کمال اللہ میر عارفاں
سال قدسی آمد از وصلش عجیب   رھنمائے سالکیں رفت از جہاں
۱۲۲۴ھ

مرشد تحقیق دل قبلہ کمال   "تربتِ پیر ھدی" سال وصال
۱۲۲۴ھ

اولاد امجاد:—دو صاحبزادے[2] اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ صاحبزادے (۱) سید دادا پیرحسینی۔ (۲) سید جلال الدین حسینی المتخلص بہ اکمل۔

دونوں صاحبزادیاں سید میرعسکری حسینی اور سید بہاؤالدین حسینی میر قاضی سرکار سدھوٹ ضلع کڑپہ سے منسوب تھیں۔

خلفا:—سید علاؤالدین[3] قدس سرہ ھوئے۔ دوسرے میرحیات مصنف مصباح الحیات[4] و حضرات خمسہ المتوفی سنہ ۱۲۸۲ھ ھیں۔

تصنیفات:—(۱) دیوان مخزن العرفان[5] و کلیات مخزن العرفان[6] اردو میں ھے جو ۴۲۳ غزلیات۔ ۱۱ مخمس۔ ۴ مرثیے۔ چکی نامہ۔ ۱۱۴ رباعیات۔ مختلف قصاید۔ مناجاتیں۔ مناقب بزرگان دین پر شامل ھے۔

---

۱ شجرہ خاندانی۔ ۲ شجرۂ خاندانی۔ ۳ شجرۂ باطنی خلافت موجودۂ احقر۔
۴ مطبوعۂ بمبئی۔ ۵،٦ مطبوعہ حشمت الاسلام پریس بنگلور سنہ ۱۳۰۱ھ۔

(۲) دیوان فارسی - مختصر ہے - رنگ متصوفانہ ہے -
(۳) کلمات کمالیہ فارسی - تصوف میں ہے -
(۴) کمال المعرفت منظوم فارسی - جس کا ذکر ممدوح نے خود کلمات کمالیہ میں کیا ہے' نظر سے نہیں گزرا -
(۵) کلام کمال و کمال کلام فارسی نظم ہے تصوف میں ہے ' نظر سے نہیں گزرا -
(٦) حسن السوال و حسن الجواب - بیان کیا جاتا ہے کہ فصوص الحکم ابن عربی کی شرح بطور سوال و جواب ہے - مگر نظر سے نہیں گزری -
(۷) رباعیات اردو مسایل تصوف میں تعداد ۱۱۵ ہے- نہایت پرمغز حضرت جامیؒ کے رنگ میں ہیں - چونکہ یہ تمام تصانیف حضرت کمال کی روح ہے اس لیے ہم نے اس کو علیحدہ لکھا ہے -

ماحول :ـــ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ آپ صوفی المشرب تھے اور ایسے ماحول میں تھے جہاں عوام و خواص تصوف کے دلدادہ تھے - غالباً لوگوں کے اعتراض کی بنا پر اپنے طرز خاص نیز زبان کے متعلق صاف طور پر اعتراف فرمایا ہے :ـــ

شاعری کے متعلق رائے :ـــ بس طرز عارفانہ ترے شعر میں کمال
« لاباس » شاعرانہ اگر ہووے داب کم

لاباس : عربی فقرہ ہے جس کے معنی « کوئی جھگڑے کی بات نہیں » ہے -
داب : مراد شاعرانہ شان و شوکت -

دوسری جگہ کہا ہے :ـــ شعر قدیم ساتھ مشابہ ہے بے سخن
تیرا کلام اگرچہ کمالی جدید ہے

یعنی طرز قدیم ہے - مگر زبان جدید ہے -

ہم آپ کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں - پہلے وہ غزلیں جو اوایل عمر کی معلوم ہوتی ہیں جن میں درد و سوز ہے مگر ٹھیٹ دکنی زبان ہے - دوسرے تبلیغ تصوف کے سلسلے میں عالمانہ اردو استعمال کی ہے جس کی یہ لشکری زبان اس وقت متحمل نہ تھی - تیسرے عشقیہ غزلیں -

(۱) قدیم نمونۂ کلام :—

تجھ عشق کے آتش منے[1] اب شمع ہو جلنا پڑیا[2]
تجھ شوق کے تابش ستی[3] جیوں موم ہو گلنا[4] پڑیا
تجھ غم کے گلشن میں سجن جُھکہ جُھکہ[5] ہوں جوں سرو ہوں
تسپر[6] فلک کے جور کے بارے[7] سرنت ہَلنا[8] پڑیا
تیرے برہ کے درد کو دارو نہیں بن وصل کے
اس واسطے مجھ رات دن تجھ باج[9] تلملنا[10] پڑیا
کئے[11] دن پچھے[12] قاصد دیا پیو کی خبر لا آج مجھ
اب ڈھونڈنے اس کو مجھے دل کے نگر چلنا پڑیا

تجھ ۔ منے ۔ ستی ۔ گلنا ۔ تسپر ۔ بارے ۔ نت ۔ ہَلنا ۔ باج ۔ تلملنا ۔ قدیم دکنی الفاظ ہیں جو آج کل متروک ہیں ۔ مگر دکن کے دیہاتی آج کل بھی بولتے ہیں ۔

بہت ممکن ہے کہ آپ نے اول اول خاکی کی اتباع کی ہو اور انہیں کے طرز میں عارفانہ تبلیغی اشعار نظم کیے ہوں گے ۔ چناں‌چہ خاکی کی غزل پر غزل کہی ہے جو نصف اردو اور نصف فارسی ہے :—

خاکی: ہشیار ہو اے یار من آخر ز دنیا رفتن است
غافل ہو رہنا خوب نیں بےشک پریشاں رفتن است
(نہیں)

کمال: غافل نہ ہو اے جان من آخر ز دوراں رفتن است
صد سال جیوے گرچہ تو یک روز مِیداں[13] رفتن است

خاکی: اس وقت کوئی ہمراہ نیں[14] مادر پدر نا بھائی بہن
غفلت میں پڑ غافل نہ ہو تنہا تو یک جاں رفتن است

کمال : ساتھی نہیں کوئی حشر میں جز فعلہائے نیک و بد
نیکی سے ہے خوبی خوشی و ز بد پشیماں رفتن است

---

۱ میں ۲ پڑا ۳ سے ۴ گھلنا ۵ جُھک جُھک ۶ اس پر
۷ بار- بوجھ ۸ ہلنا ۹ سوا ۱۰ تلملانا ۱۱ کئی ۱۲ پیچھے
۱۳ میداں - جان (فارسی) ۱۴ نہیں

خاکی
هشیار هو اے بےخبر هے جسم میں تیرے یزید
یا مار کر غازی هو توں[1] یا مرکے هو اس سوں[2] شهید

کمال
کر فی سبیل‌اللہ غزی[3] پاکر شهادت مرتبه
مقتول تیغ عشق هے اور خصم کا قاتل بھی هے

خاکی نے نفس سے مارے جانے کو شهادت کہا هے - آپ کہتے هیں تیغ عشق سے شهید هوتا هے - وقت واحد میں غازی بھی هے اور شهید بھی هے -

خاکی
خوش یہی حال هے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ هو رهنا

کمال
کافر نفس کے تئیں روح کو لا جنگ کے بیچ
گر مسلمان هے تو مردانه هو اس جنگ کے بیچ

شاہ کمال - خوبی سے نفس و روح کی لڑائی میں جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی هے - بیشتر غزلیات تصوف و عقاید پر مشتمل هیں اور اردو عالمانه هے -

تبلیغ تصوف :-
حق کو تنزیه میں تبطن هے لیک تشبیه سے تبین هے
لاتعین بذاتہ - امّا متعین به هر تعین هے
بل[4] تعین لباس و زیور جوں شاهد عور[5] کو تزین هے

علم کلام میں :-
ذات حق جسم هے نه جسمانی نه هیولا هے نه هیولانی
نه طبیعت هے نا طبیعی هے نیز هم نفس هے نه نفسانی
قالب و قالبی نه قلبی و قلب نه تو وہ روح هے نه روحانی

عقاید :-
وجود حقیقی هے جس‌کا[6] ثنا وهی هے سزاوار انّی انا
هے شایان بقا و وجوب و قدم تجھے هم‌کو امکان حدوث و فنا

عشقیه غزلیں :- آپ کی عشقیه غزلیں بہت کم هیں - البته چیدہ چیدہ اشعار بہت هیں جن میں شان تغزل هے اور سادگی ' جوش ' عشق و محبت و حسن و جمال کی سچی تصویر هے - مضامین جدت حسن و جمال و معشوق کی نفسیاتی کیفیات کو خوب ادا

---

۱ تو - ۲ سے ۳ غزی (ع) لڑائی - ۴ بلکه
۵ عور (ع) برهنه ۶ جس کی -

کیا ہے اگرچہ زبان قدیم ہے اپنے ہمعصر شعرا ۔ ولی دکنی ' سراج دکنی' عارف الدین خاں عاجز[1] ' عبدالولی عزلت[2] ' فدوی[3] وغیرہ کی غزلوں پر غزلیں کہیں ۔ ہم یہاں ان شعرا کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ایک ہی دور اور ایک ہی خطۂ ملک کے چند دکنی شعرا نے اپنی روانی طبع و جولانی کا کس حد تک ثبوت دیا ہے :—

ولی :— ترا مکھ حسن کا دریا وو[4] موجاں چین پیشانی
ابر[5] ابرو کی کشتی کے یہ تل جیوں ناخدا دستا[6]

کمال :— خدا کی ذات کے مرآت میں روئے خدا دستا
جہاں کے جام میں عکس جمال مصطفے دستا

ولی :— تجھ عشق میں ولی کے انجھواں[7] امڈ چلے ہیں
اے بحر حسن آ دیکھ اس پور کا تماشا

کمال :— گر قصد سیر تجھکو آب رواں کا ہووے
مجھ جوئے چشم کے دیکھ آ نیر[8] کا تماشا

ولی :— ہر پلک تیری جو ہے تیغ فرنگ عاشقاں کے مارنے کو تیز ہے
کمال :— ترکِ چشم بتاں کی خونریزی دم تیغ فرنگ سے پوچھو

ولی :— بھواں تیغ و پلک خنجر' نگہ تیر
یہ کس کی قتل کا ساماں ہوا ہے

کمال :— برچھی نگہ ' کٹار پلک ' زلف ذوالفقار
آتا ہے مجھ پہ یہ سامان جنگ کوں[9]

ولی :— سوکھ کر تجھ غم منے[10] یو تن ہوا ہے جوں رباب
دل مرا سینے منے جیوں کہ تار ساز ہے

---

۱ ' ۳ دکن میں اردو مؤلفہ نصیرالدین ہاشمی ۲ یادگار ولی نمبر مرتبہ سید محمد ایم اے حیدرآباد
۴ وو=وہ ۵ اوپر ۶ دستا=دکھائی دیتا ۷ آنسو ۸ پانی
۹ کو ۱۰ میں

کمال :— گاتا ہوں سوز ہجر میں میں نغمۂ الم
زخمہ سے آہ دل کے بجا تن کے چنگ کوں

ولی :— شکار انداز دل وو[1] من ہرن ہے
لقب جس شوخ کا جادو نین ہے

کمال :— یک بیاباں صید ہوں وحشی دلاں اے من ہرن
زلف سے اپنے کرے تو جب کمند افگندگی

سراج :— ہر شب ترا تصور آرام جان و دل ہے
آنکھوں کو خوش لگے ہے جوں خواب کا تماشا

کمال :— تجھ حسن کا تصور ہے فرض عین مجھکو
لازم مرید کو ہے جوں پیر کا تماشا

سراج :— مدت ہوئی کہ ہوا خانۂ زنجیر خراب
بستۂ زلف گرہ‌دار ہوں کن کا ان کا

کمال :— بستہ، حلقہ، زلفیں[2] ہوں کن کا ان کا
ہدف ناوک قوسین[3] ہوں کن کا ان کا

سراج :— قد ترا سرو رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلشن دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

فدوی :— میں دیا جان کے تئیں جان کے جاناں اپنا
جان من جان جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

ناصر جنگ شہید :— یار خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ذرہ ذرہ میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

کمال :— پیو نے پیر کے گھنگٹ میں دکھایا ہے جمال
یہ عجب راز نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

---

۱ وہ ۲، ۳ صیغۂ تثنیہ عربی دو زلف۔ دو قوس۔

عاجز :— سحر اوس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا
ظہور حق کو دیکھا ، خوب دیکھا ، باضیا دیکھا

کمال :— محبت میں تری اے فتنہ برپا ہم نے کیا دیکھا
ستم دیکھا ، الم دیکھا ، جفا دیکھا ، بلا دیکھا

عزلت :— بندہ ہیں تیری چھب کے مہ سے جمال والے
یہ گل سے گال والے سنبل سے بال والے

کمال :— طلعت کے نور سے کر ہجرت کا[1] دور ظلمت
اک دن مرے گھر آئے ابرو ہلال والے

شمالی ہند کا اثر :—

میردرد :— کیا سیر[2] سب ہم نے گلزار دنیا
گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

کمال :— دیکھا ہے ہم نے گلشن فطرت کا سیر[3] کر
گل تجھ سے خوش نما و معطر نہیں کہیں

مرزا رفیع سودا :— مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں
غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار میرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

کمال :— زاہدا چشم تری کچھ نگراں ہے کہ نہیں
دیکھ ہر ذرہ سے خورشید عیاں ہے کہ نہیں
پردہ غفلت کا اٹھا دیدۂ عرفاں سے دیکھ
شاہد غیب کا آئینہ جہاں ہے کہ نہیں

میر تقی میر :— عشق بازی میں کیا موئے ہیں میر
آگے ہی جی انھوں نے ہارا تھا

---

۱ کو مذکر باندھا ہے ۔ ۲ سیر مذکر مستعمل تھا شمالی ہند و دکن میں ۔ [illegible]

کمال :— بلبلو اوسط گلبازی عشاقی میں
ہار بےدل کی ہے اور جیت دلارام کی ہے

خواجہ میر درد کی رباعی پر رباعی :—

توحید نہ میں چھپا چھپا کہتا ہوں جو کچھ کہتا ہوں برملا کہتا ہوں
مُلاّ کو بھی اس سے نہیں ہے انکار بندہ بندہ خدا خدا کہتا ہوں

کمال :—

سایل کو جواب کیا بجا کہتا ہوں میں آپ کو بندہ نہ خدا کہتا ہوں
میں نیست ہوں راست فی الحقیقت لیکن ہست مطلق کا رونما کہتا ہوں

حافظ شیرازیؒ کے بعض مضامین کو ریختہ میں خوب ادا کیا ہے۔

حافظ :— جاں بے جمال جاناں میل جہاں ندارد
ہر آنکہ ایں ندارد حقا کہ آں ندارد

کمال :— جانِ جاں جاں میں جلوہ گر نیں
جسم میں جان جسم جان میں عبث

حافظ :— چشم جادوئے تو در عین سواد سحر است
ایں قدر ہست کہ ایں نسخہ سقیم افتاد است

کمال :— ساحر جہاں کے بھولے افسون و سحر اپنا
دیکھے جو تجھ نین کی تزویر کا تماشا

حافظ :— نیست بر لوحِ دلم جز الف قامت یار
چہ کنم حرف دگر یاد نداد استادم

کمال :— دل پہ جوں لوح پر قلم نافذ
ہے خیال قد صنم نافذ

حافظ :— از چاشنی قند مگو ہیچ وز شکر
زانرو کہ مرا با لبِ شیرینِ تو کام است

کمال :— جو حلاوت لب حبیب میں ہے
نه رطب[1] میں ہے نه زبیب[2] میں ہے

بعض نعتیه غزلیں آپ کی مرصع ہیں - زور کلام اور روانی ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاآنی کہه رہا ہے :—

قاآنی :— دو ہاروت و دو ماروت دو گلبرگ و دو مرجانش
پر از خواب و پر از تاب و پر از آب و پر از شکر

کمال :— دو زلف مشکیں، عذار رنگیں، دہان شیریں یه سن[3] تمہارے
ہے دام مردم، ہے رشک انجم، ہے سنگ شکر، ہے درّ دریا

قاآنی :— کفش رنگیں، دلش سنگیں، خطش مشکیں، لبش شیریں
بخو نوسن، برو سوسن، برخ گلشن، بتن مرمر

کمال :— مژہ به تیری، نگہ یه تیری، ضمیر تیرا، نظیر تیرا
ہے تیر پرّاں، ہے تیغ برّاں، ہے سنگ خارا، جہاں میں عنقا

قاآنی :— برش دیبا، فرش زیبا، قدش طوبی، خدش جنت
تنش روشن، خطش جوشن، رخش گلشن، لبش شکر

کمال :— یه صافی رو، یه ہر دو ابرو، یه قد دل‌جو، یه چشم جادو
مثال درپن، ہلال روشن، نہال گلشن، غزال صحرا

قاآنی :— سمن خوی و سمن بوی و سمن روی و سمن سیما
پری طبع و پری‌زاد و پری چہر و پری پیکر

کمال :— به تن مطہر، بخوی معطر، برو مقمر، بمو معنبر
به حسن اکثر[4]، به خُلق اکبر، بقدر عالی نبی امی

مرثیه میں قدیم رنگ ہے - صرف چار مرثیے کہے ہیں - ایک مرثیے میں قافیه ہشت حرفی = مستبنین - مستطیعین وغیرہ -

---

۱ رطب عربی لفظ ہے خرمائے تازہ ۲ مراد میوہ تر و خشک کشمش
۳ سن (ع) دانت - ۴ صیغۂ تفضیل (عربی)

کامل برہانپوری:—اے فلک کس کے سبب ماتمی ساماں ہے توں[1]
اے زمیں خاک بسر کس دکھوں حیراں ہے توں
اے سحر کس کے الم چاک گریباں ہے توں
اے صبا کس کی جہت آج پریشاں ہے توں

کمال:— بار سے اس غم کے خم ہے قامت سرو چمن
ہر گل صد برگ کا صد چاک اس ماتم سے تن
اشک شبنم سے ہمیشہ تر ہیں نرگس کے نین
تازہ تر لالہ کے دل پر داغ ہجراں ہے ہنوز

انتخاب کلام:— ہم اپنی نظر انتخاب سے حضرت سید کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے مختلف نمونے پیش کرتے ہیں:—

ہوں مدہوش شراب صاف معنی نہ دُردِ زلف و خط و خال سے مست
سر خوش ہوں بہ جام لعل ساقی پیکر ہے سرخ فام وحدت

دیکھا ہوں جب سے حسن تقدیر کا تماشا
چھوڑا ہوں تب سے روئے تدبیر کا تماشا
تجھ حسن کا تصور ہے فرض عین مجھکو
لازم مرید کو ہے جیوں پیر کا تماشا
ساحر جہاں کے بھولے افسون و سحر اپنا
دیکھے جو تجھ نین کی تزویر کا تماشا
تجھ حسن کی یہ دولت جو دن بدن ہے افزوں
دستا ہے مجھ دعا کی تاثیر کا تماشا

نہ چاہیے تجھے اے مہر مہ رخاں روزہ کہ مہر و مہ پہ روا نہیں کوئی آن روزہ
نہ کر نہ کر تن نازک کے کاست سے تیرے ہزار سوختہ دل کو کرے بجان روزہ

---

[1] تو

دل پہ جوں لوح پر قلم نافذ ہے خیال قد صنم نافذ
شام تجھ زلف کارواں فرمان حکم تجھ رخ کا صبح دم نافذ
جسم و جاں لا الٰہ الا اللہ اسم و شاں لا الٰہ الا اللہ
موج و یم نقد و گنج و دُرّ و صدف لعل و کاں لا الٰہ الا اللہ

دل کو تسخیر کیے ہو شاباش خوب تدبیر کیے ہو شاباش
زلف مرغول دکھاکر دل کو پا بہ زنجیر کیے ہو شاباش
یار کے حسن کا گلستاں دیکھ سیر کرنا ہے بوستان میں عبث

نگہ کی تیغ سے زخمی نہ ہوتا تو رہتا کاش کے چنگا بھلا دل
نہ راہ راست گم کرتا نہ ہوتا اگر آشفتۂ زلف دوتا دل

سوز میرا پتنگ سے پوچھو حال دل اس کا سنگ سے پوچھو
ماجرا میرے اشک جاری کا سیل دریائے گنگ سے پوچھو
ترکِ چشم بتاں کی خونریزی دم تیغ فرنگ سے پوچھو

نفسیات عشق:— بازار حسن یار میں سودائے عشق لے
دے نقد جاں کو نفع و ضرر پر نظر نہ کر
ہے راہ عشق میں خطر جاں بھر قدم
چل جلد تر تو اس کے خطر پر نظر نہ کر
رشک گلشن ہے سجن تجھ حسن کی زیبندگی
غیرت گل ہے تمھارے غنچہ لب کی خندگی
شرم سے گلتا (کھلتا) ہے ہر شب ماہ اے خورشید رو
دیکھ کر تجھ روئے روز افروز کی رخشندگی

کیا عجب نرگس ترے آنکھاں کی شوخی دیکھ کر
چشم میں اپنی لگاوے سرمۂ شرمندگی
یک بیاباں صید ہوں وحشی دلاں اے منہرن
زلف سے اپنی کرے تو جب کمند افگندگی

مومن و کافر کے حق میں یار کی زلف دراز
سبحہ یا حبل‌المتیں زنار یا زنجیر ہے
دل باندھ اپنی زلف سے کہتے ہو مجھ کو جا
مخلص کہاں اسیر ہو ایسے حصار سے

بلبلو اوسط گل‌بازی عشاقی میں
ہار بےدل کی ہے اور جیت دلارام کی ہے

نرم و نازک دیکھنے میں سخت محکم اصل میں
کسوت ابریشمیں ہے تجھ محبت کا لباس

جو حلاوت لب حبیب میں ہے — نہ رطب میں ہے نا زبیب میں ہے
آن میں دلبری و جاں بخشی — جادو اس خندۂ عجیب میں ہے
معجز عیسوی و داؤدی — حمد اللہ دم خطیب میں ہے
حسن تیرا ہوا ادب سے فزوں — طرفہ صنعت ترے ادیب میں ہے
سوز فاضل ہے، شور ہے مفضول — جو پتنگ اور عندلیب میں ہے
یار مایل ہے ہم سے ملنے پر — میل اس سے دل رقیب میں ہے

ریختی :—
تجھ ناز کا جو نیزہ لاگا ہے دل میں تب سوں[1]
کم سوئی سے جانتی ہوں تلوار کی انی میں
جانی تھی خاک اپس[2] کو پن[3] خوب گیان کر کر
دیکھی تو نورتن کی ان‌مول ہوں کنی میں

---

۱ سے ۲ خودکو ۳ پن = پر

قمری نمن[1] لگا کر سب تن کو راکھ اپنے
تجھ سرو قد کے کارن بن گئی ہوں جوگنی[2] میں

تمھارے مکھ کے زلفوں کی قسم ہے کہ تم بن ہم پہ ہر دن مثل شب ہے
پلاؤ وصل کا شربت کہ میرا برہ کی تشنگی سے جاں بلب ہے

اے عاشقاں سے ناحق رزم و قتال والے
غمزہ کی تیر والے مژگاں کی بھال والے
شمشیر عشق سے تجھ آخر ہوئے ہیں زخمی
عصمت کی خود والے عفت کی ڈھال والے
ہر بزم و ہر سرا میں کرتے ہیں ذکر تیرا
اشغال و حال والے مال و منال والے
خوباں تمام جگ کے خوبی کا دان لینے
آتے ہیں در پو[3] تیرے ہوکر سوال والے
ظلمت کے نور سے کر ہجرت کا دور ظلمت
یک شب میرے گھر آ اے ابرو ہلال والے
فرہاد دل کو میرے اب کام بخش[4] ہوکر
دے لب ستی[5] شکر اے شیریں مقال والے
مشتاق تجھ لقا کے عشاق ہیں و لیکن
کمتر ہیں مجھ سے اکثر قرب و وصال والے
دریا دلاں سخن کو پاویں کمال تیرے
کیا جانتے ہیں ناداں غفلت کی جال والے

سوال و جواب :— گفتم کہ ڈالا کفر میں کیوں برہمن کو اے صنم
گفتا کہ میری زلف کا ہر تار اک زنار ہے

---

۱ نمن = طرح ۲ جوگن ۳ پہ ۴ مقصد پورا کرنے کے لیے ۵ سے

حافظ شیرازی اور نیز ولی دکنی نے معشوق کے نامہ و پیام اور ہجر و فراق کا مضمون باندھا ہے اور نامہ و پیام کی شکوہ و شکایت ہے۔ آپ نے اس مضمون میں جدت پیدا کی ہے اور محبوب و محب کی نفسیاتی کیفیت کا خاکہ خوب کھینچا ہے۔ ولی دکنی:—

مدت ہوئی سجن نے اشارت نہیں لکھی
آنے کی اپنے رمز و اشارت نہیں لکھی
مارہا[1] ہے انتظار نے مجھ کو ترے ہنوز
اس بے‌وفا نے دل کی حقیقت نہیں لکھی

حافظ:— دیر است کہ دل‌دار پیامے نفرستاد پیکے ندوانید و سلامے نفرستاد

مگر امیر خسرو رحمۃاللہ کا مضمون بہت بلند ہے۔

مہر دل از تیغ مژہ بشگاف وبر خواں نامۂ

اور شاہ کمال نے اپنی ایک مسلسل غزل میں اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے اور فی‌البدیہہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کا پیام تو پہنچ گیا، مگر میں اب دیدار کا منتظر ہوں اگرچہ کہ یہ مضمون عشق حقیقی پر تمام ہوتا ہے:—

نامہ:—

مکتوب سے جاناں جو مجھے یاد کیے تم
شاباش کہ شاداں دل ناشاد کیے تم
تھا مرغِ رواں غم کے قفس میں جو گرفتار
اے کاشف مشکل اسے آزاد کیے تم
تھا شہر میری روح کا مدت ستی ویراں
بارے سر نو سے اسے آباد کیے تم
کھوئے تپ تشویش پلا شربتِ دیدار
کر عیش عطا طیش کو برباد کیے تم
اوراد دل و جان سحر و شام کیا ہے
وہ نامہ جو داعی طرف ایراد[2] کیے تم

---

۱ مارا ہے

۲ ایراد کیے = لکھے (یعنی تم نے لکھا)

گریز:— مکتوب کے تئیں نصف ملاقات کہو لیک
مجھ عاشق مہجور پو ا بیداد کیے تم

تلمیح :— مجھکو نہ بلا آپ نہ آ۔ بھیج کے قاصد
شیریں روشی در حق فرھاد کیے تم

اطاعت گزاری :— القصہ کیے رحم و یا ظلم و لیکن
ھر حال میں اپنا مجھے منقاد کیے تم

فی البدیہ :— ھے داد الہی کی علامت کہ بدیہاً
اپنی غزل طرفہ کو ایجاد کیے تم

شکریہ :— احسنت کی شادی کا میرے کرکے سر انجام
فی الجملہ ادا خدمت استاد کیے تم

استقلال :— ثابت قدم اس پر ھے سر صدق سے ھر دم
شہمیر کمالی پہ جو ارشاد کیے تم

ولی دکنی کی غزل پر نعت میں بہترین تضمین کی ھے جس سے حقیقت تو یہ ھے کہ غزل میں چار چاند لگادیے ھیں :—

والشمس تری طلعت دلجو سے لکھا ھوں قرآن تری خصلت نیکو سے لکھا ھوں
واللیل سواد سر گیسو سے لکھا ھوں میں سورۂ اخلاص تیرے رو سے لکھا ھوں
بسم اللہ دیوان تجھ ابرو سے لکھا ھوں

تجھ خوئے معطر کی صفت وجہ حسن[۲] پر ھر صبح گزر کرکے لکھوں صحن چمن پر
شبنم کی سیاھی ستی قرطاس سمن پر تجھ چشم کی تعریف کو آھو کے نین پر
اکثر قلم نرگس جادو سے لکھا ھوں

چھوڑا ھوں طوامیر کی تالیف کو اے شوخ مشق خط ریحان کی تکلیف کو اے شوخ
لکھ تیرے خط وخال کی توصیف کو اے شوخ تجھ طرۂ طرار کی تعریف کو اے شوخ
سنبل کے چمن میں گل شبو سے لکھا ھوں

---

۲ باحسن الوجوہ

کیا کوئی لکھے شرح ترے تنگ دھاں کی نیں کس کو[۱] کماھی خبر اس راز نہاں کی
طاقت ھے کسے نقطۂ وھمی کے بیاں کی اے موئےمیاں وصف تیرے موئےمیاں کی
چیونٹی کی کمر پر قلم موسے لکھا ھوں

منظور نظر نیں ھے زر و مال ولی کا دل‌دار کا دیدار ھے اقبال ولی کا
برلاوے کمالی مگر آمال ولی کا اس مردمک چشم طرف حال ولی کا
پلکھاں[۲] سوں قلم کر اپس انجھواں[۳] سوں لکھا ھوں

چکی‌نامه :— عجیب ترنم و موسیقیت کی مثنوی ھے اور آپ کے دیوان کا آخری شاھکار ھے - روایت ھے که خواجه رحمت‌الله قدس سرهٗ کی حرم محترم کی فرمایش پر فی‌البدیه لکھی گئی تھی جس میں جذبات و کیفیات ' جوش ' مستی و سرشاری اور رموز و اسرار پنهاں ھیں - دکنی عورتوں کی زبان اور رسم و رواج شادی کو قلم‌بند فرمایا ھے :—

(۱) اعوذ بالله من الشیطن الرجیم
بفضل بسم‌الله الرحمن الرحیم

(۲) بسم‌الله بسم‌الله ھردم میں بولوں‌گی
ثنا اور صفت کے موتیوں کو رولوں‌گی

(۳) بسم‌الله بسم‌الله سمرن[۴] میرے من کا
ھردم ھے وظیفه ناؤں[۵] اس ساجن کا

(۴) بسم‌الله جو ناری[۶] یکباری[۷] کہےگی
بدی اس کی ذری[۸] باقی نه رھےگی

(۵) بسم‌الله کہنے میں شیطان یوں جل‌جاتا
اگن[۹] کے درمیانی[۱۰] کتھل[۱۱] جوں گل‌جاتا[۱۲]

---

۱ کسی کو ۲ پلک ۳ انجھواں=آنسو ۴ مالا ۵ نام ۶ عورت
۷ اپکبار ۸ ذره برابر ۹ اگن : آگ ۱۰ درمیان ۱۱ قلعي ۱۲ پگھل جاتا

(۶) بسم اللہ جو سندر[۱] صدق سے کہے گی
وہ پار ہو دوزخ سے جنت میں رہے گی

(۷) بسم اللہ سے حق نے سنوارا قرآن کو
جیسے چندر، سورج، تاروں سے آسمان[۲] کو

(۸) بسم اللہ میں الحمد[۳] - الحمد میں مصحف سب
بسم اللہ کے بے کے نقطے میں سب مطلب

(۹) بسم اللہ کے نیہ[۴] کی مدن[۵] کی ماتی[۶] ہوں
پل پل[۷] اس ناؤں کے صدقہ میں جاتی ہوں

(۱۰) بسم اللہ میں پیارے اس تن[۸] سے چھٹ جانا
مسمّٰی میں بعد از میں پن[۹] سے اٹھ جانا

(۱۱) بسم اللہ سے کرنا چکی کا ابتدا
وحدت کے آٹے میں برکت دے گا خدا

(۱۲) بسم اللہ کے بل سے چکی میں بھراؤں
کامل سب صفتاں سے جن کو سراؤں

(۱۳) سہیلیاں کلمے کے نول چکی میانے
دوئی کے خطراں کو بھاکے[۱۰] پیسو دانے

(۱۴) اقرار کا ہے کھونٹا تصدیق کی ہے میانی
نفی کے ہاتھوں سے اثبات چکسا[۱۱] چھانی

---

۱ ماہرو ۲ آسمان ۳ قول حضرت علیؓ جس کو وجہی نے بھی سب رس میں نقل کیا ہے - تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے - ۴ نیر ۵ شراب محبت ۶ کشتہ - متوالی - سرشار ۷ لحظہ بلحظہ - ۸ ایک مرتبہ ہے جس میں سالک کی نظر جسم خاکی سے اٹھ جاتی ہے اور وہ عالم ملکوت میں پہنچ جاتا ہے ۹ مرتبۂ فنا - محبوب میں فنا ہوجاتا ہے میں و تو کا جھگڑا باقی نہیں رہتا - سراج دکنی :-

نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

۱۰ بھاکے ، ڈال کر ۱۱ ایک قسم کا مسالا جسے عورتیں جسم پر نہاتے وقت لگاتی ہیں -

(۱۵) عینیت[۱] غیریت[۲] چاکی کے دو پاٹان
اللہ اور نبی سے ملنے کی وہ باٹان[۳]

(۱۶) چاکی کو پھرانا ارشاد کی قوت سے
ہو ہو آواز اس میں آتا ہے قدرت سے

(۱۷) پیسنا[۴] اس چاکی کا انبھیائی[۵] کو نیں آتا
سہاگن کے ہاتوں چکسا پیسے جانا

(۱۸) اول تو یہ چاکی دولہ[۶] نے پھرایا[۷]
تس[۸] پچھے دلھن[۹] کو پھرانے[۱۰] سکھایا

(۱۹) بعد از ساری بیویاں[۱۱] دلھن سے سکھیاں[۱۲] ہیں
زباں پر راکھیاں[۱۳] ہیں دلوں میں لکھیاں[۱۴] ہیں

(۲۰) الااللہ فرما کے اثبات اپنی جوڑا[۱۵]
لا[۱۶] کہہ کے اللہ نے بولو کس کو چھوڑا

(۲۱) لازم ہے نیاریاں[۱۷] ہو اول پیو کو پانا[۱۸]
حاصل کیا نا پا کے خالی گیتاں[۱۹] گانا

(۲۲) میں نیں[۲۰] ہوں یا ہے ہوں یا رب ہوں یا بندی
بوجی نیں سو ناری دونوں جگ میں اندھی

۱-۲ اصطلاحات تصوف عینیت سے مراد بندہ روحانی ترقی کرکے خدا کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے مگر بعینہ خدا نہیں ہوجاتا - نیز صوفیا کا عقیدہ لاموجود الااللہ ہے - غیریت یعنی بندہ خدا کا غیر ہے - تکالیف شرعیہ سے مکلف بھی ہے دونوں نسبت ثابت رکھنا ضروری ہے ۳ باٹ : راستہ- باٹاں : راستے (دکنی) ۴ اس کا تلفظ پسنا یعنی پیسنا ۵ ان بیاہی ۶ دولہ سے مراد خدا - چاکی سے مراد قران حکیم ۷ پھرائی ۸ تس پیچھے : اس کے بعد ۹ دلھن استعارہ ہے رسول سے ۱۰ پھرانا سکھایا یعنی اقرا بسم ربک الذی خلق ۱۱ ساری بیویاں استعارہ ہے جمیع صحابہ رض سے ۱۲، ۱۳، ۱۴ سیکھے - رکھے - لکھے ۱۵ جوڑا یعنی جوڑ دیا - وحدت اوریکانگی ثابت کی ۱۶ لا سے تمام تعینات کی نفی کردی یعنی تعینا بالذات لاوجود ہیں - کوس لمن الملک الیوم بجایا — ۱۷ نیاریان ، ہمجولیاں ۱۸ معرفت اولین فرض ہے ۱۹ بغیر معرفت کے اشغال و اذکار جھوٹے گیت ہیں ۲۰ نہیں

(۲۳) خدا ہونا ہو تو خودی کا سر مونڈو
خودی کھونا ہے تو کامل مرشد ڈھونڈو

(۲٤) دل کا صندوق[1] کھولو کلمہ کی لیو[2] کونجی
اللہ کی پچھانت[3] اس میں مایا پونجی

(۲۵) دولا اور دلھن کے جلوہ کی رات[4] آئی
میں سو تو تو سو میں کیا بہتر بات آئی

(۲٦) حقیقت میں دلھن دولہ سے بیگانی[5]
دولہ جم‌جم[6] باقی دولھن نت‌نت فانی

(۲۷) پھر دیکھوں تو یک ہی دولہ دلھن دو مل
جدائی اور دوری دونو میں نیں[7] یک تل[8]

(۲۸) اٹھا ساتو[9] پردے دیکھی پیو کی صورت
ہے پن[10] جس کا معنی میں پن[11] جس کی صورت

(۲۹) نا او دولہ میرا نا میں اوس کی دولھن
جو کچھ نیں سو میں ہوں جو کچھ ہے سو لالن[12]

(۳۰) حقیقت دلھن کی عدم ہے امکانی
ماہیت دولہ کی ہستی ہے وحدانی

(۳۱) دولے کا وہ ہےپن[13] دلھن کا وہ نیں‌پن[14]
یک یک کی ماہیت یک یک کا ہے درپن[15]

(۳۲) دلھن کی صورت سے دولہ خود ظاہر ہے
دولہ کی ہستی سے دلھن کب باہر ہے

---

۱ دکنی تلفظ صندق ۲ لو ۳ پچھانت یعنی پہچان ۴ مراد شب معراج' استعارہ ہے
۵ اس کا دکنی تلفظ بگانی معنی غیر حقیقی ہے ٦ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا ۷ نہیں
۸ تل برابر بھی نہیں ۹ ساتوں پردے استعارہ ہے سات آسمان سے ۱۰ ہے پن یعنی
ذات بحت وجود محض ۱۱ انانیت مرتبۂ وحدت ۱۲ لالن مشاطہ مراد جبرئیل قوت جبرئیلیہ
واسطہ ہے ملاقات کا ۔ ۱۳ ہے پن: ہستی ۱۴ نیں پن یعنی نہیں' پن مراد نیستی ۱۵ آئینہ

(۳۳)　دانائی تجی[1] ہوں دیوانی[2] ہوں پیو کی
　　رتی[3] نیں رکھتی ہوں پروا اپنے جی کی

(۳۴)　پرم[4] کا پیالہ بھر بھر کر دیے مجھ[5]
　　شہمیر[6] پیر کی واری متوالی کیے مجھ[7]

(۳۵)　بختاں[8] سے پائی ہوں ایسا مرشد کامل
　　شریعت پو[9] ثابت حقیقت سے واصل

(۳۶)　گیانی[10] سوندر[11] ہو سو بوجھے میرے بتیاں[12]
　　ست کت[13] کے کاجل سے روشن جس کے نیناں

(۳۷)　ایسا چکی نامہ چاتر دھن[14] کوئی گاوے
　　چکی کے گھونگٹ میں پیو کا مکھ نجھاوے[15]

(۳۸)　ھر شے اللہ[16] ہے کر یقین[17] دھر کمالی
　　دوئی کے گمان سے اپس کو[18] کر خالی

---

۱ تجی ہوں یعنی تج گئی ہوں کھو بیٹھی ہوں جس کے لیے انسان ترس ترس جائے مطلب مدھوش و سرشار ہوں　۲ تالفظ دِوانی ہے　۳ رتی، ذرہ برابر　۴ پرم یعنی پریم، محبت　۵ مجھ یعنی مجھے، مجھ کو　۶ پیر طریقت سید محمد شہمیر مصنف اسرارالتوحید (نثر) (اردوے قدیم)　۷ مجھے، مجھ کو　۸ بخت، قسمت　۹ پو (دکنی) پر- پہ　۱۰ گیانی گیان سے - عقلمند، سمجھدار　۱۱ سوندر＝سندر　۱۲ باتیں کی روشنی　۱۳ مراد معرفت　۱۴ چاتر، ہشیار — دھن، معشوق خوش‌قسمت　۱۵ نجھاوے : نظر آوے　۱۶ مراد مسئلہ وحدت‌الوجود - ہمہ اوست　۱۷ مراد عین‌الیقین　۱۸ اپس کو یعنی خود کو -

روسی ناول، پہلا دور

تالستائی

از

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے آنرز (آکسن)

روسی ادب کے دینی اور اخلاقی رجحانات کا اکثر ذکر آچکا ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ لوگوں کا جذبۂ دینی اظہار سے محروم رہ کر کس طرح بگڑ گیا اور دستۂ لغسکی کے دل میں اسی جذبۂ دینی نے کس طرح کامل انسان کا عکس ناول میں اتار لینے کی آرزو پیدا کی۔ تالستائی کی شخصیت اور تصانیف میں روسی ادب کا یہ رجحان من کی حد سے نکل کر سیاست، اخلاق اور مذہب کے میدانوں میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک زمانے کی آسودگی، اطمینان اور خودپسندی کی ایسی قلعی کھولی کہ ساری دنیا میں کھلبلی مچ گئی، ایک معیار کو جسے یورپی تہذیب نے ردی سمجھ کر کباڑخانے میں ڈال دیا تھا دوبارہ عقیدت کی عزت بخشی اور ناول نویس کی حقیقت بینی مصلح اور رہبر ہونے کا حوصلہ کرنے لگی۔

تالستائی کی ادبی زندگی تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، جن میں سے پہلا جو خالص ناول نویسی کا دور ہے، ۱۸۷۶ کے لگ بھگ "آننی کارنین" کی تصنیف کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ اخلاقی اور دینی جد و جہد کا زمانہ ہے، جب ناول نویسی تالستائی کی کارگزاری کا بس ایک پہلو تھی اور اس کا معیار اس کے دینی اور اخلاقی عقیدوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ دور ۱۹۰۰ میں ختم ہوا۔ اور اس کے بعد پھر تالستائی کی حیثیت ایک اخلاقی معلم کی سی ہوگئی۔

جو مختلف مسائل پر براہ راست اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے اور جسے اس کی خواہش یا ضرورت نہیں کہ انھیں ادبی پیرائے میں بیان کرے ۔ یہ تینوں دور تالستائی کی شخصیت کی نشوونما کی تین منزلیں ہیں ۔ ان کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو صبح کا دوپہر سے اور دوپہر کا شام سے ۔ انھیں ہم الگ تو کر سکتے ہیں ' جیسے ہم دن کو پہروں میں تقسیم کرتے ہیں ' لیکن اس کا خیال رکھ کر کہ آفتاب وہی تھا اس کا مقام بدلتا رہا ۔

تالستائی کے روزنامچے اور اس کی ابتدائی زندگی کے واقعات سے ہم کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی طبیعت بہت حساس تھی ' اس کے جذبات میں بڑی شدت تھی اور جیسا کہ ایسے مزاج کے لوگوں میں اکثر دیکھا جاتا ہے ' اس میں جھیپ اور خودپسندی بہت تھی اور اس کی طبیعت پلٹے بھی بہت کھایا کرتی تھی ۔ تقدیر نے اسے ایک آبرودار ' دولت‌مند خاندان میں پیدا کرکے بہت سی مشکلیں آسان کردی تھیں ' لیکن ایک تو اسے صورت بڑی ہی خراب ملی تھی ' دوسرے اس کی خواہشیں اس کی استعداد سے ہمیشہ دس قدم آگے رہتی تھیں ' اس لیے اس میں خوداعتمادی پیدا نہ ہو سکی ۔ طبیعت کو بےچینی ایک روگ کی طرح لگ گئی اور اس کا لڑکپن اور شروع جوانی کا زمانہ اپنے عیب گنتے ' غلطیاں کرتے اور پھر اپنے دل سے ان کا اعتراف کرکے اپنے لیے سزائیں تجویز کرتے گزرا ۔ تعلیم سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوا ' نہ اپنی طبیعت کی افتاد کا پتہ چلا نہ اپنے اندر کسی صلاحیت کا احساس ہوا اور ناول‌نویسی کی پہلی کوششوں میں اسے کامیابی نہ ہوتی تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا ۔ یہ کامیابی اس کے لیے بڑا سہارا ہوگئی اور اس کے نمو کی ان قوتوں کو جو اب تک گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھیں صرف میں آنے کا موقع مل گیا لیکن انشا پردازی تالستائی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں تھی ' اس کے دل میں بہت سے حوصلے تھے جنھیں نکلنے کو اس طرح رستہ ملا ' مگر یہ رستہ تنگ تھا اور حوصلوں میں وسعت اور جوش اور وہ انشاپردازی کی حدبندیوں کو توڑ کر ادھر ادھر بہ نکلے ۔ پھر ان بندوں کو توڑ دینا بھی سیلاب کے لیے کافی نہ رہا ' تالستائی کی شخصیت دنیا کو

اپنے رنگ میں رنگ دینے کی آرزو میں تڑپنے لگی اور جب تک جسم میں جان تھی دل میں یہ تڑپ رہی ۔ ایسی حساس اور جوشیلی طبیعت جیسی کہ تالستائی کی تھی تربیت اور تعلیم کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہے اور تالستائی کو صحیح تربیت اور تعلیم دینے والے ملے بھی نہیں ۔ ۱۸۳۰ میں، جب وہ دو برس کا تھا، اس کی ماں کا انتقال ہوگیا اور اسی کے چند سال بعد اس کے باپ کا ۔ جن رشتہ‌داروں نے اس کی اور اس کے بھائی بہنوں کی پرورش کی وہ اس سے محبت تو کرتے تھے، مگر اس کی طبیعت کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، انھوں نے تالستائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچا سکتے تھے ۔ تعلیم میں تالستائی کا کبھی جی نہیں لگا، شاید اس لیے کہ تعلیم اور معلموں میں کوئی کشش نہ تھی، تالستائی نے کوئی مضمون آخر تک نہیں پڑھا اور کورس ختم کیے بغیر یونیورسٹی کو چھوڑ کر جائداد کا انتظام کرنے کے بہانے سے گھر چلا آیا ۔ اس وقت تعلیم میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اس کی ذہنی نشوو نما کے لیے خاصی مضر ثابت ہوئی اور اسے وہ برسوں تک اپنے طور پر مطالعہ کرکے بھی پورا نہ کرسکا ۔ جائداد کے انتظام کا شوق دراصل کتابی تعلیم سے بھاگ کر دنیا اور آدمیوں میں رہنے اور عمل کے ذریعے استعداد اور تجربہ بڑھانے کی قدرتی خواہش کا نتیجہ تھا، لیکن وہ استقلال جو اس طرح کی تعلیم کو کارآمد بنانے کے لیے لازمی ہے تالستائی کی طبیعت میں تھا ہی نہیں ۔ کسانوں کی اصلاح کا خیال کسانوں کی ذہنی اور اخلاقی پستی سے دو چار ہوتے ہی خود بخود غائب ہوگیا اور تالستائی اپنی نشوو نما کی اس منزل تک ابھی پہنچا نہ تھا کہ اسے اپنی ذہنیت اور معاشرت میں اخلاقی بگاڑ نظر آیا اور کسانوں کی زندگی صحیح اور سچی معلوم ہوئی ۔ وہ زمیندار تھا اور جائداد کے انتظام کی اس پہلی کوشش کے بعد بھی وہ زمیندار ہی رہا ۔

تالستائی کی طبیعت کی کلی ۱۸۵۱ میں قفقاز جاکر کھلی اور وہیں کی فضا اور مناظر نے اس کی نظروں پر سے وہ پردہ ہٹایا جس نے اب تک اس کو اندھا بنا رکھا تھا ۔ سماجی زندگی نے اس کے جذبات میں ایک الجھاؤ پیدا کر دیا تھا، آدمیوں کی صحبت نے

اسے خودبیں اور خودپسند بنا دیا تھا، یہاں وہ ایک‌بارگی فطرت کی گود میں پہنچ گیا اور ایک بچے کی طرح جو اپنی ماں سے جدا رہ کر پھر ملا ہو، تالستائی پر مسرت کا ایک وجد سا طاری ہوگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی طبیعت سے اب تک ناواقف اور اپنی اصل سے دور رہا ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی بہت سے حوصلے جو اس کے دل میں غافل پڑے تھے چونک اٹھے۔ پیاس سے مرجھائی ہوئی کھیتی کو اب گویا پانی ملا تھا، اس کا رنگ بدلا، شگفتگی آئی، ہر پود سے کلے پھوٹنے لگے۔

انسان اپنی ذات، اپنی شخصیت کا کچھ ایسا گرویدہ، اپنے دل میں کچھ ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اس کے باہر وہ کبھی نکل نہیں پاتا اور نکلتا بھی ہے تو بھٹکنے لگتا ہے۔ اس کی جگ بیتی تبھی سچی اور موثر ہوتی ہے جب وہ آپ بیتی کا ایک روپ ہو، واقعات اور حادثوں کو وہ تبھی سمجھا سکتا ہے جب وہ خود اس پر گزرے ہوں، زندگی اور دنیا کے راز وہ تبھی معلوم کر سکتا ہے جب اس نے اپنی شخصیت کے راز معلوم کر لیے ہوں۔ اس سے اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری حقیقت انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسان کی دنیا اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی کہ اس کی شخصیت، یعنی کوئی کال کوٹھری میں بند ہوتا ہے اور کوئی ساری مادی اور انسانی دنیا پر حاوی۔ حقیقت نگار صرف اپنی حقیقت بیان کرتا ہے اور اس فن میں کامل ہم اسی کو کہیں گے جو ایک دنیا کی زندگی کا سارا طلسم اپنے اندر رکھتا ہو اور وہ اپنے دل پر نظر ڈالے تو ایک دنیا کا ماجرا بیان ہو جائے۔ تالستائی نے اپنی انشاپردازی اپنی سوانح عمری سے شروع کی اور سوانح‌عمری بچپن سے، جو جسم کے لیے نہیں تو شخصیت کے لیے عدم اور وجود کی درمیانی کیفیت ہوتی ہے۔ اس نے ناول‌نویسی کی مشق بالکل نہیں کی تھی، لیکن اپنی طبیعت پر وہ ایک زمانے سے غور کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی معیار نہ تھا اور کسی معیار پر پورا اترنے کا اسے یقین بھی نہ تھا، لیکن تخیل اور قلم کو آزاد چھوڑ دینے سے اس کے بیان میں ایسی بےساختگی، سچائی اور سادگی آ گئی جو

خود معیار ہے اور جسے دیکھتے ہی پہچاننے والے پہچان لیتے ہیں۔

تالستائی کی انشاپردازی کا ہر رنگ دراصل اس کی شخصیت کا رنگ تھا۔ اس کی ابتدائی اور آخری تصانیف میں، خواہ وہ ناول ہوں یا رسالے، یہ خصوصیت مشترک ہے کہ ان کا جوہر آپ بیتی کا وہ عنصر ہے جو ان میں شامل کیا گیا یا ہوگیا۔ اس طرح اس کی تصانیف پر معقول بحث کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ہمیں اس کی شخصیت کا اندازہ ہو جائے اور نشو و نما کی جو منزلیں اس نے طے کیں ان کا ایک نقشہ ہمارے ذہن میں قایم ہو جائے۔

یہ تو ہم بیان کر چکے ہیں کہ تالستائی بہت حساس تھا اور اس کے جذبات سوئے ہوئے رہتے یا اگر اٹھتے تو ایک طوفان موج کی طرح۔ لیکن اس کے باوجود تالستائی کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی اور ہر مسئلے پر اس کی نظر صاف اور سیدھی پڑتی تھی، اس میں نہ تہذیب کی وہ خودپسندی تھی نہ مذاق اور ذہن کے وہ تعصبات جو غور کرنے سے پہلے ہی رائے کو کسی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ مناظر قدرت نے اسے اپنے نفس اور اپنے جذبات کا مطالعہ کرنے کا شوق دلا کر ناول نویس بنادیا، پھر بعد کو جب تہذیب سے اس کا جی ہٹ گیا تو کسانوں کی سیدھی سادی طبیعتوں اور دیہات کی معاشرت سے اس نے اتنا اثر لیا کہ بڑے خلوص اور جوش کے ساتھ اسے مہذب زندگی کے مقابلے پر لایا اور اس میں شک نہیں کہ دل و دماغ کی وہ سادگی، طبیعتوں کا وہ ہموار اور سلجھا ہونا، جس کی شان یہ ہے کہ محسوس نہ ہو، اسے وجد میں لا سکتا تھا۔ اس کی آنکھ دنیا کو اور آدمیوں کو بچوں کی نظر سے دیکھتی تھی اور اس کا دماغ ان دیکھی ہوئی چیزوں کو بوڑھوں کی طرح جانچتا تھا؛ جو تصویر وہ کھینچتا ہے وہ تعصب اور نظر کے دھوکوں سے خالی اور اس وجہ سے صحیح اور دلکش ہوتی ہے؛ جو رائے وہ قائم کرتا ہے وہ ایک حساس دل کی سرگزشت اور تجربے پر منحصر اور اس وجہ سے سبق آموز ہوتی ہے۔ یہ سب بڑی نایاب خوبیاں ہیں اور اگر ناول نویسی میں تسکین دینے کا اتنا مادہ ہوتا کہ وہ تالستائی جیسی بے چین طبیعت رکھنے والے کی زندگی کا مقصد

بن سکے تو تالستائی ناول نویسی میں کامل ہوتا اور ہمیشہ کے لیے ویسے ہی سرفراز مانا جاتا جیسے کہ کوہ ایورسٹ پہاڑ کی چوٹیوں میں ۔

لیکن ناول‌نویسی میں اتنی وسعت کہاں کہ وہ تالستائی جیسی شخصیت کے لیے جولاں‌گاہ بن سکے ۔ اس کی طبیعت میں موج پر موج اٹھتی رہتی ' کبھی دو چار موجیں ایک ہی طرف بہتیں تو کبھی سب ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتیں اور وہ طوفان برپا ہوتا کہ خدا کی پناہ ۔ تالستائی کو کبھی رفاہ‌عام کا حوصلہ ہوا ' کبھی تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا شوق اور تان اس پر ٹوٹی کہ دنیا میں وہ دین جو دراصل حضرت عیسی کا دین تھا عام مسلک بنایا جائے ۔ یہ سب حوصلے بہت بڑے تھے ' اتنے بڑے کہ ہر ایک کے لیے عمریں وقف کی جائیں تو بھی یقین نہ ہو کہ ان کے پورے ہونے کی صورت نکل آئی ہے ' ان میں سے ہر ایک کے لیے وہ صبر اور استقلال چاہیے جو وقت کو خاطر میں نہ لائے اور کوشش کو کامیابی سمجھے ۔ تالستائی کا تخیل اور اس کا دل اتنا بڑا اور قدرشناس تھا کہ ہر حوصلہ پر جان کو قربان کرنا وہ ایک ادنی خدمت سمجھتا تھا ' لیکن اس کے دل کو بڑے حوصلوں کی تاب نہ تھی ' وہ انھیں پیدا ہوتے ہی دنیا کے سپرد کر دیتا یا وہ خود اس کے دل کے باہر کود پڑتے ۔ ہر حوصلہ اسے دنیا کو بدل دینے کی فکر میں ڈال دیتا ' اس کی شخصیت میں وہ صفات پیدا نہ کرتا جو دنیا کو بدل سکتی ہیں ۔ اس کی نظر سب کچھ دیکھ سکتی تھی ' ایسی گہرائیاں ناپ سکتی تھی جہاں وجدان کے سوا علم کے کسی ذریعے کی رسائی نہیں ' لیکن آنکھ کی دیکھی چیز اس کی طبیعت کے سانچے میں ڈھل کر دوسروں تک نہیں پہنچتی تھی ' اس کا نقش فوراً دنیا پر اثر آتا اور تالستائی کی اپنی شخصیت اس کاغذ کی طرح رہ جاتی جس پر سے کسی نے تصویر مٹائی ہو ۔ اس کے جذبات کا سیلاب کبھی ادھر بہتا کبھی ادھر ' کسی کی کھیتی سیراب نہ ہوتی اور جب وہ گزر جاتا تو تالستائی کے اپنے دل میں بھی اس کا پتہ دینے کو ایک ذرا سا نالہ تک نہ رہ جاتا ' بس خشک زمین کی صورت یہ بتاتی تھی کہ ادھر سے سیلاب گزرا ہے ۔

تالستائی میں یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید وہ ناول‌نویس نہ ہوتا ' اس سے کچھ

بہت بڑھ کر ہوتا اور وہ اپنی کمزوریاں محسوس نہ کرتا تو دنیا اس بصیرت افروز ہنگامے سے محروم رہ جاتی جو اس کی تنقید نے پیدا کیا۔ ہمیں اس کی دینی اور معاشرتی تعلیم کے صحیح اور کامیاب ہونے سے بحث نہیں، صرف اس ادیب سے مطلب ہے جس نے ادب، فن اور اخلاق کے چشموں کو ملا کر اپنے دل—اور اس کے ساتھ ساری دنیا—کی پیاس کو بجھانا چاہا، جس نے حجاب کی رسموں کو توڑ کر ادب کو دین اور اخلاق کی صورت دکھائی اور قلم کی انتہائی قوت میں بےچارگی پائی تو اسے اٹھا کر پھینک دیا اور دل کو ہاتھ میں لےکر دنیا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

ناول نویسوں کے لیے، خصوصاً جب وہ حقیقت نگاری کا دعوے کرتے ہوں، یہ خلاف ادب مانا گیا ہے کہ وہ قصے میں اپنے خیالات کو اس طرح ظاہر کریں کہ وہ ایک پیوند معلوم ہوں، یا افسانے کے ذریعے سے اپنے کسی عقیدے کی کھلم کھلا تبلیغ کریں۔ تالستائی نے اس قاعدے کی پروا نہیں کی اور شروع میں کم لیکن آخر میں بہت زیادہ اپنے خیالات اور عقیدوں کو ناولوں اور افسانوں میں بیان کرتا رہا۔ کہیں پر تو بےشک اس کی یہ تبلیغی کوششیں گراں گزرتی ہیں اور اصل داستان سے الگ اور بےتعلق ہوجاتی ہیں، مگر دوسری طرف دیکھیے تو ناول نویسوں کا دعوے کہ وہ آدمی اور دنیا کو جیسی کہ وہ ہے دکھاسکتے ہیں صریحی دھوکا ہے۔ فن اور فن کے سچے قدردانوں کا مطالبہ تو بس یہ ہوتا ہے کہ ناول‌نویس آدمی کے نام سے پتلے بناکر نہ کھڑے کردے اور زندگی کی وارداتوں کے بہانے سے خیالی باتیں بیان کرکے نہ رہ‌جائے۔ یعنی اسے آدمی کی سیرت اور زندگی کے کاروبار سے غیرمعمولی طور پر گہری اور سچی واقفیت ہونا چاہیے، خواہ وہ یہ واقفیت اخبارنویسوں کی طرح آنکھوں سے دیکھ‌کر حاصل کرے یا اپنے جذبات کے دریا میں غوطے لگاکر۔ قصہ تو بہرحال سوچا جاتا ہے، سیرتوں اور صورتوں کے نقش بنائے اور مٹائے جاتے ہیں جب تک کہ وہ اصل کے بالکل مطابق نہ ہوجائیں۔ تالستائی نے چھوٹے قاعدے کی پروا نہ کی، مگر وہ سچائی اور خلوص کا ایسا دلدادہ تھا کہ اس کی تصانیف میں حقیقت

اور افسانے کے درمیان فرق ہی نہیں رہا۔ اس کے بیان میں ہم شروع ہی سے ایک بےتکلفی، سادگی اور صفائی دیکھتے ہیں جو یا تو قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے یا برسوں کی محنت اور مشق کے بعد کسی کسی کو حاصل ہوتی ہے اور یہی صفت تھی جس نے اس کی پہلی تصانیف میں ایسی کشش پیدا کردی کہ وہ قصے کو دلچسپ بنانا درکنار، قصہ سنانے ہی کی شرط سے بری ہوگیا۔ یہ صفت روس کے اور کئی ناول‌نویسوں میں پائی جاتی ہے، تالستائی دوسروں سے بازی لےگیا اس لیے کہ اس کی ادبی صفات میں ایک شخصیت کی پرچھائیں بھی نظر آتی تھی جو اور کسی روسی ناول‌نویس کو نصیب نہ ہوئی۔

تالستائی کا مذاق اور اس کے رجحانات کی ایک علامت یہ ہے کہ اس نے لکھنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے "بچپن" لکھا۔ شاید قفقاز کے مناظر کا اس کی طبیعت پر جو اثر پڑا اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے ورق الٹ کر اور کئی حصوں پر قلم پھیر کر اسے دوبارہ اور اس نئی نظر سے جو قفقاز کی دین تھی، مرتب کرنا شروع کیا۔ سرگزشت کی یہ نئی ترتیب تاریخ نہ تھی، اس وجہ سے اس کو افسانہ کہا گیا، لیکن لکھتے وقت تالستائی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ تاریخ سے زیادہ صحیح ہے کہ اس میں آغاز اور انجام کا خیال رکھا گیا ہے، اس میں جان ہے، اسے پیار سے دیکھا جاسکتا ہے۔ جو کوئی محض کھوج کی خاطر تالستائی کے بچپن کے حالات معلوم کرنا چاہے اسے اس کتاب کا دوسری "تاریخی" کتابوں سے مقابلہ کرنا ہوگا؛ جو تالستائی کے بچپن میں اپنا بچپن دیکھنا چاہے اور شخصیت کی کلی کے کھلنے کا مزہ لینا چاہے اس کے لیے یہ افسانہ نہیں بلکہ مستند سے مستند تاریخ سے بھی زیادہ صحیح اور بصیرت افروز ہوگی، کیوں‌کہ اس میں وہ حقیقتیں اور کیفیتیں بیان کی گئی ہیں جن تک مورخ کی رسائی نہیں ہوتی۔ "بچپن" کی ایک کیفیت ملاحظہ ہو:

"پیٹ بھر کر کھاچکے ہیں۔ چائے کی میز کے سامنے اونچی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دودھ اور شکر کا پیالہ پیے ہوئے دیر ہوچکی۔ نیند جیسے پپوٹوں کو چپکائے دیتی ہے۔ مگر اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بیٹھے ہیں اور سن رہے ہیں۔ سنیں نہ

تو کریں کیا۔ اماں کسی سے باتیں کررہی ہیں ۔ ان کی آواز بڑی میٹھی اور خوش اخلاقی سے بھری ہے ۔ آواز سنوں اور بات نہ سمجھوں تب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے دل سے بہت کچھ کہہ گئیں ۔ نیند سے نظر دھندلی پڑگئی ہے مگر میں انھیں کی طرف دیکھے جاتا ہوں ۔ ایکبارگی وہ چھوٹی ہوجاتی ہیں، بالکل مُنّی سی ۔ ان کا چہرہ بٹن سے بڑا نہیں ہے، مگر مجھے بالکل صاف دکھائی دیتا ہے ۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ پر ایک نظر ڈالتی ہیں اور مسکراتی ہیں ۔ مجھے وہ اتنی چھوٹی بہت بھلی لگتی ہیں ۔ میں اپنی آنکھیں اور دبا لیتا ہوں ۔ اب وہ بس اتنی بڑی ہیں جتنے کہ وہ چھوٹے بچے جو پتلیوں میں دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن پھر میں ہل جاتا ہوں اور یہ سارا تماشا ختم ہوجاتا ہے ۔ میں اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں، بدن کو ادھر ادھر مڑوڑتا ہوں، ہر طرح سے کوشش کرتا ہوں کہ تماشا پھر سے دیکھوں، مگر کچھ نہیں ہوتا ۔ »

« بچپن » ختم ہوتا ہے تو « لڑکپن » اور « جوانی » شروع ہوتی ہے، بچپن کا بھولاپن اب بدل کر لڑکے کی بےچینی اور جوان کی جستجو بن جاتا ہے، کلی اب پھول بن گئی ہے، پھول اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور چمن، صبا اور بہار، خزاں اور انتشار، سب کا حال اس پر کھلنے لگتا ہے ۔ اس دور کی کیفیتیں بیان کرتے وقت ٹالسٹائی کی نظر زیادہ تیز اور گہری ہوجاتی ہے اور وہ تمام احساسات جنھوں نے اس زمانے میں اسے پریشان اور جان سے بیزار کردیا تھا سب کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے جب وہ جائداد کا انتظام کرنے کے لیے یونیورسٹی چھوڑ کر گھر چلا آیا تھا اور « زمیندار کی صبح » اس وقت کی زندگی کا سچا اور موثر خاکہ ہے جس میں اس نے نہ اپنے ساتھ کوئی رعایت کی ہے نہ ان غلام کسانوں کے ساتھ جن سے اس کا سابقہ تھا ۔ اس کے مشاہدے میں اب وہ بےباکی آگئی ہے جس نے آگے چل کر اس کی حقیقت نگاری کو سوسائٹی کے لیے ایک تازیانہ بنادیا، مگر ساتھ ہی محبت اور انسانی ہمدردی کی چارہ سازی پر ایسا بھروسا بھی نظر آتا ہے جو سچائی اور حقیقت نگاری کی کڑی دھوپ میں سائے کی طرح پناہ دیتا ہے ۔

تالستائی ۱۸۵۱ میں قفقاز گیا اور اسی دوران میں جب وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہا تھا اس نے وہاں کے منظروں کی تصویریں بھی کھینچیں۔ اس فن میں بھی اسے کمال تھا۔ دوسرے روسی مصنفوں سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی زبان کچھ خاص طور پر اچھی نہیں، لیکن اس میں مشاہدے کی جو قوت تھی وہ اس کے بیان میں ایک انوکھی تاثیر پیدا کردیتی جو شاعری اور مصوری دونوں کی تاثیر سے جدا تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ تالستائی قدرت کو اس نظر سے دیکھتا تھا جس سے کہ اپنے آپ کو اور صبح اور شام، سکون اور طوفان، غرض قدرت کا ہر رنگ اور ہر کیفیت اس کی اپنی کیفیت، اس کی آپ بیتی بن جاتی تھی۔ قفقاز کی ایک صبح کا منظر، جو اس کے افسانے «حملہ آور» میں بیان کیا گیا ہے، اور «برف کا طوفان» دونوں فن کی شاہکار مانی جاتی ہیں۔ لیکن قفقاز کی فضا سے اثر لے کر تالستائی نے جو کچھ لکھا اس میں اس کا افسانہ «کوسک» سب سے ممتاز ہے۔

«کوسک» کا قصہ بہت مختصر ہے۔ ایک روسی نوجوان اولینن جنوبی روس میں جاکر کوسکوں کی ایک بستی میں رہتا ہے اور کچھ دنوں رہ کر چلا آتا ہے۔ بہت سے لوگ اسی طرح صحت یا سیر کی خاطر یا ملازمت کے سلسلے میں کوسک علاقے میں جاکر رہتے ہوں گے، اور دل پر کوئی خاص اثر لیے بغیر چلے آتے ہوں گے۔ لیکن اولینن کا حال ہی کچھ اور ہے۔ اس میں وہ قدرتی تنگ نظری اور خود غرضی نہیں ہے جو انسانی زندگی کو چند خواہشوں کا مجموعہ بنا دیتی ہے اور خواہشوں کے پورے ہونے کے ساتھ ساتھ اطمینان بخشتی ہے۔ وہ یہ سمجھ کر کہ «سب ایسے ہی ہوتے ہیں» اپنے لیے کوئی مسلک نہیں بنا سکتا اور اسے کسی خاص مسلک کے صحیح ہونے کا یقین بھی نہیں ہے۔ قدرت یا قسمت یا اس کی اپنی طبیعت کے کسی چھپے روگ نے ایسا کچھ کردیا ہے کہ اس کی ایک آنکھ تن کی دنیا کو دیکھتی ہے تو ایک من کی دنیا کو تکتی رہتی ہے، اسے دنیا میں کسی طرف اطمینان کی صورت نظر نہیں آتی اور سب سے زیادہ شکایت اسے اپنے آپ سے ہے۔ اس کے مذاق اور اخلاق میں بڑی نفاست پسندی آگئی ہے، جو کہ بذات خود بہت اچھی اور کمیاب صفت ہے، مگر

اسی نے اس کی قوت عمل کو اس طرح مار دیا ہے کہ اسے ان حقیر اغراض اور ادنے ذہنیت رکھنے والے لوگوں پر رشک آتا ہے جو مرنے میں اپنا کام نکالتے رہتے ہیں اور جنھیں اپنے عیبوں کا احساس ہے نہ اس کا اندیشہ کہ دنیا ان پر اعتراض کرے گی - اولینن ہر وقت اپنی طبیعت پر غور کرنے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور اس مشغلے کو بہت اہمیت دیتا ہے، اس لیے اسے بڑا سخت صدمہ ہوتا جب کبھی وہ اچانک محسوس کرتا ہے کہ دنیا کو اس سے مطلب ہے نہ ان مشکلوں سے جو اسے مصروف رکھتی ہیں - ظاہر ہے کہ جس کی طبیعت کا یہ رنگ ہو اسے حسرت کے سوا کیا نصیب ہو سکتا ہے - اولینن کی حسرتوں پر ستم یہ ہے کہ وہ جوان ہے، حسن کا قدردان ہے اور دل میں ہزار امنگیں رکھتا ہے - وہ شہری زندگی اور آدمیوں کی صحبت سے بیزار تھا اور ایسی جگہ پہنچ کر جہاں قدرت انسانی زندگی کو اپنی گود میں پالتی ہے اسے پھر اپنے آپ سے اور دنیا سے بڑی امیدیں ہوگئی تھیں - لیکن قفقاز سے بھی وہ دنیا کی بیدردی کا داغ دل میں لے کر واپس ہوا۔

«کوسک» میں تالستائی نے اولینن کی آڑ میں اپنی سیرت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ شاید اس خاص زمانے کے لیے جب وہ قفقاز میں تھا، صحیح ہے۔ نومبر ۱۸۵۳ع میں روس اور ترکی کی جنگ شروع ہوئی، جس میں انگلستان اور فرانس ترکوں کے ساتھ تھے اور ان کی فوجوں نے کریمیا کے جزیرہ‌نما پر حملہ کیا - یہاں پر ایک لمبی جنگ کا سامان ہونے لگا اور تالستائی پر بھی وطنیت کے جوش نے اتنا اثر کیا کہ اس نے لڑائی میں بھیجے جانے کی درخواست کی اور قفقاز کی فوج سے منتقل ہو کر نومبر ۱۸۵۴ع میں سواستوپول پہنچا، جو جنگ کا مرکز تھا - اس کے ساتھیوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہنس مکھ رفیق اور بہادر سپاہی ثابت ہوا، دنیا کو اس کے اس جنگ میں شریک ہونے سے تین افسانے ملے جو فن کے اعتبار سے بہت اچھے اور مضمون اور خیالات کے لحاظ سے شاید اس وقت تک کے یورپی ادب میں انوکھے تھے - پہلے میں، جو سب سے کمزور ہے، صرف سواستوپول کی فضا اور وجد کی سی ایک کیفیت جو خود تالستائی پر طاری تھی، بیان کی گئی ہے - لیکن تالستائی

کا تخیل وطنیت جیسے جذبے کے فریب میں آنے والا نہ تھا' دوسرے افسانے میں ہم اس کا بالکل اور ہی رنگ دیکھتے ہیں۔ اب اسے نہ کسی طرف بہادری نظر آتی ہے نہ وطن اور بادشاہ پر جان دینے کا شوق' بس خود پسندی ہے اور مجبوری اور خوف' مرنے میں کوئی شان نہیں ہے اور زندگی میں رونق پیدا کرنے والے ارمان نہیں ہیں۔ اس کو لکھنے کے بعد تالستائی خلوص سے کہہ سکتا تھا کہ " میرے افسانے کی ہیروئن جسے میں پورے دل سے چاہتا ہوں' جسے میں اس کے پورے حسن کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں' سچائی ہے' وہ سچائی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی "۔ جنگ کی فضا میں چند مہینے رہنے سے تالستائی کے مذاق سے جذبات پرستی کی طرف وہ تھوڑا سا میلان جو اس کی ابتدائی تصانیف میں ملتا ہے' جاتا رہا اور اس کی نظر کے سامنے سے وہ ہلکا سا کہرا جو اب تک پڑا تھا' اٹھ گیا۔ سواستوپول کے متعلق جو تیسرا افسانہ ہے اس کا موضوع انسان کی طبیعت ہے اور جنگ کی حیثیت بالکل ضمنی ہوگئی ہے۔ یہاں تالستائی نے جذبات کی الٹ پھیر کا جو منظر دکھایا ہے وہ درد کی ایک موثر تصویر اور نفسیاتی مطالع اور تشریح کا ایک کارنامہ ہے۔

تالستائی کریمیا سے واپس ہوا تو اس کا شمار ملک کے ممتاز ادیبوں میں ہونے لگا تھا اور پتروگراد میں وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لیکن ادیبوں کی صحبت میں اسے ایک ہمدم نہ ملا' اور ادیبوں کو بھی عام طور پر اس سے یہ شکایت ہوگئی کہ وہ اپنی ریاست اور اعلے خاندانی جتاتا ہے' نک‌چڑھا ہے اور کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ یہ شکایت بھی اپنی جگہ پر غلط نہ تھی۔ آرٹسٹ عموماً تنقید اور اختلاف‌رائے سے چڑھتے ہیں' اپنے آرٹ کو چاہے وہ خودپسندی سے جتنا بھی پاک کر لیں' ان کے اخلاق پر شہرت اور کامیابی کا کچھ برا اثر ضرور پڑتا ہے۔ تالستائی میں ذات اور خاندان کا خیال ایک ناگوار صورت اختیار کر لیا کرتا تھا اور اگرچہ بعد کو وہ بہت افسوس کرتا مگر غصے میں منہ سے گھمنڈ اور تکبر کی کوئی نہ کوئی بات نکل ہی جاتی تھی۔ آپس کی رنجشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تالستائی نے روسی ادیبوں سے ملنا اور ادبی صحبتوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔

لیکن تالستائی کی شکایتیں ذاتی اور اتفاقی تھیں تو اصولی بھی تھیں ۔ اس کی طبیعت اس زمانے میں بہت بےچین تھی ' وہ گویا جذبات کی ایک موج کے ساتھ بہت اونچا اٹھ کر پھر نیچے گرا تھا ' اور ایک تو یہ اٹھ کر گرنا اور دوسرے شاید منزل سے دور ہونے کا خوف ' کہ وہ بلندی سے دیکھنے پر بھی کسی طرف نظر نہ آئی تھی ' اسے پیچ و تاب میں ڈالے ہوئے تھا ۔ اپنے زمانے کے ادیبوں سے اس کو امید تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح منزل مقصود تک پہنچنے کے شوق میں تڑپ رہے ہوں گے ۔ اور ان کی سرگزشت سے اس کو کچھ سبق ' کچھ سہارا ملے گا ۔ مگر اس نے انھیں ایسے ہر حوصلے سے خالی پایا اور وہ تمام عیب اسے ڈھیروں نظر آئے جو وہ معمولی آدمیوں میں اور خود اپنے اندر بھی دیکھتا تھا ۔ اس زمانے میں اس کی ادبی استعداد بھی کچھ ماند پڑگئی تھی ' اس نے جو کچھ لکھا وہ خاص طور پر پسند نہ کیا گیا جس سے اس کا یہ اندیشہ اور بھی بڑھ گیا کہ وہ غلط رستے پر جارہا ہے اور روحانی سکون اور اخلاقی نشوونما ایسے مقصد نہیں ہیں جو خالی انشاپرداز بننے سے حاصل ہوسکیں ۔ اس کی عقل ایسی نہ تھی کہ جزوی اصلاحوں کو بےجا اہمیت دے ' دل ایسا تھا کہ انقلاب چاہتا تھا ۔ اس نے اپنے زمانے کے لوگوں کو غافل اور گمراہ پایا تو غفلت اور گمراہی کی جڑ تک پہنچنے کی ٹھانی اور پہنچ بھی گیا ۔ اس نے خود جس طرح تعلیم پائی تھی اور ہر سبق کو کڑوی دوا کا گھونٹ سمجھ کر اور منہ بنا بنا کر پیا تھا وہ اسے یاد تھا ۔ رائج طریقوں کے مطابق اس نے پڑھانے کی بھی کوشش کی تھی اور ناکامیاب رہا تھا ۔ اب اس نے یورپ کا سفر کیا وہاں کے تعلیمی ادارے دیکھے ' مگر وہ بھی اسے صحیح رستہ نہ بتاسکے ' اور اس کی اس رائے کی تصدیق ہوگئی جو اس نے روسی سوسائٹی اور اس کے مختلف طبقوں کی زندگی اور حوصلوں کا مشاہدہ کرکے قائم کی تھی کہ ہمارے تعلیمی ادارے وہ ایسے آدمی پیدا نہیں کرتے جن کی نوع انسانی کو ضرورت ہے بلکہ ایسے آدمی جن کی ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی میں قدر ہوتی ہے ' سرکاری ملازم ' تعلیمی اداروں کے ملازم ' ادب کے ملازم ' یا ایسے آدمی جنھیں بیکار ان کے ماحول سے کھینچ کر نکالا گیا ہے ' جن کی جوانی برباد کی گئی ہے اور جنھیں زندگی میں اپنے لیے کوئی جگہ

نہیں ملتی، یعنی چڑچڑے، روگی، ترقی کے پرستار، جب تعلیم اس قدر غلط تھی تو کوئی تعجب نہیں کہ عوام، جو اخلاقی اور جسمانی تندرستی کی حس کو کھو نہیں چکے تھے، اس سے بھاگتے تھے۔

لیکن اس عام تعلیمی گمراہی کا علاج کیا تھا؟ تالستائی کا خیال تھا کہ تعلیم کو آزادی پر منحصر ہونا چاہیے اور اسے کتاب کی پرستش کی بجائے خدا اور انسانیت کی سیوا کرنا اور اپنے طریقوں میں قومی ضرورت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ تالستائی نے اپنے کسانوں کے لیے ایک اسکول کھولا اور اپنے تعلیمی نظریوں پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن معلم کے لیے جو صبر اور استقلال چاہیے وہ اس میں نہ تھا، اور اگرچہ تالستائی نے بات بڑی دور کی سوچی تھی، اس کا اسکول تھوڑے ہی دنوں میں بند ہوگیا۔ اسی زمانے میں اس نے شادی بھی کرلی (۱۸۶۲) اور شادی سے پہلے اس نے «گھر کے سکھ» کے عنوان سے جو ناول لکھا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کی طبیعت پھر ناول نویسی کی طرف مائل ہورہی تھی۔ یہ ناول بڑے شوق سے لکھا گیا، ازدواجی زندگی پر شاید اس سے زیادہ پاکیزہ کوئی تصنیف نہیں اور عشق اور محبت کا پردہ اٹھا کر نباہ اور نباہنے کی خواہش کے پیدا کیے ہوئے سکون کا جو منظر دکھایا گیا ہے اس سے بہتر ازدواجی زندگی کی شرح تفسیر بھی مشکل سے ملے گی۔

اسی سکون کی بدولت تالستائی کو بلند پروازی کا حوصلہ ہوا اور کچھ دنوں پر تولنے کے بعد اس نے «جنگ اور صلح» لکھنا شروع کیا۔ یہ ناول قصے کی حد سے گزر کر قومی زندگی کی ایک تصویر ہوگئی ہے اور تصویر بھی ایسی جو قومی معاشرت اور حالات کے چوکھٹے میں نہیں سماتی بلکہ تاریخ اور بڑی تاریخی تحریکوں کے وسیع پس‌منظر میں ہی ٹھیک دیکھی جا سکتی ہے۔ تالستائی نے توجہ صرف روسی زندگی پر کی ہے، لیکن انسانی طبیعت کی وہ خصوصیتیں بھی واضح کر دی ہیں جو تاریخ کے بہاؤ کو ذرا سا ادھر یا ادھر موڑ کر عام انسانی زندگی کو کچھ نہ کچھ بدل دیتی ہیں اور اس طرح وہ فرق جو قومی معاشرت اور عادتیں انسانوں میں پیدا کرتی ہیں مٹا کر تالستائی نے روسی اور عام یورپی بلکہ انسانی زندگی کے جوڑ ملا دیے ہیں۔

کمال تو یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر کام کرنے کے لیے تالستائی نے اپنا قلم موٹا نہیں کیا، سیرتوں کے ہجوم میں ہر ایک کو اس دیدہ ریزی اور صفائی سے بنایا ہے گویا وہی ناول کی مرکزی سیرت ہے اور خاندانوں اور افراد کی روزمرہ زندگی کے باریک نقشوں سے قومی زندگی کی ایک جیتی جاگتی کتھا مرتب کی ہے۔

« جنگ اور صلح » کا زمانہ انیسویں صدی کے پہلے بیس پچیس سال ہیں۔ شروع میں روسی سوسائٹی اور اخلاق کی پستی اور کھوکھلے پن کا منظر دکھایا گیا ہے، پھر ہم سیاست اور جنگ کے میدان میں پہنچ جاتے ہیں اور آؤسٹرلٹز کی لڑائی کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ایک مختصر سا دور آتا ہے جب وہ جذبات اور حوصلے جو جنگ نے بیدار کیے ہیں روسی زندگی میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ خیال ہوتا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے اور وہ اٹھان جو ہم نے آؤسٹرلٹز کی لڑائی کے زمانے میں دیکھا تھا موج کا اٹھان نہ تھا کہ اپنے بعد دوسری موجوں کے لیے سامان کرتا بلکہ دریا کا کنارہ تھا کہ کٹ کر گرا تھا اور دریا کے خاموش بہاؤ میں چند لمحوں کے ہیجان کے سوا کچھ پیدا نہ کر سکا۔ لیکن روس اور نپولین کے درمیان پھر لڑائی چھڑ جاتی ہے اور اب روس ہی میدان جنگ ہے۔ نپولین سرحد کے قریب روسیوں کو پسپا کرکے روس کے اندر گھستا چلا آتا ہے، ماسکو کے پاس بورودنو کے مقام پر پھر لڑائی ہوتی ہے اور نپولین ماسکو پر قبضہ کر لیتا ہے۔ روسی ماسکو خالی کر دیتے ہیں اور صلح کی درخواست نہیں کرتے۔ اسی سے نپولین کی تدبیر الٹ جاتی ہے اور اس کی فوج واپسی کے وقت سردی اور برف کے طوفانوں اور بھوک کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے۔ روس میں نپولین کی لشکرکشی اور پسپائی قومی حوصلہ‌مندی کے بیج بو جاتی ہے، قومی خطرے کے ہمدردی اور اتحادعمل اور ایثار کا جو جوش پیدا کیا تھا وہ چند حساس دلوں میں خدمت اور قومی ترقی کے لیے جدوجہد کرنے کا ایسا شوق ڈال جاتا ہے کہ ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب خودغرضی، پست‌ہمتی اور سزا کا خوف روسی زندگی کے بہاؤ کو روک کر دریا کو گندے پانی کا تالاب نہ بنا دے‌گا،

بلکہ دریا اپنے لیے نئے رستے نکالے گا اور ادھر ادھر سے چشمے آ کر اس میں گریں گے اور اس کے زور کو بڑھاتے رہیں گے۔

مورخ زندگی کے مد و جزر سے غافل نہیں ہوتے، لیکن شخصی زندگی کی تفصیلات ان کی نظر میں نہیں ہوتیں، وہ بچوں کو جوان، جوانوں کو بوڑھا ہوتے نہیں دیکھتے، ان کے کان حادثوں کے شور سے گونج جاتے ہیں، وہ دلوں کی دھڑکن نہیں سن سکتے۔ ناول‌نویس بھی ان واقعات اور تحریکوں کو اصولاً نظرانداز نہیں کرتے جس کا اثر شخصی زندگی پر پڑے بغیر رہ نہیں سکتا، لیکن ان کے ذہن کو ایسی وسعت کم نصیب ہوتی ہے کہ ایک قوم کی قوم اور زمانے کا زمانہ اس کے اندر سما جائے، ان کے تخیل میں اتنی ہمت کم ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بےشمار انفرادی سیرتوں کے بدلتے رنگوں کو دیکھیں اور ان کی جھلمل جھلمل سے ایک بدلتا ہوا اجتماعی رنگ بھی پیدا کریں۔ تالستائی "جنگ اور صلح" میں مورخ بھی ہے اور ناول‌نویس بھی، تاریخ کے فلسفے پر بحث کرتا ہے اور ایک زمانے کی تحریکوں اور واقعات سے اپنے نظریوں کو ثابت بھی کرتا ہے، دوسری طرف وہ روسی زندگی کو ناول‌نویس کی نظروں سے دیکھتا ہے، ایک نسل کے جو سن کو پہنچ چکی ہے چند مثالی نمونے پیش کرکے وہ نئی پود کو ہنستے کھیلتے دکھاتا ہے، اس نئی پود میں پھر آہستہ آہستہ قدرتی پردوں کو ہٹا کر شعور اور شخصیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، وہ اپنے ماحول اور ابدی اور موروثی مسائل سے دو چار ہوتی ہے، ایک نئی نسل کی پرورش کا ذمہ اپنے اوپر لیتی ہے اور آخر میں ہمیں دکھایا گیا ہے کہ بچے بڑوں کی باتیں سنتے ہیں اور اس طرح ایک نسل کے حوصلے دوسری تک پہنچتے ہیں۔ روسیوں کے علاوہ غیر ملکیوں کی سیرتیں بھی بیان کی جاتی ہیں، مگر سوا نپولین اور دو ایک اور ممتاز لوگوں کے، کہ جن کا ذکر تاریخ کے سلسلے میں آیا ہے اور جن کی سیرتیں پیش کرتے ہوئے تالستائی اپنے آپ کو مورخ تصور کرتا تھا نہ کہ ناول‌نویس، ہمیں کسی سیرت پر شبہہ نہیں ہوتا کہ یہ گھڑی ہوئی ہے اور اس میں اصلیت کا رنگ روپ نہیں۔

« جنگ و صلح » کے آخری حصے میں خاص طور پر تاریخی بحث پوری شیطان کی آنت بن جاتی ہے اور بڑی الجھن پیدا کرتی ہے، اس لیے کہ تالستائی نے اپنے نظریوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک ہی بات بار بار دھرائی ہے۔ مگر یہ تاریخی بحث اصل قصے سے جدا چیز ہے اور جسے تاریخ سے دل‌چسپی نہیں وہ اسے بڑی آسانی سے نظرانداز کر سکتا ہے۔ تورگینف کے اس اعتراض کا جواب البتہ ذرا مشکل سے دیا جا سکتا ہے کہ « جنگ و صلح » میں دراصل ارتقا اور نشو و نما کا کوئی پہلو نہیں، ارادے کی کمزوری اور جذبات کی الٹا پلٹی کی ایک مستقل کیفیت دکھائی گئی ہے۔ روسی نقاد بھی عام طور پر ناول‌نویسوں سے اسی کی شکایت کرتے رہے ہیں کہ وہ انفرادی زندگی کی رنگا رنگی دکھا کر رہ جاتے ہیں، اجتماعی زندگی کو ایک قدم آگے بڑھتے نہیں دکھاتے۔ خود تورگینف پر بھی یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے جو اس نے تالستائی پر کیا۔ لیکن تالستائی اور اس کے ساتھ تمام حقیقت‌نگار مجبور تھے کہ بےچینی اور تڑپ کی کیفیت دکھا کر خاموش ہو جائیں، اس لیے کہ آگے کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔ تالستائی نے یہی بہت کیا کہ روکی معاشرت اور اخلاق اور خالی دلوں کے سناٹے نے فضا میں جو افسردگی پھیلائی تھی اسے بچوں کے کھیل کود اور بھولے جذبات کی انگڑائیوں سے کسی‌قدر زائل کیا اور نئی پود کی محبت دلوں میں اس طرح بٹھادی کہ اس کا پروان چڑھنا ہی ترقی اور کامیابی کی صورت بن گئی۔

« جنگ اور صلح » جیسے کارنامے کے بعد لازمی تھا کہ تالستائی پر بےچینی کا ایک دور گزرے، جیسے شدید محنت کے بعد سستی اور تھکن لازمی ہے۔ تالستائی کو پھر یہ خیال ستانے لگا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے اور اسے جو کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہا ہے۔ اس نے عوام کے لیے ایک کہانی لکھنے پر چار برس صرف کیے، یونانی زبان کو سیکھنا شروع کیا اور یونانی ادب کے گن گانے لگا۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح آزاد نہیں تھا کہ جو دھن سوار ہو اسی میں لگ جائے۔ اب اس کے بیوی بچے تھے۔ اس کی بیوی چاہتی تھی کہ وہ ناول لکھتا رہے، اور زیادہ نام پیدا کرے۔ « جنگ اور صلح » کی تصنیف میں اس نے بڑی مدد کی تھی اور اسے خواہش تھی کہ

اشتراکِ عمل کا یه سلسله جاری رهے - پھر تالستائی کی بےچینی بھی غضب کی هوتی تھی اور جن تبدیلیوں کا وہ ارادہ کرتا وہ بھی ایسی که زندگی کو جڑ سے اکھاڑ دیں - کوئی تعجب نہیں که اس زمانے میں اس کے ارادوں کا بیوی کی خواهشوں سے تصادم هوا اور اسے اندیشه هونے لگا که بیوی اور ازدواجی زندگی اس کے اخلاقی ارتقا میں رکاوٹیں ڈالے گی - بعد کو اس اندیشے نے تالستائی کی خاندانی زندگی کو بالکل ته و بالا کردیا، لیکن اس وقت کی رومانی بےچینی یه ظاهر کرکے که آنے والے انقلاب کا ماده اندر هی اندر پک رها هے پھر کچھ دب گئی اور تالستائی نے « اننا کارنین » اسی سکون کے دوران میں (سنه ۱۸۷۳-۱۸۷٦ع) لکھا -

اس ناول میں زندگی کی وہ وسعت نہیں دکھائی گئی هے جو که « جنگ اور صلح » کی امتیازی خصوصیت هے، اس کا موضوع چند افراد کی زندگیاں هیں، لیکن تالستائی کی نظر وهی هے که جس نے « جنگ اور صلح » کو ناول‌نویسی کا کرشمه بنا دیا اور میدان کے محدود هو جانے سے روشنی جہاں پڑتی هے تیز پڑتی هے - اس ناول میں سیاست اور تاریخ سے بحث نہیں هے، اخلاق سے هے، مگر اس انداز سے که نه تو انجام سے وہ بےتعلقی برتی گئی هے جو رسم نے حقیقت‌نگار کے لیے لازمی بنا رکھی هے اور نه وہ ناصحانه طریقه اختیار کیا گیا هے جو تالستائی کی بعد کی تصانیف میں ملتا هے - کسی کی زندگی بگڑتے دکھائی گئی هے، کسی کی بنتے، کسی کو طبیعت اور عادت نے ایسا سخت کر دیا هے که وہ نه بگڑ سکتا هے نه بن سکتا هے، کسی کی زندگی بس جینے میں هے اور اسے اس کا احساس هی نہیں که بگڑنا کیا هے اور بننا کیا - لیکن صورتیں، سیرتیں، جذبات کے پلٹے، واقعات، تقریبیں، سبھی کے بیان کرنے میں تالستائی نے کمال دکھایا هے اور اس کا اخلاقی حسن کبھی اسے چشم‌پوشی یا حقیقت کو صاف صاف دکھانے سے پرهیز کرنے پر مجبور نہیں کرتا - آخری حصه باقی ناول کے مقابلے میں بےشک ذرا کمزور هے، کیوں‌که اس وقت جب یه لکھا گیا تالستائی پر ایک رومانی کیفیت طاری تھی جس نے اس کی طبیعت کو ناول‌نویسی سے هٹا دیا تھا اور وہ چاهتا تھا که کسی طرح سے یه پاپ کٹے - اس آخری حصے کا تعلق دراصل ناول کے قصے سے

نہیں ہے بلکہ تالستائی کی اپنی زندگی کے ایک نئے دور سے جو کہ اب شروع ہو گیا تھا۔

«آننا کارنین» کی مرکزی سیرتیں دو ہیں، ایک تو خود آننا اور دوسرے لیون۔ لیون تالستائی کی اپنی سیرت کا عکس ہے، تالستائی نے اسے اپنی طرح بدصورت، جھیپو، بےچین، سوسائٹی اور اس کے معیار سے غیر مطمئن اور ایک بہتر اصول زندگی دریافت کرنے کی فکر میں مبتلا دکھایا ہے۔ لیون کی سرگزشت کے بعض موقعے اور واقعات تالستائی کی اپنی زندگی سے لیے گئے ہیں، تالستائی کی طرح وہ بھی ہے تو رئیسوں کے خاندان سے مگر سرکاری ملازمت اور سوسائٹی میں شہرت حاصل کرنے کے حوصلے کو غلط ٹھیرا کر وہ زمینداری اور دیہات سدھار میں لگ جاتا ہے، تالستائی کی طرح وہ بھی تین بہنوں پر ایک ساتھ عاشق ہو جاتا ہے، بڑی بہن ڈَولّی آننا کارنین کے بھائی سے بیاہ دی جاتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ منجھلی بہن ھی اس کے لیے زیادہ موزوں ہوگی اور جب یہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو اسے چھوٹی بہن کِٹّی سے شادی کرنے کی دھن ہو جاتی ہے۔ لیون جب کِٹّی سے پہلی مرتبہ اپنی دلی خواہش بیان کرتا ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس وقت ایک خوبصورت، خوش مذاق رئیس، کاؤنٹ ورونسکی سے رشتے کا امکان بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ ورونسکی خود اگرچہ سیر تفریح اور ناچ وغیرہ کی محفلوں میں کِٹّی سے اپنا خاص تعلق سب پر ظاہر کرتا ہے، لیکن وہ محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی کی پابندیوں کو عاید کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور کِٹّی کو مایوسی ھی نہ ہوتی بلکہ شاید ذلت بھی اٹھانا پڑتی اگر آننا کارنین کے اچانک نمودار ہونے سے خود ورونسکی کی طبیعت پھر نہ جاتی۔

آننا کارنین ایک معزز سرکاری ملازم کی بیوی ہے، خوش اخلاق، ہمدردی رکھنے والی عورت ہے اور خودداری اور بےتکلفی، حیا اور ملنساری کے رنگ اس کی طبیعت میں اس طرح ملے ہیں کہ وہ شائستگی اور بھولے بھالے حسن کا ایک مثالی نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے اپنی قسمت سے یا اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں، پرسکون گھریلو

زندگی اسے دل سے پسند ہے اور اس کے گھر کی رونق ایک بچہ بھی ہے جس سے اسے اتنی محبت ہے جتنی کہ ماں ہی کو ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان کی طبیعت میں بگڑنے کے امکانات اسی طرح موجود رہتے ہیں جیسے کہ تندرست جسم میں بیماریوں کے جراثیم۔ ورونسکی سے ملاقات ہوتی ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں تو آنا کی اخلاقی خوبیاں آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتی ہیں۔ ورونسکی کی محبت کے منہ پر سے پردہ ہٹتا ہے تو شہوت کی بھیانک صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ شہوت کچھ ایسا منتر مارتی ہے کہ آنا کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں رہتا، اس کا ضمیر، اس کا اخلاقی حس بالکل فنا ہو جاتا ہے، اس کے معصوم چہرے پر شہوت کی مہر لگ جاتی ہے اور وہ جدھر جاتی ہے، جہاں بیٹھتی ہے، اسی شہوت کی بو پھیل جاتی ہے۔ اب تو ورونسکی کو جال میں پھنسائے رکھنے کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا اور اس کوشش میں اس کی صورت اور سیرت ان بےحیا عورتوں کی سی ہو جاتی ہے جو مجبوری سے پیٹ پالنے کے لیے نہیں بلکہ طبیعت اور عادت سے مردوں کو پکڑنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ وہ رشک میں جلتی، ورونسکی کے چھوڑ بھاگنے کے خوف میں گھلتی رہتی ہے اور اپنی مستقل بےچینی اور درد کا علاج وہ مورفیہ (جوہرافیون) سے کرتی ہے۔ وحشت اور بےچینی آخر کو ایسی شدید ہو جاتی ہے کہ آنا کو اس کی تاب نہیں رہتی اور جب ورونسکی اسے چھوڑ کر ایک فوجی مہم پر چلا جاتا ہے تو وہ ایک مال‌گاڑی کے نیچے گر کر اپنی جان دے دیتی ہے۔

کسی کی طبیعت اس طرح روگی ہو جائے اور زندگی تباہ ہو تو دوسرے اس کے اثر سے بچے نہیں رہ سکتے۔ لیون، کِٹّی اور کِٹّی کی بڑی بہن ڈولّی، جو آنا کی بھاوج ہے، سب آنا کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے سب سے زیادہ دکھ آنا کے شوہر کارنین اور اس کے لڑکے کو ہوتا ہے، جو ماں کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔ کارنین روکھا پھیکا، رسم اور قاعدے کی پرستش کرنے والا آدمی ہے، اس کی طبیعت میں ذرا بھی لوچ نہیں اور وہ انسانی ہمدردی اور شرافت جو گمراہوں کو بھی محبت کا مستحق سمجھتی

ہے' اس کے قیاس میں نہیں آتی - کارنین پہلے اپنی بیوی کو ایک خاص رسمی اور خشک انداز سے نصیحت کرتا ہے' جب ورونسکی سے اس کا تعلق مشہور ہو جاتا ہے تو وہ آننا کو گھر میں آنے اور بچے کو دیکھنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور اس ضد میں آننا کو طلاق دینے سے انکار کرتا رہتا ہے کہ اگر اسے طلاق مل گئی تو وہ ورونسکی سے نکاح کر لے گی اور اس کی بد اخلاقی جیسی عیاں ہونی چاہیے' نہ رہے گی۔ اس معاملے میں اور ہر دوسرے معاملے میں کارنین کا رویہ منطق اور مروجہ اخلاق کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے' لیکن جب سینہ میں آدمی کا دل نہ ہو تو آدمی کی صورت اور ناصح کی منطق کام نہیں آتی۔ دکھ میں بھی کارنین کوئی ہمدردی حاصل نہیں کر پاتا اور آخر میں جب اس پر ایک طرح کی روحانیت طاری ہوتی ہے تو وہ خاصا مضحک معلوم ہونے لگتا ہے۔

آننا کی زندگی برباد ہوئی تو اس میں قصور کس کا تھا؟ اس معاشرت کا جو اپنے آپ کو ناچ رنگ کی محفلوں سے سنوارتی اور آزاد خیالی کے چرچے سے ذہن اور دماغ کو جلا دیتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے' لیکن آننا ایسی کمسن اور بھولی نہ تھی کہ بھٹک جاتی اور اس کے مقابلے میں کِٹّی کا معاشرتی عیبوں میں پھنس کر یا کسی کے دھوکے میں آ کر ذلیل اور تباہ ہونا کہیں زیادہ آسان تھا۔ زندگی کا کوئی مقصد نہ ہونا ہزار اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہے' مگر عورت کے لیے خود تالستائی کے خیال میں بھی اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا کہ گھر ہو' شوہر ہو اور اولاد ہو' وہ تمام چیزیں جو آننا کو حاصل تھیں اور جنھیں وہ حد درجہ عزیز رکھتی تھی۔ پھر ورونسکی نہ دغاباز تھا نہ بدمعاش' اس نے آننا کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی' اسے کسی دھوکے میں نہیں ڈالا اور اسے آننا سے جو محبت تھی اس سے زیادہ داستانوں میں بیان ہو تو ہو' دنیا میں کم پائی جاتی ہے۔ تالستائی نے لیون کے لیے تو ہدایت اور نجات کا سامان اس طرح کیا کہ ایک کسان کے ذریعے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ آدمی کو اپنے واسطے نہیں' خدا کے واسطے زندہ رہنا چاہیے' آننا کا معمہ حل نہیں کیا۔ ہم چاہیں تو اس کی حقیقت نگاری کو عشق مجازی کی پردہ دری سمجھ سکتے ہیں

اور عبرت کی ایک تصویر، چاھیں تو اسے درد کی ایک سچی کہانی سمجھ سکتے ھیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ھے اور وہ غفلت دور ھو جاتی ھے جو انسانیت کی سب سے مہلک بیماری ھے۔

تالستائی نے جب "آننا کارنین" ختم کیا تو وہ شخصی اخلاق کے معموں کو چھوڑکر ان بنیادی اصولوں کی تلاش میں نکل گیا تھا کہ جن پر اجتماعی زندگی تعمیر کی جاسکے، اور سچ تو یہ ھے کہ یہی اصول ان شخصی معموں کو بھی حل کرسکتے ھیں کہ جن پر الگ الگ غور کیجیے تو درد سر اور بےچینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ھوتا۔ تالستائی حقیقت کی تلاش میں نکلا تو صبر اور استقلال اور ضبط کا وہ سامان جو ایسے لمبے سفر کے لیے درکار ھے اس کے پاس نہ تھا، مگر اس کا شوق ایسا سچا تھا کہ بےسروسامانی کے باوجود وہ بہت دور پہنچ گیا اور اس میں اتنی ھمت پیدا ھوگئی کہ ھزار دشواریاں اور الجھنیں پھر اسے گھسیٹ کر بلندی سے پستی کی طرف نہ لاسکیں۔ اس کو یقین ھوگیا تھا کہ وہ علم جو فرد اور جماعت دونوں کی اخلاقی نشوونما کا ذریعہ نہ بن سکے جہالت سے بھی بدتر ھے، اور وہ آزاد خیالی جو بصیرت دینے کی بجائے تنقید کے نشے میں مست کرکے نظر کو اور بھکادے ایک روگ ھے کہ جسے دور کیے بغیر صحیح اخلاق کا تصور قایم کرنا ناممکن ھوگا۔ "عقیدہ زندگی کی قوت ھے۔ انسان بغیر عقیدے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ زمانے میں انسان کے روحانی شعور نے دینی تصورات مرتب کیے اور عقیدے نے زندگی کی پہیلیاں جس طرح بوجھی ھیں اسی میں نوع انسانی کا سب سے گہرا علم پایا جاتا ھے"۔ اس خیال کی تکمیل ایک اور کیفیت نے کردی۔ "بہار کا دن تھا اور میں اکیلا جنگل میں بیٹھا خاموشی پر کان لگائے تھا۔ میں سوچ رھا تھا کہ دیکھیے پچھلے تین سال سے بےچین ھوں، خدا کی جستجو ھے، خوشی اور بیزاری کی دو حالتوں کے درمیان جھولتا رھتا ھوں.......ایک بارگی مجھے معلوم ھوگیا کہ میں زندہ تبھی ھوتا ھوں جب مجھے خدا پر یقین ھوتا ھے...میرے گرد ھر چیز جاگ اٹھتی ھے، ھر چیز میں معنی اور مقصد نظر آنے لگتے ھیں.......خدا کو جاننا اور زندہ ھونا ایک ھے"۔

جذبۂ دینی کے اس تسلط نے ایک طرف تو تالستائی کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے عقیدے صاف صاف بیان کرے جس کے سبب سے اس کی روسی کلیسا سے لڑائی ہوگئی اور دوسری طرف اسے یورپ کے ادیبوں اور فنون لطیفہ کے قدرشناسوں سے بھڑا دیا ۔ تالستائی انجیل کا مطالعہ، ماحول کا مشاہدہ اور اپنے دل سے جرح کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ حضرت عیسیٰ نے اخوت، عدم تشدد، ایثار اور سلجھی ہوئی، پاکیزہ، محنت مشقت کی زندگی کی تعلیم دی تھی کلیسائی نظام، اس کا ٹھاٹھ، اس کی عبادت اور رسمیں بعد کے تصرفات ہیں جنھوں نے اصل تعلیم کی صورت بگاڑدی ۔ ادھر ان لوگوں کے جواب میں جن کا خیال تھا کہ مذہب اور تہذیب کا ساتھ نہیں ہوسکتا، اور انسان اگر تہذیب کو چھوڑے تو ترقی کے تمام رستے بند ہوجاتے ہیں تالستائی نے کہا کہ مذہب اور عقیدہ اگرچہ اس محدود، علمی عقل کے لیے مہلک ہے جو جزو کو کل اور حیوانی زندگی کو اصل زندگی ٹھیراتی ہے، لیکن وہ اس سچی عقل کی روشنی پھیلاتا ہے جو کائنات کے اندر مضمر ہے اور جس سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے ۔ یہ عقل عمل چاہتی ہے، اس کا عمل عشق ہے، وہ عشق جو انسان کو بےخودی سکھاتا ہے اور اپنی ذات کو جس کی کوئی وقعت نہیں اس لیے کہ انسان کو اس پر اختیار نہیں، قربان کرکے ایک غیرمحدود، دائمی زندگی کی دعوت دیتا ہے ۔

اس وقت سے تالستائی، سرکاری کلیسا اور «روشن خیال» طبقے کے درمیان جو جنگ چھڑی وہ تالستائی کے مرنے دم تک جاری رہی ۔ ہم یہاں پر مذہبی بحث میں حصہ نہیں لے سکتے، اگرچہ یہ موضوع بہت دلچسپ ہے اور ایک زمانے میں تالستائی کے جوش اور اس کے قلم کے زور نے سارے یورپ کو اس میں الجھا دیا تھا ۔ ادب اور فن کے معیار پر جو بحث تالستائی نے چھیڑی وہ بھی کچھ کم دلچسپ اور بصیرت افروز نہیں، لیکن اسے مفصل بیان کرنے کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جائے تو بھی شاید کافی نہ ہوگی ۔ تالستائی اب تک تو ادب اور انسانیت کی خدمت کا مقابلہ کرتا رہا تھا، اور ادب کے خلاف جو کچھ کہا تھا اس کا مقصد ادیبوں کو حقیقت شناسی کی طرف مائل کرنا تھا ۔ ۱۸۸۲ میں اس نے مردم شماری میں حصہ لیا اور ماسکو کے غریب

واڑوں میں اس نے افلاس، درد اور بےحسی کے جو منظر دیکھے انھوں نے اس کے دل کو تڑپا دیا اور یہ ناممکن ہوگیا کہ اس کے بعد وہ ادیب رہ سکے اور اب تک اس کی زندگی کی جو صورت تھی وہ قائم رہے ۔ « ہمیں کیا کرنا چاہیے » کے عنوان سے اس نے جو کتاب لکھی وہ ایسی ہمہ‌گیر ہے اور ایسے گہرے خلوص اور شدید غم اور غصے کا پتہ دیتی ہے کہ جس کی مثال یورپی ادب میں نہیں ملتی اور جو اس کتاب کا رشتہ الہامی کتابوں سے جوڑتا ہے ۔

تالستائی نے پہلے غریب واڑوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور پھر اس کے اسباب پر بحث کرکے نتیجے نکالے ہیں جو صحیح تسلیم کرلیے جائیں اور ہدایت کا ذریعہ بنائے جائیں تو مذہبی، سیاسی اور معاشی نظام، علم، ادب، فن سب ہی کو مٹانا اور مٹاکر نئے سرے سے قائم کرنا لازمی ہوجاتا ہے ۔ لیکن تالستائی کی بحث علمی اور عقلی نہیں ہے، اس نے ریاست کے ظلم، دولت‌مندوں کی خود غرضی اور علم اور تہذیب کے دھوکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اور اس کی تلقین کی ہے کہ ظالموں اور گمراہ کرنے والوں سے قطع تعلق کیا جائے، غریبوں کی محنت سے فائدہ اٹھانا، ریاست کی خدمت کرنا بند کردیا جائے، جسمانی محنت کو ایک اخلاقی فرض مانا جائے اور عدم تشدد کے ذریعے سے ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیا جائے جو سماجی زندگی میں ظلم اور خود غرضی پیدا کرتی ہیں اور قائم رکھتی ہیں ۔ عدم تشدد کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ نے دی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ظلم کا مقابلہ ظلم سے نہیں بلکہ ایثار سے کرنا چاہیے اور دنیا کا سارا دکھ درد اپنے اوپر لے کر اپنی زندگی کو مجسمہ صبر، محبت اور بیخودی بنا دینا چاہیے ۔ یہ تعلیم ایسی ہے کہ اس پر عمل کرنے والا ہو تو یہ نہایت دل افروز اور ہمت افزا بن سکتی ہے، لیکن اگر یہ باتوں اور بحثوں تک محدود رہے اور اس پر عمل کرنے والا بڑے پائے کی شخصیت نہ رکھتا ہو تو اس کا اثر بالکل الٹا ہوتا ہے اور لوگ متاثر ہونے کی بجائے محبت، صبر اور ایثار جیسے قابل قدر جذبات کی ہنسی اڑانے لگتے ہیں ۔ تالستائی کی شخصیت ناہموار تھی، اس کا جوش زائد بھاپ کی طرح زبان اور قلم کے رستے سے نکل جایا کرتا تھا

اور عمل کا وقت آتا تو وہ ایسی پس و پیش میں پڑجاتا کہ جو اس کو شل اور اس کے معتقدوں کو حیران کردیتی تھی ۔ گاندھی جی نے اگرچہ اپنے دل کا دیا تالستائی کی مشعل سے جلایا، مگر اپنی خاص استعداد کے سبب سے وہ عمل میں اپنے استاد سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدے اور عمل ھی میں نہیں بلکہ عقیدے اور معمول میں ایسی مطابقت پیدا کرلی کہ جو تالستائی کو نصیب نہ ہوئی ۔

پھر تالستائی اپنی طبیعت کی افتاد اور اپنے خاص ذوق اور استعداد سے مجبور تھا کہ ایسی بحثیں چھیڑے جو دینی مصلح کے لیے بالکل ضمنی ھیں اور جن سے اسے جہاں تک ھوسکے، بچنا چاھیے ۔ «ھمیں کیا کرنا چاھیے» اور «آرٹ کیا ھے؟» (۱۸۹۸) ان دونوں کتابوں میں تالستائی نے آرٹ کی ماھیت اور آرٹسٹ کے فرایض کو اپنے محبت، ایثار اور اخوت کے عقیدے کی روشنی میں دکھایا ھے اور یہ روشنی بڑی ھی بصیرت افروز ھے ۔ «آرٹ کیا ھے؟» «ھمیں کیا کرنا چاھیے» کے تیرہ برس بعد لکھی گئی، اس میں تنقید زیادہ ھے اور اس میں تالستائی نے یورپی آرٹ کے مثالی نمونوں پر جو اعتراضات کیے ھیں وہ اکثر غلط اور بےجا ھیں ۔ تالستائی کو دراصل یورپی ادب اور آرٹ سے اتنی واقفیت نہ تھی کہ وہ ان پر معقول تنقید کرسکے اور اس بحث سے اس کا اصل مطلب واضح ھونے کی بجائے تفصیلات میں اور چھپ جاتا ھے ۔ لیکن اس تنقیدی حصے کو نظرانداز کرکے تالستائی کی تعلیم کو دیکھیے تو اس میں نور ھی نور ھے ۔ آرٹسٹ اور ادیب ان حقیقتوں اور اعلی مقاصد کے سامنے سر نہ جھکائیں جن کا جلوہ تالستائی کی تعلیم میں نظر آتا ھے تو آپ سمجھیے کہ وہ شیطان ھیں اور ایسے غرور کے مجسمے جو کہ اپنا حق سمجھتا ھے کہ انسانیت کا جوھر اس کی خودنمائی پر نثار کیا جائے ۔

«اپنے آپ کو قربان کرنا اور دکھ سہنا یہ سچے مفکر اور ماھر فن کا حصہ ھوتا ھے، کیوں‌کہ اس کا مقصد انسانیت کی بھلائی ھے ۔ آدمی غم میں مبتلا ھوتے ھیں، مصیبتیں جھیلتے ھیں، مرتے ھیں، فراغت اور لطف اندوزی کی مہلت کسے ملتی ھے ۔ مفکر اور ماھر فن آسمان کی بلندیوں پر بھٹکتا نہیں پھرتا....وہ ھمیشہ حوصلوں کے

ہجوم میں گھرا رہتا ہے، اس کا دل بےچین رہتا ہے ۔ اس کا فرض منصبی یہ طےکرنا اور بتانا ہے کہ انسان کی فلاح کاہے میں ہے، اسے مصیبت سے نجات کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے، وہ ابھی تک کچھ طے نہیں کر پایا ہے، کچھ بتا نہیں سکا ہے اور کل تک شاید بہت دیر ہوجائے اور وہ مرجائے....مفکر اور ماہر فن وہ ہے جو خوش ہوتا اگر اسے سوچنا نہ پڑتا اور دل میں جو بات بیٹھ گئی ہو اسے بیان نہ کرنا پڑتا مگر وہ اپنے آپ کو اس سے روک نہیں سکتا، اس لیے کہ دو پوشیدہ قوتیں اسے اس پر مجبور کرتی ہیں: ایک تو اس کا اپنا شوق اور دوسرے اس کی انسانی ہمدردی ۔ فن کے سچے شیدائی جو سیر اور لطف‌اندوزی کی طرف مایل اور اپنے آپ سے مطمئن ہوں، ڈھونڈھے بھی نہ ملیں گے" ۔ ("ہمیں کیا کرنا چاہیے؟")

مفکر اور ماہر فن کا یہ خاکہ تالستائی نے اس وقت بنایا جب ماسکو کے غریب واڑوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی اور یہ خاکہ آخر وقت تک اس کے ذہن میں محفوظ رہا ۔ یہ نصب‌العین اسے بےحد عزیز بھی تھا اور اسے بڑا صدمہ ہوتا اگر لوگ اس پر تنقید یا اعتراض کرتے ۔ "آرٹ کیا ہے؟" ان اعتراضات کا ایک جوشیلا جواب ہے، اس میں تالستائی نے اپنے زمانے کے آرٹ کے شیدائیوں پر حملہ کیا، ان کے بتوں کو توڑا، ان کے احساسات کو پامال کیا، ان کے عقیدوں کا مذاق اڑایا، ان پر یہ الزام دھرا کہ وہ اپنی ایک الگ ذات بنائے ہیں اور اپنی پست دلچسپیوں اور گرے ہوئے مذاق کو معیار قرار دیے بیٹھے ہیں ۔ عام خیال کے خلاف اس نے یہ دعوٰی کیا کہ آرٹ کسی طرح محدود نہیں اور اس کا دارومدار خاص استعداد پر نہیں ۔ "آرٹ ہرجائی ہے" ۔ "آرٹ ہماری ساری زندگی میں سمایا ہوا ہے ۔ ہم جسے آرٹ کہتے ہیں، یعنی تھیٹر، کونسرٹ، کتابیں اور تصویروں وغیرہ کی نمایشیں، یہ آرٹ کا بہت ہی حقیر حصہ ہے ۔ ہماری زندگی طرح طرح کے فنی الہاموں سے بھری ہوتی ہے، چاہے آپ بچوں کے کھیل کو دیکھیے، چاہے مذہبی رسموں کو ۔ آرٹ اور بولی انسانی ترقی کے ذریعے ہیں، ایک دلوں کو ملاتا ہے، دوسرا خیالات کو ۔ جب ان میں سے کسی میں خرابی پیدا ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی روگ

ہوگئی ہے۔ ہمارے زمانے کا آرٹ غلط اور جھوٹا ہے۔''

آرٹ کا میدان اتنا وسیع ہے تو اس کا صحیح مظہر وہی جذبات ہوسکتے ہیں جو انسان کی سرشت میں ازل سے موجود ہوں اور اس کا صحیح مقصد صرف یہ ہوسکتا ہے کہ سچے اخلاق کو فروغ دے کر وہ معاشرتی اور ذہنی فضا پیدا ہو کہ جس میں انسانیت کے جوہر کھلیں، افراد میں جماعت کی بھلائی کا احساس بڑھے، مختلف جماعتوں اور ملتوں میں ربط اور اتحاد قایم ہو۔ ہر جماعت کا ایک مخصوص تصور حیات ہوتا ہے جس کی بنیاد اس کا دین ہوتا ہے، آرٹ کو چاہیے کہ دین کا خادم ہو اور اس مخصوص تصور حیات کا آئینہ۔ مثلاً عیسائی مذہب کی امتیازی صفت ایثار اور اخوت ہے، اس لیے عیسائیوں کے واسطے وہی آرٹ قابل قدر ہے جو اخوت اور ایثار کے جذبے کو چمکائے اور ان کی تکمیل کی آرزو کو یہاں تک بڑھائے کہ وہ پوری ہوجائے۔ ''آنناکارنین'' کے بعد تالستائی نے جو افسانے اور ناول اور ڈرامے لکھے ان میں آرٹ کا یہ نیا مقصد جو اس کے ذہن پر حاوی ہوگیا تھا اپنا رنگ دکھاتا رہا۔ ''عوام کی کہانیاں''، ''عوام کی داستانیں''، ''اوان ایلئچ کی موت''، ''باطل کی قوت''، ''کرائٹسر سوناٹا''، ''آقا اور غلام'' اور ''نئی زندگی'' موضوع کے اعتبار سے اتنے مختلف اور فنی نقطۂ نظر سے اتنے کامیاب کارنامے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر یقین ہوجاتا ہے کہ اور کوئی نہیں تو تالستائی خود تو اپنے معیار پر پورا اتر سکتا تھا۔

عوام کی کہانیوں میں سے زیادہ تر تالستائی نے کسانوں اور داستان گوؤں کی زبانی سنیں، چند اس خاص طرز میں اس کی اپنی تصنیف کہی جا سکتی ہیں۔ ان سب میں ایسی سادگی اور ہمواری ہے، خالص ادبی خوبیوں سے ایسا تغافل برتا گیا ہے کہ وہ ادب سے ایک برتر چیز بن گئی ہیں اور ان میں نصیحت بھی کی گئی ہے تو اس پیرائے میں اور ایسی ظاہری بےپروائی سے کہ وہی بات جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ادب لطیف میں کھپتی نہیں یہاں زیور کا نگینہ، حُسن کی خاص ادا بن گئی ہے۔ ''آدمی کو کتنی زمین چاہیے'' اور ''تین بوڑھے'' تو ایسے قصے ہیں کہ جنھیں ایک بار

پڑھ لیجیے تو ساری عمر یاد رهیں اور اس وجہ سے یاد رهیں کہ ان میں جو نصیحت کی گئی هیں وہ خود بہ خود دل پر نقش هو جاتی هے ۔ « آقا اور غلام » اسی رنگ میں ڈوبا هوا افسانہ هے ، اگرچہ اس میں ادبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس خیال سے تالستائی نے اپنے ابتدائی زمانے کے ایک افسانے « برف کے طوفان » کا ایک حصہ پس منظر کے طور پر رکھا هے ۔

« اوان ایلئچ کی موت » ایک ایسے آدمی کے انجام کا نقشہ هے جو اپنی زندگی ، معمول ، خیالات کے لحاظ سے ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ هے جو یورپ میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے هیں ۔ اوان ایلئچ ایک ایمان‌داری سے کام کرنے ، عام قاعدے کے مطابق زندگی بسر کرنے والا سرکاری ملازم هے ۔ اس کے دل میں اپنی ترقی کے سوا کوئی حوصلہ نہیں ، اس کے اخلاق اور عادات کی ابتدا اور انتہا یہ هے کہ اپنے جیسوں میں اچھا سمجھا جائے ، وهی مانے جو سب مانتے هوں ، وهی کہے جو سب کہتے هوں ۔ پابندی سے کام کرے ، عام دل‌چسپیوں میں شریک هو ، کبھی ناچ لے ، کبھی تاش کھیل لے ۔ جب تک وہ اپنے معمول پر چل سکا اسے اپنے اندر کوئی خامی ، اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں هوتی ، لیکن جب وہ بیٹھنے کے کمرے میں پردہ لگاتے وقت گر پڑا ، بیماری نے اس کے معمول کو چھڑا دیا اور درد کے دورے اسے دوا اور تسکین کے لیے تڑپانے لگے تو اسے ایک‌بارگی معلوم هوا کہ اس کا کوئی سہارا نہیں ۔ جان پہچان والے اسے بھول گئے ، بیوی یہ تاڑ گئی کہ اب وہ بچنے والا نہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے انتظام کرنے لگی ، بڑی لڑکی شوهر کی فکر میں پڑ گئی ۔ ان سب کی سرد مہری اور خودغرضی نے اوان ایلئچ کو ان سے بیزار کردیا ، لیکن ایک مدت تک اسے نہ تکلیف نے چھوڑا نہ موت نے اپنے دامن میں پناہ دی ، اس کے دل کا کسی عقیدے پر تکیہ نہ تھا ، اس کا جذبۂ دینی ایسا معطل هو گیا تھا کہ اس نے دائمی حیات کی وہ جھلک کبھی نہ دیکھی تھی جو ایک زندگی کے خاتمے کو دوسری کی ابتدا بنا دیتی هے اور اس لیے وہ تڑپتا اور کراهتا رها ۔ موت بے‌شک آئی اور تسلی ساتھ لائی ، مگر اسی وقت جب بے‌عقیدہ ، بےمقصد زندگی کے عبرت‌ناک انجام کی هیبت طرح طرح سے دل میں بٹھائی جا چکی تھی ۔

اخلاقی اور روحانی بےمایگی یا کج‌روی کی پردہ دری کے لیے موت کا آنا ہی ضروری نہیں، عام زندگی میں بہتیرے ایسے موقع اور واقعات پیش آتے ہیں کہ جن سے سبق لیا جاسکتا ہے۔ اوان ایلئچ ساری عمر گزار چکا تھا جب ایک حادثے نے دنیا سے اس کا رشتہ توڑا اور عادت اور رسم کی غلامی اور خدا کی بندگی کے درمیان جو فرق ہے اس پر آہستہ آہستہ ظاہر ہوا۔ «کرائٹسر سوناٹا» میں تالستائی نے خود اس رسم رواج اس تربیت پر حملہ کیا ہے جو بلوغ کے زمانے سے ہی انسان کو غلط رستے پر لگادیتی ہے اور اس معاشرت کی قلعی کھولی ہے جو ایک ناپاک جذبے کو لطف محبت کی خوشبو میں بسا کر اور ازدواجی زندگی کی سنہری ہتکڑیاں پہنا کر اپنا اور قدرت کا کام نکالنا چاہتی ہے۔ کرائٹسرسوناٹا یورپ کے سب سے بڑے ماہر موسیقی بیٹھوون کی ایک تصنیف ہے جسے تالستائی نے ایک زمانے میں سنا تھا اور شاید اسے یہ شہوانی جذبات کے لیے اشتعال انگیز معلوم ہوئی، اگرچہ دوسروں پر اس کا یہ اثر نہیں ہوتا اور ہمیں یہیں پر کہہ‌دینا چاہیے کہ بیٹھوون جیسے پاکیزہ نفس آرٹسٹ کا نام اس طرح سے اس بحث میں الجھا دینا جو تالستائی نے اپنے افسانے میں چھیڑی صریحی زیادتی ہے۔ غالباً تالستائی کا مقصد یہ جتانا تھا کہ یورپی تہذیب کے نیک اور پاک لوگ بھی ان رسموں کی تائید کرنے اور ان کو اپنے نام کا سہارا دینے میں شریک ہیں جنھیں اس نے سچے اخلاق کے لیے مہلک پایا۔ پھر بھی بیٹھوون کا اس سلسلے میں ذکر نہ آنا چاہیے تھا۔

«کرائٹسرسوناٹا» کا قصہ ایک مجرم پوزدنی‌شِف کی زبانی بیان کیا جاتا ہے جو دس برس قید کی سزا بھگت چکا ہے، اس لیے کہ اس نے اپنی بیوی اور اس کے دوست پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ پوزدنی‌شِف قصہ اس وقت سے شروع کرتا ہے جب وہ نوجوان تھا، خوش حال تھا اور بہت سی مائیں چاہتی تھیں کہ اسے اپنا داماد بنائیں۔ ایک خاندان کی عورتیں ذرا زیادہ ہشیار تھیں، انھوں نے گفتگو اور ہنسی مذاق کے ذریعے طرح طرح سے پوزدنی‌شِف کو ایک خاص لڑکی کی طرف متوجہ کیا، اس کے موقع نکالے کہ دونوں کا ساتھ ہو، لڑکی کا لباس ایسا تھا اور طریقہ ایسا کہ جنسی

رغبت پیدا ہو اور آخر میں یہ سازشیں کامیاب ہوئیں، یعنی پوزدنی‌شف نے لڑکی سے نکاح کرلیا ۔ لڑکی والے مطمئن ہوگئے کہ بیٹی ٹھکانے لگ گئی، لڑکی آپ بھی خوش تھی، لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے لیے اس کے شوہر میں شہوانیت کی جو آگ بھڑکائی گئی ہے وہ کسی طرح بجھائے نہ بجھے گی، اس نے شادی سے پہلے لگاوٹ کی تھی تو یہ سمجھ کر کہ قاعدہ یہی ہے، اس کی لگاوٹ انسانی تھی، حیوانی نہ تھی لیکن پوزدنی شف کی طبیعت ایسی نہ تھی کہ اس آنکھ مچولے میں اسے مزہ آئے، اس زمانے میں اس کے احساسات کچھ بھی ہوں، اپنی داستان بیان کرتے وقت تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے شروع سے دیکھا کہ میرے جنسی جذبات کو اُکسایا اور ایک خاص لڑکی کی طرف مائل کیا جارہا ہے، لڑکی کا لباس اور انداز ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی اس میں شریک ہے ۔ شادی ہوجانے پر لڑکی سمجھی کہ مطلب پورا ہوگیا ہے، اب تعلقات کا رنگ بدلنا چاہیے، پوزدنی‌شف کے لیے شادی بیاہ نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ایک رسمی پردہ تھا اور وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے علاوہ ازدواجی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے ۔ پوزدنی‌شف کی بیوی بہت جلد تعلقات کے اس ڈھنگ سے بیزار ہوگئی، اسے اس کی تمنا ہوئی کہ کوئی اسے انسان بھی مانے ۔ موسیقی کا اسے پہلے بھی شوق تھا، اب وہ اس طرف زیادہ توجہ کرنے لگی اور اسی سلسلے میں اس کی ایک وایولن بجانے والے سے دوستی ہوگئی جو اس کی انسانیت کی بھی قدر کرسکتا تھا ۔ دراصل اس کی دوستی جنسی خواہشوں سے بالکل پاک تھی، لیکن پوزدنی‌شف کو اب یقین ہوگیا تھا کہ مرد عورت کا میل جول صرف انھیں خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ہوسکتا ہے، اور ایک شام کو جب وہ گھر آیا اور اپنی بیوی اور اس کے دوست کو کرائٹسر سوناٹا بجاتے دیکھا تو اس نے ان پر حملہ کرکے دونوں کے کاری زخم لگائے اور اس طرح قصے کو ختم کیا ۔

یورپی لباس، گفتگو اور میل جول کے قاعدوں پر تالستائی پہلے بھی اعتراض کر چکا تھا، اس افسانے میں اس نے یورپی معاشرت کے جسم پر لاج رکھ لینے کو ایک

چیتھڑا بھی نہ چھوڑا اور اسے پڑھنے کے بعد آدمی کو کئی دن تک ہر شخص اور ہرچیز برھنہ نظر آتی ھے ۔ تالستائی کے اعتراضوں کو غلط ٹھیرائیے اور پوزونی‌شف کی ذھنیت کو ایک شخصی روگ سمجھیے تو « کرائٹسر سوناٹا » ایک بہت اچھا افسانہ ھے اور وہ دل کو صاف اور محبت کو پاک رکھنے کی خواھش بھی پیدا کر سکتا ھے ۔ لیکن اس پر خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو فوراً محسوس ھوتا ھے کہ تالستائی کی تنقید حد اعتدال سے گزر گئی ھے اور اس نے اپنے اوپر ایسی تعلیم دینے کا ذمہ لے لیا ھے جو انسانی سرشت کو بالکل بدل دے‌گی اور نسل کی بقا کے لیے کوئی ایسی ترکیب بتائے گی کہ جو نفس سے کوئی دور کا رشتہ نہ رکھتی ھو ، یا پھر انسانوں کو اس پر راضی کر لے‌گی کہ وہ پیدائش کا سلسلہ بند کر دیں ۔ چناں‌چہ جب تالستائی پر اعتراضات کی بوچھاڑ بہت پڑی تو اس نے افسانے کا ایک تتمہ بھی شایع کیا جس میں اس نے یہ تسلیم کیا کہ « کرائٹسر سوناٹا » کی اخلاقی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ نسل انسانی کو شہوت سے پاک ھونے کے لیے افزائش نسل کا سلسلہ بند کر دینا چاھیے اور یہ ثابت کرنا چاھا کہ یہ نتیجہ حضرت عیسے کی تعلیم کے مطابق ھے اور نسل انسانی کے لیے بقا کوئی ایسی نعمت نہیں کہ جس کی خاطر اخلاقی گمراھی گوارا کی جائے ۔ لیکن یہ تو منطق کو اس کے گھر تک پہنچانا ھوا ۔ اس سے اخلاق کی کوئی گتھی نہیں سلجھتی اور قانون قدرت اور انسانی فطرت کے یہ تعلیم اس‌قدر خلاف ھے کہ وہ کبھی صحیح مانی نہیں جا سکتی ۔

شہوانی جذبات کی ستم‌شعاری تالستائی کے ایک ڈراما « باطل کی قوت » اور ایک ناول « بازخاست » کا بھی موضوع ھے ۔ « باطل کی قوت » کا قصہ وہ ھے جو تقریباً ہر روز اخباروں میں بیان ھوتا ھے : فلاں کا فلاں کی بیوی سے ناجائز تعلق ھوگیا عورت بڑی بدمعاش تھی ، اس نے اپنے شوھر کو زھر دے‌دیا اور اپنے بچے کو مار ڈالا ۔ تالستائی نے صرف یہ جدت کی ھے کہ مجرم باپ کے کہنے سے پنچوں کے سامنے اپنے جرم قبول دیتا ھے اور سزا گناہ کے دھبوں کو دھو کر دل میں صفائی پیدا کرتی ھے شاید اس خیال سے کہ ڈراما دیہاتیوں کو دکھایا جائے‌گا تالستائی نے دیکھنے والوں

کے تخیل پر قصے کا جوڑ ملانے اور گفتگو یا کیفیت سے ایسے واقعے کا پتہ چلانے کا بار نہیں ڈالا ہے جو اسٹیج پر دکھایا نہیں جا سکتا ۔ اس لیے بچہ بھی اسٹیج پر مارا جاتا ہے ' جو کہ بہت ہی کریہ منظر ہے ۔

" بازخاست " کے آخری حصے میں انجیل کی آیتیں ہر خیال اور ہر کیفیت کی سند کے طور پر شامل کردی گئی ہیں جن کی بدولت وہ ایک عیسائی ناول معلوم ہوتا ہے ' ورنہ اس میں اور تالستائی کے پچھلے ناولوں میں اصول ادب کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور وہ ہر طرح سے ناول‌نویسی کا ایک شاہ‌کار ہے ۔ بےشک اس کا مقصد اخلاقی نصیحت اور اصلاح ہے اور یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مصنف کا ارادہ ہے کہ یہ ثابت کرے کہ شہوت " ایک ڈراؤنا جانور ہے جو انسان کے اندر رہتا ہے اور کبھی اسے چھوڑتا نہیں ' جو اس وقت اور بھی زیادہ ہیبت‌ناک ہو جاتا ہے جب وہ اپنی صورت نہیں دکھاتا ' جب وہ ایک شاعرانہ بھیس میں اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے " ۔ تالستائی اسے کئی میدانوں میں اپنا ناپاک کام کرتے اور طبیعتوں کو روگی اور زندگی کو گندہ کرتے دکھاتا ہے ' مہذب محفلوں کے طور طریق اور بول چال میں ' اس ملازمہ کی سرگزشت میں جو گھر سے بےعصمت ہو کر نکلتی ہے اور بازار میں جا بیٹھتی ہے ' ان لوگوں کے دلوں میں جو اس بےچاری کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں اور تھوکتے ہیں ' جو اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا کر اسے پولیس اور عدالت کے حوالے کرتے ہیں ' مجرموں کی دنیا میں ' انقلابیوں کے گروہوں میں ۔ اس طرح اگرچہ تالستائی کو کہنا بس یہ ہے کہ نفس کے پھندوں سے بچے رہو اور گناہوں سے توبہ کرو ' کہ سچی مسرت اور خدا کی رضامندی اسی میں ہے ' اس نے اپنی بات ذہن نشین کرنے کے لیے ساری دنیا کا کاروبار نظروں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور کبھی اشارے ' کبھی بحث ' کبھی تلقین اور لطیفے سے اپنا مطلب واضح کیا ہے ۔ انقلابیوں کی کارروائیاں اور چال ڈھال ' مجرم اور جیل‌خانے ' یہ تالستائی کے لیے نئے مضمون تھے ' لیکن سوائے انقلاب کے کہ جس سے اس کو للّٰہی عداوت تھی ' اس نے یہ نئے مضمون خوب ہی برتے ہیں ۔

« ھمیں کیا کرنا چاھیے » لکھنے اور مذھبی بحثیں چھیڑنے کے بعد تالستائی کو خالص ادبی تصانیف کے لیے بہت کم مہلت ملتی تھی اور اگر ادبی شوق اس کے رگ و پے میں نہ ھوتا تو شاید « آنناکارنین » کے بعد کوئی ناول یا افسانہ تک لکھنے کی نوبت نہ آتی ۔ آخر میں تو یہ ھوا بھی کہ اس کی اصلاحی کوششوں اور عدم تشدد کی تعلیم نے انگلستان کی پارلیمنٹ اور پیرس کی رنگینی کی طرح تالستائی کی روحانیت کو ایک چیز بنا دیا جس پر تعجب کرنے کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور سوالات اور مباحثوں کی بھرمار ایک طرف اور سیاسی مسایل نے دوسری طرف تالستائی کو ایسا مبتلا اور مصروف رکھا کہ وہ بس انھیں کا ھو رھا ۔ معلوم نہیں اس سے انسانیت گھاٹے میں رھی یا فائدے میں ۔ یورپ کے چند حساس اور برگزیدہ لوگوں پر تو اس کی فنی، اخلاقی اور دینی تعلیم کا بہت گہرا اثر ھوا، مگر عدم تشدد کی تعلیم ایسی تھی کہ جس کو عملاً صحیح ثابت کرنا تالستائی کے بس کی بات نہ تھی اور سچی عیسائی زندگی کا جو معیار اس نے قایم کیا تھا اس کا نباہ خود اس لیے قریب قریب ناممکن تھا ۔ پھر تالستائی ایسا قدامت پسند تھا اور لبرل اور انقلابی تحریک کی اس نے ایسی سختی سے مخالفت کی کہ انھیں جوشیلے اور کارپرداز لوگوں کی طبیعتیں اس سے پھرگئیں جن پر اسے دراصل بھروسا کرنا چاھیے تھا ۔ تالستائی ادب ھی کو اپنا میدان عمل سمجھتا تو شاید یہ عداوت پیدا نہ ھوتی اور اس کی ادبی عظمت اس کی قدامت پسندی اور نصیحت کے شوق پر احترام کا پردہ ڈال دیتی ۔

تالستائی کی زندگی کا سب سے افسوسناک پہلو وہ خاندانی کشمکش ھے جس کی طرف ھم پہلے اشارہ کرچکے ھیں ۔ عقیدے کے مطابق رھن سہن بدلنے کی خواھش جو پہلے تالستائی کی اپنی روحانی کیفیت کا عکس تھا، لیکن ھوتے ھوتے یہ ایک ایسا فرض بن گیا کہ جسے تالستائی انجام نہ دیتا تو دنیا میں اس کی ھنسی اڑائی جاتی ۔ مگر اس کی بیوی اور اولاد پر اس کے خیالات کا آخر تک کوئی خاص اثر نہ ھوا، وہ اپنی پرانی وضع پر قایم رھے اور تالستائی کی بیوی خاص کوشش کرتی رھی کہ وہ بھی پرانی وضع کو نہ چھوڑے ۔ اس وجہ سے اکثر ایسے موقعے پیدا ھوتے رھے جن سے

تالستائی کو صدمہ بھی پہنچتا اور ندامت بھی ہوتی۔ مرنے سے چند روز پہلے تالستائی نے اپنی بیوی کے نام خط لکھ کر رکھ دیا اور چپکے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔ سفر کے دوران ہی میں اسے بخار آیا اور ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے مسافرخانے میں اس کا انتقال ہوا۔ عقیدے پر عمل کرنے کی آزادی کا یہ مظاہرہ جو اس نے گھروالوں کے خلاف کیا ایک لمبی اور عبرت انگیز کشمکش پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن تھی۔

بیرنگی

(دو ابواب میں)

از

ابو ظفر عبدالواحد ، ام ۔ اے (علیگ) لکچرار انگریزی (سابق لکچرار اردو)

سٹی کالج ۔ حیدرآباد دکن

(۱)

« بیرنگی » سے میری مراد ہے « بیسک » (Basic) جس نے انگریزی سے جنم لیا ہے ۔ اصل میں یہ زبان انگریزی سے جدا نہیں اور نہ انگریزی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ بلکہ جیسا کہ اس کے شبدی مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے معنی ہیں « اساسی » یعنی ایسی زبان جس کی اساس یا بنیاد ٹھیٹھ انگریزی پر ہے ۔ البتہ اس اساسی کے پرچاریوں نے کیا یہ ہے کہ معیاری یا ٹھیٹھ انگریزی کے دشوار گزار راستوں، ایچ‌پیچ کی ترکیبوں اور بےٹھاٹھ محاورے بازیوں سے اپنی زبان کو پاک صاف کرکے مبتدیوں اور خصوصاً اجنبیوں کے لیے اس زبان کے سیکھنے میں بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں ۔ بظاہر ہوا یہ ہے کہ انگریزی زبان کی معنوی نزاکتیں اور رنگ‌آمیزیاں تو اساسی میں نہیں ہیں ۔ کہنے کو سیدھی سادی اور معرّا سی زبان ہے، لیکن اس کے گروں اور محدود ذخیرۂ الفاظ کو ذہن میں رکھنے کے بعد انسان اپنا دلی مطلب اچھی طرح سے ادا کرسکتا ہے ۔ اس طرح دیکھنے میں اساسی ہے تو بظاہر ایک بےرنگ سی زبان، لیکن اس کے اصول اتنے تیکھے ہیں کہ اساسی کے اس « بیرنگ » پر آپ آگے چل کر معیاری انگریزی کی پایدار عمارت کھڑی

کرسکتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ «بیسک» کا ترجمہ میں نے «بیرنگی» کیا ہے جس میں انگریزی لفظ کا لغوی اور معنوی مفہوم پورے طور پر ادا ہوتا ہے ۔ «اساس» میں «بیرنگ» کا وہ زور ہے اور نہ وہ سادگی ۔

کسی زبان پر دسترس یا قابو پانے کے لیے یہ بےحد ضروری ہے کہ مختصر اور جامع الفاظ میں مبتدی کے سامنے ایک باضابطہ نقشہ یا بیرنگ پیش کردیا جائے جو اپنی جگہ خود مکتفی اور آیندہ کوششوں کے لیے چراغ ہدایت بنے ۔ یہ خوبی انگریزی بیرنگی میں ہے ۔ چناں‌چہ انگریزی کے ایک مشہور گیانی ادیب اور ناول‌نویس' مسٹر ایچ' جی ولس (H. G. Wells) کا خیال ہے کہ بیرنگی بہت جلد ایک بین قومی اور سنساری زبان بن‌کر رہےگی ۔ انگریزی یوں بھی ایک طرح سے دنیا کے بیشتر حصے پر چھائی ہوئی ہے جہاں نام کو برطانوی سامراج کا راج پاٹ نہیں ۔ خیر' ان بیرنگی بکھیڑوں کے پرچاری شبدوں سے ہمیں واسطہ نہیں ۔ صرف یہ دیکھنا ہے کہ انگریزی زبان کے سیکھنے اور سکھانے میں عام طور پر ہمارے ہاں کتنا وقت اور ذہنی توانائی صرف ہوتی ہے؟ سالہاسال کا تعلیمی تجربہ بتا رہا ہے کہ بڑی محنت اور دردسری کے بعد ایک طالب‌علم انگریزی کا شدبد سا گیان حاصل کرتا ہے اور بعض صورتوں میں تو ساری محنت اکارت جاتی ہے ۔ لہذا سوال اب یہ ہے کہ آیا بیرنگی اس تعلیمی نقص کو دور کرسکتی ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ بیرنگی کے منجھے ہوئے ضابطوں پر قابو پانے کے بعد ایک طالب‌علم اپنا دلی مطلب آسانی کے ساتھ ادا کرسکے؟ میرا جواب' ہاں میں ہے ۔

چناں‌چہ ہماری آنکھوں کے دیکھتے صوبہ برما میں قطعی طور پر ابتدائی اور وسطانی مدارس میں معیاری انگریزی کی بجائے بیرنگی کی تعلیم چالو کردی گئی ہے ۔ بنگال اور بہار میں اس پر سر جوڑکر غور کیا جارہا ہے ۔ صوبہ متحدہ میں اس کی طرف توجہ جاری ہے ۔ حال کی بات ہے کہ الہ‌آباد یونیورسٹی نے صوبے کے مدرسین کی تربیت اور رہنمائی کی خاطر «بیسک ٹریننگ کالج» قایم کیا ہے ۔ صوبہ بمبئی میں بھی اس پر غور ہورہا ہے اور ممکن ہے کہ عملاً اس کی جانب کوئی پیش‌قدمی ہو ۔

پارسال (اپریل سنہ ۳۸ع) بیسک کے اصول سے مدرسین کو روشناس کرنے کی خاطر مسٹر مائرس نے (جو ٹائمز آف انڈیا اور بیرنگی انجمن کے صدر دفتر واقع انگلستان کے نمایندے ہیں) چھے لکچر الفنسٹن کالج (Elphinston College) بمبئی میں دیے تھے، جہاں شرکت کی غرض سے میں اور میرے پانچ ساتھی سٹی کالج سے گئے تھے۔ ہم لوگ ان لکچروں کو سننے کے بعد بےحد متاثر ہوئے اور حیدرآباد پہنچ کر اپنے بس بھر پرچار شروع کیا اور اپنے کلیہ کے صدر (جناب سید محمداعظم صاحب ام اے کینٹب) کی دور نگاہی کی داد دی، اس لیے کہ ہمارا یہ جانا بڑے نامساعد اور خاطر شکن حالات میں ہوا تھا جب‌کہ خود ناظم صاحب تعلیمات کو بیسک کے کارآمد اور مفید مطلب ہونے کے بارے میں بھاری شکوک تھے۔ غرض‌کہ ہم لوگوں کے بمبئی سے لوٹ کر آنے کے بعد بھی یہی صورت حال رہی یہاں تک کہ ہمارے خلوص نیت کا صاحب موصوف کو اس وقت یقین ہوا جب‌کہ خود مسٹر مائرس نے ڈپارٹمنٹ کی دعوت پر حیدرآباد میں (اواخر دسمبر سنہ ۳۸ع) تین چار لکچر دیے جن کا یہاں کے تعلیم پیشہ طبقے پر اچھا اثر ہوا' اور خود ناظم صاحب تعلیمات نے فراخ دلی کے ساتھ میرے ساتھیوں کی راست بیانی پر صاد فرمایا۔ شکر کا مقام ہے کہ سفر بمبئی کے مصارف بھی ہم لوگوں کو ملے۔ سٹی کالج میں اس سال بیرنگی کی تعلیم کا نجی طور پر انتظام کیا گیا تھا اور ہمارے ہاں کی بیرنگی جماعت کے کم‌سن رنگروٹوں کا مظاہرہ بھی مسٹر مائرس کے پہلے لکچر کے خاتمے پر ہوا تھا، جس کے اچھے اثرات سامعین اپنے ساتھ لےگئے۔ مزید خوش‌خبری یہ ہے کہ آیندہ سال سے ریاست کے تمام ابتدائی مدرسوں میں بیرنگی کی تعلیم کا سرکاری طور پر انتظام ہو رہا ہے، جیساکہ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کے بیان (مطبوعہ اخبار «ہندو» مورخہ ۲۱ فروری ۳۹ع) سے ظاہر ہوتا ہے۔

بہرحال میرا اپنا خیال ہے کہ بیرنگی انگریزی اوبرسوبر ملک میں عام ہوکر رہے گی اور ہونی بھی چاہیے خصوصاً جبکہ موجودہ نظام تعلیم کے بےتکے ادبی رجحان کو کم کرنے کے یوں چاروں طرف منصوبے ہورہے ہیں۔ ایسی صورت میں ابتدائی

مدارج میں یہ غیر ادبی اور بیرنگی انگریزی تمام طلبا کے لیے بڑی حد تک کافی اور آیندہ مدارج کے لیے ایک محکم اساس ثابت ہوگی۔ پھر 'عبوری دور' میں (جو وسطانی مدارج کی آخری منزل میں سال ڈیڑھ سال کی مدت پر مشتمل ہوگا) معیاری انگریزی کے ضروری داؤں پیچ سے طلبا کو باخبر کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اس کے بعد فوقانی مدارج میں معیاریت کی رفتار کچھ اور تیز کی جاسکے گی' یہاں تک کہ فوقانی منزل طے کرنے کے بعد' ادبی رجحان رکھنے والے اور اعلی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا ایک محکم اساس اور وافر ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ انگریزی ادب کی سرسبز وادیوں میں قدم رکھنے کے قابل ہوجائیں گے۔

بیرنگی انگریزی کے متعلق میں اپنے تاثرات "حیدرآباد ٹیچر" کے غالباً جولائی نمبر (سنہ ۳۸ء) میں اپنی بیرنگی انگریزی میں بیان کرچکا ہوں۔ سوال ہوگا کہ پھر اس بیرنگی سے فائدہ؟ اس سے دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایسے حضرات کے دل میں جو انگریزی سے شدبدگیان رکھتے ہیں' بیرنگی کے ذریعے حصول انگریزی کا شوق پیدا کروں۔ دوسرے یہ کہ اگر ہوسکے تو بیرنگی انگریزی کے چند اصولوں کو پیش کرکے اردو کے بہی‌خواہوں کے دل میں ایک تڑپ پیدا کروں تاکہ کچھ ان اصولوں کو پیش نظر رکھکر بیرنگی اردو (میرے نزدیک یہی حقیقی ہندستانی ہوگی) کے تانے بانے جوڑنے میں انھیں مدد ملے۔ میں خود اس قسم کا ایک دھندلاسا خاکہ ذہن میں رکھتا ہوں جس کے متعلق اس رسالے کے اوراق میں اپنے خیالات کا بشرط فرصت اظہار کرتا رہوں‌گا۔ ممکن ہے کہ ایسے حضرات جو مجھ سے زیادہ اس کام کے لیے موزوں ہوں' یا مجھ سے زیادہ اس کام کے لیے وقت دے سکتے ہوں' ہندی اردو کی اس بڑھتی ہوئی خلیج اور افراتفری کی کچھ روک تھام کرسکیں۔

ان سطروں کی ترتیب کے وقت کچھ اڑتی اڑتی سی ایک خبر میرے کانوں تک پہنچی ہے کہ بیرنگی اردو کا نقشہ تیار کرنے میں مولوی سجاد مرزا صاحب (صدر کلیۂ تعلیم) اپنے رفقا کے ساتھ سرگرم کار ہیں۔ میں اس کو نیک شگون سمجھتا ہوں اور صاحب موصوف کو مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ خدمت اندیشۂ "من و تو" سے پاک ہے'

اور پاک ہونی چاہیے - میر و میرزا کا زمانہ گیا - اردو کا مسئلہ اب کل ہند کا مسئلہ ہے :-

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　ایک ہی زلف کے اسیر ہوئے

(۲)

' بیرنگی ' سے متعلق اس طویل تمہید کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چند انوکھے ضابطوں کو آپ کے سامنے پیش کروں - انگریزی سے گیان نہ رکھنے والے بھی اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ گوری زبان ہماری سانولی سلونی زبان کی طرح کئی زبانوں کے میل سے بنی ہے - ایک زمانہ وہ تھا کہ لاطینی اور فرانسیسی شبدوں کی بھرمار سے یہ بیچاری اپنے دیس میں رہ کر بھی خاصی بدیسی معلوم ہوتی تھی' ٹھیک اسی طرح جیسا کہ فارسی عربی شبدوں کی بےجا ٹھونس ٹھانس سے ہماری برج کی ناری اپنا موہناپن گنوا کر ہندو بھائیوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی - لیکن انھوں نے بھی تو سنسکرت کی بھرمار سے اس کا چہرہ مہرہ خراب کرنے میں کوئی کمی نہیں کی - کٹر مسلمانوں کی بد مذاقی نے خیر اس کا ناک نقشہ بگاڑا ضرور مگر اس کایا پلٹ کے بعد بھی وہ ایک زندہ زبان نظر آتی ہے - لیکن سنسکرت شبدوں کے موئے منتروں نے تو اس کو ادھ موئی بنا دیا ہے - بہر حال اس دو طرفہ کھینچا تانی نے معاملے کو ایسا بھد اور ناس کردیا ہے کہ اب یہ مسئلہ زبان کی اختلاف کی چوحدی سے نکل کر ایک بھیانک روپ میں آنکھیں دکھا رہا ہے -

اگر اس بےجا ہٹ سے منہ موڑ کر ٹھنڈے دل سے دونوں فرقے ہندی اردو سے یہ زبردستی کے سنسکرت اور عربی فارسی کے شبدوں کو نکال باہر کریں تو ہندی اور اردو کا جھگڑالو مسئلہ آج طے ہوا جاتا ہے ' اس لیے کہ وہ زبان جس نے برج بھاشا سے جنم لیا اور ہندستان کے چاروں کھونٹ جس کا چلن ہے ' اصل میں یہی ہندستان کی عام زبان ہے خواہ وہ دیوناگری روپ میں لکھی جائے یا اردو خط میں - مجھے ان بکھیڑوں سے سروکار نہیں -

میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ سنسکرت اور عربی فارسی کے شبدوں کی بھرمار کے ہوتے بھی یہ زبان نہ تو مردہ ہے اور نہ بدیسی - خاص حالات اور ضرورت کے تحت فطری

اصولوں پر اس کی داغ بیل پڑی اور فطری اصولوں پر اس کا بیرنگ تیار ہوا ۔ پنڈتوں اور مولویوں نے بعد کو اس پر شفقت کا ہاتھ پھیرا ۔ اس افراتفری کی روک تھام اگر ہم کر سکیں تو ایک جاندار اور لچکیلی زبان ہمارے پاس موجود ہے ۔ یاد رہے کہ بناوٹی اور بے ڈھنگے طریقوں سے زبان بنتی نہیں، بگڑتی ہے ۔

البتہ کسی زبان کی مہم کو کامیاب بنانے میں ہمیں اس کے فطری رجحان کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے اور نہ بےجا ہٹ، تنگ نظری اور تعصب سے کام لینا چاہیے ۔ اپنی زبان کو عام فہم بنانے کے لیے ہم بلاشبہ اور جگہ سے بھی کارآمد اصول لے سکتے ہیں، چند ایسے نئے پرانے شبد بھی داخل کر سکتے ہیں جن سے ہماری زبان کا دائرہ وسعت اور گھیر پیدا کر سکے اور یہ سب چیزیں گھل مل کر ہماری زبان کا جز بن جائیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ لاطینی اور فرانسیسی شبد، اینگلو سیکسن شبدوں کے ساتھ « بیسک » کی شبد فہرست میں گھلے ملے نظر آتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ آج کل کی سنسکرت روپ ہندی میں بعض سنسکرت کے شبد ایسے ہیں جو اردو میں گھل مل سکتے ہیں اور بعض تو ایسے بھی ہیں جو اردو میں کبھی چالو تھے لیکن فارسی عربی کے شبدوں کو لے کر مدت ہوئی کہ آپ نے انھیں بے دخل کردیا ہے ۔ کیوں نہ انھیں پھر سے چلن دے کر اردو میں عام کردیا جائے، اس لیے کہ جو شبد کسی زبان کے خمیر میں ہوتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اس زبان میں گھل مل کر بھلے معلوم ہوتے ہیں بلکہ وہ موہنے اور عام پسند بھی ہوتے ہیں ۔ سو بیرنگی اردو کا بیرنگ تیار کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ ہم ایسے اصولوں یا گروں کو نظر کے سامنے رکھیں جن سے ہماری زبان سیدھی، صاف، عام پسند اور پھر یہ کہ وسیع اور گھیردار بنے ۔ اس 'وسیع' یا 'گھیردار' سے میرا دھرا مطلب ہے، وہ یہ کہ ایک طرف ہماری یہ زبان ہندستان کے چاروں اُور اس طرح پھیل جائے کہ ہر ہندستانی (خواہ اس کی مادری زبان کچھ ہی ہو) ایک مشترک زبان میں اپنی کہے اور دوسرے کی سمجھے ۔ دوسرے یہ کہ اس زبان میں ہر خیال، ہر گیان اور ہر فن کے ادا کرنے کی سکت پیدا ہو ۔ یہ گر ہمیں بیرنگی انگریزی سے ملیں گے جن کا ایک مختصر سا خاکہ اب ہم پیش کرنا چاہتے ہیں ۔

رِشیوں اور نبیوں کی طرح ایک گیانی بھی دھنی ہوتا ہے۔ ایسے دھنی کو لوگ سِڑی کہتے ہیں اور بڑی دیر میں اس کے قایل ہوتے ہیں۔ بیرنگی انگریزی کے دھنیوں پر بھی کچھ اسی قسم کی لتھاڑ رہی ہے۔ لیکن ہیملٹ (Hamlet) کے جنون کی طرح ان بیرنگی کے سودائیوں کی دھن میں بھی ایک ضابطہ (Method) بلکہ کئی ایک ضابطے ہیں۔ سو، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ضابطے ہمارے لیے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں ؟

(شبد چُناؤ)

آپ جانتے ہیں کہ انگریزی زبان تقریباً پانچ کروڑ شبدوں کی سرمایہ دار ہے ؟ پانچ کروڑ کی اس لمبی فہرست سے (۸۵۰) شبد "بیرنگی" کی فہرس میں داخل کیے گئے ہیں۔ یہ تو بعد کی بات ہوگی کہ آیا ہم اپنی بیرنگی زبان کے لیے ایسی ہی مختصر اور کارآمد شبد فہرس تیار کر سکتے ہیں؟ ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ فرنگی بیرنگی کی اس فہرس میں لفظوں کا چناؤ کن اصول پر کیا گیا ہے۔ پہلا اصول تو وہی ہے جو ہندستان میں آج کل بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے اور جس کے متعلق اردو اور ہندی کے ہوا خواہوں کے الگ الگ اکھاڑے قایم ہوگئے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا حل تو وہی ہے جس کے بارے میں سچے قوم پرست جی جان سے کوشاں ہیں اور جس کے متعلق میں نے بھی اس مضمون کے پچھلے حصے میں اشارہ کیا ہے۔ وہ یہی کہ ہم اس ہونے والی عام زبان کو اس کے فطری رجحان کے مطابق لے چلیں۔ نہ عربی فارسی کی ٹھونس ٹھانس مچے اور نہ سنسکرت کے موئے منتروں کی۔ اردو کی حد تک ایسے سنسکرت شبد جو پہلے چالو تھے انھیں پھر سے چلن دیا جائے۔ بلکہ ایک جائز حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض نئے سنسکرت یا ہندی شبد جو بلاتکلف ہماری زبان میں گھل مل جائیں، انھیں شبد فہرس میں داخل کر لیا جائے۔ یہ الفاظ بلاشبہ عربی فارسی کے شبدوں کے مقابلے میں ہماری زبان میں پیوست ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ اردو ایک آرین زبان ہے اور آرین زبانوں کی ایک امتیازی خصوصیت ہے دو لفظوں کا جوڑ بند جس کے لیے فارسی میں

بسا اوقات اضافت اور عربی « ال » ضروری ہوتا ہے ۔ اس طرح دیسی لفظوں کے لینے سے ہمیں لچک‌دار اور ڈھلے ہوئے مرکب لفظ ملیں گے ۔ اس کے علاوہ فارسی اور خصوصاً عربی اسما کی جمع بنانے کے گورکھ دھندے سے نجات ملے گی ۔ مثال کے طور پر چند الفاظ لیجیے ۔ اس مضمون میں جا بجا میں نے « شبد » اور « گیان » کا لفظ برتا ہے ۔ ان دونوں لفظوں کے مترادف عربی لفظوں (علم اور لفظ) ہی کو لیجیے ۔ بہتیری صورتوں میں ان کی جمع (الفاظ اور علوم) کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ لہذا ان بدیسی لفظوں کی جگہ خالص دیسی لفظوں کو استعمال کرنے میں ہمیں عربی فارسی کے پیچ در پیچ قاعدوں اور اضافتوں سے ایک طرف چھٹکارا ملے گا اور پھر بہتیرے مرکب الفاظ بنانے میں بھی سہولت ہوگی ۔ پھر یہ کہ معنوی اعتبار سے « شبد » اور « گیان » میں کون سی ایسی کمی ہے جس کی بنا پر آپ ان لفظوں پر عربی لفظوں کو ترجیح دینا پسند کریں گے ؟ ذرہ کی ذرہ غور فرمائیے تو صاف پتہ چلے گا کہ جہاں علم ، عالم اور علوم کا انچھر چلانا آپ پسند کریں گے ، گیان اور گیانی کے لفظ نہایت صفائی اور سادگی کے ساتھ وہی معنوی مفہوم ادا کر دیتے ہیں ۔ بہرحال یہاں اس مثال سے میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ کچھ ان اصولوں پر ہمیں لفظوں کا چناؤ کرنا چاہیے نہ یہ کہ ان عربی لفظوں کو ترت نکال کر گیان اور شبد کو جما دیجیے ۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے بہتر لفظ پیش کیے جا سکیں ۔

بیسک کی شبد فہرس پر غور کرنے سے یہی پتہ لگتا ہے کہ بیسک والوں نے بھی یہی اصول پیش نظر رکھا تھا جس کی میں حمایت کر رہا ہوں ۔ پس ہمیں سب سے پہلے ایک قطعی اصول یہ بنالینا ہوگا کہ لفظوں کے چناؤ کے معاملے میں عربی کے مقابلے میں فارسی اور فارسی کے مقابلے میں دیسی لفظوں کو ہم بلا رو رعایت ترجیح دیں بشرطیکہ یہ چنے ہوئے لفظ اپنے اندر جامعیت یا معنوی گھیر رکھتے ہوں اور کئی طور پر کئی حیثیتوں ، شکلوں اور ترکیبوں سے ہم انھیں برت سکیں ۔ جہاں فارسی یا دیسی لفظ میں یہ خوبی اور کارکردگی نہ ہو ، وہاں بلا شبہ عربی لفظ کو شبد فہرس میں جگہ دینی چاہیے ۔ لیکن عربی لفظوں کو بھی دیسی بنانے کی کوشش کی جائے ۔

مثلاً یه کہ ان کی عربی طور پر جمع بنانے سے پرہیز کیا جائے ، یا یہ کہ ھندی لفظ کے ساتھ جوڑ میں لاتے وقت عربی لفظ کا کوئی حرف چھانٹ دیا جائے ۔ مثلاً « شبد فہرس » ۔

لفظوں کے چناؤ کے معاملے میں ان کی کارکردگی ، جامعیت اور سیدھے سادے جوڑ توڑ کی صلاحیت کے علاوہ ایک اور اہم اصول پر ہمیں نظر رکھنی چاہیے ۔ ظاہر ھے کہ ایک ھی معنی کے بعض اوقات کئی ایک لفظ ملیں گے اور ان میں سے بعض لفظ اپنے ہم معنی لفظوں کے مقابلے میں زیادہ چالو اور زبان زد خاص و عام ہوں گے لیکن ان کا افادی پہلو محدود ھوگا ۔ ان حالات میں زبان پر زیادہ چالو رہنے والے یا زیادہ برتاؤ میں آنے والے شبد کی جگہ ہم ایک ایسے شبد کو اپنی فہرس میں جگہ دیں جو 'کم چالو' تو ھے مگر اس کا افادی پہلو زیادہ پھیلاؤ رکھتا ھے اور جو ہمیں اپنے ہم معنی لفظوں کے برتاؤ سے بےنیاز کرسکتا ھے ۔ مثلاً ٹہنی ، ڈالی ، شاخ شعبہ ، کم و بیش ایک ھی معنی کے لفظ ھیں ۔ لیکن ڈالی کا لفظ اتنی معنوی لچک نہیں رکھتا جتنا کہ 'شاخ' کا لفظ ۔ ڈالی اور ٹہنی درخت ھی کی شاخ ھوگی ۔ لیکن شاخ کئی طرح سے شاخ ھوسکتی ھے اور ان تمام معنوں میں یہ لفظ کارآمد ھوگا جن کے لیے بلاوجہ صیغہ ، حلقہ ، شعبہ ، جیسے شبد برتے جاتے ھیں ۔ ایک اور مثال : نقشہ ، خاکہ ، بیرنگ ، تینوں ہم‌معنی شبد ھیں ۔ لیکن میرے خیال میں اپنے دونوں ہم معنی ساتھیوں کے مقابلے میں 'بیرنگ' زیادہ جامع اور کارآمد لفظ ھے ۔ مثلاً یہ لفظ ان تمام مفہوموں کو ادا کرنے کے علاوہ جن کے لیے نقشے اور خاکے کے الفاظ برتے جاتے ھیں ، ایک اور خاص معنی میں بھی برتا جاسکتا ھے جس کو انگریزی کی اصطلاح میں پلاٹ (Plot) کہتے ھیں ۔ مثلاً ڈرامے کا بیرنگ ، ناول کا بیرنگ ، وغیرہ ۔ یا لفظ گیان ، علم اور واقفیت ھی کو لیجیے ۔ کیا گیان کا لفظ ان تمام موقعوں کے لیے کافی نہ ھوگا جہاں 'علم' اور 'واقفیت' جیسے بھاری بھرکم الفاظ برتے جاتے ھیں ۔ یا ان الفاظ کو لیجیے : روزی ، روزگار ، آمدنی ، رویہ ، معاش ۔ کیا تنہا « معاش » کا لفظ ان تمام موقعوں پر کارآمد نہیں ھوسکتا جہاں روزی ، روزگار ، رویہ ، آمدنی ، کی غیر ضروری

پلٹن سے کام لیا جاتا ہے؟۔ اس لفظی اسراف کو چھوڑ کر صرف «معاش» پر کیوں نہ اکتفا کی جائے؟ اور پھر اس پر غور فرمائیے کہ مختلف جوڑ بند، کیل کانٹوں اور آنکڑوں کے ساتھ جتنا یہ لفظ کارآمد ہوسکتا ہے، دوسرے مندرجۂ بالا الفاظ نہیں ہوسکتے۔ غور فرمائیے: «نیک معاش» (نیک رویہ)، «بدمعاش» (بد رویہ)، جز معاش (جس کی آمدنی کم ہو)۔ اور پھر، معاش گیان (علم المعیشت = معاشیات) معاش گیانی (ماہر معاشیات = معاشیین)۔ یہ چند مثالیں میرے نزدیک توضیح مطلب کے لیے کافی ہیں۔ بہر حال کچھ اس قسم کا عمل درآمد ہمیں بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو بیسک والوں نے نظر کے سامنے رکھا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس میں کامیابی نہ ہو۔ مگر ہاں، یہ کام نہ تو ایک آدمی کے بس کا ہے اور نہ برس چھ مہینے میں ختم ہونے کا، جیسا کہ بعض زعما اس خیال میں مگن ہیں کہ بیسک انگریزی کی شبد فہرس کو لےکر اس کا ترجمہ ٹھونس دیں گے۔ اتنا آسان کام ہوتا تو پھر کیا بات تھی۔ نہیں، اس کے لیے بےحد غور اور خود اپنی زبان کے داؤں پیچ سے باخبر ہونے اور اس میدان میں کافی تجربہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ بقول مولانا عبدالحق جس طرح ہٹ اور ضد سے «راشٹر بھاشا» بنانے کی کوشش میں ایک اچھی خاصی «راکشش بھاشا» تیار ہو رہی ہے، ڈر ہے کہ علم دوست حضرات کہیں اپنی بیرنگی بھاشا تیار کر کے ہندستان میں ایک نئی «بھوت بھاشا» کا اضافہ نہ کردیں۔

(اعمال، اوصاف، ضمائر اور اطراف)

شبد چناؤ کی سرخی تلے ابھی جن چیزوں کا ذکر ہوا، اصل میں «اشیا» سے متعلق تھیں۔ اسی پر بیسک والوں نے زور دیا ہے اور دراصل کسی زبان کا ایک جاندار اور نازک مسئلہ «اسما» ہی کا ہے۔ اگر ہمارے پاس ان الفاظ کا جو اشیا پر دلالت کرتے ہیں، کافی ذخیرہ ہو تو پھر اور الفاظ (مثلاً افعال اور حروف) کے بغیر بھی اشاروں اور اعضا و جوارح کی جنبش یا حرکت سے ہم اپنا دلی مطلب ادا کرسکتے ہیں۔ مثلاً میز پر نارنگی دھری ہے۔ کسی شخص کو نارنگی کی طرف محض اشارہ کرکے بھی ہم اپنا مطلب اس پر واضح کرسکتے ہیں اور صرف «نارنگی!» کی

معنی خیز آواز سے وہ تمام مفہوم ادا کیا جاسکتا ھے جس کے لیے افعال اور حروف کا اثالہ لایا جاتا ھے ۔

یہی وجہ ھے کہ بیرنگی انگریزی کی شبد فہرس میں (۶۰۰) شبد، اسم ھیں جن کو بجا طور پر «اشیا کے نام» یا صرف «نام» کہا گیا ھے اور اس طرح گریمر کے اصطلاحی ناموں (اسما Nouns) سے رو گردانی برتی گئی ھے ۔ سچ پوچھیے تو لسانی قواعد پر بےجا زور نے ھر زبان میں مبتدی کے لیے ایک دقت پیدا کردی ھے ۔ لہذا «اسما» کہنے کی بجائے صرف «نام» کہنے سے اشیا کا معروضی اور خارجی پہلو (Objective side) اور بھی دل نشیں ھوگیا ھے ۔ بہر حال ان (۶۰۰) ناموں میں (۲۰۰) «چتر کار» یا صورت پذیر الفاظ ھیں جو تصویری شکل میں بہ آسانی منتقل ھوسکتے ھیں اور اس طرح اصول تعلیم کے سیدھے ضابطے (Direct Method) کی رو سے کمسن بچوں کے تخیل کو اشیا کی جانب براہ راست منتقل کیا جاسکتا ھے ۔ پھر ان دو سو (۲۰۰) «چتر کاروں» (صورت پذیر شبدوں) کی مدد سے آھستہ آھستہ مزید (۴۰۰) ناموں سے کمسن طلبا کو مانوس کیا جاسکتا ھے ۔

۸۵۰ شبدوں کے اس مکمل 'بیرنگ' (Chart) میں تعداد کے لحاظ سے دوسرا نمبر «اوصاف» (Adjectives) کا ھے جن کی کل تعداد (۱۵۰) ھے ۔ اس طرح شبدوں کی مجموعی تعداد یہاں تک (۷۵۰) ھوئی ۔ ظاھر ھے کہ ان شبدوں کے آنکنے اور چننے چنانے میں کیسی کھکھیڑ اٹھانی پڑی ھوگی ۔

لیکن میری رائے میں اس سے بھی نازک اور اھم مسئلہ «اعمال» کا ھے جن کی مجموعی تعداد (امدادی افعال کو ملاکر) صرف (۱۸) ھے ۔ یہیں پر بے جھجک ماننا پڑتا ھے کہ یہ انگریزی زبان کا اعجاز ھے، اس لیے کہ صرف اٹھارہ 'اعمال' (افعال Verbs) میں متعلقات فعل، ضمائر اور خصوصاً حروف (Prepositions) کے (۳۸) شبد ملانے کے بعد یہ کیسے ممکن ھے کہ وہ سب کچھ کہہ لیا جائے جس کے لیے ھر زبان میں سیکڑوں افعال کا برتنا اظہار مدعا کے لیے ناگزیر سا ھوگیا ھے ؟

آئیے اس پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالیں ۔ بیسک والوں کا کہنا یہ ھے کہ

عام طور پر وہ شبد جنھیں 'افعال' کہتے ھیں اصل میں حقیقی اعمال نہیں بلکہ مصنوعی اور مرکب اعمال ھیں۔ حقیقی اعمال در اصل وھی اعمال ھیں جو ھمارے جسمانی اعضا کی حرکت سے سرزد ھوتے ھیں۔ انھیں اعمال کو بیرنگی انگریزی کی شبد فہرس میں جگہ دی گئی ھے، گو اس میں شک نہیں کہ ان اعمال کے ساتھ کچھ غیرحقیقی اعمال کو بھی ادائے مطلب میں سہولت کی غرض سے 'اعمال فہرس' میں سمو لیا گیا ھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ھے:

تفصیل اعمال

حقیقی اعمال

Come (آنا، آؤ، آتا ھے)، Go (جانا، جاؤ، جاتا ھے)، Do (کرنا، کرو، کرتا ھے)
Be (ھونا، ھو، ھوتا ھے)، See (دیکھنا، دیکھو، دیکھتا ھے)، Say (کہنا، کہو، کہتا ھے)
Give (دینا، دو، دیتا ھے)، Take (لینا، لو، لیتا ھے)، Get (پانا، پاؤ، پاتا ھے)
Make (بنانا، بناؤ، بناتا ھے)، Keep (رکھنا، رکھو، رکھتا ھے)، Put (دھرنا، دھرو، دھرتا ھے)

امدادی اور غیر حقیقی اعمال

(ا) Have (ماضی قریب کی علامت اور حال تملیکی)،
May (سکو، سکتا ھے)، Will (گا، گے، گی۔ علامت مستقبل)
(ب) Send (بھیجنا، بھیجو، بھیجتا ھے)،
Seem (معلوم ھونا، ھو، ھوتا ھے)، Let (دو۔ بطور فعل امدادی جیسے آنے دو)

* * * *

حقیقی، غیر حقیقی اور امدادی اعمال کی دی ھوئی اس فہرس پر ایک اچٹتی نظر ڈالنے سے بھی چند باتیں خاص طور پر نظر آئیں گی جو دنیا کی دوسری زبانوں (جن میں ھماری زبان بھی شامل ھے) میں پائی نہیں جاتیں۔ وہ یہ کہ انگریزی افعال کی شکلیں حال، امری اور مصدری حالتوں میں ایک سی ھوتی ھیں۔ اس کے علاوہ افعال کی بعض اھم شکلوں اور زبانوں (ماضی، ماضی معطوف) کے امتیازی اظہار میں 'd' یا 'ed' کے آنکڑے فعل حال کے آخر میں لگا دینے سے بیشتر صورتوں میں کام بن جاتا ھے۔ اسی طرح 'er' اور 'ing' کے سیدھے سادھے آنکڑے لگا کر

سیکڑوں مشتقات اور بےشمار حاصل‌مصدر اور «صفت نما افعال» (Participles) بنا لینا حد درجہ آسان ھے ۔

ھماری زبان میں ایسے مختصر اور سادے آنکڑے موجود نہیں ۔ مثال کے طور پر 'ing' کو لیجیے جس سے حاصل‌مصدر (Verbal nouns) اور حالیہ (Present Participles) بنتے ھیں ۔ اردو میں حاصل‌مصدر بنانے کا کوئی ایک قاعدہ نہیں ۔ یا 'er' کو لیجیے جسے اسما کے آخر میں لگا دینے سے ان (۶۰۰) ناموں کے علاوہ (جو بیرنگی انگریزی کی شبد فہرس میں داخل کیے گئے ھیں) سیکڑوں شبد اور ملتے ھیں جو آسانی سے اسم‌فاعل بن جاتے ھیں ۔ ھمارے ھاں اسم‌فاعل بنانے کا بھی کوئی ایک قاعدہ نہیں ۔ ایک «والا» کا شبد ھے جو ھر موقع پر کام نہیں آسکتا ۔ پھر ان سب خوبیوں سے بڑھ کر ایک خوبی انگریزی میں یہ ھے کہ حقیقی «اعمال» کے آخر میں مختلف «سمت کاروں» (حروف جار «Directives») کے آنکڑے لگاکر بےشمار اعمال بنائے جا سکتے ھیں جو اپنے اندر وہ سب معنوی زور اور لطافت رکھتے ھیں جن کے لیے عام طور پر مرکب اعمال («افعال Verbs») کی ضرورت لاحق ھوا کرتی ھے ۔

غرض کہ اس خوبی کی وجہ سے (جو انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں دکھائی نہیں دیتی) بیرنگی اعمال کی شبد فہرس اتنی مختصر اور جامع ھوگئی ھے ۔ پھر er اور ing کے آنکڑے لگا کر مزید سیکڑوں الفاظ کے بہ آسانی مہیا ھوجانے کی وجہ سے وہ لچک اس زبان میں پیدا ھوگئی ھے کہ اردو تو اردو، دنیا کی کوئی زبان اس معاملے میں انگریزی کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ اس بنا پر نہایت قطعیت کے ساتھ میں دعوی کر سکتا ھوں کہ اردو ھی کیا، دنیا کی نامور سے نامور زبان بھی (جو اور لحاظ سے کتنی ھی جامع اور وسیع کیوں نہ ھو) ایسی مختصر شبد فہرس نہیں پیش کرسکتی جو بیرنگی انگریزی نے پیش کی ھے ۔ البتہ ھم اس کے چند اھم اصولوں کو نظر کے سامنے رکھ کر اعمال اور آنکڑوں کی تعداد کو تابمقدور گھٹائیں لیکن (۸۵۰) شبدوں اور شبد آنکڑوں اور منتروں میں سب کچھ کر لینا قطعی ناممکن ھے ۔

اس تمام بحث کا نچوڑ

سوال ہوگا کہ پھر اس انگریزی بیرنگی کے ضابطوں کا ماحصل ؟ اس کا جواب صاف ہے - یہ تو ممکن نہیں کہ ۸۵۰ کی کوئی شبد فہرس بیرنگی اردو کی تیار ہو سکے - جو لوگ اس امید پر انگریزی شبد بیرنگ (Basic Chart) کو شمع ہدایت بناکر ترجمے میں مصروف ہیں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا ہوگا - ضرورت اس کی ہے کہ بیرنگی انگریزی کے تین اہم ضابطوں (۱- شبد چناؤ ۲- اختصار اعمال اور ۳- چند اہم آنکڑوں) کو لے کر اپنی زبان کے مخصوص ماحول اور فطری رجحانات کے مطابق انہیں ڈھالا جائے - البتہ چناؤ کے معاملے میں دیسی شبدوں پر خاص طور سے زور دیا جائے - لیکن لفظوں کی کارکردگی کا جہاں سوال ہو' وہاں دیسی اور بدیسی کے امتیاز کو قطعی جگہ نہ دی جائے- اصطلاحی یا گریمر کی زبان میں جنھیں « افعال » کہتے ہیں' ان کی تعداد بس بھر اقل رکھی جائے - زیادہ زور حقیقی « اعمال » پر دیا جائے اور فرنگی بیرنگیوں کی طرح' جہاں تک ممکن ہو فعل کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے « اعمال » کے ساتھ اطراف یا « سمت کاروں » Preposition or "Directives" کے جوڑ لگائے جائیں اور مرکب اعمال («افعال» Verbs) سے بچنے کی کوشش کی جائے -

بیرنگی انگریزی کے چند ضابطے اور ان کے افادی پہلو پیش کیے جاچکے - ان اصولوں سے احتیاط اور صبر کے ساتھ کام لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مفید مطلب نتیجہ نہ نکلے - مگر ہاں' یہ ایک آدمی کے بس کا کام نہیں - اس کے لیے کئی ایک کارداں افراد کی ضرورت ہے جو سالہاسال اور لگاتار محنت کے لیے خوشی سے آمادہ ہوں- مطلب یہ کہ یہ کام ناممکن بھی نہیں - میرے نزدیک اردو اور اس جگر گوشۂ اردو (بیرنگی) کا مستقبل شاندار ہے - یہ زبان ہند ماتا کے گنوان سپوتوں کی جگر کاویوں کا ثمرہ ہے - یہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی زبان ہے' خواہ چند روزہ سیاسی اغراض کے تحت یہ دونوں فرقے دست و گریباں ہی کیوں نہ ہوں - یہ لیل و نہار سدا رہنے والے نہیں -

بہرحال بیرنگی اردو هی هندستانی هے - رهی وه زبان جسے مولوی عبدالحق صاحب نے "واکشش بهاشا" کا خطاب دیا هے، وه ایک بناوٹی اور ادهموئی زبان هے - اردو کی چندی کرنے کے بعد بهی "بیرنگی" یا عملی هندستانی کے روپ میں وه اپنی زندگی کا ثبوت دے گی - لیکن هندی کی چندی کرنے کے بعد صرف موئے منتر ره جائیں گے یا محض وه زبان گانے بجانے اور ٹهمری دادرے کی زبان هے -

نہیں، ماضی مرچکا - حال زنده هے - زنده چیزوں کی قدر کرکے زندگی اور زنده دلی کا ثبوت دو - مہابهارت اور خلافت راشده کا زمانه هندستان میں ختم هوچکا - نئے حالات میں پرانی باگ ڈوریں کام نه دیں گی - جس طرح بیرنگی انگریزی ٹهیٹه انگریزی کی حریف نہیں، رفیق هے - اسی طرح ایک بیرنگی زبان هی هندستان کی "راشٹر بهاشا" بننے کی حق‌دار هے اور بن کر رهے گی - سیاست اور پرچار کی زبان میں اسے چاهے کچه بهی کہه لیں، چاهے دیوناگری میں لکهیں یا اردو خط میں، یہی هندستان کے ۳۰ کروڑ باشندوں کی مشترک زبان هے -

بہرحال بےجا خوف اور جلدبازی سے کام نہیں چلنے کا - ضرورت اس کی هے که منظم هوکر اس زبان کو جو دهرم اور سیاست کے هاتهوں ناس هو رهی هے، کچه سوچ سمجه کر اور نیک دلی کے ساته سنبهالا جائے - اس میں بلا کی لچک اور جان هے - دیکهیے تو کہاں سے کہاں پہنچتی هے - تجدید، تنظیم اور ایکا هر رنگ میں شرط هے - ان حربوں سے هندستان تو کیا ساری دنیا رام هوسکتی هے - میرے نزدیک رام راج وهی هے جس میں بیرنگی کا راج هو - یه هوگیا تو هندستان پاکستان هے اور پاکستان هندستان -

---

ادبی معلومات

مرتبۂ « ناخدا »

صفحہ

کارل چیپک (KARL CAPEK)

گزشتہ دسمبر کو چیکوسلوویکیا کے ادیب کارل چیپک کا انتقال ہوگیا ۔ اس وقت اس کی عمر ۴۸ سال تھی ۔

چیپک تقریباً تیس ادبی کتابوں کا مصنف تھا اور اس کا شمار زمانۂ موجودہ کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا تھا ۔

ان میں سے چند کتابیں سیاحت اور سوانح‌عمری کے زمرے میں آتی ہیں ۔ چیپک بڑا سیلانی تھا اور وہ ایک نظر میں پردیسوں کی روح کو اس طریقے سے بھانپ جاتا تھا کہ ناظروں کو بڑی حیرت ہوتی تھی ۔ انگریزوں کی زندگی پر اس نے جو تحریریں لکھی ہیں وہ انگلستان میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کسی غیر ملکی کو انگریزی تمدن کے سمجھنے میں ایسی کامیابی نہیں ہوئی ۔

مگر چیپک کی شہرت کا دارومدار اس کے ڈراموں پر ہے اور یہاں وہ اپنی اصلی ادبی شان میں نظر آتا ہے ۔ ایچ ۔ جی ۔ ویلز اپنے رومانوں میں جس حیرت‌انگیز تخیّل کی مثال پیش کرتا ہے تمثیل کے میدان میں چیپک کا پلہ اس سے ہلکا نہیں ۔ جنھیں اس کے شہرۂ آفاق طنزیہ ناٹک R.U.R. یا Insect Play یا Macropolus Secret یا Adam, the Creator کو پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ آج ہم میں سے کتنا بڑا ادیب اٹھ گیا ۔

اس کی طنز بہت ہی لطیف اور دوُررس ہے ۔ موجودہ تمدن کی ہلاکت اسے پریشان رکھتی ہے اور گزشتہ و آیندہ جنگوں کا خیال اس میں مایوسی کے جذبات پیدا کرتا ہے ۔ چنانچہ R. U. R. میں وہ میکانکی آدمیوں (Robot یہ لفظ چیپک کا

تراشا ہوا تھا اور اب اسی معنی میں ہر زبان میں رایج ہے) کی بغاوت کا تصور کرتا ہے جو ساری انسانیت کو فنا کردیتے ہیں۔ لیکن اس مایوسی کے بادل سے امید کی ایک کرن ہمیشہ جھانکتی رہتی ہے اور چیپک یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ ایک دن انسان مشین کا مالک بن جائے گا اور پھر بنی نوع انسان سکھ چین سے رہ سکیں گے۔

اپنے نظریہ میں وہ لبرل اور انسانیت پسند تھا اور اس کے افسانے اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ابھی چیپک کو بہت دن جینا چاہیے تھا لیکن چیکوسلوویکیا پر پچھلے دنوں جو کچھ بیتی اس نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس کی زندگی کے خواب ورق ورق ہوا میں اُڑ گئے اور جمہوریت پر سے اس کا ایمان اٹھ گیا۔ اسے فاشیزم، نسلی تعصب وغیرہ سے انتہائی نفرت تھی اور اب اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ملک میں یہ لعنتیں مسلط ہو رہی تھیں۔ اس واقعہ کے تین ماہ بعد ہی وہ مرگیا۔ افسوس کہ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں کی اپیل کے باوجود اس مرتبہ اس بےمثال ادیب کو نوبل پرائیز نہ دیا گیا اور اس کی وجہ سیاسی مصلحتوں کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ یہ ایک ماتم افزا حقیقت ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا ادبی امتیاز بھی سیاسی ہتکنڈوں سے محفوظ نہیں ہے۔

کُپرِن (KUPRIN)

کپرن کی موت ادبی دنیا کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ گزشتہ سال کے وسط میں وہ روس میں ۷۳ سال کی عمر میں مرگیا۔ انقلاب کے بعد اس نے اپنا وطن چھوڑ دیا تھا اور پیرس میں رہنے لگا تھا۔ یہاں ہمیں ایک بار اسے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی صحت بہت خراب تھی اور لقوے کے مارے وہ ہلنے یا بولنے سے بھی معذور

ہوگیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے یہ آرزو ظاہر کی کہ وہ روس میں دفن کیا جائے۔ اس کے احباب اسے وہاں لے گئے اور کچھ عرصے بعد ہی وہ مرگیا۔

تالستائی کہتا تھا کہ روس کے نئے ادیبوں میں کپرن سے بڑا حقیقت پسند کوئی نہیں - اور یہ بالکل سچ ہے۔ جنھوں نے اس کا شاہکار YAMA—the Pit پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے قلم میں کیسی قوت تھی، اس کی نگاہ میں کیسی وسعت تھی اور اس کے دل میں کیسا درد تھا۔ یہ طوایفوں کی زندگی کا مرقع ہے اور آج تک عالم ادب میں اس موضوع پر ایسا ناول نہیں لکھا گیا۔ گو 'بالزاک' اور 'زولا' جیسے با کمالوں نے بھی ان بدنصیبوں کا نوحہ لکھا ہے مگر کپرن کی گرد کو بھی کوئی نہیں پہنچتا۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام متمدن زبانوں میں ہو چکا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سب ملا کر اس کی تیس لاکھ کاپیاں بک چکی ہیں۔

کپرن بھی نوبل پرائیز کی کمیٹی کی مصلحتوں کا شکار ہوا۔ سنہ ۱۹۳۲ع میں یہ کمیٹی کسی روسی ادیب کو یہ انعام دینا چاہتی تھی۔ گورکی، کپرن اور میرجکووسکی (Merejkovsky) کے نام پیش تھے۔ لیکن یہ اندیشہ تھا کہ گورکی کو انعام ملا تو سرمایہ‌دار ممالک برہم ہوں گے اور اگر کپرن کو ملا تو روسی حکومت کی ہتک ہوگی۔ لہذا انعام 'بونن' کو دے دیا گیا جو ان تینوں کے مقابلے میں ایک معمولی ادیب ہے۔

ایٹس (W. B. YEATS)

ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ تعزیتوں کا یہ سلسلہ لمبا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن انگریزی کے نامور شاعر 'ایٹس' کا انتقال ایسا واقعہ نہیں کہ بھلایا جا سکے۔ اس زمانے میں وہ انگریزی کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ عشقیہ شاعری اس کا خاص وصف تھا اور اس فن کے استادوں میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ جمالیات میں یکسر ڈوبا ہوا تھا اور اشاریت (Symbolism) کا علمبردار تھا۔ اس اعتبار سے اس میں

اور ٹیگور میں کئی چیزیں مشترک ہیں اور یہی وجہ تھی کہ ٹیگور کے کمال کو سب سے پہلے اسی نے پہچانا اور اس کا تعارف بذات خود لندن کے ادبی حلقوں سے کرایا۔ اس کے بعد ہی ٹیگور کو نوبل پرائیز ملا۔

ایٹس کو بھی سنہ ۳۲ع میں یہ امتیاز ملا اور اس سے بڑھ کر اس کا اہل کون ہو سکتا تھا۔

اس نے کئی ڈرامے بھی لکھے اور ان میں (Shadowy Waters) (۱۹۰۰) (Catheleen ni Houlihan) (۱۹۰۲) اور (Deirdre) (۱۹۰٦) کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

نظموں میں اس کا شاہکار (Wind among the reeds) ہے۔ اس نے خود اپنی بہترین نظموں کا انتخاب سنہ ۳۴ع میں شایع کیا تھا۔

اس کی تمثیلوں پر اس کے ہموطن آئیرش ڈراما نگار (Synge) اور "سانرلنک" کا اثر نظر آتا ہے اور اس کی ابتدائی شاعری فرانس کی اشاریاتی تحریک کی تحریروں سے بہت متاثر ہے۔ وہ فرانس کو اپنا روحانی وطن سمجھتا تھا۔ آخری عمر میں یہیں رہنے لگا تھا۔

عالم ادب

از گورکی

[انقلاب روس کے بعد سنہ ۱۹۱۹ میں حکومت نے ادب کی نشر و اشاعت کا بڑا ساز و سامان کیا۔اس سلسلے میں ان تصانیف کی ایک فہرست شایع ہوئی جن کے تراجم کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر گورکی مرحوم نے حسب ذیل تقریب تحریر کی تھی۔]

ادب کے غایر مطالعہ کی ضرورت پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ ادب دنیا کا دل ہے جس میں انسانیت کے ارمان اور خواب، سکھ اور دکھ، امید و مایوسی اور

خوف و ہراس محفوظ ہیں۔ یہ دل خودبینی کے شوق سے دھڑک رہا ہے ۔ قدرت کی گوناگوں طاقتوں نے انسان کو اپنا بلند ترین مظہر بنایا ہے اور ادب اس انسان کی ہستی کی غایت اور مقصد کے اظہار کا آلہ ہے۔

ادب دنیا کی وہ نگاہ دوربیں ہے جو روح انسانی کے ہر راز کو دیکھ سکتی ہے ۔ کتاب جو ہمارے لیے نہایت ہی معمولی چیز ہے، کاینات کے سب سے بڑے کرشموں میں سے ایک ہے۔ کوئی انجان آدمی ایک عجیب زبان میں ہزاروں سال پہلے اور ہزاروں میل دور بیٹھے بیٹھے کچھ نشانات کاغذ پر بناتا ہے اور ہم جو اسے نہیں جانتے ان سطور کو پڑھ کر اس کے جذبات و خیالات سے آشنا ہوتے ہیں، اس کے تخیل و تصور سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس کی آوازوں پر سر دھنتے ہیں۔ اسے پڑھ کر ہم ہنستے ہیں، روتے ہیں، مچلتے ہیں ۔ اس بےجانی پہچانی زندگی سے ہم ہم‌آواز ہوجاتے ہیں ۔

انسانیت نے قوت اور مسرت کی تلاش میں جو معجزے دکھائے ہیں ان میں 'کتاب' سب سے عجیب اور عظیم‌الشان ہے ۔

عالم ادب کوئی واحد شے نہیں کیونکہ ہماری کوئی واحد زبان نہیں ہے ۔ لیکن تمام ادبی کارناموں میں خیالات و جذبات کی وہی یگانگت نظر آتی ہے جو ساری انسانیت کا ورثہ ہے ۔ روحانی آزادی کی تمنا ، غم زندگی کا نوحہ ، یہ توقع کہ زندگی کا نظام بہتر ہوسکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ اس منزل کی تلاش جس کی راہ میں ہر آدمی رواں ہے اور جو الفاظ و خیالات کے بندھن سے آزاد ہے بلکہ ہمارے تخیل تک کو قریب نہیں آنے دیتی ۔ یعنی وہ غیر مرئی حقیقت جسے ہم نے 'حسن' کا نام دیا ہے اور جو دنیا میں اور ہمارے دلوں میں منور ہے ۔

خلا اور فضا کے علاوہ ہماری دنیا روحانی تخلیقیت کے ہالے سے گھری ہوئی ہے اور اس کا جنم ہماری اس قوت سے ہوتا ہے جو فنا سے بقا پیدا کرتی ہے؛ جس میں سے ایک طرف مشینوں محلوں اور سرنگوں کی بنیاد پڑتی ہے تو دوسری طرف

کتابیں تصویریں اور گیت بنتے ھیں - ھماری زندگی کی آھنی مگر کمال نازک شاعری اسی جوھر سے عبارت ھے -

قدرت کی دیواروں کو توڑتے ھوئے اور انسان کی درندگی کو کچلتے ھوئے جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے ھیں، ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ ھمارے کارناموں کا سب سے شاندار اظہار ھماری علمی اور ادبی مساعی میں ھوا ھے -

ادب کی سب سے بڑی خوبی یہ ھے کہ ھمارے احساس کو عمیق، خیالات کو وسیع اور زندگی کے جذبے کو بلندتر بنا کر وہ یہ ثابت کرتا ھے کہ سارے عمل و خیال کی جڑیں انسان کے گوشت و پوست میں نہاں ھیں -

وہ یہ بتاتا ھے کہ چینی 'ھن توی' محبت کا اتنا پیاسا ھے جتنا ڈان جوان؛ حبشی گیت اتنے ھی اداس ھیں جتنے فرانسیسی؛ جاپانی بیسوا (گیشا) کا عشق اتنا ھی دردناک ھے جتنا 'مانوں لیسکو'[1] (Manon Lescaut) کا - ایک عورت کو اپنی روح کا ھمدم بنانے کی تڑپ ھر زمانے اور ھر ملک کے مرد میں اتنی ھی شدت سے موجود ھے - ایشیا اور یورپ میں قاتل سے یکساں نفرت کی جاتی ھے - روسی کنجوس 'پلیشکن'[2] اتنا ھی قابل رحم ھے جتنا فرانسیسی 'گراندے'[3] - ھر ملک کا بگلابھگت ایک ھی گت کو پہنچتا ھے -

غرض یہ کہ زبان کوئی ھو لیکن تمام انسانیت کی داستان کا موضوع ایک ھی ھے: انسان اور اس کے حالات -

انسانیت کی لاتعداد یگانگتوں اور کثرتوں نے ادب کی پرورش کی ھے اور یہ ادب حیات کا زندۂ جاوید نمونہ ھے - اسے اپنے عکس کی اصلیت کا احساس ھے - اس درپن میں ڈکنس کی مسکراھٹ اور دستوویسکی کی فریاد، ھماری کمینگی اور حماقت، قدرت کے آگے ھماری بہادری یا بزدلی، عشق کی شرافت اور نفرت کی آگ، مکر و

---

۱ ابے پریوست کا اسی نام کا مشہور فرانسیسی ناول -

۲ گوگل کے شاھکار Dead Souls کا ایک کردار جو اپنی کنجوسی کے لیے ضرب المثل ھے -

۳ بالزاک کے شاھکار Eugenie Grandet کا کنجوس کردار -

۴ مولیر کے کردار 'تاروف' کی طرف اشارہ ھے -

دجل کی کمندیں، خوابوں کی رنگینیاں، محنت و مزدوری کی کرشمہ‌گری اور ہماری کانپتی ہوئی امیدیں ــــــــ یعنی وہ سب کچھ نظر آتا ہے جس سے دنیا زندہ ہے اور ہماری جان میں جان ہے۔ انسان کو کسی ہمدرد دوست یا منصف کی نظر سے دیکھتے ہوئے، اس کے سکھ دکھ میں ہاتھ بٹاتے ہوئے؛ اس کی کمینگی اور بزدلی پر لعنت بھیج‌کر اور اس کی جواں‌مردی کو آفریں کہہ کر ــــــــ ادب زندگی سے بلندتر ہوجاتا ہے اور سائنس کے ساتھ ساتھ انسان کو بتاتا جاتا ہے کہ اس کی راہ کیا ہے اور اس میں کیسے کیسے جوہر نہاں ہیں۔

ادب انسان کا عیب‌چیں ہی نہیں، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں اپنی حیوانی زندگی سے بلندتر ہونے کی تمنا پیدا کرے، اسے انحطاط پذیر حقیقت کی بیڑیوں سے آزاد کرے اور بتائے کہ وہ ماحول کا غلام نہیں بلکہ اس کا مالک اور خالق ہے۔ اس معنی میں ادب ہمیشہ انقلاب‌گیر رہےگا۔

لفظ اور تصویر میں تخلیق کی جو قوتیں پوشیدہ ہیں ان کی ہمہ‌گیری کو دیکھو تو یقین ہوجاتا ہے کہ یہ دریا قوم و نسل، طبقہ و مذہب کے بندھنوں کو توڑنے کے لیے ہے اور یہ اس لیے رواں ہوا ہے کہ انسان انسان کی لڑائیوں کو بند کرے اور انھیں ایک ہار میں گوندھ دے۔ جب یہ ایک ہوجائیں تو قدرت کی بےپناہ طاقتوں سے انسان کی جنگ شروع ہو۔

چند مختصر الفاظ میں ادب کے متعلق یہ ہمارا رویہ ہے جس کے مطابق ہم عالم ادب کے انتخاب و اشاعت کا کام شروع کرنے والے ہیں۔

ہم اپنا کام ان کتابوں کی اشاعت سے شروع کریں‌گے جو فرانسیسی اور روسی انقلابوں کے درمیان چھپی تھیں۔ ان کی ترتیب میں اس نکتے کا خیال رکھا جائےگا کہ ناظر اس زمانہ کے مختلف ادبی رجحانوں کے ہر پہلو کو سمجھ سکے، طرز و بیان کی باریکیوں سے واقف ہوسکے اور اس تاریخی ارتقا کو پہچان سکے جو 'والتیر' سے شروع ہوکر 'اناطول فرانس' اور 'رچرڈسن' سے لےکر 'ایچ-جی- ویلس' تک آتا ہے۔

یہ کتابیں سستے ایڈیشن میں چھپیں گی اور ان کے ساتھ مصنف کی سوانح عمری دیباچے، ضروری حوالے اور کتاب کا سماجی اور تاریخی پس منظر بھی شامل ہوگا۔ اس قسم کی پندرہ سو کتابیں شایع کرنے کا ارادہ ہے!

اس کے بعد عہد وسطیٰ کے ادب اور روسی ادب کے انتخاب کا سلسلہ شروع ہوگا۔ ساتھ ساتھ ایشیائی ممالک کے ادب کے نمونے بھی شایع کیے جائیں گے۔ اس دوران میں ہم چھوٹے چھوٹے پمفلٹ چھاپیں گے جو زیادہ سے زیادہ تعداد میں عوام میں تقسیم کیے جائیں گے۔ ان میں یورپ اور امریکہ کی اہم ترین تحریروں کا انتخاب ہوگا اور ساتھ ساتھ ضروری حوالے اور اشارات وغیرہ بھی ہوں گے۔

ادب جو ہمارے اجداد کی خوبیوں اور برائیوں، کامیابیوں اور غلطیوں کی تاریخ ہے، ادب جو خیالات کی تہذیب کرتا، قوت ارادی کو جلا دیتا اور جبلتوں کی حیوانیت کو دور کرتا ہے ـــ اس کا فرض ہے کہ اب وہ اپنی اصل منزل کو پہچانے۔ یعنی اپنے میں وہ روحانی طاقت پیدا کرے جو ساری انسانیت میں ایک آرزو اور ایک خواب کا نغمہ چھیڑ دے اور یہ آرزو ہو ـــ آزاد اور حسین زندگی کی تکمیل کی تگ و دو۔

ادبی تخلیق کا میدان روحانی 'انٹرنیشنل' ہے۔ آج جب بین قومیت کا جھنڈا فضا میں لہرانے لگا ہے کیوں نہ ادب انسانیت کی روح تک یہ پیغام پہنچا دے۔

اب تک 'روپیہ' کی تلاش نے انسان کو انسان کا بیری بنا رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے نفرت کی آگ جلتی تھی، خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ لیکن ادب انسان کی یگانگت کا صور پھونکے گا اور پھر سے وہ صدا بلند کرے گا جس پر ہر زمانے کے عالموں اور ادیبوں نے لبیک کہا تھا۔

کارل مارکس کا ادبی ذوق

از

پول لافورگ

[پول لافورگ اشتراکیت کے مشہور نظریات‌داں تھے - علاوہ بریں وہ مارکس کے داماد بھی تھے اور اس وجہ سے اس کی نجی زندگی سے بخوبی واقف تھے - هندستان میں ادبی 'ترقی پسندی' کے نام پر جب عجیب عجیب غلط‌فہمیاں پھیلی هوئی هیں تو یہ مقالہ دل‌چسپی سے پڑھا جائے گا -]

مارکس کسی کو اپنی کتابیں یا کاغذات چھونے کی اجازت نہ دیتا تھا - گو بظاهر اس کی میز پر ایک هیولیٰ نظر آتا تھا، لیکن اس کے لیے اس افراتفری میں بھی بڑی ترتیب تھی - وہ جو کتاب چاهتا ایک آن میں نکال لیتا - بات‌چیت کرتے کرتے وہ یک بیک رک جاتا اور حوالے کے لیے کوئی صفحہ یا اعداد و شمار ڈھونڈھ کر دکھا دیتا - اپنی میز کو وہ بڑی محنت سے ٹھیک کیا کرتا اور هر کاغذ ایک فرماں‌بردار خادم کی طرح اس کے حکم کا منتظر رهتا تھا -

کتابوں کی ترتیب میں وہ ان کے سائیز کا نہیں بلکہ نفس مضمون کا التزام رکھتا تھا - چناں‌چہ ایک قطار میں کوئی کتاب هاتھ بھر لنبی هوتی تھی تو کوئی ایک بالشت سے زیادہ نہیں - مگر کتابوں کو وہ نمایش کے طور پر نہیں بلکہ اپنے اوزاروں کی طرح رکھتا تھا - وہ کہا کرتا تھا کہ یہ میری باندیاں هیں اور انھیں میری حسب مرضی میری خدمت کرنی چاهیے - وہ ان کے ظاهری روپ کی کوئی پروا نہ کرتا تھا اور بےدریغ کسی کا ورق موڑ دیتا تو کسی کی جلد هی اکھاڑ لیتا اور هر صفحہ پر سرخ نشانوں کا تو کوئی حساب نہ تھا - وہ نوٹ کم لیتا تھا - خاص مقاموں پر حیرت ـــــ یا سوال کے نشان بنا دیتا تھا - کئی کئی سال بعد وہ اپنی نوٹ‌بک یا ان نشان‌شدہ ابواب کو دوبارہ پڑھتا تھا تاکہ ضروری چیزوں کو بھول نہ جائے - هیگل کے مشورے کے مطابق اپنی جوانی سے اس نے اشعار اصلی زبان میں یاد رکھنے کی عادت ڈال لی تھی، خواہ وہ ان زبانوں سے براہ راست واقف نہ بھی هو -

گیٹے (Goethe) اور هائنے (Heine) کا کلام اسے بر زبان یاد تھا اور گفتگو کے دوران میں وہ اکثر ان کے شعر سناتا تھا - وہ یوروپین ادب کے تمام شاعروں کو پڑھتا تھا - ہر سال وہ یونانی تمثیل‌نگار Aeschylus کا ورد کیا کرتا تھا - اس کی رائے میں شکسپیر اور اسکائی‌لس دنیا کے دو بہترین ڈرامانگار تھے - وہ شکسپیر کا عاشق تھا اور بڑی محبت سے اس کا مطالعہ کرتا تھا - وہ اس کے ہر کردار کو جانتا تھا - سچ تو یہ ھے کہ مارکس کا پورا خاندان شکسپیر کا دلدادہ تھا - اس کی تینوں بیٹیوں کو اس کے پورے ڈرامے حفظ تھے - سنہ ۱۸۴۸ع میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس نے اسی باکمال ادیب کو اپنا رہبر بنایا اور اس کے خاص خاص محاوروں کو یکجا جمع کرڈالا - 'دانتے' اور 'روبرٹ برنس' کو بھی وہ بہت پسند کرتا تھا - جب اس کی بیٹیاں پرانے شاعروں کے پریم گیت گاتیں تو وہ بہت خوش ہوا کرتا تھا -

جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتا تو کمرے میں ٹہلنے لگتا تھا - دروازے سے لےکر کھڑکی تک وہ ایک خاص سمت سے ہوکر آتا جاتا تھا اور اس کے قدم اتنے باقاعدہ تھے کہ قالین کے وہ حصے ادھڑ گئے تھے - بیچ میں وہ سوفے پر لیٹ کر کوئی ناول پڑھنے لگتا - ڈارون کی طرح اسے بھی رومان بہت پسند تھے - ان میں وہ اٹھارھویں صدی کے ناولوں کو ترجیح دیتا تھا! فیلڈنگ کے Tom Jones کو اس نے کئی بار پڑھا - نئے ناول‌نگاروں میں وہ پول د کوک (Paul De Kock) والٹر اسکاٹ اور ڈیوما (Dumas) کا معترف تھا - اسکاٹ کے Old Mortality کا شمار وہ ادبی شاہکاروں میں کرتا تھا - سیاحت اور مزاح کے قصوں میں بھی اسے مزا ملتا تھا -

لیکن اس کا سب سے محبوب ناول‌نویس 'بالزاک' تھا - وہ اس حد تک اس کا شایق تھا کہ اپنے اقتصادی مقالوں سے فرحت پانے کے بعد اس کے Comedie humaine پر ایک تنقیدی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا -

مارکس تقریباً تمام یوروپین زبانیں پڑھ لیتا تھا اور ان میں سے تین یعنی جرمن، انگریزی اور فرانسیسی کا ایسا انشاپرداز تھا کہ اهل زبان بھی دنگ رہ جاتے تھے - وہ کہا کرتا تھا کہ 'غیر ملکی زبان کا علم کشمکش حیات میں حربے کا کام دیتا ھے'!

اسے زبانیں سیکھنے کا خاص ملکہ تھا - پچاس سال کی عمر میں اس نے روسی پڑھنا شروع کی - سب جانتے ھیں که دوسری یورپین زبانوں سے روسی کو دور کی بھی نسبت نہیں - تاھم چھے مہینے کے اندر وہ روسی کتابیں پڑھنے لگ گیا - روسی ادیبوں میں وہ 'پشکن'، 'گوگول' اور 'شڈیورن' کا قایل تھا -

............جب اس کی بیٹیاں کم عمر تھیں تو وہ اکثر انھیں ھواخوری کے لیے باغ لے جاتا تھا - ٹہلتے ٹہلتے وہ انھیں من گھڑت قصے سنایا کرتا تھا - قصوں کی چھٹائی بڑائی راستے کے فاصلے پر منحصر ھوتی تھی - گھر سے نکلتے ھی وہ کوئی کہانی دل میں گھڑ لیتا تھا -

وہ فطری شاعر تھا اور اس کا تخیل بہت بلند تھا - اس کی ادبی کاوش کی ابتدا شاعری سے ھوئی تھی - اس کی بیوی نے بڑی احتیاط سے ان نظموں کو محفوظ رکھا تھا لیکن انھیں کسی کو نہ دکھاتی تھی - مارکس کے والدین نے سوچا تھا که وہ کوئی پروفیسر یا ادیب ھوگا، لیکن وہ نکلا اشتراکیت کا علمبردار اور بازار میں اس وصف کی جو قدر ھوتی ھے سو معلوم! - مارکس نے اپنی بیٹیوں سے وعدہ کیا تھا که وہ ان کے لیے یونانیوں کے متعلق ایک ڈراما لکھےگا - مگر وہ اپنے ارادے کی تکمیل نہ کرسکا - مارکس کے منصوبوں کا کوئی شمار نہیں - اس کی تمنا تھی که فلسفے کی تاریخ اور علم منطق کا ایک تبصرہ لکھے - اور اس نے جو ادبی منصوبے بنائے تھے ان کی تکمیل کے لیے تو اسے مزید ایک سو سال کی مدت کی ضرورت تھی -

---

'پرل بک' اور نوبل پرائیز

نوبل کمیٹی نے اس سال کا ادبی انعام امریکہ کی مشہور ناول‌نگار خاتون مسز پرل‌بک کو عطا کیا ھے - ان سے پہلے امریکہ کے دو ادیبوں کو یہ امتیاز حاصل

ھوا تھا؛ یوجین اونیل کو اپنی تمثیلوں کے لیے اور سنکارلیوس کو ناولوں کے لیے۔

پرل بک کی زندگی کا بہت بڑا حصہ چین میں گزرا۔ اس کا باپ وھاں کا مشنری تھا اور وہ خود نانکنگ یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ وھاں اسے چین کے ادب اور تمدن کے مطالعہ کا موقع ملا اور اس کے آرٹ کا واحد موضوع چین ھی ھے۔ اب تک وہ چار ناول لکھ چکی ھے جن میں Good Earth کو بڑی شہرت ملی۔ اسی پر اسے نوبل پرائیز بھی ملا۔ گو یہ سچ ھے کہ اس ناول کا جو فلم تیار ھوا وہ عدیم المثال تھا اور ناول کی مقبولیت میں چین و جاپان کی جنگ کو بھی بڑا دخل ھے، لیکن ان دونوں چیزوں سے قطع نظر یہ ناول بذات خود اعلی پایہ کا ھے۔ پرل بک کے آرٹ پر ایک اعتراض یہ ھے کہ اس کی تحریروں میں بڑا اتارچڑھاؤ ھے اور یہ کسی اعلی پایہ کے آرٹسٹ کے شایان شایان نہیں۔ جو بھی ھو، اس میں شک نہیں کہ چینی زندگی کا ایسا پراثر اور صحیح مرقع اب تک کسی نے نہیں پیش کیا اور یہ 'پرل بک' کا ایسا عطیہ ھے کہ بھلایا نہیں جاسکتا۔

رومن رسم الخط کی ضرورت

از

سبھاش چندر بوس

[قومی رسم الخط کے مسئلے پر کانگریس کے صدر نے ھندی کے ایک اخبار نویس کو حسب ذیل بیان دیا ھے جو 'وشال بھارت،' (نومبر سنہ ۳۸ع) سے ماخوذ ھے]۔

سنہ ۳۴ع تک میں رومن رسم الخط کا مخالف تھا اور سمجھتا تھا کہ کسی غیرملکی خط کا استعمال ایک قسم کی قومی ھتک ھے۔ انھیں دنوں مجھے تقریباً تمام یورپ کی سیر کا موقع ملا۔ یوگوسلاویہ اور بلغاریہ میں ایک ایسے خط سے سابقہ پڑا جو روسی سے ملتا ھوا تھا اور میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ اس دقت سے مجھے کہیں اور دوچار نہ ھونا

پڑا کیوں‌کہ ہر جگہ رسم‌خط ایک ہی سا تھا اور آسانی سے پڑھ لیا جاتا تھا۔ ترکی میں بھی عربی خط کی جگہ رومن نے لے لی تھی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ ایک بین قومی خط کتنی آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ میں یہ بھی سوچنے لگا کہ پردیسیوں کو ہمارے ملک میں اس وجہ سے کیسی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہوگا۔ بین قومی نقطۂ نگاہ سے یہ امر میرے لیے مسلّم ہوگیا کہ ہندستان میں بھی ایک 'جگت لِپی' (خط) کا چلن ہونا چاہیے۔

مگر ہندستان لوٹنے کے بعد قومی زاویۂ نگاہ سے اس راہ میں کئی رکاوٹیں نظر آئیں۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ہمارے اتحاد کی راہ میں ایک بڑا روڑا رسم‌خطوں کا اختلاف بھی ہے۔ یہ بھی سوچنا ہے کہ اگر کوئی پردیسی ہماری زبانوں سے واقف ہونا چاہے تو بھانت بھانت کی 'لپیوں' کو سیکھنے میں اس کا کتنا وقت ضایع ہوتا ہے۔ اگر یہاں بھی اسی 'جگت لِپی' کو رواج ہوتا تو ہزاروں غیرملکی ہماری زبانیں سیکھ جاتے۔ غرض یہ کہ بین قومی تعلّقات کے لیے ایک ایسے خط کا استعمال ناگزیر ہے جو دوسرے ملکوں میں بھی رایج ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا رسم‌الخط ہے جسے ساری قوم قبول کر سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ دیوناگری اور اردو کے سوا اور کوئی مقامی لِپی اس منصب کو نہیں پہنچ سکتی۔

چناں‌چہ مسئلہ اردو اور دیوناگری میں سے کسی ایک کے انتخاب کا ہے۔ ہمارے ملک کے حالات ایسے ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو قبول کرنے کے لیے سارا ملک تیار نہیں ہے۔ لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ ہندستان ایک تیسرا رسم‌خط منظور کر لےگا۔ ایک تو یہ کہ ہمیں یورپ کی زبانوں سے آشنا ہونا ضروری ہے اور ان کے لیے رومن رسم‌خط جاننا ہی ہے۔ پھر ہم اسے ہی اپنا خط کیوں نہ بنا لیں۔ ناگری والے اردو کے بیری ہیں اور اردو والے ناگری سے خار کھاتے ہیں۔ لیکن یہ عجب نہیں کہ دونوں کا میل رومن کے ذریعہ سے ہو جائے۔

اس میں کوئی خاص قباحت بھی نہیں ہے - نوّے فی‌صدی ہندستانی ان پڑھ ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ سب آسانی سے رومن خط نہ سیکھ جائیں - مثال کے طور پر ترکی کو لے لیجیے - وہاں بھی جہالت کا یہی حال تھا لیکن لوگوں کو بدیسی رومن لپی سیکھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی - حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم پر جو اعتراض ہوتا ہے وہ تعلیم‌یافتہ طبقے کی طرف سے ہوتا ہے - اس کا خیال ہے کہ کسی نئے اور غیرملکی رسم‌خط کا چلن ہماری قومی شان کے خلاف ہے - نئے پن کا اعتراض تو صریحاً بےبنیاد ہے - اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ ناگری لپی خدا کی دین نہیں ہے - ویدوں کے عہد سے لےکر اب تک نہ جانے کتنے خط آئے گئے ہوئے تب کہیں اس ناگری کا ظہور ہوا - اب بھی ہر صوبے میں اس کی ایک الگ شکل موجود ہے - اگر ہزاروں سالوں سے ہمارے خط بدلتے آئے ہیں تو ضرورت کے لحاظ سے ہم آج اسے کیوں نہیں بدل سکتے ؟

یہ سچ ہے کہ غلام ہندستان کسی غیرملکی رسم‌خط کو قبول نہیں کر سکتا - اس وقت غیرملکی چیزیں ہمارے قومی احساس کو مجروح کر سکتی ہیں - لیکن میرا خیال ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ہم اس مسئلے کو ایک نئے پہلو سے دیکھنے لگیں گے - اس وقت تو یہی دیکھا جائےگا کہ کون سا خط آسان ہے - دنیا یگانگت کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے اور آزاد ہونے کے بعد ہمیں بھی یہی راستہ اختیار کرنا ہوگا - اس وقت ہم خوشی سے اپنا رسم‌الخط رومن کو بنا لیں‌گے -

یورپ میں خط ایک ہے اور زبانیں مختلف ہیں - لیکن رومن میں اتنا 'لچیلا پن' ہے کہ وہ ہر قسم کی آواز ادا کر سکتی ہے - ہر آواز کے لیے کوئی نشان مقرر کیا جا سکتا ہے اور یورپ میں یہی کیا جاتا ہے ؛ ہم بھی یہی کر سکتے ہیں -

اس سے اور بھی کئی فایدے ہوں گے - ہم اپنی زبانوں میں رسم‌الخط کی مشکل کی وجہ سے تار نہیں دے سکتے - لینوٹائپ وغیرہ سے فایدہ نہیں اٹھا سکتے - فوج میں ہر طرح کی 'سگنلنگ' رومن میں ہی ہوتی ہے - مختصر یہ کہ سائنس اور صنعت و حرفت کی تمام برکتوں سے ہم قریب‌تر ہو جائیں گے -

میرے خیال میں رومن لپی کے استعمال سے یہ فایدے ھوں گے :-

(۱) ھندی اردو کا قضیہ ختم ھو جائےگا۔

(۲) رسم‌الخطوں کا اختلاف دور ھوگا اور قومی یگانگت کی ایک بڑی منزل طے ھو جائے گی۔

(۳) ایک ھی رسم‌خط کے سہارے ھم دیسی پردیسی سب زبانیں سیکھ سکیں گے۔

(۴) نوے فی‌صدی جاھل عوام کی تعلیم کا مسئلہ آسان ھو جائےگا اور وقت اور خرچ دونوں کی بچت ھوگی۔

(۵) دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے میں سہولت ھوگی۔

(٦) یہ اعتراض غلط ھے کہ انگریزی زبان رومن میں لکھی جاتی ھے لیکن اس میں لکھا جاتا کچھ اور پڑھا جاتا کچھ ھے۔ یہ انگریزی زبان کی خطا ھے نہ کہ رومن لپی کی۔ فرینچ اور جرمن میں یہ نقص نہیں ھے۔

شرت چندر چٹرجی

از

چارو چندر بینرجی

[سال بھر پہلے ھمارے ملک کے سب سے بڑے ناول‌نگار شرت چندر کا انتقال ھوا تھا۔ ھم اب تک سوچتے رھے کہ تفصیل سے ان کی زندگی اور آرٹ پر کچھ لکھا جائے لیکن تنگیِ وقت نے اب تک موقع نہ دیا۔ فی‌الحال ھم شرت چندر کے ایک عزیز دوست کے لکھے ھوئے مضمون کے چند اقتباسات ایک بنگالی رسالے سے یہاں ماخوذ کرتے ھیں۔]

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ھوتی تھی کہ شرت چندر راستے کے کتوں کا بہت خیال کرتے ھیں۔ ان لاوارث بازارو کتوں پر ھمیشہ ان کا کرم رھتا تھا۔ انھوں نے

اپنے ڈرائیور کو تاکید کر رکھی تھی کہ اگر موٹر کے نیچے کوئی کتا آیا تو تجھے نکال باہر کروں گا ۔ کسی دوسرے کے موٹر پر بیٹھتے تو سب سے پہلے ڈرائیور کو سمجھاتے کہ کتوں سے بچا کر چلنا ۔ وہ کبھی کسی کو اپنے سامنے کتوں کو پیٹنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور سخت خفا ہوتے تھے ۔

میں نے اس کا ذکر یوں کیا کہ یہ شرت چندر کے آرٹ کا سب سے بڑا وصف ہے ۔ سوسائٹی میں جو سب سے مظلوم ہے، سب سے زیادہ بد نصیب اور پامال ہے، شرت چندر کی ہمدردی اسی کے ساتھ ہے ۔ جو محروم پناہ ہے اور جس کا نہ ماضی ہے نہ مستقبل ، شرت چندر اسی کا ہمدم ہے ۔ اس کے کرداروں میں یا تو آوارہ ہیں یا بیوائیں ، ٹھکرائی ہوئی عورتیں اور کچلے ہوئے غریب ۔ اس کے ادب کا محل ٹوٹے ہوئے دلوں سے چنا گیا ہے ۔ اس کی ذاتی زندگی میں بھی یہی جوہر نمایاں ہے ۔

شرت چندر سے پہلے بنگالی ناول امیروں اور پاکبازوں کا آئینہ‌خانہ تھا ۔ وہاں غریبوں اور گنہگاروں کے لیے جگہ کہاں تھی ۔ اور یہ شرت چندر کا ہی کام تھا کہ اس نے بنگالی ادب کو حقیقت اور ہمدردی کی راہ دکھائی ۔

انسان ہو یا حیوان، وہ جتنا ذلیل ہوتا تھا شرت چندر اسی درجہ اس پر مہربان ہوجاتے تھے ۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے ناولوں میں بڑے سے بڑا بدمعاش بھی ایسی صورت میں نظر آتا ہے کہ ہم اس سے نفرت نہیں کر سکتے ۔

اپنے آرٹ کا رنگ روپ انھیں کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ملا تھا ۔ اس سلسلے میں مجھے ان کی ایک بات یاد آتی ہے جو انھوں نے کسی موقع پر مجھ سے کہی تھی : « وہ چیز میرے ادب میں داخل نہیں ہو سکتی جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پرکھ کر نہیں دیکھ لیا ہے ۔ تخیل یا تصور کے برتے پر ناول نہیں لکھے جاتے ۔ آدمی کی نجی زندگی کو میں نے غور سے دیکھا ہے، اس کے دکھ سکھ کو سمجھا ہے اور پھر قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے ۔» ان کا ہر ناظر اس قول کی صداقت کا گواہ ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا احساس بھی کام کرتا تھا اور دل اور نگاہ کا ایسا جوگ کم لوگوں

کو ودیعت ہوتا ہے ۔ یہاں میں ان کے وسیع مشاہدہ کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں ۔

* * * * * *

ایک مرتبہ شرت چندر نے مجھ سے کہا : " تم قیاس نہیں کر سکتے کہ اپنے ناولوں کے لیے میں نے کتنا خون پانی کیا ہے ۔ بہت سے موقعے آئے ہیں کہ دو دو روز بے کھائے ' بے سوئے گزر گئے ۔ کاندھے پر رومال ڈالے گانوؤں گانوؤں کی خاک چھانتا پھرا ۔ چماروں اور موچیوں کے ساتھ بارہا کھانے سونے کا اتفاق ہوا ۔ میں ان میں اس لیے گھل مل کر رہا کہ ان کے حالات انھیں کے منہ سے سنوں ۔ اس طرح میں نے دیہاتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ میرے ناولوں کے زیادہ کردار اور واقعات میری آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں ۔" یہی سبب ہے کہ شرت چندر کے ادب کا ہر لفظ جیتا جاگتا ہے اور ہمارے دل کی تہ کو پہنچتا ہے ۔

انھوں نے ایک ہزار طوایفوں کی رام کہانی قلم‌بند کی تھی ! افسوس کہ گھر میں آگ لگی اور اس کا مسودہ جل گیا ۔

نیچے طبقے کے لوگوں کی صحبت میں انھیں دنیا بھر کی نشیلی چیزوں کو چکھنے کا موقع ملا ۔ میرے سوال کے جواب میں سنانے لگے : " بھائی ' قصہ کوتاہ یہ کہ 'پنج رنگ' اور 'گریپ شاٹ' سے بھی لذّت آشنا ہوچکا ! اور کیا چاہتے ہو ۔ تم جانتے نہ ہوگے کہ یہ کیا چیزیں ہیں ۔ ایک حقہ میں بیک وقت پانچ چلمیں چڑھتی ہیں ' کسی میں گانجا ' کسی میں چرس ' کسی میں مدک ۔ پانی کی بجائے نلی میں شراب بھری جاتی ہے ۔ اس کا نام ہے 'پنج رنگ' ! 'گریپ شاٹ' چنڈو کا حقہ ہے لیکن اس میں سینکڑوں سوراخوں سے دھنواں آتا ہے اور بڑے بڑے چینی نشہ‌باز بھی ایک کش میں غش ہوجاتے ہیں ! میں یہ سب پاپ کرچکا ہوں ۔"

شرت چندر سانپ پکڑنے کے فن میں بڑے استاد تھے ۔ اپنے شاہکار 'شری کانت' میں انھوں نے اکثر اس کا ذکر کیا ہے ۔ وہ بڑے زہریلے سانپوں کو آسانی سے زیر کرلیتے اور ان کے دانت توڑ دیتے تھے ۔ کئی بازی‌گر ان کے شاگرد تھے ۔ جب ان سے

کوئی سانپ نہ پکڑا جاتا تو آ کر اپنے استاد کی دہائی دیتے۔ لیکن ایک بار کسی سانپ کے کاٹے پر شرت چندر کی دوا کارگر نہ ہوئی اور وہ مرگیا ۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کرتب چھوڑ دیا۔

ہندو مسلم ملاپ کے بڑے موید تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں کی زندگی پر کوئی ناول لکھیں۔ لیکن مسلم سماج کا کٹڑپن اس کی اجازت نہ دیتا تھا اور وہ جھجکتے تھے کہ ان کی نکتہ چینی فرقہ‌پرستی سے تعبیر نہ کی جائے۔ بنکم چند چٹرجی کی ان تحریروں کے سخت خلاف تھے جن میں مسلمانوں کی برائی کی گئی تھی۔

تبصرے

ادب

آهنگ

(مجموعۂ کلام اسرارالحق صاحب مجاز، بی اے۔ مطبوعۂ حلقۂ ادب، لکھنؤ، قیمت ایک روپیہ)

اسرارالحق صاحب مجاز اردو کے ہونہار شعرا میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں نوجوانی کا جوش اور تخیل کا بانکپن پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ندرت اور رنگینی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان کے موجودہ رنگ سخن سے انؔ کے مستقبل کے متعلق خوشگوار پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ اس مختصر سے مجموعہ میں زیادہ تر ان کی نظمیں ہیں۔ آخر میں یا متن کے نیچے چند ایک غزلیں بھی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں بھی غزلوں کی شان پائی جاتی ہے اور ہم انھیں غزل کا شاعر مانتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار سے ان کے رنگ طبیعت کا اندازہ ہوسکتا ہے:۔

کمال عشق ہے دیوانہ ہوگیا ہوں میں یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ! تمھارا راز تمھیں سے چھپا رہا ہوں میں

اک مجمع رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی!

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا سہرے میں چمکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سے رخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

اے نو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ مہکیں تری عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے روز شباب اور زیادہ!

مجموعہ کی ابتدا میں "زیب داستاں" کے عنوان سے جناب سجاد ظہیر صاحب نے مجاز کا تعارف کرایا ہے ۔ آپ کے خیال میں "جو شخص ان نظموں اور غزلوں کو پڑھےگا وہ یہ محسوس کرےگا کہ........تہذیب و تمدن کی دلھن کا لباس اب ریشمی نہیں ' وہ چھیتڑے پہنے ہوئے ہے ۔ وہ قصر امرا کی آرام دہ غلامی سے پیچھا چھڑاکر سیلاب حیات کے منجدھار میں پڑنا زیادہ پسند کرنے لگی ہے" مگر اس مجموعہ میں بہت سی نظمیں اس کلیہ کے خلاف پیش کی جا سکتی ہیں اس لیے مجاز کی شاعری کے متعلق یہ حکم لگانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں ادب اور زندگی کے تعلق پر زور دےکر ہمارے شعرا کو ملک کی موجودہ سماجی اور سیاسی جد و جہد سے متاثر ہوکر ادب میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت پر جو توجہ دلائی گئی ہے ہمیں اس سے پورا پورا اتفاق ہے ۔ مگر یہ مسئلہ ہمارے نوجوان شعرا نے غالباً ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا ہے ۔ ادب میں انقلاب کے معنی ادب میں انتشار ' بدنظمی اور سوقیانہ‌پن پیدا کرنے اور رخش ادب کو بےلگام چھوڑ دینے کے نہیں ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے ہمارے ادب میں جو رسمی اور نام‌نہاد انقلابی شاعری شروع ہوئی ہے وہ بےاثر بلکہ مضر ثابت ہو رہی ہے ۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا مخالفت اور مقابلہ کی اسپرٹ کو ترک کرکے تخریبی سے زیادہ تعمیری نقطۂ‌نظر سے کام لیں ۔ سرمایہ‌دار

اور مزدور کے عنوانات پر رسمی نظمیں لکھنے یا ایک کو برا اور دوسرے کو بھلا کہنے کی بجائے زندگی اور سماج کے مسائل میں زیادہ گہری اور سنجیدہ نظر ڈالیں اور زندگی میں ان انسانی اوصاف اور خصائل کو راہ دینے کا پرچار کریں جنھوں نے ہر زمانے میں قومی زندگی کی تعمیر اور ترقی میں بیش از بیش حصه لیا ہے - (ج - ا - ق)

جام طہور

(مجموعۂ رباعیات و قطعات خواجه عبدالسمیع پال صاحب اثر صہبائی - ایم اے' ایل ایل بی - جلد دیدہ زیب - ناشران تاج کمپنی لمیٹڈ' ریلوے روڈ لاهور - قیمت درج نہیں -)

اثر صہبائی صاحب پنجاب کے جدید شعرا میں رباعیاں لکھنے میں خاص امتیاز رکھتے ھیں - اس سے پہلے آپ کی رباعیوں کا ایک مختصر مجموعه "راحت کدہ" کے نام سے شایع ھوکر مقبول ھوچکا ہے مگر اس مجموعه میں آپ کی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد کے دور زندگی کی رباعیاں تھیں - زیر نظر مجموعه میں آپ کی کل رباعیاں شامل ھیں جو تعداد میں ۲۶۱ ھیں - آخر میں ۳۴ قطعات بھی ھیں -

رباعی لکھنا حقیقتاً نہایت مشکل فن ہے - چند غیر معروف اور متعین بحروں میں لکھنے کی قید کے علاوہ شاعر کو صرف ایک یعنی رباعی کے چوتھے مصرع میں ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت یا اصل مفہوم پیش کرنا ھوتا ہے - باقی تین مصرعے رباعی کو مکمل کرنے کے لیے کہے جاتے ھیں اور یہیں شاعر کے کمال کا امتحان ھوتا ہے - اگر تینوں مصرعے چوتھے مصرعے سے قدرتی طور پر مربوط اور اصل مضمون میں مکمل طریقے سے پیوست نه ھوں یا ان میں ذرا سا بھی جھول معلوم ھو تو پوری رباعی بےلطف ھوجاتی ہے - فارسی میں خیام اور سرمد کی رباعیاں مشہور ھیں اور اردو میں انیس' مولانا حالی اور اکبر الهآبادی نے رباعی لکھنے میں کمال حاصل کیا تھا - جدید ایرانی شاعری کا تو چولا ھی بدل گیا مگر اردو میں اس طرف جگت موھن لال رواں

مرحوم نے بھی خوب خوب رباعیاں لکھی تھیں۔ اردو کے زندہ شعرا میں حضرت امجد حیدرآبادی چوٹی کی رباعی کہنے والوں میں سے ھیں۔ اثر صہبائی نے بھی رباعی لکھنے میں اچھی مہارت حاصل کی ھے۔

اس مجموعہ کی رباعیاں زبان کی پختگی اور مضامین کی بوقلمونی سے معمور ھیں۔ ان میں حسن و عشق، مجاز و حقیقت، خیر و شر، زندگی و موت، مسرت و غم، انسان و خدا وغیرہ جیسے مسائل پر فلسفہ اور شاعری کا اچھا امتزاج پایا جاتا ھے۔ اسی کے ساتھ شاعر کے ذاتی غور و فکر اور رجحان کی جھلک بھی نظر آتی ھے جس کے بغیر شعر اثر نہیں پیدا کرسکتا۔ چند رباعیاں ملاحظه ھوں:—

یه پھول یه باد سرد یه آب رواں یه منظر کوھسار و ماہ تاباں
ھر چیز ھے بادۂ سکوں سے مسرور انساں ھی اسیر غم ھے، نادان انساں!

مٹی میں یه روشنی کہاں سے آئی؟ یه عقل، یه آگہی کہاں سے آئی؟
پھر عشق جنوں فزا کی مے میں یا رب سرمستی و بےخودی کہاں سے آئی؟

وہ کیف سرور اب کہاں سے لاؤں! وہ عشق کا نور اب کہاں سے لاؤں!
روشن تھی یه کائنات جس سے ھمدم وہ شعلۂ طور اب کہاں سے لاؤں!

یه بود و نبود کیا ھے، معلوم نہیں یه آتش و دود کیا ھے، معلوم نہیں
ھستی میں عدم ھے اور عدم میں ھستی یه مرگ و وجود کیا ھے، معلوم نہیں

ھر بت میں جھلک خدا کی پائی ھم نے نادان تھے، خوب منه کے کھائی ھم نے
ایک ایک صنم کو ھم نے توڑا آخر پھر پاکے خدا کو، کی خدائی ھم نے

شیطان تھا سر به سجدہ یزداں کے حضور لیکن نه کبھی جھکا وہ انساں کے حضور
انسان ھے مگر که ھے خدا سے سرکش لیکن ھے نیازمند شیطاں کے حضور

اے کیف و سرور زندگانی آجا اے روح نشاط و شادمانی آجا
ھر شے ھے ترے بغیر آنی جانی تو بن کے حیات جاودانی آجا!

مگر بعض جگہ خیال یا طرز بیان مستعار معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ رباعی :—

کچھ حق سے جدا نہیں ہیں مردان خدا مجبور فنا نہیں ہیں مردان خدا
لاریب خدا کے دست و بازو ہیں یہی ہر چند خدا نہیں ہیں مردان خدا

خیال کے کچھ اضافہ کے ساتھ فارسی کے اس مشہور شعر کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے :—

مردان خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نباشند

یا حسب ذیل مصرعے :—

تو حلقۂ صبح و شام سے ہے آزاد

اور

مانند سحر میری جوانی ہوتی

اقبال کے ان دو مصرعوں کی تبدیل‌شدہ صورت ہیں :—

حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے

اور

بےداغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

یا ایک رباعی کے یہ دو مصرعے :—

جب تجھ سے جدا نہ تھے تو تھے ہم بھی خدا

ہم تجھ سے جدا ہوئے تو انسان ہوئے

غالب کے مشہور شعر :—

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

کے ناکام چربے ہیں۔

مجموعہ کی ابتدا میں اثر صاحب نے تفصیل کے ساتھ ان شعرا و مفکرین کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے جن کے خیالات سے آپ کا ذوق شاعری متاثر ہوا ہے۔ ان میں غالب اور اقبال کے نام سر فہرست نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے مندرجہ بالا تسامحات ان ہر دو بزرگوں کے ساتھ ضرورت سے زاید عقیدت رکھنے کا نتیجہ ہوں۔ (ج۔ا۔ق)

درس غالب

(مجموعہ کلام غالب بہ طرز جدید مجلد۔ مرتبۂ پیرزادہ ابراہیم حنیف۔
اردوے معلی اکیڈمی۔لاہور، قیمت ایک روپیہ)

اہل پنجاب کو جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ’’ ایجاد بندہ ‘‘ کے مصداق ہو۔ مگر علم و ادب کا ذوق کسی کے میراث نہیں، نہ اس کی اچھائی یا برائی کو دو اور دو چار کے قطعی اور دو ٹوک کی قسم کے اصولوں کے مطابق جانچ سکتے ہیں۔ یہاں تو ’’ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ‘‘ کا فیضان درکار ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ جو چیز ایک شخص کو ناپسند ہو دوسرے کے نزدیک وہ بہترین قرار پائے۔ خیر، بہرحال اس مجموعہ میں جدت سے ضرور کام لیا گیا ہے۔ اور وہ جدت یہ ہے کہ مروجہ و متداول دیوان غالب کو ردیف وار حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مثلاً ہوتا کی ردیف کا سارا کلام ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے، نہ ہوا کا ایک جگہ اور اسی طرح اور۔ اس ترتیب میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے، سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا گیا ہے مثلاً ہوئے کے ردیف میں کم ہوئے، دم ہوئے کی غزل کے بعد ہی مسہل والا قطعہ ہے۔ ’’ یہ سب کئے دن ہوئے؟ ‘‘ اس کے بعد ’’چراغان کیے ہوئے‘‘ ’’مژگاں کیے ہوئے‘‘ والی غزل۔ وغیرہ۔

اس جدت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بقول مرتب صاحب: ’’ اردو کی خوش قسمتی سے کلام غالب کی قدر و منزلت دن بدن زیادہ ہوتی جاتی ہے خصوصاً اردو اشعار کو ضرب المثل یا سند کے طور پر استعمال کیے جانے کا میلان روز بروز بڑھتا جارہا ہے مگر افسوس کسی حوالہ یا سند کی تلاش میں چونکہ تمام دیوان غالب کو مکمل پڑھنا ممکن نہیں ہے اور موجوہ گڈمڈ ترتیب غزلیات سے متفرق اشعار کا بہ آسانی پتہ چلانا اس سے بھی مشکل کام ہے‘‘ اس لیے اس دقت کو اس نئی ترتیب کے ذریعے دور کردیا گیا ہے جس سے ’’ ایک بڑی حد تک یہ آسانی پیدا ہوگئی ہے کہ غزلیات وغیرہ کو صرف ردیف وار ڈھونڈنے سے ایک دو منٹ میں ہر غزل اور شعر کا پتہ

لگایا جاسکتا ہے ' گویا یہ مجموعہ غالب کے کلام کا انڈکس ہے -

اس ترتیب کے سلسلے میں ' یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ مرزا غالب کے مشہور مطلع : ' نہ تھا کچھ تو خدا تھا ' کی غزل کا نمبر خود بخود آغاز کلام میں سب سے پہلے آگیا - مرزا غالب مسلک وحدت الوجود کے قایل تھے اس لیے ان کے کلام کا ایسا حسب حال برجستہ افتتاح بجائے خود ایک دلچسپ نکتہ ہے ' کتاب کی بعض اور خوبیاں صرف دیکھنے پر معلوم ہوسکتی ہیں -

(ج - ا - ق)

اقبال اور اس کا پیغام

(از ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد ' ایم-اے ' پی-ایچ-ڈی ' بار ایٹ لا
و میاں محمد رفیق خاور ' ایم-اے ' ہاشمی بک ڈپو ' لاہور ' قیمت ۸ آنے)

' سرود رفتہ شاید واپس آئے یا نہ آئے پھر بھی ہم ان محدود ذرایع سے جو انسان کو عطا کیے گئے ہیں اس کی صدائے بازگشت پیش کرسکتے ہیں - یہ تصنیف اس صدائے بازگشت کے سوا اور کچھ نہیں '

مندرجہ بالا اقتباس جو زیر نظر تصنیف کے ' تعارف ' سے ماخوذ ہے اس کتاب کی اشاعت کے مقصد کے اظہار کا ایک اچھا پیرایہ ہے جس سے اقبال کے کلام کے ساتھ صاحب مضمون کی خوش عقیدگی بھی ظاہر ہوتی ہے - یہ مقالہ اصل میں انگریزی زبان میں تھا جسے ڈاکٹر خالد نے علامہ اقبال کی تشریف آوری کے موقع پر اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں پڑھا تھا - اب خاور صاحب نے جو ڈاکٹر موصوف کے چھوٹے بھائی ہیں اسے اردو زبان میں منتقل کیا ہے اور اس میں بعض جگہ ترمیم بھی کی ہے - نیز ذاتی آرا کے اظہار کے لیے آخری حصہ اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے - اس مقالہ میں اقبال کی شاعری پر ان شگفتہ الفاظ میں رائےزنی کی گئی ہے : ' اقبال کا

سرچشمۂ الہام مسرت ھے - یہی ان کی زندگی اور یہی ان کی روح رواں ھے - ان کی شاعری میں ھم شادمانی ھی شادمانی جلوہ‌گر پاتے ھیں - اس شادمانی کے مظاھر بےشمار ھیں؛ قدرت کی شادمانی' علم و حکمت کی شادمانی' انسانیت کی شادمانی' ذوق عمل کی شادمانی' امید اور ایقان کی شادمانی' طاقت اور توانائی کی شادمانی' حسن کی شادمانی' محبت کی شادمانی' کیف' رنگ' نور اور نکہت کی شادمانی - شروع سے لےکر آخر تک آپ کی شاعری کا آب و رنگ مسرت ھے - آپ کے تمام مزرع سخن میں مسرت ھی مسرت لہلہاتی ہوئی دکھائی دیتی ھے"

بہ‌حیثیت مجموعی اس کتاب میں علامه اقبال کی شاعری پر نه صرف والہانه انداز میں بلکه نہایت قابلیت کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ھے اور ان عناصر سے بحث کی گئی ھے جو اقبال کو عہد حاضر کا بہترین فلسفی شاعر اور اس کی شاعری کو تسخیر حیات کا ایک کامیاب آلۂ کار قرار دیتے ھیں - اس سلسلے میں اقبال کے مذھبی اور وطنی ماحول نیز ان کی ذاتی تعلیم اور عام مطالعه پر اظہار خیال کرتے ہوئے عقلی دلایل سے ثابت کیا گیا ھے که ان کا فلسفه مشرق کے فلسفۂ ویدانت اور تصوف اور مغرب کی انسانیت اور ذوق عمل سے مل کر بنا ھے - ڈاکٹر خالد کے الفاظ میں "اقبال کی ذھنیت مشرقی مذھب پرستی اور مغربی انا پرستی دونوں کا مجموعه ھے"

مولانا عبدالمجید صاحب سالک نے کتاب پر مقدمه تحریر کیا ھے جس میں ڈاکٹر خالد کے اس خیال سے اختلاف ظاھر کیا ھے - آپ کے خیال میں اقبال کی شاعری تعلیمات قرآنی کی تفسیر ھے اور اس کی پختگی اور رسائی کا راز محض اقبال کی قوت ایمان ھے - ھمارے خیال میں کسی بڑے شاعر کی تنقید کا یه طریقه صحیح نہیں کیونکه ھر بڑا شاعر ایک خاص مذھب یا قوم کا نمایندہ ھونے کے باوجود ایک عالمگیر نصب‌العین کی ترجمانی کرتا ھے اس لیے اسے صرف مذھب کی کسوٹی پر پرکھنا اس کے ساتھ ناانصافی کرنا ھے - اقبال ایسے ھی شاعروں میں سے ھے کیوں که وہ انسانیت کا ترجمان اور حیات کا مفسر ھے اور اس کی شاعری ایک بین‌الاقوامی میراث ھے - اس کی شاعری پر تنقید بین‌الاقوامی نقطۂ نظر سے ھونی چاھیے -

---

تحفۂ بسنت

(از منشی تلوک‌چند محروم ' بی‌اے؛ ڈی‌آر - سورج بلرام ساھنی -
پبلشرز ' راولپنڈی - قیمت ۲ آنے)

منشی تلوک‌چند محروم کا شمار اردو کے پرانے اور مشاق شاعروں میں ھے - اس مجموعه میں بسنت رت کے متعلق آپ کی لکھی ھوئی بارہ نظمیں شامل ھیں اور سب کی سب اچھی ھیں - ایک خاص بات یه ھے که بعض نظموں میں بسنت کے سلسلے میں قومی اور وطنی راگ چھیڑا گیا ھے اور نوجوانوں کو عمل اور حرکت کی تعلیم دی گئی ھے - بسنت ھمارے دیس کا خاص موسم اور تہوار ھے اس لیے اس موقع پر وطن کی محبت کا ترانه گانا نہایت برمحل ھے -

(ج - ا - ق)

روئداد ادارۂ معارف اسلامیه اجلاس دوم منعقدہ لاھور - اپریل سنه ۱۹۳۶ع

شایع کردۂ مجلس اداره معارف اسلامیه ' لاھور
صفحات انگریزی ۲۹۷ ' صفحات اردو ۲۱۵

علامه اقبال مرحوم نے جہاں اپنی شاعری سے ایک سوئی ھوئی قوم کو جگایا وھاں انھوں نے یه بھی محسوس کیا که اسلامی علوم کی تحقیقات کے لیے ایک اداره کا ھونا بہت ضروری ھے - چناں‌چه انھوں نے اپنے ھاتھوں سے ادارۂ معارف اسلامیه کی بنیاد ڈالی - پیش نظر دوسرے اجلاس کی روئداد ھے جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپی ھے - اس میں مسلمانوں کے ان علمی اور ادبی کارناموں کا ذکر ھے جن سے ایک دنیا نے استفادہ کیا اور جو آج پردۂ گمنامی میں پڑے ھوئے ھیں - آج یورپ میں علم کی شمع ھرگز روشن نه ھوتی اگر مسلمانوں نے علم کی خدمت کمال بےنفسی سے نه کی ھوتی - قرطبه و بغداد ' قاھرہ اور قیروان ' سسلی اور غرناطه ھی میں

اول اول موجودہ علمی ترقی کی بنیاد پڑی جس نے یورپ کے تعصب کو مٹایا اور علم سے مانوس کیا۔ لیکن آج خود ان شمع روشن کرنے والوں کی بزم بالکل سونی ہے۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے :-

وہ شمع ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں آج اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

شکر کا مقام ہے کہ اب بیداری پیدا ہو رہی ہے۔

اس مجموعے کے شروع میں علامہ یوسف علی کی ایک معرکۃالآرا تقریر اسلامی تاریخ اور اس کے فلسفہ پر ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ نے عربوں کے نظریہ اراضی پر پرمغز مقالہ لکھا ہے جس میں معاشیات سے بھی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر واحدمرزا نے ابن خلدون کے مقدمہ کو سامنے رکھ کر مراکش کی شاعری پر تنقید کی ہے۔

حصۂ اردو میں پہلا مضمون مولانا اسلم جیراجپوری کا علم تفسیر پر ہے۔ قاضی احمدمیاں اختر جوناگڑھی نے مسلمانان سلف اور ان کے شوق جمع و مطالعۂ کتب پر ایک نہایت دلچسپ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی نے شہابی کی مثنوی عروۃالوثقیٰ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ مجموعہ اسلامی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔

سیاسیات

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو

مصنفہ ڈاکٹر زین العابدین احمد۔

(صفحات ۱۱۵، قیمت آٹھ آنے، شایع کردۂ مکتبۂ جامعہ ملیہ، دہلی۔)

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیادوں کو جوں جوں گہرائی سے دیکھا جاتا ہے اتنا پتہ لگتا جاتا ہے کہ یہ بنیاد معاشی اور تجارتی مفاد پر قائم ہے۔ ہندوستان برطانیہ کے حق میں کچے مال کا ایک گودام اور مصنوعات کے لیے ایک بڑی منڈی ہے۔ شروع ہی سے برطانوی تاجروں نے ہندستان میں اپنا سرمایہ لگانا شروع کردیا

تھا اور آج یہ سرمایہ کروڑں روپے تک پہنچتا ہے۔ برطانیہ اس لیے ہندستان سے اپنا تعلق کبھی قطع نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ معاشی تعلق باقی ہے۔ ہندستان کے لوگ جوں جوں باخبر ہوتے جائیں گے اور ملک میں اپنی مصنوعات بننے لگیں گی اتنا ہی غیر ملکی مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے آزادی کی جنگ ایک طرح معاشی ہے اور اگر دیکھا جائے تو ہندستان کے بہت سے اہم مسئلے برطانیہ کے اسی معاشی اقتدار میں منہ چھپائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر زین‌العابدین احمد نے برطانوی حکومت کے بعض معاشی پہلوؤں پر خاصی روشنی ڈالی ہے اور ان مسئلوں کو سمجھایا ہے جن سے آج برطانوی سامراج قائم ہے۔

اردو کے رسالے

رہنمائے تعلیم لاہور (چندہ سالانہ پانچ روپے)

یہ رسالہ سردارصاحب ماسٹر جگت سنگھ صاحب کے زیر اہتمام ایک عرصے سے اردو کی خدمت کر رہا ہے۔ خالص تعلیمی مضامین کے علاوہ اس میں تاریخی اور تحقیقی مقالے، ادبی تنقیدیں، دلچسپ افسانے اور پرلطف نظمیں اور غزلیں وغیرہ بھی شایع ہوتی ہیں۔ غرض‌کہ مضامین کا انتخاب بڑے سلیقے سے کیا جاتا ہے تا کہ ہر مذاق کے لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ سال میں دو ایک خاص نمبر بھی نکلتے ہیں جو ملک میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔

سردارصاحب قابل مبارک‌باد ہیں کہ ان کی کوششوں سے یہ ننھا پودا آج ایک بارآور درخت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ سردارصاحب نے جس خلوص اور محنت سے اس پودے کو پروان چڑھایا ہے اس کا ذکر اس رسالے کے "سلور جوبلی نمبر" میں ملے گا۔ شائقین وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

ہماری رائے ہے کہ محکمہ جات تعلیم اور مدارس کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ عام محبان زبان و ادب پر بھی اس رسالے کی سرپرستی نہایت ضروری ہے۔

ھل (الہ آباد)

(چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے، قیمت فی پرچہ چھے آنے۔)

صوبہ متحدہ کی حکومت نے جو گانوں سدھار کا محکمہ قائم کیا ھے یہ رسالہ اسی تحریک کو بڑھانے کے لیے نکالا گیا ھے۔ اس میں تحریک امداد باھمی، کسانوں کی حالت اور گانوں کی بیماریوں وغیرہ کے متعلق مفید مضامین شایع ھوتے ھیں۔ غرض اہل دیہات کے لیے بہت اچھا رسالہ ھے۔

خاص نمبر

جوھر اقبال

صفحات ۲۲۶، قیمت ایک روپیہ، مکتبہ جامعہ ملیہ، قرول باغ، دھلی۔

جامعہ ملیہ سے طلبا کا ایک پرچہ جوھر شایع ھوتا ھے۔ علامہ اقبال کی وفات پر اس کا اقبال نمبر شایع ھوا جو جوھر اقبال کے نام موسوم ھوا۔ اس میں اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر تبصرے ھیں جو بعض مشہور انشاپردازوں کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور جامعہ کے سابق اور حال کے طلبا کے قلم سے نکلے ھیں۔ شروع میں بعض مقتدر اہل قلم و اہل فکر کے پیامات ھیں جن میں اقبال کی شاعری کو زندگی کی رھنمائی کے لیے ایک زبردست تحریک قرار دیا گیا ھے اور در اصل بات بھی یہی ھے کہ وہ زندگی کا راز جاننا چاھتے تھے اور یہ معلوم کرنا چاھتے تھے کہ زندگی جو مختلف شکلیں اپنی ارتقا کے واسطے اختیار کرتی ھے اس کی وجہ کیا ھے اور ان مختلف شکلوں میں کوئی موافقت بھی ھے؟ اقبال نے اپنی ساری زندگی کے غور و فکر کے نتیجوں کو شعر کی صورت میں ظاھر کیا ھے اور بتایا ھے کہ زندگی ایک نعمت لازوال ھے مگر اس نعمت کو ترقی دینے کے لیے محنت و جفاکشی ضروری ھے۔ انھوں نے سستی اور کاھلی کو

بہت برا کہا ہے کیوں‌کہ اس سے زندگی کا بہاؤ رک جاتا ہے ۔ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے افلاطون اور حافظ کو نشانۂ ملامت بنایا ہے کیوں‌کہ افلاطون کے نظریوں اور حافظ کے شعروں کا مطلب انسان کو جد و جہد کی زندگی سے محروم کرنا ہے ۔ حافظ کی ذات سے اقبال کو کوئی سروکار نہ تھا بلکہ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ان اشعار سے " مقصود محض ایک لٹریری اصول کی تشریح و توضیح تھا " لیکن جب اسرارخودی شایع ہوئی تو ہندستان میں لوگ حافظ کے نظریے کے خلاف کچھ سن نہیں سکتے تھے ۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے اس وقت " الناظر " میں اقبال کی موافقت میں ایک نہایت جامع تبصرہ فرمایا اور ان اشعار کو بھی نقل کیا جو اب اسرارخودی سے نکال دیے گئے ہیں ۔ یہ مضمون تمام و کمال جوہراقبال میں نقل کر دیا گیا ہے ۔

پروفیسر مجیب صاحب نے اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بہت دل‌چسپ پیرائے میں لکھا ہے اور چھوٹی اور بڑی شخصیتوں کا مقابلہ کیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ " چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو ، ہردلعزیزی کا بادبان ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے ' سستانے اور پناہ لینے کے لیے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل رہے تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں ۔ وہ موج تو چیز ہی اور ہوتی ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں ' ہوا کو للکارتی ہے کہ دم ہو تو ذرا زور دکھا ۔ آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اور اونچا ہو سکتا ہو تو ہوجا ۔ اسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے ' وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے ۔ اسے کہیں جانا نہیں ہوتا اس کے لیے اٹھنا اور تڑپنا بس ہے ۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اس کا سمندر عالم اسلام تھا " مگر عالم اسلام سے مراد ملا کا تنگ نظر مذہب نہ سمجھنا چاہیے بلکہ ان اصولوں کو جاننا چاہیے جن پر زندگی کی بنیاد قائم ہے ۔

(ر ۔ ح)

مقدمۂ

بنیادی ہندستانی

از

(پروفیسر محمد اجمل خاں۔ ایم۔اے)

کچھ دنوں سے انگلستان میں یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ انگریزی زبان کو انٹرنیشنل (بین‌المللی) زبان بنا دیا جائے۔ انگریزی کے حامیوں کا یہ قول ہے کہ یہ زبان پچاس کرور انسانوں کے ملکوں کی حکومت کی زبان ہے اس لیے اس زبان کا عالمگیر ہونا بہت آسان ہے۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر انھوں نے اپنی گرامر کے قواعد کو صرف پانچ قاعدوں میں جکڑ دیا ہے اور بنیادی (Basic) الفاظ کی تعداد ساڑھے آٹھ سو مقرر کردی ہے۔ بہت سی کتابیں اس زبان میں ترجمہ اور تالیف ہو رہی ہیں لیکن ان کی یہ کوشش سرسبز ہوتی نظر نہیں آتی اس لیے کہ الفاظ کی مقررہ تعداد سے روزمرہ کا کام تو چل جاتا ہے لیکن ادبی اور علمی (Literary and Scientific) مضامین کے لیے نارمل (Normal) انگریزی کے بغیر چارہ نہیں اور وہ مجبور ہیں کہ زیادہ الفاظ استعمال کریں۔

اس چیز کو دیکھ کر ہندستان کے بعض حضرات کو یہ خیال ہوا کہ ہم کو ایک نیشن (ملّت) بننے کے لیے ایک زبان کی ضرورت ہے اور چونکہ سب کو ملانے والی زبان ہندستانی ہی ہوسکتی ہے لہذا کوئی خدا کا بندہ انگریزی کی طرح بنیادی ہندستانی پر کتابیں لکھ دیتا تو ہماری زبان تو ایک ہوسکتی۔ اس قسم کا خیال دو سال ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے مجھ سے بھی ظاہر فرمایا۔ میں نے آل انڈیا کانگرس

کمیٹی کے کتب خانہ میں بیسک انگلش (Basic English) کی کتابوں کو دیکھا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کچھ مواد بھی جمع کرلیا لیکن جب میں نے اپنی کوششوں پر نظر ثانی کی تو معلوم ہوا کہ بنیادی ہندستانی کا کام مجھ سے بہت پہلے ہوچکا ہے اور یہ اس وقت ہوا ہے جب کہ انگریزوں نے مدنیت کے ابتدائی زینہ پر قدم رکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان ایک براعظم ہے۔ آریوں کے ہندستان میں آنے سے پہلے یہاں ایک عظیم‌الشان تمدن تھا۔ شمالی ہند میں جو نئے آثار برآمد ہوئے ہیں خصوصاً سندھ میں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں کا تمدن مصر و بابل و خالدیہ کے تمدن سے گہرا تعلق رکھا تھا۔ جنوبی ہند کا ایک طرف عرب کے مذہب و تمدن سے بنیادی طور پر اتحاد تھا۔ دوسری طرف ان کی نسلی کیفیتیں سماٹرا، جاوا اور آسٹریلیا تک ایک قسم کی یکسانیت ظاہر کرتی ہیں۔

آریہ آئے اور اپنے نئے جوش و خروش کے ساتھ سنٹرل ایشیا اور ایران کا مذہب، زبان اور تمدن بھی لائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریوں میں آپس میں مذہب کے نام پر اتنی خانہ جنگی ہوئی تھی کہ ایک ہی مذہب کو دو گروہوں نے مختلف طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی حتی کہ (شاید ایک دوسرے کی ضد میں) ایک جماعت کے مقبول دیوتا دوسری جماعت کے مردود شیطان قرار پاگئے۔ لڑائی اس حد تک بڑھی کہ آریوں کی ایک جماعت «دیو» کے معنی «قابل احترام و پرستش ہستی» ماننے لگی اور ان کے خلاف ایرانی «دیو» کو «اہرمن یا شیطان» قرار دینے لگے۔ اصلی مذہب کیا تھا اور کس جماعت نے یہ انقلاب بپا کیا؟ اس سوال کا جواب صرف اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ «دیو» اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ قدیم لاطینی و یونانی زبانوں میں بھی ذی‌اس (Zeus) دئی (Dei) یا ڈیٹی (Deity) کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو بس اتنا ظاہر کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ جو آریہ اپنے وطن سے نکالے گئے وہ «دیو» ہی کے لفظ کو کسی «اچھی ہستی» کے لیے استعمال کرتے تھے اور مقامی طور پر جو انقلاب ہوا اس نے قدیم مذہب کو پاش پاش کردیا۔

بہر حال ہندستان میں آریہ آئے اور یہاں کے سیاہ فام باشندوں کو چنڈال اور دشمن قرار دینے پر مجبور ہوئے ۔ اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اقوام کو جملہ مدنی حقوق اور سوشل تعلقات سے دور کردیا گیا ۔ لیکن جب انھیں خادموں کے درجہ پر رکھا تو مجبوراً آریہ بھی ان ھی کی زبانوں میں بات چیت کرنے لگے اور اس طرح نہ صرف وہ خود اپنے مذہب اور فلسفہ سے محروم ہوگئے بلکہ سنسکرت زبان بھی عام زبان نہ بن سکی ، صرف آریوں کی آپس کی بول چال اور دربار تک محدود رہی ۔ سنسکرت لٹریچر میں جو کچھ بھی سرمایہ تھا وہ جمود کی حالت میں برہمنوں تک محدود رہا اور رفتہ رفتہ ملکی بولیوں نے راج دربار پر بھی قبضہ کرلیا حتّٰی کہ گوتم بدھ کی انقلابی تحریک نے یونیورسٹیوں تک سے سنسکرت کو نکال دیا اور لطف یہ ھے کہ برھمنوں کی مقدس مگر قدامت پسند اور غیر متحرک جماعت سنسکرت زبان کی واحد ٹھیکہ‌دار ہونے پر خوش تھی اس لیے کہ صرف اسی طریقہ سے وہ راجا سے پرجا تک اپنا راج قایم رکھ سکتی تھی ۔

آریوں کے بعد سکندر کے حملہ سے پہلے عرب و مصر سے ہندستانیوں کے اچھے خاصے تعلقات تھے اور سمندر کے کنارے والوں کی زبان اور تمدن پر آپس کے میل جول سے خاصا اثر پڑچکا تھا ۔ سکندر آیا تو نئے قسم کی طرز جنگ اور فلسفیانہ اور معاشری خیالات کا تبادلہ ہوا تجارت کی نئی نئی راہیں کھلیں اور جو یونانی ہندستان میں آباد ہوئے وہ برہمن قرار پائے اور یہیں کے ہورہے ۔

اگرچہ اسلام سے پہلے ہندستان کے مغربی ساحل پر عربوں کی اور عرب میں ہندوؤں کی جماعتیں آنے جانے رہنے سہنے لگی تھیں لیکن اس آمدورفت کا اثر مذھب پر بہت کم پڑا تھا ۔ جنوبی ہندستان والے شیو کی پوجا کرتے تھے اور عرب کے بعض مشہور بت‌خانوں میں شیو کے قسم کے بتوں کی پوجا کرنے جایا کرتے تھے ۔ پوجا کے بعد جانوروں کو بھینٹ چڑھانا ، سر منڈانا اور نہانا جس طرح ہندستان میں رائج تھا اسی طرح عرب میں بھی تھا ۔ لہذا مذہب کے نام پر ان تجارتی اقوام میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی ۔ اصل تو یہ ھے کہ اس زمانے کے تاجر جاتری ،

زائر اور سیاح جیسا دیس ہوتا تھا ویسا ہی بھیس بنا لیتے تھے، جہاں جاتے تھے وہاں کے دیوتاؤں اور خداؤں کی پوجا کرلیتے تھے اور ہندستان والے تو اس قدر سادہ مزاج اور فطرت‌پرست واقع ہوئے تھے کہ قدرت کی ہر ایک صنعت ان کے دلوں میں خوف و احترام کے جذبات کے ذریعہ سے سر تسلیم خم کرا دیتی تھی۔

ہندستان میں مسلمان آئے تو یہیں کے ہو رہے اور ہندستان والوں نے بھی نہایت فراخدلی سے مسلمانوں کے مذہب اور تمدن سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ صوبہ سرحد، کشمیر، پنجاب، ملتان اور سندھ میں اسلامی تمدن و مذہب رائج ہوگیا۔ مسلمانوں نے بھی ہندستان کی مقامی بولیوں کو فروغ دینا شروع کیا اور پشتو، سندھی، پنجابی، اودھی، گجراتی، برج بھاکھا اور بنگالی میں جو لٹریچر تیار کیا وہ اب تک ان زبانوں کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے لیکن مسلمان سنسکرت کو دوبارہ زندہ نہ کرسکے۔ جن لوگوں نے اسے سیکھنا بھی چاہا انھیں ہندو بن کر کاشی کے پنڈتوں کی خدمت کرنی پڑی اور بڑی بڑی مشکلوں سے ویدوں اپنشدوں اور شاستروں کے رازوں پر آگہی حاصل ہوسکی۔ اپنشد، رامائن، مہابھارت، گیتا، نجوم کی بعض کتابیں اور ایوروید کے کچھ اصول فارسی اور مقامی بولیوں میں مسلمانوں نے ہی ترجمہ کیے اور اکثر و بیشتر ترجمہ کے وہی اصول قائم رکھے جو بنوعباس کے زمانے میں منضبط ہوچکے تھے یعنی بجائے ترجمہ کے اصل الفاظ کو معرب کرلیا جاتا تھا۔ مثلاً (Canon) کو قانون، (Clime) کو اقلیم (Geography) کو جغرافیہ (یا علم‌المسالک و الممالک)، (Organon) کو ارغنون بنا لیتے تھے اور کہیں کہیں لفظی ترجمہ بھی کردیتے تھے۔

غرض کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ہندستان کی بہت سی ملکی بولیاں ترقی کرکے زبانوں کے درجہ تک پہنچ گئیں اور مختلف صوبوں کی دفتری زبان فارسی قرار پائی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک کے عام باشندوں میں وہ اصطلاحیں رائج ہوگئیں جو ایران اور آریہ قوم سے زیادہ تعلق رکھتی تھیں اور جن کے لیے مقامی بولیوں میں لفظ موجود نہ تھے۔ ایسے الفاظ کا تعلق زیادہ‌تر ان تمدنی اور

معاشری ضروریات سے تھا جن کا وجود یا تو ہندستان میں تھا ہی نہیں یا تھا بھی تو ان کا معیار بہت پست تھا اور نئی ضروریات اور خیالات کے اظہار کے لیے ناکافی تھا۔

مثال کے طور پر ہم ان چیزوں کو جانچیں جو ہندستان میں پست حالت میں تھیں تو بہت سے غیر ملکی الفاظ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ انسان کے لیے ضروریات زندگی میں سے تین چیزیں سب سے پیش پیش ہیں ۔ لباس' خوراک اور مکان ۔ لباس کے لیے سنسکرت میں سوائے کپڑے کے اور کوئی لفظ نہیں ملتا اور ہو بھی کیوں؟ ہندستان کی آب و ہوا میں زیادہ‌تر ایسا موسم رہتا ہے کہ جبہ و دستار کی ضرورت ہوتی ہی نہیں ' ایک دھوتی بھی اکثر بار ہوتی ہے بلکہ لنگوٹی ہی کافی ہوتی ہے۔ اسی لیے قدیم ہندستانی تمدن کی یادگار اب تک اوڑیسہ' آسام' وسط و جنوبی ہند میں باقی ہے اور مردوزن بعض اوقات گھاس' پتوں اور کھال سے سترپوشی کرلیتے ہیں اور اکثر بالکل نیچرل حالت میں نظر آتے ہیں ۔ اسی کو ایک شاعر نے اس پیرایہ میں ادا کیا ہے :—

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

اگلے وقتوں کا متمدن لباس ایک یا دو چادریں ہوتی تھیں۔ روما میں اسے ٹوگا' ایران میں جامہ' عرب میں مِئزر' بُرد' ثوب وغیرہ اور ہندستان میں دھوتی کہتے تھے۔ اُمرا لمبی لمبی چادریں اوڑھنا دولت‌مندی کی علامت سمجھتے تھے اور عرب میں تو یہ بات باعث افتخار سمجھی جاتی تھی کہ چادر اتنی لمبی ہے کہ وہ زمین پر خط بناتی چلتی ہے۔ اسی طرز عمل سے نفرت کے اظہار کے طور پر ایک شاعر کہتا ہے :—

لَیْسَ الجمالُ بمِئْزرٍ و اِنْ رُدِّیتُ بردا
اِنَّ الجَمال محاسن و معادنٌ اورثن مجدا

(یعنی مئزر پر ایک اور ردا اوڑھ لینا حسن کو نہیں بڑھاتا' حقیقی حسن تو محاسن اخلاق کو کہتے ہیں) اسی طرح ہندستان و ایران اور مصر و روما کے جتنے پرانے مجسّمے نظر آتے ہیں سب میں بغیر سلے ہوئے کپڑوں کا استعمال ہے اور ہندستان میں یہ چیز

مردوں کے لیے، خصوصاً راجاؤں اور امرا کے لیے باعث افتخار سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جہاں کہیں عورتوں کے مجسمے یا تصویریں ہیں مثلاً بودھ گیا یا اجنتا و ایلورا وغیرہ میں، وہاں یہ چیز نمایاں ہے کہ ستر پوشی سے بعض اعضا مستثنے ہیں۔

کپڑوں کی تراش خراش مسلمانوں کے عہد میں شروع ہوئی۔ جہاں جہاں اسلام گیا، حتٰی کہ افریقہ کے وحشیوں تک کو اس نے ستر پوشی کا ایک نیا نظریہ بتایا۔ جاوا اور سماٹرا میں ننگی قومیں اب تک ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ دربار سے زیادہ قریب ہوئے وہ کپڑوں کو کاٹ چھانٹ کر نئی نئی ترکیبوں سے استعمال کرنا سیکھ گئے۔ خطاب کے ساتھ ہفت پارچہ خلعت کے دستور نے کپڑوں کی اہمیت کو اور بڑھا دیا اور راجا کی دیکھا دیکھی پرجا نے بھی کپڑوں کی صنعت کی ہمت افزائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک ہندستان کے کسی خطے میں جائیے جو الفاظ کپڑوں کے لیے ہیں وہ سب ایران و توران کے ہیں حتٰی کہ یورپ سے جو نئے قسم کے لباس یہاں آئے ان میں بھی اکثر مشرقی الاصل ہیں مثلاً پاجامہ (Pyjamas)، قمیص (Chemise)، فرغل (Frock)، سربند (Turban) وغیرہ۔

خوراک اور غذا کے سلسلہ میں سنسکرت میں روٹی تک کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے، اسے گیہوں سے بنی ہوئی غذا کہتے تھے۔ مختلف صوبوں میں اس کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ اب تک ہندستان کے دیہاتوں میں کھانے کی عام استعمال کی چیز بھنا ہوا غلہ ہے۔ چونکہ کچی اور پکی غذا کا تعلق ہندو دھرم سے ہے اس لیے کسی ایسی غذا کا نام پرانی زبانوں میں نہیں پایا جاتا جو چھوت چھات کے اثرات سے خالی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی صنعت کا بھی اس میں دخل ہو۔ ہندستان کے علاوہ روٹی ہر جگہ تنور میں پکتی ہے اور نانبائی، حلوائی، کبابچی، قہوہ فروش وغیرہ کا تخیل ہی ایسی اقوام سے وابستہ ہے جن میں چھوت چھات نہ ہو۔ ہندو سوسائٹی نے انفرادیت کو اپنے کلچر کا تمغۂ افتخار سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوبیاں جو جماعتی زندگی کا جزو لاینفک ہیں ان کی جماعت میں نہ داخل ہو سکیں اور اب بھی کلکتہ، بمبئی یا بعض دوسرے شہروں میں شدھ بھوجن کی دکانیں نظر

آتی ہیں وہاں ” اونچی “ ذات والے ہندو نظر نہیں آتے۔ جب اس بیسویں صدی میں ہندستانی اقوام کے تمدن کا افراد پر اتنا گہرا اثر ہے تو کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی تحریک جو مشترک تمدن یا اجتماعی ترقی کی بنیادوں پر قایم کی جائے اس کی مخالفت نہ ہوگی۔ اگر علانیہ نہیں، قولاً نہیں تو خفیہ اور فعلاً ایسی چیزیں ہمیشہ ہمارے سامنے آتی رہیں گی جو ” برہمن ذاتی “ نے اپنے مفاد کے لیے ہزاروں سال پہلے بنائی تھیں اور مذہب کے نام پر، لیکن حقیقت میں ایک چھوٹی سی مذہبی جماعت کے مفاد کے لیے ابد تک قائم رکھنے کی کوشش جاری رہے گی۔

بہر حال تیسری بنیادی چیز جس کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے وہ مکان ہے۔ ہندستان میں جن تعمیروں پر سب سے زیادہ روپیہ خرچ ہوا وہ ہندوؤں اور بودھوں کے ” مندر “ اور ” وہار “ (بہار) ہیں۔ جنوبی ہند میں جو عمارتیں غاروں اور پہاڑوں کو کھود کر بنائی گئیں ان کا مذہب ہی سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ان سب میں جہاں جہاں برہمنزم کا اثر ہے وہاں ہر جگہ انفرادی عبادت ہے اور متشائم فلسفہ کی بنا پر دنیا اور دنیا کی چیزوں کو مایا اور ہیچ سمجھ کر ان سے نفرت ہی کا اظہار حاصل عبادت ہے ۔ گوتم بدھ نے بھی اسی جنجال سے نکلنے کی کوشش میں ایک بلند پایہ فلسفہ کی بنیاد رکھ دی ۔ اس کے بعد سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ ہندستان کے مہربان اور فرحت بخش موسم سے پورا فایدہ نہ اٹھایا جائے ۔ راجا نے قلعے بنائے لیکن اس کا مقصد بھی چوتھے آشرم یعنی بڑھاپے میں سنیاس لینا تھا۔ پرجا نے مندر کھڑے کیے لیکن وہ بھی دنیا کو چھوڑنے پر تیار۔ بس اس زندگی کو قیدخانہ سمجھ کر صرف اتنی کوشش پر قناعت کی گئی کہ بارش سے ایک چھپر بچالے اور دھوپ سے آم یا املی کا درخت۔ فن تعمیر کو بحیثیت فن کے جب ہی ترقی ممکن تھی کہ یہاں کے باشندوں کا نظریہ حیات ہی ایسا ہوتا جو جماعتی زندگی، جماعتی نشوونما، جماعتی بقا و دوام کے تخیل کو سامنے رکھتا اور افراد کی زندگی کے مختلف حصے مقرر نہ ہوتے، بلکہ عملی دنیا کے اٹل قوانین کے مطابق ہر شخص جماعت کے فائدے کے لیے چاہتا تو برہمچاری رہتا، گرہست ہوجاتا یا تمام عمر سنیاسی ہی بنارہتا۔

مسلمانوں کی آمد نے اس نظریہ کو بھی بدلا اور جماعت کو سامنے رکھ کر فن‌تعمیر نے ہندستان کے آرکی‌ٹکچر (Architecture) میں ایک انقلاب بپا کردیا۔ محل‌سرا اور دیوان‌خانہ عام ضروریات زندگی میں داخل ہوگیا، مسجدوں نے عبادت کا جماعتی خیال پیش کیا۔ ہندوؤں کی ایک جماعت کبیرپنتھی اور سکھ کے نام اختیار کرکے اسلام سے قریب آگئی۔ ان کے گرودواروں میں جماعتی عبادت ہونے لگی اور خانقاہوں اور مدرسوں کے لنگر نے اس نئی جماعت کو مشترک طور پر کھانا پکانا اور لنگر جاری کرنا سکھایا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مغل فن‌تعمیر ہندستان کے طول عرض میں پھیل گیا اور کوئی گاؤں بھی اس سے محروم نہ رہا۔ مسجد ہو یا مندر، پل ہو یا سرائے ہرجگہ مغل محراب اور مغل گنبد نظر آنے لگے۔ عام زندگی میں حمام و باغ و چمن جزو عمارت بن گئے۔ نہریں اور فوارے مسجدوں اور مدرسوں کی شان بڑھانے لگے اور تعمیرات میں حسن و جمال کو شوکت و شکوہ کے ساتھ اس طرح ملایا گیا کہ اس کی افادیت میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور افراد کی بجائے جماعت کو اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

یہاں لباس، خوراک اور مکانوں کی قسمیں لکھنے کی گنجایش نہیں لیکن ان میں سے جتنی قسمیں ہیں وہ سب اور اگر سب نہیں تو ۹۹ فی‌صدی غیر ہندستانی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایرانی، تاتاری اور ترکی تمدن کی یاد دلاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی آمد کا ذریعہ مسلمان ہوئے لیکن اس تمدن کو ہندستان کے باشندوں نے ہندستان ہی کے روپیہ سے ہندستان ہی کے صنّاعوں اور مزدوروں کی محنت سے ترقی دی۔ مسلمانوں کا اگر یہ خیال ہو کہ اسلامی تمدن کسی خاص طرز لباس و خوراک و مکان سے وابستہ ہے تو قطعی غلط ہے۔ ان چیزوں کا تعلق زیادہ‌تر مقامی آب و ہوا اور جغرافیائی حالات سے نشوونما پاتا ہے۔ جو لوازم تمدن ہندستان میں ہیں وہ اسلام کے منبع یعنی عرب میں موجود نہیں۔ نہ وہاں شیروانی ہے نہ پگڑی، نہ چوڑیدار پاجامہ نہ دوپلّی ٹوپی۔ آج کل تو عربی ممالک میں لمبی قمیص پر چھوٹا کوٹ اور سرپر رومال رایج ہے اور حضرت ابراہیم کے زمانے کی تمدن کی یادگار ہر سال حاجیوں

کے احرام کی چادروں کی صورت میں منائی جاتی ہے لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ جو جماعتی نظریہ اسلام نے پیش کیا اور جو اصول مساوات بنی نوع انسانی قایم کیے اس کی جھلک ہر اسلامی ملک میں مسلمانوں میں پوری طرح نظر آتی ہے۔

اردو زبان کی پیدائش

اسی وحدت انسانی، اسی اخوت و مساوات کے جذبہ نے ہندستان میں ایک ایسی زبان پیدا کردی جس کے کئی ناموں میں سے ایک نام اردو بھی ہے۔ زمانۂ قدیم میں جو کام سنسکرت کر سکتی تھی لیکن مذہبی فرقہ کی تنگ نظری کی وجہ سے نہ کرسکی، وہ کام فارسی کو کرنا پڑا یعنی دارالسلطنت کے قریب کی بولی کو عام طور پر ہندستان کی مشترک زبان بنا دیا اور جو لوگ فارسی سے نا آشنا تھے انھوں نے بھی ہندستان کے دور دراز گوشوں میں رہنے کے باوجود اردو زبان کے ذریعہ سے فارسی لٹریچر اور ہندستان کے مشترک تمدن سے فائدہ اٹھایا اور عام لوگوں کی بولی یعنی برج بھاشا نے فارسی طرز انشا، فارسی بحروں اور فارسی اصطلاحات کو اتنا جذب کیا کہ وہ ہندستانی ہوگئیں۔

ہندستان کی بولیوں کی جتنی قسمیں ہیں ان میں سے کسی میں وہ بحریں نہیں ہیں جو فارسی شعرا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ سنسکرت کی تقلید میں وہ اصول عروض کی پابند نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دوہے یا چوپائی میں چند قوافی جمع کردیے گئے ہیں اور بس۔ ہر حرف کے ساتھ ایک ہلکی سی زبر کی آواز لگی ہوئی ہے جو بسا اوقات ایک مصرعے کو دوسرے سے بہت زیادہ لمبا کر دیتی ہے۔ پھر اس میں ترنم پیدا کرنے کے لیے اتنی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے کہ الفاظ کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی شاعری میں ایک بات ضرور ہے جو ہمیں یوروپین شاعری میں بھی نظر آتی ہے، یعنی بلینک ورس (Blank Verse) کی طرح قافیہ دار شعر (Rhymed Couplets) بھی ہوجاتے ہیں اور شاعر کے دل اور زبان میں زیادہ تفاوت نہیں پیدا ہوتا۔ جو دل میں

آیا، بغیر کسی تصنع کے کہہ دیا۔ آمد ہی آمد ہوتی ہے اور آورد کی گنجائش ہی نہیں لیکن اردو شعرا کا یہ خیال ہے کہ یہ شاعری نہیں تک‌بندی ہے جس میں نہ موسیقی کی شیرینی ہے، نہ زبان کا چٹخارا۔ یہ چیز گو نیچرل ہے لیکن ہر چیز جو نیچرل ہو آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے جنگل ہے چمن نہیں ہے۔ فارسی نے جو کام کیا وہ یہی تھا۔ اس نے فطری پیداوار کو اپنے عروض کی قینچی سے تراش کر ایک چمن بنا دیا۔

یہ فارسی زبان کی فتح تھی فارسی تمدن کی فتح تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و تمدن کی رفعت و شوکت کا بھی ثبوت تھی۔ اسے عرب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسے عربی زبان کے قواعد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ایران کے ان باشندوں کی زبان تھی جو اسلام کی جمہوریت و مساوات کے سیلاب میں بہ تو گئے تھے لیکن باوجود اس کے ان کا تمدن اتنی ٹھوس بنیادوں پر قائم تھا کہ آخرکار خود عربوں کو ایرانی رنگ ڈھنگ اختیار کرنے پڑے اور رفتہ رفتہ عربی سادگی اور حمایت و مروت پر ایرانی تکلفات نے غازہ مل کر کیا سے کیا بنادیا۔ بہت سی عربی بحریں متروک ہوگئیں۔ معانی کو چھوڑ کر بیان پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ حریری اور بدیعی نے نثر میں اور متنبّی وغیرہ نے نظم میں فارسی رنگ عربی پر چڑھانا شروع کیا اور اگر تھوڑا بہت کلام جاہلیہ اور قرآن‌کریم موجود نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ آج ہمیں حقیقی اور فصیح عربی سے اتنا ہی بُعد ہوتا جتنا برج بھاکھا کو سنسکرت سے یا موجودہ یورپین زبانوں کو لاطینی و یونانی سے۔

لیکن فارسی کی یہ فتح حقیقت بیں نگاہوں کے لیے کسی اور قدیم‌تر زبان و تمدن کی فتح ہے۔ وہ زبان و تمدن کون سا تھا؟ اس کا جواب تاریخ ادبیات سنسکرت سے مل سکتا ہے۔ سنسکرت زبان کے محققین معترف ہیں کہ جس منبع سے فارسی، پہلوی اور ژند نکلی ہیں وہی سنسکرت کا بھی سرچشمہ ہے۔ حقیقت سے بُعد ہونے کی وجہ سے ہم تنگ‌نظر بن جائیں تو یہ دوسری بات ہے ورنہ یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سنسکرت کی بہترین اور ترقی‌یافتہ صورت فارسی ہے اس لیے کہ جتنے ماہرین لسانیات ہیں

سب قائل ہیں کہ زندہ زبانیں ہمیشہ ترقی کرتی رہتی ہیں اور ترقی کے سفر کے دوران میں اپنے تیز اور بھدے کناروں کو گھس گھسا کر اتنا درست کرلیتی ہیں کہ وہ انسان کی فطری لطافت گفتگو کا نمونہ بن جاتے ہیں۔

ہندی اردو کا اختلاف

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہندستان میں سیاسی، مذہبی اور سماجی اختلافات پر کچھ عرصے سے ایک نیا اضافہ ہورہا ہے۔ یہ ادبی اور لسانی اختلاف ہے۔ ہمیں صاف صاف اس حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ جانا چاہیے، انہیں منظر عام پر لانا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو ان کا مداوا کرنا چاہیے۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں جتنی بولیاں بولی جاتی ہیں وہ ہندستانی ہیں اور چونکہ یہیں کی پیداوار ہیں لہذا بقول کاکا کلیلکر صاحب کے «ہندی ہندستانی» ہیں، گجراتی، بنگالی، پشتو، اڑیہ، تلنگی، بھوجپوری حتّٰی کہ اردو بھی «ہندی» ہے۔ لیکن کسی «ہندی» کے متعلق اب تک یہ دعوے نہیں کیا گیا کہ وہ ہندستان کی عام زبان یا کم از کم بین صوبجاتی زبان ہوسکتی ہے۔ صرف اس ہندستانی زبان کا یہ دعویٰ ہے جو لاہور، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو بندرگاہوں اور فوج کے مختلف اللسان اور مختلف النسل لوگوں کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے یعنی یہ شمالی ہندستان کے «شہروں» کی زبان ہے جو اگرچہ قصبات میں بھی رائج ہے لیکن قریات اور دیہات میں لوگوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ دیہاتی بولیاں سو سو میل پر بدل جاتی ہیں۔ لاہور سے انبالہ اور سہارنپور کے قریب تک پنجابی ہندی کہی جاسکتی ہے۔ دہلی سے لکھنؤ تک ترقی‌یافتہ برج بولی ہے۔ لکھنؤ سے الہ‌آباد تک اودھی اور الہ‌آباد سے پٹنہ تک پوربی کہی جاسکتی ہے۔ پٹنہ سے سنتھال پرگنوں حتّٰی کہ بردوان تک بہاری پوربی ہے۔ ان سب غیر تربیت‌یافتہ ہندیوں کو اب تک زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ جو کوئی بھی کسی متمدن زبان میں بولنا چاہتا ہے وہ آسانی سے فارسی اصطلاحات اور اردو طرز بیان کو لے کر انک

شہری زبان بنا لیتا ہے۔ یہ وہی زبان بن جاتی ہے جو شمالی ہندستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جسے کانگرس نے ہندستانی زبان مانا ہے اور اسے یہ حق دیا ہے کہ بین صوبجاتی زبان تسلیم کی جائے۔ اس زبان نے فطری طریقے پر عرصۂ دراز سے یہ حق خودبخود حاصل کرلیا ہے اور ہر صوبہ میں رائج ہے۔

لیکن پھر یہ اختلاف کیا ہے اور کیوں ہے؟ بقول غالب :

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ ہنگامہ کی بنیاد ہمیشہ جہل پر ہوتی ہے، اور موجودہ ہندی اردو جھگڑا تو سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ دو گروہ ہیں جو صاف صاف اپنا مافی الضمیر کہتے ہیں اور اس کہنے میں انہیں کوئی جھجک بھی نہیں ہے۔ ایک کہتا ہے کہ ہندی ہندستان کی زبان ہے، یہ چالیس کرور باشندگان ہند کی زبان ہے اور دوسری بولیاں نہ اتنی بلند ہیں نہ اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اسے انگریزی کو ہٹاکر عام ملکی زبان اور تعلیمی زبان ہوجانا چاہیے۔ (دیکھیے اڈریس ہندی سبھا سنہ ۱۹۳۷ع شانتی نکیتن، بنگال۔ بزبان پنڈت بنارسی داس چترویدی، اڈیٹر وشال بھارت، کلکتہ)۔ سی۔ ایف۔ انڈریوز صاحب نے اس کا یہ جواب دیا کہ «ہندی میں جب تک کافی تعداد فارسی الفاظ کی نہ ہو وہ ہندستانی زبان نہیں ہوسکتی اور نہ ایسی زبان رائج کرنا مفید ہے»۔ اس کے بعد ہی انہوں نے مسئلہ زبان پر ایک رسالہ لکھا جو مختلف اخبارات میں گزشتہ سال شائع ہوچکا ہے۔

دوسرا گروہ اردو کا حامی ہے اور صاف صاف اردو لٹریچر کی خوبیاں اور اس کا ہندستان پر عالم‌گیر اثر و نفوذ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بھی چترویدی جی کی طرح «اردو» کو ہندستان کی عام زبان قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ زبان عرصہ دراز سے اپنا حق قایم کرچکی ہے اور جو لوگ ہندی کے حامی ہیں وہ ایک ایسی زبان رائج کرنا چاہتے ہیں جو کہیں بولی نہیں جاتی۔ صرف چند اخبارات و رسایل کی مصنوعی سنسکرت‌آمیز زبان تک محدود ہے۔

دونوں گروہ جہالت کی وجہ سے برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ ایک جا و بےجا سنسکرت

کے نامانوس الفاظ سے ایک ایسی زبان اور گرامر رائج کرنا چاہتا ہے جو صرف تحریری بولی تک محدود ہے، کسی حصۂ ملک کی عام بات چیت کی بولی نہیں ہے حتّٰی کہ بنارس میں بھی یہ بولی کوئی نہیں بولتا۔ دوسرا گروہ عربی کے بوجھل الفاظ کے ساتھ اس زبان کی گرامر کی خصوصیتوں کو بھی ہندستانی بنانا چاہتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سوائے چند کے عام لوگوں تک یہ زبان نہیں پہنچ سکتی حتّٰی کہ ان ادھورے پنڈتوں اور نیم ملاؤں کی زبان خود ان کے بچے تک نہیں سمجھ سکتے۔

ہندی کے ہمدردوں کا فرض ہے کہ اگر واقعی وہ کسی زبان کو جسے وہ خالص ہندی کہتے ہیں ملک کے طول و عرض میں رائج کرنا چاہتے ہیں تو وہ ایسی بولی منتخب کریں جو کسی خطۂ ملک میں بولی جاتی ہو خواہ وہ آگرے کے قرب و جوار کی برج بولی ہو، لکھنؤ، فیض‌آباد کی اودھی ہو یا الہ‌آباد و بنارس کی پوربی۔ یہ بولیاں ایک حد تک ایک ہی قسم کی گرامر رکھتی ہیں۔ عام ضروریات زندگی کے لیے جو الفاظ ہیں وہ بھی ملتے جلتے ہیں اور افعال و حرف میں بھی کسی حد تک یکسانیت ہے۔ سب سے بڑی خوبی ان بولیوں میں یہ ہے کہ عوام میں رائج ہیں اور بےتکلف ہر ایک دیہاتی اپنی بولی میں اپنے جذبات کا اظہار کرسکتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ مصنوعی ہندی نہ صرف ان بیچاروں کے لیے ایک نئی زبان ہوتی ہے بلکہ ایک ایسا بار ہوتی ہے جو بالکل نئی زبان سیکھنے کے مقابلہ میں زیادہ بوجھل ہوتا ہے۔ مصنوعی ہندی میں جو نئے نئے لفظ اور محاورے ٹھونسے جاتے ہیں وہ ایک بنی بنائی زبان کی لطافت کو کھودیتے ہیں اور چند دوست‌نما دشمنوں کو موقع ملتا ہے کہ قدامت پرستی اور مذہب کی آڑ میں ہماری سیدھی سادی زبان کا گلا گھونٹیں اور نوے فی‌صدی آبادی کی روزمرہ کی زبان پر ایک ایسا پلاسٹر لگائیں جو نہ صرف اس کے اصلی خط و خال کو چھپادے بلکہ ہندی کے اصلی رنگ روپ کو مٹاکر تمسخر انگیز الفاظ پیش کرے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ "جی ہاں" سنسکرت سے دور ہوگیا ہے اس لیے اسے قریب لانا ہے۔ قریب لانے سے یہ فائدہ (؟) ہے کہ چونکہ ہندستان کی دوسری بولیاں بھی سنسکرت سے نکلی ہیں اور ہر ایک بولی بنیادی طور پر اسی طرح ایک ہوسکتی ہے

کہ الفاظ اپنے اصل کی طرف رجوع کریں لہذا تلاش شروع ہوئی ۔ معلوم ہوا کہ «جی» کا ماخذ «آگیا» ہے ۔ «آگیا» کا کاف ہزاروں سال کی تگ و دو کے بعد جیم ہوگیا تھا ۔ اس لیے اب ماہرین ادبیات ہند کا حکم ہے کہ «جی» کی جگہ «آگیا» اور «جی ہاں» کی بجائے «آگیا ہاں» بولا جائے ۔ اسی طرح «آپ» کی جگہ «آلپ» ہندستان کو بھارت ورش۔ برس (سال) کو ورش کہیے ۔ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ ایک ایسی زبان ایجاد کیجیے جو نہ آپ سمجھیں نہ کوئی دوسرا سمجھے، جو نہ آپ کے گھر میں بولی جاتی ہو نہ کسی حصۂ ملک کے آدمیوں کی مادری زبان ہو ۔ لیکن ہو سنسکرت سے قریب۔

ہندی کے حامیوں میں یہ غلط طریقہ کیسے پیدا ہوا اور انھیں اردو سے کیوں نفرت شروع ہوئی، اس کی ایک وجہ تو پہلے عرض کردی گئی ہے یعنی مذہبی تنگ نظری اور قدامت پرستی۔ اس سنسکرت کی محبت نے ملکی بولیوں کو بھی پنپنے کا موقع نہیں دیا اور برج، اودھی اور پوربی جہاں تھیں وہاں اب تک ہیں ۔ سنسکرت کے پنڈتوں نے انھیں عوام کی زبان سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے ۔ اگرچہ پنڈت جواہرلعل نہرو اور دوسرے بین‌الملیت کے دلدادہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام کی بولی یعنی شمالی ہند کے دیہاتوں کی بولی کو ترقی ہو تاکہ عوام تک جمہوریت اور مساوات کے خیالات پہنچیں اور وہ خود اپنا زندہ لٹریچر بناسکیں لیکن اب تک یوپی، بہار اور پنجاب میں یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ عام مدارس میں جو زبان رائج ہو وہ مادری زبان ہو اور شہری یا تمدنی کاروبار اور بین صوبجاتی تعلقات کے لیے ہندستانی زبان ہو جو شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس کا دوسرا نام آسان اردو یا فارسی‌آمیز اودھی یا پوربی یا برج ہے ۔ اس زبان میں جو فارسی کے لفظ ہیں وہ بھی ہندستانی ہوگئے ہیں اور اپنی اصل سے بہت دور ہوگئے ہیں اور گو ان کی اصل یعنی فارسی بھی سنسکرت کی ترقی‌یافتہ صورت ہے لیکن قوانین ترقی نے فارسی لفظوں کو بھی ایسے معنوں میں مخصوص کردیا ہے جو سوائے ہندستان کے ایران یا کسی فارسی بولنے والے ملک میں رائج نہیں ۔ بہرحال ہندی والوں کا یہ نظریہ سراسر غلط ہے کہ جو فارسی کے لفظ ہندستانی زبان میں رائج ہوگئے ہیں وہ ہندستانی نہیں ہیں۔ بلکہ

یہ غلو کیا جارہا ہے کہ اصلی ہندستانی لفظوں کو جو براہِ راست سنسکرت سے نکل کر بدل گئے ہیں ان کو بھی ایک فرضی و سطحی یکسانیت کے خیال سے بدل کر سنسکرت بنایا جارہا ہے ۔

دوسری وجہ سیاسی ہے ۔ ہندستان میں اختلافات کو ترقی دے کر ہی ایک قوم اپنی سیادت قائم رکھ سکتی ہے ۔ فارسی درباری زبان تھی لیکن آسان اردو یا ہندستانی عام طور پر سند قبول حاصل کرچکی تھی ۔ اس لسانی یک جہتی نے ہندستانی قوم کو عملی طور پر ایک ہی طرح سوچنے اور بولنے کا عادی کردیا تھا۔ جو لوگ اس اتحاد کے دشمن تھے انھیں یہ بات نہ بھائی ۔ پہلے یہ کوشش کی گئی کہ فارسی کی جگہ اردو رائج ہو۔ پھر اردو رسم خط سے نفرت کا اظہار شروع ہوا اور بہار میں کیتھی رسم خط سنہ ۱۸۸۱ء سے شروع کیا گیا ۔ اسی سال سی-پی میں بھی ہندی زبان اور ناگری رسم خط عدالتوں میں جاری کردیا گیا ۔ اس نفاق کا بیج بونے والوں کی تحریروں کے چند اقتباسات اس تاریخ اور پس منظر کو ظاہر کر سکیں گے جو موجودہ دور کے ہندی کے حامیوں کی کوششوں میں نظر آتا ہے ۔

سرکلر نمبر ۴۵ صدر بورڈ مال مورخہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۳۷ء بنام کمشنران مال جس نے فارسی کا خاتمہ کیا :—

"مجھے بیان کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ صدر بورڈ صیغہ مال کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ جہاں تک ناقابل اعتراض طریقوں سے ممکن ہو، پُرزور طریقے اختیار کیے جائیں کہ فارسی کی جگہ انگریزی اور ورنیکلر زبانوں میں صیغۂ مال کا کام جاری ہو ۔

(صفحہ ۷۱۱ مطبوعہ ۱۸۳۸ء)

"ہز لارڈشپ نہایت ہی آرزومند ہیں

The Secretary to the Board in his Circular No.45, dated 30th May, 1837, addressed to all Commissioners of Revenue, said :—

"I am directed to state that, in the opinion of the Sudder Board of Revenue, the proper time has arrived for taking effectual measures to substitute, as for as may be unobjectionably practicable, the English and Vernacular languages for the Persian, in the business of the Revenue Department.,,

(p. 711, printed in 1838)

"His lordship is extremely desirous, in accordance with the

چونکہ یہی جذبات آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے بھی ھیں کہ باشندگان ھند کی ورنیکلر زبان پھر اپنی اصلی جگہ پر قائم ھو جہاں سے وہ عرصہ دراز سے نکالی پڑی ھے اور اسی زبان میں ملک کا کاروبار پھر شروع ھوجائے ، (صفحہ ۷۳۷)

sentiments of the Honourable the Court of Directors, that the vernacular language of the people should resume its proper place, from which it has been so long banished,- in the transaction of the business of the country." (p. 737).

لیکن بنگال کوڈ (Bengal Code) کے قواعد کے مطابق عدالت اور محکمہ مال کی کارروائیوں میں فارسی کا استعمال قانوناً ناگزیر تھا۔ بہ مشکل گورنر جنرل نے اپنی کونسل کی مدد سے حل کردی اور قانون نمبر ۲۹ سنہ ۱۸۳۷ ع (Act 29 of 1837) ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۳۷ع کو جاری کردیا گیا اور ورنیکلر زبانوں کو فارسی کی بجائے رائج کرنے کا حق سپریم اگزیکٹو حکومت ھند (Supreme Executive Govt. of India) کو مل گیا۔

لیکن چونکہ ھندستان (یعنی بہار ، شمال مغربی صوبہ جسے اب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کہتے ھیں اور صوبۂ متوسط کے بعض علاقوں) میں صرف ایک ھی زبان جاری تھی جسے انگریز ھندستانی اور خود ان ممالک کے لوگ اردو یا ریختہ کہتے تھے اس لیے سرکار کمپنی بہادر نے اتنا کرم فرمایا کہ اسے عدالتوں اور محکمہ مال کی زبان تسلیم کرلیا اور اردو رسم خط جاری رھنے دیا لیکن مزید تفریق پیدا کرنے کے لیے سنہ ۱۸۸۱ ع میں بہار میں کیتھی اور اسی سال سی۔پی میں ناگری جاری کردی گئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ جتنا علاقہ انگریز کمپنی نے حاصل کرلیا تھا اس میں گاؤں کے رھنے والوں کی زبان اردو نہیں تھی اور خود ان کی بولیاں اتنی ترقی‌یافتہ نہ تھیں کہ تمدنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرسکتیں۔ بہاری ، بھوجپوری ، پوربی زبانوں میں ترقی کی صلاحیت ضرور ھے اور سنہ ۱۸۵۶ع کے بعد جب اودھی زبان بولنے والوں کا علاقہ بھی کمپنی کے زیر اثر آگیا تو وھاں بھی شہروں کی زبان اردو اور

قصبات کی معمولی اردو لیکن گاؤں اور دیہات کی بولی اودھی تھی جو کمپنی کے دوسرے علاقوں کی بولیوں سے بڑی حد تک ملتی جلتی تھی۔ گو مرزاپور کے پادریوں کو انگریزی کمپنی کی حمایت میں اسلام اور مسلمانوں کی حکومت پر ہر طرح کے جا و بےجا حملے کرنے کا اختیار تھا لیکن انھیں ابھی یہ چیز نہیں سوجھی تھی کہ ہندو بھی کسی زمانہ میں مد مقابل ہوں گے؛ ادھر انھوں نے توجہ ھی نہیں کی تھی۔ ان کے سامنے تو صرف ایک ایسی قوم تھی جو خود عیسائیوں کو اہل کتاب مانتی تھی اور ذاتوں کی گروہ بندی کی دشمن اور عالمگیر اخوت و مساوات کی حامی تھی۔ لہذا پہلے اسے مٹانا یا کم از کم زیر کرنا مشنریوں کا فرض تھا۔ انھوں نے بنارس اور مرزاپور سے لوہے کے ٹائپ میں جو کچھ بھی لکھا وہ ہندستانی زبان اور رسم خط میں لکھا۔ اودھ میں فارسی رائج تھی لیکن شاہان اودھ نے ملکی تمدن کو ترقی دے کر اپنا لیا تھا۔ انھوں نے ملکی زبان بھی اردو ھی قرار دے لی تھی اور اس طرح وہ لوگ عوام کے بہت ھی قریب زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ اسی لیے جب عنان حکومت کمپنی کے ہاتھ میں آئی تو اسے اردو کو عوام کی زبان مان لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اسی زبان کو ہندی بھی کہتے تھے اور ہندوی بھی۔ ریورنڈ مسٹر کیلاگ اپنی کتاب « ہندی زبان کی گرامر » کے دیباچہ میں کہتا ھے :-

The Rev. Mr. Kellogg, in the Preface to his "Grammar of the Hindi Language" 1865, says:-

"Of the two hundred and fifty million inhabitants of India, speaking a score or more different languages, fully one-fourth, or between sixty and seventy millions, own the Hindi as their vernacular. In all the great centres of Hindu faith in North India, alike in populous

« شمالی ہند کے ان شہروں میں جو ہندو دھرم کے بڑے مرکز ھیں مثلاً بنارس، الہ آباد اور متھرا اور ہمالیہ میں گنگوتری، کدار ناتھ اور بدری ناتھ کے مقدس مندروں تک اور ہندستان کی اکثر

Benares, Allahabad and Mathura, and in the mountains about the sacred shrines of Gangotri, Kidarnath and Budrinath, among the Himalayas; in many of the most powerful independent native states of India." (Page 40).

طاقتور ریاستوں میں'..........ہندی ہی آبادی کے بہت بڑے حصہ کی زبان ہے"۔

لیکن ہندی سے اس کا کیا مفہوم ہے اور اردو ہندی میں کیا فرق ہے اسے وہ اگلے جملے میں اس طرح ادا کرتا ہے:۔

"Only where Mahomedan influence has long prevailed, as in the large cities, and on account of the almost exclusive currency of Mahomedan speech in Government offices, have many Hindus learned to condemn their native tongue and effect the Persianized Hindi known as Urdu." (Page 40).

" صرف جہاں کہیں مسلمانوں کا اثر زیادہ عرصہ تک رہا ہے یعنی بڑے بڑے شہروں میں اور چونکہ تقریباً ہر سرکاری دفتر میں صرف مسلمانی زبان رائج ہے' بہت سے ہندوؤں نے اپنی مادری بولی سے نفرت کرنا سیکھ لیا ہے اور فارسی آمیز ہندی بولتے ہیں۔ اس کو اردو کہتے ہیں"۔

اس ہندو دھرم اور ہندی کی محبّت کو مسٹر آر بیمز نے اپنی گرامر کے مقدمہ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

Mr. R. Beames, B.C.S., author of "A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India" in this work says:-

"Hindi is that language which is spoken in the valley of the Ganges and its tributaries, from

" ہندی وہ زبان ہے جو وادی گنگ و جمن میں بولی جاتی ہے۔ بہ مقام

راج محل تک ہے جہاں سے بنگال شروع ہوتا ہے۔ یہ رقبہ آریہ ہندستان کا مرکز اور خاص حصہ ہے......لہذا یہ (یعنی ہندی) سنسکرت کی جائز وارث ہے اور موجودہ ہندستان میں اس کی وہی جگہ ہے جو قدیم ہندستان میں سنسکرت کی تھی"۔

the watershed of the Jamna, the largest and most important of them, as far down as Rajmahal, the point where the Ganges takes a sudden turn to the south, and breaks out into the plains of Bengal. This area is the centre and principal portion of Aryan India. It includes the Antareed or Doab between the Ganges and the Jamna, the "inner hearth" of the nation. It is therefore the legitimate heir of the Sanskrit, and fills that place in the modern Indian system which Sanskrit filled in the old."

صرف مندرجہ بالا تحریر کو اس زمانے سے اب تک ہندی کے متعلق ایک بنیادی اور صحیح نقطہ نظر سمجھا جارہا ہے۔ اسی قسم کی تحریروں کے ذریعہ سے بعض فرقہ پرور اور قدرتاً تنگ نظر اور قدامت پرست حضرات ہندی کی محبت کو ہندو دھرم اور آریہ ورت یا بھارت ورش کی محبت قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید کوئی ہندی زبان ضرور موجود ہے جو دوآبۂ گنگ و جمن میں یکساں طور پر شہروں اور دیہاتوں میں رائج ہے۔ حالانکہ واقعہ سراسر مختلف ہے۔ برج، اودھی، پوربی، بہاری ایک محدود رقبہ کی بولیاں ہیں اور اگرچہ سب ہندی کی شاخیں ہیں لیکن اس ادبی معیار تک نہیں پہنچیں کہ زبان کہلائیں۔ اسی خیال کو مندرجہ بالا مصنف جب آگے چل کر بیان کرتا ہے تو عصبیت کی عینک سے وہ حقیقت نظر نہیں آتی جو یقیناً ہمیں متحدہ قومیت اور بین الملیت کی طرف لےجاسکتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اس وسیع رقبہ میں اگرچہ عام بولیوں میں بہت بڑا اختلاف ہے لیکن

"Throughout the whole of this vast region though the dialects diverge considerably, one common

ایک عام اور عالمگیر طرز گفتگو رائج ہے
اور سب پڑھے لکھے اشخاص اسے استعمال
کرتے ہیں ۔ بظاہر یہ عام زبان دہلی کے
قرب و جوار سے نکلی.........اس ہندی
کو تدریجی ترقی ہوئی اور زبان نے کسی
قدر نئی شکل اختیار کرلی جس میں اگرچہ
اسما و افعال خالص ہندی رہے اور عام
الفاظ بھی کثیر تعداد میں وہی رہے لیکن
فارسی، عربی، حتیٰ کہ ترکی زبان کے
بہت سے لفظ اس میں جگہ پاگئے ۔ جس
طرح لاطینی اور یونانی الفاظ انگریزی
میں داخل ہوگئے ہیں اسی طرح ایسے
الفاظ نے نہ تو زبان کو بدلا نہ اس پر اثر
ڈالا ۔ اس کی صوتی کیفیتیں اور گردانیں
خالص آرین رہیں ۔ یہ چیزیں ولی اور
سودا کے یہاں بھی ویسی ہی ہیں جیسی
تلسی داس اور بہاری لال کے یہاں ۔ اردو
اور ہندی کو دو زبانیں سمجھنا نہ صرف
مسئلہ کے متعلق سخت ترین غلط فہمی
کو ظاہر کرنا ہے بلکہ یہ علم لسانیات کے
جملہ اصولوں کے بھی منافی ہے ۔ جب
بعض لوگ یہ شور غل مچاتے ہیں کہ
عدالتوں کی زبان اردو کی جگہ ہندی ہو
تو ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ عدالت

universal form of speech is recognised, and all educated persons use it. This common dialect had its origin apparently in the country round Delhi, the ancient capital, and the form of Hindi spoken in age, in which, though the inflections of nouns and verbs remained purely and absolutely Hindi, and a vast number of the commonest vocables were retained, a large quantity of Persian and Arabic and even Turkish words found a place, just as Latin and Greek words do in English. Such words, however, in no way altered or influenced the language itself, which, when its inflectional or phonetic elements are considered, in those of Tulsi Das or Behari Lal. It betrays therefore a redical misunderstanding of the whole bearing of question, and of the whole science of philology, to speak of Urdu and Hindi as two distinct languages. When certain agitators cry out that the language of the English Courts of law in Hindustan should be Hindi and not Urdu, what they mean is that clerks and native writers should be restrained from importing too many Persian and Arabic words into their writings, and should use instead the honest old Sanskrit Tadbhavas with which the Hindi abounds,

کے عملے کو زیادہ فارسی' عربی استعمال کرنے سے روکا جائے اور ان سنسکرت کے الفاظ کو رائج کرایا جائے جو ہندی میں بہت کثرت سے ہیں اور جنھیں تتبھو یا عام بول چال کے لفظ کہتے ہیں - بے شک ایسا ہی ہونا چاہیے - لیکن یہ نہ ہونا چاہیے کہ اردو کو ہندی سے علیحدہ ایک زبان مانا جائے - عربی اور فارسی الفاظ کے رواج نے ہندی پر احسان عظیم کیا ہے کیوں کہ ہندی کو نئے الفاظ کے لیے بار بار سنسکرت کی طرف رجوع کرنے اور پُر شکوہ اور پُر معنی سنسکرت الفاظ کی تلاش سے بچا لیا ہے"۔

By all means let it be so, only let it not be said that the Urdu is a distinct language from Hindi. By means of the introduction of Arabic and Persian words, a very great benefit has been conferred on Hindi, in as much as it has thus been prevented from having recourse to Sanskrit fountains again and again for grand and expressive words." (See Introduction to "A Comparitive Grammar of the Modern Aryan Language of India. Vol. I pp. 31-33).

یہ (تت بھو) الفاظ وہی ہیں جو ابتدا میں سنسکرت سے نکلے تھے اور ہزاروں برس کے بعد منجھتے منجھتے اور عام بولی پر چڑھ کر قبول عام کی سند حاصل کرچکے ہیں یا جیسا پہلے عرض کیا گیا ہے کہ فارسی الفاظ جو سنسکرت کی ترقی یافتہ صورت ہیں انھیں بھی (تت بھو) کہنا چاہیے اور جو الفاظ عام بولی میں گھل مل گئے ہیں انھیں غیر ملکی سمجھ کر ان کے درپے نہ ہونا چاہیے - اس خیال کو مسٹر بیمز اس طرح ادا کرتے ہیں :-

"سنسکرت الفاظ کو ان کی قدیم کلاسکل صورت میں دوبارہ لانے اور استعمال کرنے کی کوشش (جو موجودہ زبانوں میں قرنوں سے جاری ہے اور اب بھی

"This resuscitation of Sanskrit words in their classical form, a process which has been going on in the modern languages for ages, and is still at work as vigorously as ever, just as the resuscitation of Latin

words has always been and is still going on in French, has done a serious injury to some languages of the Indian group, in as much as it has led them to drop their Tadbhavas, which are the most vlauable class of words that a language can possess, not only on account of the light they throw on the philological processes which language has undergone, but because, having cast away all that was difficult of pronounciation, combrous, and superfluous in the ancient language, they possess the perfection of flexibility, neatness and practical usefulness. In some languages, notable in Bengali, Tatsama words have been borrowed from Sanskrit, and employed in written works, in cases where there already existed good serviceable Tadbhavas. The result has been that the unfortunate peasant who knows no Sanskrit, finds it more and more difficult every day to acquire knowledge, and the education of the masses is thus retarded. In respect of Tadbhavas, Hindi stands pre-eminent, whether it be that form of Hindi which relies principally upon indigenous sources for its words, or that other wirely employed form which he incorporated the flower and grace of

زوروں پر ہے۔ مثلاً لیٹن کو اصلی صورت میں فرانسیسی زبان میں داخل کرنے کی کوشش) نے ہندستان کی بعض زبانوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے اس لیے کہ اصلی سنسکرت الفاظ کی وجہ سے عام الفاظ (تت بھو) کو چھوڑنا پڑتا ہے اگرچہ الفاظ کی یہ قسم زبانوں کا بہترین خزانہ ہوتا ہے۔ ان سے نہ صرف لسانی ترقی کے مدارج معلوم ہوتے ہیں بلکہ مشکل تلفظ کو (جو قدیم زبان میں تکلیف دہ درجہ تک فاضل ہوتا ہے) چھوڑ دینے کی وجہ سے ان میں انتہائی لوچ، صفائی اور عملی افادیت پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض زبانوں (خصوصاً بنگالی) میں "تت سم" (یعنی اصلی لفظ) سنسکرت سے لے لیے ہیں اور تحریر میں لائے جارہے ہیں۔ باوجودیکہ عام بول چال کے اچھے خاصے الفاظ موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بدقسمت کسان جو سنسکرت نہیں جانتا علم حاصل کرنے میں روز افزوں مشکلوں میں پھنس رہا ہے اور عوام کی تعلیم میں اس سے رکاوٹ پیدا ہورہی ہے۔ روزمرہ (تت بھو) کے لیے ہندی سب سے آگے ہے وہ ہندی بھی جو مقامی ذرائع سے الفاظ لیتی ہے اور زبان کی وہ عام اور

ہمہ گیر صورت بھی (جس نے عربی اور فارسی اسما کی خوبی اور لطافت کو جذب کرلیا ہے) جسے کبھی اردو کہتے ہیں اور کبھی ہندستانی "

Persian and Arabic nouns, and which is called sometimes Urdu, sometimes Hindustani.,, (Beam's Comparitive Grammar p.p. 31-33).

زبان کا معاملہ ہندو مسلم سوال کیوں بنایا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کو اپنی حکومت جمانے کے لیے اُسی رومن نظریۂ افتراق کو ترقی دینا تھا جس پر ہر جگہ استعمار پرستیوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مذہب کے نام پر مشنری آتے ہیں۔ تجارتی حقوق پیدا کیے جاتے ہیں۔ قرض دیے جاتے ہیں۔ اجارے حاصل کرنے کے بعد آپس میں لڑانا اور حکومت کو مضبوط کرنا شروع ہوتا ہے۔ گو ابتدا میں اپنا مذہب پھیلانے کے لیے مسیحی مشنریوں نے ضمناً وہ کام بھی کردیا جو مقامی باشندے اب تک نہ کر سکے۔ یعنی انھوں نے ہندستان کی جتنی بولیاں تھیں سب کی گرامریں اور لغتیں مرتب کر ڈالیں۔ مثلاً رسالہ ایشیاٹک (Asiatic) کی اردو دوستی کے جواب میں بنگال سول سروس کا ایک شخص (Mr. F.S. Growse M.A. (Civil Service ضمناً ان پادریوں کا اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

" اس عقیدے کی بنیاد کہ ہندی چند گنواری بولیوں کے مجموعے کا نام ہے جن میں نہ تو باہمی ربط ہے نہ وہ ایک مقررہ معیار پر لائی جا سکتی ہیں یہ ہے کہ ابتدائی دور کے پادریوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا کہ جس ضلع میں وہ ہوتے تھے وہاں ایک لغت مرتب کرنے لگتے تھے۔ "

"The only foundation for the belief that Hindi is an arbitrary name for a group of vulgar dialects, which have little in common and could not be reduced to one standard, is the practice of the early Missionaries, each of whom set about compiling a dictionary for the district in which he happened to be placed."

(F.S. Growse of Bengal Civil Service)

ان گرامروں اور لغتوں کی ترتیب کا صرف ایک ہی منشا ہو سکتا تھا کہ مقامی باشندوں کو اس تاریکی سے (بزعم خود) نکالیں جس میں وہ اپنے مذاہب کی وجہ سے پڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے مذہب کے مقابلے کی تاب ان میں نہ تھی اس لیے ہندوؤں کی طرف رخ کیا گیا اور مقامی بولیوں میں اظہار خیال کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہندو نظام جسے ذاتوں کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے اور جس نے بہت سے سیلابوں کو ہزاروں سال سے روک رکھا ہے، اس مشنری حملے کی دستبرد سے بھی محفوظ رہا اور جب ان کی نہ چلی تو صرف اسی پر اکتفا کرنا کافی سمجھا گیا کہ ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کردیا جائے۔ ایک اردو کا حامی بنا دوسرا ہندی کا۔ لیکن ہندوؤں نے ابتدا میں نہایت سلامت‌روی اور فراخدلی کا ثبوت دیا اور صرف یہ خواہش ظاہر کی کہ زبان تو ایک ہی رہے البتہ اردو اور ناگری دونوں خطوں میں لکھی جائے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ صورت پیدا کی گئی کہ ہندوؤں نے اسے مذہبی مسئلہ بنا لیا اور ستم‌ظریفی دیکھیے کہ وہ یہی اپنی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ دینے لگے کہ چونکہ مسلمان آزادی پسند ہیں اور محکومیت کو توڑنے کے لیے انھوں نے بنگال سے پنجاب و صوبہ سرحد تک مجاھدین کی ایک جماعت تیار کرلی ہے اور جو وھابی مشہور ہیں، لہذا اگر اس تحریک کو کچلنا ہو تو ہندی کو اس طرح ترقی دی جائے کہ ناگری رسم‌خط عدالتوں اور مدرسوں میں جاری کیا جائے۔ اس سلسلے میں راجہ شیو پرشاد سی۔ ایس۔ آئی انسپکٹر تعلیمات نے تعلیمی کمیٹی سنہ (۱۸۷۰ع) کے روبرو شہادت دیتے ہوئے یوں گہرافشانی فرمائی:—

"I think, after all, we are getting on very well in our United Provinces, and very little is wanted here except one thing, which is the root of much mischief, great hindrance, and endless complaints. I mean the court character, which is Persian. The true secret of the success in Bengal is that the same

"میرا خیال ہے کہ ہم ممالک متحدہ میں اچھی خاصی ترقی کر رہے ہیں - بس ایک بات کی کمی ہے جو بہت بڑی برائی کی جڑ ہے اور جس کی وجہ سے بڑی رکاوٹ اور غیر متناہی شکایتیں ہو رہی ہیں - میرا مقصد عدالتی رسم‌خط سے ہے

جو فارسی ہے - بنگال کی ترقی کا راز یہ ہے کہ جو خط عدالتوں میں ہے وہی دکانوں اور دیہات میں بھی ہے - بہار میں سر ایشلے ایڈن نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ ہندی خط کو فارسی کی جگہ رائج کر دیا ہے - میں نہیں سمجھتا کہ اودھ اور شمال مغربی صوبے بمقابلۂ صوبہ بہار زیادہ مسلمانی ہیں - یہ پٹنہ ہی تھا جہاں وہابی تحریکیں زوروں پر تھیں -

(صفحہ ۳۲۷ - رپورٹ آف دی ایجوکیشن کمیشن صوبہ شمال مغربی و اودھ) -

character (Bengali) is used in the courts as in the shops and villages. Sir Ashley Eden has done a great thing in making the Hindi character take the place of Persian in Behar. I do not think Oudh and the North Western Provinces are more Muhammadan than the Province of Behar. It was in Patna that the Vahabi movements were so active."

(p. 327 report of the Education Commission N.W. Province.)

یہی راجہ شیو پرشاد جو اس وقت بابو تھے، اپنی "یاد داشت متعلق رسم خط عدالت" (Memorandom on Court Characters) میں سنہ ۱۸۶۸ع میں فرماتے ہیں کہ گورنمنٹ نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ انگریزی عوام کی زبان نہیں ہے - لیکن اس کا ایک غیر مرئی نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ فارسی جو بالکل اجنبی زبان ہے یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ فارسی خط میں لکھی ہوئی اردو جو نیم فارسی ہے، بیچارے عوام کے سر تھوپی جا رہی ہے -

چند سال بعد (سنہ ۱۸۷۳ع میں) سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ کو ہندوؤں کی طرف سے ایک میموریل بھیجا گیا جس میں مندرجہ ذیل چیزیں اردو رسم خط کے خلاف لکھی گئیں :-

"(۱) فارسی خط غیر ملکی ہے -

(۲) جمہور اس کے پڑھنے سے معذور ہیں -

(۳) خاص برائی یہ ہے کہ اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے -

(۴) ان تحریروں میں آسانی سے تحریف ہو سکتی ہے۔
(۵) اس تحریر کے رواج کی وجہ سے فارسی اور عربی مشکل الفاظ زیادہ رائج ہو رہے ہیں۔
(۶) ہندی تحریر میں مکروہ فارسی اور عربی الفاظ کم ہو جائیں گے۔
(۷) ہندی زیادہ عام ہے۔ خط و کتابت، بہی کھاتہ، کاغذات دیہی سب اسی میں ہوتے ہیں۔
(۸) ہندی بہی تیزی سے لکھی جاسکتی ہے جیسا کہ کمایوں، گڑھوال، سنٹرل انڈیا، دیسی ریاستوں اور نیپال میں رائج ہے۔
(۹) مسلمانوں کو یہ تبدیلی پسند نہ ہوگی لیکن وہ تو آبادی کا صرف آٹھواں حصہ ہیں۔ جمہور کا خیال کرنا مناسب ہے (جو ہندو ہیں)۔
(۱۰) ہندی رسم خط سے عام تعلیم (Mass Education) میں ترقی ہوگی۔
(۱۱) ہندی سیکھنا آسان ہے۔

لہذا فارسی تحریر کی جگہ عدالتوں اور دفتروں میں ہندی یا ناگری رسم رائج کردیا جائے تو ہم ہمیشہ دعائیں دیں گے۔"

ان سب دلائل پر صرف ایک جملہ اور بڑھادیجیے اور دیکھیے کہ موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے مدبر اور اہل علم بھی ہندی کی حمایت میں اس سے زیادہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ وہ یہ ہے :-

"ہندستان میں سب سے تعداد آریہ نسل کے لوگوں کی ہے۔ کاشتکاروں کی تاریخ و ادب سب ہندی بھاشا میں ہے اور اسی سے ملتی جلتی بولیاں یعنی بنگالی، مرھٹی، گجراتی وغیرہ اس کے اطراف میں مضبوطی سے قائم ہیں۔ اس چیز کی اہمیت کو کم سمجھنا خواہ وہ لسانی طور پر ہو یا سیاسی

"The prevailing nationality is Aryan. The folklore of the peasantry is enshrined in the old Hindi Bhasha; the Bengali, Marhatti, and Gujrati congeners of Hindi are firmly established in the neighbourhood and it is philologically and politically idle to ignore its importance, present or future. It would

طور پر فضول ہوگا۔ بس یہ کہنا حقیقت سے قریب تر ہے کہ عدالتوں کی انڈوپرشین (اردو) زبان کو زندہ رہنے کا کوئی حق سوائے اس کے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان بادشاہی کی یادگار ہے" (ڈائرکٹر تعلیمات کی رپورٹ بابت سنہ ۷۴-۱۸۷۳ع)

be nearer the mark to say that the Indc-Persian of the Courts has no raison d'etre except as a remnant and reminiscence of Mahomedan soverignty." (Report of the Director of Education for 1873-4).

ہم کس ہندی کو اختیار کریں؟

فرض کیجیے کہ اوپر لکھے ہوئے بیانات بھی صحیح ہیں اور موجودہ زمانہ کے ہندی دوستوں کے دعوے بھی اس حقیقت پر مبنی ہیں کہ "ہندوستان" یعنی سرہند سے بنگالے تک اور جنوب میں ممالک متوسط کے بڑے حصہ تک ہندی رائج ہے۔ اور فرض کیجیے کہ بنگالی، مرھٹی، گجراتی، پنجابی، پشتو وغیرہ بھی اس ہندی سے بہت ہی قریب ہیں جو "ہندوستان" میں بولی جاتی ہے۔ لہذا نظری حیثیت سے تو مان ہی لینا پڑے گا کہ ضرور "ہندی" رائج کی جائے۔ چونکہ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ بچے کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہی ہونا ضروری ہے، اگر ہم اس "ہندی" کو بچوں کے لیے نہ استعمال کریں تو اس ظلم کا نتیجہ کم علمی بلکہ جہالت کی صورت میں رونما ہوگا۔ نہ تو وہ اپنے صحیح جذبات کو ایک مصنوعی زبان کے ذریعہ سے ظاہر کرسکیں گے نہ ان کا کوئی لٹریچر بنے گا بلکہ وہ ایک نیم ٹر ہندستانی کی طرح کبھی بے محل فارسی الفاظ بول جائیں گے اور کبھی بےتکے سنسکرت محاورے۔

لیکن "ہندستان" میں جو بولیاں رائج ہیں، یعنی بولی جاتی ہیں اور لکھنے تک محدود نہیں ہیں، ان کی خالص ہندی صورتوں میں سے کھڑی بولی، اودھی اور پوربی ممتاز ہیں۔ یہ کھڑی بولی قدیم برج بھاشا کی نکھری ہوئی صورت ہے۔ اسی بھاشا میں پرتھوی راج کے درباری شاعر "چند" نے "پرتھوی رائے راسو" لکھی تھی۔ یہ زبان قنوج کے دربار کے اثر سے کافی ترقی کرچکی تھی گو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بکرماجیت کے وقت سے پرتھوی‌راج کے زمانے تک عوام کی کیا زبان تھی۔ بہر حال

اسی قسم کی زبان میں للوجی لال کبی (شاعر) نے پریم ساگر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس هزار سال کے عرصه میں برج بھاشا بہت کچھ ترقی کر چکی ہے اور زبان اتنی بدل گئی ہے کہ نہ تو اب "چند" کی زبان قنوج میں کوئی سمجھتا ہے نہ للولال کی مصنوعی بولی کوئی بولتا ہے۔ لیکن اس تحریک کا نتیجه یه هوا که گزشته صدی کے اواخر میں مونگھیر کے "آریه دهرم پرچارک" اور "آریه درپن" بنارس وغیرہ نے هندو دھرم کے احیا کے سلسله میں دیانندجی سرسوتی اور للولال کبی کی پیروی شروع کی۔ انھوں نے هندو دھرم کو ویدک دھرم قرار دیا اور سنسکرت سے رشته جوڑنے کے لیے کھڑی بولی کو آریه بھاشا نامزد کیا اور پھر ویدوں کے متعلق جتنے حواشی لکھے وہ اسی مصنوعی آریه بھاشا یا سنسکرت آمیز هندی میں لکھنے شروع کیے۔ یه ایک مصنوعی بولی ہے جو صرف سنسکرت کے اصلی الفاظ کو مذهبی خیالات کے ظاهر کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے اور پنڈتوں کی زبان کہی جانے کا حق رکھتی ہے۔ اگرچه موجودہ برج بھاشا یعنی کھڑی بولی یا دلی، آگرہ، قنوج کے قرب و جوار کی عام بازاری اور گھریلو بولی اس مصنوعی بولی سے بدرجہا ترقی یافته اور صاف ہے، هندوستانی گرامر اور اس کے محاورے هندستانی محاورے اور گرامر کہے جاسکتے هیں لیکن اسے زندہ هندی سمجھنے کے باوجود ترقی دینے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔

یہی حال اودھی اور پوربی کا ہے۔ اودھی زبان میں صرف ایک مستند کتاب لکھی گئی ہے جو اب تک موجود ہے۔ یعنی ملک محمد جائسی رح کی پدماوت۔ یه کتاب سلطان شیرشاہ کے زمانه میں (سنه ۹۴۷ھ) لکھی گئی اور موجودہ اودھی سے اتنی مختلف ہے کہ وهاں کے باشندوں کو اپنی بولی میں ترجمه کرنا پڑتا ہے۔ ظاهر ہے که جب ولی اور میر کی زبانوں میں اصلاح هوگئی ہے تو ایسی بولی جو تحریری معیار نه هونے کی وجه سے صرف بول چال تک محدود هو اس میں کیا کچھ تغیر و تبدل نه هوا هوگا۔ اس کا ایک بند ملاحظه هو:—

(رانی ناگمتی طوطے سے سنگل دیپ کے حسینوں کا حال پوچھتی ہے اور وہ اس طرح جواب دیتا ہے):—

سنـور روپ پدماوت کیـرا ‖ ہنسا سوا رانی مکھ ہیرا
پدمات کا حسن یاد کرکے ‖ ہنسا طوطا اور رانی کا منہ تکنے لگا

جنھ سـرور مـانھ ہنس نـہ آوا ‖ بگلے تنـھ سـر ہنس کہـاوا
جس جھیل میں ہنس نہیں آتا ‖ بگلے ہی اس جھیل میں ہنس کہلاتے ہیں

دیو کینھ اس جگت انوپا ‖ ایک ایک تیں آگـر روپا
خدا نے پیدا کیا دنیا کو ایسا خوب‌صورت ‖ کہ حسن میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حسین ہے

کے من گـرب نچھا جا کاھو ‖ چاند گھٹـا اور لاگا راہو
دل میں غرور کسی کو سزاوار نہیں ‖ (غرور ہی سے) چاند گھٹا اور گہن لگا

لون بلون تہاں کو کاھا ‖ لـونی سـوئی کنتھ جـہ چاھا
حسین اور غیر حسین کا کیا ذکر ‖ حسین وہی ہے شوہر جسے چاہے

کا پوجھو سنگل کی ناری؟ ‖ دنـہ نـا پہنچـے نس اندھیـاری
سنگل دیپ کی عورتوں کا حال کیا پوچھتی ہو؟ ‖ دن برابری نہیں کرسکتا وھاں کی اندھیری رات کا

پہپ سگنـد سـوانھ کے کایا ‖ جہاں ماتھ کا برنوں پایا؟
پھول سا خوشبودار ان کا جسم ہے ‖ جہاں سر کا ذکر ہے، وھاں پاؤں کا کیا ذکر؟

کرھیں سوں سونے سوندھیں بھرسو روپے بھاگ
پیدائش اس کی سونے سے ہے ۔ اور چاندی کی سی قسمت
سنت سوکھے گئے رانی ۔ ھئیے لون اس لاگ
سنتے ہی مرجھا گئی رانی ۔ اور دل میں نمک سا لگ گیا

کتنی زوردار زبان ہے! کتنے فطری استعارے ہیں! اور کیوں نہ ہو جبکہ شاعر ایک ایسی زبان میں کہہ رہا ہے جو زندہ زبان ہے، جو عوام کی بولی ہے اور ان کی روزمرہ کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے ۔ لیکن افسوس کہ اس زبان کی موجودہ

شکل کو، جو ایک ترقی‌یافته اودهی زبان هے، کوئی هندی کا ادیب اپنی تصنیفوں کے لیے استعمال نهیں کرتا۔ ایک مصنوعی هندی رائج کرنے کی کوشش کی جارهی هے اور هزاروں نهیں، لاکھوں انسانوں کی مادری زبان کو دهرم اور قدامت‌پرستی کی قربان‌گاه پر بهینٹ چڑهایا جا رها هے۔

پدماوت کی تحریر کے چار سو برس بعد بهی دهلی اور روهیلکھنڈ تک کے لوگ اس سے لطف‌اندوز هوتے تهے۔ لیکن اس درمیان میں اودهی بولی بهت کچھ بدل گئی تهی اور ارباب ذوق کو اس سے بحث نهیں تهی که زبان هندی هے، ریخته هے یا فارسی۔ اس لیے اس قدیم اودهی زبان سے زنده تعلق قایم رکھنے کے لیے سنه ۱۲۱۱ھ میں یه قصه دوباره زبان ریخته میں کها گیا۔ مقدمهٔ "پدماوت ریخته" کے ضروری اقتباسات یه هیں:—

"سبب تالیف۔ خاکسار بےمقدار سید غلام‌علی مشهدی متخلص‌به عشرت ساکن بریلی ابجد خوان دبستان مرزا علی‌لطف صاحب سلمه‌الله‌تعالی (یه اس وقت زنده تهے) که ذات با برکات ان کی ذوق یاب شعر و شاعری کی کلام کرامت نظام مرزا رفیع‌السودا مرحوم مغفور سے هے بلکه شاگرد ان کے هیں چند روز سے سنه ۱۲۱۱ھ درمیان شهر رامپور کے که نام خاص اس شهر بلند اور بلدهٔ ارجمند کا مصطفی‌آباد هے......... وارد تها۔ که مولوی قدرت‌الله صاحب شوق نے فرمایا که..............میر ضیاءالدین نام متخلص‌به عبرت متوطن شاهجهان‌آباد، خوش باش قصبهٔ رامپور همارے آشنا تهے اور رفقائے نجو خاں مرحوم کے انیس و جلیس تهے..........خان والا شان مرحوم کی خاطر سے (عبرت صاحب) اشعار فارسی و هندی کے کهتے تهے.........ان کی فرمائش سے انهوں نے قصه راجه رتن‌سین اور پدماوت کا که زبان پوربی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی کا هے، زبان ریخته میں تصنیف کرنا شروع کیا۔ (نصف کے قریب لکھا تها که) عبرت کو مرض‌الموت هوا اور ساتھ حسرت و غم نا تمامی اس داستان ندرت بیان کے دارالفنا سے دارالبقا کی طرف قدم رنجه فرمایا............اور وه صاحب فرمائش زبدهٔ خوانین روزگار یعنی نجو خاں سپه سالار بهی بیچ کارزار فرنگیان آتشبار کے رفاقت نواب غلام محمد خاں پسر نواب فیض‌الله مرحوم و مغفور میں، بنام آوری تمام کام آیا۔

مہربان من اب استدعا اور آرزو ہم مشتاقوں کی یہ ہے کہ بسبب فکر تمھاری کے یہ قصہ عجیب و غریب باقی‌ماندہ بیچ نظم آبدار کے آب وتاب انتظام کے پاوے "۔

اس آخری دور میں بھی ادبیات سے سپاھیوں تک کو دلچسپی تھی اور کمپنی بہادر کے گوئنڈوں کو ابھی ھندی اردو اور ھندو مسلمان، دین اور دھرم کا جھگڑا شروع کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ رامپور میں جو کسی حد تک اب بھی آزاد ھے اور مسلمانوں کی بستی ھے، کون مجبور کرسکتا تھا کہ پوربی زبان سے اتنی محبت کی‌جائے کہ اصل مع ترجمہ اردو شائع ھو اور پھر شاھان مغلیہ کی سنت پر عمل کرتے ھوئے اس کی "ریختہ" میں نظم بھی ھو۔ عبرت کو اس کا شبہ ھوا کہ بعض تنگ‌نظر اس قسم کی چیزوں کو کفر و اسلام کا جھگڑا بنا سکتے ھیں۔ کس خوش اسلوبی سے وہ اس کا جواب دیتا ھے :—

"سوال کرنا قلم نزاکت رقم سے واسطے تالیف
اس قصۂ لطیف کے"

جو دیکھی اس کی میں نے رائے صائب
کہا اپنے قلم سے ھو مخاطب

جہاں میں تجھ سے ھے اشراق ایجاد
فلاطوں کا تو حکمت میں ھے استاد

ھے دل میں تاکہ میں ھوکر نوا ساز
نکالوں پردۂ دل سے اک آواز

برائے خاطر یاران بےکیں
لکھوں اک داستان شوخ و رنگیں

کروں خورشید ساں طبع آزمائی
سیاھی کی بناؤں روشنائی

بدل شنگرف کے رنگ شفق ھو
گلستاں کا نمونہ ھر ورق ھو

خموش الفاظ ھوں جوں غنچۂ گل
معانی میں چھپا ھو شور بلبل

صلاحاً لیک، میں پوچھوں ھوں تجکو
کہ کرتا ھوں بیان عشق ھندو

کہے کوئی کہ عبرت سا مسلماں
ھوا ھے عشق کافر سے سخن راں

جواب معترض مجکو بتا دے
مرے دل سے یہ شبہ تو مٹا دے

جواب تشفی مآب قلم کا

قلم بولا کہ اے سرمایۂ عقل تو جس قصے کو چاہے کر وہی نقل
کہ عشق آزاد ہے کا کفر و دیں سے نہیں کچھ کام اسے شک و یقیں سے
وہ ان دونوں ہی عالم سے ہے آزاد کرے ہے کفر و دیں دونوں کو برباد
نہیں کچھ مانتا عشق ستمگار کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنار
مسلماں، کافر اس سے سب ہیں مجبور حقیقت شیخ صنعاں کی ہے مشہور
نہ اک بلبل ہی کو رکھتا ہے غمناک کرے ہے گل کے بھی سینہ کو صد چاک
کرے ہے روشن اپنا شعلہ جس دم جلا دے شمع و پروانہ کو باہم
سنی اے قبلۂ امید عبرت جناب عشق کی تو نے حقیقت
جہاں میں عشق کا جو رسم و دیں ہے معاف حضرت شرع متیں ہے
کرے گا اعتراض اس میں جو بیجا جناب عشق کا مردود ہوگا
قلم نے جب مجھے ڈھارس بندھایا سخن کے گھر فراغت سے میں آیا

لیکن بدقسمتی سے اب وہ زمانہ آگیا یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ارباب سیاست نے وہ حالت پیدا کردی ہے کہ گائے اور باجا، محرّم و دسہرہ، تولاّ و تبرّا، آریہ اور سناتن، اردو ہندی، اشتراک و انفراد، جمہوریت و آمریت، اقرار و انکار کی وجہ سے اگر کوئی مسلمان وحدت وجود کے متعلق اس قسم کے اشعار کہے تو فوراً اسے کمیونسٹ فرض کرلیا جائے گا اور گو وہ نیم ملاؤں کے فتووں کی پروا نہ کرے اور اپنا اعتماد صاحب فصوص پر رکھے اور رومی و تبریزی کے دجلے کو گنگا کے ویدانت سے ملائے، لیکن سیاست کی خشک منطق کے سامنے ادبی لطافتوں کی کون پروا کرتا ہے، خواہ عبرت لاکھ کہے کہ :—

اسی اک ذات کی ہیں سینکڑوں شان ہے جن کا مظہر کامل یہ انسان
ز دریا موج گونا گوں برآمد ز بیچونی برنگ چوں برآمد

ہزاروں شان میں ہوکر وہ گزرا　　کبھی وامق بنا وہ گاہ عذرا
کہیں شمع شبستاں وہ کہایا　　کہیں پروانہ ہو دل کو جلایا
کہیں مثل پدم کہلایا بھوگی　　رتن بن کر ہوا گاہے وہ جوگی
نہ کعبے سے غرض نہ طالب دیر　　ہے مقصد اس کو اپنے جلوے کی سیر
خم وحدت کی مے کے ہیں یہ سب جوش　　کہ کوئی ہوش میں ہے کوئی مدہوش
رہی دیر و حرم میں جلوہ‌گر ہے　　کہ ہر اک سنگ میں خفیہ شرر ہے
ہے اک شعلے سے اے شیخ و برہمن　　چراغ کعبہ و بتخانہ روشن
نمی‌دانم کہ دل یا دوست گویاست　　صدائے قلقل از مے یا ز میناست

اوپر کی عبارت سے صرف وحدت وجود ہی کا تذکرہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ آپ شاعر کی روانی بیان کو دیکھیں۔ یہی ایک ثبوت ہے کہ اردو زبان عام زبان ہوچکی تھی۔ تاہم جہاں عبرت نے پدماوت کا ترجمہ شروع کیا ہے وہ ترجمہ اگرچہ آزاد ہے لیکن ملک محمد کی روانی اور سلاست کو نہیں پہنچتا۔ ملک محمد کا بند جو پہلے دیا گیا ہے اس کا آزاد ترجمہ یہ کیا گیا ہے :—

قسم دیتی ہوں تجکو مجھ سے سچ بول　　ٹک اپنے دیدۂ انصاف کو کھول
کہ میرا حسن بہتر یا پدم کا　　بتادے فرق جو ہو بیش و کم کا
کہا رانی سے سن اے ناز پرور　　رہے نت چتر دولت تیرے سر پر
پدم کی بات سچ مت پوچھ مجھ سے　　کہ ہے وہ گل نہایت دور تجھ سے
اگرچہ تو بھی اک رشک پری ہے　　ترے ہر عضو میں جادوگری ہے
و لیکن اس پری رو کا کف پا　　ترے منہ سے کہیں دلچسپ ہےگا
جو دیکھے شکل تو اس دلربا کی　　نظر آوے تجھے قدرت خدا کی
نکل آوے جو خورشید جہاں تاب　　فروغ مہ اڑے مانند سیماب

مقابلۃً یہ نظم اس لیے زیادہ پھیکی معلوم ہوتی ہے کہ خود «اردو» اس ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں بدل چکی ہے اور ترجمہ کی وجہ سے سلاست زبان باقی نہیں رہی۔

پھر حال منشائے تحریر یہ ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی دیں تو اس

زبان یا بولی کو دیں جو کسی خطۂ ملک میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور مرد عورت، بچے بوڑھے اس میں اپنا اظہار خیال کرسکتے ہوں۔ نہ وہ ہندی ترقی کرسکتی ہے جو بنارس کے پنڈتوں نے ایجاد کی ہے نہ وہ اردو ملک کی زبان قراردی جاسکتی ہے جو علمی رسالوں اور عربی آمیزی تک محدود ہے۔ سیدھی سادی لیکن ترقی‌یافتہ بامحاورہ اور روزمرہ کی زبان خواہ اسے ہندی کہیے، ریختہ کہیے یا اردو نام رکھیے ایک ہی ہے اور ایک ہی ہونی چاہیے۔

سوال ہوگا کہ یہ زبان کہاں بولی جاتی ہے؟ اس کا جواب نہایت آسان ہے کہ یہ شمالی ہندستان کے شہروں کی زبان ہے اور کانگرس نے ہندو مسلم اتحاد کو سامنے رکھ کر اسے نہ ہندی کہا ہے نہ اردو بلکہ اس کا نام ہندستانی قرار دیا ہے اگرچہ بعض کانگرسی حضرات اب تک اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں سمجھے اور بلاوجہ ملک میں سیاسی گتھیوں کے ساتھ ایک ادبی گتھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کانگرس کا فرض ہے کہ ماہرین "ہندستانی" کی ایک کانفرنس کرنے کے بعد اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے واضح کردے تاکہ غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ رہے اور اس پس‌منظر کا بھی خیال رکھے جس کی وجہ سے آسان اردو یعنی ہندستانی پر حملہ کیا گیا ہے تاکہ فیصلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رہے:—

(۱) آسان اردو یا ہندستانی شمالی ہندستان کی زبان ہے۔ یہ خصوصیت سے شہروں اور قصبات میں بولی جاتی ہے اور گاؤں کے متمدن باشندے بھی اسے سمجھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن ان کی عورتوں اور بچوں کی زبان نہیں ہے اس لیے یہ گاؤں والوں کی مادری زبان نہیں ہے۔

(۲) آسان ہندی کوئی زبان نہیں ہے۔ البتہ اگر آسان ہندی سے یہ منشا ہے کہ وہ بولیاں جو انبالہ سے بنگالہ تک دیہاتوں میں بولی جاتی ہیں اور بولنے والوں کی مادری بولیاں ہیں تو ہندستانی بولنے والوں کو بہت خوشی ہوگی اگر ان میں سے کسی کو ترقی دےکر ہندستانی سے قریب لایا جائے۔ اس میں لٹریچر تیار ہو اور عوام کو اسی بولی میں تعلیم دی جائے۔ ان بولیوں میں سے کھڑی بولی، اودھی،

پوربی اور بہاری مشہور ہیں اور راجستھانی شامل کی جاسکتی ہے ۔ ان زبانوں کی گرامر سادہ ہے ۔ ان میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا بھی نہیں ۔ مثلاً پوربی میں کہیں گے « مہراروجات با ۔ منئی جات با اس کی سنسکرت آمیز مصنوعی ہندی ہے : «استری جاتی ہے ۔ پُرش جاتا ہے» اور اس کی ہندستانی ہے : «عورت جاتی ہے ۔ مرد (یا آدمی) جاتا ہے» ۔

(۳) چونکہ ہندستانی زبان میں فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے لفظ بالکل ہندستانی ہوگئے ہیں اور اپنی اصلی شکلوں کو بہت کچھ چھوڑ چکے ہیں اور اس میں سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو بین‌الصوبجاتی (Interprovincial) ہی نہیں بلکہ بین‌المللی (International) ہیں اس لیے اس زبان کو حق حاصل ہے کہ وہ شمالی ہند کی مختلف ہندیوں کو ملانے اور دوسرے صوبوں میں انگریزی کی جگہ لینے کی کوشش کرے اور ملک کی زبان کہلائے ۔

(۴) ہندستانی گرامر خود اپنے اصول رکھتی ہے ۔ یہ سنسکرت اور عربی کے اصول نہیں مان سکتی اس لیے کہ ان دونوں زبانوں میں تثنیہ (Dual) بھی ایک صیغہ ہے جو ہندستانی میں نہیں ۔ اس کے علاوہ تذکیر و تانیث بہت کچھ سماعی ہے اور جمع بنانے کے قاعدے بالکل نرالے ہیں ۔ فارسی گرامر بھی ہندستانی کے لیے موزوں نہیں ہوسکتی ۔ پوربی یا بنگالی کی طرح فارسی میں افعال کے اندر تذکیر و تانیث نہیں لیکن ہندستانی میں ہے، اس لیے ہندستانی گرامر کے اصول منضبط ہوجائیں تو بہتر ہے ۔ ان اصول کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس زبان کی ساخت انوکھی ہے یعنی اگرچہ کچھ کچھ شمالی ہندستان کی ہندیوں سے ملتی ہے، لیکن بعض افعال و روابط اس زبان کے لیے مخصوص ہیں ۔

(۵) ہندستانی زبان کے لیے تین رسم‌خط مانے جائیں ۔ اردو، ناگری اور لاطینی ۔ اور ہر صوبے میں سرکاری کاغذات وغیرہ کے علاوہ جتنی تعلیمات کے سلسلے کی کتابیں ہوں وہ سب ان تینوں خطوں میں شائع کی جائیں لیکن سب کی زبان ایک ہی ہو ۔

(۶) ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت ہے جو ہندستانی زبان کا معیار مقرر

کرے اور مختلف صوبوں کی سرکاری یا نیم سرکاری مطبوعات کی نگرانی کرے اور اگر کسی چیز کو اصلی معیار کی بجائے افراط یا تفریط کی طرف مائل دیکھے تو بازپرس کرسکے۔

(۷) ایک ایسے ادارے کا قیام ہو جو زیادہ سے زیادہ تین ہزار لفظوں میں ہندستانی زبان کے لفظوں کو محدود کردے تاکہ ان کے ذریعے سے دوسرے صوبوں اور غیر ممالک کے لوگوں کو ہندستانی لٹریچر پہنچایا جاسکے۔ عام آدمی کو اپنے کاروبار کے لیے ایک ہزار سے دو ہزار تک الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور سائنس و ادب کی ایک ہزار اصطلاحیں شامل کرلی جائیں تو ہر قسم کا علمی و ادبی کام ہونا کچھ مشکل نہیں۔ اس ڈکشنری کے ساتھ ایک آسان گرامر مرتب کرنے کا کام بھی اسی ادارے سے متعلق ہونا چاہیے۔ راقم الحروف نے انفرادی طور پر اس کام کو شروع کردیا ہے۔

فرقہ پرستی کا خطرہ

بدقسمتی سے گزشتہ پچاس سال سے فرقہ پروری کے جراثیم کو نہ صرف ترقی ہورہی ہے بلکہ وہ حضرات بھی جو قوم پروری کی طرف مائل ہیں عوام کی رائے کے دھارے میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جس طرح ابتدا میں فارسی کے خلاف آواز اٹھوائی گئی اور اس کی جگہ انگریزی رائج کی گئی اور جو لوگ انگریزی تعلیم و تمدن کے مخالف تھے انھیں ٹوڈی اور قدامت پرست کہہ کر خاموش کردیا گیا اور اس کے بعد جب اردو رائج ہوئی تو اس کو یہ کہہ کر نکلوایا کہ اس کا رسم‌خط مشکل ہے اور اس صدائے بےہنگام میں ڈاکٹر فیلن (صاحب لغت)، سر ولیم جونز، پروفیسر مونیر ولیمز کے ساتھ اخبار آرین، راجہ شیو پرشاد، پنڈت متھرا پرشاد مصرا وغیرہ شامل ہوگئے اور مسٹر فریڈرک پنکوٹ (Mr. F. Pincott, M.R.A.S.) نے یہ طے کردیا کہ "اصلی مسئلہ زبان کا نہیں بلکہ ابجد کا ہے" "The real language question is one of alphabets." لیکن بہت ممکن ہے

کہ اب ناگری رسم‌خط جاری ہونے کے بعد ہندستانی زبان کو بھی بدلنے کی کوشش کی جائے ۔ یہ خطرہ ایک حد تک حق بجانب ہے اس لیے کہ اب جو زبان ایجاد کی جارہی ہے اس میں سے چن چن کر نہ صرف فارسی عربی کے ہندستانی لفظوں اور محاوروں کو نکالا جارہا ہے بلکہ یہ ظلم ہورہا ہے کہ خالص سنسکرت سے نکلے ہوئے ہندستانی لفظوں کو پھر مخرج کی طرف واپس کیا جارہا ہے ۔ لیکن جب یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا اس وقت صرف یہ خیال تھا کہ ہندستانی زبان سے ایسے الفاظ نکال دیے جائیں جو عوام میں رائج نہیں خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ بابو ہریش چندر بنارسی نے ایجوکیشن کمیشن سنہ ۱۸۸۲ع کے سامنے جو بیان دیا تھا وہ ذرا دلچسپ ہے وہ کہتے ہیں :—

"ہم (اردو حرفوں کے ذریعے سے) ہزاروں مختلف لفظ بنا سکتے ہیں۔ خدا ہمیں ایسے حرفوں سے بچائے......... دفتروں میں فارسی حرفوں کا استعمال نہ صرف ہندوؤں پر ظلم ہے بلکہ ہر امپیریل مجسٹی (ملکہ وکٹوریہ) کی وفادار رعایا کی کثیر تعداد کے لیے الجھن اور مشکل کا سبب ہے............ مجھے افسوس ہے کہ آنریبل سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ نے اپنی شہادت کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ اردو شرفا کی زبان ہے اور ہندی دیہاتی بولی ہے ۔ یہ بیان نہ صرف غلط ہے بلکہ ہندوؤں کے ساتھ نا انصافی ہے.........بیرونی لفظوں نے ہماری خالص ہندی کو برباد کردیا ہے۔

Babu Harish Chandra of Benares says :—

"We can have a thousand new pronunciations. May God save us from such letters...........

The use of Persian letters in offices is not only an injustice to Hindus, but it is a cause of annoyance and inconvenience to the majority of the loyal subjects of Her Imperial Majesty...............

I am sorry to learn that the Honourable Sayyid Ahmad Khan Bahadur, C.S.I., in his evidence before the Education Commission says that Urdu is the language of the gentry and Hindi that of the vulgar. The statement is not only incorrect, but unjust to the Hindus.

"This interposition of foreign words has spoiled true Hindi. Hindi by itself without much

foreign aid can easily answer our purpose..................

I do not mean to say that all Persian words should be banished from our vernacular. This is beyond our power. Who can dispense with the words 'matlab', 'adalat', 'hazar', 'Jahaz', 'wazir', 'badshah', 'jama kharach', 'nekniyat', 'sahib'.. ....

We want the pure simple vernacular understood by the public and written in character familiar to the majority.

In books of science, of course, we are compelled to use technicalities for which we can not find equivalents in the vernacular."

(see Report of the Education Commission 1882.)

ھندی بغیر غیر ملکی مدد کے ھمارا کام نکال سکتی ھے..................میں یہ نہیں کہنا چاھتا کہ سب فارسی لفظ ھماری بولی سے نکال دیے جائیں۔ یہ ھمارے بس کی بات نہیں ھے۔ کون ھے جو ایسے لفظوں کو نکال سکتا ھے جیسے: مطلب، عدالت، حاضر، جہاز، وزیر، بادشاہ، جمع خرچ، نیک نیت، صاحب وغیرہ.........ھم صرف یہ چاھتے ھیں کہ وہ زبان رائج ھو جو خالص اور آسان عوام کی بولی ھو اور ایسے خط میں لکھی جائے جس سے (وفادار) رعایا کی اکثریت مانوس ھو۔ ھاں، سائنس کی کتابوں کے لیے مجبوری ھے کہ ھماری بولی میں مترادفات نہیں ملتے اور ھمیں اصطلاحیں (فارسی ؟) استعمال کرنی پڑتی ھیں‘۔

(رپورٹ صفحہ ۲۰۰—۲۰۲)

بےشک آپ آسان ھندستانی کے حامی معلوم ھوتے ھیں اور ان فارسی کے لفظوں کو نکالنا ناممکن تصور کرتے ھیں جو ھندستانی میں گھل مل گئے ھیں۔ آپ کو کیا معلوم تھا کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ھے کہ اسمائے نکرہ نہیں بلکہ معرفہ اور علم (Proper Names) بھی بدلے جا سکیں گے اور ھندستان کو بھارت ورش، برار کو ودھرب، ھندستانی سی پی کو مہا کوشل، آگرہ و اودھ کو جُٹ پرانت کہہ سکیں گے اور نیشنل ادارے بھی منہ تکا کریں گے۔ آپ کہتے ھیں کہ وزیر بادشاہ وغیرہ کو کون بدلے گا ؟ اول تو اس قسم کے انسان اب قصۂ پارینہ ھوگئے ھیں لیکن ھماری

ملکی آزادی طلب کرنے والی جماعت نے جسے عربی میں حزب‌الوطنیہ کہہ سکتے ہیں اور جسے « ہندستانی » کے ہمدردوں نے « راشٹریہ مہاسبھا » کے نام شدہ کیا ہے، اپنی تحریروں اور اعلانوں میں بھی « کانگرس » یا « نیشنل کانگرس » کا لفظ چھوڑ دیا ہے اگرچہ ہندستان کا بچہ بچہ اس لفظ سے آشنا ہے۔ اس جماعت نے چند افراد کو سکریٹری کے نام سے موسوم کیا تھا جو پریسیڈنٹ کے لیے منشی یا کاتب کا کام انجام دیتا ہے۔ لہذا ان غیر ملکی لفظوں کی جگہ پریسیڈنٹ یا صدر کو تو سبھاپتی بنادیا گیا اور سکریٹری کو وزیر فرض کرکے « منتری » کا لقب عطا ہوا۔ صاحب کی بجائے شریمان یا شری‌جت آ گئے۔ جمع خرچ جوڑ نکاس بن گیا۔ غرضکہ بہت کچھ ہوا اور ہونے والا ہے اور سب نیشنلزم اور حریت‌پسندی اور ترقی کے نام پر ہو رہا ہے۔ لیکن ابتدا صرف اسی سے کی گئی کہ ناگری رسم‌خط ہندوؤں کی اکثریت کا رسم‌خط ہے اور زبان ایک ہی ہے جسے آسان ہندستانی کہہ سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ ع لفٹنٹ گورنر مکڈانلڈ نے یوپی میں ناگری رسم خط کو جاری کیا اس سے بہت پہلے یہ ہندو مسلم مسئلہ بنایا جاچکا تھا اور ہندو اپنی وفاداری کے صدقے میں وہابی اور جہادی خیال کے مسلمانوں کے رسم‌خط کو نکلوانا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کے اشارے سے یوپی کے بااثر مسلمان ہندستانی زبان کے لیے احتجاج کرنے سے روک دیے گئے تھے۔ اس وقت جو فضا پیدا ہوگئی تھی وہ ذیل کی دو نظموں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نظمیں ناگری رسم‌خط میں پنڈت آر۔ ان۔ ترپاٹھی جی نے ایک نظموں کی کتاب میں جس کا نام «کویتا کومُدی» ہے شائع کردی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب بچوں اور طالب‌علموں کے لیے لکھی گئی ہے اور مسلسل اس زہر کو قائم رکھنے میں امداد دیتی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے ہندستان کی مشترکہ قومیت کو مٹانے کے لیے پھیلایا گیا تھا۔ اردو کی اپیل اودھ پنچ لکھنؤ میں ۱۷ مئی سنہ ۱۹۰۰ع کے پرچے میں شائع ہوئی تھی:—

اردو کی اپیل

خدایا بڑی کیسی افتاد ہے — بڑے لاٹ صاحب سے فریاد ہے

مجھے اب کسی کا سہارا نہیں — یہ بے وقت مرنا گوارا نہیں

مرا حال بہر خدا دیکھیے — ذرا میرا نشو و نما دیکھیے

میں شاہوں کی گودی کی پالی ہوئی — مری ہائے یوں پائمالی ہوئی

نکالے زباں پھرتی ہوں باؤلی — خدایا میں دلّی کی تھی لاڈلی

ادائیں بلا کی ستم کا جمال — وہ سج دھج قیامت، وہ آفت کی چال

مرے عشق کا لوگ بھرتے تھے دم — نہیں جھوٹ کہتی، خدا کی قسم

یہ آفت لڑکپن میں آنے کو تھی — جوانی ابھی سر اٹھانے کو تھی

نکالے تھے کچھ کچھ ابھی ہاتھ پاؤں — چمک پھیلتی جاتی تھی گاؤں گاؤں

کہ غیبی طمانچہ سے منہ پھر گیا — مہ چاردہ ابر میں گھر گیا

مری گفتگو اور ہندی کا حرف — وہ شعلہ فشانی، یہ دریائے برف

اس انداز پر دل ہوا لوٹ پوٹ — دولائی میں اطلس کی، گاڑھے کی گوٹ

خدایا نہ کیوں مجھکو موت آ گئی — کہاں سے مرے سر یہ سوت آ گئی

نہ جھومر نہ جھمکا نہ بالے رہے — نہ گیسو مرے کالے کالے رہے

نہ اطلس کا پاجامہ کلیوں بھرا — دوپٹہ گلابی مرا کیا ہوا

نہ سرمہ نہ مسّی نہ مہندی کا رنگ — عجب تیری قدرت عجب تیرے ڈھنگ

نہ بیلے کی بدّھی نہ اب ہار ہے — نہ جگنو گلے میں طرحدار ہے

نہ جھانجوں کی جھن جھن، کڑوں کا نہ شور — دوپٹے کی کوسکن نہ محرم کا زور

وہ بانکی ادائیں وہ ترچھے چلن — قفیرژا ہوا، ہوگیا سب ہرن (؟)

[illegible] — فقط ایک دم آنا جانا رہا

یہ سودا بہت ہم کو مہنگا دیا　　　　که خلعت میں حاکم نے لہنگا دیا
انگوچھوں کی اب تم پھبن دیکھنا　　　　کھلی دھوتیوں کا چلن دیکھنا
وہ سیندور بالوں میں ایسی جٹی　　　　که ہے پارک میں جیسے سرخی کٹی
(وغیرہ)

اس کا جواب ، بھارت متر ، اخبار میں مسٹر بال مکند گپتا نے اس طرح دیا تھا :

اردو کو اُتّر (یعنی جواب)

نہ بی بی بہت جی میں گھبرائیے　　　　سنبھلیے ذرا ہوش میں آئیے
کہو کیا پڑی تم پہ افتاد ہے　　　　سناؤ مجھے کیسی فریاد ہے
کسی نے تمھارا بگاڑا ہے کیا ؟　　　　سنوں حال میں بھی تو اس کا ذرا
نہ اُٹھتی میں یوں موت کا نام لو　　　　کہاں سوت ؟ مت سوت کا نام لو
بہت تم پہ ہیں مرنے والے یہاں　　　　تمھاری ہے مرنے کی باری کہاں
بہت بہکی بہکی نہ باتیں کرو　　　　نہ سائے سے تم آپ اپنے ڈرو
ذرا منہ پہ پانی کے چھینٹے لگاؤ　　　　یہ سب رات بھر کی خماری مٹاؤ
تمھاری ہی ہے ہند میں سب کو چاہ　　　　تمھارے ہی ہاتھوں ہے سب کا نباہ
تمھارا ہی سب آج بھرتے ہیں دم　　　　یہ سچ ہے تمھارے ہی سر کی قسم
تمھاری ہی خاطر ہیں چھتیس بھوگ　　　　که لٹّو ہیں تم پر زمانے کے لوگ
جو ہیں چاہتے ، ان سے ریجھو رجھاؤ　　　　کوئی کچھ جو بینڈی کہے ، سو سناؤ
وہی پہنو جو کچھ ہو تم کو پسند　　　　کسو اور بھی چست محرم کے بند
کرو اور کلیوں کا پاجامہ چست　　　　وہ دھانی دوپٹہ وہ ٹِک ٹِک درست
وہ دانتوں پہ مسی کھڑی پر کھڑی　　　　رہے آنکھ آئینہ ہی سے لڑی
کڑے سے کڑے کو بجاتی پھرو　　　　وہ بانکی ادائیں دکھاتی چلو
مگر اتنا جی میں رکھو اپنے دھیان　　　　وہ بازاری پوشاک ہے میری جان
جنا تھا تمھیں ماں نے بازار میں　　　　پلی شاہ عالم کے دربار میں

ملی تم کو بازاری پوشاک بھی
وہ تھی دوغلے کاٹ کی فارسی

وہ پھر اور بھی کٹتی چھنٹتی چلی
وضع روز اس کی پلٹتی چلی

وہی تم کو پوشاک بھاتی ہے اب
نہیں اور کوئی سہاتی ہے اب

مگر ایک سُن آج مطلب کی بات
نہ پچھلا وہ دن ہے نہ پچھلی وہ رات

کیا ہے طلب تم کو سرکار نے
تم آئی ہو انگریزی دربار میں

سو اب چھوڑیے شوق بازار کا
ادب کیجیے کچھ تو دربار کا

ادب کی جگہ ہے یہ دربار ہے
کچہری یہ کچھ ہے نہ بازار ہے

یہاں آئی ہو آنکھ نیچی کرو
مٹکنے چٹکنے پہ مت اب مرو

(یہاں تین شعر ترک کر دیے گئے ہیں)

یہ سرکار نے دی ہے جو ناگری
اسے تم نہ سمجھو نری گھاگری

تمھاری یہ ہرگز نہیں سوت ہے
نہ حق میں تمھارے کبھی موت ہے

سمجھ لو ادب کی یہ پوشاک ہے
حیا اور عزت کی یہ ناک ہے

ادب اور حرمت کی چادر ہے یہ
چڑھو گود میں مثل مادر ہے یہ

یہی آپ کی ماں کی پوشاک تھی
یہ آزاد سے پوچھنا تم کبھی

عنایت ہے تم پر یہ سرکار کی
تمھیں دوسری اس نے پوشاک دی

برائی نہ اس کی کرو دوبدو
بڑھائے گی ہر دم یہی آبرو

پرانی بھی ہے وہ تمھارے ہی پاس
اسے بھی پہن کر رہو بے ہراس

کرو شکریہ جی سے سرکار کا
کہ اس نے سکھائی ہے تم کو حیا

مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ کچھ لوگ مشترکہ قومیت و تمدن کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہیں اور ان کے اقوال کا اندازہ افعال سے ہورہا ہے۔ ایسی حالت میں فرقہ پرستی کا خطرہ اگر ہو تو بیجا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض ناسمجھ افراد ایسی باتیں کرتے ہیں، جمہور کا نہ تو غیر ملکی تمدن و علم سے بیر ہے، نہ اس سے ان کا نقصان ہے، لہذا ایسی تحریکیں چند دن میں خود مردہ ہوجائیں گی اور جس طرح مسلمانوں نے "خذ ما صفا" اور "دع ما کدر" پر عمل کرتے ہوئے جس

جگہ گئے وہاں کا تمدن و علم اپنے اندر جذب کرلیا، اسی طرح باوجود ذاتوں کی کشمکش اور مذہب کی تنگیوں کے ہندوؤں میں بھی جو جماعتیں میدان علم و عمل میں آگے ہیں وہ اسلام کی اخوت و مساوات و حریت، اور یورپ کی علمی ترقیوں کی دلدادہ ہیں اور باوجود شاستروں کی ممانعت کے پنڈت مدن موہن مالوی جی نے سمندر پار کرنے کا راستہ کھول دیا ہے اور صرف محبت وطن کی وجہ سے خاک پریاگ و گنگا جل کو ٹیمز کو پوتر کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ شاہ دہلی کا نمکخوار قدیم راجہ رام موہن رائے سمندر عبور کرنے کے جرم میں ذات باہر ہو۔ اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہندیوں کی کثیر تعداد نہ صرف یورپین تمدن و علم کی پرستش کرتی ہے بلکہ اس سے مرعوب ہوکر اپنے خالص ہندستانی تمدن کو غیر ملکی قرار دے رہی ہے اور فارسی عربی یا انگریزی سے نفرت کی صدائیں صرف ایسی جماعت کی طرف سے اٹھ رہی ہیں جو ہندستان کو صدیوں پیچھے لے جانے اور کپڑے ادھیڑ کر سینے کی سعی لاحاصل کرنا چاہتی ہے۔

یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ بعض افراد یا جماعتیں جھوٹے جوش میں ترقی معکوس کا نام ترقی سمجھتی ہیں۔ لیکن ہندستانیوں کو متفقہ طور پر ان کی بےمعنی کوششوں کو پنپنے نہ دینا چاہیے اور صاف دلی کے ساتھ اپنے خطرات کا اظہار کرنے کے بعد ایک صحیح مسلک اختیار کرلینا چاہیے۔ زبان کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ چند افراد اپنی ذاتی مصلحتوں کو پوری قوم اور ملک پر عاید کریں۔

چند سال ہوئے جب « ہندستانی اکیڈیمی » الہ آباد کے بعض ہمدردوں نے ہندی اردو کو الگ ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک مشترک زبان کی پرورش پر زور دیا تھا، تو ہندی ڈپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی کے بعض استادوں کو یہ چیز پسند نہیں آئی اور « ہندستانی اکیڈیمی » کے آئین کا حوالہ دےکر یہ بتایا گیا کہ اس اکیڈیمی کا قیام ہی اس غرض سے ہوا ہے کہ ہندی اور اردو الگ الگ ترقی کریں اور اپنی اپنی رائیں علیحدہ علیحدہ بنائیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب بنگال کے بعض اہل علم نے اس مصنوعی ہندی پر نظر ڈالی جو الہ آباد و بنارس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہے تو

صحیح طور پر اس نتیجہ پر پہنچنے کہ پدماوت اور رامائن کی زبانیں اتنی قدیم ہیں کہ اب ان بولیوں کو کوئی شخص اودھ یا پورب میں نہیں بولتا۔ باوجود اس کے یہ ایم۔اے کے کورس میں داخل ہیں۔ اسی طرح دوحۃ الابصار یا نوطرز مرصع کی زبان اس دور کی ہے جب اردو میں ہزاروں متروکات داخل تھے، لیکن پھر بھی یہ کتابیں الہ آباد کے ایم۔اے کے طلبہ کے مطالعہ کے لیے ضروری سمجھی گئی ہیں۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد بجاطور پر اہل بنگال نے یہ صدائے با ہنگام بلند کی کہ ایسی بےتکی اور غیر ترقی‌یافتہ زبانوں کو بنگال پر عاید کرنا بنگالی زبان پر سراسر ظلم ہے۔ ہندستانی کو نہیں بلکہ بنگالی کو "راشٹریہ بھاشا" ہونا چاہیے۔ اب بتائیے کہ مصنوعی ہندی اور مشکل اردو کے "نخل آرزو کی جڑ کٹ گئی" یا بچی؟

اس میں شک نہیں کہ بنگالی ہندی ہندستان کی دوسری ہندیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی‌یافتہ ہے۔ اس کا لٹریچر ادبیات فرنگ کی پوری دل‌آویزیوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے دامن سے زیادہ وابستہ ہے۔ ٹیگور اور نذرالاسلام نے اسے عوام کی بولی سے زیادہ قریب کردیا ہے اور اسی لیے اس میں جان ہے اور ایسی جان جو بنگال کے بچے بچے کو میدان عمل میں سرگرم بناسکتی ہے۔ اگر نیچر کی مہربانیوں نے اسے دوسرے صوبوں سے بے نیاز نہ کیا ہوتا اور موسم کی لطافت نے قوائے جسمانی کو نزاکت کی طرف مائل نہ کردیا ہوتا تو یقیناً بنگال کو اپنی وحدت لسانی کے بل بوتے پر ہندستان کی قیادت کا فخر حاصل ہوتا۔ یقیناً مسٹر ہیرندر ناتھ دت کا یہ خیال درست ہے کہ کسی مصنوعی زبان کو ترقی دینے سے یہ بہتر ہے کہ بنگالی زبان کو راشٹریہ بھاشا قرار دیا جائے۔ (دیکھیے تجویز بنگال ساھتیہ پریشد کانفرنس۔ اخبار ہندستان سٹینڈرڈ ۳ فروری سنہ ۱۹۳۹ع)۔ لیکن اسی بنگال ساھتیہ سمیلن کے جلسہ منعقدہ کومِلّا میں ۸ اپریل کو کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے یہ تسلیم کرلیا کہ بنگالی راشٹریہ بھاشا نہیں ہوسکتی۔ البتہ ہندی یا ہندستانی کا بنگال پر عائد کرنا "زبردستی" ہے۔ ان کی رائے میں انگریزی ہی ہندستان کی انٹرپراونشل زبان ہوسکتی ہے۔

غرض کہ ہماری مشترک زبان بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی زبان مشترک زبان تسلیم کرلی جائے ۔ وہ کھڑی ہندی ہو یا پوربی‘ بنگالی ہو یا آسان اردو‘ کوئی زبان ہو لیکن اس میں صلاحیت ہو کہ وہ انٹر پراونشل زبان ہی نہیں بلکہ وقت آنے پر انٹرنیشنل زبان بن سکے ۔ اس کے لیے شرط اولین یہ ہے کہ وہ ہندستان کے کسی خطے کی بول چال کی زبان ہو اور اس میں کچھ نہ کچھ لٹریچر بھی موجود ہو ۔ بنگالی زبان سنسکرت کی طرف زیادہ مائل ہے‘ پنجابی اور پشتو میں فارسیت غالب ہے لہذا اگر کوئی زبان انٹر پراونشل ہوسکتی ہے تو وہ صوبہ آگرہ و اودھ کی ترقی‌یافتہ بولی ہی ہوسکتی ہے خواہ وہ کھڑی بولی پر کھڑی ہو‘ اودھی پر ہو یا پوربی پر ۔ ہمیں عام اصطلاحات کے لیے انگریزی‘ فارسی‘ سنسکرت کی مروجہ اصطلاحوں کو خارج نہ کرنا چاہیے بلکہ حسب ضرورت ان زبانوں سے مدد لینی چاہیے ۔ اگر ہم مختلف بولیوں کے چند بنیادی لفظوں کا مقابلہ کریں تو ہمیں آسانی سے معلوم ہو جائےگا کہ جس زبان میں ہندستان کی مشترک زبان بننے کی صلاحیت ہے وہ شمالی ہندستان کے شہروں کی زبان ہے ۔

نیچے کے نقشے میں چند ایسے ضروری لفظوں کا مقابلہ کیا گیا ہے جن کے بغیر کسی بچے کو بھی چارہ نہیں ۔ فہرست بہت مختصر ہے لیکن نتیجہ نکالنے کے لیے کافی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن‌نشین رکھیے کہ افعال (Verbs) کی صورتیں ہر بولی میں مختلف ہیں‘ اگر یکسانیت ہے تو صرف اس شہری بولی میں جو شمالی ہندستان کے شہروں میں رائج ہے‘ اور اردو رسم خط میں زیادہ واضح طور پر لکھی جاتی ہے ۔ اُسے ناگری‘ بنگالی یا انگریزی رسم‌خط میں بھی لکھ سکتے ہیں ۔

مختلف ہندیوں کا ہندستانی زبان سے مقابلہ

زبان	Mother	Hand	Water	Bread	House	Cow	Matches	Shirt	Sleep	Good	Where	Marriage
پشتو	مور	لاس	اُبہ	ڈوڈائی	کور	غوا	نیلی	جامئے	خوب	خوہ	چرتہ	واُدہ
پنجابی	ما	ہتھ	پانڑی	ڈُکر	کھر	گاں	ڈبّی	کمیز	نیندر	چنگا	کِتھے	ویاہ
برج یا کھڑی بولی	مائی	ہاتھ	پانی	روٹی	گھر	گؤ	دیاسلائی	کُرتا	نیند	بھلو	کہاں	بیاہ
اودھی	مہتاری	ہتھوا	پنیا	روٹی چپاتی	کُریا گھر	گیا	آگ کاڑی	انگا شلوکا	نینداس	نِیک بانکا	کےکیت	گون بیاہ
پوربی	آیّا	ہانت	پنیوا	پرتھنی	"	گئیو	دلاسلائی	شلوکا کُرتا	اونگھائی جھوپائی	بھل نِیک	کونے ٹھیان	بیاؤ
بہاری	مانا متاری	ہتوا	پانی	روٹی	گھر	گئیو	ماچس	فتوھی کُرتا	اونگھائی	نِی من	کہاں	بیاہ
بنگالی	ما	ہات	جول	رُٹی	باڑی باشا	گورو گائے	دےسلئی	پنجابی	گھوم	بھالو	کوتائے	بی اے
آسامی	آما	ہاتھ	پانی	روٹی	گھر	گائے گورو	ماچس	دورا	سوتنو	رامرو	کتا	بیاہ لگن

Marriage	Where	Good	Sleep	Shirt	Matches	Cow	House	Bread	Water	Hand	Mother	زبان
بیاہ	کُواڑے	بھولو	نِدّو	لُگا کمیجو	دیاس لئی	گورو	گھورو	ڑُٹی	پاڑیں	ہاتو	ماں	اُڑیہ
وِواھوں	اِنگے	نلّے	تونو	چوکائی	نڑپ پیٹی	آؤ	ووڑو	روٹی	تنّی	کےیی	آما	تامل
پینڑی	اکّاڑا	منچی	نِدرا	کمیزو	اگّی پٹّائی	آوو	اِلُو	رُٹّائی	نی رو	چےاِی	امّا	تلنگی
لَگنا	کُٹھے	چانگلا اُتم	جھوپے	کمیج	کانڈی	گاؤری	چھاپرا	باکھری	نِیر	ہاتھ	ائی	مرہٹی
لَگن	کِیاں	سارو	ہوؤ سوؤ	کھامیس	پیٹی دیو اسٹری	گائے	گِیر	روٹڑا	پانڑیں	ہاتھ	مَئی -با-	گُجراتی
بیاہ	کُترا	اُتم	نِدرا	*	*	گو	گری ہا	گودھم پِشٹک	باری	ہستو	ماتری	سنسکرت
شادی بیاہ	کہاں	اچھا	نیند	قمیص کُرتا	دیاسلائی ماچس	گائے	گھر	روٹی	پانی	ہاتھ	ماں	ہندستانی

اوپر کے نقشے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں : اول یہ کہ صرف کھڑی بولی' اودھی اور پوری بولیاں ہندستانی زبان سے بہت ہی قریب ہیں - دوسرے یہ کہ سنسکرت نہ صرف ہندستانی سے بہت دور ہے بلکہ اس میں ضروریات تمدن کی ان چیزوں کے نام نہیں ہیں جو اس زمانے میں موجود نہ تھیں ' نہ ہونا چاہیے- مثلاً ہم آج سے پہلے کے تمدن میں ریل' انجن' ریڈیو وغیرہ کے لیے الفاظ تلاش کریں تو سخت نادانی ہوگی - اس لیے سنسکرت میں دیاسلائی یا ماچس کے لیے کوئی لفظ نہیں اور نہ ہوسکتا ہے - کرتا یا قمیض بھی اس زمانے میں رائج نہ تھا - اس لیے لباس اور اس کے متعلقات کے لیے بھی الفاظ کا تلاش کرنا عبث ہے - وہ تو اتنا سادہ تمدن تھا کہ «توا» بھی شاید ایجاد نہیں ہوا تھا - غالباً مٹی کی ہانڈیوں میں کھانا پک جاتا تھا - یا سب سے زیادہ اتم خوراک دودھ گھی اور پھل تھے - اسی لیے روٹی کے لیے سنسکرت میں کوئی لفظ نہیں - اسے گون دھم (گندم) سے بنے ہوئے لیبشٹک (کھانے) کا نام دیا جاتا ہے - ممکن ہے کہ یہ گیہوں کا دلیا ہو جو گیہوں پیس کر گائے کے دودھ میں پکا لیتے ہیں - کاش ہماری زندگی پھر اتنی ہی سادہ اور نیچرل ہوسکے اور موجودہ تجارتی غلامی سے ہمیں بھی نجات ملے تاکہ دوسرے ملک بھی جو ہماری وجہ سے غلام ہیں انہیں بھی سانس لینے کا موقع ملے - تیسرے یہ کہ چند الفاظ ہندی بولیوں میں ایسے ہیں جو سنسکرت سے بہت دور ہیں - اور ان کے مقابلے میں فارسی سنسکرت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے - مثلاً (ماتری - مادر) (ھستو - دست) (باری - بارش) (گوندھم - گندم) (گو - گاو) (کت را - کجا) - ان لفظوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی چونکہ زندہ زبان ہے اس لیے اس نے سنسکرت الفاظ کو ترقی دے کر زیادہ سڈول اور قابل تلفظ بنادیا ہے - اس میں موجودہ تمدن کی ضروریات کے لیے بھی کافی لفظ ہیں اور بجائے سنسکرت کے فارسی کو اگر امدادی زبان یا پوشک بھاشا بنایا جائے تو زیادہ مناسب ہو -

اب ذرا ایک اور نقشہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ہندستانی زبان میں کس طرح ہندو اور مسلمانوں کا تمدن ممزوج ہوا ہے - یہ دنوں کے نام ہیں جو

سوائے ایک جمعہ کے لفظ کے کسی اسلامی ملک میں رائج نہیں ۔ اس کے علاوہ سوائے اتوار کے ہر لفظ کے ساتھ وار یا بار کا لفظ بھی ہندستانی سے خارج کردیا گیا ہے اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ترقی کرنے والی زبانوں کے عام قاعدے کے مطابق غیر ضروری اور بوجھل چیزوں کو صرف ہندستانی زبان نے چھوڑا ہے ۔ ذیل میں صرف چند ہندی زبانوں کا ہندستانی سے مقابلہ کیا گیا ہے ۔

ہفتہ کے دنوں کے نام

سیاروں کے نام پر	سورج کا دن	چاند کا دن	منگل کا دن	بدھ کا دن	برہسپت کا دن	شُکّر کا دن	سنیچر کا دن
عربی	یوم الاحد پہلا دن	یوم الاثنین دوسرا دن	یوم الثلاثاء تیسرا دن	یوم الاربعاء چوتھا دن	یوم الخمیس پانچواں دن	یوم الجمعہ	یومُ السبّت (سبت کا دن)
فارسی	یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنج شنبہ	آدینہ	شنبہ
پشتو	دہ اتبار اُرز	دہ گل اُرز دہ پیر ارز	دہ نہے اُرز	دہ شورو دہ بدہ	زیارت یادہ زیارت اُرز	دہ جمے اُرز	دہ خالی اُرز
پنجابی	ایت وار	سوم وار	منگل وار	بدھ وار	برہسپت وار	سُکّر وار جمعہ	سنیچر وار بار
گجراتی	روی وار	چھوم وار	منگر وار	بدھ وار	گرو وار	سُکر وار	سنی وار
بنگالی	روبی بار	سوم بار	منگل بار	بُدھ بار	لکھّی بار	شُکر بار	سونی وار
ہندستانی	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر

ہفتے کے دنوں کے ناموں کے مقابلے سے یہ چیز صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ ہندستانی اور یورپین زبانوں کے نام اجرام فلکی کے ناموں پر ہیں۔ یورپ کے بعض نام اس قدیم دیوتا پرستی کی یادگار ہیں جب وہ ان خاص دنوں میں بعض دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ عرب اور ایران میں بھی ایسے ہی نام رائج تھے۔ اسلام نے اس توہم پرستی کو ختم کردیا اور ہفتہ کو سات ہی دن کا باقی رکھا اور اتوار کو پہلا دن قرار دیا۔ اس طرح عربی میں یوم‌الاحد اور فارسی میں اس کا ترجمہ یکشنبہ ہوگیا۔ جو مسلمان بندے ماترم یا مہابھارت اور رامائن کی اساطیر میں بت پرستی پاتے ہیں انھیں حیرت ہوگی کہ ہندستان میں اکبر کے وقت سے مہینوں اور دنوں کے فصلی اور ہندستانی مشرکانہ نام مسلمانوں میں رائج ہیں اور اب تک کسی عالم دین نے اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا۔ ذیل میں مہینوں کے نام درج ہیں جو ہندستان کے مختلف حصوں میں مستعمل ہیں :—

عربی	فارسی	زنانے نام	پشتو	پنجابی	گجراتی	بنگالی	ہندستانی
محرم	اسفندیار	دھا	دہ‌حسن حسین میاشت	چیتر	چئیتر	چترو	چیت
صفر	فروردین	تیرہ‌تیزی	صفرہ	ویساکھ	ویشاکھ	بشاکھ	بیساکھ
ربیع‌الاول	اردی بہشت	بارہ‌وفات	وڑمبئی خور	جیٹھ	جیٹ	جیٹھ	جیٹھ
ربیع‌الثانی	خورداد	مدار	دریمہ خور	ہاڑ	اکھاڑھ	اساڑھ	اساڑھ
جمادی‌الاول	تیر	میران جی	دریمہ خور	ساؤن	سراون	سراون	ساون
جمادی‌الثانی	امرداد	خواجہ معین الدین	سلور امہ خور	بہادروں	بہادرو	بہادرو	بہادوں

رجب	شہریور	خدا	دہ خدائے مباشت	اسوں	آشو	آسین	کنوار
شعبان	مہر	شبرات	شوقدر	کتیں	کارتک	کارتک	کاتک
رمضان	آبان	رمضان	روزہ	مگھر	ماگھسر	اگھروں	اگھن
شوال	آذر	عید	وڑوکے اختر	پوہ	پوس	پوش	پوس
ذی القعدہ	دے	خالی	دہ خالی مباشت یا میانہ	مانگھ	مہا	ماگھ	ماگھ
ذی الحجہ	بہمن	بقرعید	اوئے اختر یا کہم اختر	پھگنڑ	پھاگنڑ	پھاگن	پھاگن

مہینوں کے ناموں کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عربی ناموں کے استعمال پر اہل ایران کو مجبور نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عربی نام قمری مہینوں کے نام تھے۔ رسول عربی نے قمری سال جاری کردیا تھا اور عربوں میں ہر سال چند روز بڑھانے کا قاعدہ منسوخ کردیا تھا۔ یہ قاعدہ ہندستان میں اب تک جاری ہے اور ماہرین فلکیات نجومی یا جوتشی تین سال میں ایک مہینہ «لوند» کا بڑھاکر قمری مہینوں کو شمسی سال کے برابر لے آتے ہیں۔ لیکن عربی سال کا انحصار موسم پر نہیں رہا اور عربوں نے بہت جلد محسوس کیا کہ ہمیں مالگزاری وصول کرنے کے لیے شمسی سال ہی کو رائج رہنے دینا چاہیے ورنہ کبھی ربیع کا موسم خریف میں آجاتا ہے اور کبھی ذی‌قعدہ میں اور وصول تحصیل میں فصل کا لحاظ نہیں رہتا۔ لہذا ایران میں ایرانی مہینے باقی رہے اور خود ہندستان میں جب مغلیہ سلطنت استوار بنیادوں پر قائم ہوگئی تو فصلی یا الہی سنہ اکبر نے رائج کردیا۔ افغانستان نے اب تک آسمان سے تعلق باقی رکھا ہے۔ جہاں دنوں میں تو سورج

چاند باقی نہیں رہے لیکن مہینوں کے نام بارہ برجوں کے نام پر حمل' ثور' جوزا' سرطان' اسد' سنبلہ وغیرہ جاری ہیں اور حیدرآباد میں ایرانی نام رائج ہیں۔

ان ناموں کے مقابلے سے ایک اور چیز معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں کی دنیا اب تک الگ ہے۔ مسلمان عورتیں مہینوں کے مخصوص نام استعمال کرتی ہیں جن سے ان کی مذہبیت اور پیر پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان ناموں کے ساتھ ایک پوری تاریخ وابستہ ہے۔ یہاں صرف یہ چیز قابل غور ہے کہ محرم' رجب' شعبان اور ذی‌العقدہ کے مہینوں کے نام پشتو اور ہندستانی عورتوں کی زبان میں بالکل ایک ہی ہیں اور پٹھانوں کا اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما سے گہرا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس ملک میں جیسی ضرورت ہوئی ویسا ہی مسلمانوں نے کیا اور ان جزئیات کی کبھی پروا نہیں کی کہ کوئی نام دیوتا سے تعلق رکھتا ہے' ستارہ پرستی ظاہر کرتا ہے یا اس سے پیروں اور اولیاؤں کے عرسوں کی تاریخیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معمولی معمولی باتوں میں اگر شرک و بت پرستی نظر آنے لگے تو دنیا سے بہت جلد اسلام کا وسعت تخئیل مٹ جائے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے اب تک من حیث القوم اس کا اندازہ ہی نہیں کیا کہ ہندستان کا اسلام ہندوؤں کے رسم و رواج اور فلسفہ سے کتنی دفعہ قریب آنے کی کوشش کرچکا ہے اور ہندو قدامت پرستی نے بھی کتنی دفعہ کبیر و نانک اور گوتم بدھ کی شکل میں ہندو جاتی کے بندھنوں کو توڑنے اور مذہبی جماعت کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علی الرغم شیخ و برہمن ہماری ہندستانی زبان اس کفر و اسلام کا اتحاد کامل ہے جو کسی بھی ترقی کرنے والی زبان کے لیے سرمایۂ فخر ہوسکتا ہے۔ اور اگر ہمیں ایک ہی سر زمین میں زندہ رہنا ہے تو ہمیں ایک دوسرے کے تمدن اور زبان کے زندہ پہلوؤں سے فائدہ اٹھائے بغیر چارہ نہیں۔ بخیال غالب ع

چھوڑونگا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا چھوڑے نہ خلق گر مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں دشنہ و خنجر کہے بغیر

اب میں صرف ایک اور نقشه دیتا هوں اور اس بحث کو ختم کرتا هوں۔ یه نقشه هندستانی گنتی کا دوسری زبانوں کی گنتیوں سے مقابله کرتا هے۔ اس پر صرف ایک نظر کافی هے اور یه بات ثابت هوجاتی هے که هندستانی گنتی دوسری گنتیوں کے مقابله میں لسانی نقطۂ نظر سے بهت سے ارتقا کے درجه طے کرچکی هے، زیاده صاف و ساده هے اور انٹر پراونشیل قرار پانے کی مستحق هے۔

مختلف زبانوں کی گنتی اور هندستانی

عدد	اُڑیه	سنسکرت	فارسی	پشتو	پنجابی	گجراتی	بنگالی	هندستانی
۱	کُٹے	ایکا	یکَ	یاؤ	اِک	ایک	ایک	ایک
۲	دوئی	دی	دو	دوا	دو	بے	دوئی	دو
۳	تِنّی	تری	سه	درے	ترے	تن تران	تین	تین
۴	چارو	چوتر	چهار	سلور	چار	چار	چار	چار
۵	پانجی	پنچا	پنج	پنزه	پنچ	پانچ	پانچ	پانچ
۶	چھوو	ششٹھا	شش	شپگ	چھے	چھو	چھوائے	چھے
۷	ساتی	شکتا	هفت	آوه	ست	سات	سات	سات
۸	آٹھو	اشٹا	هشت	آته	اٹھ	آٹھ	اشٹو	آٹھ

عدد	اڑیہ	سنسکرت	فارسی	پشتو	پنجابی	گجراتی	بنگالی	ہندستانی
۹	نوھو	نبا	نُہ	نہو	نو	نو	نوئے	نو
۱۰	دوسو	دش	دہ	لس	دس	دس	دوس	دس
۱۱	اگیارو	اکادشی	یازدہ	یاؤلس	یاراں	اگیار	اگارو	گیارہ
۱۲	بارو	دوادشی	دوازدہ	دوالس	باراں	بار	بارو	بارہ
۱۳	تیرو	*	سیزدہ	دیارلس	تیراں	تیر	تیرو	تیرہ
۱۴	چودو	*	چاردہ	سوارلس	چوداں	چود	چدو	چودہ
۱۵	پندرو	*	پانزدہ	پنزہ‌لس	پندراں	پندر	پندرو	پندرہ
۲۰	پوڑئے	*	بست	شل	وی	ویس	کوڑی	بیس
۳۰	*	*	سی	درش	تری	تریس	ترس	تیس
۹۰	*	*	نود	نوی	نبّے	نےوو	نبے	نوے
۱۰۰	*	*	صد	سل	سو	سو	ایک سو	سو

مختلف ہندیوں سے ہندستانی زبان کیسے بنی؟

اب تک ہم نے مختلف ہندیوں کے چند بنیادی الفاظ کا مقابلہ کیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ مختلف دیہات کی ہندیوں کو شہری زندگی نے سدھار کر انہیں رفتہ رفتہ ہندستانی بنا دیا۔ یہ ہندستانی زبان شمالی ہند کے شہروں کی زبان بن گئی اور اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی تمدن کے آنے سے پہلے مسلمانوں نے جو تمدن اختیار کیا تھا اس کی پوری جھلک ہندستانی زبان میں پائی جاتی ہے۔ اگر آپ مردم شماری کے اعداد ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف مختلف درباروں سے بلکہ عام طور پر شہری زندگی سے مسلمانوں کو زیادہ لگاؤ تھا۔ شہروں ہی میں شائستہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کی دلچسپیوں، صنعتوں، مشغلوں اور جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور جو چیزیں آپس کے میل جول سے پیدا ہوتی تھیں وہ ہندستانی تمدن کا جزو مشترک بن جاتی تھیں۔ آج بھی یہی ہورہا ہے اور شہری آبادی میں کراچی سے ڈھاکے تک اور پشاور سے حیدرآباد تک ہر جگہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ لہذا کسی مشترک زبان سے فارسی یا سنسکرت کے لفظوں کا نکالنا ناممکن ہے۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس زبان کے سمجھنے والے بہت کم لوگ رہ جائیں یا نئی زبان بنالیں لیکن یہ طریقہ ترقئی زبان کا نہیں بلکہ اپنی زبان کو قتل کرنے کا ہے اور ہندستان میں اس کا پہلے بھی تلخ تجربہ ہوچکا ہے۔

اردو یا ہندستانی کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ تذکرے تو متعدد موجود ہیں اور گرامریں بھی ہیں جو زیادہ تر سنسکرت، عربی یا انگریزی گرامروں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ لیکن اب ضرورت ہے کہ زبان کی خود داخلی شہادت پر زور دیا جائے اور اس طرح اس کی تاریخ، لغت اور گرامر مرتب ہو۔

مثلاً ہندستانی زبان کی تاریخ کے ایک پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی جاسکتی ہے کہ ہم غور کریں کہ مختلف ہندیوں کو کس طرح ایک دوسرے میں سمویا گیا۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص اودھی ہندی میں اپنے مکان کو گھر کہتا ہے اور دوسرا بنگالی ہے وہ باڑی کہتا ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی اس طرح کوشش کی کہ اودھ کا رہنے والا بھی گھر باڑی کہنے لگا اور بنگالی ماشا بھی گھر باڑی سے مکان کا مفہوم لینے لگے۔ معلوم نہیں ان مسافروں کی کوششوں اور میل جول کو کتنی صدیاں گزریں کہ آخرکار ایک ہی شے کے دو نام ایک جان دو قالب ہوگئے اور گھر اور باڑی سے "گھر بار" بن گیا۔

ایسے الفاظ حضرت امیر خسرو کے زمانے سے بہت پہلے بننے لگے ہوں گے اس لیے کہ خود ان کی زبان میں لفظوں کے یہ جوڑے ملتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس چیز نے اتنی ترقی کی کہ فارسی اور عربی زبان کے مترادف الفاظ کے جوڑے بھی بننے لگے اور عام طور پر اردو (یعنی ہندستانی) میں رائج ہوگئے اگرچہ خود فارسی یا عربی انشا پردازی میں اس کا وجود اس طرح نہیں ہے جیسا کہ ہندستانی میں ہے۔ یہ چیز بھی فارسی و عربی کے اثر سے ہندستان میں پیدا ہوئی صرف فرق یہ ہوا کہ واؤ عاطفہ بیچ میں سے گرا دی گئی۔

پھر یہ ہوا کہ بہت سے الفاظ فارسی اور عربی سے نکل کر ہندی لفظوں میں ضم ہوگئے اور ان کا اتنا گہرا تعلق ہوا کہ جب تک اس جوڑے کے دونوں لفظ نہ بولے جائیں زبان کا مزا نہیں آتا بلکہ گفتگو پھیکی سی رہ جاتی ہے۔ اردو (یعنی ہندستانی) اور دیہات کی ہندیوں میں امتیاز کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ الفاظ کے جوڑے جزو زبان بن گئے ہیں یا نہیں۔ ذیل میں ان جوڑوں کی ایک مختصر فہرست دی جاتی ہے۔

وہ جوڑے جن میں دونوں لفظ ہندی ہیں

بھائی بند	نائی باھمن	دن دھاڑے
گھر بار	ریل پیل	پکڑ دھر
مار پیٹ	دھان پان	پکڑ دھکڑ

بھاری بھرکم
لاڈ چاؤ
لاڈ پیار
مٹک جھٹک
سادھو سنت
اینٹ پتھر
گالی گلوچ
دھوم دھڑکا
سمجھ بوجھ
چال ڈھال
چال چلن
نک سک
سکھ چین
جھاڑو بہارو
چاؤ پیار
چاہ پیار
میل جول
مار دھاڑ
نوک جھونک

راج پاٹ
کپڑا لتا
لاٹھی ڈنڈا
گھڑی گھنٹہ
چِل پکار
ٹھوک بجا
پال پوس
بن سنور
جھاڑ پونچھ
نہا دھو
برچھی بھالا
آگ الاؤ
ساگ پات
مان دان
روکھی سوکھی
گھر دوار
مول بھاؤ
دھول دھپا
بھول چوک

اهیر گڈریہ
لون دھوپ
سنگ ساتھ
چھین اُچک
چور اُچکّا
چور چکار
دیو بھگوان
جنچا تُلا
کاٹ چھانٹ
بھاگ دوڑ
توڑ پھوڑ
لگی لپٹی
چھین جھپٹ
سوچ بچار
سوچ سمجھ
پوچھ کچھ
مل جُل

وہ جوڑے جن میں ایک لفظ هندی هے اور دوسرا فارسی

بال بچہ
جی جان

لچا شہدا
گانٹھ گرہ

خیر سلا
حکیم بید

خاک دھول
چنگل جھاڑا

میل محبت	دھن دولت	حقہ پانی	رنگ روپ
پیار محبت	پیر مرشد	رشتہ ناتا	رنگ ڈھنگ
نوکر چاکر	پیر پیمبر	راہ باٹ	جی ہاں
لونڈی باندی	جوڑی بخار	شادی بیاہ	جی حضور
لاؤ لشکر	جاڑا بخار	حلوا مانڈا	حکم حضور
ہاٹ بزار	ڈیرہ خیمہ	کام کاج	کاغذ پتر
راضی خوشی	راج دربار	عطر پھلیل	دانہ دُنکا
دکھ درد	ناک نقشہ	ناز نخرا	فقیر منگتا
بانہہ بازو	روگ مرض	حال چال	فقیر بھکاری
ریت رسم	تال سم	کرسی مونڈھا	شرم لاج
چاہ محبت	کڑوا زہر	میز تپائی	علم گیان
سان گمان	اولا برف	باگ ڈور	صبح سویرے
جوتی پیزار	اوڑھنی چادر	گور گڑھا	زیور گہنا
لاج شرم		شیر باگھ	بہادر سورما
ناچ رنگ		ذات پات	مست متوالا

وہ جوڑے جن میں دونوں لفظ فارسی یا عربی ہیں

یار دوست	راہ رسم	صبر شکر	رسم راہ
مال متاع	شرم لحاظ	چاق چوبند	رشک حسد
شرم حیا	عزت ابرو	عزت حرمت	دم درود
تن توش	زور شور	در دربار	دم خم
شال دوشالہ	وعظ نصیحت	وعظ پند	حرص ہوا
خواب خیال	ہو حق	صورت شکل	آہ و زاری
افسر حاکم	رسم رواج	غم غصہ	شان شوکت

شر فساد	شور غل	لیت لعل	پتہ نشان
شاد نادر	ہوش حواس	افرا تفری	صبح سحر

هندستانی گرامر

الفاظ کے نشوونما کے علاوہ همیں هندستانی گرامر کے ارتقا پر بھی ایک تقابلی نظر ڈالنی پڑے گی اور نئے سرے سے هندستانی گرامر کی تدوین کا کام کرنا هوگا۔ اس سلسلے میں دو چیزیں هندستانی گرامر میں ممتاز نظر آتی هیں۔ اول تو اسما کی جمع بنانے کے سماعی اور قیاسی طریقے۔ دوسرے تذکیر و تانیث کے قاعدے۔ افعال کی جمع سنسکرت میں نہیں هوتی۔ بنگالی اور بعض دوسری هندیوں میں بھی یہی چیز رائج هے۔ غالباً سب سے پہلے پشتو پھر پنجابی اور اس کے بعد کھڑی بولی یا برج بھاشا میں اور اسی کے ساتھ ساتھ دکنی اردو میں افعال کی جمع کا طریقہ رائج هوا۔ یہ طریقہ فارسی افعال کی پیروی میں کیا گیا هوگا۔ یا بہت ممکن هے کہ اور دوسرے اثرات هوں، همیں ان کی تحقیق کرنی هوگی اور اسما کی جمع کے سلسلے میں یہ چیز بھی نظر کے سامنے رکھنی هوگی۔ مثلاً

بہاری زبان میں « (میں جاتا هوں) اور (هم جاتے هیں) » دونوں کے لیے « هم جاتانی » کہتے هیں۔ (تو جاتا هے) کو « روّا جاتانی » وغیرہ۔ اُڑیہ میں (« ایک گھوڑا دوڑا ») کو « گٹے گھوڑا دوڑوچی » اور (« بہت سے گھوڑے دوڑے ») کو « انیک گھوڑا دوڑوچی » کہتے هیں۔ اسی طرح گجراتی میں (« ایک آدمی کھاتا هے ») کا ترجمہ هے « ایک مانس کھائے چھے » اور (« دو آدمی کھاتے هیں ») کو کہیں گے « دو مانس کھائے چھے » گویا افعال میں واحد جمع نہیں هے۔ لیکن پنجابی میں کھاتا هے کو کہیں گے (کھاندا هے) اور کھاتے هیں کو (کھاندے هیں)۔ اس لیے سوائے پنجابی اور کسی حد تک اودھی و پوربی کے جتنی هندی زبانیں هیں ان کے افعال کا ڈھانچہ بھی اردو (یعنی هندستانی) سے بالکل الگ هے اور هندستانی افعال میں واحد جمع کا داخلہ غالباً فارسی هی کے اثر سے هوا هے۔ لیکن لطف یہ هے کہ هندستانی افعال کی ایک یہ بھی خصوصیت هے

که اس میں تذکیر و تانیث بھی پیدا ہوگئی ہے جو نہ سنسکرت میں ہے نہ فارسی میں۔ ہاں بعض ہندیوں میں اس کا کسی کسی فعل میں وجود پایا جاتا ہے۔

ان چیزوں پر غور کرنے سے ہم اس ناقابل انکار نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ مختلف ہندیوں اور فارسی اور سنسکرت نے مل کر ہندستانی زبان کی گرامر اور لغت کو تعمیر کیا ہے۔ اس تعمیر میں سیکڑوں سال صرف ہوئے ہیں اور رفتہ رفتہ ہندستان کی مختلف بولیوں نے ایک ایسی عالی‌شان زبان بنائی ہے جس میں ہندیوں کی فطری سادگی اور لوچ، فارسی کی روانی و سلاست، عربی کا ایجاز و شکوہ اور سنسکرت کا ذخیرۂ الفاظ و طرز بیان سب کچھ شامل ہے اور اب تو یورپ کی سائنس بھی ہندستانی زبان کے سرمایۂ علم کو بڑھا رہی ہے اور اس بلند عمارت کی مختلف اینٹوں کو ہندستان کی مختلف قوموں کا تمدن ایک دوسرے سے پیوستہ کر رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ اگر کسی نے ایک اینٹ بھی الگ کرنے کی کوشش کی تو ہماری مشترکہ قومیت ہی نہ تباہ ہوجائے۔

بنیادی ہندستانی کے لوازم

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ شمالی ہندستان کے شہروں کی زبان جسے اب «ہندستانی» کہتے ہیں، ہندستان کی بولیوں میں سب سے بہتر ہے اور اس کا خزانۂ الفاظ اور گرامر اپنے دامن میں زندگی اور نشو و نما کی پوری قوتوں کو چھپائے ہوئے ہے، ہمیں دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو ایسی فہرست الفاظ تیار کرنا ہے جو بنیادی الفاظ پر حاوی ہو اور دوسرے ایسی گرامر تیار کرنا جسے پڑھ کر نہایت آسانی سے دوسرے صوبوں کے لوگ ہندستانی سیکھ سکیں۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ بنیادی ہندستانی کا کام سیکڑوں سال پہلے سے جاری ہے اور بہت کچھ ہوچکا ہے۔ لیکن یہ سمجھنے کے لیے کہ فی الحقیقت «بنیادی ہندستانی» ہے کیا اور اس کا مقصد کیا ہے، ہمیں ایک سرسری نظر بنیادی انگریزی (Basic English) پر ڈالنی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زبانوں کی کثرت ہمارے افتراق کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان ان علوم و فنون سے جو مخصوص اقوام کی میراث سے ہوگئے ہیں اس وقت تک فائدہ نہیں حاصل کرسکتا جب تک ان قوموں کی زبانوں سے واقف نہ ہو ۔ عام آدمی تو کیا خواص بھی سب علمی زبانوں سے واقف نہیں ہوسکتے ۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے یورپ میں کئی زبانیں ایجاد کی گئیں لیکن (آئڈو) (Ido) تو بہت جلدی ختم ہوگئی اور اسپرانٹو (Espranto) اپنا دم توڑ چکی ہے ۔ یہ دیکھ کر انگریزی زبان کے حامیوں نے اپنی سلطنت کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی عالمگیر بنانا چاہا اور آسان انگریزی کے آٹھ سو پچاس (850) لفظوں کو چُن کر ان کے استعمال کے قاعدے بنائے اور گرامر کے چند ایسے اصول منتخب کیے جو ان اقوام میں رائج کیے جاسکتے ہیں جن کی زبان کو انگریزی نہیں ہے ، لیکن وہ انگریزی کو ثانوی زبان (Secondary Language) کی طرح استعمال کرنے پر مجبور ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا موزوں ہوگا کہ بنیادی انگریزی ایک علمی طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے انگریزی نہ بولنے والی قوموں کو انگریزی سکھائی جاسکتی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش ہورہی ہے کہ خود انگریزی زبان بولنے والے ، یعنی انگلستان ، کینیڈا ، آسٹریلیا اور ریاستہاے متحدہ امریکہ والے بھی تین ہزار لفظوں میں اپنے خزانہ لغت کو محدود کرلیں ۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں اور عام آدمیوں کے حافظہ پر غیر ضروری اور مشکل الفاظ کا بار نہ ہوگا اور عام لٹریچر کے سمجھنے کے لیے پندرہ بیس ہزار لفظوں کے یاد کرنے سے بچ جائیں گے ۔ گویا یہ کوشش ہے کہ انگریزی زبان کو دنیا کی زبان بنانے کے لیے ساڑھے آٹھ سو لفظوں سے کام لیا جائے اور معیاری انگریزی (Standard English) کے لفظوں کی تعداد بھی گھٹائی جائے تاکہ علوم و فنون سے عوام بھی بقدر ضرورت فائدہ حاصل کرسکیں ۔

اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوگی ، اس کا جواب مشکل نہیں ۔ مشرقی اقوام کا تمدن کچھ ایسا ہے کہ یوروپین تمدن سے میل نہیں کھاتا ۔ یہاں کی بعض زبانیں بھی اتنی

ترقی‌یافتہ ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ دوسری زبان اختیار کریں۔ خود ہندستانی زبان اتنی ہمہ‌گیر ہے کہ انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری یورپین زبانوں کو ہندستانی بنالیتی ہے اور اپنی گرامر کی وسعت پر ناز کرتی ہے اور جہاں تک یورپ اور امریکہ کا تعلق ہے وہاں خود ایسی زندہ زبانیں موجود ہیں جو انگریزی کو حاوی ہونے کا موقع نہیں دے سکتیں۔

اب بنیادی ہندستانی کا مفہوم کسی قدر واضح ہوگیا ہوگا؛ اسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) بنیادی ہندستانی وہ زبان ہوگی جو ہندستان کے ایسے صوبوں کی بین صوبجاتی (Inter Provincial) زبان بن سکے جہاں ہندستانی رائج نہیں ہے۔ اس کا کام وہی ہوگا جو آج کل انگریزی سے لیا جارہا ہے یعنی حکومت کی بھی زبان ہے اور عام کاروبار میں اس کا بول بالا ہے۔ بنیادی ہندستانی کو آٹھ نو سو لفظوں میں محدود کر کے اس کی تدریجی ریڈریں بنانی ہوں گی اور اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ جو لفظ منتخب کیے جائیں وہ مختلف ہندی بولنے والے لوگوں کی زبانوں میں زیادہ رائج ہوں لیکن معیاری ہندستانی میں پہلے سے موجود ہوں اور ایسے ہوں کہ ان کے ذریعہ سے ہم ہندستانی زبان میں پانچ چھے ہزار محاورے بناسکیں اور معیاری ہندستانی کے دس بارہ ہزار لفظوں کا کام لیا جاسکے۔

(۲) بنیادی ہندستانی میں عام سائنس کے وہ لفظ جو ہر شعبۂ سائنس میں استعمال ہوتے ہیں منتخب کرنے ہوں گے۔ ان کی تعداد سو سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ اسی طرح ہر مخصوص سائنس Special Science کے پچاس پچاس لفظ منتخب کرنے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ہم کسی مخصوص سائنس مثلاً کیمسٹری یا ستارا نامی (نجوم) کے متعلق کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہیں تو عام سائنٹفک الفاظ کے ساتھ پچاس لفظ مخصوص کیمسٹری یا ستارا نامی کے ملاکر ڈیڑھ سو علمی اصطلاحوں کے ساتھ آسانی سے کام چلاسکتے ہیں۔

(۳) بنیادی ہندستانی کی ایک گرامر ہو جو معیاری ہندستانی کے اصولوں کو ملک ہندوستان کی دوسری ہندیوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی جائے اور خصوصیت سے ان چیزوں کو سمجھائے جو دوسری ہندیوں کی گرامروں میں نہیں ہیں مثلاً اصول تذکیر و تانیث، جمع بنانے کے قاعدے اور مرکبات اضافی و توصیفی وغیرہ۔ اور جہاں تک نحو اور عروض کا تعلق ہے وہ تقریباً کل ہندیوں میں ایک ہی ہے۔

آٹھ نو سو لفظوں کے جمع کرنے کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ کام اس طرح ہوسکتا ہے کہ آسان اور روزمرہ کی ہندستانی میں سے چند صفحوں کی تحریر کو سامنے رکھا جائے اور حروف تہجی کے سلسلہ سے لفظوں کی فہرست اور ہر لفظ کے استعمال کی تعداد لکھ لی جائے اور پھر بیسک انگلش کے لفظوں سے ان کا مقابلہ کیا جائے؛ اس طرح ہمیں معلوم ہوسکے گا کہ کون کون سے لفظ ضروری ہیں۔ پھر ان ہندستانی لفظوں کی فہرست سے جو بنگالی، اودھی، پنجابی، گجراتی اور پشتو وغیرہ میں رائج ہیں ان کا مقابلہ کیا جائے اور مشترک الفاظ کی فہرست بنالی جائے۔ اس طرح بنیادی انگریزی کے مقابلے میں بنیادی ہندستانی کا کام زیادہ آسان اور مستقل بنیادوں پر ہوگا اس لیے کہ نہ صرف ہندستان کی مختلف زبانوں میں ہزاروں لفظ مشترک ہیں بلکہ گرامر کے قواعد بھی ملتے جلتے ہیں۔ اور جو کام بیسک انگلش والے ہزار سال میں کریں گے وہ کام چند مہینوں کی محنت سے ہمارے سامنے یہ بات ظاہر کردے گا کہ ہندستان میں بنیادی ہندستانی سیکڑوں سال سے بن رہی ہے اور اس کا بہت کچھ کام ہوچکا ہے۔

میں نے آٹھ نو سو لفظوں کی ایک فہرست تیار کرلی ہے۔ لیکن جب تک اسی طرح مختلف ہندیوں اور ہندستانی کے جاننے والے آزادانہ فہرستیں نہ تیار کریں گے اور بحث و نظر کے بعد ایک متفقہ فہرست تیار نہ ہوگی، صرف ایک فہرست کا ملک میں رائج کرنا ضروری نہیں اور میں اسے مفید بھی نہیں سمجھتا اس لیے کہ جب تک مقبولیت کی سند کسی موقر ادارے یا جماعت کی طرف سے نہ دی جائے اس وقت تک ایسی کوششیں جلد کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

ان الفاظ کی فہرست بنانے کے سلسلے میں میرے سامنے جو خاص چیز آئی وہ یہ ہے کہ بنیادی ہندستانی کے بعض الفاظ بالکل بنیادی انگریزی سے مل جاتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو سنسکرت سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں یا عربی سے یعنی ہماری روزمرہ کی ہندستانی میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں الفاظ کی تلاش میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ لفظ خالص ہندستانی ہوں، خواہ وہ انگریزی، سنسکرت اور عربی سے قریب ہوں یا نہ ہوں۔ مثلاً نیچے لکھے ہوئے لفظ اگرچہ انگریزی زبان کے بنیادی لفظوں سے قریب ہوجاتے ہیں لیکن چونکہ ہندستانی میں رائج نہیں ہیں لہذا ان کا یہ ترجمہ صحیح نہ سمجھنا چاہیے:

انت	End	صوت	Sound
بد	Bad	باسَن	Basin
برادر	Brother	بندی	Point
دوار	Door	یوَن	Young
جرائم	Crime	طال	Tall
نوا	New	گاؤ	Cow
پد	Foot	سوریہ	Sun

ہاں اگر ایسے الفاظ جو ہندستانی میں عام طور پر رائج ہوگئے ہیں اور دوسرے لفظوں کے مقابلے میں وہ انگریزی زبان سے زیادہ قریب ہیں تو ان کو اپنی زبان میں ضرور شامل کرلینا چاہیے تاکہ ہندستانی زبان نہ صرف انٹرپراونشل ہو بلکہ انٹرنیشنل ہوجائے۔ مثلاً نیچے لکھے ہوئے لفظ انگریزی سے بہت قریب ہیں اور ضرور بنیادی ہندستانی میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں:—

بیری	Berry	برش	Brush
دراز	Drawers	درجہ	Degree
گانٹھ	Knot	گروہ	Group
ہاتھ	Hand	گاڑی	Carriage
لب	Lip	کنگھی	Comb
اوپر	Over	نشان	Sign

Receipt	رسید	Able	قابل
Bazar	بازار	Vizier	وزیر
Cough	کف	Voice	آواز
	Grip	گرفت	

اسی طرح بنیادی انگریزی میں جن لفظوں کو انٹرنیشنل قرار دیا ہے ان میں سے اکثر ہندستانی زبان کے علاوہ ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی رائج ہوگئے ہیں۔ مثلاً الکحل، الومینیم، بنک، چک، سگرٹ، کلب، کافی، انجنیر، گیس، ہوٹل، نکل، میم، پارک، پاسپورٹ، فونوگراف، پیانو، پولس، پروگرام، پروپاگنڈا، ریڈیو، رسٹوران، ٹیکسی، ٹیلیگرام، ٹیلیفون، تھیٹر، تمباکو، یونیورسٹی وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اور بہت سے انٹرنیشنل اسما ہیں جو ہندستانی زبان میں بطور انٹرپراونشل اور انٹرنیشنل الفاظ کے شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہمیں علوم (Sciences) کی اصطلاحوں کے لیے طے کرنا ہوگا کہ بنیادی عام اصطلاحیں براہ‌راست یورپین زبانوں کی رکھی جائیں یا کچھ یورپین ہوں اور کچھ ہندستانی۔

اگر ہندستان کی کوئی موقر مجلس علمی اس کام کو انجام دینے کا ذمہ لےسکتی اور ملک کے زبان دانوں کے مشورہ سے بنیادی ہندستانی کی لغت اور گرامر مرتب کرسکتی تو انفرادی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے کام ہوسکتا اور اس کے بعد ملک کی زبانوں اور بولیوں میں ان کتابوں کا ترجمہ آسانی سے ہوسکتا اور تھوڑی سی کوشش میں ہندستانی زبان شہروں سے قصبات اور قصبات سے دیہات تک پہنچ جاتی۔ پھر ہم فخر سے کہہ سکتے کہ پورے ہندستان کی زبان ہندستانی ہے۔

عربوں کی نثر

از

مولوی عبداللطیف اعظمی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

عربی زبان کی دو قسمیں ہیں شمالی اور جنوبی ۔ شمالی زبان حجاز اور نجد میں بولی جاتی تھی ۔ اسے لغت مضر یا لغت عدنان کہتے ہیں ۔ جنوبی زبان یمن کے جنوبی علاقوں میں رائج تھی؛ اسے لغت حمیر کہا جاتا ہے ۔ یہ دونوں زبانیں آپس میں اس قدر مختلف تھیں کہ انہیں با آسانی دو زبانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ لسان حمیر کے عروج کا زمانہ عیسی علیہ السلام کی پیدائش تک ختم ہوگیا اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا دائرہ محدود ہوتا ہوگیا یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی میں صفحۂ ارض سے معدوم ہوگئی۔

عربی زبان کی یہ دو قسمیں در اصل اس لیے ہوئیں کہ عربی قوم دو مختلف شاخوں میں تقسیم ہوچکی تھی ۔ ایک عدنان سے اپنی نسبت جتاتے تھے، دوسرے اپنے کو قحطان شمار کرتے تھے ۔ عدنان اور قحطان کا باہمی تعصب عربی تاریخ پڑھنے والے پر مخفی نہیں ۔ اس وقت لسان حمیر کا وجود آثار قدیم کے کتبوں کے سوا کہیں نہیں مل سکتا ۔ قدوم اسلام سے سو برس پیشتر عربی زبان مختلف لہجوں میں منقسم تھی ۔ انہیں اختلافات کا یہ اثر ہے کہ مرادف الفاظ کی اتنی کثرت دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی اور اگر حالت ایسی ہی باقی رہتی اور عکاظ کا بازار گرم نہ ہوتا تو آج عربی زبان متعدد چھوٹی چھوٹی زبانوں میں منقسم نظر آتی ۔ یہ سوق عکاظ ہی کا احسان ہے کہ قریش کی زبان دوسرے قبائل کے لہجوں پر غالب آگئی اور تمام عرب نے ان کی زبان کو ایک معیاری زبان تسلیم کرلیا ۔ چونکہ عکاظ، حجاز کے وسط

میں واقع ہے اور قریش کی سیادت کو تمام قبائل پہلے سے مانتے تھے اس لیے عکاظ کے میلوں میں دوسرے قبائل کے شعرا آتے اور ان کی زبان کے مطابق اپنے لہجوں کی اصلاح کرتے۔ لیکن عربی زبان پر سوق عکاظ کا اتنا احسان نہیں ہے جتنا کہ قرآن کریم کا ہے۔ ایک عیسائی ادیب سلیمان بستانی کے الفاظ میں یوں لکھتا ہے:

"اس (قرآن) نے زبان کو آج تک محفوظ اور زندہ رکھا اور قیامت تک اس کی بقا کا ضامن ہے۔ ورنہ عربی زبان بھی سریانی، عبرانی اور سنسکرت کی طرح مٹ جاتی[1] قرآن کریم کے اس احسان کو جرجی زیدان اور دوسرے غیر مسلم مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔

جب ہم اقوام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نثر سے قبل عموماً شعر وجود میں آتا ہے کیونکہ قومیں جب اپنے ابتدائی دور میں ہوتی ہیں تو اپنے آلام و مصائب، مسرت و شادمانی اور جذبات و تاثرات کو نظم کے ذریعے ادا کرتی ہیں لیکن جب ان کی اجتماعی زندگی ترقی کر جاتی ہے، وہ میدان عروج میں گامزن ہوتی ہیں اور ان کے افکار و خیالات میں تغیّر و تنوّع پیدا ہوجاتا ہے تو وہ مجبور ہوتی ہیں کہ کسی اور چیز کے ذریعے انھیں ادا کریں کیونکہ ان تمام چیزوں کو شاعری کے ذریعے ادا نہیں کیا جاسکتا؛ اس وقت نثر وجود میں آتی ہے۔ مثلاً یونانیوں کو لیجیے۔ ان میں سب سے پہلے قصصی شاعری پیدا ہوئی، اس کے بعد غنائی، پھر تمثیلی۔ نثر اس وقت وجود میں آئی جب یونان اور مشرقی و جنوبی اقوام کی کشمکش سے سیاسی ہیجان پیدا ہوا، اجتماعی زندگی نے کروٹ بدلی، سیاسی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات میں انقلاب ہوا اور مسائل حیات اس قدر متنوّع ہوگئے کہ شاعری میں وہ کسی طرح سما نہیں سکتے تھے۔

یہی حال رومانی قوم کا بھی نظر آتا ہے اور بعینہ یہی حال عربوں کا ہے۔ ان میں سب سے پہلے شاعری پیدا ہوئی اور ایک مدت کے بعد نثر نے جنم لیا۔ نثر کب پیدا ہوئی؟ اس کے متعلق علمائے ادب میں اختلاف ہے۔ عام طور پر خیال ہے کہ

---

۱ مقدمہ الیازہ

نثر کا وجود بہت قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے اور طلوع اسلام تک اس نے اس قدر ترقی کرلی تھی کہ قرآن کریم جیسی نثر کی کتاب ان کے سامنے پیش کی جاسکے۔ مگر بعض علمائے ادب کو اس سے اختلاف ہے۔ ان میں مشہور مستشرق ولیم مرسیہ William Marcia اور ڈاکٹر طه حسین کو اہمیت ہے[1] ڈاکٹر طه حسین نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد جاہلیت میں نثر کا مطلق وجود نہیں تھا، بلکہ عہد رسالت کی پیداوار ہے اور پہلا نثر نگار ابن المقفّع فارسی تھا[2] ان کی دلیل یہ ہے کہ عرب جاہلیت ابتدائی دور Primitive میں تھے جس میں کسی قوم میں نثر پیدا نہیں ہوتی کیونکہ نثر عقل کی ترقی کے زمانہ میں وجود میں آتی ہے۔

لیکن یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ یہ علمائے ادب جس عہد کو عربوں کا دور اول کہتے ہیں وہ پانچویں صدی بعد مسیح ہے۔ اس وقت عرب کے قرب و جوار کی قومیں مثلاً ایرانی، ہندستانی، مصری اور یونانی وغیرہ کے یہاں نثر کا وجود ملتا ہے بلکہ پانچویں صدی قبل مسیح سے بھی ان کے یہاں نثر کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے کہ عرب تہذیب و تمدن اور خصوصاً ادب میں اس قدر پیچھے تھے کہ پانچویں صدی بعد مسیح بھی ان کے یہاں نثر وجود میں نہیں آئی؟۔

حالات و قرائن پر غور کرنے اور تاریخ ادب عرب کے مطالعہ کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ طلوع اسلام سے قبل عربوں کے یہاں نثر موجود تھی۔ اس کی تائید قرآن حکیم سے بھی ملتی ہے کہ عرب جاہلیت کے پاس مذہبی اور ادبی کتابیں موجود تھیں۔

---

۱ مرسیہ کے خیالات معلوم کرنے کے لیے اس کی کتاب Revue Africaine—Nos. 330 & 331 (Ier & 20 trimestres) 1927 اور ڈاکٹر طه حسین کے خیالات معلوم کرنے کے لیے ان کی کتاب شوقی و حافظ اور المجمل ملاحظہ فرمائیے۔

۲ طه‌حسین کو نہ صرف جاہلی زمانہ میں نثر کے وجود سے انکار ہے بلکہ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں امریکن یونیورسٹی (الجامعةالامریکیة) میں انھوں نے اپنے ایک لکچر میں یہ بھی فرمایا کہ پہلی صدی ہجری میں بھی نثر کا وجود نہیں تھا اور نہ کوئی اہم اجتماعی کتاب تھی، صرف شاعری ہی شاعری تھی۔

وَ مَا کُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ کِتَابٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۔ (عنکبوت)

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا، اپنے داہنے ہاتھ سے، (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت یقیناً یہ جھوٹے شبہ کرتے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ظہور اسلام سے قبل کتابیں موجود تھیں جنھیں لوگ پڑھتے تھے اور آنحضور جب گزشتہ اقوام کے حالات بیان کرتے تو کفار سمجھتے کہ انھیں کتابوں کو پڑھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ کتابیں نثر میں رہی ہوں گی نظم میں بھی رہی ہوں گی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ صرف نظم ہی میں تھیں، نثر میں نہیں۔ اسی طرح اس آیت سے "لکھنے" کا بھی وجود ثابت ہوتا ہے تو کیا وہ صرف نظم ہی لکھتے تھے اور رسائل اور خطب جو عربوں کی قدیم مشہور چیزیں ہیں، نہیں لکھتے تھے؟ اور اگر ایسا نہیں تو بتلایا جائے کہ یہ رسائل اور خطبے نثر میں تھے یا کسی اور چیز میں؟

مرسیہ نے ایک مرتبہ (سنہ ۱۹۲۷ء میں) مشہور اہل قلم، ڈاکٹر ذکی مبارک سے پوچھا کہ "اگر عہد جاہلیت میں نثر کا وجود ہوتا تو اگر سب نہیں تو کچھ حصہ تو ہم تک پہنچتا، جس طرح ہندستان، ایران اور روم کی قدیم نثر کے آثار کتابی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں" تو موصوف نے جواب دیا کہ "ان آثار کا فقدان اس بات کے انکار کے لیے کافی نہیں ہے کہ عہد جاہلیت میں نثر موجود نہیں تھی، اگر کوئی اور کتاب نہیں تو قرآن تو موجود ہے جو جاہلی نثر کا نمونہ ہے[۱]"۔

جو لوگ عہد جاہلیت میں نثر کے وجود سے انکار کرتے ہیں، انھیں غالباً اس وجہ سے دھوکا ہوا کہ اگر نثر موجود ہوتی تو ہم تک یقیناً پہنچتی، وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ نہ پہنچنے کے اسباب ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ جس طرح ہندستانی، رومی اور ایرانی قدیم قوموں کی نثر زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی اسی طرح عرب جاہلیت کی نثر کو بھی محفوظ رہنا چاہیے تھا حالانکہ اس طرح غور کرنا اصولی غلطی ہے۔ ہر قوم اور ہر زمانے کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور نتائج و عواقب،

۱ النثر الفنی ص ۳۴

حالات اور ماحول کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ دور جاھلیت کے بعد جس دور سے عربوں کو سابقہ پڑا، وہ ان اقوام سے بالکل مختلف تھا۔ گو اس کے محفوظ نہ ہونے کے اسباب یہ بھی ہیں کہ جہالت بہت زیادہ تھی، پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابت کی آسانیاں نہیں تھیں اور نہ عام تھی، تدوین کا رواج بہت کم تھا لیکن سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ طلوع اسلام کے بعد یکایک عربوں کو انقلابی دور میں داخل ہونا پڑا، ان کی اجتماعی زندگی ایک ایسے ماحول اور حالات سے دو چار ہوئی جو ایام جاھلیت سے بالکل مختلف تھی، اس کی تابانی اور روشنی اس قدر تیز تھی کہ اس کے مقابلے میں تمام چیزیں ماند پڑگئیں۔

ایام جاھلیت میں نثر کے وجود پر اس سے بھی دلیل ملتی ہے کہ قرآن نثر کی پہلی کتاب نہیں ہوسکتا۔ قرآن کی مخاطب یقیناً ایسی ہی قوم ہوسکتی ہے جو بہترین زبان اور بہترین نثر کی حامل ہو، ایسی قوم کبھی نہیں ہوسکتی جو نثر سے قطعی ناواقف ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اسے سمجھنے سے ناواقف ہوتے بلکہ اس سے انکار کردیتے۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا، انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ ایسی زبان ہے جس سے ہم بالکل نابلد ہیں بلکہ انھوں نے اس کی خوبیوں کی داد دی، اس کی فصاحت و بلاغت کی تحسین کی اور اس کے مقابلے کی کوشش کی۔

جو لوگ وحیِ خداوندی کی تاریخ اور کیفیت سے واقف ہیں وہ یہ تسلیم کریں گے کہ جب کوئی پیغمبر کسی قوم میں مبعوث کیا جاتا ہے تو وہ اسی قوم کی زبان بولتا ہے اور اسی قوم کی زبان میں اس کا پیغام ہوتا ہے تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں اور اس پر عمل کرسکیں اگر ایسا نہ ہو تو رشد و ہدایت کی راہ میں بہت سی مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ اصول میرا آپ کا بنایا ہوا نہیں ہے، خود قرآن کا ہے:

وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلاَّ بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ۔　(ابراھیم)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی، تاکہ ان کو سمجھا سکے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین ان لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ جو شاعری دور جاہلیت کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ منحول ہے یعنی وہ جاہلی شاعری نہیں بلکہ اسلامی شاعری ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں شاعری موجود تھی اور نہایت عمدہ۔ تو کیا جس طرح وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر عہد جاہلیت میں نثر موجود ہوتی تو اس کے آثار باقی رہتے یا بقول خلیل مطران[1] اس قدر کم نہ ہوتی کہ ایک چھوٹے سے مجموعہ میں آجائے، یہی اعتراض ان پر نہیں کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں کہ شاعری سینہ بسینہ محفوظ رہ سکتی ہے اور نثر "سفینہ" کی محتاج ہے جس کے ضائع ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ ٹھیک جس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ امرأ القیس کے قصیدے کو دیکھ کر ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس سے پیشتر یقیناً نہایت ترقی‌یافتہ شاعری موجود تھی، یہ پہلا قصیدہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً قرآن سے قبل نثر کا وجود تھا، یہ نثر کی پہلی کتاب نہیں ہوسکتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ معترضین حضرات قرآن کو نثر کی کتاب ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین کا قول ہے:—

ان القرآن لا ھو شعر و لا ھو نثر و انما ھو القرآن

بالکل یہی خیال ولیم‌مرسیہ کا بھی ہے بلکہ النثر الفنی کے مصنف کا خیال ہے کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اسی کے خیال سے استفادہ کیا ہے۔ مرسیہ اپنی ایک فرانسیسی تصنیف میں لکھتا ہے کہ:—

"On est done fonde a refuser a la langue du Coran le nom de prose au sens plein et strict du not."

جس کا انگریزی میں ترجمہ یہ ہوگا کہ:—

"One is therefore entitled to deny to the language of the Qoran the name of 'prose' in the full and strict sense of the word."

یعنی جہاں تک لفظ "نثر" کا تعلق ہے، اس کے پیش‌نظر قرآن کی زبان کو نثر نہیں کہا جاسکتا۔

---

۱ النثر الفنی صفحہ ۳۳

مگر ان چند لوگوں کے علاوہ علمائے ادب نے عام طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ قرآن نثر کی کتاب ہے، اس پر مبسوط مضامین لکھے گئے ہیں اور معترضین کے مدلل جوابات دیے گئے ہیں۔ بہر نوع یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ قرآن نثر کی کتاب ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کے یہاں نثر موجود تھی اور ایرانیوں اور یونانیوں کے اختلاط سے قبل وہ بہترین ادب اور لٹریچر کے حامل تھے۔

اسلام ایک انقلاب عظیم تھا، اس نے قدیم نظام کی جگہ جدید نظام پیش کیا، اس نے عربوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی جو اس سے قبل بالکل مفقود تھی، اجنبی قوموں کو اسلام میں داخل کرکے مختلف قسم کی تہذیبوں کو آمیزش کا موقع دیا، اس انقلاب نے ان کی اجتماعی زندگی کو بالکل بدل دیا، وہ ایک ایسے دور سے دو چار ہوئے جس سے بالکل ناآشنا تھے۔

اس کے بعد ممالک فتح ہوئے، اجنبی اقوام سے اختلاط پیدا ہوا۔ اس آمیزش نے زندگی کے ہر پہلو پر اثر ڈالا، عربوں کو ان اجنبی قوموں کے افکار و آرا سے واقفیت پیدا ہوئی۔ ان کے مذاہب، ان کے علوم اور ان کے فلسفے سے واقف ہوئے اور آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہوئے، اس سے مسائل حیات میں تغیر ہوا، موضوعات تفکر میں اضافہ ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں نہ صرف تغیر ہوا بلکہ انقلاب ہوا۔ ذخیرے میں اضافہ، تعبیر میں توسیع، تخیل میں ترقی اور نظر میں وسعت پیدا ہوگئی؛ دین کے عقائد، سلطنت کے قوانین، تمدن کی ضروریات، علوم کی اصطلاحات، جدید چیزوں کے اسما، مناظر تمدن کی تصویر کشی وغیرہ کا اضافہ ہوا، الفاظ مہذب، اسالیب ترقی یافتہ اور زبان صاف ہوگئی۔

قرآن کی بلاغت، احادیث نبوی کی فصاحت نے زبان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور زبان اپنے تنگ دائرے سے نکل کر مذہب اور حکومت کی زبان ہوگئی۔

سب سے بڑا انقلاب جو ہوا وہ یہ تھا کہ ان کو نثر کے نئے نمونے سے سابقہ پڑا جو ان کے دماغ میں اچھی طرح مرتسم ہوگیا اور ان کے زبان و قلم پر بالکل مستولی

ہوگیا - یہ قرآن مجید تھا جس میں تشبیہ و تمثیل کی باریکی' اجمال وتفصیل' بلاغت و فصاحت اور جدید اسلوب تھا - انھوں نے اس کا بالارادہ یا بلا ارادہ تتبع کیا اور ان کی زبان اس کے قالب میں ڈھلتی گئی' ایک طرف اس نے زبان کا ذخیرہ بڑھایا' تعبیر کا دائرہ وسیع کیا' دوسری طرف اس کی خاطر نئے علوم وضع ہوئے جو عام زبان کے لیے عام طور سے مفید اور ضروری ہیں - نحو' صرف اور اشتقاق لحن دور کرنے کے لیے' معانی و بیان اور بدیع اس کا اعجاز ثابت کرنے کے لیے' لغت اور ادب اس کے غریب الفاظ کی شرح کے لیے اور حدیث و اصول' فقه و تفسیر' اس سے احکام شریعت استنباط کرنے کے لیے وضع کیے گئے جنھوں نے عربی زبان میں بیش از بیش اضافه کیا اور عربی زبان کو دنیا کی سب سے بڑی اور مدون زبان بنا دیا -

دوسری طرف رسول‌اللہ صلعم زبان کے مجتہد اور امام تھے' آپ کے کلام میں نئے نئے اسالیب کلام اور مذاهب بیان' تراکیب اور اصطلاحات ہوتی تھیں جس سے زبان کا خزانه مالامال ہوگیا' بہت سی ضرب‌الامثال' محاورے اور تعبیرات خالص آپ کی ایجاد ہیں -

خلافت کے ساتھ ہی ساتھ کتابت (نثرنگاری) اور خطابت نے ترقی کی - عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے زمانے میں دفتر کی زبان عربی ہوگئی اور اس سے زبان کی عمومیت اور اس کے ذخیرے میں بہت ترقی ہوئی - خلافت بنو امیه میں انشا نے ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی تھی - اس وقت کا طرز نگارش حسب ذیل تھا:

الفاظ میں شیرینی' تراکیب میں شان اور اسی کے ساتھ اختصار اور سادگی ہوا کرتی تھی' متکلم کے کلام اور واحد کے خطاب میں جمع کی ضمیریں استعمال نہیں ہوتی تھیں' « بسم‌اللہ » سے ابتدا ہوتی تھی' اس کے بعد « من فلان الی فلان » یا « انی احمد اللہ الذی لا الہ الا ہو » لکھتے تھے اور « والسلام » یا « السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ » پر ختم کرتے تھے - ولید نے کچھ تکلف کیا جس کی وجه سے کچھ دنوں کے لیے اس کا رواج جاتا رہا' پھر اس سے زیادہ شروع ہوگیا اور عبدالحمید نے تو اس کو ایک مستقل فن بنا دیا اور اسے بہت ترقی دی - خلاصه یه که نثر نے چالیس برس

میں دین کی برکت سے ترقی کی بہت بڑی مسافت طے کی اور اس کے سامنے جاهلیت کی رسم کی کوئی چیز باقی نہیں رهی۔ نسبۃً شعر سے نثر نے اسلام سے زیادہ فائدہ اٹھایا اس لیے کہ اسلام کو اس کی ضرورت زیادہ تھی۔

عبدالحمید بن یحیی انشا پردازی کا مجدد بلکہ موجد اور اس فن کا امام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالحمید سے نثر نگاری کی ابتدا هوئی اور ابن عمید پر ختم هوگئی۔ اس نے نثرنگاری کو بہت ترقی دی، بہت سی اصلاحات کیں اور اس کے عہد میں انشا ایک مستقل فن اور ایک شریف پیشہ بن گیا، اس نے اس کے خاص اصول اور قواعد مقرر کیے، نئے اسالیب بیان وضع کیے، تفنن اور تنوع اختیار کیا، سیاسی اور اجتماعی حالات نے اس کی مساعدت کی اور سلطنت کی ضروریات، زمانے کی ترقی اور ذوق کی تبدیلی نے اس کی قدردانی اور همت افزائی کی۔ عبدالحمید پہلا شخص هے جس نے رسائل میں طوالت اور تصانیف میں حمد کی ابتدا کی۔ اس کے رسائل بہت بلیغ هوتے تھے۔ ابن ندیم کا بیان هے کہ اس کے رسائل ۸ هزار صفحات سے کم نہ هوں گے مگر هم تک اس کا بہت کم حصہ پہنچا هے۔ کتب‌خانہ خدیویہ میں ایک مختصر قلمی نسخہ هے جو عبدالحمید کی طرف منسوب هے۔

خطابت کی ترقی کے اسباب میں اسلام کو بہت بڑا دخل هے۔ عہد اسلام میں خطیبوں نے بڑی خدمات انجام دی هیں۔ دینی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اصلاح مفاسد، رد بدعت اور لشکر کو جنگ کے لیے آمادہ کرنا اور جوش دلانے کے لیے هر موقع پر خطابت کی ضرورت تھی اور خصوصاً حضرت عثمان کی شہادت کے بعد اور سیاسی اختلافات کے وقت خطابت نے بڑی ترقی کی۔ حقیقت میں خطابت کا دور سقیفہ بنی ساعدہ سے شروع هوتا هے۔ هر جماعت کو قدم پر قدم خطابت کی ضرورت پڑتی تھی اور خوب خوب زبان کے جوهر دکھلانے کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ طبعی طور پر اس دور میں جو سیاسی، ملکی اور دینی انتشار کا زمانہ تھا، کثرت سے باکمال خطیب پیدا هوئے۔ اس وقت کی خطابت کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:—

شیر ینی الفاظ، پختگئ اصول، قوت تاثیر، قرآن سے کثرت سے اقتباسات اور وزن و سجع میں حتی الوسع اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے اور حمد و صلوۃ سے شروع کرتے ۔ خطابت کا طریقہ اس وقت تک ایام جاہلیت ھی کا تھا ۔ عمامہ باندھنا، چھڑی لینا، بلندی پر کھڑے ھوکر تقریر کرنا وغیرہ پر سختی سے پابندی کی جاتی تھی ۔

حقیقت میں اسلام کا کوئی دور خطابت میں اتنا بلند تھا اور نہ اس کثرت سے خطبا پیدا ھوے جتنے اس دور میں تھے۔ اس دور کے مشہور خطبا سحبان بن وائل، زیاد بن امیہ، حجاج بن یوسف، فطری بن فجاۃ وغیرہ تھے۔

عہد اسلام میں رسائل کو بھی اچھی خاصی ترقی ھوئی ۔ تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں بہت زیادہ خطوط لکھنے پڑتے تھے ۔ یہ رسائل عموماً مختصر ھوتے تھے وہ لکھتے وقت محض مقصد پیش نظر رکھتے، سادے سے سادے الفاظ اور مختصر سے مختصر عبارت میں وہ اپنا مطلب ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ عبارت آرائی نہیں ھوتی تھی، جملے چھوٹے چھوٹے ھوتے تھے۔

تمدنی اور علمی حیثیت سے بنو عباس کا زمانہ ترقی یافتہ دور کہلایا جاسکتا ھے ۔ یہ اسلامی فنون، عربی ادب اور اجنبی علوم کی گرم بازاری کا عہد تھا ۔ اس وقت عربی دماغ بھی بہت پختہ اور ترقی یافتہ ھوچکا تھا، حکومت عباسیہ اور دولت امویہ سے چند باتوں میں بالکل ممتاز ھے، جس کی اثر سے زبان محفوظ نہ رہ سکی ۔ دولت امویہ خالص عربی سلطنت تھی ؛ اس میں پوری عربیت، عربی عصبیت اور عربی خصوصیات اور رنگ موجود تھا ۔ اس کا دارالسلطنت بھی دمشق جیسی مرکزی جگہ پر تھا اور اس کے لشکر میں اعلی سردار سے لے کر معمولی سپاھی تک سب عرب تھے اس لیے زبان میں تمدن اور آبادی کے بڑھ جانے سے جو اثرات پیدا ھوسکتے تھے اور اس کے لازمی نتائج تھے، ان کے سوا کوئی انقلاب نہیں ھوا ۔

حقیقت میں بنو امیہ نے اپنی عربی خصوصیات، قومی روایات اور زبان کے ترکہ و میراث کی پوری حفاظت کی، اس لیے اس کا دور عربیت کے لیے مبارک ترین دور ثابت ھوا ۔ لیکن اس کے برخلاف دولت عباسیہ پر ایرانی رنگ غالب تھا اور یہ سیاسی

حالات کے لازمی نتائج تھے اس لیے عجمیوں کا تسلط اور ان کا اثر نہ صرف سیاست میں بلکہ تمدن میں، زبان میں اور ادب میں پورا پورا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چند نئی چیزیں پیدا ہوئیں یعنی قومی تاثیر، اختلافات عقائد، الحاد، بےحیائی اور تکلفات ان چیزوں کا اثر زبان و ادب پر بہت خاصا پڑا۔

دولت امویہ کے اواخر اور سلطنت عباسیہ میں عربی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی، مذہبی، علمی اور سیاسی زبان بن چکی تھی اور تقریباً تمام ممالک مفتوحہ متعرب ہوچکے تھے۔ اس لیے طبعاً لحن زبان میں عام ہوگیا اور عجمیت کی وبا عام ہوگئی، یہاں تک کہ ایک مستقل عامی زبان بن گئی جس میں خاص ملک کی زبان کے الفاظ رائج تھے۔

عصر عباسی میں زبان کا دائرہ تمدن اور نئی علمی ترقیوں اور تحقیقوں کی بنا پر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اس میں کثرت سے فارسی، ہندستانی اور یونانی زبانوں کے الفاظ داخل ہوگئے اور مذاق کی لطافت اور سہولت کی وجہ سے الفاظ میں دقت پیدا ہوتی گئی، علمی اصطلاحات، انتظامی اور سیاسی، اقتصادی اور خانگی الفاظ کا اضافہ ہوا۔ عربی زبان سے فارسی زبان نے صرف مفردات ہی نہیں لیے بلکہ اسالیب بھی اخذ کیے، خطاب میں تعظیم، مخاطب کے ساتھ تکلف اور حضرت اور جناب اور مجلس کی طرف نسبت کرنا اور خلفا، وزرا، امرا اور افسروں کے نئے نئے القاب، خطوط وغیرہ طویل اور مترادف الفاظ سے بھرے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اور دوسری چیزیں ہیں جنھوں نے ایک طرف زبان کو زینت دی تو دوسری طرف اسے سخت نقصان پہنچایا۔ سنہ ۲۳۲ھ سے عربی کی رہی سہی سلطنت اور فوقیت جاتی رہی اور ترکوں کا زور ہوگیا۔ اس نے طبعی طور پر عربوں کو نقصان پہنچایا، تاتاریوں کے بغداد پر حملے نے تو اس کا خاتمہ ہی کردیا ہوتا لیکن قرآن نے اُس وقت سے لےکر اِس وقت تک پوری حفاظت کی۔

عباسیوں کی ترقی کے زمانے میں بہت سی چیزیں نئی پیدا ہوئیں اور نثر کو مرصع اور مزین بنانے کے طریقے نکلے۔ اس کے نئے نئے موضوع پیدا ہوئے، اب وہ

صرف دفاتر، خطوط اور فرامین کی زبان نہیں رہی بلکہ تصنیف و تالیف، مضامین ومقالات، معاہدے، وصف مناظر اور مختلف ضرورتوں اور تقریبوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔ اب انشا کو وہی اہمیت حاصل تھی جو خطابت کو حاصل تھی۔

عصر عباسی کی ابتدا میں نثرنگاری عبدالحمید ہی کے طرز نگارش پر رہی جس کی خصوصیت اختصار اور اعتدال ہے۔ تمدن اور ایرانیوں کے ساتھ اختلاط نے تانق اور تکلف بڑھا دیا یہاں تک کہ قدیم اسلوب بالکل متروک ہوگیا اور مسجع، اشعار اور ضرب‌الامثال کا استعمال عام ہوگیا لیکن ابھی تک لفظی تکلف رائج نہیں ہوا تھا۔ خلافت کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ نثرنگاری میں بھی زوال شروع ہوا اور سادہ نثر لفظی صنائع و بدائع میں الجھ کر رہ گئی۔ بظاہر شاندار و بارونق مگر حقیقت میں قالب بےروح اور جسم بےجان تھی۔ علمی اور تاریخی کتابیں بھی اس وبا سے نہ بچ سکیں۔ اس وقت سے نثر کا وہ مبتذل اور بےجان طریقہ نکلا جس نے طبیعتوں کو مضمون کو اور پڑھنے والوں کے مذاق کو خراب کردیا۔ اس زمانے کے لکھنے والوں میں چار طبقے تھے جن میں ہر طبقہ ایک ایک زمانے میں کامیاب تھا۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا امام ابن‌المقفّع ہے۔ اس کی خصوصیات میں عبارت کئی طریقوں سے ادا کرنا، جملوں کو علیحدہ علیحدہ کرنا، روانی کا خیال رکھنا، مضمون کا اہتمام کرنا اور سجع سے اجتناب کرنا، وغیرہ ہے۔

دوسرا طبقہ جس کا امام جاحظ ہے، اس کا طریقہ پہلے طریقے سے یعنی عبارت کی شیرینی اور روانی وغیرہ میں بہت مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک جملے کو مختلف مقفّی یا مرسل فقروں میں قطع کردیتا ہے، الفاظ اور جملوں میں زیادہ طول ہوتا ہے، حکمت کے ساتھ ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی ہے، مضمون کی تحلیل اور اس کا استقصا ہوتا ہے، دعائیہ جملے کثرت سے آتے ہیں، اس طبقے میں ابن قتیبہ، مبرّد اور نوری مشہور ہیں۔

تیسرا طبقہ ابن‌العمید کا ہے۔ اس کی نثر بظاہر دل‌آویز معلوم ہوتی ہے اور اچھی خاصی نظم ہوتی ہے، صرف وزن کی کمی ہوتی ہے، چھوٹے چھوٹے قافیے اور مجانست

تاریخی و علمی لطائف، چٹکلے، اشعار اور تشبیہات اس کے لوازم میں سے ہیں۔ اس طبقہ میں صاحب ابن عباد، مہلبی، خوارزمی، بدیع‌الزماں، صابی و ثعلبی مشہور ہیں اور اسی طبقہ کی یادگار «مقامات» ہے۔

چوتھا طبقہ قاضی فاضل کا ہے۔ اس کا طریقہ تیسرے طریقے کے اصول کا پابند ہے لیکن توریہ اور مجانست میں بہت غلو ہے یہاں تک کہ انشا اس کے زمانے میں بالکل ملمع، مصنوعی اور الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

اس وقت کے ذوق کے مطابق سب سے زیادہ جاحظ، ابن مقفّع کا دور اور ان دونوں سے زیادہ ابن خلدون کا طرز انشا ہے اور قاضی فاضل کے بعد سے ابن خلدون کا تتبع کیا گیا چنانچہ اس وقت کی عربی نثر سب سے زیادہ ابن خلدون اور غیر زبانوں کی نثر سے متاثر ہے۔

خطابت کی دولت عباسیہ کی ابتدا میں بہت کچھ اہمیت اور حیثیت تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کو زوال ہوتا گیا اور اس کی جگہ انشا نے لے‌لی۔ یہاں تک کہ صرف عیدین اور جمعہ کے خطبے باقی رہ گئے، وہ بھی محض رسمی۔

مقالات گارساں دتاسی

ہندستانی زبان و ادب

سنہ ۱۸۷۳ع میں

۱ - «سال نو نے گزرتے ہوئے برس کی جگہ لے لی ہے۔ ہماری زندگی کے دن بھی یوں ہی گزر رہے ہیں اور ہم ان کی رفتار دیکھ نہیں سکتے» یہ ہماری محبوب پیرسی عشائے ربانی کے خطبۂ نوروز کے ابتدائی الفاظ ہیں۔ وقت حقیقت میں تیزی سے گزر رہا ہے کیونکہ یہ بائیسویں مرتبہ ہے[۱] کہ میں جدید ہندستان کی خاص زبان «ہندستانی» کے متعلق «سالانہ تنقید» پیش کررہا ہوں۔ یہ زبان باوجود مخالفتوں اور رد عمل کے اب تک اپنی افضلیت برابر برقرار رکھے ہوئے ہے اور دن بدن زیادہ پھیلی جاتی ہے۔ جن دو شاخوں سے یہ زبان مرکب ہے ان میں سے اردو کو ہمیشہ سے اولین حیثیت حاصل ہے۔ دیکھیے کہ مسٹر جان بیمز (John Beames) جو صوبۂ اڑیسہ کے ناظم تھے اپنی کتاب «ہندستان کی جدید آریائی زبانوں کے تقابلی قواعد[۲]» میں اس کے متعلق کیا کہتے ہیں :—

---

۱ میرے ابتدائی تبصرے سنہ ۱۸۶۹ع تک «خطبات» کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ میں نے پہلے دس خطبوں کی فہرست یکم دسمبر سنہ ۱۸۶۲ع کے خطبے میں دی ہے اور اس کے بعد کے سے سولھویں خطبے تک کی فہرست' سولھویں ہی میں یعنے ۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ع کے خطبے میں۔ آخری خطبات سنہ ۱۸۶۸ع اور سنہ ۱۸۶۹ع کے ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۷۰ع سے «تبصرے» شروع ہوئے۔ پہلا خطبہ محاصرہ پیرس کے زمانے میں دکن میں شایع ہوا۔ بعد کے تبصرے سنہ ۱۸۷۱ع اور سنہ ۱۸۷۲ع کے ہیں اور ان کے بعد یہ۔

۲ "A comparative Grammar of the modern Aryan Languages of India" جلد اول۔ اس جلد پر ایک بہت دلچسپ مضمون لکھنؤ کے ہندستانی اخبار «اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ» کی اشاعت یکم اپریل سنہ ۱۸۷۲ع میں شایع ہوا ہے۔

ان زبانوں کی صف اول میں ہندی اور اس کی ضمنی شکلوں، گجراتی اور پنجابی کو جگہ دینا چاہیے۔ ان کی پیدائش کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی ہے اور ان کا تعلق دوسری جدید زبانوں کی طرح واضح طور پر پراکرت سے ہے۔ اس کے بعد مرہٹی کی باری آتی ہے جو بارھویں یا تیرھویں صدی تک پراکرت کی شکل میں رہی اور بالآخر اُڑیا کہ جس نے چودھویں صدی تک اپنی شکل پوری طرح نہیں بدلی تھی۔ اٹھارھویں صدی تک بنگالی آزاد زبان نہ بن سکی۔ جب تک دھلی میں مسلمانوں کی مرکزی قوت کمزور ہوتے ہوتے اس درجہ پر نہ پہنچ گئی کہ صوبجات کے گورنر خود مختار ہوگئے تب تک بنگالی ہندی سے جدا نہ ہوسکی اور نہ وہ رسم‌الخط اختیار کرسکی جو آج ایک مختلف زبان ہونے کی حیثیت سے اپنا حق سمجھ کر اس نے انتخاب کیا ہے۔ سندھی زبان بڑے پُر اسرار طریقے پر پیدا ہوئی اور نشو و نما پاتی رہی۔

زبانوں کے اس مجموعے کے مستقبل کے متعلق پیشین‌گوئی کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کا پورا دارومدار سیاسی حالات پر ہے جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر بھی اگر تھوڑی بہت قیاس آرائی کی جائے تو اس کا امکان نظر آتا ہے کہ ذرائع آمد و رفت ریل گاڑیوں اور دوسرے ذرائع حمل و نقل کی بڑھتی ہوئی افراط کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجابی اور راجپوتانے کی بولیاں معدوم ہوجائیں گی اور بجائے ان کے ایک یکساں سی زبان عام طور پر اختیار کرلی جائے گی یعنی فارسی آمیز ہندی (ہندستانی) جو دریائے سندھ سے لےکر راج محل تک ہمالیہ سے لےکر بندھیاچل تک رائج ہوجائے گی۔ بنگال کے ایک بہت بڑے حصے میں ہندستانی عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے[1]۔ اُڑیسہ اور مرہٹی علاقوں میں ان لوگوں کی تعداد (ان میں اکثر کا تعلق نیچ ذاتوں سے ہے) جو اردو استعمال کرتے ہیں بہت وافر ہے اور دن بدن اس تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر صوبجات کی علیحدگی کی وجہ سے جو رکاوٹ ہے وہ دور ہوجائے اور ملک کے مختلف حصوں میں آزاد ذرایع آمد و رفت کا رواج

---

۱ مشرقی بنگال کے بڑے مرکزوں، ڈھاکہ، چٹاگانگ، باریسال میں بنگالی سے زیادہ ہندستانی بولی جاتی ہے (Annales de la propagation de la for شمارۂ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع)۔

ہوجائے تو اردو وہی جو اس قدر صاف، سادہ، لطیف زبان ہے، جو ہر طرح کی بات کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو اب بھی حقیقت میں ہندستان کے بہت سے حصوں میں «لنگا فرانکا» کا کام دیتی ہے اور جو فاتح قوم کی خاص چہیتی ہے، بلاشک ایک ایسی زبان نظر آتی ہے جو جلد یا بدیر ہندستان کی صوبجاتی بولیوں میں سب کی نہیں تو اکثر کی جگہ لے لےگی اور پورے آریائی ہند کو ایک متجانس اور مہذب بولی عطا کرےگی[1]۔

مسٹر بیمز کی کتاب پر ایک مضمون میں مسٹر جی۔ گاریز (G.Garrez) نے یہ تشریح کی ہے۔ «مسٹر بیمز کے ہندی کے متعلق وہی خیالات ہیں جن کا ایم گارساں دتاسی ہمیشہ اظہار کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے سنسکرت دانوں کے تعصب کو چھیڑا ہے، یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ مسلمان شاعروں کی زبان بھی اتنی ہی خالص ہے جتنی کہ ہندو شاعروں کی زبان اور اسلامی رسم‌الخط دیوناگری رسم‌الخط سے زیادہ سہل ہے اور اردو کو فی‌الحقیقت ہندستان کی قومی زبان بننے کا زیادہ موقع اور زیادہ حق حاصل ہے»۔

مشہور مسلمان سید احمد خان نے بنارس میں ایک دعوت میں جو انھوں نے اپنے آزاد خیالات کے لحاظ سے اپنے مسلمان اور عیسائی دوستوں کو اپنے صاحبزادے کی انگلستان سے واپسی پر ۲۶ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع کو دی تھی، اپنے جام صحت کی تجویز کا جواب اردو ہی میں دیا تھا[2]۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ اس قسم کی صحبت جمع ہوئی تھی مگر توقع ہے کہ یہ آخری موقع نہ ہوگا۔ پہلے تو جس کے لیے یہ دعوت کی گئی تھی اس نے اپنے سفر انگلستان کا حال بیان کیا جس سے کئی چیزوں کے متعلق اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے ہندستان اور انگریزوں کے اتحاد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا—ایسا اتحاد جو اس کے خیال میں سیاسی سے زیادہ سماجی اہمیت رکھتا تھا۔ اس قسم کا اتحاد بہت آسانی سے ممکن ہے اگر دونوں میں سے

---

۱ یہ دیباچۂ جلد اول صفحۂ ۱۲ سے ماخوذ ہے («اخبارالاخیار» مورخۂ ۱۵ اگست سنہ ۱۸۷۳ع نے اس عبارت کا ترجمہ کیا ہے اور اس رائے سے کامل اتفاق کیا ہے)۔

۲ علیگڑھ اخبار ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ع۔

ھر ایک دوسرے کی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اس تقریب کے لیے مواقع اتحاد کے لیے سہولتیں فراھم کرتے ھیں اور ھندستانیوں کو اپنے فاتحوں اور حاکموں سے نہیں بلکہ اپنے ایسے دوستوں سے ملنے کا موقع دیتے ھیں جو ان کی طرح اسی بادشاہ کے وفادار ھیں۔

ھم عصروں میں فیض علی خان[1] قابل ذکر ھیں جنھوں نے اسی یک جہتی کے جوش میں یہ تحریک پیش کی ھے اور اس تحریک میں بہت سے انگریز بھی ان کے ھم خیال ھیں کہ اگر ھندستان میں انگریزی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے، جیسی کہ بعض اصحاب کی رائے ھے تو اس کے ساتھ انگریزوں کے لیے بھی ھندستانی کی تحصیل لازمی مقرر کی جائے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ لندن میں ایک خالص کالج قایم کیا جانا چاھیے جہاں متعدد منشی نوجوان انگریزوں کو نہ صرف نظری بلکہ عملی طور پر ھندستانی کی تعلیم دیں اور اس طرح کہ وہ روزمرہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور بےتکلفی سے بات چیت کرسکیں۔ ان کے خیال میں اس کی بھی ضرورت تھی کہ عام علوم سے متعلق ایک انگریزی ھندستانی ڈکشنری تیار کی جائے اور سستے داموں ھندستان کے شہروں اور قصبوں میں بیچی جائے تو اس کا اثر بہت مفید ھوگا۔

سر ولیم میور کو ان خیالات سے اتفاق ھے۔ طامسن کالج رڑکی میں جو سول انجنیرنگ کی تعلیم کے لیے پچیس سال سے قایم ھے، اپنی تشریف آوری کے موقع پر، ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع کو انھوں نے اردو زبان میں طلبا کو اپنے اسی مشفقانہ اور پرمغز انداز تقریر میں مخاطب کیا جس کے ھندستانی خوگر ھیں اور جس کی وجہ سے وہ ان سے محبت کرتے ھیں[2]۔ اس سال ۱۲ جنوری کو جو دربار انھوں نے آگرے میں علاقہ کی باریابی کے لیے کیا اس میں بھی یہی عمل کیا[3]۔ یہ تقریر میرے خیال میں سب سے زیادہ اھم ھے کیونکہ اس میں مسئلہ تعلیم نسواں کا ذکر ھے، ان عورتوں کی تعلیم کا جو زنانے کی دیواروں میں دنیا سے اس طرح پوشیدہ ھیں کہ یورپ کے

---

۱ Allen's Indian Mail ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع

۲ علیگڑھ اخبار ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع

۳ علیگڑھ اخبار ۲۱ فروری سنہ ۱۸۷۳ع

کسی حصے میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی »۔ تقریر کے خاتمے پر انھوں نے کہا کہ جب تمھاری عورتیں تعلیم حاصل کرلیں گی اور حقیقت میں تمھاری شریک زندگی اس طرح بنیں گی کہ انھیں بھی وهی مرتبه حاصل هوجائےگا جو تہذیب یافته ممالک میں عورتوں کو حاصل هے تو ان کا فیض هندستان میں اس طرح پھیلے گا جیسے همالیه کی برف پگھل کر ندیوں کی شکل میں بہنے لگتی هے اور ایک نئی زندگی اختیار کرتی هے۔ بغیر اس انقلاب کے دوسری جنس هرگز سماجی زندگی میں اعلے درجے تک نہیں پہنچ سکتی۔

کچھ دن کے بعد ۲۴ جنوری کو به سلسله تقسیم انعامات «ساں اے تین کالج» میں جسے مشنریوں نے «روم ایشیائی» یعنی دهلی میں قایم کیا هے اور جس میں تقریباً ایک هزار طلبا اور طالبات زیر تعلیم هیں، سر ولیم نے ریورنڈ آر آر ونٹر کے سپاس نامے کا جواب دیتے هوئے اپنے اعلیٰ خیالات کا اردو هی میں اظہار فرمایا[1]۔

هندی کے متعلق اخبارالاخیار مورخه ۱۵ نومبر ۱۸۷۲ ع سے همیں اطلاع ملی که آئنده سے اضلاع متوسط هند میں دفاتر اور عدالتوں میں بجائے اردو کے هندی سے کام لیا جائےگا اور سرکاری گشتیاں بھی اسی زبان میں نکلا کریں گی۔ بجز سرکاری رپورٹوں اور رجسٹریوں کے فارسی رسم‌الخط بالکل استعمال نہیں کیا جائےگا۔ اس تبدیلی کے بعد ان اضلاع میں جہاں اس رجعت پسندانه طرز عمل کا اقدام کیا جائےگا غالباً نئے صیغه‌دار مقرر کیے جائیں گے۔ سرکاری حکم سے اس قسم کی تبدیلی دارجلنگ میں اور بنگال میں بھی هوئی هے۔

« صحیفه‌نگار نے یه بھی لکھا هے که هندستان میں آج کل یه مسئله درپیش هے که ناگری یا دیوناگری رسم‌الخط هندستانی زبان کی تحریر کے لیے فارسی رسم‌الخط سے زیاده موزوں هے۔ کامیابی کا سہرا اس سوال کے اثباتی جواب کے سر هے اور ابھی سے تبدیلی شروع هوگئی هے۔ فارسی حروف کی بجائے ناگری حروف کے استعمال کی وجه یا سچ پوچھیے تو بہانه[2] یه پیش کیا جاتا هے که اول‌الذکر کے حروف شکسته

۱ علی‌گڑھ اخبار ۳۱ جنوری سنه ۱۸۷۳ ع۔

۲ یه حقیقت میں بہانه هے کیونکه ناگری کے قلم‌برداشته حروف کے پڑھنے میں خط شکسته سے زیاده دقت هوتی هے۔

پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور اس لیے مناسب ہے کہ اب ہم دیوناگری کا استعمال شروع کردیں—اس بدشکل اور بےوضع رسم‌الخط کا استعمال جو مدتوں سے متروک ہے۔»

اخبار عالم میرٹھ (مورخۂ ۱۴ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع) نے بھی اسی مضمون پر اسی قسم کی اطلاع شائع کی ہے۔ «ایک عام مباحثے میں اس سوال پر بحث کی گئی کہ کون سی زبان اور کون سا رسم‌الخط بہتر ہے۔ اکثریت کا فیصلہ یہ تھا کہ ہندی زبان اور ناگری حروف زیادہ موزوں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ ناگپور میں جوڈیشل کمشنر کے حکم سے سرکاری تحریرات کی زبان ہندی اور رسم‌الخط ناگری ہوگیا۔ لفٹنٹ گورنر نے پریسیڈنسی کے کچھ اور اضلاع کے متعلق بھی یہی حکم صادر کیا ہے۔» اسی رد عمل کے اثر میں ایک عرضی صوبجات شمالی و مغربی میں بھی شایع کی گئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ عدالتوں میں بجائے فارسی کے ناگری رسم‌الخط کو رواج دیا جائے۔ قدرتی طور پر اس تحریک کی بانی ہندو جماعت ہے۔ بابو ہریش‌چندر نے بھی اپنے «کوی بچن سدھا»[1] میں پانیر[2] کے ایک بہت ہی اچھے مقالے «جس میں اردو کی حمایت کی گئی ہے»—کے ایک ایسے جواب کو جگہ دی ہے جس میں سخت حملے کیے گئے ہیں اور جو محض اپنے مبالغے کی وجہ سے واہیات معلوم ہوتا ہے۔

اس کے برعکس دوسری طرف علیگڑھ اخبار[3] جو کچھ لکھتا ہے وہ بھی سنیے:

«ان لوگوں کے لیے جو ہندستان کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہوئے پوری قوت سے یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ ناگری رسم‌الخط اختیار کیا جائے، بہتر ہوگا کہ صوبجات شمال مغربی کی تعلیمی رپورٹ کے ضمیموں کو پڑھ لیں۔ وہ دیکھیں گے کہ اس صوبے کے آٹھ ضلعوں میں ان طلبا کی تعداد جو فارسی حروف استعمال کرتے ہیں ناگری حروف استعمال کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ان اضلاع میں عام طور پر فارسی حروف استعمال کیے جاتے ہیں اور ان کی تبدیلی کی کوئی خواہش نظر نہیں آتی»۔

---

۱ شمارۂ ۸ اگست سنہ ۱۸۷۳ع۔
۲ شمارۂ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع۔
۳ شمارۂ ۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۳ع۔

سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا اخبار[۴] یہ اطلاع دیتا ھے کہ پٹنہ اور بہار کے دیگر مقامات کے رھنے والوں نے سرکار میں ایک عرضداشت پیش کی ھے جس میں یہ استدعا کی گئی ھے کہ ھندستانی (فارسی) حروف کی بجائے ناگری حروف استعمال کرنے کے جو احکامات جاری کیے گئے ھیں واپس لے لیے جائیں۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ اس عمل سے کاروبار میں رکاوٹ ھوئی اور نقصان پہنچا اور اس کے نتائج سے جو زحمتیں پیش آئیں وہ عرصے تک محسوس ھوتی رھیں گی[۱]۔ اسی لیے اس مبحث پر کوئی یہ توجیہ پھر نہیں پیش کرسکتا کہ یہ فی‌الحقیقت اردو زبان کی جگہ دوسری زبان کو جانشین کرنے کا سوال نہیں ھے بلکہ محض دوسرے رسم‌الخط کا سوال ھے۔ منشی کاشی‌ناتھ[۲] اور فاضل پنڈت ھریش‌چندر نے بھی اسی قسم کی توجیہیں پیش کی ھیں۔ منشی‌جی اس مبحث پر لکھتے ھیں کہ[۳] «اردو اور ھندی زبانیں حقیقت میں ایک ھیں کیونکہ سنسکرت کے دقیق اور ناقابل فہم الفاظ سے عاری ھندی اور عربی و فارسی کے مقبول الفاظ سے خالی اردو میں کوئی فرق نہیں۔ اس زبان کو اردو کہیے یا ھندی جو آپ کا جی چاھے مگر فی‌الحقیقت یہ محض وھی عام زبان ھے، ادعا سے خالی، مردہ یا بیرونی زبانوں سے ماخوذ، مگر صوبۂ شمالی و مغربی کی پوری آبادی میں رائج۔ میں اردو یا ھندی کی کسی اور تعریف کو سمجھنے یا ماننے کے لیے تیار نہیں ھوں۔ اس سے ھمیں کوئی بحث نہیں کہ اردو کب پیدا ھوئی۔ مصنفین دھلی کی قدیم تصانیف نظم و نثر آج ھندی سمجھی جاتی ھیں جو فارسی رسم‌الخط میں لکھی گئی ھے......»۔

یہ اصلی ھندی جو محاورۂ عام میں ناگری کہلاتی ھے ھرگز ھندستانی اردو کی مترادف نہیں جو ھندستان کے بہت سے بڑے بڑے صوبوں کی مادری اور خاص زبان ھے اور جس کو کم و بیش ھندستان کی آبادی[۴] کا بڑا حصہ بول سکتا ھے، وہ تمام لوگ جنھوں نے اس خوبصورت سرزمین کی سیاحت کی ھے اس کے متعلق یہی بیان پیش کرتے ھیں۔

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ع۔ ۲ علیگڑھ اخبار ۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

۳ ھریش‌چندر میگزین شمارۂ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ع صفحۂ ۱۱۔ ۴ آخری مردم شماری کی رو سے چھیاسی ملین رعایائے سرکار انگریزی میں اور پچپن ملین دیسی ریاستوں میں۔ سیلون اور سنگاپور کا اس میں شمار نہیں۔

ہندستانی زبان فرانسیسی مقبوضات ہند میں بھی اسی طرح استعمال ہوتی ہے جیسے ہندستان کے باقی حصوں میں - پان‌دی‌شیری میں تامل اصل میں ہندوؤں کی زبان ہے - مسلمانوں کی زبان ہندستانی ہے اور سپاہی بھی اس کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں بولتے - شاہی کالج میں بھی اس کی تعلیم دی جاتی ہے جب سے کہ سنہ ۱۸۲۶ع میں فرانسیسی افسر ہند متعینۂ «اسمبلی ناسیونال» کے والد کاونٹ دے بے سیں د ریش موں نے اس کی بنیاد ڈالی - یوژین سیسے نے پیرس میں میرے درس میں شریک ہونے سے پہلے پان‌دی‌شیری ہی میں ہندستانی سیکھی تھی - وہیں مسٹر پال دگواردی (جو اب عدالت اپیل پاؤ میں مشیر قانونی ہیں) اور مسٹر ریو (جو کمبرلے میں مفصلات کے مصنف ہیں) نے بھی یہ زبان سیکھی تھی - دونوں اس میں بے تکلفی سے گفتگو اور نوشت و خواند کرسکتے ہیں - محض پان‌دی‌شیری اور مدراس کے درمیان ریل جاری کرنے کا سوال باقی ہے، مدراس میں ہندستانی عام طور پر استعمال کی جاتی ہے اور اس طرح فرانسیسی نوآبادی میں یہ زبان زیادہ اہمیت حاصل کر سکے گی اگر ان دونوں شہروں کا باہمی تعلق بڑھ جائے -

سر بارٹل‌فریر نے جن کے افریقی مشن نے بصد دقت سلطان زنجبار و زنگ‌بار سید احمد برگش سے انسداد بدسلوکی حبشیان[1] کا عہدنامہ حاصل کرکے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، بڑے تعجب سے یہ دیکھا کہ ساحل افریقہ اور سقوطرہ اور مدغاسکر کی ساری تجارت ہندستانیوں کے ہاتھ میں ہے جس میں ہندو اور مسلمان برابر شریک ہیں اور انھوں نے وہاں ہندستانی بالکل اسی طرح بولی جاتی سنی جیسے ہندستان میں

---

۱ اس میں قلیوں پر تشدد بھی شامل تھا - یہ نام (قلی) ان ہندستانیوں اور چینیوں کو دیا جاتا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے چند سال کے لیے خط غلامی لکھ دیتے ہیں - لیکن اصلیت میں اس کاروبار کے چلانے والوں نے اس پیشے کو بہت زیادہ گرا دیا ہے اور اس تجارت کو بہت فروغ ہو رہا ہے کیونکہ سنہ ۱۸۴۲ع کے بعد سے اب تک ایک ملین قلی محض جزیرۂ مارلشیس میں درآمد کیے گئے ہیں - لفظ «قلی» کے اصل معنے ترکی زبان میں غلام ہی کے ہیں حالانکہ لفظ «غلام» اب زیادہ مستعمل ہے - یہ تو معلوم ہوگا کہ مشہور و معروف نادر شاہ کا اصلی نام «طہماسپ قلی» تھا یعنی «طہماسپ ثانی شاہ ایران کا غلام» -

بولی جاتی ہے۔ انھوں نے اسی زبان سے اپنی گفتگو اور اپنے لکچروں میں بھی کام لیا کیونکہ انھیں ان تاجروں کو مخاطب کرنا پڑا کہ وہ اس قابل نفریں تجارت (تجارت غلاماں) میں کوئی حصہ یہاں تک کہ بالواسطہ حصہ بھی نہ لیں۔

ساحل عرب پر مسقط اور مکلا میں بھی انھیں ھندستانی بولنے کا موقع ملا۔ جہاں انھوں نے اپنے رفاہ عام کے مشن کے لیے اس زبان سے بڑی آسانی سے کام لیا[۱]۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ سرکار انگریزی بجائے اس کے کہ پورے ھندستان کے لیے ایک زبان کی تحصیل لازمی قرار دیتی، جو ان حالات میں ھندستانی ھی ھوسکتی ہے، اس کی مخالفت کررھی ہے کیونکہ نہ صرف وہ طرح طرح کی ھمت افزائیوں سے صوبجاتی زبانوں میں جو ھندستانی کی وجہ سے مغلوب، افتادہ اور غیر مستعمل تھیں ایک نئی جان ڈال رہی ہے بلکہ ان زبانوں کو سرکاری کاموں میں بھی دخیل کر رھی ہے۔ ان زبانوں کی گرامریں اور ڈکشنریاں تیار کررھی ہے اور چونکہ ان میں سے اکثر میں ادب سرے سے مفقود ہے، سرکار ان میں ادب تیار کرانا چاھتی ہے اور ان دیسی لوگوں کی ھمت افزائی کے لیے معاوضے دیتی ہے جو ان زبانوں میں جو محض بول چال کی حد تک باقی رہ گئی ھیں، کتابیں لکھیں۔ وہ اپنے عہدہ‌داروں کو ان کی تحصیل پر مجبور کرتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو کامیابی سے اسے سیکھیں معاوضے کا وعدہ کرتی ہے۔ شمال میں اس نے پنجابی اور سندھی کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر تماشا دیکھیے کہ ھندستانی کے انسداد کے باعث خود اھل سندھ عدالتی کاروبار کے لیے بجائے اپنی زبان کے انگریزی کو ترجیح دیتے ھیں۔ سندھی میں انھیں یہ خامی نظر آتی ہے کہ عدالتی کارروائیوں کے لیے جس صحت بیان کی ضرورت ہے وہ اس میں میسر نہیں۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اس مضمون کی ایک عرضداشت دفتر کراچی سے مقامی عہدہ‌دار کے پاس پیش کی گئی ہے[۲]۔

---

۱ ایلن انڈین میل مورخۂ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔

۲ علی‌گڈھ اخبار ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع۔

صوبجاتی بولیوں کو سیاسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہ اہمیت دی جارہی ہے مگر یہ چیز ہندستانیوں کے لیے نقصان رساں ہے کیونکہ اگر وہ زبان کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ رہیں گے تو مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔

مسٹر کیمبل جو اب سر جی کیمبل ہوگئے ہیں، جن کی کئی خاص خوبیوں کی وجہ سے لسانیات کے متعلق ان کے عجیب و غریب نظریوں پر نظر نہیں پڑتی، ہندستان میں متعدد زبانوں کے رواج کے پرجوش حامیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اردو کو علیحدہ کردیا جائے اور اس زبان سے انھیں جو نفرت ہے صاف ظاہر ہے۔ علیگڑھ سوسائٹی نے سائنس کی انگریزی کتابوں کے جو قابل تعریف ترجمے اردو میں کیے ہیں ان سے وہ مطمئن نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ ترجمے بنگال اور اڑیسہ کی ٹھیٹھ زبانوں میں بھی کیے جائے[1]۔ مزیدبرآں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ نفرت بنگالی زبان تک بھی بلا ارادہ بڑھ گئی ہے[2] کیونکہ انھوں نے اہل آسام کے لیے آسامی زبان کے از سرنو استعمال کا حکم دیا ہے حالانکہ یہ زبان عرصۂ دراز سے متروک ہے اور اس کی جگہ بنگالی اور اردو نے لےلی ہے۔ جب اس حکم کی تعمیل کی جائےگی تو عدالتی کاروبار اور مدرسوں کے لیے اسی بولی کو استعمال کرنا پڑےگا یہاں تک کہ جب سر جارج کی گورنری بنگال کا زمانہ ختم ہوجائےگا تو حالات پھر اپنی قدرتی صورت اختیار کر لیں گے۔

ان نئے ضابطوں کا انگلستان میں کوئی اثر نہیں ہوا جہاں ہندستانی کی تعلیم میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ادھر کچھ دن پہلے جامعۂ کیمبرج میں سرکاری طور پر اس کی تدریس کا کوئی خاص انتظام نہ تھا بلکہ فارسی کی طرح اسے بھی عربی اور سنسکرت کے اساتذہ مسٹر پامر اور مسٹر کوول براہ مہربانی از خود پڑھا دیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی مجلس تنظیم نے اس صورت حال کے روکنے کے لیے مسٹر پامر کو جو عربی کی طرح ان دونوں زبانوں کے بھی عالم ہیں، اس زبان کی باقاعدہ تدریس کے لیے ایک خاص مشاہرے کے ساتھ مقرر کیا ہے۔ اور اب ہندستانی زبانوں کے

---

۱ انڈین میل ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع

۲ میرا «تبصرہ» متعلق سنہ ۱۸۷۲ ع ملاحظہ ہو۔

« آنرز امتحان » میں جو هندستانی سول سروس کے طلبا کے لیے اور ان طلبا کے لیے جو تقابلی لسانیات کی تیاری کررهے هیں، قایم کیا گیا هے، فارسی اور سنسکرت کے دوش بدوش اردو کی بھی تعلیم دی جاتی هے۔

جامعۂ کیمبرج کے ان طلبه کو جو هندستانی زبان سیکھنا چاهتے هیں اس نئی گرامر سے بہت فائدہ پہنچےگا جسے مسٹر جان پلیٹس شایع کررهے هیں۔ هندستان میں ایک عرصۂ دراز کے قیام اور مشہور اهل هند سے گہری ملاقاتوں کی وجه سے وہ اس کام کے بہت اهل هیں اور ان وجوهات سے توقع هے که وہ اس کام کو صحت سے انجام دے سکیں گے۔

جو لوگ هندستانیوں میں انگریزی زبان کی تعلیم پھیلانے سے دلچسپی رکھتے هیں وہ غالباً مسٹر الٹوڈس بری چارڈ کی کتاب جو انھوں نے اب انگلستان سے واپسی پر شائع کی هے The English Language on Nasmith practical system adapted to Oordoo بہت شوق سے پڑھیں گے یه کام جو انتہائی احتیاط سے دو فاضل مسلمانوں سید جعفر حسین اور مرزا خداداد بیگ کی مدد سے کیا گیا هے، ان هندستانیوں کے لیے جو انگریزی سیکھنا چاهتے هیں اتنا هی مفید ثابت هوگا جتنی که مسٹر نیس متھ کی اصلی کتاب ان انگریزوں کے لیے جو فرانسیسی سیکھنا چاهتے هیں۔ مسٹر بری چارڈ جن کو اس قاعدے پر پورا بھروسه هے اپنی کتاب Elementary Readings in Oordoo Physical Geography کی پہلی جلد مکمل کرچکے هیں اور ان کے اس قسم کے اور رساله جات جو علم هئیت اور تاریخ و جغرافیۂ یونانی وروما وغیرہ سے متعلق هیں، زیر طبع هیں۔

۲۔ ایک عجیب متضاد بات یه هے که اسی دوران میں جب گورنر بنگال اردو سے اپنی مخالفت کا کھلم کھلا اظہار کر رهے هیں اگر اخبار انجمن پنجاب[1] کا بیان سچ هے تو حکومت نے اپنے خرچ سے اور اپنی نگرانی میں ایک بڑی لغت کی ترتیب و اشاعت کا حکم دیا هے جس میں کل اردو الفاظ شامل هوں گے۔ اس کام میں بڑی محنت اور

---

۱ شمارۂ ۱۱ جولائی سنه ۱۸۷۳ء۔

احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ کئی اور لوگوں کے منشی فقیرچند متوطن عرب سرائے دھلی اور اسی پایہ تخت کے ایک اور ساکن منشی احمد نے باہم اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لیے کئی برس کی شدید محنت درکار ہے۔

دوسری طرف صوبۂ شمال مغربی کے محکمۂ تعلیمات نے انگریز عہدہ داروں میں اردو اور ہندی کی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے یہ طے کیا ہے کہ ہر افسر کو جو اس زبان میں مہارت حاصل کرنے کا سرٹیفکٹ لے سکے گا ایک ہزار روپیہ معاوضہ دیا جائے گا اور بعض بعض صورتوں میں دو ہزار روپے[1]۔

ایک خاص «جریدے» کے مطابق حکومت ہند نے ان مصنفوں کے لیے جو اس عام زبان میں بہترین کتابیں لکھیں گے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۲ اور سنہ ۱۸۷۳ع میں انتیس ہندستانی کتابیں اس اعزاز کی مستحق قرار دی گئیں[2]۔ ان کتابوں میں مندرجہ ذیل بھی شامل ہیں۔

«داستان دانش آموز» مظاہر آسمانی و ارضی پر ایک ابتدائی کتاب مصنفۂ مولوی عبیداللہ عبید کلکتوی:۔

«صبح صادق اخلاق کا» از منشی کالکا پرشاد کانپوری۔

«تنبیہ التعلیم» از محمد مبارک اللہ متھرا۔

«گلدستۂ ادب» اخلاقی کہانیاں۔ از دیبی پرشاد اجمیری۔

«مراۃ الایشیا» ایشیا اور بالخصوص ہندستان کا جغرافیہ از کلیان رامی میرٹھی۔

ان انعامات کے متعلق مدیر علیگڑھ اخبار کی رائے ہے[3]:۔

«ہمیں یہ معلوم کرکے فخر کرنا چاہیے کہ دوران سنہ ۱۸۷۲ و سنہ ۱۸۷۳ع میں ہماری فیاض اور ہمدرد سرکار نے انتیس کتابوں پر جو ہندستانی (اردو یا ہندی) میں لکھی گئیں ان کے مصنفوں کو انعام عطا کیے ہیں اور اس بے مثل ہمت افزائی سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے ہیں۔ ان کتابوں میں سے آٹھ اخلاقیات سے متعلق ہیں،

---

۱ انڈین میل مورخۂ یکم دسمبر ۱۸۷۳ء۔
۲ اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ شمارۂ یکم جون سنہ ۱۸۷۳ع
۳ شمارہ ہائے ۳ و ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ ع

دو عام تعلیم سے، پانچ تعلیم نسواں سے۔ دو ریاضی پر لکھی گئی ہیں، دو علم ہئیت پر، دو علوم طبیعیات پر، دو خیالی تصانیف ہیں، چار تاریخ یا جغرافیہ سے متعلق ہیں، ایک تاریخ طبیعی سے اور ایک علم حفظان صحت سے۔ ان کتابوں میں سے تین انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں، دو سنسکرت سے، ایک فارسی سے اور باقی سب تصنیفات ہیں۔ پانچ ہزار پانچ سو روپے کی رقم ان کتابوں پر انعاموں میں صرف کی گئی اور سرکار نے صرف اسی‌قدر فیاضی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ بعض مصنفوں سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اشاعت کے بعد ان کی کتابیں خریدے گی بھی اور اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ آئندہ سال وہ دیسی (اردو یا ہندی) کتابوں کے مصنفین کو ہزار ہزار روپے کے پانچ انعامات عطا کرے گی۔

سائنس جو شمع کی مانند، بلکہ اس سے بھی زیادہ اور شمع کے شعلے کی مانند ہے، ہندستانیوں کی طبائع کی وجہ سے ہمیشہ مسافت پر رہی اور وہ سرچشمے جو ہندستان قدیم میں کثرت کے ساتھ پھوٹ نکلے تھے بالکل بند ہوگئے۔ یہ سرسبز باغ باد سرد جہالت سے اس حد تک ویران ہوگئے تھے کہ لوگ اس زمانے میں بھی انتہائے غفلت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم کتابیں جن کو پڑھ کر وہ اس قدر محظوظ ہوتے ہیں آدمیوں نے نہیں بلکہ دیوتاؤں نے لکھی تھیں۔ اب ان سرکاری انعامات کی ہمت‌افزائی کی برکت سے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو کام وہ دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے خود کرسکتے ہیں اور اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان تصانیف نے وہ درجۂ کمال حاصل نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا، پھر بھی ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ جس طرح پودے شروع میں بہت نازک ہوتے ہیں لیکن اگر ان کی وقت پر باقاعدہ آبیاری کی جائے تو آخرکار ان میں پھل پھول نکلتے ہیں اسی طرح ہمارے ہم‌وطن وقت آنے پر وہ پھل پیش کریں گے جن کی خوشبو تازگی مشامہ اور آسودگی ذائقہ کا باعث ہوگی۔[۱]

میں اس سے قبل ذکر کرچکا ہوں کہ اردو عیسائی ادب کو فروغ دینے کے لیے

---

۱ Allen's Daily Mail ۱۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ع

صاحب لفٹنٹ گورنر صوبۂ شمال مغربی نے اپنی جیب خاص سے ڈھائی ہزار روپے کے انعامات اس قسم کی ان تصانیف کے لیے مقرر کیے ہیں جو ان کے پاس بھیجی جائیں۔ بیس مسودے وصول ہوئے جن میں سے سات مشنریوں کے لکھے ہوئے تھے اور تیرہ ہندستانی عیسائیوں کے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر "Pligrim's Progress" کا اردو ترجمہ ہے جو شرف الدین جبلپوری نے اردو نظم میں کیا ہے۔ تیس زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں اور اردو اور ہندی نثر میں بھی اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ ہندی میں منشی بھوانی پرشاد ساکن المو‌ڑہ نے 'مدغاسکر میں عیسایت کی تاریخ'۔ لکھی ہے۔

اسی طرح کے ایک اور نئے انعامی مقابلے[1] کا آغاز " North India Tract and Book Society " الہ آباد کی جانب سے زیر سرپرستی سر ولیم میور ' ہندستانی (اردو اور ہندی) میں عیسائی ادب کی اشاعت کے لیے ہوا ہے۔ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۴ع سے پہلے سیکریٹری کے پاس تصانیف کا پہنچ جانا ضروری ہے۔

دیسی ادب کی اصناف قدیمہ ہرگز متروک نہیں ہونے پائیں۔ آئے دن مجموعہ‌ہائے سخن یعنی دیوان شایع ہوتے رہتے ہیں اور ان کی طلب برابر جاری ہے۔

گزشتہ سال 'دیوان سروری' کے نام سے مفتی غلام سرور صاحب لاہوری نے اپنا دیوان محبوب سبحانی کی مدح میں شایع کیا ہے۔ حضرت محبوب[2] سبحانی مسلمانوں کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں اور بکثرت مسلمان ان کے مزار پر کھنچ کھنچ کر آتے ہیں کیونکہ مسلمان اپنے بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کے لیے اکثر جایا کرتے ہیں اور اگر کوئی بزرگ شہید بھی ہیں تو سرخ یا سبز جھنڈیاں لے جاتے ہیں۔ ہندو بھی اسی قسم کے مظاہرات کرتے ہیں اور ہندستان ہمیشہ زائرین کی سفرگاہ بنا رہتا ہے۔

---

۱ اس مقابلے کی تفصیلات اور تصنیف کی نوع کے متعلق معلومات انڈین میل مورخۂ ۸ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

۲ ان کے حالات 'یاد داشت مذہب مسلمانان ہندستان' میں درج ہیں صفحۂ ۸۶۔

ایک اور بہت مشہور اهل قلم کا دیوان، جن کا چند مہینے ہوئے انتقال ہوا ہے، لاهور هی سے شائع هورها هے۔ یه مجموعه محض دیوان نہیں کیونکه اس میں غزلیات کے علاوه قصیدے اور اردو کے سوا فارسی اور عربی قطعات بھی شامل هیں جس کا حجم تقریباً دو سو باره صفحات هوگا۔ ان میں سے کئی نظمیں مصنف کے زمانۂ حیات میں هندستانی رسالے «کوه نور» لاهور میں شائع هوکر بہت مقبول هوئی تھیں۔

سید غلام‌حیدر لکھنوی کی دو تصانیف قابل ذکر هیں۔ ان میں سے پہلی موسوم‌به «سیر مقبول» کا موضوع آغا مقبول اصفہانی کی فرضی سیر و سیاحت هے۔ یه ایک جغرافیائی افسانه[1] هے جس پر علیگڑھ اخبار میں دو مضمون شائع هوچکے هیں ایک خود اڈیٹر کے قلم سے اور دوسرا بابو کاشی‌ناتھ کے قلم سے۔ دونوں مضامین تعریف سے پر هیں۔ سیاحت و مہمّات کے حالات کا پیرایۂ بیان بہت دلکش معلوم هوتا هے اور اپنی دلچسپی اور سادگی کے باعث سندباد جہازی اور داستان کامروپ کی یاد تازه کرتا هے۔ سبق آموز اور اخلاقی اقوال سے پر هونے کی وجه سے اخلاقی تعلیم بھی دیتا هے۔ اس میں کوئی کلام نہیں که یه کتاب جدید اردو ادب میں ایک قیمتی اضافه هے۔ اس کی (اردو ادب کی) اهمیت گھٹنا تو ایک طرف آئے دن وه نئی تصانیف سے مالامال هورها هے۔ مصنف اپنے هیرو کو دنیا کے تمام ممالک کا سفر کراتا هے، حالات طبعی دریاؤں اور پہاڑوں کا ذکر کرتا هے، قدیم تاریخ بیان کرتا هے اور جدید حالات دکھاتا هے، پیداوار اور رسم و رواج سے واقف کراتا هے اور پھر سب کے ساتھ چوبی نقش اور جغرافیائی نقشے شامل هیں۔

لاهور میں سید عمادعلی کی «تفسیر قرآن» کی طباعت شروع هوگئی هے۔ یه کام بہت قابل قدر هے کیونکه یه پہلی بار هے که اردو میں مسلمانوں کی مقدس کتاب کی سچی تفسیر شایع هو رهی هے۔ اب تک صرف تراجم موجود تھے جن میں کہیں کہیں حاشیوں پر تشریح بھی کردی جاتی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت بھی مسلمانوں کی بیداری کی نشانی هے جس کا میں نے اکثر ذکر کیا هے۔ زیرنظر کتاب میں پہلے

---

۱ آکٹیوو تقطیع کے ۲۴۲ صفحات مطبوعۂ کانپور۔

تو اصل آیات ہیں، پھر ان کا لفظی ترجمہ (لفظی لیکن صاف اور واضح) اور پھر تفسیر جس میں بحث اور ضروری تشریحات داخل ہیں۔

سید اشرف‌علی گلشن‌آبادی نے جو چونتیس[1] مختلف کتابوں کے مصنف ہیں بمبئی سے « تحفة المثال فی الاصطلاحات و الامثال » کے نام سے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی ضرب‌الامثال اور محاورات کا مجموعہ شایع کیا ہے۔

بیگم صاحب بھوپال جو اس سے پہلے اپنے حالات حج تحریر کرچکی ہیں، اب اردو ہی میں اپنی ریاست کے دورے کا حال نظم و نسق کی بہتری کے لیے شائع کرنے والی ہیں[2]۔

ہندی تصانیف میں سے، جو حال میں شایع ہوئی ہیں، قابل تعریف منشی کیشوپرشاد کا مکمل رسالۂ علاجات مستعمل ہندستانیاں ہے۔ اس کے بعد « منوسمرتی » (منو کا قانون) جو سنسکرت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

« اوتار رام چرتر » کو بریلی کے پنڈت دیودت نے سنسکرت سے ترجمہ کیا ہے۔

« سچی برتا » جس کو پنڈت رام‌نراین نے اسی عنوان کی اردو کتاب « سچی بہادری » سے ترجمہ کیا ہے۔ فارسی لفظ بہادری، ہندی لفظ برتا کے ہم‌معنی ہے۔

« وکرم اروسی » کو الہ‌آباد کے رام‌پرشاد تواری نے سنسکرت ہی سے ترجمہ کیا ہے۔

« پوتھی سری گیت جی » برج لال لاہوری نے « بھگوت گیتا » کا نیا ترجمہ پیش کیا ہے۔

سب سے آخر میں بنارس کے بابو شیوپرشاد کی تاریخ ہند موسوم بہ « اتہاس تمرنسک » کی تیسری اور آخری جلد ہے جو ہندستانی ماخذوں سے لےکر یورپی تشریحات کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔

انھیں بابو صاحب نے « گوتکا » یعنی مرقع کے نام سے اردو اور ہندی کا ایک مجموعۂ نظم شایع کیا ہے جو صوبجات شمالی و مغربی کے تعلیمی درس میں شامل ہے[3]۔

---

۱ ان کتابوں میں سے ایک کا ذکر میری « تاریخ ادب ہندوی و ہندستانی » میں دیکھیے۔ جلد دوم صفحہ (۱۹)۔

۲ انڈین میل ۲۱ جون سنہ ۱۸۷۳ ع

۳ علی‌گڑھ اخبار ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۳ ع۔

نئی کتابوں میں سے مذکورۂ ذیل کا ذکر میں نے مسٹر کولن براؤننگ (Colin Browning) کی سنہ ۱۸۷۱ع کی رپورٹ میں دیکھا ہے۔

« قانون شیخ » (یعنی بوعلی سینا) بابت فن طبابت ۔ پانچ جلدوں میں۔ عربی سے ترجمہ ۔

« علاج الامراض » آکٹیوو تقطیع ۔ ۶۵۰ صفحات ۔

« ذخیرۂ خوارزم شاہی » فن طبابت پر ایک اور کتاب ۔ چھے جلدوں میں ۔

« تاریخ عبدالقادر بدوی » (تاریخ اکبر) فارسی سے ترجمہ ۔

« فتاویٰ عالمگیری » عربی سے ترجمہ ۔

ایک « تاریخ ہند » مولفہ منشی محمد حسین پرتاب‌گڑھ ۔ اودھ کے مدرسوں میں تدریس کے لیے شایع کی گئی تھی ۔ اس کے مصنف کی کئی نظمیں ہندستانیوں میں بہت مقبول ہیں ۔ پنڈت رامانند سکسائی نے ایک اور « تاریخ ہند » لکھی ہے جو ہندو راجاؤں، مسلمان سلطانوں اور حکومت انگریزی کی بابت ہے ۔

لاہور کالج کے مولوی محمدحسین آزاد نے محکمۂ تعلیمات پنجاب کی سرپرستی میں « قصص ہند » کا دوسرا حصہ پیش کیا ہے جس میں اہم ترین تاریخی شخصیتوں کے حالات حکایات کے طور پر بیان کیے ہیں اور شستہ پیرائے میں سچی اور بہت اچھی اردو میں قلمبند کیے ہیں[1] ۔

منشی گوکل پرشاد رئیس لکھنؤ نے جو عام طور پر اپنے تخلّص «رسا» سے مشہور ہیں، سکندر نامۂ نظامی کا اردو میں کارنامۂ اسکندری کے نام سے ترجمہ کیا ہے ۔ مترجم نے لفظ بہ لفظ فارسی متن کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس طرح کہ وہ ہندستانی جو فارسی زبان نہیں جانتے اس ترجمے کے ذریعے جو مقفّی نثر میں ہے، اس تاریخ سے واقف ہوسکیں ۔ اس سے خود ان کی اپنی زبان میں یہ تاریخ دستیاب ہوسکے گی ۔ اس جرنلسٹ نے جس سے میں یہ اطلاع نقل کررہا ہوں میری طرح یہی خواہش ظاہر کی ہے کہ ہندستان میں اس کی اشاعت ہو اور ہندستان کی کثیر آبادی کے یہ کام آئے[2] ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی

---

۱ انڈین میل ۳ فروری سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

۲ اخبار انجمن پنجاب ۱۸ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع ۔ علیگڑھ اخبار ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

ہے کہ یہ ترجمہ ایک ہندو نے کیا ہے جو اپنی اردو شاعری کی وجہ سے مشہور ہے اور اس کا شمار ان رجعت پسندوں میں نہیں جو پرانی ہندی کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے چونکہ وہ لکھنؤ میں ایک ہندستانی اشاعت خانے کا مہتمم ہے، اس کے یہاں اس حسین زبان کی (جس کو ہمیشہ ہندستانی کی قومی زبان کے لقب سے یاد کرتا رہوں گا) کتابوں کی ایک بڑی تعداد زیر طبع ہے۔

«تہذیب مقال» یا «تعویذ ایمان» کے نام سے ہندستانی مصنف میر آقا حسین نے جو میراں صاحب کے لقب اور نامی[1] تخلص سے بھی مشہور ہیں، گجرانوالہ میں (جہاں منشی گوپال داس «تاریخ و جغرافیہ[2]» شایع کرنے والے ہیں) «پرا بودہ چندرودے» مشہور سنسکرت ڈرامے کا اردو ترجمہ شایع کیا ہے۔ اس کا ترجمہ نند داس جیو ہندی میں اور اس سے قبل بھگوان داس دہلوی اردو میں کرچکے ہیں۔

«آئینہ جہاں نما» کے نام سے گجرانوالہ ہی میں احمد حسین لکھنوی نے تاریخ عالم موسوم بہ «مراۃ العالم» کا ترجمہ شایع کیا ہے۔

ان تمہیدی تصنیفوں میں سے جو حال ہی میں شایع ہوئی ہیں، میں «کلید سخن» کو خاص اہمیت دیتا ہوں جس کو کلکتہ یونیورسٹی کے اردو کورس کے لیے مولوی محمد حسین لکھنوی استاد اردو بارہ بنکی ہائی اسکول نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب جس کی موافقت میں ۲۸ مارچ کے علی گڑھ اخبار میں ایک مضمون چھپا تھا، نو حصوں پر مشتمل ہے جس میں ایک گرامر شامل ہے۔ ایک حصہ اخلاقیات سے متعلق ہے، ایک تصوف سے، ایک علم عروض سے، ایک تاریخ سے وغیرہ وغیرہ مضمون نگار لکھتا ہے کہ یہ کتاب فی الحقیقت ایک گلدستۂ فصاحت ہے اور تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔ طلبا کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اردو زبان ترقی کررہی ہے اور اس کی فوقیت کا وقت آچکا ہے[3]۔

اس کے علاوہ اسی رسالے کا ایک اور نامہ نگار ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ اس کتاب پر فاضل قدردان کمال مسٹر کولن براؤننگ (Colin Browning) ناظم سر رشتۂ تعلیم اودھ نے

---

۱ ملاحظہ ہو «تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی» جلد دوم صفحۂ ۴۳۰۔

۲ تاریخ گجرانوالہ کوارٹو ۲۹۲ صفحات۔

۳ ملاحظہ ہو سر جارج کیمبل کی رائے ہندستانی جرالڈ کی رائے سے کس قدر مختلف

ایک انعام عطا فرمایا ۔ اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "اگر ہندستان میں اس طبیعت کے عہدہ‌دار اور زیادہ ہوتے تو وہ انگلستان کے مقابلے میں اس‌قدر پست نہ ہوتا" ۔ ہندستانی شعرا نے اس قابل ناظم کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے ہیں جو اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ میں شایع ہوئے ہیں ۔

ایک اور تمہیدی کتاب "تسہیل الکلام" یا Hindustani made easy، کپتان ڈبیلو-آر-ایم - ہال رائڈ (W.R.M. Holroyd) ناظم سررشتۂ تعلیمات پنجاب نے بڑی احتیاط سے مرتب کی ہے اور حقیقت میں اسم بامسمّٰی ہے ۔

سید نصرت علی دہلوی نے لاہور سے ایک اردو انگریزی قواعد "کتاب مفید عام" کے نام سے شایع کی ہے جو ایک طرح کی چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندستانیوں اور انگریزوں کے لیے یکساں مفید ثابت ہو ۔ کتاب کے خاتمے پر کچھ منظوم قطعات ہیں اور ایک جنتری ہے جن میں سالہائے ہجری کی سنہ ۱۸۶۵ ع سے لےکر سنہ ۱۹۶۶ ع تک کے عیسوی (جنتری نگاروں کی اصطلاح میں گریگورِوی جنتری) سے مطابقت کی گئی ہے ۔ گریگوری اس وجہ سے کہ پاپائے گریگوری سیزدہم نے سنہ ۱۵۸۲ ع میں یہ نئی جنتری قایم کرنا چاہی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ جولین جنتری کی ابتدا کے بعد سے نقطہ‌ہائے خط سرطان اور نقطہ‌ہائے معتدل‌النہار میں انحطاط ہوچکا ہے ۔ یورپ میں اس تبدیلی کی وجہ سے سلسلہ‌وار واقعہ نگاری میں بڑی زحمت پیش آئی اور بہت مزاحمتوں کے بعد یورپ کے بعض حصوں نے اسے قبول کیا چنانچہ جرمنی نے تقریباً سنہ ۱۷۰۰ ع میں، انگلستان نے سنہ ۱۷۵۲ ع میں سویڈن نے سنہ ۱۷۵۳ ع ۔ روس اور کلیسائے شرق نے اس نئی ایجاد کو منظور نہیں کیا اور جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے یہ اصلاح بہت زیادہ صحیح بھی نہیں ہے[1] ۔

سید حسین پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ نے اسی عام زبان میں اصطلاحات علمیہ پر ایک رسالہ شایع کیا ہے ۔ ان کا مقصد انگریزی اصطلاحات علمیہ کے مترادف الفاظ

---

[1] "Manuel de chronologie" از A. Sedillot جلد اول صفحہ ۱۴

اردو میں تلاش کرتا تھا اور دیسی رسالے ان کی کوشش سے مطمئن ہیں[1] -

نئے نئے اہل‌قلم منظر ادب پر رونما ہوئے ہیں۔ شعرا میں سب سے پہلے میں ایک مدراسی خاتون کا ذکر کروں گا جن کا گزشتہ جون میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اردو نظمیں عہدنامۂ جدید (انجیل مقدس) کی کئی عبارتوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اردو میں انھوں نے کئی مثنویاں بھی لکھی تھیں اور اپنے کلام کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی تھی[2] -

'پنجابی اخبار[3]' نے پٹنہ کے ایک شاعر سے ہمارا تعارف کرایا ہے جو آتش[4] کے شاگرد ہیں اور (اس زمانے میں) پنجاب کا سفر کر رہے تھے۔ اردو نظم و نثر میں انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مضمون‌نگار نے جو ان کے زور طبع کا بہت معترف ہے مثال کے طور پر ان کے کئی غزلیں اور نثر کے پارے پیش کیے ہیں جن میں سے ایک کو ۸ مارچ کے میرٹھ گزٹ نے نقل کیا ہے۔ یہ مصنف جن کا نام شیخ اعظم حسین ہے' پیارے صاحب کے عرف سے بھی مشہور ہیں۔ علاوہ ان کی تصانیف کے ان کی گفتگو کی بھی قدر کی جاتی ہے جس کا موضوع اکثر اخلاق و روحانیت ہوتا ہے۔ ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں جمع ہیں۔ اردو ادب کی طرف سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود نئے واقعات کے قابل قدر لوگ برابر ابھر رہے ہیں اور پوری کامیابی سے زبان کو نشوونما دے رہے ہیں اور اپنے پیشرووں کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔

اسی اخبار نے نصیراحمد المتخلص به ناصر جن کی کچھ غزلیں اس نے چھاپی بھی ہیں اور اشرف علی اشرف[5] (سید عبدالفتاح) جو زمانے کے مشہور ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور اپنی مادری زبان ہندستانی کے سوا عربی' فارسی اور انگریزی میں مہارت کامل رکھتے ہیں' کا بھی تعارف کرایا ہے۔ ان کی (اشرف علی اشرف کی)

---

۱ علیگڑھ اخبار ۱۰ جنوری سنه ۱۸۷۳ع۔ ۲ اخبار انجمن پنجاب ٦ جون سنه ۱۸۷۳ع -

۳ شماره جات یکم و ۸ مارچ سنه ۱۸۷۳ع - ۴ یعنی خواجه حیدر علی آتش. ملاحظه هو "تاریخ ادبیات هندوی و هندستانی" پہلی جلد صفحهٔ ۲۵۲ -

شمارهٔ ۲ مئی سنه ۱۸۷۳ع -

تصانیف کی تعداد انیس بتائی جاتی ہے اور یہ سب کی سب سررشتۂ تعلیمات بمبئی میں مدرسوں کے درس میں شامل ہیں۔ میں صرف ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو اردو میں لکھی گئی ہیں :— « خزینۂ دانش » پانچ جلدوں میں ۔ « کلید دانش »۔ « تائیدالحق »۔ « تحفۂ محمدیہ »۔ « صد حکایت »۔ « خلاصۂ علم جغرافیہ »۔ « تاریخ افغانستان »۔ « تاریخ انگلستان » اور ایک قواعد انگریزی موسوم بہ « رسالۂ تعلیم الایقان فی لغت انگلستان »۔

سنہ ۱۲۸۴ھ (سنہ ۱۸۶۸ع) میں عدالت ضلع خاندیش میں ایک خدمت پر ممتاز رہنے کے بعد ناصر صاحب الفنسٹن کالج بمبئی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد اشرف صاحب نے « اشرف الانشا » تصنیف کی جس کا شمار ان کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے اور جس کے نام میں انھوں نے اپنے تخلص کی رعایت رکھی ہے۔ ان کتابوں کی طرح جن کے اس قسم کے نام ہوتے ہیں یہ کتاب محض خطوط نویسی کے آئین سکھانے تک محدود نہیں بلکہ فن تحریر پر ایک جامع کتاب ہے جس میں عروض اور بلاغت دونوں پر جامع بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد « اشرف اللغت » شایع کی جو ہندستانی، فارسی، عربی اور انگریزی کی لغت ہے اور جس کو اڈیٹر « پنجابی » نے اکثر استعمال کیا ہے۔

اگرچہ بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی کا رواج زیادہ ہے پھر بھی یہاں سے سنہ ۱۸۷۱ع و سنہ ۱۸۷۲ع میں بہت سی ہندستانی کتابیں شایع ہوئیں جن میں سے زیادہ تر مذہب اسلام سے متعلق تھیں۔ اکثر گجراتی حروف میں ہیں۔ ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں :— حاتم کے متعلق ایک ڈراما (حاتم ہندستانی ناٹک)۔ کبیر کی نظمیں « کبیر کویا »۔ تین قصے موسوم بہ « تمبولن » « لعل و گوہر » « نجمثی پاتھن » مختلف مصنفین کے لکھے ہوئے۔ گیتوں کا انتخاب۔ اس کے علاوہ اردو مہابھارت جو بالاقساط شایع ہو رہی ہے اور جس کا آٹھواں حصہ طبع ہوچکا ہے۔

انگریزی سے ہندستانی میں ترجموں کی تعداد ہمیشہ کثیر رہتی ہے۔ « اخبار انجمن پنجاب » مورخۂ ۱۸ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع نے ترجموں کے موضوع پر

سب سکریٹری حکومت ہند کا ایک خط سکریٹری حکومت صوبۂ شمال مغربی کے نام شایع کیا ہے[1]۔

مولوی شیو دیال سنگھ کی کتاب «اخلاق باری» کا نام دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ اردو میں انگریزی زبان کی گرامر ہے۔ کتاب مکمل ہے اور «پنجابی» مورخۂ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع میں اس کی سفارش کی گئی ہے۔

بابو کیشب رام نے اردو میں چونسٹھ صفحات کا ایک «جغرافیۂ بنارس» شایع کیا ہے جس کی «پنجابی» مورخۂ ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع نے بجا طور پر تعریف کی ہے۔

«اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی» فارسی میں فلسفۂ اخلاق و معاشرت پر مشہور و معروف کتابیں ہیں۔ ہندستانی میں «اخلاق محسنی» کی طرح ان کا بھی ترجمہ ہوچکا ہے لیکن مولوی کریم بخش[2] نے ان میں سے چیدہ چیدہ اور بےحد دلچسپ حصوں

---

۱ اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔ از فورٹ ولیم کالج مورخۂ ۷ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع۔ «ہوم ڈیپارٹمنٹ پبلک انسٹرکشن» «علیگڑھ اخبار شمارۂ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ع میں ان اہم انگریزی کتابوں کی ایک فہرست شائع کی گئی تھی جو دیسی زبانوں میں ترجمہ اور اشاعت کے لایق ہیں۔ یہ فہرست قابل و فاضل انگریزوں کی مدد سے تیار کی گئی تھی۔ حکومت ہند نے اسے تسلیم کرلیا ہے اور مناسب خیال کیا ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ان میں سے کون کون سی کتابیں اردو، ہندی اور بنگالی میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ اسی خیال سے اس فہرست کی کاپیاں بکثرت انجمنوں اور سررشتۂ تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کو بھیجی گئی ہیں اور ان کی رائے طلب کی گئی۔

جو جوابات وصول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوا کہ جو کتابیں اس فہرست میں شامل ہیں ان میں سے کوئی ہندی، بنگالی یا اڑیا میں ترجمہ نہیں ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے زیر اہتمام صرف اردو میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً منشی ذکاءالله نے حساب کی کتابوں کے ایک سلسلے کا ترجمہ کیا ہے جو سوسائٹی کی مدد سے چھپ رہا ہے۔

صاحب گورنر جنرل کی رائے سے حکومت اس تجویز کی ہمت افزائی کرے گی اور باعتبار مرتبہ ترجموں کی قدر کرے گی۔ اس طرح ترجموں کی تعداد اور اصل تصانیف کی تحریر کا شوق دن بدن بڑھتا جائے گا۔ جو لوگ اس کام کو محنت سے انجام دیں گے حکومت ہند انھیں مالی معاوضے، خلعتیں، اعزازی خطابات عطا کرے گی۔ اس کا تصفیہ لفٹنٹ گورنر کے مختلف انجمنوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہوگا کہ ان میں سے کن کتابوں کے ترجمے کی مدد کرنی چاہیے۔

۲ ان کے حالات میری «تاریخ ہندوی و ہندستانی» میں ملاحظہ فرمائیے۔ جلد دوم صفحۂ ۱۶۵۔

کا انتخاب « اکسیر اعظم » کے نام سے آکٹیوو تقطیع پر ۹۲ صفحات میں لاہور سے شایع کیا ہے۔ اس کے سوا مرزا محمد علی نے اسی قسم کی ایک کتاب « اخلاق محمدی » کے نام سے شایع کی ہے۔ بنگلور کے ایک اخبار نے اس کی بڑی تعریف کی کیونکہ اسی شہر[1] کے ایک اور اخبار نے اسی زمانے میں اس پر تنقید کی تھی۔

محمد اکرم غنیمت نے جن کے دیوان کی وجہ سے ان کا شمار پنجاب کے منتخب شعرا میں ہونے لگا ہے' لاہور ہی میں ایک مثنوی شایع کی ہے جو ایک نواب زادے کے عشق کی داستان ہے۔ یہ قصہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور ایسے لطیف اوصاف سے لبریز ہے کہ اڈیٹر « پنجابی »[2] نے ایک طویل مضمون میں اسے سلسلۂ تصاویر سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن اس کی تعریف کرتے کرتے اڈیٹر نے انداز بیان کی بعض خصوصیتوں پر نہایت باریک بینی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اور اس سے اس کی وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ «گلزار کشمیر» کے نام سے پنڈت بشن‌ناراین لاہوری نے خاص کشمیری زبان کی ایک قواعد شایع کی ہے جس کی تعریف میں «پنجابی» رطب‌اللسان ہے[3]۔

میرٹھ سے شاہنامہ کا ایک نیا اڈیشن اردو میں شایع ہوا ہے جو دیدہ زیب تصاویر سے آراستہ ہے۔ اس پر بھی اس کی قیمت بہت مناسب رکھی گئی ہے۔ دہلی میں « شمس‌الانوار » کے نام سے « بوستان خیال » کا اردو ترجمہ شایع ہوچکا ہے جو بہرام‌گور کی رومانی سرگزشت ہے اور فولیو تقطیع کے ۷۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

"Bibliotheca Indica" اپنی انتہائی اہم مطبوعات میں ایک ایسی ہندستانی کتاب کو بھی شمار کرتا ہے جسے فی‌الحقیقت تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ میرا اشارہ قدیم ہندی نظم یا منظوم داستان کی طرف ہے جسے چند[4] شاعر نے اسلامی فتوحات سے پہلے گیارھویں صدی عیسوی میں « پرتھی راج رساؤ[5] » (یعنی اجمیر اور دہلی

---

۱ علیگڑھ اخبار ۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ع۔ ۲ شمارۂ ۲۲ فروری سنہ ۱۸۷۳ع۔

۳ شمارۂ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

۴ میری « تاریخ ہندوی و ہندستانی » میں ان کا مضمون ملاحظہ ہو۔ اس شاعر اور اس کی نظموں کے متعلق اور بہت سی تفصیلات ریورنڈ جان رابسن (Rev. John Robson) کے مضمون مطبوعۂ انڈین میل ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۳ع سے معلوم ہوسکتی ہیں۔

۵ لفظ «راس» کی ابتدائی شکل ہے۔ میری کتاب "Rudiments hindovi" ملاحظہ ہو۔

کے رانا پرتھی راج جو سنہ ۱۰۵۰ء میں پیدا ہوا کے وقایع) کے نام سے تحریر کیا تھا - یہ محض میرے مشہور دوست مسٹر جان بیمز (John Beames) کی ان تھک کوشش اور محنت کا نتیجہ تھا کہ اس بے بہا کتاب کی ترتیب و اشاعت کا کام انجام پاسکا - پہلا گیت ' بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں پہلا حصہ (ادی پرو) ان لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا جنھیں محض راماین اور مہابھارت کے هندستان سے نہیں بلکہ مقابلۃً جدید هندستان سے دلچسپی ہے - مرتب نے ایک خاص خط میں مجھے لکھا ہے کہ انھوں نے نہایت احتیاط و پابندی سے صرف ایک متن کی پابندی کی ہے اور باقی نسخہ‌جات کے اختلافات صرف حاشیہ میں تحریر کیے ہیں اور دوسرے نسخوں کی چھان بین کا کام اپنے دوسرے ماہر هندیات ساتھیوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے جو جس طرح دل چاہے تصریحات کرتے رہے ہیں جس طرح اب آئے دن ہومر اور ورجل کی عبارتوں کی کی‌جاتی ہیں- مجھے توقع ہے کہ یہ کام خیر و خوبی سے انجام پا جائےگا کیونکہ اس کے لیے نہ صرف غیرمعمولی قابلیت کی ضرورت ہے بلکہ اس قسم کے کام کے لیے کثیر وقت اور استقلال بھی درکار ہے - یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس وقت تک صرف ایک ہی حصہ شایع ہوا ہے جو ۶۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس قسم کے ۶۸ حصص اور باقی ہیں جن میں سے بعض بعض پہلے حصے سے کہیں زیادہ طویل ہیں- مسٹر بیمز نے پہلے حصے کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالے کے شمارۂ دوم میں جو اطلاع شایع کی ہے اس میں یہی لکھا ہے - یہ کہنا بے‌محل نہ ہوگا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے خلاف جو هندستانی سے تمام فارسی و عربی الفاظ خارج کردینا چاہتے ہیں دلیل قاطع ہے ' کیوں کہ ایسے الفاظ چند کے کلام میں بھی بکثرت ملتے ہیں جو حقیقت میں هندستان کا قومی شاعر ہے[1] - اس کے سوا دوسرے مشہور هندو شاعروں کبیر' تلسی' سور داس' دادو' بہاری وغیرہ کے کلام میں بھی اس قسم کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں - مسٹر جان بیمز نے مجھ سے کہا تھا کہ جوں جوں

---

۱ چند الفاظ جو چند کی نظم میں کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ ہیں:- « شہر »، « خبر »، « ظالم »، « حکم »، « تیغ »' « فوج » -

اس دلکش زبان کا مطالعہ کیا جائے یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اردو اور فارسی الفاظ اس میں مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہیں ۔ یہ کبھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی بھی ہندی زبان عربی اور فارسی الفاظ سے خالی رہی ہے ۔ بابو شیو پرشاد نے اپنے مقالے ,,کچھ بیان اپنی زبان کا ،، میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے ۔ وہ ان لوگوں کے مخالف ہیں جو ہندی سے عربی و فارسی الفاظ خارج کردینا چاہتے ہیں اور محض سنسکرت الفاظ لینا چاہتے ہیں ۔

اسی زمانے میں جبکہ مسٹر بیمز اپنی ,,السنۂ جدید کی ہند تقابلی قواعد،، مرتب کررہے تھے ، ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ (Dr. Ernest Trumpp) جو بڑے ان تھک آدمی ہیں ,,افغانیوں کی زبان اور فارسی اور شمالی ہندستان کے محاورات کی تقابلی گرامر[۱] ،، شایع کرنے کے بعد ,,ازمنۂ وسطیٰ کی ہندستانی زبانوں کی قواعد ،، کی ترتیب شروع کردی تھی تاکہ پرانی پراکرت اور جدید ہندستان کی زبانوں کے درمیان جو جگہ (تحقیقی نقطۂ نظر سے) خالی رہ گئی تھی وہ بھر جائے ۔ اس کی ضرورت ہے کہ سنسکرت کے بعد کی آریائی زبان پر ، جس کو مسلمان شاستری (یعنی شاستروں کی زبان) کہتے ہیں اس زمانے تک کی تمام تبدیلوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک تبصرہ شایع کیا جائے ۔ اس قسم کا تبصرہ لسانیات کی کسی اور شاخ میں موجود نہیں ۔

علمائے لسانیات کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ انجمن لاہور نے انھیں ڈاکٹر ٹرمپ کے مرتب کردہ ,,سکھوں کے گرنتھ،، کو شایع کرنے کا تصفیہ کیا ہے[۲] ۔ انھیں یہ معلوم کرکے بھی خوشی ہوگی کہ الہ آباد کے ریورنڈ ایس ۔ ایچ ۔ کیلاگ (Rev. S. H. Kellogg) کی ایک ہندی گرامر زیر طبع ہے جو نہایت مکمل ہے اور جس میں مشہور ہندو مصنفوں کی کتابوں سے بکثرت مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔

تلسی‌داس کی ہندی رامائن کو ہمیشہ سے ہندستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے ۔ شہرت میں وہ والمیک کی رامائن کے برابر ہے بلکہ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ اس سے بھی بازی لے جارہی ہے ۔ بنارس کے مسٹر گرفتھ (Mr. Griffith) کے

---

۱ Grammar of the Pasto or language of the Afghans Compared with the Iranian and North Indian idiosm مطبوعۂ لائپزش

۲ اخبار انجمن پنجاب ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

ترجمۂ رامائن سنسکرت کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے - تیسری جلد شایع ہوچکی جس کی بابو کاشی ناتھ نے بہت تعریف کی ہے[1] -

یہ تو سب کو معلوم ہوگا کہ پروفیسر ویبر (Weber) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رامائن کا خیال ہومر سے لیا گیا ہے - انھیں منشی کاشی ناتھ نے اس نظریے کی تردید ایک تقریر میں کی جو پہلے تو رسالہ "Native Opinion" میں شایع ہوئی اور پھر ایک رسالہ کی صورت میں طبع ہوئی[2] -

میں نے متعدد مرتبہ ان قدیم سنسکرت ڈراموں کا ذکر کیا ہے جو اب بھی کبھی کبھی ہندستان میں تمثیل کیے جاتے ہیں[3]، کبھی اصلی زبان میں اور کبھی ہندستان کی عام زبان میں - لیکن جو چیز اس زمانے تک نظر نہ آتی تھی اور ایک سچا ہندستانی تھیٹر، ایک مستقل "قومی" تھیٹر، وہ بھی اب کلکتہ میں قائم ہوگیا ہے جس میں ملکی باجوں کا آرکسٹرا ہے اور عورتوں کی بجائے لڑکے اداکاری کا کام انجام دیتے ہیں - انگریزی اخبارات نے اپنے نامہ نگاروں کے حوالے سے ایک ہندو کامیڈی کی جو اس تھیٹر میں تمثیل کی گئی، روئداد شایع کی ہے - یہ ایک معمر برہمن کا قصہ ہے جس کی دو لڑکیاں بیوہ ہیں اور جو خود ایک نیچ ذات کی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے - تجویز آزادانہ ہے اور یہ کشمکش قابل دید کہ اس کی لڑکیاں اس بے جوڑ رشتہ کی بہت مخالف ہیں - بہرحال ان کی ناراضی کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ محض یہ ہے کہ ہندی سماج کے اصول مطابق ان کی دوبارہ شادی نہیں ہوسکتی اور انھیں سوتیلی ماں کو برداشت کرنا پڑے گا - جو چیز ہمیں اس قصے میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں اس پر افسوس کرتی ہیں کہ سرکار انگریزی نے ستی کی ممانعت کردی -

---

۱ علیگڑھ اخبار ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع -

۲ Allen's Indian Mail شمارۂ ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع -

۳ گزشتہ جنوری میں فریدپور کے بازار میں لوگوں کی دلچسپی کے لیے ایک کھیل "رام بیساکھ" کے نام سے پیش کیا گیا تھا - (انڈین میل ۸ جون سنہ ۱۸۷۳ع -

ان کے خیال میں ستی، حالت بیوگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے[1]۔ خوش قسمتی سے بوڑھا برھمن بہت پس و پیش کے بعد اپنے ارادے سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

اخبارات نے ایک اور کامیڈی «نو سو روپے» کا بھی ذکر کیا ہے جو کسی موقع پر کھیلی بھی گئی تھی۔ اس کے چھے ایکٹ اور اٹھارہ مناظر ہیں اور کھیل کا وقت پانچ گھنٹے ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک باپ شادی کے ایک دلال کے مشورے پر نو سو روپے کے عوض اپنی لڑکی کی شادی کردینا، بلکہ اسے بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ دلال ایک شوہر یعنی ایک خریدار فراہم کرتا ہے۔ لیکن ہونے والی دلھن کا چچا جو حشیش بہت پیتا ہے، اسے اس سے زیادہ قیمت پر بیچنا چاہتا ہے۔ لڑکی بیہوش ہوجاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر، ایک ہومیوپیتھک معالج اور ایک حکیم بلایا جاتا ہے۔ چچا ان طبیبوں کا مذاق اڑاتا ہے اور بالآخر کہتا ہے کہ لڑکی کی بیماری مرض عشق کے سوا کچھ نہیں۔ جس شخص سے اسے محبت ہے وہ بلایا جاتا ہے لیکن اس کے پاس مقررہ رقم موجود نہیں اور پھر عاشق و معشوق کے نسب میں بھی کچھ فرق ہے۔ لیکن چھٹا ایکٹ بخیر و خوبی ختم ہوتا ہے۔ روپے بھی فراہم ہوجاتے ہیں،

---

۱ یہ بالکل درست ہے کہ ہندستانی عورتوں کو اس وحشیانہ رسم کے مٹ جانے کا افسوس ہے۔ کچھ دن ہوئے متوفی راجہ جودھپور کی درجن بھر بیویاں اور بکثرت خواصیں بڑی خوشی سے ان کی چتا پر جل مرنے کو تیار تھیں۔ مگر انھیں بڑی مایوسی اس وجہ سے ہوئی کہ نئے راجہ نے جو بقول ہندستانی اخبارات کے یورپ زدہ ہیں، انھیں اس کی اجازت نہیں دی۔

حال ہی میں «تاماتارا» واقع ٹونک میں ایک برھمن مرگیا۔ اس کی بیوی ستی ہوجانا چاہتی تھی لیکن چونکہ سرکار نے اس رسم کی ممانعت کردی تھی اس لیے تاماتارا کے ایجنٹ نے کچھ سواروں کو نگرانی پر مقرر کیا اور اس عورت کو نظربند کردیا۔ جب ہندو رسم کے مطابق برھمن کی لاش چتا پر رکھی جاچکی اور آگ لگائی جانے والی تھی، عورت کسی ترکیب سے دروازہ کھول کر نکل بھاگی۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا وہ اپنے شوہر کی چتا میں گر کے جل مرنے ہی کو تھی کہ ایک مسلمان سپاہی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس پر اسے بہت غصہ آیا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس نے اس شخص کو بد دعا دی «اے بھگوان یہ شخص مجھے اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی نیکی سے روکتا ہے، اسے اس گناہ کی سزا دے اور اگر تو میری قربانی قبول کرنا چاہتا ہے تو مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جا ملنے کی اجازت دے» یہ الفاظ کہتے کہتے وہ ختم ہوگئی اور اس طرح اس نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ (پنجابی مورخۂ ۱۴ جون سنہ ۱۸۷۳ع)۔

دونوں کا نسب بھی ایک ھی ثابت ھوتا ھے اور حشیش کا عادی اس عادت بد سے توبہ کرلیتا ھے۔

میں ایک اور ڈرامہ کا ذکر کروں گا جو اسی تھیٹر میں بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا تھا۔ میرا اشارہ "نیل درپن" کی طرف ھے جس کی وجہ سے سرکار کو سنہ ۱۸۶۷ع میں اچھی خاصی فکر پیدا ھوگئی اور جس کی وجہ سے ریورنڈ۔ جے لانگ (Rev. J. Long) کو کئی مہینے کی سزائے حبس برداشت کرنی پڑی۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں نیل استعمال کرنے والوں پر سخت حملے کئے گئے تھے۔ تمثیل کے وقت ان حملوں کا لہجہ بہت نرم کردیا گیا اور جہاں ضرورت تھی، ڈرامے میں کانٹ چھانٹ کی گئی۔

۳ - ان وجوھات میں سے جن کے باعث ھندستانی انگریزی حکومت کو پسند کرتے ھیں ایک یہ بھی ھے کہ اس نے انھیں تحریر و اشاعت کی آزادی عطا کی ھے۔ اخبار "آب حیات ھند" اس موضوع پر لکھتا ھے کہ انگریزوں کی قوم ایک آزاد قوم ھے اور وہ دوسروں کو بھی اسی طرح آزادی دینا چاھتی ھے۔ قانون کی پابندی کے لیے اس کا انصاف حد درجہ غیر جانبدارانہ ھے۔ حکومت ھمیشہ اخباروں کی مفید تجاویز کو سننے لیے تیار ھے اور رعایا اس لیے خوش ھے کہ اس کا اخبارات کے ذریعے حکومت پر اچھا خاصا اثر ھے۔

انجمن ادب دھلی کے ایک اجلاس میں اسی اھم ذریعۂ اثر پر بحث کی گئی تھی سیکریٹری[۱] نے تبصرہ کرتے ھوئے کہا "بدقسمتی سے انگریز دیسی زبانوں کے اخبارات کو نہیں پڑھ سکتے اور حکومت کے مترجم جو سرکاری خلاصہ ھفتہوار پیش کرتے ھیں وہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے یہ بہت مناسب ھوگا کہ ھندستانی لوگ انگریزی اخبارات اور رسالے شایع کریں اگرچہ ابھی تک انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی ھے۔ اسی طرح ان کے خیالات کا حکومت کو اچھی طرح علم ھوسکے گا۔" بکثرت ممبروں نے اس مباحثے میں حصہ لیا جس کا آغاز سیکریٹری نے کیا تھا اور

---

۱ علیگڑھ اخبار ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع۔

موافق و مخالف آرا کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک صاحب سری رام نامی نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت دیسیوں کی رائے معلوم کرنے کی بہت خواہش‌مند ہے۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہند کی مثال پیش کی جو بہت کثرت سے ہندستانی اخبارات کا مطالعہ کیا کرتے تھے مگر انھیں اس کی شکایت تھی کہ جس چیز کی انھیں تلاش تھی انھیں نظر نہیں آئی۔ کسی نے ان سے کہا کہ ہندستانیوں کو حکومت سے بہت شکایت ہے اور ان کی ہمت نہیں پڑتی کہ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کریں مثلاً جو لوگ میونسپل کمیٹیوں یا اور دوسری کمیٹیوں کے ممبر ہیں، ڈرتے ہیں کہ اگر وہ کسی تجویز کی مخالفت کریں گے تو انھیں کمیٹی سے برخاست کردیا جائےگا اور ان کی بےعزتی بھی ہوگی۔

یہ سچ ہے کہ جس چیز کو رائے عامہ کہتے ہیں اس کا ہندستان میں وجود نہیں۔ جن رایوں کا وہ اظہار کرتے ہیں اکثر جزوی ہوتی ہیں اور حکومت پر ان کا برائے نام اثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کسی معاملے میں ان کی ایک متفقہ رائے ہو اور حکومت کو یہ معلوم ہو کہ اس کی کوئی تجویز عام طور پر غیر مقبول ہوگی تو وہ فوراً اس سے دستکش ہوجائےگی[1]۔

«علیگڑھ اخبار» جس پر «علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ» کا نام زیادہ پھبتا ہے، ایک ایسا انگریزی اخبار بھی شائع کرنا چاھتا ہے جس میں دیسی اخبارات کے مضامین کے ترجمے شائع کیے جائیں تاکہ یورپین پبلک کو ان خیالات اور آرا کا علم ہوسکے۔ متعدد ہندستانی انگریزی زبان میں اخبارات شایع کرتے ہیں جن کا اینگلو انڈین صحافت میں خاصہ حصہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر «پائنیر» (Pioneer) بنگالی «ہندو پیٹریاٹ» (Hindoo Patriot) اور «نیٹو اوپینین» (Native Opinion) ہیں جن کو ہزارھا ایسے ہندستانی خریدتے اور پڑھتے ہیں جن کو انگریزی زبان میں بھی اتنی ہی مہارت حاصل ہے جتنی اپنی مادری زبان میں۔ انگریزی اخبارات کی مثال اکثر ان کے پیش نظر رہتی ہے اور انھیں کی جرأت بیان کی بھی وہ پیروی

۱　علیگڑھ اخبار شمارۂ ۱۷ و ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

کرتے ہیں - وہ اکثر مخالفت بھی کرتے ہیں' ہندستانی زبان کے اخباروں کو اس کی ہمت نہیں پڑتی اور کم و بیش ہندستانی بودےپن کا ان پر اثر رہتا ہے - انھیں مقلد یورپ اخبارات سے حکومت کو اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی رائے کا علم ہوتا ہے - دیسی زبان کے اخبارات کی اکثر شہروں میں خاص اہمیت ہوتی ہے - صوبجات شمال مغربی' پنجاب' اودھ' صوبجات متوسط اور راجپوتانے میں اسّی اخبارات نکلتے ہیں جن میں سے اکثر ہفتے میں ایک یا دو بار شایع ہوتے ہیں - صرف اودھ سے ۲۵ اردو اخبارات شایع ہوتے ہیں جن کی مجموعی اشاعت پانچ ہزار سات سو نوے ہے اور جن میں مقامی اور بیرونی خبریں شایع ہوتی رہتی ہیں -

ان میں سے چونتیس اخبارات کا ذکر میں اس سال کے تبصرے میں کروں گا :-

« آثارالامصار و اصح الاخبار » لکھنؤ سے نکلتا ہے اور اس میں مسلمان مولویوں کے فتوے شایع ہوتے ہیں - اس کا ایک نام « صبح الاخبار » بھی ہے -

« اخبار عام » لاہور کا ایک مقبول عام رسالہ - خبریں کثرت سے شایع کرتا ہے -

« اخبار انجمن شاھجہانپور » اس شہر کی ادبی انجمن کا اخبار جس نے « سنڈراس گزٹ » (Sandras Gazette) کی جگہ لے لی ہے؛ میں نے سنہ ۱۸۷۱ع کے تبصرے میں اس کا ذکر کیا تھا -

« اخبار سررشتۂ تعلیم » (صوبۂ شمال مغربی) اس کے ایڈیٹر بابو شیورام ہیں -

« اخبارالاخیار » لکھنؤ کا ایک ہفتہوار اخبار جو مرزاپور اور مدراس کے دو ہمنام اخباروں سے مختلف ہے - اس کے اڈیٹر منشی محمدعلی ہیں -

« بھارت پتریکا » لکھنؤ کے اس رسالے کا ہندی نام ہے جس کا اردو لقب « اخبار انجمن ہند » ہے اور جس کا اس موخرالذکر نام سے میں نے اپنی « تاریخ ہندوی و ہندستانی » میں ذکر کیا ہے - یہ ہفتہوار اخبار صرف تعلقداران اودھ کے مضامین کے لیے وقف ہے -

« برہم گویاں پرکاش » بمبئی کا اردو اخبار جس کا مسلک وحدت پرستی کی اشاعت ہے -

« دھولپور گزٹ » دھولپور کا اردو اخبار جس کی مدبر « علیگڑھ اخبار » نے تعریف کی ہے -

« ہادی حقیقت » ایک نیا اخبار جو لاھور سے مہینے میں دو بار چھوٹی تقطیع کے چار صفحوں پر شایع ھوتا ھے جو برھما سماج کے نقطۂ نظر سے مذھبی مسائل پر بحث کرتا ھے - اس میں خدا کی وحدت کے دلائل پیش کیے جاتے ھیں اور ھندو دھرم کے سچے اصول بیان کیے جاتے ھیں، گمراہ اور باطل اوھام کی تردید کی جاتی ھے اور مذموم رسوم کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی جاتی ھے -

« ھریش چندر میگزین » جس کا آئندہ ذکر آئےگا -

« ھندی پرکاش » ھفتہوار اخبار جو امرتسر سے « دھرم سبھا » کی جانب سے ا کتوبر سنہ ۱۸۷۳ع سے تین طرح کے رسم‌الخط، اردو، دیوناگری، اور گورمکھی میں شایع ھوتا ھے -

« گوالیار گزٹ » - میں اس امر سے قطع نظر کرتا ھوں کہ « گوالیار اخبار » کے نام سے میں نے اس پر اپنی « تاریخ ھندوی و ھندستانی » میں تنقید کی تھی - اب اس اخبار میں دو کالم ھوتے ھیں، ایک اردو میں اور دوسرا مارواڑ کی بولی میں - اس میں دربار گوالیار کی خبریں اور احکامات شایع ھوتے ھیں -

« اسٹریچی گزٹ » مرادآباد - اس نئے اخبار کے اڈیٹر منشی مہدی حسن خاں نے یہ دیکھ کر کہ بہت سے اردو اخبارات مشہور انگریزوں کی سر پرستی میں جاری کیے گئے ھیں اور انھیں کے ناموں سے نکلتے ھیں مثلاً «لارنس گزٹ، میور گزٹ، میو گزٹ، اپنے اخبار کو سر جان سٹریچی (Sir John Strachey) کی سر پرستی میں شایع کیا ھے اور اخبار کا نام بھی انھیں کا ذرا بگڑا ھوا نام ھے - علیگڑھ اخبار مورخۂ ۷ فروری ۱۸۷۳ع نے اس کی تعریف کی ھے -

« جبل پور کرانیکل » جبل پور کا اردو اخبار ھے -

« جہلم پنجاب » اخبار انجمن پنجاب میں اس اخبار کا ذکر ھے -

« خیر خواہ اودھ » لکھنؤ سے شایع ھوتا ھے -

« خیر خواہ عالم » دہلی سے عیسائی مذہب کی تردید کے لیے نکلتا ہے مگر اس میں تازہ خبریں بھی شایع ہوتی ہیں۔

« لوح محفوظ » مرادآباد جس کے اڈیٹر پر مباحثات میں غیر پارلیمانی محاورات کے استعمال کا الزام لگایا گیا ہے۔

« لارنس گزٹ » میرٹھ کا اردو رسالہ جس کے اڈیٹر منشی سید جمال الدین ہیں۔

« میسور اخبار»۔ یہ اخبار بہت شستہ اردو میں بنگلور کے اعلیٰ فن طباعت (جس کو « فردوسی » کہتے ہیں) کا مظہر ہے۔

« مارواڑ گزٹ »۔ یہ سرکاری اخبار جودھ پور سے دو زبانوں میں نکلتا ہے ایک کالم اردو میں اور دوسرا مارواڑی میں۔ عدالتی خبریں درج ہوتی ہیں۔

« ناصرالاخبار » جو دہلی سے ستمبر سنہ ۱۸۷۳ء سے شایع ہورہا ہے۔

« نور افشاں » لودھیانے کا خبروں سے مالامال اخبار جو ایک مشنری کی ادارت سے اردو اور انگریزی میں شایع ہوتا ہے۔

«نورالافلاک» کانپور ۔ یہ اخبار جو اگست سنہ ۱۸۷۳ء سے جاری ہوا ہے اس کا اعلان کرتا ہے کہ مختلف انواع کے مضامین اس میں شایع ہوں گے جس کے لیے « متاع نیک ہر دوکان کہ باشد » کا انتخاب کیا جائےگا۔

« نورالانوار » ایک اور اخبار ہے جو کانپور سے شایع ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ‌تر انگریزی اخبارات کے تراجم اور اردو اخبارات کے منتخب مضامین شایع کیے جاتے ہیں۔ اس میں اکثر منظوم قطعات اور معمے بھی ہوتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حکومت انگریزی کا مخالف اور (سر) سید احمد خاں کے خیالات کے خلاف ہے۔ اڈیٹر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ نے لکھا تھا کہ اس اخبار کے لیے زیادہ مناسب نام « ظلمت شعار » تھا کیونکہ موجودہ لقب اس کی خصوصیات کی ضد ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

« پنجاب گزٹ » پنجاب کا سرکاری اخبار ہے' اردو میں شایع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ « اردو گورنمنٹ گزٹ پنجاب » بھی کہتے ہیں۔ جنوری ۱۸۷۳ء سے یہ لاہور

سے زیر نگرانی ناظم تعلیمات کپتان ہال رایڈ (Holroyd) شایع ہو رہا ہے۔ انھوں نے مجھے اس کا مجموعہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔

« روزنامہ »۔ لکھنؤ سے بہت شستہ زبان میں شایع ہوتا ہے۔ اس میں تمام عدالتی خبریں درج ہوتی ہیں۔

« صادق الاخبار » بہاول پور۔ دھلی سے بھی اسی نام کا ایک اور اخبار شایع ہوتا ہے لیکن مقدم‌الذکر اس علاقے کا سرکاری جریدہ ہے۔

« سید الاخبار »۔ یہ نیا اخبار جو دھلی سے شایع ہوا ہے اپنے ہمنام لاھوری ہمعصر سے مختلف ہے۔ یہ گزشتہ مئی سے ایک دس بارہ کوارٹو تقطیع کے ۲۵ صفحات پر دو کالموں میں شایع ہوتا ہے۔ اس کے اڈیٹر منشی مراری لال ہیں جنھوں نے مجھے بھی از راہ عنایت اس کے کچھ شمارے بھیجے۔ میں نے ان کو بڑے شوق سے پڑھا اور ان کا شستہ و صاف اسلوب بیان مجھے بہت پسند آیا۔

« سوشل سائنس کانگریس » کا اخبار اردو میں جےپور سے ریاست کی زیر سرپرستی سرکاری طور پر شایع ہوتا ہے اور اس میں اکثر خبریں اور سرکاری احکامات شایع ہوتے ہیں۔

« صبح الاخبار »۔ اس کا تذکرہ پیشتر « آثار الامصار » کے نام سے کیا جاچکا ہے۔

« تہذیب الاخلاق » علیگڑھ کا اردو اخبار ہے جس کا انگریزی لقب « محمڈن سوشل رفارمر Mohammedan Social Reformer » ہے۔ اس کی ابتدا مسلمانوں کے قایداعظم مولوی سیداحمد خاں نے اپنے سفر یورپ کے بعد سنہ ۱۲۸۷ھ (سنہ ۱۸۷۰ع) میں کی۔ انھیں نے علیگڑھ کی ادبی سوسائٹی اور اس کے اخبار کی بھی بنیاد ڈالی اور وہ پوری سرگرمی سے اسی شہر میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تجاویز میں منہمک ہیں۔ اس کے لیے گزشتہ موقع پر پٹیالے میں بکثرت ہمدردانہ جلسے کیے گئے۔

اس رسالے کے سرپرستوں نے ایک طرح کی انجمن بنا رکھی ہے جس کا نام بھی وھی ہے جو اس رسالے کا ہے۔ تمام مشہور و معروف آزاد خیال ہندستانی مسلمان اس میں شریک ہیں۔ سید احمد خاں کے قابل فرزند سید محمود نے، جو اب ہندستان

واپس ہوئے ہیں کہ اپنے محترم والد کی اعلیٰ ادبی و اصلاحی خدمات میں ان کا ہاتھ بٹائیں، مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس رسالے کے پہلے دو برس کے مکمل پرچے مجھے بھیجیں گے۔ تب میں ان کی خوبی اور اہمیت کا اندازہ کرسکوں گا۔ یہ رسالہ مہینے میں دو بار کوارٹو تقطیع کے ۸ صفحات پر چھپتا ہے۔ یہ علیگڑھ سوسائٹی کے اخبار کی طرح چھپتا ہے اور دوسرے تمام اردو اخبارات کی طرح لیتھوگراف میں نہیں چھپتا۔ پہلے شمارے کی تاریخ بکم شوال سنہ ۱۲۸۷ ھ ہے، دوسرے کی ۱۵ اور پھر اسی طرح سلسلہ وار۔ اس بےمثل رسالے میں جو سلسلۂ مضامین نکل رہا ہے ان میں سے اکثر اسلامی دینیات و فلسفۂ عملی و علمی سے متعلق ہیں۔ ان سے مذہب سے سچی دلچسپی اور روشن خیالی کے ساتھ انسانی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ زیادہ تر مضامین خود سید احمد خاں کے ہوتے ہیں جن میں مذہب اسلام، اس کے اصول، پیغمبر اسلام، احادیث اور چار اسلامی فرقوں، مذہبی اعتقادات اور تعصبات، غلامی، آزادی خیال، مصر کی قابل تقلید اصلاحات، تربیت اطفال اور تعلیم عمومی، فلسفیانہ اور روایاتی علوم، مذہب اور حکومت کی ہم آہنگی، جدید سائنسوں کی ترقیوں، علم ہئیت کے متعلق اسلامی خیالات، فرق مابین تعلیم و تربیت اور بہت سے اہم اور دلچسپ مباحث پر بحث کی جاتی ہے۔ سال دوم کے تمامتر شمارے (سر) سید کے مقبول نظر مقصد یعنے مسلمانوں کے لیے ایک اعلیٰ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز سے متعلق مضامین سے پر ہیں۔

«طلسم ؤڑنین» بنگلور سے نکلتا ہے جس میں کبھی کبھی اچھے مضامین چھپتے ہیں۔

«اردو دھلی گزٹ»۔ آگرے کا یہ اخبار بلا لحاظ اپنے نام کے ہفتہ میں ایک بار چھپتا ہے اور خبروں سے لبریز ہوتا ہے۔ اس میں کابل کے ایک نامہ نگار کی اطلاعیں بھی چھپتی ہیں۔

لاہور کا اردو اخبار موسوم بہ «پنجابی» اپنے ایک شمارے[۱] میں اپنے ایک مضمون «ہندستانی شاعری» میں بر سبیل تذکرہ تہذیب‌الاخلاق کی تعریف کرتا ہے۔

«تین یا چار شعرا کے سوا مشاہیر شعرا نے فن قصیدہ نگاری کو ترقی دینے کے قابل

---

۱ شمارۂ ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع

نہیں گردانا ۔ آتش نے ایک شعر بھی کسی کی مدح میں نہیں لکھا ۔ سودا، ناسخ، جراءت، مومن، ذوق، وغیرہ نے قصیدے لکھے تو ہیں لیکن صلے کی توقع کے بغیر۔ غالب کی حد تک یہ، کہ اگر مجھے ان کے احباب اور ان کے شاگردوں کو جو ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں رنج دینے کا خوف نہ ہوتا تو میں یہ ضرور کہتا کہ اس شاعر میں جہاں اور ہر طرح کی اعلیٰ خوبیاں تھیں وہاں یہ عیب بھی تھا کہ جب کبھی وہ کسی نزاب، کسی خان، کسی رائے یا کسی مشہور ہندستانی کا ذکر کرتا تو قصیدے کا رنگ اختیار کرلیتا ۔ لیکن میں یہاں صرف ان لوگوں کی اصلی کیفیت پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فن شاعری اختیا کرنا چاہتے ہیں ۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اب شاعری کرنا بہت دشوار ہے ۔ جو لوگ اس طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، مفلسی اور ضروریات کی محتاجی انہیں روکتی ہے ۔ اس کا اندیشہ ہے کہ اس صدی کے ختم تک بلکہ شاید کچھ ہی عرصے میں یہ فن لطیف بالکل نابود ہوجائے ۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ اب شعرا باقی نہیں رہ گئے ہیں یا کوئی شخص شعر نہیں کہنا چاہتا ۔ اس کے برعکس شاعری کی طلب بڑھ گئی ہے مگر شاعری کا معیار گرگیا ہے ۔ ہمارے دور کے شعرا شعر کہتے وقت یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ پڑھنے والوں کو ان کے شعر خوشگوار یا ناخوش گوار معلوم ہوں گے کیوں کہ اچھے شعر سنتے وقت ہر شخص ناقص اشعار کا طالب معلوم ہوتا ہے ۔ شعرگوئی کا ہندستانی زبان سے جس قدر تعلق ہے شاید ہی کسی اور زبان سے ہو مگر بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ نئے خیالات تلاش کیے جائیں اور نئی طرح ادا کیے جائیں وہی اسلوب اور وہی صنعتیں استعمال کی جاتی ہیں جو متقدمین استعمال کرتے تھے ۔ ہندستانی حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ لکھا جاسکتا تھا متقدمین لکھ چکے ہیں اور اب بجز ان کے خیالات کو دھرانے کے اور کوئی صورت نہیں ۔

سید احمد خان نے اس امر پر نظر ڈالی ہے کہ نثر کا بھی وہی حال ہے جو نظم کا ہے ۔ اس میں بھی ہر جگہ تقلید ہی تقلید نظر آتی ہے ۔

انگریز اس امر کو اپنے ادب کا کمال سمجھتے ھیں کہ اس میں آئے دن نت نئے خیالات کا اضافہ ھوتا جائے۔ ھندستانیوں کو ھرگز یقین نہیں آئے گا اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ان جدتوں میں فصاحت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ مگر ھندستانی تو مسلسل تقلید کے قایل ھیں اور کسی نئے اسلوب بیان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ھمیں اب یہ چاھیے کہ تقلید ترک کردیں اور ھم میں سے ہر ایک اپنے خاص انداز تحریر کے مطابق لکھے۔

اخبار ‹‹ پنجابی ›› جس سے میں نے یہ نقل کیا ھے، محمد اعظم صاحب[1] کی مستقل ادارت میں شایع ھوتا ھے اور اب تک کامیابی سے نکل رھا ھے۔ اس کا ھرشمارہ کم از کم کوارٹو تقطیع کے تیرہ صفحات پر مشتمل ھوتا ھے۔ ھر صفحے پر تین کالم ھوتے ھیں حسب سابق مضامین حقیقت میں ادبی لحاظ سے بلند پایہ ھوتے ھیں اور نظمیں بہت دلکش ھوتی ھیں جن سے اندازہ ھوتا ھے کہ اعلی اردو شاعری کا مذاق باوجود تخریب کی کوششوں کے اب بھی ھندستان میں بڑی حد تک موجود ھے۔ قابل ذکر مضامین میں سے میں اس سلسلۂ مضامین کا ذکر کرنا چاھتا ھوں جس میں ان فارسی محاورات اور ضرب الامثال سے بحث کی گئی ھے جو اردو میں رائج ھیں۔ ان کی تشریح کے لیے مثالوں کا بہت اچھا انتخاب کیا گیا ھے۔ مجھے اس رسالے کی ایک اور خصوصیت پسند ھے اور وہ یہ کہ اس میں نئی دیسی تصنیفات پر بہت بسیط مضامین ھوتے ھیں۔ ان مضامین کے درمیان ایک ایسا بھی مضمون ھے جو کسی قسم کی دلچسپی کا موجب نہیں[2]۔ یہ مضمون اھل سنت کے مذھب سے متعلق ایک کتاب موسوم بہ ‹‹ اظہارالحق ›› کی تردید میں لکھا گیا ھے۔ اس مضمون کے مصنف جن کا تعلق فرقۂ شیعہ یعنی امامیہ سے ھے، سنیوں کے ادعا کے اور ان کے اس دعوے کے کہ وہ دین برحق پر ھیں، شاکی ھیں۔

---

۱ یہی صاحب جو مشہور مسلمانوں میں شمار ھوتے ھیں، لاھور کے ایک عربی اخبار ‹‹ النفع الاعظم ›› کے بھی اڈیٹر ھیں جس کے نام میں ان کے نام کی رعایت رکھی گئی ھے۔ ھندستان بھر سے یہی ایک اخبار عربی میں نکلتا ھے۔

۲ شمارۂ یکم مارچ سنہ ۱۸۷۳ع۔

ایک اور شمارے[1] میں ایک مضمون کا موضوع خطابات کا مذموم اثر ہے جو ایشیا پر بالعموم اور ہندستان پر بالخصوص پڑا۔ یہ خطابات اصلی ناموں کے پہلے یا ان کے بعد اضافہ کیے جاتے ہیں[2] ۔ واجد علی شاہ سابق بادشاہ اودھ نے ہر شخص کو «دولہ» کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس طرح ان کا باغباں بجائے محض «مالی» کہلانے کے «گلبان الدولہ» کا خطاب رکھتا تھا۔ ان کے باورچی کا خطاب «نمکین الدولہ» تھا۔ مضمون نگار کا منشا یہ تھا کہ انگریزوں کی متانت کی پیروی کی جائے اور آئندہ سے ان بظاہر پُر شکوہ لیکن فی الحقیت مہمل خطابات کو ترک کردیا جائے۔

علی گڑھ اخبار[3] کا ایک نامہ نگار بھی ان ہندستانی اعزازی خطابات کا شاکی ہے؛ وہ ان لوگوں کی شکایت کرتا ہے جو بلا امتیاز اور بے لحاظ اس قسم کے القاب استعمال کرتے ہیں جن کا مقصد واضح نہیں ہوتا؛ مثلاً «قبلہ و کعبۂ دوعالم» «ماوا و ملجائے بیکساں» «چارۂ بے چارگاں» وغیرہ۔ مزید برآں طرز تحریر میں یہ لوگ اس قدر غلو اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ بعض اوقات خطوط کا مطلب سمجھنے کے لیے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی ہے!

اخبار انجمن پنجاب مورخۂ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع میں ایک بلند پایہ اور بےحد دلچسپ مضمون مشرقی مبالغے اور ذوق ستایش کی مخالفت میں شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار کشن لال صاحب طالب ساکن راولپنڈی ہیں اور مضمون اٹھارہ کالموں پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا ایک قصیدے سے کی گئی ہے جس کا قافیہ «مبالغہ» ہے۔ خاتمہ بھی ایک نظم پر کیا گیا ہے۔

اسی موضوع پر ایک اور مضمون «اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ[4]» میں بھی شایع ہوا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بدرجۂ مجبوری گورنمنٹ کو ان طولانی اعزازی القاب اور سرکاری خطوط میں آداب انشا کے تکلفات کے خلاف قدم اٹھانا پڑا۔ چنانچہ

---

۱ شمارہ ۲۵ جنوری ۱۸۷۳

۲ ملاحظہ ہو میری کتاب ''Memoire sur les noms et titres musulmans'

۳ شمارہ ۳۰ مئی ۱۸۷۳ء

۴ شمارہ یکم اگست سنہ ۱۸۷۳ع

ڈاک کے محکمے میں ان کے استعمال کی ممانعت کردی گئی ہے کیونکہ اکثر پرتکلف القاب کے ہجوم میں نام کا پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔

«اخبارالاخیار» جو بہار کی ادبی انجمن کا اخبار ہے اب بھی اسی طرح دلچسپ ہے اگرچہ کہ سر جارج کیمبل (Sir. G. Campbell) کو خوش کرنے کے لیے اردو متن کے ساتھ ساتھ ہندی ترجمہ بھی شامل کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے مضامین کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ ضخامت وہی ہے جو پہلے تھی۔

«اتالیق پنجاب» میں دلچسپ اور مفید مضامین برابر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصیت سے قابل ذکر ایک سلسلۂ مضامین ہے جن میں قدیم اور جدید ہندستان کی مشہور خواتین کے تذکرے ہیں۔

انجمن مناظرہ دہلی سے ہر ماہ اس کا رسالہ شایع ہوتا رہتا ہے جس کا ذکر پنجاب کی اشاعتوں کی سرکاری فہرست میں کیا جاچکا ہے[1]۔

«الموڑہ اخبار» ضلع کمایوں کے اسی قصبے سے شائع ہوتا ہے جس کے نام سے وہ موسوم ہے۔ یہ دیوناگری رسم‌الخط میں چھپتا ہے۔ اس کا کوئی پرچہ میری نظر سے نہیں گزرا اور میں اس کی سیاسی اور ادبی اہمیت کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن منشی محمدحسین نے علیگڑھ اخبار[2] میں ہندستان کے خاص اخبارات پر تبصرے کرتے ہوئے اس کو «میٹا پھوس» کہا ہے۔ اس لفظ کا مفہوم انگریزی لفظ Trash [3] سے ادا ہوتا ہے۔ اس پر اخبار کے اڈیٹر کو بہت غصہ ہے اور اس لفظ سے پیچ و تاب کھاکر انھوں نے پلٹ کر منشی صاحب کو «بھونکنے والے کتے» کا لقب دیا ہے۔ یہ دونوں القاب پارلیمانی معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ میں بھی ہم لوگ اسی قسم کی خوش اخلاقی کے عادی ہیں۔

---

۱ میں نے اس کا ذکر اپنے مقالۂ سنہ ۱۸۷۲ع میں کیا ہے۔

۲ شمارۂ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع

۳ اس لفظ سے پرووانسال (Provensal) لفظ "estresse" یاد آتا ہے

بٹالہ کی ادبی انجمن لکشمن سہائے کی ادارت میں اپنا ماہوار رسالہ برابر شایع کر رہی ہے جس کا نام « رسالۂ انجمن بٹالہ » ہے -

ہندی کا بہت پسندیدہ رسالہ « کوی بچن سدھا » ایک مدت سے بابو ہریش چندر کی ادارت میں پہلے ماہانہ پھر مہینے میں دو بار شایع ہوتا رہا اور اب گزشتہ ستمبر سے ہفتہ‌وار شایع ہو رہا ہے اور اس کے مشہور اڈیٹر نے ۱۵ اکتوبر سے چند اور مشہور ہندستانیوں کے ساتھ ہندی ہی میں ایک اور ماہوار رسالہ « ہریش چندر میگزین» کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے جس میں نظموں کے انتخابات، تصانیف پر تبصرے، تاریخی، ادبی، سیاسی، فلسفیانہ مباحث، افسانے اور ضرورت کی وجہ سے گپ‌شپ اور لطائف و ظرائف شایع ہؤا کریں گے۔ پہلا شمارہ جو بابو صاحب کی عنایت سے میرے پیش نظر ہے کوارٹو تقطیع کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحے پر دو کالم ہیں جن میں رادھا سودھا کی « ساتکا» کے ابتدائی ۲۵ شعر ہیں جو بھکتی سوترا سے لیے گیے ہیں، ایک ڈراما کا ٹکڑا ہے، چند سوالات ہیں جو ہندوؤں کی جانب سے انگریزوں سے کیے ہیں، مختلف مضامین پر کچھ کالم انگریزی میں ہیں- ہریش چندر کے ایک مضمون کا ابتدائی حصہ ہے جس کا عنوان « اُراھنا » ہے - «کھتری» فرقہ کی ابتدا کے متعلق ایک دلچسپ مضمون ہے جو مسلسل شایع ہوتا رہے گا، دو دوستوں کے درمیان ایک مکالمہ ہے - آخر میں مذہب تثلیث پر ایک مضمون ہے اور بابو گدّدھر سنگھ کے ایک بنگالی ناول کا ابتدائی حصہ ہے -

« اردو گائیڈ» جس کا اپنی« تاریخ ادب ہندوی و ہندستانی » میں میں نے صرف ذکر کیا ہے، کلکتے سے شایع ہوتا ہے - دو کالم ہوتے ہیں ایک انگریزی اور دوسرا اردو- یہ بہت اچھا اخبار ہے اور اس کی اشاعت کثیر ہے -

اپنی اسی تصنیف میں « شمس‌الاخبار » کا میں نے محض نام ہی گنایا ہے - علی‌گڑھ اخبار [1] سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو اخبار مشنری حضرات مسلمانوں کے خاص عقاید کی تردید میں نکالتے ہیں - اس کے اڈیٹر ایک مرتد مسلمان رجب‌علی ہیں -

---

[1] شمارۂ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ء

گزشتہ سال میں نے محض اشارتاً « پٹیالہ اخبار » کا ذکر کیا تھا جو پٹیالے سے نکلتا ہے - لیکن اس کی اشاعت ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک مضمون « ہندستانی صحافت » پر شایع ہوا ہے جو توجہ کے قابل ہے - علی گڑھ اخبار نے اپنی ۲۷ دسمبر کی اشاعت میں اس کو نقل کیا ہے - ابتدا میں انھیں خیالات کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے بعد کے شماروں میں اسی بحث کی مزید تشریح کے لیے اور بہت سے مضامین شایع کیے ہیں - یہ مضامین بہت طویل ہیں اور رسالہ کے کئی کالم ان سے بھرے ہوئے ہیں - میں ان مضامین کا محض ایک نہایت مختصر سا خلاصہ بیان کرسکتا ہوں -

اڈیٹر « پٹیالہ اخبار » کی رائے میں اخبارات کا پہلا مقصد ناظرین کی ہدایت ہے اور دوسرا مقصد رعایا کی شکایتوں کو حکومت کے سامنے پیش کرنا اور ان کا علاج تجویز کرنا - لیکن ان دونوں مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اخبارات کے اڈیٹر خود بھی معزز ہوں، ضروری حد تک فاضل ہوں اور جن مضامین کو پیش کرنا چاہتے ہوں ان کی تشریح و اشاعت کا ہر ممکن ذریعہ استعمال کریں - اڈیٹر کی رائے میں بہت کم دیسی اخبارات اپنے اعلی فرائض انجام دینے کے قابل ہیں - صرف خبریں ہی ان اخبارات میں کچھ اہمیت رکھتی ہیں مگر ان کی حیثیت بھی ضمیمے کی سی ہے کیوں کہ پست مضامین، جن سے اخبار کا اکثر و بیشتر حصہ بھرا ہوتا ہے، کے بعد تھوڑی سی خبریں بھی چھاپ دی جاتی ہیں -

« پٹیالہ اخبار » کے اڈیٹر کی تمنا ہے کہ ہندستانی اخبارات میں بھی ٹائمز اور دوسرے انگریزی اخبارات کے سے بلند پایہ مضامین شایع ہوسکیں - وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ان اخبارات کی انتہائی احتیاط سے ادارت کی جائے تاکہ حقیقی طور پر بہتر نتائج حاصل ہوسکیں اور وہ اثر حاصل ہوسکے جو تعلیم کی عام اشاعت کے لیے ضروری ہے - لیکن اس کے ساتھ ہی میری رائے میں وہ ایک ناقابل عمل تجویز بھی پیش کرتا ہے کہ اس مقصد کے لیے ایک مرکزی کمیٹی بنائی جائے جس میں ارکان کا بہت وسیع پیمانہ پر انتخاب کیا جائے اور یہ کمیٹی ہندستان کے تمام اخبارات کی نگرانی کرے

اور بھی بہت سے خیالات جو بہت تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ ان مضامین کا مصنف اخبارات میں اس شے کا طالب ہے جو کسی بات میں حاصل نہیں ہوسکتی—یعنی کمال۔ وہ چاہتا ہے کہ نقصان رساں مضامین نہ شایع کیے جائیں (اس حد تک تو اس کا کہنا صحیح ہے) مگر اس کے ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ انتہائی غیر جانبداری برتی جائے، اشتہارات کی قسم کے مضامین شایع نہ کیے جائیں، ظریفانہ مضامین اور ایسے مضامین جن میں تخییل کی چاشنی ہے، مسترد کردیے جائیں اور صرف سنجیدہ اور کارآمد مضامین شایع کیے جائیں۔ آخر میں وہ باشندگان ہند کے عدم اتفاق پر افسوس کرتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ مسلمانوں کے بھی وہی خیالات ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ مضمون نگار کسی پارٹی کے نمایندے نہ بنیں بلکہ جو کچھ لکھیں عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے لکھیں۔ سب سے بڑھ کے وہ یہ چاہتا ہے کہ اخباروں کے سامنے ذاتی منافع نہ ہوں بلکہ رفاہ عام کے مقاصد ہوں۔

اخبار "پنجابی"[1] لکھتا ہے کہ اخبارات کی جادوبیانی یہ ہے کہ ایسے محاورات استعمال کیے جائیں جو عام فہم ہوں، زبان سلیس اور صحیح ہو اور سب اس کو سمجھ سکیں اور خیالات جن کا اظہار کیا جائے، پاکیزہ ہوں۔ اس کے سوا ضروری ہے کہ اڈیٹر خبروں کی چھان بین کرے اور انھیں دلچسپی کا موجب بنائے۔ مزید برآں اڈیٹر کو ذہین اور تجربہ کار ہونا چاہیے۔ ضروری ہے کہ وہ سماج سے اچھی طرح واقف ہوں، زندہ دل ہوں، موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی برمحل محاورہ یا اچھا سا لفظ استعمال کرنا جانتے ہوں، ایسی رائے جو عوام الناس کے لیے مفید ہو سلیس اور رواں مضامین میں ظاہر کرسکتے ہوں۔ یہ سب خصوصیتیں ہر اڈیٹر کے لیے بہرصورت ضروری ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ ساتھ اڈیٹر صاحبان سائنس اور فنون میں بھی قابلیت رکھتے ہوں تو دن بدن ان کے اخبارات کی شہرت اور مقبولیت ناظرین میں بڑھتی جائے گی۔

۱　شمارۂ ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۷۳ء

اخبارات کی تعلیمی خدمات کے متعلق ایک مضمون « قاسم‌الاخبار بنگلور » کی اشاعت ۲۰ جنوری سنه ۱۸۷۳ع میں شائع ہوا ہے جس میں « اخبار عالم » میرٹھ مورخۂ ۲۶ فروری کے ایک مضمون پر رائےزنی کی گئی ہے۔ اسی بحث پر اور بکثرت مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زیادہ بہتر تھا کہ اگر ان مضامین کے لکھنے والوں کے نام معلوم ہوسکتے۔ اخبارات میں اگر ایک طرح کی ترتیب پیش‌نظر رکھی جائے تو بہت ہی اچھا ہو؛ مثلاً پہلے وہ مضامین جو عام فلاح و بہبود کے لیے لکھے گئے ہیں، پھر خبریں اور پھر وہ مضامین یا خبریں جو نسبتاً کم اہم ہیں۔ یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ مضمون نگاروں کے ناموں کے ساتھ مضمون شائع ہوا کریں یا بغیر ناموں کے جیسا کہ انگلستان میں رواج ہے۔ « علیگڑھ اخبار » کا خیال ہے کہ مضامین اگر ان مشاہیر کے زور قلم کا نتیجہ ہوں جن کی قابلیت مسلم ہے تو ان کے نام کے ساتھ شائع کرنا ہی زیادہ مفید ہے۔ اگر صورت برعکس ہو تو اس کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اگر اڈیٹر اس ذریعے سے اپنی قابلیت اظہار کرنا چاہے تو کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اس مضمون کا ہندستانی مصنف لکھتا ہے۔ « یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہندستان کے اکثر جرائد میں مضامین کے ساتھ ان کے مصنفین کے ناموں کی اشاعت کا مقصد ناظرین کو ان سے واقف کرانا ہے۔ اڈیٹروں کو یہ زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اکثر یہ مضامین اس قدر مہمل ہوتے ہیں کہ جن اخبارات میں چھپتے ہیں ان کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں» ۔

« پنجابی » مورخۂ ۱۵ مارچ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس امر کی شکایت کرتا ہے کہ باوجودیکہ ہندستانی زبان روز بروز ترقی کررہی ہے مگر اخبارات وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ وہ ان کی عدم غیر جانب‌داری کی شکایت کرتا ہے کہ اکثر بےمحل تعریف اور غلط تنقید محض اڈیٹر کی طبیعت کے لحاظ سے چھاپی جاتی ہے۔ اسے اس کی بھی شکایت ہے کہ یہ اخبارات خود کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتے بلکہ انگریزی اخبارات کی نقل کرتے ہیں۔ آخر میں وہ ایسے اخبارات کے اجرا کی خواہش ظاہر کرتا ہے جو خصوصیت سے مذہبی، ادبی اور سائنٹفک

مضامین پر بحث کریں۔ اڈیٹر «المورڑہ اخبار» عورتوں کے لیے خاص اخبارات نکالنے کی تجویز پیش کرتا ھے تاکہ آزادئ نسواں کی کوششوں میں اس سے مدد مل سکے[1] ۔

«علیگڑھ اخبار» مورخۂ ۲۳ مئی میں یہ خواھش ضرور کی گئی ھے کہ دیسی ریاستوں میں جدید تصانیف پر مضامین شائع کیے جائیں۔ مضمون نگار لکھتا ھے کہ «نئی تصانیف پر ذمہ‌دارانہ تبصرے مصنفین کی همت افزائی کا باعث ھوتے ھیں اور کھرے نقاد کی نکتہ‌چینی لکھنے والوں کو اپنے کام کی طرف اور زیادہ متوجہ کرتی ھے»۔ میں یہ کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ھوں کہ کچھ عرصے سے بےشک ھندستانی رسائل میں اس قسم کے تبصرے شائع ھو رھے ھیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ضروری ھے کہ ان میں سے اکثر میں محض بےاندازہ مدح‌سرائی کی جاتی ھے اور کتاب کے مضامین کا ایک مختصر سا خلاصہ درج کردیا جاتا ھے۔ (باقی آیندہ)

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔

مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری

(۳)

(از نورالحسن صاحب ہاشمی ایم۔اے، علیگ)

اب ہندستان کی ریاستوں کی خبریں ملاحظہ ہوں۔ یہ خبریں محض انتخاب ہیں کل نہیں ہیں۔ ابتدا میں واقعات بہت مختصر لکھے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک خود ان کو اپنی زندگی سنوارنے کا موقع نہ ملا تھا لیکن جیسے جیسے ان کی مالی حالت بہتر ہوتی گئی ڈائری میں واقعات زیادہ اطمینان سے لکھے جانے لگے۔

کپورتھلا

یکم نومبر سنہ ۱۸۶۷ع :۔ لشکر کپورتھلا آج سندیلا ہوکر گزرا۔ چونکہ راجہ صاحب بذریعہ ریل واسطے ملاقات گورنر جنرل بہادر کے لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں لہذا لشکر براہ خشکی پیدل منزل بہ منزل جاتا ہے۔

بلرام پور

۲۸ مئی سنہ ۱۸۸۲ع:۔ ۲۷ مئی کو مہاراجہ درگبجے سنگھ والی ریاست بلرام پور و تلسی پور عارضہ استسقا میں بمقام الہ آباد فوت ہوئے، عمر ۵۹ سال تھی۔ مہاراجہ کو سرکار انگلشیہ سے بہت بڑا اعزاز ملا تھا اور گیارہ ضرب توپیں سلامی کی ان کی آمد و شد میں سر ہوتی تھیں۔ سنا گیا کہ قبل وفات ایک لاکھ روپیہ پجاریان الہ آباد وغیرہ کو دیا تھا۔

حیدرآباد

۱۴ نومبر سنہ ۱۸۸۲ع :۔ مولوی ضامن حسین صاحب حال سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد میری ملاقات کو تشریف لائے اور عندالتذکرہ بیان کیا کہ حیدرآباد دکن میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی کسی کی ملاقات کو آتا ہے تو جس وقت دوسرا پان

صاحب خانہ ملاقاتی کو دیتا ھے تو اس سے رخصتی مفہوم ہوتی ھے اور اھل ملاقات پان کھاکر رخصت ھوجاتا ھے۔

۸ فروری سنہ ۱۸۸۳ ع ۔ سر سالار جنگ مختارالملک وزیراعظم دکن حیدرآباد نے بعارضہ ھیضہ وبائی آج انتقال کیا۔ یہ بہت بڑے مدبر و فرزانہ روزگار تھے اور ان کے عہد وزارت میں ریاست حیدرآباد نے بہت ترقی حاصل کی۔

۶ فروری سنہ ۱۸۸۰ ع ۔ کل نظام حیدرآباد گدی نشین ھوئے ۔ لارڈ رپن صاحب گورنر جنرل کشور ھند نے گدی نشین کیا۔

بھوپال

۲ نومبر سنہ ۱۸۸۵ ع :— معائنہ اودھ اخبار سنہ ۱۸۸۵ ع سے معلوم ھوا کہ ۲۶ ماہ حال کو بحکم گورنمنٹ مولوی صدیق حسن خان صاحب شوھر رئیسہ بھوپال سے خطاب نوابی واپس لیا گیا اور کار ریاست سے بے تعلق ھوئے اور ۱۷ ضرب توپ سلامی کی موقوف ھوئی جس کا سبب یہ معلوم ھوا کہ مولوی صاحب موصوف رعایا پر ظلم و جور بہت کرتے تھے جس کی شکایت سر لیپل گریفن صاحب ایجنٹ راجپوتانے نے گورنمنٹ سے کی تھی۔

اندور

۱۷ جون سنہ ۱۸۸۶ ع :— آج مہاراجہ ھلکر نے ۱۱ بجے دن کو انتقال کیا۔

رامپور

۲۶ مارچ سنہ ۱۸۸۷ ع :— نواب کلب علی خان صاحب والی ریاست رامپور بعوارض چند در چند ۲۳ مارچ یوم چہار شنبہ کو فوت ھوئے۔ نواب صاحب کی ذات سے بہت سے امور متعلقہ رفاہ عام سر انجام پاتے تھے اور قبل وفات نواب صاحب مرحوم نے ایک لاکھ روپیہ واسطے مرمت جامع مسجد دھلی کے عطا کیا تھا۔

حیدرآباد

۳ نومبر سنہ ۱۸۸۸ ع :— معائنہ اودھ اخبار لکھنؤ سے واضح ھوا کہ سر سالار جنگ مرحوم وزیراعظم حیدرآباد دکن کی پوتی کی شادی ایک امیر زادہ سے ھوئی۔ عمر دولھا تین سال اور دلھن کی ایک ماہ سات دن کی ھے۔ ایسی شادی نادرالوقوع ھے جو قبل اس کے کبھی سماعت میں نہیں آئی اور اسی وجہ سے اس مقام پر اس کا اندراج ھوا۔

بھوپال

۱۹ فروری سنہ ۱۸۸۹ع :۔ آج چودھری نصرت علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقداران اودھ و آنریری مجسٹریٹ لکھنؤ سے ملاقات ہوئی۔ کمال تپاک سے پیش آئے اور مجھے وہ تحریریں معائنہ کرائیں جو ان کے نام شاہجہاں بیگم صاحبہ والئی ریاست بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں صاحب شوہر رئیسہ نے بجواب شقہ طلب (شادی چودھری عزت علی خلف چودھری صاحب موصوف) بھیجی ہیں اور رئیسہ نے ایک ہزار روپیہ کا کرنسی نوٹ بطریق نیوتہ و تیاری جوڑہ کے بمعیت اپنے معتمد کے بھیجا ہے۔ تحریروں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ہر دو صاحبان کی نظر الطاف چودھری صاحب پر زاید ہے اور ان کو امیدوار ملازمت بعہدہ نائب وزارت مال کے کیا ہے جس کا اشارہ تحریر نواب صاحب میں درج تھا۔ تعداد مشاہرہ کی بالفعل چار سو پچاس قرار پائی ہے اور آئندہ کو امید ترقی ہے لیکن منشا چودھری صاحب بباعث غیر استقلالی و تلون ریاست کے معلوم نہیں ہوتا۔

رامپور

یکم مارچ سنہ ۱۸۸۹ع :— معائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ سے معلوم ہوا کہ نواب مشتاق علی خان صاحب والی ریاست رامپور نے بعارضہ سرسام بعمر ۳۳ سال واقعہ ۲۵ فروری سن حال روز دو شنبہ ۲ بجے دن کے انتقال کیا۔ دو لڑکے خورد سال چھوڑے۔ حامد علی خاں ولیعہد کی عمر ۱۴ سال کی ہے۔ صاحب ایجنٹ روہیلکھنڈ نے ولیعہد صاحب کو بتاریخ ۲۷ فروری مسند نشین ریاست کا کیا اور اختیارات ریاست اس وقت عطا ہوں گے جب وہ علوم متعرفہ کو حاصل کرکے لیاقت پیدا کریں گے اس وقت تک امور انتظامی بذریعہ کونسل تصفیہ پاتے رہیں گے جس کے وائس پریسیڈنٹ جنرل اعظم الدین خان صاحب و ممبر جوڈیشل نواب اکرام اللہ خان صاحب یارجنگ و منشی علی حسن خان صاحب ممبر مال ہیں۔ نواب مشتاق علی خان صاحب مرحوم ابتدا عمر سے بعارضہ فالج مبتلا تھے۔

بوندی

۵ اپریل سنہ ۱۸۸۹ع :— معائنہ اودھ اخبار ۵ اپریل سے معلوم ہوا کہ ۲۸ مارچ سن رواں کو مہاراؤ راجہ رام سنگھ والئی ریاست بوندی بعمر ۷۸ سال فوت ہوئے۔ ان کی رعایا ان سے بہت رضامند تھی۔ بجائے راجہ صاحب متوفی ان کے بیٹے رگھوبر سنگھ گدی نشین ہوئے۔

بھوپال

۲۶ فروری سنه ۱۸۹۰ :— بمعائنه اودھ اخبار محرره امروزه سے معلوم ہوا که نواب صدیق حسن خان صاحب شوہر شاہجہاں بیگم رئیسه بھوپال واقعه ۱۹ فروری سن رواں کو بعارضه استسقا فوت ہوئے اور ۲۰ کو دفن ہوئے۔ نواب صاحب ساکن قنوج ادنیٰ درجه کے آدمی تھے لیکن اقبال نے کچھ ایسی ترقی کی که دفعتاً شوہر رئیسه ہوکر مرتبه اعلیٰ پر پہنچے اور خطاب نوابی گورنمنٹ انگلشیه سے حاصل ہوا اور گیاره ضرب توپ سلامی کے مقرر ہوئے۔ لیکن تھوڑے عرصه میں به ثبوت مخالفت گورنمنٹ نے خطاب وغیره واپس لیا اور عہدۂ مدارالمہامی ریاست سے معزول کیا جس کا سخت صدمه نواب صاحب کو ہوا اور کوئی کوشش حصول اعزاز کارگر نه ہوئی۔ بالآخر اسی کوفت میں انتقال کیا۔ اگرچه ذی علم تھے لیکن ماده انتظامی دماغ میں نه تھا۔ تلوّن کی شکایت تھی اور مخبری پر دار و مدار جس سے سارے اہل کاران ریاست ہر وقت اندیشه ناک رہتے تھے۔ نواب صاحب کی ذات سے رئیسه کی بیٹی اور داماد کے درمیان عداوت قلبی تھی۔ یقین ہے که اس حادثه سے اہل کاران ریاست کم ملول ہوں۔

کشمیر

۲۵ جولائی سنه ۱۸۹۲ ع :—آج پنڈت منوہر ناتھ خلف پنڈت بشمبھرناتھ صاحب سابق سبجج اضلاع اودھ بہمراهی راجه کنعد نراندر بہادر صاحب تعلقه‌دار میری ملاقات کو تشریف لائے اور اپنی مہذبانه بات چیت سے مجھے خوش کیا۔ بالفعل پنڈت صاحب سٹی مجسٹریٹ شہر سری‌نگر کشمیر کے ہیں اور ۳۰۰ ماہوار تنخواه پاتے ہیں۔ میری ان سے اس وقت کی ملاقات ہے جب‌که ان کے والد من ابتدا سنه۷۳ ع لغایت سنه ۷۶ ع تحصیلدار سندیله تھے۔ پنڈت صاحب کا بیان ہے که اس موسم میں جب‌که یہاں زمانه بارش کا ہوتا ہے تو کشمیر کا موسم نہایت خوشگوار و پسندیده ہوتا ہے اور دور دور کے لوگ وہاں تفریحاً اسی زمانے میں جاتے ہیں۔

حیدرآباد

۲۶ مارچ سنه ۱۸۹۳ ع :— بمعائنه اودھ اخبار مطبوعه امروزه سے معلوم ہوا که جو مقدمه توہین کا نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ سابق ہوم سکریٹری ریاست حیدرآباد دکن ساکن ضلع نواب گنج اودھ نے دربارۂ اشاعت پمفلٹ

فضیحتی نسبت بدچلنی و بداطواری مسماۃ گرٹڈر ڈانڈلے (زوجہ مہدی حسن) کے مسٹر مترا بنگالی پر دائر کیا تھا اور جس کی تحقیقات مسٹر ویس کویٹھ اسسٹنٹ رزیڈنٹ حیدرآباد مدت ایک سال سے کررھے تھے اسے ختم کرکے ۱۹ اپریل سنہ ۹۳ع کو اپنی تجویز مجمع عام میں سنائی کہ مترا ملزم اس بنیاد پر بری ہوا کہ اثبات جرم کے یہ ثابت کرنے میں ناکامی کہ مترا نے پمفلٹ شایع کیا تھا اور واجبیت کے بابتہ مجسٹریٹ صاحب نے فیصلہ قلم‌بند کرنے سے انکار کیا ھرچند کہ فریقین کی استدعا تھی۔

مقدمہ ھذا میں بہت بڑی طوالت و فضیحتی ہوئی جو ھندستان کی تواریخ میں قابل یادگار ھوگی۔ آغا مرزا ملقب بہ سرور جنگ برادر زادہ مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ اضلاع سیتاپور و ھردوئی ساکن دھلی حال سکریٹری صیغہ متفرقات ریاست نظام بانئی مقدمہ ھذا تھے اور انھیں کی مدد سے یہ مقدمہ اس قدر زمانہ تک چلا جس میں لکھوکھا روپیہ صرف ھوا۔ ان کے معین سر خورشید جاہ یکے از دولت‌مند اخوان ریاست ھیں اور مہدی حسن کے مددگار سر آسماں جاہ وزیر ریاست۔ پس انھیں دو صاحبوں کا روپیہ صرف ھوا ورنہ سرورجنگ و فتح نواز جنگ کچھ بالذّات ایسی مقدرت نہ رکھتے تھے کہ چند ہزار روپیہ بھی اپنی جیب خاص سے صرف کرسکتے۔ آج کل سرورجنگ کا بہت بڑا زمانہ ھے۔ نظام حیدرآباد دکن کی ناک کے بال ھورھے ھیں اور مابین نظام و صاحب ریذیڈنٹ کے متوسط ھیں۔

یکم اگست سنہ ۱۸۹۳ع۔ بمعائنہ اودھ اخبار مطبوعہ امروزہ کے واضح ھوا کہ مولوی مہدی علی خان صاحب ملقب بہ نواب محسن‌الملک جو ھوم ڈیپارٹمنٹ ریاست حیدرآباد کے نامور وزیر تھے اور جن کی لیاقت و عالی دماغی کی بہت تعریف تھی اور ریاست موصوفہ کے سچے خیرخواہ تھے، مسٹر پلوڈل صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد کی پولٹیکل کارروائیوں سے علیحدہ ھوئے اور یکم محرم سنہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۵ جولائی سنہ الیہ کو ریاست موصوفہ سے اپنے وطن مالوفہ شہر اٹاوہ کو روانہ ھوئے جن کی مفارقت میں ہزارھا پارسی، دکھنی و ھندستانی بوقت رخصت اسٹیشن ریلوے پر چشم پُرنم و گریاں تھے۔ سچ یہ ھے کہ یہ زمانہ خیرخواہ لوگوں کا دشمن ھے۔ یہ مسلمہ

امر ہے کہ جب کسی ریاست میں زوال آنے والا ہوتا ہے تو وہاں سے خیر طلب لوگ اول اسی طور سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔

قلات

۲۴ اگست سنہ ۱۸۹۳ء :- بمعائنہ اودھ اخبار کے واضح ہوا کہ خداداد خاں خان قلات بلوچستان بباعث قتل کرنے اپنے وزیر و وزیرزادہ کے معزول ہوئے اور بجائے ان کے محمود خاں ان کے بڑے بیٹے حسب منظوری گورنمنٹ ہند والی قلات مشتہر ہوئے۔

رامپور

۴ اپریل سنہ ۱۸۹۴ء :- آج صبح کو سر چارلس کراس ویٹ صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ نے نواب حامد علی خاںصاحب والئی ریاست رامپور کو حسب ضابطہ مسند نشین کیا اور ایک ہزار اشرفی نواب صاحب نے بطور نذر کے پیش کی۔

حیدرآباد

۹ فروری سنہ ۱۸۹۷ء :- ۳ فروری سن الیہ کو آغا مرزا بلقب نواب سرور جنگ پیشی سکریٹری نظام حیدرآباد اپنے عہدہ سے علیحدہ کیے گئے اور بلدہ سے خارج۔ چار سال تک ان کا زمانہ بہت موافق رہا اور لاکھوں روپیہ کمایا۔ اور سر آسمان جاہ وزیراعظم و نواب محسن الملک مہدی علی خاں و نواب مہدی حسن انھیں کی کارروائیوں سے موقوف ہوئے تھے۔

بھوپال

۱۹ جون سنہ ۱۹۰۱ء :- خط برخوردار مجتبےٰ علی مورخہ ۲۹ صفر موصولہ بھوپال سے واضح ہوا کہ تاریخ ۱۶ جون سنہ ۱۹۰۱ء یوم یکشنبہ ساڑھے ۱۱ بجے دن کے سرکار عالیہ شاھجہان بیگم صاحبہ والی ریاست بھوپال نے بعمر ۶۵ سال مرض آکلا میں رحلت کی جس شکایت میں وہ ایک سال سے مبتلا تھیں۔ رئیسہ کے مزاج میں خیر خیرات بہت تھی اور پکی مسلمان تھیں۔ انھوں نے اپنا عقد ثانی مولوی صدیق حسن قنوجی سے کیا تھا جو شوہر ہونے کے بعد خطاب نواب سے ممتاز ہوئے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا۔ اسے بارہ سال کا زمانہ ہوا کہ مولوی صاحب موصوف نے رحلت کی۔ مرحومہ بعد نماز مغرب باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں۔ پچیس ہزار سے زائد لوگ شریک نماز تھے۔ بعد وفات رئیسہ مرحومہ ان کی ولیعہدہ

بیٹی سلطان جہاں بیگم صاحبہ داخل تاج محل ہوئیں ۔ چونکہ رئیسہ مرحومہ ۱۶ سال سے ان سے ناراض تھیں اس وجہ سے صرف ایک مرتبہ بیٹی صاحبہ چند منٹ کے لیے اپنی والدہ کی عیادت کو آئیں تھیں اور اب بعد وفات آئیں ۔

۲۸ جون سنہ ۱۹۰۱ع :— آج برخوردار مجتبےٰعلی مع ہمشیرہ منجھلی خود وارد سندیلہ ہوئے جن کی زبانی معلوم ہوا کہ ۳ جولائی مطابق ۱۷ ربیع‌الاول سنہ رواں کو جناب سلطان جہاں بیگم رئیسہ بھوپال تخت نشیں ہوں گی ۔ لیکن انھوں نے انتظام ریاست ابھی سے شروع کردیا ھے اور ہر ایک کارخانہ میں تخفیف کا لگا لگا دیا ھے ۔ چنانچہ تعمیرات میں ۲۵ ہزار روپے ماہوار کا صرفہ تھا جو گھٹا کر صرف دو ہزار روپیہ کردیا گیا اور جس قدر بیگمات لکھنؤ وغیرہ کی محل سرا میں تھیں ان سب کو نکال دیا گیا اور منشی احتشام علی خلف منشی امتیاز علی صاحب مرحوم سابق وزیراعظم کو جو تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ملتی تھی وہ موقوف کردی گئی ۔ غرض کہ ریاست میں ہر قسم کا عزل و نصب ہو رہا ھے اور سلطان جہاں بیگم اپنے شوہر احمد علی خاں بلقب سلطان دولہا کی رائے پر کام کرتی ھیں ۔

۲۹ جون سنہ ۱۹۰۱ع:— حالات مختصر جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال ۔ آپ ۶ جمادی‌الاول سنہ ۱۲۵۴ھ میں قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں اور ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۰ ہجری کو بیگم صاحبہ کے والد جہانگیر محمد خاں صاحب نے بعارضہ ضعف معدہ انتقال کیا ۔ ۱۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۱ ہجری کو بخشی باقی محمد خاں بلقب امراؤ دولھا صاحب سے آپ کی شادی ہوئی اور ۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۴ ہجری کو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ پیدا ہوئیں ۔ ۲۱ صفر سنہ ۱۲۸۴ ہجری کو امراؤالدولہ صاحب شوہر بیگم صاحبہ نے انتقال کیا اور ۱۴ رجب سنہ ۱۲۸۵ ہجری کو نواب سکندر بیگم صاحبہ والدہ ماجدہ نواب بیگم صاحبہ نے انتقال کیا ۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ یکم شعبان سنہ ۱۲۸۵ھ کو مسند نشیں ہوئیں اور موصوف‌الیہا نے سنہ ۱۲۸۸ ہجری میں مولوی صدیق حسن صاحب قنوجی سے عقد ثانی کر لیا ۔ شاہجہاں آباد کی آبادی میں قریباً ایک ہزار روپیہ صرف کیا جس کو آپ نے خود آباد کیا اور ۱۶ جون سنہ ۱۹۰۱ع

مطابق ۲۹ صفر سنہ ۱۳۱۹ ہجری یوم یکشنبہ کو انتقال کیا اور ۳ جولائی سنہ ۱۹۰۱ء مطابق ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۹ ہجری یوم پنجشنبہ کو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دختر بلند اختر شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا اور ان کے خلف اکبر نصراللہ خاں صاحب ولیعہد ریاست مقرر ہوئے ۔ اس وقت عمر رئیسہ حال کی ۴۵ سال ہے اور ان کے دو فرزند اور ایک شوہر نواب سلطان دولہا صاحب اس وقت موجود ہیں اور ان ہی کی رائے پر کام ریاست چل رہا ہے ۔

جودھپور

نیز آج خط عزیز از جان سید اعجازالحسن مورخۂ ۱۶ جون سنہ رواں کے جو جودھپور سے موصول ہوا وہ لکھتے ہیں کہ اس ریاست کے سکریٹری پنڈت دینا ناتھ جی صاحب ہیں جن کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار اور پانچ سو کی ان کی جاگیر ہے ۔ پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب منجھلے بھائی سکریٹری صاحب کے جوڈیشل سکریٹری ہیں اور انگریزی میں بی ۔اے پاس ہیں اور خطاب راؤ بہادر گورنمنٹ سے ان کو ملا ہے ۔ تنخواہ ان کی بارہ سو ماہوار ہے ۔ اور پنڈت شیو پرشاد صاحب سکریٹری صاحب کے چھوٹے بھائی کی تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار ہے ۔ اور سر مہاراجہ پرتاب سنگھ وزیراعظم اور مہاراجہ سری دربار کی مشورت سے کام ریاست جودھپور کا سرانجام پاتا ہے اب چونکہ دونوں صاحب ریاست میں تشریف نہیں رکھتے ہیں اس وجہ سے سکریٹری صاحب باستصواب رائے جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر امورات اہم ریاست کے انجام دیتے ہیں اور عدالتی کارروائی کونسل سے ہوتی ہے اور انتظامی مصارف بھی صاحب موصوف کے حکم سے ہوتے ہیں ۔ مگر سب امور سکریٹری صاحب ہی کی رائے سے طے ہوتے ہیں ۔

بھوپال

۶ جنوری سنہ ۱۹۰۲ء :۔ بمعائنہ اخبار انگریزی پانیر الہ آباد کے معلوم ہوا کہ نواب احمد علی خاں صاحب شوہر نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال نے بتاریخ ۴ جنوری ۱۹۰۲ء یوم شنبہ بوقت ۳ بجے صبح کے دفعتاً انتقال کیا ۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ قلب پر فالج گرا ۔ نواب صاحب مرحوم کی عمر چالیس کے اندر تھی ۔ اپنے صاحبزادگان نصراللہ خاں و عبیداللہ خاں کی تقریب شادی

میں مصروف تھے جو ۷ شوال آمد کو ہونے والی تھی ۔ سنا جاتا ہے کہ مرحوم سخت منتظم تھے ۔ انھوں نے ہزارہا آدمی ڈیوڑھی خاص سرکار عالیہ شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کو موقوف کردیا اور اب تخفیف عمال کے کاغذات پیشی میں تھے جن کے واسطے عنقریب حکم تخفیف کا صادر ہونے والا تھا ۔ لیکن قبل اس کے کہ کاغذات ملاحظہ ہوکر کوئی حکم اس پر صادر ہو دفعتاً پیک اجل نے اپنے پنجہ میں ایسا لیا کہ پھر دم‌زدن کا موقع نہ ملا اور عموماً کل باشندگان اور خصوصاً ملازمت پیشہ کو مرحوم کے انتقال سے نہایت درجہ خوشی ہوئی ۔ البتہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کو سخت صدمہ ہوا جو اپنے شوہر کی نہایت درجہ مطیع و فرماں بردار تھیں ۔

نانپارہ

۳ مئی سنہ ۱۹۰۲ع :- یکم مئی سنہ ۱۹۰۲ع کو سر راجہ جنگ بہادر تعلقدار نانپارہ نے بعوارض چند در چند بمقام بہرائچ قضا کی ۔ عمر....سال تھی ۔ آدمی نہایت مخیّر اور متمول تھے اور نہایت خشوع خضوع کے ساتھ گیارھویں حضرت پیران پیر چار روز تک انجام دیتے تھے ۔ اور جو لوگ بغرض شرکت وہاں جاتے تھے ان کو حسب حیثیت زر نقد دیا کرتے تھے مزاج میں انکسار بےحد تھا اور مثل ادنی آدمیوں کے اپنا طرز عمل رکھتے تھے ۔

حیدرآباد

۶ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ع :- نظام حیدرآباد دکن نے ۱۹ نومبر سنہ ۱۹۰۲ع کو ایک دربار منعقد کیا جس میں صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد بھی شریک تھے اور مہاراجہ کشن پرشاد صاحب کو خلعت وزارت عطا فرمایا جو قیمتاً ایک لاکھ روپیہ کا تھا ۔

اندور

یکم فروری سنہ ۱۹۰۳ع :- کل مہاراجہ ہلکر اندور نے تخت سے کنارہ‌کشی کی ۔ شاید لارڈ کرزن وایسرائے سے کچھ ناچاقی ہوگئی تھی ۔ مہاراجہ موصوف سنہ ۱۸۶۰ع میں پیدا ہوے تھے اور سنہ ۱۸۸۶ع میں ریاست کی گدی پر متمکن ہوے تھے ۔ بعد کنارہ کشی اپنے اکلوتے بیٹے بالا صاحب کو تخت‌نشین کیا جس کی اب عمر بارہ برس کی ہے اور مہاراجہ صاحب کو منجانب ریاست چار لاکھ سالانہ کا گزارہ تجویز ہوا اور انھوں نے اپنی ریاست کا ایک مقام بروہار واسطے سکونت کے تجویز کیا جو دریائے نربدا کے کنارے واقع ہے اور اسی وقت اندور سے روانہ ہوگئے ۔

حیدرآباد

۸ اپریل سنہ ۱۹۰۳ ع:۔آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب وزیر اعظم حیدرآباد پر نواب سید سراج‌الحسن امیر یار جنگ بہادر نے بذریعہ قاضی کبیرالدین بیرسٹر ایٹ‌لا بمبئی و مسٹر ہراد جی وکیل حسب منشا دفعہ ۳۶۱، ۳۶۳، ۴۹۳، ۴۹۶، ۱۰۹، تعزیرات ہند باجلاس کنٹونمنٹ مجسٹریٹ مقدمہ دایر کیا ہے کہ ان کی پوتی مسماۃ غوثیہ بیگم نابالغہ دختر سید نورالدین متوفی کو بلا اجازت نالشی عقد کرکے اپنے محل میں داخل کرلیا ہے۔ چونکہ یہ جرم انگریزی عملداری میں وقوع پذیر ہوا ہے لہذا مدعاعلیہ پر سمن جاری ہونا چاہیے اور یہ نالش سکندرآباد کے مجسٹریٹ کے اجلاس میں رجوع ہوئی ہے اور بیرسٹر نے یہ بھی بیان کیا کہ حسب دفعہ ۱۸۱ ضمن ۴ ضابطہ فوجداری سے عدالت میں یہ مقدمہ دائر ہونا چاہیے۔

۹ مئی سنہ ۱۹۰۳ع:۔مسماۃ فیض‌النسا بیگم زوجہ مسٹر سید نورالدین متوفی نے اخبار مشیر دکن کو چٹھی بھیجی کہ عدالت کنٹونمنٹ مجسٹریٹ سکندرآباد میں سید سراج‌الحسن نے مہاراجہ کشن پرشاد صاحب وزیر اعظم پر جو نالش دائر کی تھی وہ خارج ہوئی اور بوجہ پردہ نشینی اس کی اطلاع مجھے دیر کو ہوئی لہذا اب میں سچے واقعات ظاہر کرتی ہوں کہ میری دختر غوثیہ بیگم پر جو الزام عداوتاً لگائے گئے ہیں ان کی تردید کروں۔ غوثیہ بیگم مسٹر سید نورالدین اور میری دختر ہے جو صغیرسنی سے اپنے والد متوفی اور میری حفاظت و نگرانی میں پرورش پاتی رہی۔ اب اس کی عمر ۲۱ برس کی ہے۔ اس کے بلوغ کو پانچ برس کا عرصہ ہوا۔ گو مسٹر سراج‌الحسن غوثیہ بیگم کے دادا ہیں لیکن کبھی وہ ان کی حفاظت اور نگرانی میں نہیں رہی۔ میں نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ساتھ اپنی خوشی اور اپنے لڑکے یعنی اس کے بھائی سید معین‌الدین کی رضامندی سے غوثیہ بیگم کی نسبت کردی۔ یہ گفتگو ایک سال سے ہورہی تھی جس سے سراج‌الحسن اور تمام اہل خاندان واقف تھے اور جن باتوں کا انھوں نے ذکر کیا وہ محض بے بنیاد ہیں۔ نہ میرے بیٹے سکندرآباد کو گئے اور نہ کسی عورت نے اسے بھکایا اور نہ کسی وقت مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے مذہب کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی کی۔ تمام باتیں میری رضامندی سے ہوئیں۔

۲۳ مئی سنه ۱۹۰۳ع:- مہاراجه کشن پرشاد صاحب وزیراعظم کے خاندان میں برابر یه دستور چلا آتا ہے که منجمله اور بیبیوں کے ایک مسلمان بی‌بی بھی تصرف میں آیا کرتی ہے چنانچه مہاراجه چندولال جو مہاراجه حال کے پردادا تھے ان کی بھی ایک مسلمان بی‌بی تھی - علی‌هذا ان کے بعد جو جو راجه وزیر مقرر ہوئے ان کے بھی ایک زوجه مسلمان ہوتی آئی - چنانچه مہاراجه صاحب حالی کے بھی مسلمان زوجه سابق میں تھی جو فوت ہوگئی، اب مسماۃ غوثیه بیگم بنت فیض‌النسا بیگم زوجه ثانیه ہوئی ہیں -

محمودآباد

۳۱ مئی سنه ۱۹۰۳ع:- سر راجه محمد امیرحسن خان صاحب تعلقه دار محمودآباد تاریخ ۳۰ مئی سنه ۱۹۰۳ع کو بوقت ۸ بجے صبح کے بعوارض چند در چند فوت ہوئے - مرحوم نہایت لائق و فائق تعلقه‌دار تھے - سنه ۱۸۶۲ع میں میں اور وہ ایک ساتھ مدرسه سیتاپور میں انگریزی پڑھتے تھے - مزاج میں نہایت خلق و مروت تھی - مرحوم ۱۶ جون سنه ۱۸۴۹ع کو پیدا ہوئے تھے - اس حساب سے ان کا سن تقریباً ۵۴ سال کے تھا - اولاد لایق چھوڑ گئے -

کشمیر

۴ اگست سنه ۱۹۰۳ع:- یہاں پانی کی کمی ہے اور کشمیر میں ۲۹ جولائی کو اتنا پانی برسا که سیلاب آگیا جو سنه ۱۸۹۳ع کے سیلاب سے دو فٹ بلند تھا - وہاں کے باشندے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور کشتیوں پر جاکر پناہ لی - ریذیڈنسی و ہوٹل اور ہوٹلوں کے مکانات زیریں میں چھت تک پانی بھر گیا - خیریت ہوئی که سیلاب دن کو آیا؛ اگر رات کو آتا تو بہت سی جانیں تلف ہوجاتیں - آبادی میں دس سے پندرہ فٹ کی گہرائی میں پانی تھا - ایسا سیلاب وہاں کبھی نہیں آیا -

۷ ستمبر سنه ۱۹۰۳ع- جو سیلاب ۲۳ جولائی سنه ۱۹۰۳ع کو کشمیر میں آیا تھا اس سے سات ہزار مکان شہر کے منہدم ہوگئے اور تیس ہزار آدمی بےخانماں ہوئے -

رامپور

۹ فروری سنه ۱۹۰۴ع- آج منشی میکولال صاحب شاعر لکھنؤ تخلص عشرت عزیز راجه درگا پرشاد صاحب موضع کھجونه سے میری ملاقات کو آئے اور کہا که میں آخیر ہفته دسمبر سنه ۱۹۰۳ع میں مہمان راجه کشن کمار صاحب رئیس

سہس پور ضلع مرادآباد کا تھا جہاں ایک جلسہ بدیں غرض منعقد ہوا تھا کہ نواب حامد علی خان صاحب والی ریاست رامپور قلعہ زیر تعمیر برج جنوبی کا بنیادی پتھر تاریخ ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ع وقت ۱۰ بجے دن کے رکھیں۔ چنانچہ نواب صاحب نے کنّی نقرئی سے بنیاد رکھی اور جلسہ رقص و سرود منعقد ہوا۔ اولاً ایک طوائف منی نامی نے جو علیگڑھ سے ۲۰۰ روپیہ یومیہ پر آئی تھی' رقص شروع کیا۔ ھنوز اس نے کچھ گایا نہیں تھا کہ حضرت نواب صاحب نے جو جلسہ کے محاذ ایک کمرہ میں مع اپنے مصاحبین کے قیام فرما تھے' طوائف مذکور کو طلب کیا اور سر مجلس اس سے مذاق شروع کردیا جو ایک گھنٹہ تک کرتے رہے۔ اس کے بعد طوائف مذکورہ کو اپنے ھمراہ لیے چلے گئے۔ یہ امر خلاف تہذیب سب حاضرین کو ناپسند ھوا۔ یہ ھی وجہ ھے کہ برٹش گورنمنٹ اکثر والیان ملک و رؤسا کو نگاہ وقعت سے نہیں دیکھتی ھے کہ طرز معاشرت ان کا نہایت خراب و خلاف تہذیب ھے۔

حیدرآباد

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع:—آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۲۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ع کو شدت کی بارش حیدرآباد میں ہوئی اور سیلاب آنے اور تالاب حِدمتلا کا بند ٹوٹ جانے سے مفصلہ ذیل محلے تباہ و برباد ھوگئے۔ ریذیڈنسی۔ بازار شیری۔ مہاراج گنج۔ افضل گنج۔ یہ محلے تو بالکل تباہ ھوگئے اور ریذیڈنسی کے مغربی جانب تھوڑے فاصلہ پر جو مکانات کی قطار واقع تھی وہ بالکل مسمار ھوگئی۔ چادرگھاٹ ھلماٹ یہ دونوں گاؤں بہہ گئے۔ پل انگورا اور کوٹھی جوڑا اور ڈاک خانہ بالکل منہدم ھوگئے۔ افضل گنج کے کنارے کنارے جو مکانات تھے ان میں کوئی باقی نہیں رھا۔ عابد کمپنی کا کارخانہ واقعہ چادرگھاٹ سے لے کر سرکاری باغات کی سڑک تک نوبت خانہ بازار کا ایک حصہ منہدم ھوگیا۔ جان بازار۔ مہراج گنج۔ ٹھنڈی بازار اور بیگم بازار بالکل مسمار و منہدم ھوگئے ھیں۔ شمالی جانب ایک پل سے دوسرے پل تک جس قدر گاؤں و بستیاں دریا کے کنارے واقع تھیں سب بہہ گئیں۔ شہر میں بارہ دری۔ پوسٹ آفس بازار مسٹر کوج۔ امین باغ۔ نیزہ گلی تک بہہ گئی۔ افضل گنج کا اسپتال جس کی تیاری میں دس بارہ لاکھ روپیہ صرف ھوا ھوگا اس کا ایک بڑا حصہ

مسمار ہوگیا۔ زنانہ اسپتال امینؑ باغ جس کا بنیادی پتھر بیگم شہزادہ ویلس نے رکھا تھا اور جس کی تیاری میں چار لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اس کا بہت بڑا حصہ گر گیا۔ نظام حیدرآباد کو اس واقعہ سے سخت صدمہ ہوا۔ لکھا ہے کہ ایک چہارم شہر حیدرآباد تباہ و برباد ہوگیا۔ دریائے موسٰی ان پہاڑوں سے نکلا جو شہر سے ۵۰ میل پر واقع ہیں۔ جاڑے اور گرمی کے موسم میں یہ بالکل ہی بےحقیقت نالہ معلوم ہوتا ہے اور برسات میں بھی اس دریا سے لوگ پایاب عبور کرتے ہیں۔ اس دریا میں اکثر طغیانی آتی ہے جس سے نقصان پہنچتا ہے خاص کر سنہ ۱۷۴۸ع اور سنہ ۱۸۷۱ع و اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ع میں جو سیلاب اس دریا میں آئے ان سے بہت نقصان ہوئے اور بےشمار لوگ غرق ہوئے اور بہت سے مکانات مسمار ہوگئے۔

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع:—آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ سیلاب آنے سے جو تباہی و بربادی شہر حیدرآباد کی ہوئی اس کے واسطے اس وقت تک حسب ذیل چندہ ہوا ہے لارڈ منٹو وایسرائے ہند ۱۵۰ پونڈ لیڈی منٹو ۷۵ پونڈ نظام حیدرآباد اپنی جیب خاص سے ۴ لاکھ پچاس ہزار گورنمنٹ حیدرآباد دو لاکھ گورنر بمبئی ۲۵۰ کریم بھائی ابراھیم دوارکا داس وغیرہ اور سرسوتی بورڈ؟ وغیرہ۔ منجانب ریاست حیدرآباد تیس ہزار آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ایک لاکھ آدمی بےخانماں ہوگئے۔

۲۴ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع:—آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ حیدرآباد کے سیلاب سے ۵۲ وارڈ ویران ہوگئے اور ڈیڑھ کروڑ کی جائداد غیر منقولہ اور ایک کروڑ کی منقولہ جائداد کا نقصان ہوا۔ ایک لاکھ انتیس ہزار روپیہ مصیبت‌زدوں کی امداد کے لیے چندہ ہوا ہے اور یہ چندہ ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع تک کا ہے۔ جو چندہ اب کے ہوا ہے اس کی تعداد آئندہ تحریر ہوگی۔ قریب ستر ہزار کے جانیں تلف ہوئیں۔ یہ امر حیدرآباد کے جلسے عام میں طے ہوا جس میں اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے لوگ شریک جلسہ تھے۔

یکم ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء:—آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ نواب میر محبوب علی خان بہادر نظام حیدرآباد دکن مورخہ ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ اگست سنہ ۱۹۱۱ء کو عارضہ فالج میں وفات پائی۔ عمر ۴۵ سال تھی۔ مرحوم تعلیم یافتہ اور شکار دوست تھے۔ متوفی کی بجائے ان کے بیٹے میر عثمان علی خان مسند نشین ہوئے جن کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہے۔

۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء:—بمعائنہ اودھ اخبار امروزہ واضح ہوا کہ ہز ہائی نس نواب میر عثمان علی خان جدید نظام دکن حیدرآباد تاریخ ۲۹ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۳ھ یوم سہ‌شنبہ وقت ۹ بجے رات کو پیدا ہوئے تھے۔

—o—

اب سمندر پار اور ہمالیہ پار کے حالات ملاحظہ ہوں۔ زیادہ‌تر یہ حالات مختلف اخباروں مثلاً اودھ اخبار اور پائیر سے لیے گئے ہیں۔ اودھ اخبار خود منگاتے تھے اور دوپہر کو سونے کی بجائے اسی کا مطالعہ کرتے اور اس میں سے اہم خبروں اور دلچسپ معلومات کا خلاصہ درج روزنامچہ کرتے۔ ذیل میں محض چند درج کی جاتی ہیں' بہت سی معلومات مثلاً مدت عمر جانوراں' گزارہ سالانہ خاندان شاہی انگلشیہ، دنیا کے دس بڑے دولت‌مندوں کے نام و تعداد روپیہ، جارج اسٹیفن کی ایجاد انجن، ملکہ وکٹوریا کی زندگی اور ان کی اولاد کا حال، فہرست آمدنی سلطنت‌ہاے روئے زمین، شرائط صلح‌نامہ مابین روس و جاپان وغیرہ وغیرہ بخوف طوالت نظرانداز کیے گئے۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۸۷۸ء جو لڑائی سلطان روم و روسیوں سے ہو رہی تھی اس میں سلطان کو شکست ہوئی اور بحالت مجبوری صلح کرنے کو مجبور ہوئے۔ شرائط صلح ابھی دریافت نہیں ہوئے ہیں؛ مگر اس بات کا ضرور اندیشہ ہے کہ روسی ایک نہ ایک روز ضرور قسطنطنیہ دارالخلافت روم کو اپنے قبضہ میں لے‌آویں گے کیونکہ سامان جنگ روسیوں کا بمقابلہ سلطان کے بکثرت ہے اور سلطنت روم کو روز بروز زوال نظر آتا ہے۔

۸ مئی سنہ ۱۸۷۸ء درمیان گورنمنٹ انگلستان و روس بباعث مزاحمت نہر باسفرس فی‌الجملہ صورت رنجش کی پیدا ہے اسی وجہ سے فوج انگریزی

ہندستان سے براہ بمبئی بجانب ٹاپو مالٹا بھیجی گئی ہے عجب نہیں کہ جنگ ہو۔

۲۵ اکتوبر سنہ ۱۸۷۸ع | منجانب انگلش گورنمنٹ بافسری چمرلین صاحب کابل کو سفارت جاتی تھی۔ بمقام علی‌مسجد فیض محمد خاں گورنر علی‌مسجد نے حسب اشارت امیر شیر علی خاں والی کابل سفارت کو آگے جانے سے روکا لہذا سرکار نے حکم فراہمی فوج بندھنے لام کا بمقام پیشاور دیا ہے۔ غالباً تھوڑے زمانہ میں لڑائی ہو۔

۲۳ نومبر سنہ ۱۸۷۸ع | سرکار اور امیر شیرعلی خاں والی کابل سے لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ ۲۱ نومبر سنہ ۱۸۷۸ع کو اس کا آغاز ہوا تھا۔ ۲۲ ماہ حال کو قلعہ علی‌مسجد فتح ہوگیا اور سرکار انگریزی کے قبضہ میں آیا۔

۲۵ مارچ سنہ ۱۸۷۹ع | جنگ کابل ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایک فوج کابلی مع سامان کثیر واسطے مقابلہ انگریزوں کے کابل سے جلال‌آباد کو بھیجی گئی۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ع | معائنہ اودھ اخبار سے دریافت ہوا کہ میجر کوگنارل صاحب ریذیڈنٹ و دیگر حکام انگلش بمقام کابل بالاحصار قتل ہوئے۔ کوئی شخص فوج انگریزی کا باقی نہیں رہا جس کا سبب یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ فوج کابلی امیر صاحب غدر کرکے باعث اس قتل‌عام کی ہوئی ہے اور امیر یعقوب خاں بھی بحالت محصوری ہیں۔ لہذا فوج انگریزی قندھار سے واسطے تادیب فوج باغی کے کابل بھیجی گئی ہے۔

۸ اپریل سنہ ۱۸۸۵ع | کل بمقام راولپنڈی عبدالرحمان خاں صاحب امیر کابل و لارڈ ڈفرن صاحب گورنر جنرل کشور ہند سے ملاقات ہوئی اور بہت تحایف امیر کابل کو منجانب سرکار دیے گئے۔ بہت بڑے بڑے رئیس اس دربار میں شریک تھے۔

۱۳ اپریل سنہ ۱۸۸۵ع | ۳۰ مارچ سن‌الیہ کو بمقام پنجدہ متعلقہ کابل افغانان اور روسیوں سے لڑائی ہوئی۔ پانچ سو فوج امیر کابل کی قتل ہوئی۔ جنرل کم‌روف فوج روسیہ کا افسر تھا۔

یکم جون سنہ ۱۸۸۵ع

معائنہ پرچہ جریدہ روزگار مدراس نمبری ۲۱۵ محررہ ۲۶ مئی سنہ ۱۸۸۸ع سے واضح ہوا کہ ممالک ذیل کی آبادی حسب صراحت تحت ہے:-

چین	۴۰ کرور
سلطنت برطانیہ	۳۶ "
روس	۱۰ "
فرانس	۷ "
ممالک متحدہ امریکہ	۵½ "
جرمنی	۵ "

۱۹ جون سنہ ۱۸۸۸ع

بمعائنہ اودھ اخبار محررہ امروزہ کے واضح ہوا کہ ۱۵ جون سنہ ۱۸۸۸ع کو یوم جمعہ ساڑھے بارہ بجے دن کے شہنشاہ فریڈرک جرمن نے تین مہینے ٦ یوم سلطنت کے بعد بعمر ۴۷ سال عارضہ خناق میں قضا کی۔ متوفی ملکہ وکٹوریا انگلینڈ کے بڑے داماد تھے۔

۳۰ جون سنہ ۱۸۸۸ع

معائنہ اودھ اخبار مورخہ ۲۷ جون سنہ ۱۸۸۸ع نمبری ۱۳۸ سے واضح ہوا کہ مردم شماری سلطنت‌ہائے ذیل میں حسب مندرجہ تحت ہے:-

لندن	دارالسلطنت	انگلستان	۳٦۵۵۸۱۹
پیرس	"	فرانس	۲۲٦۹۰۲۳
برلن	"	پروشیا	۱۱۲۲۳۳۰
سینٹ پیٹرس برگ	"	روس	۷٦٦٦٦۴
کلکتہ	"	ھندستان	۷٦٦۲۹۸
وائنا	"	آسٹریا	۷۲۰۱۰۵
قسطنطنیہ	"	ٹرکی	۷۰۰۰۰۰
میڈرڈ	"	اسپین	۵۰۰۹۰۰

۴ اپریل سنہ ۱۸۸۹ع

ممالک یورپ مندرجہ ذیل میں اشخاص ناخواندہ یعنی جاھل حسب ذیل ھیں جس کی شہادت اخبار سررشتہ تعلیم

اودھ یکم اپریل سنہ ۱۸۸۹ع سے کماحقہ ہوتی ہے:۔

نام ملک	تعداد فی صدی	نام ملک	تعداد فی صدی
روس و سرویا و رومیلہ	۸۰	فرانس و بلجیم	۱۵
اسپین	۶۳	انگلستان	۱۲
اٹلی	۴۸	اضلاع امریکہ	۸
ہنگری	۴۱	اسکاٹلینڈ	۷
آسٹریا	۲۹	جرمنی	۱
سوئٹزرلینڈ	۲۵	ڈنمارک۔ بویریا	۰
آئرلینڈ	۲۱	ہندستان	۸۳ یعنی

ہندستان میں سو میں صرف ۱۷ آدمی لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ مقام غور ہے کہ ہندستان کے باشندے روسیوں سے بھی جو جاہل قوم مشہور ہے، تہذیب و شائستگی میں پیچھے رہ گئے۔

۳۶ ستمبر سنہ ۱۸۹۰ع

سچ ہے دنیا میں تہذیب و شایستگی کی روزافزوں ترقی ہے علی‌الخصوص یورپ کو اگر مخزن تہذیب کہیں تو گنجائش ہے۔ ایک ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ اودھ اخبار محررہ امروزہ مترجمہ انگریزی ٹائمس سے معلوم ہوا کہ بالفعل تخمیناً اکتالیس ہزار اخبار تمام دنیا میں شایع ہوتے ہیں ان میں چوبیس ہزار یورپ میں ہیں۔ حسب ذیل:۔

جرمنی ۵۵۰۳، فرانس ۴۱۰۰، انگلستان ۳۰۰۰، آسڑیا ہنگری ۳۵۰۰، اٹلی ۲۴۰۰، اسپین ۸۵۰، روس ۸۰۰، سوئزر لینڈ ۴۵۰، ہالی لینڈ ۳۰۰، امریکہ ۱۲۵۰۰، کنیڈا ۷۰۰، آسڑیلیا ۷۰۰، ایشیاء ۳۰۰، جاپان ۱۰۰، افریقہ ۲۰۰۔

۴ ستمبر سنہ ۹۱ع

بمعاینہ اودھ اخبار امروزہ بحوالہ ملٹری گزٹ مطبوعہ ۲۸ اگست سن الیہ سے واضح ہوا کہ مکہ معظمہ میں حفظان صحت کا عمدہ بندوبست نہیں ہے اس وجہ سے ہر سال شکایت ہیضہ وبائی بکثرت ہوتی ہے اور ایک ایک تاریخ میں چار چار پانچ پانچ سو آدمی مبتلاے عارضہ مہلکہ ہوکر ضایع ہوتے ہیں۔ نقشہ سرکاری چھے سال گزشتہ سے واضح ہوتا ہے کہ جس قدر

حاجی بمبئی سے گئے ان میں سے دو ثلث سے زیادہ ہندستان واپس نہیں آئے ۔

حاجیوں کا شمار

سنہ	روانگی	مراجعت	ضایع
سنہ ۱۸۸۵ع	۸۴۳۶	۵۰۴۵	۳۳۹۱
سنہ ۸۶ع	۸۶۰۶	۶۱۵۰	۲۴۵۶
سنہ ۸۷ع	۹۴۶۶	۵۷۲۶	۳۷۴۰
سنہ ۸۸ع	۱۳۹۷۰	۶۵۰۵	۷۴۶۵
سنہ ۸۹ع	۱۲۴۹۵	۱۱۱۰۱	۱۳۹۴
سنہ ۹۰ع	۱۱۶۶۵	۸۶۶۲	۳۰۰۳
میزان	۶۴۶۳۸	۴۳۱۸۹	۲۱۴۴۹

۳۰ نومبر سنہ ۹۲ع

چند اقوال میں تجربہ کار عاقلوں کے درج ذیل کرتا ہوں جو قابل یاد رکھنے کے ہیں :—

ملٹن — سچ کی کسی ظاہری برائی سے قدر کم نہیں ہوسکتی جیسا کہ سورج کی کرنوں کو کوئی ہاتھ لگاکر میلا نہیں کرسکتا ۔

کوپر — خالی بیٹھا رہنا آرام نہیں ہے ؛ جو دل کہ کسی شغل سے خالی ہے وہ غم سے بھرا ہوا ہے ۔

— جو کسی کی برائی کرتا ہے خود اسی کے خیالات اسے رنج و دکھ میں رکھتے ہیں ۔

سعدی — دو شخصوں کے درمیان ایسی بات کہنا چاہیے کہ اگر وہ دوست ہوجاویں تو ان سے شرمندہ ہونا نہ پڑے ۔

سعدی — جو کوئی شخص بروں میں بیٹھے اگرچہ ان کی عادات اس میں اثر نہ کریں لیکن بروں کے فعل کی تہمت اس پر بھی لگے گی ۔

سعدی — بےوقوف کے لیے خاموشی سے بہتر کوئی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ اس مصلحت کو جانتا تو بےوقوف نہ ہوتا ۔

سعدی — جو اپنی امیری کی حالت میں بھلائی نہیں کرتا وہ غریبی کی حالت میں تکلیف اٹھاتا ہے ۔

۲ جولائی سنہ ۹۳ء بمعائنہ اودھ اخبار لکھنؤ مطبوعہ دیروزہ سے معلوم ہوا کہ (۱) تمام روئے زمین پر اہل اسلام کی آبادی ساڑھے سترہ کروڑ ہے (۲) شہر لندن کی ۷۰۰ مربع میل میں آبادی ہے (۳) تمام دنیا میں ایک ارب ۷۲ کروڑ پچاس لاکھ من گیہوں پیدا ہوتا ہے - واقعی اس زمانہ میں شہر لندن سے کوئی دوسرا بڑا شہر بلحاظ طول و آبادی روئے زمین پر نہیں ہے -

۲۱ ستمبر ۹۳ء مسٹر ڈیورنڈ کا کمیشن بغرض صلاح و مشورہ عبدالرحمان خاں امیر کابل ۱۵ ستمبر سن الیہ کو پشاور سے روانہ جمرود ہوا - یہ کمیشن لارڈ لینس ڈاؤن صاحب گورنر جنرل کشور ہند کی ہدایت سے بدیں غرض بھیجا گیا ہے کہ مراتب ضروریہ سرحدی کے بعد یہ بھی امیر سے طے کرے کہ وہ قندھار تک ریل بنانے کی اجازت عطا کریں -

۱۸ نومبر سنہ ۹۳ء لارڈ سالسبری سابق وزیر اعظم انگلستان کا وزن جسمانی ۳ من ٦ سیر اور حال کے وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن کا کا دو من ۴ سیر ہے - ایک ڈاکٹر کا قول ہے :- سر ٹھنڈا رکھو، پاؤں گرم اور عادات باقاعدہ، پھر تم کو طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہ ہوگی -

۲۳ نومبر سنہ ۹۳ء سفارت مسٹر ڈیورنڈ کامیابی کے ساتھ کابل سے واپس ہوئی - امیر عبدالرحمان خاں صاحب نے ہر طرح سے اس کی خاطرداری کی اور جملہ عہد و مواثیق مابین گورنمنٹ اور امیر کابل بسہولت طے ہوگئے اور برٹش گورنمنٹ نے بعوض بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اب اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کا گزارہ امیر کابل کا مقرر کردیا یعنی ڈیڑھ لاکھ روپیہ ماہوار ان کو ملا کریں گے اور جس قسم کے آلات حرب وغیرہ امیر کابل چاہیں انگلستان سے منگالیں -

۹ مارچ سنہ ۹۴ء ۳ مارچ سن رواں کو مسٹر گلیڈسٹن وزیر اعظم انگلستان نے اپنی ملازمت سے بحضور ملکہ معظمہ استعفا داخل کیا اور لارڈ روز بیری صاحب کو یہ اعزاز بخشا گیا - مسٹر گلیڈسٹن نے بوجہ ضعف بصارت

و نہ منظور ہونے قانون ہوم رول آئرلینڈ کے استعفا داخل کیا۔ اب ان کی عمر ۸۳ سال ہے۔

۵ نومبر سنہ ۹۴ع | معائنہ اخبار پانیر انگریزی الہ آباد و مطبوعہ ۲ نومبر سے واضح ہوا کہ زار روس (الگزنڈر سویم شہنشاہ روس) نے پھیپھڑے کے عارضہ میں بمقام لیوادیا تاریخ یکم نومبر پنجشنبہ سوا دو بجے شام کو انتقال کیا۔ یہ بادشاہ بہت صلح پسند تھا۔

۹ جنوری سنہ ۹۵ع | بمعائنہ ملٹری گزٹ لاہور مطبوعہ یکم دسمبر سے واضح ہوا کہ سلطنت ہائے ذیل میں مفصلہ تحت فوج بحالت صلح و جنگ پائی جاتی ہے:—

نام سلطنت	تعداد ایام صلح	تعداد ایام جنگ	توپوں کی تعداد
روس	۱۰۲۰۰۰۰	۴۵۰۰۰۰۰۷	۳۳۶۰
جرمنی	۵۵۷۰۰۰	۴۳۰۰۰۰۰	۲۹۹۴
فرانس	۵۷۲۰۰۰	۴۰۰۰۰۰۰	۲۸۸۰
اٹلی	۲۲۰۰۰۰	۲۹۸۰۰۰۰	۱۶۲۰
آسٹریا	۳۹۰۰۰۰	۱۴۲۷۰۰۰	۱۹۱۲
ٹرکی	۱۷۰۰۰۰	۱۱۰۰۰۰۰	۲۵۰۰
اسپین	۱۰۰۰۰۰	۷۰۰۰۰۰	۸۰۰
برطانیہ اعظم	۲۱۱۰۰۰	۶۲۴۰۰۰	۶۰۰

۲۵ فروری سنہ ۹۵ع | دنیا میں سب سے بڑا بلند قد آدمی حسن علی مصری ہے جس کی عمر اس وقت ۱۶ برس اور قد سات فٹ ۹ انچ ہے اور ہنوز نشو و نما جاری ہے اور صرف اپنی طویل القدی کے بدولت نمائش گاہ برلن دارالسلطنت جرمن میں پیش ہوا۔

۲۰ جولائی سنہ ۹۵ع | سردار نصراللہ خاں خلف دویم امیر عبدالرحمان خاں کابل جو حسب خواہش گورنمنٹ ملکہ وکٹوریہ آج کل

انگلستان کے شہروں کی سیر کررہے ھیں ' کل صرفہ ان کی سیاحت کا گورنمنٹ موصوفہ برداشت کررھی ھے۔ چنانچہ ملک معظم نے حکم دیا ھے کہ تمام شاھزادگان انگلستان پر سوائے شہزادہ ویلس بہادر اور ڈیوک آف کوبرگ کے ان کو سبقت دی جائے۔ یہ بہت بڑا اعزاز خلف دویم امیر کابل کا ھوا۔ اس کی تصدیق انگریزی اخبارات سے ھوئی۔

۸ اکتوبر سنہ ۹۵ع

ملک الشعرا انگلستان ملٹن کا قول ھے کہ جن دلوں میں مہلک نفرت نے گہرے زخم کردیے ھوں ان میں مصالحت نہیں ھوسکتی۔ بمعائنہ اخبار ایوننگ حیدرآباد مطبوعہ ۲۵ ستمبر سن الیہ سے واضح ھوا کہ جان ڈی راک فیلر امریکہ میں سب سے زیادہ دولتمند ھیں ان کے پاس ۱۴ کروڑ ۵ لاکھ ڈالر ھیں اور ایک ڈالر تقریباً ۲ روپے ۵ آنہ کا ھوتا ھے۔ سال ختم ھونے کے قبل ان کی دولت ۱۵ کروڑ ھو جائے گی۔ بیان ھے کہ اس کی دولت ایک کروڑ ۵ لاکھ سالانہ کے حساب سے بڑھتی ھے۔

۶ جنوری سنہ ۹۶ع

آج کل قسطنطنیہ کی حالت نازک ھورھی ھے۔ کل سلاطین یورپ آرمینیا کی حسن انتظامی کے سلطان عبدالحمید سے خواھاں ھیں اور وہ بوجوہ لیت و لعل کررھے ھیں۔ لہذا روس' فرانس' انگلینڈ' اٹلی اور امریکہ کے جنگی جہازات آبنائے ڈارڈی نیلیز میں داخل ھوئے ھیں اور چاھتے ھیں کہ سلطان کو خوف دلاکر کارروائی کریں اور قسطنطنیہ کو سلطان سے انتزاع کرکے باھم تقسیم کرلیں جس سے سلطان از بس پریشان ھیں۔ دیکھا چاھیے کہ اس کا انجام کیا ھوتا ھے۔ آج کل اخباروں میں بجز اس حال کے اور باتوں کا کم تر تذکرہ ھوتا ھے۔ یہ پیچیدگیاں چند ماہ گزشتہ سے برابر قایم چلی آتی ھیں۔

۵ فروری سنہ ۹۶ع

چونکہ بسازش انگلستان پانچ دیگر سلطنت‌ھاے یورپ نے اپنے جنگی جہازات بحیرہ ڈارڈ نیلیز متعلقہ ٹرکی میں قایم کیے تھے کہ سلطان عبدالحمید خاں سے بزور حسن انتظام صوبۂ آرمینیا کرادیں لیکن بتدریج وہ جہاز تو واپس گئے اور یکم فروری کے تاربرقی اودھ اخبار

مطبوعہ ۵ فروری میں لارڈ سالسبری وزیر اعظم انگلستان کی اسپیچ کا یہ مضمون ہے کہ "انگلستان ٹرکی سے آرمینیا لوگوں کی طرف سے جنگ نہیں کرسکتا اور مہلت دینا چاہیے تاکہ عمدہ انتظام عمل میں لایا جاوے۔ میں یقین نہیں کرتا کہ سلطان نے اس جور و ظلم کا حکم دیا ہے جو آرمینیا میں ہوئے گو ان کی گورنمنٹ کمزور و نالایق ہے اور کچھ نہیں کرسکتی۔ سلاطین یورپ عمدہ انتظام کے نگراں رہیں گے لیکن آگے بڑھکر کوئی کار روائی نہ کریں گے" یہ نتیجہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ انگلستان کو چند سخت جدید جھگڑے امریکہ و جرمن وغیرہ سے پیش ہوگئے۔ سچ یہ ہے کہ مشیت ایزدی میں ابھی قسطنطنیہ کا خاتمہ مقدر نہیں ہے ورنہ یوروپین سلطنتوں کی تو یہ خواہش ہے کہ اس کے حصہ بانٹ کرلیویں جیسا کہ اخباروں سے معلوم ہورہا ہے۔

۵ مئی سنہ ۹۶ء

یکم مئی کو مرزا محمد رضا ایک مذہبی متعصب نے ناصرالدین شاہ بادشاہ فارس کے دل میں گولی ماردی جب کہ وہ ایک زیارت متصل طہران کے اندر جارہے تھے اس کے صدمے سے چار بجے شام کو شاہ نے قضا کی اور بجائے متوفی ان کے دوسرے بیٹے جو اصلی بیگم کے بطن سے تھے تیسری مئی کو بمقام تبریز تخت نشین ہوئے۔ اس خبر کی تصدیق پانیر الہ آباد مطبوعہ ۳ مئی سے ہوئی۔ عمر شاہ متوفی ۶۷ سال تھی۔ سنہ ۱۸۲۹ع میں پیدا ہوئے تھے اور بڑی طویل بادشاہت کی۔ مزاج میں تعصب نہ تھا۔

۳۰ مئی سنہ ۹۶ء

معائنہ اخبارات سے واضح ہوا کہ شہنشاہ روس کا جشن تاجپوشی ۲۶ مئی کو ختم ہوا اور شہنشاہ نے بر وقت تاجپوشی ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے تمام باقیات ٹیکس معاف کردیے اور دس برس کے لیے محصول اراضی نصف کردیا اور خفیف مجرموں کے جرایم معاف کیے اور دیگر سزاؤں میں تخفیف کردی اور پولیٹیکل جلاوطنوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں کہیں مناسب سمجھیں تخفیف سزا کردیں۔ مگر یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ جب لوگ کھانا کھانے اور انعام لینے چلے تو لکھوکھا آدمی کے اژدحام کے باعث

۲۷۰۰ آدمی کچل کر مرگئے جو ایسے موقع پر افسوسناک ہے۔ یہ یادگار کبھی فراموش نہیں ہوسکتی۔

۹ جولائی سنہ ۹۱ء — معائنہ اخبارات انگریزی سے معلوم ہوا کہ شاہزادہ نصراللہ خاں خلف دویم امیر عبدالرحمان خان والی کابل کی سیاحت انگلستان میں ۲۵۸۰۸ پونڈ خرچ ہوے جو چند روز ہوے تشریف لے گیے تھے۔ یہ روپیہ خزانہ ہندستان سے خرچ میں پڑے گا۔

۲۸ ستمبر سنہ ۹۶ء — دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ شاہنشاہ ہندستان و انگلستان ۲۴ مئی ۱۸۱۹ء کو پیدا ہوئی تھیں اور ۲۰ سنہ ۱۸۳۸ء کو بیسویں سال تاج شاہی زیب سر کیا۔ اس حساب سے ۲۰ ستمبر سنہ ۹۶ء تک جناب ممدوح نے اپنے دادا جارج سویم کے مساوی ۵۹ سال ۹۷ یوم زمانہ حکمرانی ختم کیا اور ۲۳ ستمبر سن الیہ سے آپ کو اپنے دادا کی سلطنت سے سبقت شروع ہوئی۔ اس قدر مدت تک سلطنت کسی بادشاہ انگلینڈ نے سلف سے اس وقت تک نہیں کی۔

۸ مئی سنہ ۹۷ء — جو جنگ مابین سلطان روم اور یونانیوں کے ہوتی تھی اس میں سلطان کو کامل کامیابی حاصل ہوئی اور یونانیوں کو ہزیمت حاصل ہوئی اور شہر تھیسلی پر سلطان کا قبضہ ہوگیا۔ اس فوج کے ترکی کے کمان بر اور افسر اعلیٰ ادھم پاشا تھے جن کی عموماً تعریف ہورہی ہے۔ سلطان کی اس کامیابی سے تمام یورپ حیرت میں آگیا اور جو خیالات فاسد و حقارت آمیز جنگی کارروائی ترکوں کے نسبت دول یورپ کو تھے وہ اس ظفریابی سے بالکل بدل گئے اور سمجھنے لگے کہ یہ بھی ایک معتدبہ سلطان یورپ میں ہے۔

۲۲ مئی سنہ ۹۸ء — ۱۹ مئی کو گلیڈاسٹون سابق وزیر اعظم نے بعمر ۸۹ سال قضا کی جو ۲۹ دسمبر ۱۸۰۹ کو پیدا ہوے تھے۔ یہ بہت بڑا لایق شخص تھا اور جب اسپیچ کہنے کھڑا ہوتا تھا تو ایسا خوش بیان تھا کہ گھنٹوں میں ایک بحث ختم ہوتی تھی۔ سخت متعصب شخص تھا۔ ترکوں سے اسے عداوت قلبی تھی۔

۲۶ اگست سنہ ۹۸ء | بابت جزیرہ کیوبا مابین اسپین اور امریکا اس عرصہ میں سخت سخت لڑائیاں ہوئیں - اسپین کو شکست اور امریکا کو کامیابی حاصل ہوئی- سلاطین یورپ نے باہم صلح کرادی اور جزیرہ کیوبا اور فلپی پائن کو اسپین سے امریکا کو دلوادیا-

۱۵ ستمبر سنہ ۹۸ء | آج بمعائنہ اودھ اخبار بحوالہ اخبار انگریزی اکسپریس معلوم ہوا کہ ممالک ذیل میں شادی لڑکوں اور لڑکیوں کی کس عمر میں ہوتی ہے:-

نام ملک	عمر لڑکا	عمر لڑکی
اسٹریا	۱۴ سال	۱۴ سال
جرمنی	۱۸ سال	۱۸ سال
فرانس و بلجیم	۱۶ سال	۱۵ سال
اسپین	۱۴ سال	۱۲ سال
روس و سیکسنی	۱۴ سال	۱۶ سال
یونان	۱۴ سال	۱۲ سال
سوئٹزرلینڈ	۱۴ سال	۱۲ سال

قسطنطنیہ میں شادیاں اس وقت ہی ہوجاتی ہیں جب لڑکے لڑکیاں چل پھر سکتے ہیں اور ضروری مذہبی احکام تمام کو سمجھ سکتے ہیں-

۲۴ اکتوبر سنہ ۹۹ء | آج کل مابین ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال واقعہ افریقہ و انگریزوں کے جنگ ہورہی ہے اور بمقام کلنکو بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں ۲۲ افسر انگریزوں کے مع جنرل سمنز قتل ہوئے-

۲۰ دسمبر سنہ ۹۹ء | دیکھنے اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ جو لڑائی افریقہ میں مابین ڈچ کاشتکاران ٹرانسوال اور انگریزوں کے ہورہی ہے وہ بہت سخت مقابلہ ہے - ہر لڑائی میں بہت سی فوج انگریزوں کی مقتول و مجروح ہوتی ہے - ڈچ ایسے نشانہ باز ہیں کہ افسروں کو چن چن کر مارتے ہیں اور سامان حرب

بمقابلہ انگریزوں کے ان کا نہایت عمدہ ہے۔ پانچ ہزار گز کے فاصلہ پر ان کی توپوں کے گولے بہت عمدہ کام دیتے ہیں اور انگریزوں کی توپیں دو ہزار گز کے فاصلے کی ہیں۔ جناب ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کو اپنی فوج کے ضایع ہونے کا سخت ملال ہے حتّٰی کہ ان کا قصد تھا کہ بعد بڑے دن کے لندن کے دوسرے مقامات کو جاویں لیکن وفور رنج و غم سے انھوں نے فسخ عزیمت کی۔

۲۸ جنوری سنہ ۱۹۰۰ع ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع میں جنگ ٹرانسوال واقعہ افریقہ مابین بویر و برٹش گورنمنٹ کے شروع ہے۔ سرکار کے بہت سے افسر و فوجی لوگ ضایع ہوئے۔ لارڈ ڈفرن کے خلف اکبر اور لارڈ رابنسن کے اکلوتے بیٹے اور لفٹننٹ گورنر برھما کے صاحبزادے اور بڑے بڑے باقی افسر قتل ہوئے۔

۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۰ع بمعاینہ اودھ اخبار واضح ہوا کہ ۵۷ لاکھ تیس ہزار آدمی رفع تکالیف کام قحط میں آج کل متعلق ہیں۔ ۳۰ مئی سے دارالخلافت فاتین جنوبی افریقہ کیپ‌ٹون میں شامل کیا گیا اور اس کی آرنج فری اسٹیٹ کا نام آئندہ آرنج اورکالونی ہوگا کیوں‌کہ اب وہ مستقل طور پر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اب جہاں تک اخبارات دیکھے جاتے ہیں انگریزوں کی برابر فتح معلوم ہوتی جاتی ہے اور بور لوگ پس پا ہورہے ہیں۔ وہ جوھانس‌برگ میں پہنچ گئے ہیں۔

۵ اگست سنہ ۱۹۰۰ع آج کل ملک چین پر پانچ سلطنتیں چڑھائی کر رہی ہیں جن کی فوجیں برابر بذریعہ جہازات اپنی اپنی دارالسلطنتوں سے بھیجی جارہی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ جرمن، فرانس، روس، اٹلی، جاپان اور چھٹی برٹش گورنمنٹ۔ سبب اس لڑائی کا اخباروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم بکسر باشندگان چین کی پیشوا ہے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ غیر ملک کے لوگ چینیوں کو عیسائی کیے ڈالتے ہیں تو انھوں نے غدر کردیا اور جس‌قدر عیسائی لوگ بہم پہنچے ان کو قتل کرڈالا۔ چونکہ ان کی جماعت کثیر ہے اور اہل چین بھی ان کو اپنا پیشوا مانتے ہیں اسی وجہ سے وہ لوگ بھی بکسروں کی شریک ہوگئی اور چینی فوج بھی ان کی

معاون ہے اس وجہ سے ان کی بہت بڑی جمعیت ہوگئی ہے - اور ان سلطنتوں سے مقابلہ کے لیے وہ تیار ہیں - دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے - بظاہر سخت کشت و خون ہوتا ہوا نظر آرہا ہے اور عجب نہیں بعد ظفر پانے سلطنت ملک چین کو باہم تقسیم کرلیں - یہ سلطنت بہت پرانی ہے اور کسی نے اس وقت تک اس پر دست‌درازی نہیں کی تھی لیکن اب انجام بخیر نظر نہیں آتا -

۲۴ جنوری سنہ ۱۹۰۱ع | آج کے اردو اخبار میں یہ خبر غمگین مندرج دیکھی گئی کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصرہ ہند نے اس جہان فانی سے بمقام لندن رحلت کی - وقت ٦ بجے ۳۰ منٹ شام کا تھا اور تاریخ ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ع - کوئی شک نہیں کہ قیصرہ ہند نہایت ہی خوش اقبال تھیں اور جس تاریخ سے وہ تخت سلطنت انگلستان پر بیٹھیں برابر فتوحات بے پایاں حاصل ہوتے رہے اور اولاد کی جانب سے بھی وہ نہایت خوش نصیب تھیں کہ جن کے نواسے قیصر ولیم شہنشاہ جرمن ہیں - اس وقت ملکہ معظمہ کے قبضہ میں کل دنیا کا ایک چہارم حصہ ہے اور کبھی آفتاب ان کی عملداری میں غروب نہیں ہوتا - اب ذیل میں ان کی مختصر سوانح‌عمری حوالہ قلم کرتا ہوں جس سے ان کی عمر و تخت نشینی کا حال مفصل معلوم ہوگا :-

جناب ملکہ معظمہ قیصر ہند ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۱۹ع کو پیدا ہوئی تھیں - ۲۰ جون سنہ ۱۸۲۷ع کو تخت نشین ہوئیں اور ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ع کو رحلت کی - اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی دو مرتبہ مرحومہ کی پنجاہ سالہ و شصت سالہ جوبلی ہوئی اور ایسی خوش اقبال تھیں کہ ایک چہارم دنیا اس وقت ان کے قبضہ میں تھی -

۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۱ع | جنگ ترانسوال واقعہ جنوبی افریقہ ہنوز ختم نہیں ہوئی ہے - بوبر اور انگریزوں سے برابر لڑائی جاری ہے - بالفعل انگریزی فوج بہ تعداد دو لاکھ ترپن ہزار جنگ‌گاہ میں موجود ہیں - یہ لڑائی ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع کو شروع ہوئی تھی - انگریزی فوج کے سر سالار حال لارڈ کچنر ہیں -

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۱ع — مسٹرمکیلے پریسیڈنٹ امریکہ کو تاریخ ۱۴ ستمبر سنہ ۱۹۰۱ع جب کہ وہ بفلو نمائش گاہ کی سیر کر رہے تھے، سنی زول بورڈ نے دو گولیاں ماریں جس سے انھوں نے انتقال کیا اور روزولت ان کی جگہ پر پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ع — امیر عبدالرحمان خاں امیر کابل نے ۳ اکتوبر سنہ الیہ کو انتقال کیا اور بجائے ان کے حبیب اللہ خاں تخت کابل پر جانشین ہوئے اور انھیں کی بابت خان مرحوم جانشینی تجویز کرتے تھے۔ حبیب اللہ خاں خلف اکبر ہوش مند آدمی معلوم ہوتے ہیں جن کی جانشینی گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی منظور کی۔ عبدالرحمان مرحوم نہایت لایق و دانشمند شخص تھے جنھوں نے افاغنہ پر بہت رعب داب کے ساتھ سلطنت کی جن کو انگریزی گورنمنٹ بھی مانتی تھی اور دو لاکھ روپیہ ماہوار ان کو گزارہ دیتی تھی اس غرض سے کہ روسی گورنمنٹ سے کہیں وہ مل نہ جائیں جو عرصہ سے براہ کابل ہندستان کا قصد رکھتے ہیں۔ امیر صاحب نے اپنی فوج بھی قواعدداں تیار کی تھی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۰۱ع — جنگ ٹرانسوال جنوبی افریقہ اب تک مابین برٹش گورنمنٹ اور بوروں کے قائم ہے جس کا آغاز ۱۱ اکتوبر سنہ ۹۹ع کو ہوا تھا۔ اگرچہ بویر بوجہ کمی فوج کے برابر دو تین روز تک جنگ نہیں کرسکتے ہیں تاہم سرکار کی ایک بڑی فوج سے جس کی تعداد دو لاکھ ترپن ہزار ہے، برابر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۹۰۲ع — جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال کے بویرز نے جو برٹش گورنمنٹ سے ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع کو لڑائی شروع کی تھی وہ ابھی تک بدستور جاری ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ لوگ نہایت جری ہیں۔ باوجودیکہ ان کی فوج بہت ہی قلیل ہے اور انگریزوں کی ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے لیکن وہ برابر مقابلہ کر رہے ہیں اور اکثر مقاموں پر انگریزوں کو فاش زک دی۔ اگرچہ ایک روز یہ شدنی ہے کہ وہ مغلوب ہوکر اطاعت قبول کرلیں گے مگر ابھی تک ان کے دم خم وہی ہیں۔

۷ جون سنہ ۱۹۰۲ع

آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ جنگ جنوبی افریقہ میں جو بوبر لوگوں کے ساتھ سرکار انگریزی سے ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ع کو شروع ہوئی تھی اور ۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۲ع کو بذریعہ صلح ختم ہوئی اس میں سرکار انگریزی کا ۱۶۰ ملین پونڈ جو مساوی چوبیس سو ملین روپیہ کے ہے، صرف ہوا۔ اس صرف میں معمولی فوجی صرفہ جو بالفعل بہت زیادہ ہوگیا ہے داخل نہیں ہے اور نہ وہ روپیہ شامل ہے جو گورنمنٹ کو اختتام جنگ کے بعد صرف کرنا ہوگا جس کی تعداد دس ملین پونڈ ہوگی۔ شرایط صلح میں جو مابین ڈچ کاشتکاروں اور گورنمنٹ انگریزی ہوئی ہے اس کی شرط پنجم یہ بھی ہے کہ ڈچ کاشتکار اپنی حفاظت جان و مال کے خیال سے اپنی رائفل و بندوقیں اپنے پاس رکھیں گے اور چھٹی شرط یہ ہے کہ مصارف جنگ کے متعلق جنوبی افریقہ کے ٹرانسوال والوں سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔

جشن تاجپوشی شاہنشاہ انگلینڈ و ہندستان میں جو ۲۶ جون سنہ ۱۹۰۲ع کو بمقام لندن ہوگا اس میں بہت سے ہندستانی والیان ملک جیسے مہاراجا گوالیار، مہاراجا جےپور، مہاراجا اندور، مہاراجا گنگاسنگھ بیکانیر اور بہت سے رؤساءاعظم ہندستان سے جا رہے ہیں مگر مہاراجہ جےپور نے یہ قابل یادگار بات کی کہ اپنے دھرم و کرم کو قائم رکھنے کے لیے اپنے دیوتا بھی ولایت کو ساتھ لے گئے ہیں حتّٰی کہ ہاتھ پاک کرنے کی مٹی بھی جہاز پر رکھ لی گئی ہے۔ بمقابلہ اور والیان ملک کے مہاراجا نے نہایت پابندی مذہب کے ساتھ لندن کا سفر اختیار کیا۔ اودھ سے راجا پرتاب بہادر سنگھ پرتاب‌گڑھ بھی گئے ہیں۔ غرض‌کہ احاطہ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور لاہور وغیرہ سے خاص خاص رؤسا شرکت جشن تاجپوشی کے لیے جا رہے ہیں اور بہت بڑا صرف اپنے اوپر گوارا کیا ہے۔ دیکھا چاہیے کہ بتقریب تاجپوشی ان کے واسطے کیا سلوک ہوتا ہے۔

۱۶ جولائی سنہ ۱۹۰۲ع

۱۳ جولائی سنہ ۱۹۰۲ع کو لارڈ سالسبری وزیراعظم انگلستان نے اپنی ملازمت سے استعفا دے‌دیا جس کو

شاھنشاہ انگلینڈ و ھندستان نے منظور فرمایا۔ بجائے ان کے مسٹر بالفور وزیراعظم مقرر ہوئے۔

۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ع	آج کے اودھ اخبار میں درج ھے کہ ایک عورت متصل شہر نیپلز علاقہ ملک اٹلی میں رہتی تھی۔ اس کی شادی کو ۱۹سال

ہوئے ھیں۔ اس مدت میں اس کے ۶۲ بچے پیدا ھوئے۔ ۵۹ لڑکے اور تین لڑکیاں نو برس کے عرصہ میں گیارہ توام لڑکے پیدا ھوئے اور پانچ مرتبہ چار چار اور تین مرتبہ تین تین اور ایک مرتبہ چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ھوئی اور کچھ زمانے میں صرف ایک ایک لڑکا پیدا ھوا۔ اب اس کی عمر ۵۷ برس کی ھے اور ضعیف و ناتواں ھوگئی ھے۔ کچھ کام اس سے نہیں ھوتا لہذا اٹلی کے بادشاہ کو ایک عرضداشت بھیجی گئی ھے کہ اس کا کچھ گزارہ مقرر کر دیویں۔

۱۹ جون سنہ ۱۹۰۳ع	۱۳ جون سنہ ۱۹۰۳ع کے تار برقی میں درج ھے کہ الیگزنڈر شاہ سرویہ مع ملکہ ڈریگا کے اپنے ایوان میں

قتل کر دیے گئے اور ان کے ساتھ میں وزیراعظم سرویہ اور جنرل فوج بھی مقتول ھوئے۔ خود ان کی فوج نے انھیں قتل کیا۔ وجہ قتل یہ معلوم ھوئی کہ کل رعایا شاہ سے ناراض تھی۔ ۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۹ع کو شاہ سرویہ پیدا ھوئے۔ ۱۳ اپریل سنہ ۹۳ع کو تخت نشین ھوئے تھے اور ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۰۰ع کو شاہ سرویہ نے اپنی نسبت میڈم ڈریگا سے کی اور ۵ اگست سنہ ۱۹۰۰ع کو شادی ھوگئی۔ ڈریگا بادشاہ کی والدہ کی پیش خدمت تھی جس کی عمر اس وقت ۳۰ سال کی تھی یعنی بادشاہ سے عمر میں بڑی تھی۔ اس کا شوھر مرچکا تھا مگر بوجہ حسین ھونے کے بادشاہ نے اس کے ساتھ عقد کرلیا۔

۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۳ع	۲۲ اگست سنہ الیہ کو لارڈ سالسبری سابق وزیر اعظم انگلستان نے بمقام لندن قضا کی۔

سرحد بلغاریا پر پہلی بغاوت ھوئی لہذا فوج سلطان ٹرکی واسطے تادیب کے بھیجی گئی اور سلونیکا کے قریب کل جماعت باغیوں کی گولہ اندازی افواج ٹرکی سے مقتول ھوئی۔

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۳ء

ممالک مقدونیا و بلگیریا و سلونیکا کی بغاوت سے آج کل بڑی بدنظمی سلطان ٹرکی کی عملداری میں ہے اور افواج ٹرکی باغیوں کو گوشمالی واجب دے رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا کشت و خون ہو رہا ہے۔ سلاطین یورپ سلطان کو الگ دھمکی دے رہے ہیں کہ بدنظمی جلد دور کی جائے۔

۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۳ء

انگلستان میں جو طوفان ابر و باد کا آیا تھا اس سے ۶۳ جہاز تباہ ہوگئے اور ان میں کا کوئی آدمی نہیں بچا۔

آج کل یورپ میں باہم سلاطین میں انواع اقسام کے نزاعات پیدا ہیں اور عموماً سلطان ٹرکی کو کل سلاطین دبا رہے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ وہ بتیس دانتوں میں ایک زبان ہے۔

۱۳ فروری سنہ ۱۹۰۴ء

۱۲ فروری سنہ الیہ کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۹ فروری سنہ ۱۹۰۴ء کو بوقت ۱۰ بجے دن مابین جاپان و روس لڑائی شروع ہوگئی اور جاپانی تارپیدو کشتیوں نے بمقام پورٹ آرتھر روسی جہازوں پر حملہ کیا۔ یہ لڑائی دو بڑی زبردست سلطنتوں میں شروع ہوئی ہے دیکھا چاہیے کیا انجام ہوتا ہے۔

۱۴ مارچ سنہ ۱۹۰۴ء

دنیا بھر میں سب سے سن دراز و معمر شخص شہر ماسکو (روس) کا ذاردوستے ہے۔ اس کی عمر ۱۳۶ برس کی ہے اور اس کی بصارت علی حال بھی قائم ہے۔ اس کا باپ ۱۲۰ برس کا ہوکر فوت ہوا تھا۔

۳۰ اپریل سنہ ۱۹۰۴ء

آج کے اخبار میں میں نے پڑھا کہ جاپان کے مرد و عورت دونوں اپنی بہبودی ملک کے عاشق ہیں جس کی تصدیق مضامین ذیل سے ہوتی ہے۔ ایک سپاہی لڑائی پر جاتا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے جو اسے پہنچانے آیا تھا بیان کیا کہ مجھے ایک دن مرنا ہے پس بہتر ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے مریں۔ اگر میں بستر مرگ پر مروں‌گا تو کیا خاک میری ماں کو تسلی ہوگی۔ ایک عورت نے اپنے بیٹے سے جب وہ لڑائی پر جاتا تھا کہا کہ تم لڑائی پر

جاتے ہو، پھر گھر کو واپس نہ آنا۔ اگر تم واپس ہوے تو میں معاف نہ کروں گی۔ قصبہ نکاس کی ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس بنا پر جنگی خدمت سے معاف کردیا گیا کہ وہ اکیلا اپنی ماں کا پرورش کرنے والا تھا تو اس نے فوراً خودکشی کرلی اور اس نے ایک خط میں بیان کیا کہ میں نے اس وجہ سے خودکشی کی کہ میرا بیٹا اپنے ملک کے لیے روسیوں سے آزادی کے ساتھ لڑسکے۔ دم توڑنے کے وقت اس نے وہ خنجر جس سے خودکشی کی تھی اپنے بیٹے کو دے دیا کہ وہ اس کو دشمن کے خلاف کام میں لائے۔ لڑکے نے خنجر کو کمر سے باندھ لیا اور فوراً جنگ میں شریک ہونے کی درخواست پیش کردی۔ واہ رے ملکی ہمدردی! جب کہ ایسی ہم قومی و ملک کی ہمدردی ہو تو کیوں نہ اس ملک کے بادشاہ کو پوری کامیابی حاصل ہو سکے۔

یکم جون سنہ ۱۹۰۴ع — مابین جاپان و روسیوں کے ہنوز جنگ جاری ہے۔ دو مقاموں پر سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دریا بالوبر پر ۶ مئی کو دوسری نان‌شان پر ۱۵ مئی کو اور ان دونوں جنگوں میں جاپانیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ و نیز پورٹ آرتھر میں۔ نان‌شان کی جنگ میں جاپانیوں کو ۳۷ توپیں کلدار باقی میدانی اور بندوقیں و گولے باروود حاصل ہوئی ارو بہت سے روسی گرفتار ہوئے۔

۲۱ جون سنہ ۱۹۰۴ع — فرانس کے ایک پروفیسر کے پاس کل روے زمین کی اقوام کے آدمیوں کے سر موجود ہیں۔ ان کی تعداد ۹۲۰ ہے۔ اس سے صاف ہویدا ہے کہ تمام دنیا میں ۹۲۰ قومیں آباد ہیں۔

یکم جولائی سنہ ۱۹۰۴ع — اب تک جس قدر لڑائیاں مابین جاپان و روس ہوئیں ان سب میں جاپانی فتح یاب ہوے اور ۲۸ جون کی جنگ میں انھوں نے کئی مقامات منچوریا کے روسیوں کے مقابلہ میں فتح کرلیے۔

۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ع — آج کل خوب گھمسان لڑائی مابین جاپان اور روسیوں کے بمقام لیونگ متعلقہ منچوریا (چین) ہو رہی ہے۔

ڈھائی‌ڈھائی لاکھ فوج‌و تیرہ سوتوپیں دونوں جانب ہیں اورہزاروں آدمی دونوں طرف مقتول و مجروح ہو رہے ہیں - ۲۴ و ۲۸ اگست سن الیہ کے مابین سخت لڑائیاں ہوئیں اور تیسری ستمبر سن الیہ بوقت ۹ بجے صبح کے جاپانیوں نے روسیوں سے لیونگ چھین لیا اور اپنا قبضہ و دخل کیا - جنرل کروپٹن روسیوں کی طرف سے افسر اعلیٰ ہیں اور جنرل کروکے اور جنرل اوکو جاپانیوں کی جانب سے -

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ع

اصطباغ ولیعہد روس - اودھ اخبار محررہ ۱۹روزہ سے واضح ہوا کہ شہنشاہ روس نے بعد اصطباغ اپنے بیٹے شہنشاہ زادہ کی پیدائش کی یادگار میں اپنے دست مبارک کا لکھا ہوا حکم مشعر بدیں خلاصہ نافذ کیا - ۱- فوج بحری و بری کو جو مکرر ارتکاب جرم پر سزائے جسمانی دی جاتی تھی وہ نہ دی جاوے گی - ۲- بقایا مالگزاری، ٹکس و محصول معاف کیا گیا - ۳- پیداوار زمانہ قحط کی تقاوی کاشتکاروں کو معاف ہوئی - ۴- بہت سے جرمانے معاف ہوئے - ۵- قیدیوں کی سزا میں جو پولیٹیکل قیدی اپنے زمانہ قید میں نیک کردار رہے ان کی سزا ختم ہونے پر انھیں سول اختیارات دیے جائیں - ۶- جن لوگوں نے قبل پندرہ سال پولیٹیکل جرائم کیے ہیں اور ان کا پتہ نہیں ہے اب ان پر جرم عاید نہ ہوگا - ۷- جو پولیٹیکل مجرم روس سے بیرونجات کو بھاگ گئے ہیں اگر وہ پھر اعادہ چاہیں تو وزیر داخلہ سے درخواست کریں - ۸- فن لینڈ کی باقیات مالگزاری و ٹکس بابت سنہ ۱۹۰۴ع جو شہنشاہ زادہ کی پیدائش تک ادا نہیں کیے گئے وہ سب معاف کیے گئے اور وہاں کے کاشتکاروں کو جو نقد روپیہ یا غلہ دیا گیا ہے اس میں سے ایک چوتھائی معاف ہوگا - ۹- موضعوں اور قصبوں پر اپنی طرف سے لوگ منتخب نہ کرنے کی علت میں جو جرمانہ کیا گیا تھا وہ بھی معاف کردیا گیا - ۱۰- جو لوگ بغیر منظوری فن‌لینڈ سے چلے گئے تھے ان کو ایک سال کے اندر واپس آنے کی اجازت دی گئی - ۱۱- ان میں سے جو لوگ ملازم فوج تھے وہ فوراً واپس آکر حکام فوجی کو رپورٹ کریں ان کو سزا نہ دی جائے گی - ۱۲- فوجی کاموں سے گریز کرنے کے جرم میں خاندان یہود پر جو جرمانہ ہوا تھا وہ بھی معاف کیا گیا -

۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ع | برٹش گورنمنٹ اور تبت کے مابین حسب ذیل عہد نامہ ہوا - ۱- تبت پابند ہوگا کہ مقامات بٹنگ، گیانسٹی اور کٹوک میں بازار قایم کرے - ۲- تبت نصف ملین اسٹرلنگ تاوان جنگ ادا کرے - اس کی سالانہ تین اقساط ہوں گی - ۳- برٹش فوج وادی چمپی پر اس وقت تک رہے گی جب تک کہ تاوان جنگ ادا نہ ہو - ۴- برٹش گورنمنٹ کی رضامندی کے بغیر کوئی غیر سلطنت تبت کے کسی علاقہ پر قبضہ نہ کرے گی نہ کسی سلطنت کو اس کا پٹہ دیا جائےگا - ۵- کوئی غیر سلطنت معاملات تبت میں دست اندازی نہ کرےگی نہ کوئی سڑک یا ریلوے یا تار برقی قائم کرے گی اور نہ کوئی کان کھدوائے گی -

۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ع | پیڑاہیم نے سنہ ۱۵۴۰ع میں گھڑی ایجاد کی تھی جس کی یادگار مقام ٹورم برگ میں قائم ہونے والی ہے -

۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع | سردار عنایت‌اللہ خاں خلف اکبر امیر حبیب‌اللہ خاں والی کابل براہ لاہور الہ‌آباد روانہ کلکتہ ہوئے جہاں لارڈ کرزن صاحب وایسرائے ہند سے ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ع کو ملاقات کریں گے - سردار صاحب کی عمر ۱۶ سال ہے اور پانچ سو افغان ان کے ہمراہ ہیں اور کل خرچہ ان کی آمد و شد کا گورنمنٹ ہند برداشت کرے گی -

یکم جنوری سنہ ۱۹۰۵ع | راشچائلڈ انگلستان میں ایک مشہور مہاجن ہے - اس کے تمول کو بعض سلطنتیں بھی نہیں پہنچ سکتیں - اس کی منٹوں کی آمدنی لاکھوں شمار کی گئی ہے - جو نصائح اس نے اپنے خاندان کو کیے ہیں وہ غور کے قابل ہیں (۱) اپنے کاروبار کے ہر جزو پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرو (۲) ہر کام کو بمستعدی انجام دو (۳) ہر ایک معاملہ کا بعد غور کامل فیصلہ ناطق کرو (۴) اس قسم کی کوششیں کرتے رہو جو باعث ترقی ہوں (۵) جو مصائب و تکالیف پیش آویں ان کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرو (۶) تا قیام زندگی ہر ایک کام میں کوشش و سعی بلیغ کرتے رہو (۷) راست بازی کو مقدم سمجھو (۸) کاروباری معاملہ میں ہرگز جھوٹ نہ بولو (۹) لوگوں سے فضول ملاقات نہ کرو

(۱۰) اپنا فرض بمستعدی ادا کرو (۱۱) اپنے اوقات عمدہ کاموں میں صرف کرو (۱۲) جو امور اتفاقی پیش آئیں ان کا زیادہ مت خیال کرو (۱۳) اپنے متعلقہ کاموں کو نہایت محنت و مستعدی کے ساتھ انجام دو ۔

۱۸ فروری سنہ ۱۹۰۵ع جاپانی روس کو منچوریا میں برابر شکست پر شکست دے رہے ہیں ۔ پورٹ آرتھر اس سے چھین لیا اور مکڈن میں بھی شکستیں دے رہا ہے ۔ ادھر سینٹ پیٹرس برگ دارالخلافت روس و وارسا و طفلس وغیرہ میں لاکھوں آدمی بلوہ کر رہے ہیں ۔ حضرت شہنشاہ روس محل میں چھپے ہیں ۔ فوجیں بلوائیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں جس کی وجہ سے زاید فوجیں واسطے مقابلہ جاپان کے منچوریا نہیں جاسکتی ہیں ۔ ۸ فروری سنہ ۱۹۰۴ع کو جنگ شروع ہوئی تھی اور ہنوز برابر قائم ہے ۔ جنرل اسٹوسل پورٹ آرتھر سے اس شرط کے ساتھ رہا ہوئے کہ وہ آئندہ کسی جنگ میں جاپانیوں کے مقابلہ میں نہ آویں گے اور جنرل کروپٹکن موکڈن میں شکستیں کھا رہے ہیں جو گورنمنٹ روس سے وعدہ کرکے آئے تھے کہ جاپانیوں کو سمندر میں ڈبو دوں‌گا ۔

۱۶ مارچ سنہ ۱۹۰۵ع جاپانیوں نے موکڈن واقع منچوریا کو روسیوں سے چھین لیا ۔ اس لڑائی میں دو لاکھ روسی فوج قتل ہوئی اور چالیس ہزار مقید اور پانچ سو توپیں علاوہ بہت سے سامان رسد وغیرہ کے جاپانیوں کے ہاتھ آئیں ۔ جنرل کروپٹکن جو جاپانیوں کو شکست دینے کے واسطے روس سے آئے تھے انھوں نے شہنشاہ روس کو درخواست دی ہے کہ ان کی جگہ پر کوئی دوسرا جنرل بھیجا جاوے، اب ان کے آرام کرنے کے دن ہیں ۔

۴ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ع آلپین بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ برمنگھم واقع انگلستان میں ہے جہاں ہر روز تعطیل وغیرہ کا زمانہ چھوڑ کر ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ آلپینیں تیار کی جاتی ہیں ۔ نیوزیلینڈ کے جنوب میں جزائر کا ایک مجمع جو سات بہنیں کہلاتا ہے اس میں ہمیشہ بارش ہوا کرتی ہے ۔

سمندر کا پانی نہایت ہی مقوی جگر، معدہ و گردہ ہوتا ہے ۔

۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ع | روسی سلطنت کے ہر صوبہ میں غدر و فساد تو ہو ہی رہا تھا اب فوج بحری و بری نے بھی بغاوت شروع کردی ہے۔ چنانچہ اخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ روسی فوج ھاربن نے بھی غدر کردیا اور شہر مذکور کو لوٹ و جلا کر خاکستر کردیا۔ یہ بد اقبالی نکولس دویم شہنشاہ روس کی ہے۔

۵ جون سنہ ۱۹۰۶ع | ۳۱ مئی سنہ ۱۹۰۶ع کو شاہ الفانسو اسپین کی شاہزادی اپنا انگلستان سے شادی ہوئی۔ جب جلوس گرجا گھر سے ایوان خاص کو چلا تو کسی بدمعاش نے ایک گولہ چمکدار فولاد کا پھینکا جو شاہ کے گھوڑوں کے نیچے گر کر پھٹا۔ گاڑی شاہی کے پہیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ گھوڑے ہلاک ہوگئے۔ تین افسر و سات سپاہی اور پانچ تماشائی ہلاک ہوئے اور ایک سو آدمی سخت مجروح ہوئے۔ تحقیقات ہو رہی ہے۔ شاہ اور ان کی بیگم محفوظ رہیں۔

۶ نومبر سنہ ۱۹۰۶ع | اسپین میں شہد کی مکھیوں کے چھتے سولہ لاکھ نوے ہزار ہیں۔ ان میں سے ۱۹ ہزار ٹن شہد نکلتا ہے اور مقام سویل واقع جرمنی میں ۲۰ لاکھ چھتے شہد کی مکھیوں کے ہیں اور ۲۰ ہزار ٹن ان میں سے شہد نکلتا ہے (از اودھ اخبار مورخہ امروزہ)۔

۶ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع | امیر حبیب اللہ خاں والی کابل بعزم سیاحت ہندستانی ۲ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع کو لنڈی‌کوتل سرحد ہندستان میں داخل ہوے۔ ان کے ہمراہ گیارہ سو آدمی سوار و پیدل ہیں۔ امیر کی بہت خاطر و مدارات ہو رہی ہے اور جب وہ ۳ جنوری سن الیہ کو داخل پشاور ہوے تو ان کے قدموں کے پاس اکیس ہزار کی گیارہ تھیلیاں منجانب گورنمنٹ بطور نذرانہ رکھی گئیں۔ امیر نے قبول کیا۔

۱۱ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع | ۸ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع کو وقت ۱۱ بجے رات کو مظفرالدین شاہ بادشاہ ایران نے قضا کی۔

۱۳ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع | امیر حبیب اللہ خاں صاحب والی کابل اب بادشاہ قرار دیے گئے ہیں اور ہمارے شاہنشاہ ایڈورڈ نے ان کو خطاب ہز مجسٹی کا عطا کیا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں اور اسی مضمون کا

انھوں نے تار بھی بمقام لنڈی‌کوتل دیا تھا جس میں لقب ہز مجسٹی درج تھا۔ امیر کابل قبل تشریف آوری آگرہ کے اول ۸ جنوری کو مقام سرھند علاقہ پٹیالہ کو اس غرض سے تشریف لے گئے کہ حضرت امام ربانی یعنی مجدد الف ثانی کے مزار پر فاتحہ پڑھیں جو مقام سرھند سے دو میل کے فاصلے پر واقع ھے۔ یہ ایک کابلی بزرگ ھیں جو شاھنشاہ اکبر کے عہد سلطنت میں ھندستان تشریف لائے تھے۔ اولاً ان کی شاھنشاہ نے بہت قدر و منزلت کی لیکن وہ مذھب شاہ پر معترض ھوئے تو ان کی وقعت فی‌الجملہ گھٹ گئی۔ بعد انتقال شاھنشاہ اکبر جب جہانگیر شاہ کا زمانہ آیا تو اراکین سلطنت کی شکایتوں پر پیرصاحب قلعہ گوالیار میں چند سال کے واسطے قید کردیے گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب سلطنت میں کچھ بیقراری پیدا ھوگئی تو جہانگیر نے نہایت اعزاز کے ساتھ حضرت کو قید سے رھائی دےکر اپنے پاس بلالیا اور خود بھی مرید ھوئے اور تقریباً تیرہ ھزار آدمی اراکین سلطنت میں سے جو مخالف تھے وہ سب کے سب پیر صاحب کے مرید ھوگئے اور ھرایک حکم ان کا بطیب خاطر بجا لایا گیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اسی زمانے میں پیشین‌گوئی کی تھی کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آئےگا جب کہ درانی قوم کے افغان تخت کابل پر مسلط ھوں‌گے۔ چونکہ امیر حبیب‌اللہ خاں درانی نسل سے ھیں لہذا جب وہ ھندستان کو تشریف لائے تو انھوں نے حضرت صاحب کے مزار پر جاکر نہایت عقیدت کے ساتھ فاتحہ‌خوانی فرمائی۔

۱۰ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع اخباروں سے معلوم ھوتا ھے کہ امیر حبیب‌اللہ خاں امیر کابل جو ھندستان تشریف لائے ھیں منجانب برٹش گورنمنٹ ان کی بہت بڑی خاطرداری اور اعزاز ھو رھا ھے جیسا کہ گورنمنٹ نے کسی اور ان کے ماسبق کا نہیں کیا۔ بمقام آگرہ لفٹنٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ و لارڈ منٹو گورنر جنرل وائسرائے ھند نے بڑی بڑی دعوتیں کیں جس سے امیر بہت خوش ھوئے اور ایک موٹرکار گاڑی قیمتی تیس ھزار ان کی نذر کی گئی اور لارڈ منٹو نے امیر کو ہاتھ کا معزز تمغہ پہنایا۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع امیر حبیب‌اللہ خاں کا یادگار حکم:- چونکہ نماز عیدالضحیٰ امیرصاحب دھلی کی جامع مسجد میں پڑھیں گے لہذا دھلی

کے مسلمانوں نے چاہا کہ ایک سو گائیں قربانی کریں۔ جب امیر صاحب کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ ہم ہندستان کو بنا بر سیر و تفریح آئے ہیں نہ کہ کسی فریق کے دل دکھانے کو۔ ہم یہ نئی بات جس پر اہل اسلام و ہنود کے اکثر جھگڑے ہوتے ہیں ناپسند کرتے ہیں اور بجائے اس کے اگر مسلمان بکرے ذبح کریں گے تو باعث ہماری خوشی کا ہوگا۔ چنانچہ اب یہ ہی ہونے والا ہے۔ اہل ہنود اس بات سے بہت خوش ہوئے اور جابجا کومیٹیاں کرکے اظہار خوشی کے تار امیر صاحب کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع — ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۰۷ع کو امیر حبیب‌اللہ خاں امیر کابل علیگڑھ میں تشریف لائے اور کالج علیگڑھ کو غور و خوض کے ساتھ دیکھ کر نسبت تعلیم مذہبی کے واقفیت حاصل کی اور خوش ہوئے اور مبلغ بیس ہزار روپے بنا بر اعانت کالج مرحمت فرمائے اور چھ ہزار روپیہ سالانہ امداد دینے کا وعدہ کیا۔

۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۸ع — شاہ مظفرالدین متوفی ایران کی بجائے محمد علی مرزا تخت نشین ہوئے۔

۱۹ مارچ سنہ ۱۹۰۷ع — امیر حبیب‌اللہ خاں امیر کابل کے ہندستان میں تشریف لانے سے افغانستان کے متعصب فرقے بہت ناراض ہو رہے ہیں اور جن خاص امور پر اعتراض ہے وہ یہ ہیں کہ امیر نے انگریزی افسروں کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان سے بہت اظہار دوستی کا کیا۔ یورپین لباس اختیار کیا اور بہت سی انگریزی چیزیں مول لیں۔ ایک پل کا تمام سامان خرید کیا۔ کلکتہ میں امیر فرامشن ہوگئے۔ جلال‌آباد کے قریب ضلع لاغمان میں ملاؤں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا اور اشتعال طبع دلوانے والی تقریریں کی گئیں اور یہ الزام لگایا گیا کہ امیر نے فرامشن ہوکر اپنا مذہب بدل دیا۔ بعض غالی ملاؤں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ ہم پر قابل حکمرانی نہیں۔ اس جلسہ کو سردار عنایت‌اللہ خلف اکبر امیر حبیب‌اللہ نے منتشر کردیا۔

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۰۷ع — محمد علی شاہ بادشاہ ایران مظفرالدین شاہ مرحوم کے خلف اکبر ہیں جن کی عمر ۳۴ سال ہے۔ سنہ ۱۸۷۲ع

میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی شادی ملکہ جہاں خاتون وزیرجنگ کی بیٹی سے ہوئی۔

۷ فروری سنہ ۱۹۰۸ء | آج کے روز اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ شاہ کارلوس پرتگیز اور ان کے بیٹے ولیعہد اور ملکہ پرتگیز جب گاڑی پر سوار جا رہے تھے اور ان کا چھوٹا بیٹا مینول گاڑی پر سوار تھا تو تین شخصوں نے گاڑی پر چڑھ کر ریوالور طپنچہ سے شاہ اور ولیعہد کو گولیوں سے مار ڈالا۔ صرف ملکہ اور ان کا چھوٹا بیٹا محفوظ رہا۔ قاتل گرفتار ہو کر قتل کیے گئے۔

۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۸ء | سلطان عبدالحمید خاں نے قسطنطنیہ میں اپنی گورنمنٹ قائم کی۔ اگرچہ بعض وزرا وغیرہ اس کے خلاف تھے لیکن سلطان نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کو موقوف کرکے جدید وزرا مقرر کیے۔ لیکن عموماً سلطان کی کل رعایا نے اظہار خوشی کا کیا اور یورپین بادشاہ بھی پارلیمنٹ قائم ہونے سے بظاہر رضامند و خوش ہیں۔

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء | اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت ایران میں بہت غدر ہو رہا ہے۔ بادشاہ ایران آئینی حکومت کو پسند نہیں کرتے اور رعایا اسی کی خواستگار ہے۔ لہذا رعایا و بادشاہ میں بمقام تبریز سخت لڑائی ہوئی اور برابر خوں‌ریزی ہو رہی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۱۸ نومبر سنہ ۱۹۰۸ء | آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۱۴ نومبر کو شاہنشاہ چین نے اور ۱۵ نومبر کو بیوہ شاہنشاہ چین نے انتقال کیا۔

۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء | سلطان ٹرکی نے ۱۷ دسمبر سنہ ۹۰۸ ع کو پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور دستوری انتظام کے آغاز سے اپنی مسرت ظاہر کی۔

یکم مئی سنہ ۱۹۰۹ء | آج کے اودھ اخبار سے واضح ہوا کہ ۲۷ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کو عبدالحمید خان سلطان روم حسب فتویٰ شیخ‌الاسلام تخت سے اتار دیے گئے کہ انھوں نے احکام شرع شریف کے خلاف کیا اور بےگناہوں کا خون بہایا اور رشید آفندی ان کے چھوٹے بھائی کو جن کی عمر ۶۵ سال کی ہے

بہ لقب محمد پنجم تخت نشین کیا ۔ سلطانؔ عبدالحمید کی عمر ٦٨ سال تھی ۔ انھوں نے ۳۳ برس حکومت کی ۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ پارلیمنٹ بھی قائم ہو اور میرا بھی اختیار رہے ۔ اس وجہ سے بڑا کشت و خون ہوا ۔ سلطان عبدالحمید خاں مع گیارہ بیگمات و دو چھوٹے بیٹوں کے سلونیکا کو منتقل ہوئے اور بحالت جلاوطنی وہیں سکونت گزیں ہوں گے ۔ ۲۹ اپریل سنہ ۱۹۰۹ع کو سلونیکا بھیجے گئے ۔

یکم جون سنہ ۱۹۰۹ع | سلطان عبدالحمید خاں کی ذاتی دولت پانچ کروڑ پونڈ ہے جو معرض ضبطی میں آوے گی اور مصارف سلطنت میں صرف ہوگی ۔

۲۱ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع | ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع کو شاہزادہ ولیعہد سلطان احمد مرزا فرزند دویم شاہ ایران مشتہر ہوئے اور فرقہ نیشنلسٹ کے خوف سے جس کے سرگروہ اسد خاں ہیں محمد علی شاہ ایران نے روسی سفارت خانہ میں پناہ لی ۔

۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۹ع | سلطنت قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ نے چودہ ہزار تین سو پچھتر روپیہ ماہوار مشاہرہ سلطان معزول عبدالحمید خاں کا مقرر کیا ۔

اب کچھ مقامی حالاتِ و واقعات دلچسپ ملاحظہ ہوں یعنی سندیلہ، لکھنؤ اور صوبہ یو۔پی کے ۔ عموماً وہی واقعات منتخب کیے گئے ہیں جن سے اس زمانہ کے رسم و رواج، معتقدات، معاشی و تاریخی واقعات، لوگوں کے طریقہ تفکر و خیالات پر روشنی پڑتی ہے یا واقعہ بجائے خود حیرت انگیز ہوتا ہے ۔ سنہ ۱۹۱۰ع و سنہ ۱۹۱۱ع کے حالات بہت سے چھوٹ گئے ہیں کیونکہ یہ جلدیں خط شکست میں لکھی ہوئی ہیں اس لیے پڑھی نہیں گئیں ۔ اس کے علاوہ چند ایسے دلچسپ واقعات بھی چھوڑ دیے گئے ہیں جن کے کرنے والے ابھی حیات ہیں اور یقینی اپنے افعال کو یوں منظر عام پر آتے ہوئے دیکھ کر سخت ان کی کبیدگی خاطر کا باعث ہوتا ۔

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۹ع | آج ھری ھرشاہ فقیر شاہ اندراین نے حامد حسین کو طلب کیا اور شاہ اندراین کی قبر کے سامنے ان کو کھڑا کیا ۔ کھڑے ہونے کے ساتھ ہی حامد حسن نے غل و شور مچایا اور کہا کہ میں حسن علی شاہ

کو باملٹو کا ہوں۔ حامد حسین کے سر کے بالوں پر عاشق ہوکر ۱۷ دن سے ان کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اب چھوڑتا ہوں ہرگز نہ آؤں گا۔ غرض کہ ہری ہرشاہ نے حامد حسن کے چہرہ پر کچھ پڑھ کر پھونک ڈالی اور حسن علی شاہ چلے گئے اور حامد حسن صحیح و سالم ہوگئے۔ یہ کیفیت میری چشم دید ہے۔ معلوم نہیں کہ کیا اسرار تھا۔

۱۹ مئی سنہ ۱۸۷۴ ع | دریافت ہوا کہ راجا گوالیار اپنی طوائف چندر بھاگا کے لینے کے واسطے لکھنؤ آئے تھے جس نے منشی محمد حسین وکیل سے عقد کرلیا ہے۔ رات کے وقت وکیل کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ وکیل صاحب تو بھاگ گئے تھے مگر چندر بھاگا کو گوشمالی معقول دی۔

۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۴ ع کنبلس صاحب انجنیر کاکوری اکثر کانپور میں بجلسہ نازنیناں رہا کرتے ہیں۔ شاید عنقریب کسی مس کو پسند کرکے شادی کریں گے جس کی وجہ سے اکثر کاغذات بلا دستخطی رہتے ہیں اور کوئی کام اجرا نہیں ہوتا۔

۱۹ نومبر سنہ ۱۸۷۵ ع | یعقوب خاں سابق کمیدان عہد شاہی رئیس مرزا گنج نے قضا کی۔ ان کا عہد شاہی میں بہت دور دورہ تھا۔(میاں کی سر کی قسم) ان کا تکیہ کلام تھا۔ جاہل محض تھے۔ لیکن آدمی خوش نصیب تھے بعمر ۶۵ سال قضا کی۔

۶ و ۷ جنوری سنہ ۱۸۷۶ ع | آج میں لکھنؤ گیا۔ قیصر باغ میں مقیم ہوا۔ شام کو سواری شاہزادہ ویلز بہادر ولی عہد ملکہ وکٹوریہ معائنہ کی۔ شاہزادہ صاحب بگھی چواسپہ پر سوار تھے۔ ہزارہا خلقت تماشائی تھی۔ عمرا تخمیناً ۳۵ سال ہوگی۔

۷ جنوری سنہ ۱۸۷۶ ع | آج شاہزادہ ویلز قیصر باغ میں ۹ بجے رات کو تشریف لائے۔ منجانب تعلقداران اودھ دعوت بارہ‌دری قیصر باغ میں ہوئی۔ روشنی و آتش‌بازی عمدہ تھی۔ ایک تاج مرصع و بکس نقری وغیرہ قیمتی ۳۰ ہزار روپیہ منجانب تعلقداران پیش ہوا جس کو شاہزادہ صاحب نے منظور و قبول فرمایا۔

۲۷ فروری سنہ ۱۸۷۶ ع

آج کل ہر گلی و کوچہ میں تذکرہ مسماۃ ۃام النساء زوجہ محمد اجمل کا ہوتا ہے اور کمال درجہ فضیحتی ہورہی ہے۔ یہ مقام کمال عبرت کا ہے کہ جس شخص کا باپ عہدہ صدر اعلیٰ پر بمشاہرہ مبلغ ۸۰۰ روپیہ ماہواری ممتاز ہو اس کی لڑکی بمقابلہ اپنے شوہر کے عدالت میں روبکاری کرتی پھرے۔

۲ اگست سنہ ۱۸۷۷ ع

جس مقام پر طوائفان سندیلہ علم لےکر کربلا میں مقیم ہوتی تھیں اور دعا باران رحمت کی کرتی تھیں شب کو کسی شخص نے بھیٹ کربلا میں آگ لگادی اور چند بھیٹیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ تھیں، سوخت ہوگئیں۔ بیچاری طوائفیں بباعث خوف بحالت سراسیمگی بھاگ کر اپنے اپنے گھر آئیں اور امیدواری بارش میں یہ سوختگی نصیب ہوئی۔

۱۲ مئی سنہ ۱۸۸۰ ع

احمد رضا خاں تھانہ دار ہوشنگ آباد ساکن رامپور واسطے ملاقات مولوی فضل الرحمٰن صاحب مرادآبادی فائز سندیلہ ہوئے اور مکان منشی فضل حسین پر قیام کیا اور مزاحاً یہ بات کہی کہ اگر مکان منشی صاحب کو بہشت قرار دوں تو ہوسکتا ہے کیوں کہ مثل بہشت کے اس مکان میں پاخانہ نہیں ہے۔

۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۸۰ ع

۱۸ ستمبر سنہ رواں کو نینی تال پہاڑ پر ایسا سیلاب آیا کہ ایک ٹکڑا پہاڑی کا پھٹ کر گرا جس سے بہت انگریز ہلاک ہوئے اور نینی تال والوں کو بہت بڑی مصیبت کا سامنا ہوا۔

۱۰ مارچ سنہ ۱۸۸۱ ع

شام کو دریائے گومتی کے دونوں جانب اور کشتیوں پر نہایت عمدہ روشنی کی گئی اور آتش بازی چھوٹی۔ یہ دونوں چیزیں قابل دید تھیں جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اہتمام اس کا چودھری خصلت حسین صاحب تعلقدار سندیلہ و سکریٹری انجمن ہند کے متعلق تھا اور چودھری نصرت علی اسسٹنٹ سکریٹری کو بحسن کارگزاری کام متعلقہ نمائش اجناس گورنمنٹ سے

حسب ذیل خلوت عطا ہوا۔ دوشالہ یک رومال شالی یک دوپٹہ بنارسی یک چوغہ پشمینہ یک

جملہ ۵ روپیہ اور یقین ہے کہ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو۔

۲۰ اگست سنہ ۱۸۸۱ع	آج کل ایک مقدمہ چوری تیتر کا اجلاس منشی فضل‌حسین صاحب میں چالانی پولیس دائر ہے کہ جس میں مسمی

سرفراز علی رئیس‌زادہ شاہ‌آباد بھی ماخوذ ہیں اور اکثر رئیس قصبہ مذکور مقدمہ مسطورہ کی پیروی کررہے ہیں۔

۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۸۱ع	بہمراہی سید فضل‌حسین کارخانہ کاغذ سازی جو متصل دریائے گومتی لکھنؤ کے ہے آج جاکر معائنہ کیا۔

واقعی بہت بڑا کارخانہ ہے جس میں صدہا آدمی ملازم ہیں اور دو انگریز بھی نوکر ہیں۔ کام بہت عجلت سے جاری ہے۔ بالفعل چھوٹی کل سے کاغذ بنتا ہے اور بڑی کل مرتب ہورہی ہے۔

۲۵ ستمبر سنہ ۱۸۸۳ع	تحقیق و دریافت ہوا کہ حسب ایما چودھری محمد عظیم صاحب کہ جن کو منشی فضل حسین صاحب سے لطف

نہیں ہے مرزا محمد علی بیگ تعلق‌دار اورنگ‌آباد و ٹھاکر بھارت سنگھ تعلق‌دار ہتورہ و راجا رندھیر سنگھ تعلق‌دار بھراون مجمع کثیر سے شرکت شادی الطاف رسول خلف منشی فضل حسین میں کریں‌گے تاکہ اگر اچھے طور سے انتظام مہمان‌داری کا نہ ہو تو منشی فضل حسین کی بدنامی ہمچشموں میں ہو۔

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۸۴ع	کل بخانہ ملک مصطفےٰ حسین دوپہر کو فرزند نرینہ پیدا ہوا۔ چونکہ لڑکا بعد تین لڑکیوں کے پیدا ہوا ہے اس وجہ

سے عورتیں اس کو تیترا نامزد کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ایسا لڑکا ناقص ہوتا ہے' باپ اس کو نہ دیکھے۔ اس وجہ سے ملک صاحب سخت متردد ہیں اور اپنے گھر نہیں جاتے۔

۲۸ مئی سنہ ۱۸۸۸ع	شب کو دختر لالہ دولت‌رام جس نے اپنے شوہر منسارام کے غم مفارقت دائمی میں کھانا پینا بالکل ترک کردیا تھا

اور یاد شوہر میں کیفیت جنون کی پیدا ہوگئی تھی ۱۱ بجے رات کو بعمر ۱۷ سال فوت ہوئی۔ واقعی اس کو عشق حقیقی تھا اور زمانہ سابق میں ایسی ہی عورتیں ستی ہوجاتی تھیں۔

۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ع

آج کل عجب نیرنگیاں سندیلہ میں وقوع پذیر ہیں کہ جن کا اظہار اس موقع پر بےمحل نہ ہوگا۔ منشی فضل‌حسین کی عادت ہے کہ بلاوجہ لوگوں کو ستانے و دق کرنے کو اکثر خطوط گمنام ان کے نام بھیجا کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر اپنے دست و قلم سے لکھا کرتے ہیں جس کا جواب اسی طریقہ سے ان کو وصول ہوا کرتا ہے۔ بقول شخصے چاہ کندہ را چاہ درپیش۔ چنانچہ کئی روز ہوئے کہ ایک خط منجانب جناب منشی فضل رسول صاحب مرحوم از مقام جہنم بنام سید فضل حسین صاحب اس مضمون کا موصول ہوا کہ انورخاں میرے پاس داخل جہنم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم لوگوں سے خوش‌برتاؤ نہیں کرتے اور کل اہل قصبہ کو اپنا دشمن کرلیا ہے جس سے ایں‌جانب کو سخت ملال و تاسف ہے۔ قصد تھا کہ قبر توڑ کر نکل آؤں اور تم کو گوشمالی مناسب دوں لیکن یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے مجبور رہا۔ اگر تم اپنا طریق و عمل و طرز معاشرت درست نہ کروگے تو دوسرے نہج سے تمھاری تنبیہ و سرکوبی ہوگی یہ خط بدل ان تحریرات کا ہے جو وہ دوسروں کے دل دکھانے کے واسطے بھیجتے ہیں ورنہ اور رئیس بھی سندیلہ میں ہیں ان کے نام کیوں نہیں ایسے خطوط آتے۔ افسوس ہے کہ فضل‌حسین نے اپنے وقار اور حرمت کو ایسا بگاڑا ہے کہ ادنٰی درجہ کے لوگوں کو ان کے نام تحریرات، ہزل و تمسخر بھیجنے کی جرأت ہوتی ہے۔ خدا ان کو رائے صائب عطا کرے۔

۷ دسمبر سنہ ۱۸۸۸ع

آج ۹ بجے رات کو عقد شرعی دختران وصی‌علی شاہ صاحب درگاہ کا فرزندان حامد علی و مشرف علی سے ہوا۔ میں بھی شریک رہا۔ محمد ادریس خلف حامد علی کا عقد مسماۃ کنیز فاطمہ اور نبی محمد عرف مسیح‌اللہ خلف مشرف‌علی کا مسماۃ اللہ‌بخشی سے ہوا۔ ایک ایک ہزار اور ایک ایک روپیہ

مہر قرار پایا - دس بجے رات کو فراغت ہوگئی - بعد فراغت نکاح شاہ صاحب اپنے سر پر چکی کے پل رکھکر اور لڑکیوں کو پا پیادہ لےکر ان کی سسرال پہنچا آئے - لڑکیاں سات سات پیوند کی چادریں اوڑھے تھیں اور پیجاموں میں بھی پیوند لگے تھے - ایسے شرعی طریقہ سے عقد سندیلہ میں کبھی کسی کا نہیں ہوا - بر وقت رخصتی دولہن ایک کہرام عظیم تھا - کل حاضرین کو رقت تھی -

۱۱ جون سنہ ۱۸۹۰ع آج مسماۃ مہرانی طوائف سندیلہ کی ناک مسمی رگھوبر زرگر لکھنؤ نے جڑ سے کاٹ ڈالی - عشق بازی کا یہی ثمرہ ہے -

۱۶ نومبر سنہ ۱۸۹۰ع آج مسماۃ لاڈو طوائف دختر ممولا طوائف جس نے ایک مسجد بازار بزازہ امانی گنج میں تعمیر کی ہے' میری عیادت کو آئی - اس کا عہد شاہی میں بہت بڑا دور دورہ تھا - بوجہ مصاحبت نواب علی‌نقی خاں وزیر اعظم کل چکلہ دار اس کے مطیع تھے - یہ ایک نقل مشہور ہے کہ اس نے اپنی تقریب مسّی میں اہل ہنود سے گھوڑیاں چھلوائی تھیں - اب بھی وہ خوش‌حال ہے - اس کے پاس ایک موضع موسومہ لاڈو کھیڑہ ضلع اناؤ میں ۱۰۰افی ہے جس کی نکاسی حال ۵۰۰ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے -

۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ع آج ۳ بجے شام کو سر آکلینڈ کالون صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ کا دربار ہوا - مسٹر ولیم صاحب قائم مقام کمشنر اضلاع لکھنؤ وغیرہ ہمراہ تھے - میری کرسی کا نمبر ۲۲ تھا - درباریوں میں جملہ تعلقہ‌داران و رؤسا و معزز ممبران میونسپل بورڈ و ڈسٹرکٹ بورڈ شریک تھے - منجانب باشندگان ضلع ہردوئی چودھری محمدعظیم صاحب تعلقہ‌دار و رئیس سندیلہ نے ایڈریس اردو میں پڑھا جس کا جواب لارڈ صاحب نے اس زبان میں دیا - جملہ درباری حسب ہدایت کرنیل کوئن صاحب ڈپٹی کمشنر ہردوئی عمامہ باندھے تھے سوائے چند درباریوں کے جنھوں نے اپنے پرانے طریقہ کو قائم رکھنے کا عذر کیا تھا -

۱۵ نومبر سنہ ۱۸۹۲ع آج قریب نصف شب بوقت ایک بجے مولوی لطف علی صاحب برادر کوچک شیخ مومن علی صدراعلیٰ کا انتقال ہوا۔ آپ کو کیمیا کا بےحد شوق تھا۔ بعد ترک روزگار ایسے عارضہ میں تا بہ زیست مبتلا رہے۔ لیکن کبھی کامیاب نہ ہوسکے حتّٰی کہ دھونکتے اور پھونکتے بصارت بھی جاتی رہی۔ اب بعمر ۶۰ سال فوت ہوئے۔ ایک بیٹا محمد اجمل یادگار چھوڑا جو ریاست بھوپال میں تھانہ‌دار ہے۔

۲۹ مئی سنہ ۱۸۹۳ع بباعث شدت گرمی کے سرد پانی کی زیادہ خواہش رہتی ہے۔ لہذا میں نے دو من شورہ خرید کیا جس سے پانی سرد کرکے پیتا ہوں جو معین ہضم بھی ہے۔

۱۵ نومبر سنہ ۱۸۹۳ع پوسٹ کارڈ نورچشم سید مجتبیٰ علی محررہ ۱۲ نومبر سن الیہ بدیں مضمون سروے اسکول کانپور سے موصول ہوا کہ اکثر طلبا نے حسب خواہش مدرس اول مدرسہ مذکورہ کے یہ تدبیر کی ہے کہ فی طالب‌علم پچیس پچیس روپیہ کسی مہاجن معتبر کے پاس اس غرض سے جمع کردے کہ طالب‌علم کامیاب سے مدرس مذکور رقم مجتمع بذریعہ مہاجن وصول کرلیں اور اس طریق میں اپنی توجہ خاص کو صرف کریں گے۔ بتائید اس امر کے ان کے ساتھیوں نے فراہمی روپیہ کی تجویزیں کی ہیں۔ پس میں نے بھی برخوردار مذکور کو ہدایت کی کہ اپنے ساتھیوں کی روش کی پابندی کریں۔ میں بوقت ضرورت روپیہ بھیج دوں‌گا۔

۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ع آج کلو ولد فہم‌اللہ ڈنڈھا نے کلو خلف روح‌الدین کی ناک دانت سےکاٹ لی جو علیحدہ ہوگئی۔ یہ دونوں اشراف محلہ میں رہتے ہیں۔ کچھ معاملہ عاشقی معشوقی کا تھا۔ کلو کچھ ایسا حسین و خوبصورت لڑکا نہ تھا۔ لیکن طبیعت۔

۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ع آج میں ایک واقعہ افسوس ناک حوالہ قلم کرتا ہوں جو باعث عبرت ناظرین ہوگا۔ مجھے آج صبح کو اسسٹنٹ سرجن

سندیلہ نے ایک خط بھیج کر اپنے شفاخانہ میں طلب کیا کہ میں ایک ملزم کا بہ حیثیت مجسٹریٹ بیان لکھوں جو جاں بلب ہے اور شفاخانہ میں زیر علاج۔ مسماۃ پاربتی زوجہ خوشحال چمار چندپور مزرعہ بھرمیرہ تھانہ سندیلہ نے بوقت استفسار بیان کیا کہ وہ بیوہ ہے اور اس کے چار خورد سال لڑکے تھے پانچ روز سے کچھ کھانے کو میسر نہیں آیا اور وہ بھوک سے تڑپتے تھے۔ تب وہ اپنے لڑکوں کی ایسی حالت برداشت نہ کرسکی اور مرنے کو زندگی پر ترجیح دی سب سے اول اس نے چاروں لڑکوں کا گلا استرے سے کاٹا اور پھر اپنے گلے پر استرا پھیرا جس سے نیم جان ہے۔ سانس پیٹ کی کچھ بذریعہ زخم اور کچھ منہ کے نکلتی ہے۔ چند ساعت کے بعد لڑکا تو مرگیا تینوں لڑکیاں زندہ ہیں جن کی صراحت عمر وغیرہ درج ذیل ہے:—

مسمی کھاسی پسر متوفی	مسماۃ دلاری عمر	مسماۃ مکوئی عمر	مسماۃ مھرنیا عمر
۱۰ سال	۶ سال	۳ سال	۵ سال

تینوں لڑکیاں غالباً بچ جاویں مگر ماں کی خیریت نہیں ہے جس کی عمر ۴۰ سال ہے۔ یہ فعل محض مجبوری سے ہوا۔ ورنہ اولاد سے دلاری دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔

۱۸ جنوری سنہ ۱۸۹۵ع آج رات سے منشی فضل رسول صاحب کا عرس شروع ہوا اور مشائخ لکھنؤ واسطے زینت محفل کے آرہے ہیں۔ اگر کاش منشی صاحب اس مصنوعی حال قال کے مجلس موقوف کرکے دو چار ہزار بخش کھانے محتاجوں کو تقسیم کراتے تو شاید روح جناب مغفور کو زیادہ ثواب پہنچتا۔ اس مجلس کا صرف یہ ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے کہ شہر کے لوگ حالیوں کا تماشا دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور ان کی شورش سے لطف گانے کا بھی مفقود ہوجاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایسے افعال اور حرکات سے مرحوم کی روح کو صدمہ ہوتا ہو۔

۱۰ اپریل سنہ ۱۸۹۵ع بارہ‌دری قیصر باغ میں جلسہ ندوۃالعلما منعقد ہوا ہے جس میں مشہور و نامی علما تمامی ہندستان کے شریک ہیں۔ مقاصد جلسہ یہ ہیں کہ اہل اسلام کو ترقی علوم دینی و دنیوی میں توجہ و ترغیب

ہو جو اور قوموں سے پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ دونوں وقت صبح شام وعظ ہوتا ہے اور اس تمامی خرچ کے کفیل حضرت وکیل صاحب ہیں ۔ خدا ان کو اپنی کوشش میں کامیاب کرے ۔

۱۲ ستمبر سنه ۱۸۹۵ع — آج صبح کو چودھری نصرت‌علی صاحب خان بہادر رئیس متھوانه کے مکان پر محفل میلاد شریف منعقد تھی ۔ اول پانچ پانچ لڈو جو اسی غرض سے تیار ہوئے تھے تقسیم ہوئے اور جب وہ باعث مجمع کثیر کافی نه ہوسکے تو مٹھائی بازار سے منگاکر تقسیم ہوئی اور جب وہ بھی غیر کافی ٹھہری تو سو روپیه کے پیسے فی کس دو آنه کے حساب سے بانٹے گئے اور جب وہ بھی حساب نه چل سکا تو ایک آنه بعد ۶ پائی فی کس دیے گئے ۔ سنا گیا که ۱۶۵۰ روپے اس تقریب میں صرف ہوئے ۔ اب سندیله میں مجلس کرنا بہت مشکل ہوگیا، نیکی تو درکنار برائی پیش قدمی کو تیار ۔ اس وجه سے متوسط لوگوں نے ایسا کرنا موقوف کردیا ہے ۔ کروں صد عیب نه کروں یک عیب ۔

یکم اکتوبر سنه ۱۸۹۵ع — آج برخوردار منظم‌حسین کا دُر طلائی داہنے کان سے اتارا گیا اور اس کا زر ثمن اور مبلغ ۶ روپے اور شامل کرکے ۱۴ سیر پلاؤ پُخت ہوا اور بعد نیاز پیران پیر دستگیر اس کی تقسیم عمل میں آئی ۔ یه ہمارے خاندان میں رسم ہے که بعد پیدائش فرزند پہلی گیارھویں پر پیر دستگیر کے نام سے داہنے کان کی کوچیا میں دُر پہنایا جاتا ہے اور جب لڑکا گیارہ برس کا ہوتا ہے اور دُر فروخت کرکے اور کچھ اپنے پاس سے شامل کرکے پلاؤ پکتا ہے اور بعد نیاز اس کی تقسیم ہوتی ہے ۔

۹ اگست سنه ۱۸۹۶ع — آج منشی رحمت‌اللہ تحصیلدار سندیله نے بوقت ملاقات مجھ سے بیان کیا که منشی تعلقه‌دار کی وجه ناراضگی میرے ساتھ یه ہے که انھوں نے دو شکایتیں مجھ سے کیں که میں ان کا انسداد کرادوں ۔ لیکن وہ ایسے امور تھے که میں ان کی تعمیل میں قاصر رہا اول یه که چودھری علی‌جان خلف دویم چودھری محمدعظیم صاحب تعلقه‌دار جہاں کہیں ملتے ہیں تو مجھے انڈا

دکھلاتے ھیں اور قیں کردیتے ھیں اور جب میں بازار میں نکلتا ھوں تو بازاری لڑکے مجھے منہ چڑھاتے ھیں اور انڈا دکھلاتے ھیں ۔ آپ ان کو گوشمالی واجب دیں ۔ دوسرے میری آشنا شیریں کے یہاں رات کو ڈھیلے آتے ھیں اور نصف جلی ھوئی کنڈی اور میری کوٹھی و محل‌سرا میں اینٹیں آتی ھیں تو میری بی‌بی کو اس موسم گرما میں صحن میں لیٹنا دشوار ھوگیا ھے اس کا انسداد کردیں ۔ میں نے کہا کہ دونوں باتیں مجھ سے نہیں ھوسکتی ھیں آپ خود اس کا بحیثیت تعلقہ‌دار اور اپنی دولت‌مندی کے باعث بندوبست کرسکتے ھیں ۔

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۹۶ع آج کل تمامی ھندستان میں بباعث امساک باران و عدم پیداوار فصل نوبت قحط کی پہنچ گئی ھے ۔ صدھا آدمی فاقہ سے مررھے ھیں ۔ فقیروں کی یہ کثرت ھے کہ تمام دن ۱۱ بجے رات تک ان کے سوالوں سے نجات نہیں ملتی حالانکہ میں نے اپنے گھر کا یہ بندوبست کرلیا ھے کہ کچھ غلہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھوالیا ھے اور ملازموں پر تاکید ھے کہ جو سائل آوے وہ خالی نہ پھیرا جاوے ۔ لیکن کہاں تک دیا جاوے ۔ بعض وقت نوکر بھی تنگ آکر جواب دینا جائز رکھتے ھیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں تین قسم کی صعوبتیں ھوئی تھیں ۔ اول حاکم ظالم، دوسرے ھیضہ وبائی کی شدت، تیسرے قحط کی صعوبت جس سے خلق اللہ کو سخت سخت پریشانیوں کا سامنا ھوا تھا ۔ آج کل میں جہاں تک خیال کرتا ھوں تو وھی کیفیت تمام ھندستان کی ھورھی ھے اور جابجا لوٹ مار، ڈاکہ‌زنی شروع ھوگئی ھے ۔ آج کی تاریخ میں نرخ غلہ بازار سندیلہ کا حسب ذیل ھے :—

گندم	بجھرا	نخود	جو	مکائی
ساڑھے آٹھ سیر	ساڑھے گیارہ سیر	پونے گیارہ سیر	گیارہ سیر	سوا بارہ سیر

کاکن	منڈوئی	دھان	ماش
چودہ سیر	ساڑھے تیرہ سیر	دس سیر	دس سیر

یہ گرانی سنہ ۱۸۷۷ع سے بھی بڑھ کر ھے جب کہ گیہوں کا نرخ ۱۰ سیر کا تھا ۔

۳ اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء

چونکہ بخانہ الطاف رسول خلف الصدق منشی سید فضل حسین صاحب امید ولادت فرزند اولین ہے اور اب ساتواں مہینہ ختم ہورہا ہے لہذا حسب رواج خاندانی آج تقریب "ستواسے" دوپٹہ ڈالنے کے بفراہمی مستورات برادری گانے بجانے کے ساتھ ادا ہورہی ہے۔ خدا کرے فرزند صاحب اقبال پیدا ہو۔

۵ ستمبر سنہ ۱۸۹۷ء

.......مرتضی علی کی بارات لکھنؤ میں آوے اور عقد شرعی ہوگا اور ۲۷ ربیع الثانی کو رخصتی ہوگی اور ۲۸ کو دونوں کی سندیلہ سے واپسی کیوں کہ ۲۶ کو بعد شام کے ۲۷ تاریخ لگ جاوے گی جو طاق ہوگی اور اس قسم کی تاریخ میں رواجاً عقد نہیں ہوتا ہے۔

۲۱ مئی سنہ ۱۸۹۸ء

برخوردار سید حافظ علی مرحوم نے جو اپنی بیٹی کا عقد محمد عزیز کے ساتھ کیا۔ اس میں کسی کا نیوتہ نہیں لیا اور نہ کوئی رسم ادا ہونے دی۔ حتّٰی کہ کسی قسم کا کھانا بھی سمدھیانے نہیں بھیجا۔ صرف کچھ زیور معمولی اور ایک جوڑا لڑکی کو دے کر رخصت کردیا۔ جب انھوں نے نیوتہ نہیں لیا ہے تو آیندہ کسی کو نہیں دیویں گے۔ یہ طریقہ انھوں نے جدید اختراع کیا جس کا رواج اس محلہ و قصبہ میں نہیں ہے۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۸۹۹ء

آج میں نے بوقت صبح راجا درگاہ پرشاد صاحب تعلقہ دار سے ملاقات کی جو بحالت تخلیہ ہر قسم کی مجھ سے بات چیت کرتے رہے اور جب میں رخصت ہوا تو دروازہ بیرونی تک مجھے پہنچانے آئے۔ اس کے بعد میں کنور نراندر بہادر صاحب سے ملا۔ مجھے اپنی کوٹھی جدید کا معاینہ کرایا اور بہت لطف محبت سے پیش آئے اور ایک گھنٹہ تک مجھے مسٹر ایڈیسن صاحب امریکہ کا ایجاد کیا ہوا باجا سنایا جو جدید ایجاد ہوا ہے اور جس میں ہرایک شخص کی آواز کا فوٹو فوراً اتر جاتا ہے۔ جس قسم کی وہ بات چیت کرے اور جو گانا گاوے۔ فوراً اس کی آواز پیالہ میں اتر جاتی ہے اور جس وقت اس کو ٹوکیے فوراً اسی قسم کا گانا جیسا گویے نے گایا تھا اسی تال سر سے ہونے لگتا ہے۔ کنور صاحب نے اس باجہ کو بقیمت مبلغ ۳۰۰ خرید کیا ہے۔

۸ اپریل سنہ ۱۸۹۹ع

آج شب کو ایک تھیٹر لکھنو کا جلسہ احاطہ تقی میاں مرحوم میں شروع ھوا - ٹکٹ ۲ روپیے سے لے کر ۱۲ روپیے تک تھا -

۵ مئی سنہ ۱۸۹۹ع

آج کل ایک مہینہ سے اس قدر کثرت شادی بیاھوں کی قصبہ ھذا میں ھے کہ اوسط روزانہ ۱۲ سے ۱۵ تک کا ھے اور یہی کیفیت دیہات میں ھے - یہ دیکھ کر مجھے غدر کے بعد سنہ ۱۸۵۸ع کی کیفیت یاد آرھی ھے کہ جس زمانے میں یہ ھی کثرت تھی -

۲۱ دسمبر ۱۸۹۹ع

آج شام کو مسمی کرج ولد مرج ڈھاری گوالیار کا منشی سید فضل حسین صاحب کے مکان پر ناچ ھوا اور بہ اصرار منشی صاحب میں بھی شریک جلسہ ھوا - وہ اولا تلواروں کی باڑھ پر بلا تکلف پیروں کی تھپکی دے کر ناچا اور کوئی اثر تلوار کی باڑھ کا اس کے پیروں اور تلوؤں پر نہیں پہنچا - دوسرے وہ چھوٹے بتاشوں کو بچھا کر ناچا اور ایک بھی بتاشہ نہیں ٹوٹا - تیسرے وہ گھونگرو پیروں میں نہیں باندھے تھا لیکن وہ منہ سے ایسے صاف گھونگرو بجاتا تھا گویا وہ پیروں کی تھپکی دے کر بجاتا ھے - بظاھر اس کی عمر ۲۵ سال کے اندر ھے - منشی صاحب نے مبلغ ۱۰ روپیہ اس کو انعام دیا -

۲۴ دسمبر سنہ ۱۸۹۹ ع

آج کومیٹی امداد ورثا مقتولین و مجروحین جنگ ٹرانس وال میونسپل ھال میں منعقد ھوئی کہ جو انگریزی فوج بمقابلہ ڈچ کاشتکاران ٹرانس وال کی نقل ھوئی ھیں ان کی بیواؤں و خورد سال لڑکوں کو چندہ سے اعانت دی جائے -

۶ فروری سنہ ۱۹۰۱ ع

بمعاینہ اودھ اخبار امروزہ واضح ھوا کہ اصحاب ذیل نے واقعہ ۲ فروری سنہ ۱۹۰۱ع کو بہ یوم تجہیز و تکفین جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ھند انگریزی گرجا گھر لکھنؤ میں جاکر نماز مغفرت پڑھی - راجا تصدق رسول خان صاحب تعلقہ‌دار جہاں‌گیرآباد وائس پریسیڈنٹ انجمن ھند لکھنؤ نے از جانب طبقہ تعلقہ‌داران اودھ اور حاجی سید شعبان علی خان صاحب

تعلقہ‌دار از جانب اہل شیعہ و خان‌بہادر چودھری نصرت علی صاحب سندیلوی منجانب اہل تسنن۔ مسلمانوں کو مسجد میں دعائے مغفرت مانگنی چاہیے تھی۔

۲۳ فروری سنہ ۱۹۰۱ع آج صبح کی ڈاک گاڑی میں لکھنؤ گیا اور گیارہ بجے سفید بارہ دری قیصر باغ میں شریک جلسہ تعزیت وفات ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند ہوا جہاں اضلاع مغربی شمالی و اودھ کے تمام معزز اشخاص جمع تھے حتّٰی کہ نواب حامد علی خان صاحب رام‌پور بھی تشریف لائے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے دن کو جناب سر مکڈاہل صاحب لفٹننٹ گورنر اضلاع مغربی شمالی رونق بخش ہوئے اور بصدارت خود اول اسپیچ اندوھناک پڑھی۔ اس کے بعد تجویز فرمایا کہ کوئی قومی یادگار جناب قیصرۂ ہند کی کے تجویز کی جائے اور اس کے واسطے چندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس وقت صرف چار آدمیوں نے تجویز ظاہر کی ہے۔

نواب رام‌پور	مہاراجہ بھگوتی‌سنگھ صاحب بلرام‌پور	
ایک لاکھ	پچاس ہزار	
مہاراجہ صاحب بنارس	راجہ صاحب نانپارہ	جملہ
پچیس ہزار	دس ہزار	ایک لاکھ پچاسی ہزار

اسی وقت چندہ ہوا اور ما بقیہ چندہ ضلع‌وار فراہم ہوگا۔ بعد اس کارروائی کے دربار برخاست ہوا اور شام کی ریل میں سندیلہ واپس آیا۔

۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ع آج فاتحہ چہلم نورچشمی جمیلاً کا ہوا جس میں ہر قسم کا کھانا زردہ پلاؤ وغیرہ پخت ہوا اور جس میں مبلغ ۳۲ روپے خرچ ہوئے۔ ہم لوگوں میں عجب رسم ہے، اول تو آدمی مر جائے دوسرے اوپر خرچ مزید ہو جس سے سخت رنج اور ہزیر باری متصور ہے مگر کیا کیا جاوے رسم سے چارہ نہیں۔

۳ جنوری سنہ ۱۹۰۲ع آج بعد ختم سیوم ہمشیرہ منشی کرامت حسین صاحب حسب تجویز مولوی احمدعلی صاحب امور ذیل اتفاق یک‌دگر طے قرار پایے - ۱- کسی شخص کی وفات پر گھر والے و نیز اہل برادری جو شریک

غم ہوں منہ ڈھانک کر نہ روئیں اور نہ متوفی کے حالات بیان کریں۔ ۲۔ بجز رشتہ داروں کے اور کوئی اہل برادری متوفی کے گھر میں اوّل درجہ تین روز سے زاید قیام نہ کرے۔ ۳۔ قریب تر رشتہ دار طعام تقریب بخانہ متوفی بھیجیں لیکن اس کی مقدار اسی قدر ہو جو متوفی کے گھر والوں اور اقرب رشتہ داران مقیم کے واسطے کافی ہو۔ ۴۔ طعام مندرجہ ذیل بھیجا جاے۔ کھچڑی مع دہی و گھی۔ دال و چاول۔ قلیہ روٹی۔ ۵۔ جب کسی کے گھر میں واقعہ وفات وقوع میں آئے تو اس کے افسر خاندان کو لازم ہے کہ اطلاع وفات اپنے اعزہ و خاص احباب کو بذریعہ حجام کرا دیوے تاکہ کسی شخص کو عدم اطلاع کا عذر نہ ہو۔

۹ مارچ سنہ ۱۹۰۹ع

محمد عربی بیرسٹر نے باعلان اس بات کو ظاہر کیا کہ اپنی بی بی کو بے پردہ رکھنا نامناسب نہیں سمجھتا ہوں چنانچہ میں اکثر کھلی گاڑی میں اپنے ساتھ ان کو بغرض تفریح لے جاتا ہوں اور جب ۷ مارچ کو میں اپنی بی بی لکھنؤ سے سندیلہ سیکنڈ کلاس میں لارہا تھا تو اس درجہ میں ایک انگریز بھی بیٹھا تھا لیکن میں نے کوئی پروا اس کی نہیں کی اور اپنی بی بی کو لے کر اسی درجہ میں بیٹھ گیا اور جب سندیلہ اسٹیشن کو پہنچا ہوں بلا انتظار اس کے کہ کوئی پردہ واسطے اترنے کے کیا جاوے وہ فوراً اتر کے پالکی پر سوار ہوگئیں اور میں اپنے ملازمان ذکور سے بھی چنداں پردہ کرانا پسند نہیں کرتا ہوں۔ ابھی کچھ خفیف حجاب سا ہے، بعد چندے وہ بھی ترک کرادوں گا۔ میں اس پردہ کو بالکل ناپسند کرتا ہوں۔ نوکر چاکر مثل جنگلی درختوں کے ہیں، ان سے پردہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

۱۴ مارچ سنہ ۱۹۰۲ع

مسٹر محمد عربی بیرسٹر ڈاڑھی تو منڈواتے ہی تھے اور اب انھوں نے مونچھیں بھی مونڈوا ڈالیں ان کی صورت بدنما معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک نئی وضع ایجاد ہوئی ہے۔

۲۴ اگست سنہ ۱۹۰۲ع

سر لاٹوس صاحب گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ نے ۱۳ اگست سنہ ۱۹۰۲ع کے جلسہ میں یہ طے کردیا کہ

چودھری محمد جان صاحب تعلقہ‌دار ککرالی کو اس وجہ سے اجازت شرکت کی نہیں دی کہ ان کی نسبت چودھری محمد عظیم اپنے باپ کو زہر دینے کی بدگمانی ہے اور راجا جنگ بہادر صاحب مرحوم نانپارہ کے بیٹے بدیں وجہ شرکت دربار سے ممنوع کیے گئے کہ ان کی نسبت لفٹنٹ گورنر کو مخبری ہوئی کہ انھوں نے اپنے باپ کو جوتوں سے مارا کہ جس کے رنج سے وہ بیمار ہوگئے۔ آخرش مقام بھرائچ میں انھوں نے قضا کی۔ اب کے سال یہ وارداتیں ایسی ہوگئیں کہ ہلاکت خود اپنے بیٹوں کے ہاتھ سے مسموع ہورہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جائداد دنیا میں ایسی شے ہورہی ہے جس کی وجہ سے بھائی بھائی کی جان کا دشمن ہوجاتا ہے اور بیٹا باپ کو نگاہ دشمن سے دیکھتا رہتا ہے۔

۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۰۲ ع ....دریں ولا ایک میلادشریف بمقام نینی‌تال گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوئی اور سرلاٹوس صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع مغربی شمالی اودھ نے مع اپنے مصاحبوں کے اس میں شرکت کی اور ۲۰ منٹ تک شریک جلسہ میلاد رہے۔ یہ ایک نئی بات لاٹ صاحب نے کی۔

۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۳ ع آج ایک قلم انگریزی اعلیٰ درجہ کا جس کے اندر روشنائی بھر کر ہرایک شخص گھنٹوں لکھ سکتا ہے اور برخوردار مصطفےٰ علی بقیمت مبلغ ۳ روپیہ ولایت لندن سے لائے تھے اور التفات رسول کو دینا تجویز ہوا تھا، آج میں نے ان کو بھیج دیا؛ بہت خوش ہوئے۔

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ ع آج سید حسن احمد اشراف ڈولہ سے واضح ہوا کہ مہینہ ستمبر گزشتہ میں سید کرامت حسین پنشنر ڈپٹی کلکٹر نے اپنا عقد چہارم لکھنؤ اپنی منجھلی سالی سے کیا۔ یہ تین بہن تھیں بڑی کا عقد رائےبریلی میں ہوا اور چھوٹی کا ڈپٹی صاحب سے جو یکم فروری سنہ ۱۹۰۲ ع کو فوت ہوئیں اور منجھلی سے چوتھا عقد کیا۔ عمر ڈپٹی صاحب اکسٹھ سال ہے۔ چہرہ پر جھریاں پڑگئی ہیں۔ بازوؤں کی کھال لٹکتی ہے۔ کمر خمیدہ ہے۔ غذا بہت قلیل ہوتی ہے، دبلے و ضعیف ازحد ہیں۔ تند ہوا کے جھونکے سے اڑ جاسکتے

ہیں - حرارت غریزی کم پائی جاتی ہے - بظاہر یہ عقد ایام زندگی گھٹانے والا اور گویا مقام اجل ہے - خدا مبارک کرے -

۹ جنوری سنہ ۱۹۰۴ع | کل مسمی گنیش ولد منشی کلوار موضع مہسونہ طاعون سے فوت ہوا - وہاں کے باشندوں نے اس کی لاش متوفی کے مکان پر بھیج دی - لاش پہنچنے پر اس کے چچا منو نے ممانعت کی کہ گھر کے اندر نہ ڈالی جائے جو تمام شب چبوترہ پر پڑی رہی - جب آج صبح کو مولوی ضامن علی محرر رجسٹری و دیگر ہمسایہ مسلمانوں کو اطلاع ہوئی تو وہ لوگ موقع پر گئے اور مالک متوفی سے استدعا کی کہ اگر وہ اجازت دیوے تو وہ لوگ قبر کھدواکر لاش کو دفن کرائیں - بوجہ اس کے کہ متوفی کے اعزا و اقارب کوئی شریک تجہیز و تکفین نہیں ہوئے تھے، آخرش بحالت مجبوری تین ہندو دو جوشی اور ایک اہیر لاش اٹھانے کو بہم پہنچے - تب مادر متوفی نے چوتھا پایا خود اٹھایا اور جو قبر مسلمانوں نے کھدوائی تھی اس میں جاکر دفن کردیا - یہ مقام عبرت کا ہے کہ عزیز شریک نہ ہوں اور ماں اپنے بیٹے متوفی کی خود لاش لے جاکر دفن کرے اور جلوانے کا کوئی سوبیتہ نہ ہوسکے - اس بیماری کی نسبت جہاں تک غور کیا گیا، نوجوان خواہ مرد ہو یا عورت و لڑکے لڑکیاں زاید مریں اور مرتے ہیں -

۱۱ جنوری سنہ ۱۹۰۴ع | آج آٹھ بجے صبح کو ہمارے محلہ کے چاروں طرف سورۂ یٰسین اس طور پر گشت کرکے پڑھی گئی کہ چوراہے ٹاؤن ہاؤس سے لوگوں نے پڑھنا شروع کیا اور جس مقام پر 'مبین' آیا وہاں سات نمازیوں نے سات سات اذانین کہیں —— اور اس طور پر سات روز تک گشت ہوگا - خدا کرے کہ اس سورۂ یسین کی برکت سے طاعون سارے قصبہ ہذا سے دفع ہوجائے -

۱۶ جنوری سنہ ۱۹۰۴ع | مکا بری کی لاش بذریعہ میونسپل گڑوادی گئی - اس کے اعزا نے متوفی کی مدد نہیں کی جو طاعون میں مرا تھا - یہ زمانہ ایسا ہے کہ عزیز قریب بھی طاعون کے ڈر سے لاش کے قریب آنا پسند

۸ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ع

شب گزشتہ کو ایک لڑکا محلہ کسانوں میں عجیب الخلقت بخانہ فجو ولد جُمن کسان پیدا ہوا جس کا منہ لانبا، تُھتھنی لٹکی ہوئی ہے۔ بجائے آنکھ کان کے گتھی لگی ہوئی ہے۔ ٹھڈی و ناک نہیں۔ ہاتھ پیروں کی انگلیاں ندارد۔ پاؤں کے گٹھوں میں ناخن نکلے ہیں اور چار دانت اوپر کے نمایاں ہیں۔ زبان نکلی ہوئی ہے۔ بدن مثل مچھلی کے سفنوں کے چٹخا ہوا ہے۔ جسم موٹا ہے جس کے مقابلے میں ہاتھ پیر پتلے ہیں۔ بکری کا دودھ اس کو پلایا جاتا ہے۔ تمام دن وہ زندہ رہا اور آٹھ بجے رات کو مرگیا۔

۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ع

سید سالار مسعود غازی رض ۱۷ شعبان سنہ ۲۲۴ھ مطابق سنہ ۱۰۳۳ع کو بھرائچ میں داخل ہوئے اور ۱۸ رجب سنہ ۴۲۴ھ مطابق سنہ ۱۰۳۴ع کو میردبو نے ان کو مع ان کی تمامی فوج کے قتل کیا اور سید سالار بھرائچ کے تالاب کے قریب جس پر سورج کا مندر تھا اور جس کو سالار اپنی آرام گاہ کے لیے بہت پسند کرتے تھے مدفون ہوئے۔ سید سالار سالار ساہو کے بیٹے اور سلطان محمود کے بھانجے تھے۔

(باقی آیندہ)

سید شاہ کمال الدین

اس عنوان سے ایک مضمون « اردو » کے اپریل نمبر میں چھپا تھا ۔ افسوس ہے اس میں طباعت کی کچھ غلطیاں رہ گئیں ۔ صاحب مضمون نے اس میں حسب ذیل تصحیح و ترمیم فرمائی ہے ۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ اس مضمون کو درست فرمالیں ۔

صفحہ نمبر	سطر	
۲۶۳	(۱)	سید جمال الدین کے بعد ابن کمال الدین بخاری بڑھایا جائے ۔
۲۶۵	(۱۸)	نبی انور کی بجائے نبی الوریٰ ۔
۲۶۶		کی آخر سطر میں خلیل کی بجائے ضلیل بمعنی گمراہ ۔
۲۶۸	(۱۹)	بجائے ۴ مرثیے کے ۸ مرثیے ۔
۲۷۴	(۸)	بجائے دن کے « شب » ۔
۲۷۵	(۴)	رباعی کا پہلا شعر یہ ہونا چاہیے :۔

اے درد سبھوں سے برملا کہتا ہوں
توحید نہ میں چھپا چھپا کہتا ہوں

صفحہ نمبر	سطر	
"	(۶)	بجائے « میں » کے « نا » ۔
۲۷۶	(۸)	« سنگ شکر » کی بجائے « تنگ شکر » ۔
"	(۲۱)	بجائے ۴ کے ۸ بنایا جائے ۔
۲۷۷	"	بجائے « نہیں » کے « نین ہے » ۔
۲۷۹	(۱)	بجائے « کیا » کے « نین بمعنی نہیں » ۔
۲۸۰		اے عاشقاں سے ناحق رزم و قتال والی غزل کے تحت حاشیہ میں نشان بنا کر یہ لکھا جائے « یہ غزل قلمی نسخہ میں ہے مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے » ۔

صفحہ نمبر	سطر	
۲۸۴	(۴)	«آسمان» کی بجائے «اسمان» بغیر مد کے ہونا چاہیے۔
"	"	حاشیہ میں نمبر ۱۰ کے تحت «ڈال کر» کی بجائے «بہا کر»۔
۲۸۶		کے حاشیہ میں نمبر ۱۲ کے تحت «لالن» کے معنی «معشوق» کے ہیں ۔ سابقہ معنی حذف کر دیے جائیں۔
۲۸۷		کے حاشیہ میں نمبر ۱۲ کے تحت «کی روشنی» حذف کی جائے ۔
"	"	اور نمبر ۱۴ کے تحت «دھن» کے بعد «معشوق خوش قسمت» حذف کر کے «دوست» لکھا جائے ۔

(سخاوت مرزا)

تبصرے

ادب

محبت کا فسانہ

از لطیف الدین احمد۔ صفحات ۲۴۳۔ مجلّد قیمت دو روپیہ ۔ ملنے کا پتہ عظیم اطہر ۔ محلہ منٹولہ ۔ آگرہ

آج کل ادب لطیف اور رومان بےطرح پھیل رہا ہے ۔ مگر محبت کا فسانہ اپنی خاص وضع کا ہے ۔ دو بالغ اور خود مختار شخص اپنے تئیں اپنی پسند سے رشتہ ازدواج میں وابستہ کرتے ہیں ۔ ان کی ذہنیتیں مختلف ہیں اور یہ ہونا ہی تھا کیوں کہ خصوصی طور پر تاہل کے متعلقات میں مرد اور عورت کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہوسکتا ۔ نباہ کی صورت تعلیم یافتہ اور اقتصاداً مختار شخصیتوں میں کم پیدا ہوا کرتی ہے ۔ ان میں باوجود محبت کے سوال فتح اور شکست کا ہوا کرتا ہے اور یہی سوال مسٹر جمالی اور بیگم جمالی کے درمیان اٹھا ۔ اس میں قصور کسی کا نہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ مسٹر جمالی عورت نہیں اور بیگم جمالی مرد نہیں ۔ میاں بیوی کبوتر کا جوڑا ۔ افہام و تفہیم ہو تو کس طرح ۔ سمجھوتا کرائے تو کون ؟ روح پر مادہ کا غلبہ ۔ آخر مادّے ہی نے اصلاح کی صورت نکالی ۔ ایک خوفناک حادثہ نے دونوں کے ذہنوں پر سے پردے اٹھادیے اور پھر دونوں عمر بھر کے لیے عاشق معشوق اور معشوق عاشق بن گئے ۔ یہ ہے لب لباب اس کہانی کا ۔

آج کل خود پسند بیاہوں کا میلان بہت ہے - ہر بالغ مرد اور عورت کو اس کتاب کا مطالعہ اور اس سے سبق لینا چاہیے تاکہ تاہل کی زندگی میں غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچیں - خود گوئی یا متکلم تخیل اس ناول میں کئی جگہ ہے - اور ہوتا ہی کیوں کہ یہ کوئی ناٹک تو ہے نہیں - لیکن اس کی طوالت کہیں کہیں اکتانے والی ہے -

منظر کشی پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور یہ اچھا ہے - اکثر افسانہ لکھنے والے اس کا لحاظ نہیں رکھتے - مناظر کا اثر انسان کے ذہن پر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے نفسیاتی حدود بھی ہیں اور جغرافی حدود بھی - بعض کلمے اور مرکبات لطیف صاحب نے اختراع بھی کیے ہیں - ان میں اکثر نہایت مناسب اور معقول ہیں جیسے 'خیال انداز' نظر انداز کے قیاس پر - بعض کو ذوق سلیم قبول نہیں کرسکتا جیسے 'میکانکی طریق' (مصنوعی) - 'نراجی' (اینارکی) - 'معاشری فوضویت' - 'خرم لباس' - 'معرفی کرانا' - 'مسترحم لہجہ' - 'کوثر نواز پیار' - بعض غریب الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے سرکھدکنا - پنیچل - وغیرہ - تذکیر و تانیث کے بارے میں بھی بیگم جمالی کی آزادہ روی کے نشان ملتے ہیں - مثلاً 'تولیہ' اور 'تصنع' کی تانیث اور 'نم' کی تذکیر -

ان فرو گزاشتوں یا کاتبانہ اصلاحوں سے قطع نظر محبت کا فسانہ واقعی اسم بامسمےٰ ہے اور اپنے موضوع پر کئی پہلوؤں سے حقیقی روشنی ڈالتا ہے - پلاٹ مکمل ہے کیوں کہ فاضل مصنف جو دنیائے صحافت کے دل - احمد' ہیں ایک تجربہ‌کار افسانہ نویس ہیں - قصہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے -

(ک)

روح غالب

(مرتبہ ڈاکٹر سید محی‌الدین صاحب زور' پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن - صفحات ۲۴۰ - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے)

یہ مرزا غالب مرحوم کے مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے - مگر اس میں ان مکاتیب یا عبارات کو حذف کردیا گیا ہے جن میں علمی و فنی مباحث یا شخصی حوائج

کا ذکر تھا ۔ شروع میں مرزا صاحب اور ان کے کلام کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ' ان کا اجمالی تذکرہ اور مرحوم کے حالات زندگی درج ہیں ۔ چار احباب اور دو شاگردوں کا مختصر حال بھی داخل کردیا گیا ہے ۔ لیکن ان اجزا کی بجائے ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ ان سب اشخاص کے مختصر حالات لکھ دیے جاتے جن کے نام کے خطوط اس مجموعہ میں شامل ہیں ۔ کتاب ادارہ ادبیات ' حیدرآباد کی طرف سے اچھے کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہے مگر کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔

یہ کتاب محض تالیف یا انتخاب کی حیثیت رکھتی ہے جس میں کسی تحقیقات یا علمی تفحص سے کام نہیں لیا گیا ۔ لیکن زبان کے ایک مایۂ ناز ادیب کے حالات نیز کتاب کا دیباچہ لکھنے میں بھی' فاضل مولف نے صحت و فصاحت تحریر کا ایسا لحاظ نہیں رکھا جس کی ایک ادبی ادارے کی تالیف سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی ۔ امید ہے کہ کتاب کے مکرر چھپنے کی نوبت آئی تو ان اشارات پر توجہ فرمائی جائے گی ۔

(ء)

مدراس میں اردو

(سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات ۔ مولفہ نصیرالدین ہاشمی صاحب
مکتبۂ ابراھیمیہ ' حیدرآباد دکن ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

اس کتاب میں اردو کے ان قدیم اور جدید شاعروں اور نثر نگاروں کا ذکر ہے جو مدراس میں پیدا ہوئے یا وہاں کے باشندے تھے یا مدراس میں آ کر بس گئے تھے ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اردو ہندی کی طرح مدراس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کا رواج اور شوق قدیم سے چلا آرہا ہے اور اس خطے سے بڑے بڑے قابل شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں ۔ کتاب کے ایک باب میں وہاں کے رسالوں اور اخباروں اور انجمنوں کا بھی ذکر ہے ۔ آخری باب میں " میسور میں اردو " کا بیان ہے ۔ سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں اردو نے جو ترقی کی اس کا مختصر ذکر ہے ۔ اہل مدراس و میسور کے لیے خاص کر یہ کتاب بہت بصیرت افروز ہوگی اور

اس کے پڑھنے کے بعد انھیں معلوم ہوگا کہ اردو زبان ان کے بزرگوں کی مقدس میراث ہے جس کی اشاعت و ترقی ان کا فرض ہے۔ (ا)

مطبوعات کتب خانہ علم و ادب، دھلی

۱۔ پھول والوں کی سیر

یہ وہ مشہور اور دلچسپ مضمون ہے جو مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے رسالۂ اردو کے لیے لکھا تھا۔ اب اس ادارے نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔

۲۔ تھوڑی تارا ماتھے چاند

یہ پرانی قسم کی بہت دلچسپ کہانی ہے۔ اسے اشرف صبوحی صاحب نے بڑے سلیقے سے اچھی زبان میں لکھا ہے۔ قیمت دو آنے۔

۳۔ صبر بادشاہ زادہ

اس میں ایک تو صبر بادشاہ زادہ کا قصہ ہے اور دوسرا "چالاک بالشتیا" کا۔ یہ کتاب صبوحی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ قصے پرانے ہیں مگر نئے طرز سے لکھے گئے ہیں۔ قیمت دو آنے۔

۴۔ لعل شہزادہ

یہ لعل شہزادہ کا قصہ ہے اور آخر میں "چوھا اور مینڈک" کی کہانی ہے۔ صبوحی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ قیمت دو آنے۔

ان سب کہانیوں کی زبان ٹکسالی اور طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔

تمثیلی مشاعرہ

(مرتبۂ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب دہلوی، قیمت مجلد ایک روپیہ)

حضرت کیفی نے ایک خیالی مشاعرہ قائم کیا ہے اور یہ تمثیلی مشاعرہ گورنمنٹ کالج لائل پور میں منعقد ہوا۔ اس میں سودا، میر درد، میر تقی، جرات، مصحفی، انشا، آتش، نسیم، ناسخ، ذوق، مومن، غالب شریک تھے۔ بظاہر یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سودا، درد اور میر تقی کے مشاعرے میں ذوق اور غالب شریک ہوں۔ لیکن کیفی صاحب انھیں عالم بالا سے کھینچ لائے ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ بزرگ ان کے کہنے سے کیسے رضامند ہوگئے۔ تمثیل میں ان بزرگوں کے لباس اور وضع قطع کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ ہر شاعر اپنی اپنی غزل پڑھتا ہے لیکن اس میں بڑا کمال مصنف نے یہ کیا ہے کہ اشعار پر جو داد دی گئی ہے اس سے ہر استاد کا رنگ طبیعت نمایاں ہوتا ہے۔ کہیں کہیں کسی استاد نے اصلاح بھی دی ہے، پھر اس اصلاح پر جو تنقید کی گئی ہے وہ بہت ہی پُر لطف ہے اور اس تنقید کے ادبی نکات نے اس لطف کو اور بڑھا دیا ہے۔ انتخاب کلام بھی بہت اچھا کیا ہے۔ جو اصحاب ذوق ادب رکھتے ہیں ان کے پڑھنے کے قابل ہے۔

کلیات بحری

(مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم-اے، پی ایچ-ڈی، ڈی لٹ۔
الہ آباد یونیورسٹی۔ قیمت تین روپے)

بحری بارھویں صدی کے دکنی شاعر ہیں۔ یہ اورنگ زیب کا عہد تھا۔ یہ گوگی کے رہنے والے تھے جو اس وقت سرکار نظام کے علاقہ میں ہے۔ ان کا شمار اس زمانے کا صوفیا میں ہے اور گوگی میں اب تک ان کا عرس ہوتا ہے۔

بحری کا کلام اب تک بالکل نایاب تھا۔ ڈاکٹر سید محمد حفیظ صاحب نے اب بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کرکے طبع کرایا ہے۔ دیوان مختصر ہے یعنی

اس میں کل ایک سو تیرہ غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں اور ایک بنگ نامہ ہے۔ ابتدا میں قابل مرتب نے ۱۲۱ صفحے کا دیباچہ لکھا ہے جس میں بہت سی غیر ضروری بحثیں آگئی ہیں اور پھر ان کو بھی ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے مثلاً بحری کے ہم عصر شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے انتخاب کی مطلق ضرورت نہ تھی کیونکہ اس پر مستقل کتابیں موجود ہیں اور یہ حالات بھی وہیں سے نقل کیے گئے ہیں۔ دیباچے کے باب پنجم میں کلام بحری کی چند خطی اور لسانی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ یہ خصوصیات بحری ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام دکنی شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں یا مثلاً کتاب میں لگن کے تمام عنوانات کی تصریح اور پھر ان کے مضامین کی تفصیل میں تقریباً تیس صفحے رنگ ڈالے ہیں جس کی اس موقع پر مطلق ضرورت نہ تھی۔

دیباچے کے باب دوم میں شعرا کے تذکروں کا ذکر کرتے ہوے یہ لکھا ہے کہ نکات الشعرا کو تو انجمن ترقی اردو نے شایع کیا ہے لیکن فتح علی گردیزی اب تک طبع نہیں ہوا۔ یہ صحیح نہیں ہے تذکرہ گردیزی کو طبع ہوے تقریباً چھے سال ہوتے ہیں اور یہ بھی انجمن ہی نے شایع کیا تھا۔ اس کے علاوہ جن تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی انجمن شایع کرچکی ہے۔ یعنے مخزن نکات، چمنستان شعرا، گلزار ابراہیم وغیرہ۔

بحری کی اصلی کتاب جو بہت زیادہ مقبول ہوئی اور جو بارہا چھپ چکی ہے (اور بعض اڈیشن فرہنگ کے ساتھ چھپے ہیں) وہ من لگن ہے۔ ان کی غزلیات کو یہ قبولیت حاصل نہیں ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ من لگن کے مقابلے میں ان کا دیوان بہت پست ہے۔ غزلیات میں انھوں نے حد سے زیادہ لفظی رعایت، تجنیس اور ایہام وغیرہ کا خیال رکھا ہے اور اس لیے یہ کلام تصنع اور تکلف سے بھرا ہوا ہے اور یہی وجہ اس کے مقبول نہ ہونے کی ہے۔

فاضل مرتب نے دیوان کے صحیح پڑھنے اور مرتب کرنے میں بہت محنت کی ہے۔ جو جو اشعار مشکل ہیں (اور ایسے بہت ہیں) ان کے معنی حاشیہ میں لکھ

دیے ہیں اور کتاب کے آخر میں الفاظ کے معانی کی ایک فرہنگ بھی شامل کردی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اشعار کے صحیح پڑھنے اور معانی و مطلب بیان کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔ سر سری طور پر مطالعہ کرنے میں جو غلطیاں نظر آئیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ پہلی ہی غزل میں دوسرا شعر ہے (صفحہ ۱۲۳)

جیو کوں ماٹی میں سٹ اس من کون نیچایا سو تونچہ
آد مورت پرورش پانے کوں من معدن ہوا

پہلے مصرع میں لفظ «نیچایا» صحیح نہیں ہے بلکہ «نپچایا» ہے جس کے معنے کے خلق کرنے یا پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ جو کتاب میں معنے بیان کیے گئے ہیں کہ «روح کو مٹی میں پھینک کر اسے نیچے لایا» مہمل ہیں۔ «نپچایا» کے معنے بالکل صاف اور صحیح ہوجاتے ہیں، یعنے مٹی سے پیدا کیا۔ کاتب نے یا پڑھنے والے نے اسے غلطی سے «نیچایا» سمجھا۔ نپچانا قدیم دکنی اردو میں عام لفظ ہے۔

راس بن آیا تو مل بیٹھے ہیں پوچھیں گے سو کیا
یاں کے بھٹ شکر کوں سٹ گڑ مانگتے ہیں فال کیا　　(۱۳۱)

دوسرے مصرع کے معنے یہ لکھے ہیں۔ «یہاں کے بھٹ برہمن (جوتشی) فال نکالتے وقت شکر کی جگہ گڑ مانگتے ہیں»۔ یہ کیا بات ہوئی؟ اس غزل میں ایک دوسرا شعر ہے۔

جیو لے گُڑ دے کہے تو لب شکر یوں بولتے
نسٹ کر کیوں دیوں میں یو مال ہے بقال کیا

قابل مرتب کی تشریح کے مطابق پہلے مصرع کے معنے یہ ہوں گے کہ «دل لے کر گُڑ دے» جو بالکل مہمل ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ قدیم دکنی اردو میں گڑ دینا کے معنے بوسہ دینے کے ہیں۔ اور اس سے معنے ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ بحری کو رعایت لفظی اور ایہام کا خبط ہے، اس لیے وہ گڑ، لب شکر، بقال، مال وغیرہ کے لفظ لایا ہے۔ ورنہ دل لے کے گُڑ دینا مضحکہ‌خیز بات ہوگی۔

مُہن کے من کی رسختی کا جو مضمون بولنے منگتا (۱۳۲)

' بولنے منگتا ' کے معنے 'کوئی مجھ سے پوچھتا' لکھے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے دل کی سختی کا جو مضمون میں بولنا چاھتا۔ منگنا کے معنے چاھنا کے ہیں۔ انگریز اب تک یوں ہی بولتا ہے۔ 'ویل تم کیا منگتا ہے'

کیا نا جان کر تارا نین کوں
تو کھینچے منج پہ سو کے کا کٹارا

دوسرے مصرع کے معنے حاشیہ میں لکھے ہیں 'تو نے مجھے زھرہ (سوک) کے کٹارا کھینچ مارا' زھرہ کا اس شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ 'سوکا' دکن میں ایک قسم کا سنگار ہوتا تھا۔ وہ سرمے کا ایک خط ہوتا تھا جو آنکھ سے زلف تک کھینچ دیا جاتا تھا۔ یہاں یہ اسی خط سے مراد ہے اور اسے کٹار سے تشبیہ دی ہے۔

نفس جنون غرّا ہے عزت دے نکو' رکھ سر پہ لات
لات بھی لائق نہیں ہے بن مُکھی ہور لات کچھ

پہلے مصرع میں ' عزا ' کو غلطی سے غرّا پڑھ لیا گیا ہے اور اس کے معنے غرور کیے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بحری کو جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں' رعایت لفظی اور ایہام کا خاص شوق ہے۔ اسی لیے وہ اس شعر میں لات اور عزا دونوں لایا ہے۔

تجھ کچھ کی صفت میں سکی بھی کچھ تو کہوں کیا
نارنگ تے گھٹ ہے نپٹ انار تے نازک

یہ شعر سینے یعنی پستان کی تعریف میں ہے۔ 'نارنگ تے گھٹ' کے جو یہ معنے لکھے گئے ہیں کہ 'وہ نارنگی سے کم ہے'۔ صحیح نہیں۔ گھٹ کے معنے دکنی میں پکے مضبوط اور سخت کے ہیں۔ اب معنے صاف ہوجاتے ہیں یعنے نارنگی سے سخت اور انار سے نازک۔

اس مان آسمان دیا جن جو نیں کیا
ہر رنج کو سراپ' ہر آرام کو سلام

اس شعر میں "اس مان" کے معنے "اُس طرح" لکھے ہیں۔ اس لیے شعر کا مطلب بالکل خبط ہوجاتا ہے بلکہ کچھ معنے ہی نہیں بنتے۔ یہاں مان کے معنے عزت و وقار کے ہیں۔

ہزار رنگ و لیکن او یک ہے درویشی
جو فرق ہے تو یہی ہر یکس کے باناں میں

دوسرے شعر کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے "اگر کوئی فرق ہے بھی تو ہر شخص کی باتوں (باتاں) میں ہوتا ہے اور بس"۔ اول تو یہ لفظ باتاں نہیں بلکہ باناں ہے جیسا کہ متن لکھا ہے اور یہ بانا کی جمع ہے جس کے معنے واضع کے ہیں۔

پر گٹ بُرا مانے کپٹ بل گے سو کو وہ کون تھے

اس مصرع کے معنے یہ لکھے ہیں "وہ اسے برملا سُن کر برا مان گئے اور چال باز (کپٹ) جو جل بھن گئے۔ یہ بتا وہ کون تھے"۔ اول تو "کپٹ" کے معنے چال باز نہیں۔ "کپٹ" اسم ہے صفت نہیں۔ دوسرے قرینہ اور بحری کا انداز بیان اس کے خلاف ہے۔ یہ لفظ کپٹ نہیں بلکہ کپت ہے جس کے معنے پوشیدہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو برا مان گئے لیکن باطن میں جل بھن گئے۔

فقیر او جو طمع طوق ہے سو کاڑ سٹے
اپس گلے سوں نہ کنٹھا گلے میں پھاڑ سٹے

اس کے معنے یہ لکھے ہیں "فقیر وہ ہے جو اپنے گلے میں سے حرص و طمع کا طوق نکال کے پھینک دے اور اپنے گلے کے ڈورے (کنٹھا) کو گلے ہی میں پھاڑ کے پھینک دے"

قابل مرتب نے دوسرے مصرع میں حرف نفی "نہ" کا خیال نہیں کیا جس سے معنے الٹے ہوگئے۔ مطلب یہ ہے کہ فقیر وہ ہیں جو اپنے گلے سے طمع کا طوق نکال پھینکے نہ وہ جو گلے میں کا کنٹھا توڑ کے پھینک دے۔

ایک پل منے پُھٹ مغز ہوا دانا دان
یک ہات جو اس جسد کے سر پر چھوڑے

یہ مسلسل غزل کا شعر ہے اور اس میں ایک بزرگ سید محمدوارث کی وفات کا ذکر ہے۔ فاضل مرتب نے اس کے یہ معنے لکھے ہیں "جب آں جناب نے کوڑ مغز سر پر ہاتھ رکھ دبا تو وہ بھی دانا ہوگیا"۔ یہ بالکل مہمل ہے۔ اس کے ساتھ کا دوسرا شعر جو قطعہ بند ہے یہ ہے۔

یعنی لے اپس جزو کے نیں کل میں ڈباے

اپنا لے او بڑ بڑا سمد میں پھوڑے

اس شعر میں پہلے شعر کی تصریح کی ہے۔ اب ان معنوں کو جو بیان کیے گئے ہیں اس سے ملائیے تو کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اصل یہ ہے کہ "دانا دان" کے معنے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ اس کے معنے دانا کے نہیں بلکہ دانہ دانہ ہوجانے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو ہاتھ جسم پر ڈالا تو مغز پھوٹ کر دانہ دانہ (ریزہ ریزہ) ہوگیا۔ یعنے اپنے جز کو کل میں ملادیا اور اپنے بلبلے کو سمندر میں جا پھوڑا۔

چولے کوں خرابات کے چیکڑ میں چتر کر (۲۲۷)

مرتب صاحب نے چولے کے معنے چولھے لکھے ہیں۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں۔ "چولے" کے معنے لباس کے ہیں۔ ورنہ چولھے کو میکدہ کی شراب میں رنگنے سے کیا مطلب؟۔ اسی سے چولا بدلنا اردو کا محاورہ ہے۔

پانی نیر نین کا ہور قوت دم ہوا (۲۳۱)

اس کے معنے یہ بیان کیے گئے ہیں "بجائے پانی کے آنکھ کا پانی (نیر) دم کی غذا بن گیا ہے۔

میری رائے میں یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ اس کا پہلا مصرع یہ ہے:۔

"بن دوکھ ہر بشر کوں نہ پانی نہ کھان ہے"

اس میں پانی اور غذا دونوں کا ذکر ہے اور ان دونوں کی تصریح شاعر نے دوسرے مصرع میں کی ہے۔ یعنے پانی تو آنکھ کا نیر یعنے آنسو ہے اور غذا خون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر بشر کے لیے پانی اور غذا بغیر دکھ کے نہیں ہے۔ پانی تو آنسو ہے اور خون غذا ہے۔

بعض جگہ جہاں مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو قابل مرتب نے صاف لکھ دیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایسے مقامات میں سے صرف ایک کا ذکر کرتا ہوں جو بہت دلچسپ ہے۔ بحری نے ایک پھل کی چیستان لکھی ہے، اس پھل کے تمام صفات اور اتے پتے تفصیل سے لکھے ہیں لیکن نام نہیں بتایا۔ نام کو دو شعر میں ایک معمے کی صورت میں لکھا ہے۔ وہ شعر یہ ہیں:-

اگر پوچھے جو اس پھل کا ہے کیا ناؤں
نہ مرغا بل کچیک لکڑی میں ہے چھاؤں
پڑے گا پیش کی جاگے زبر توں
تو پاگا ناؤں اس کا سربسر توں

مرتب ڈاکٹر صاحب نے حاشیہ میں لکھا ہے "کہ ان دونوں شعروں میں نام کا کچھ حل بتایا ہے مگر پہلے شعر کا دوسرا مصرع ہی حل ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے"۔

اس میں کچھ مشکل نہیں صرف ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ اس مصرع میں لفظ "لکڑی" نہیں بلکہ "ککڑی" ہے یا تو کاتب کی غلطی ہے یا پڑھنے میں سہو ہوا ہے۔ اب حل دیکھیے۔ وہ کہتا ہے کہ لفظ کو بجائے کاف کے پیش کے کاف کے زبر سے پڑھیے تو وہ ککڑی ہوا اور یہی وہ پھل ہے جس کی اس نے چیستاں لکھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہوگا کہ اس مصرع میں یہ "مرغا" کیسا۔ یہ بحری کا وہی خبط ہے جو دیوان میں شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے اور کوئی شعر لفظی رعایت اور ایہام سے خالی نہیں۔ ککڑی (بضم کاف) کے معنے مرغی ہوتے ہیں۔ کہتا یہ ہے اگر تم اس پھل کا نام پوچھنا چاہتے ہو تو وہ مرغا نہیں بلکہ کسی قدر ککڑی یعنے مرغی کی چھاؤں میں ہے۔ اب وہ چھاؤں کیا ہے۔ وہ چھاؤں کاف کا پیش ہے۔ اگر پیش کو زبر سے بدل دو تو ککڑی (بفتح کاف) اس پھل کا نام ہے۔

یہ چند شعر وہ ہیں جو سرسری مطالعہ میں میری نظر پڑگئے۔ ورنہ ابھی بہت سے ایسے شعر ہوں گے جن کی صحت اور تشریح کی ضرورت ہے یا جو صحیح نہیں پڑھے گئے ہیں۔ اس کے لیے فرصت درکار ہے جو افسوس ہے کہ اس وقت مجھے حاصل نہیں۔

باوجود اس کے ہم ڈاکٹر صاحب کے بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے کلام کو جو اب تک ناپید تھا بڑی جستجو سے مہیا کرکے شایع کردیا اور پرانی دکنی زبان کے شایقین کے لیے بہت اچھا سامان فراہم کردیا۔ (ا)

—o—

تاریخ و سیر

اتا ترک

شایع کردۂ کتب خانۂ علم و ادب، دھلی

اس کتاب میں محمد مرزا صاحب دھلوی نے اتا ترک غازی مصطفیٰ کمال کے حالات زندگی بڑی محنت اور غایر مطالعہ کے بعد لکھے ھیں اور یہ غازی اعظم کی تمام و کمال سوانح عمری ھے اور اس کی زندگی کے ھر پہلو اور اس کے ھر کارنامے سے بحث کی ھے۔ آخری باب میں اتا ترک کی سیرت کی بہت ھی اچھی تصویر کھینچی ھے۔ اردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ھیں لیکن ایسی جامع کتاب اب تک ھماری زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔ حجم تقریباً تین سو صفحے ھے۔

قیمت مجلد دو روپے۔

(ا)

—o—

متفرقات

مصنفین اردو کی تصویروں کا البم

(مرتبۂ سید زوارحسین صاحب۔ حالی پبلشنگ ھاوس

«کتاب گھر» دھلی قیمت پانچ روپے)

حالی پبلشنگ ھاوس بہت اچھا کام کررھا ھے اور اس نے بعض بہت اچھی اچھی کتابیں شایع کی ھیں۔ یہ البم بھی اسی نے شایع کیا ھے۔ اس البم میں اردو کے چوٹی

کے ادیبوں، مفسرین، ناقدین، مترجمین، ناول نگاروں، افسانہ نویسوں، شعرائے متقدمین، شعرائے متوسطین، شعرائے متاخرین، شعرائے جدید، مزاحیہ نگاروں، مورخین، سوانح نگاروں، فلسفیوں، سیاست دانوں، طبیبوں، معاشئین کی نہایت عمدہ اور نفیس عکسی تصویریں ہیں۔ ایک دو تصویروں کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ میرتقی میر اور مصحفی اور میردرد کی تصویریں نہ معلوم اصلی ہیں یا محض قیاس سے بنالی گئی ہیں۔ یہ البم ہر کتب خانے میں اور صاحب ذوق کے پاس رہنے کے قابل ہے۔ جن صاحبوں کو ان مصنفین کے حالات، ان کی تصانیف اور ان کے کلام کی تنقید دیکھنے کا شوق ہو وہ « مصنفین اردو » نامی فہرست حالی پبلشنگ ہاوس، کتاب گھر، دہلی سے منگا کر اپنا شوق پورا کریں۔ یہ فہرست ۲۳۲ صفحے کی ہے۔ باتصویر فہرست دو آنے میں ملتی ہے اور بلا تصویر مفت۔ یہ فہرست بھی رکھنے کے قابل ہے اور مصفین کے حالات اور کلام کی تنقید بڑی خوبی اور سلیقے سے لکھی ہے۔ (ا)

—o—

اُردو کے جدید رسالے

ہمالیہ۔

یہ رسالہ ماہانہ ہے اور بمبئی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے اڈیٹر منال قریشی، رشید طلعت دہلوی اور ٹھاکر سورج پال ہیں۔ مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔ مثلاً طبی، ادبی، فلمی وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کارآمد باتیں درج رہتی ہیں۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ ہے۔ ایک روپیے میں یہ رسالہ بہت سستا ہے۔ رسالہ دلچسپ اور مفید ہے۔

خاص نمبر

رسالہ ہمدرد صحت دہلی

(ضبط تولید و اصلاح نسل نمبر۔ مرتبہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی۔
مقام اشاعت ہمدرد منزل، دہلی۔ قیمت بارہ آنے)۔

رسالہ کیا ہے تین سو صفحات کے قریب حجم کی ایک کتاب ہے جس میں ضبط تولید کے مسئلہ پر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ علمی، مذہبی، سماجی، عملی اور ادبی ہر تنقیح اس میں آ گئی۔ حتّٰی کہ فاضل مرتب کو اطبّا کے مجرب نسخے بھی نہیں بھولے۔ پیپائرس اور قدیم مصر و بابل سے لے کر آج کل کے اہل دنیا کی رائے اور خیالات بھی اس نمبر میں موجود ہیں۔ ناتجربہ کاری سے ضبط تولید کا عمل جو مضرتیں پیدا کرتا ہے ان کا ذکر بھی وضاحت سے کیا گیا ہے۔ فنی اور سائنس کے پہلو سے اگر یہ نمبر معلومات اور مجربات کا ایک بیش‌بہا خزانہ ہے تو صحافت اور طباعت کا بھی بےنظیر نمونہ ہے۔ اکثر نقشے اور تصویریں بھی موقع بہ موقع دی ہیں جن سے اس دقیق مسئلہ کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ معاشی مسائل پر بھی جو آبادی کی کمی بیشی سے تعلق رکھتے ہیں کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اس مسئلے پر ہر قسم کا مسالہ اتنا فراہم اور مرتب کردیا ہے کہ اسے پڑھ کر بہت سی متعلقہ کتابوں کا مطالعہ غیر ضروری ہوجاتا ہے۔ ابواب کی تقسیم اور مندرجات کی ترتیب میں نہایت دقت نظر سے کام لیا گیا ہے۔ یوں تو ہمدرد صحت کا ہر نمبر اپنی جگہ دلچسپ اور مفید معلومات کا حامل ہوا کرتا ہے مگر یہ خاص نمبر اردو صحافت اور ادارت کی انفس مذاقی کا ایک بلند معیار قایم کرتا ہے۔ اس کے باوجود قیمت کچھ بھی نہیں۔

(ک)

—o—

بنیادی ہندستانی کے الفاظ

از
محمد اجمل خاں ایم۔ اے

ہندستان کے ہر شہر میں ہندستانی سمجھی جاتی ہے اور شمالی ہندستان کے شہروں کے رہنے والوں کی تو یہ مادری زبان ہے۔ یہ ہندستان کی قومی زبان مانی جاتی ہے اور سوائے جنوبی ہندستان کی زبانوں کے، ہندستان کے مختلف حصوں کی بولیوں اور زبانوں سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس میں سنسکرت، عربی، فارسی اور یوروپین زبانوں کے لفظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے بولنے کا طریقہ ہندستانی ہوگیا ہے اور بہت سے لفظ تو اتنے بدل گئے ہیں کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ سنسکرت ہیں، عربی ہیں یا فرنگی۔ گویا وہ سب ہندستانی ہوگئے ہیں۔

ہندستان میں بہت سی زبانیں اور سیکڑوں نہیں ہزاروں بولیاں رائج ہیں۔ اس لیے اگر کوئی ہندستانی ان سب بولیوں کو سیکھنا چاہے تو اس کی عمر کافی نہ ہوگی۔ خود ہندستانی زبان میں پانچ چھے لاکھ لفظ موجود ہیں۔ ان میں سے عام آدمی کا کام پانچ چھے سو لفظوں سے چل جاتا ہے۔ لیکن جہاں کسی ادبی یا علمی مضمون سے کام پڑتا ہے وہاں نئے نئے لفظوں کی انتہا نہیں رہتی۔ اس حالت میں ایک معمولی لکھا پڑھا آدمی خود اپنی زبان سمجھنے کے لیے ڈکشنری ڈھونڈھنے لگتا ہے اور جن کی زبان ہندستانی نہیں ہے انھیں تو اور بھی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ غرضکہ ہندستانیوں کو دو بڑی مشکلیں سر کرنی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ہندستانی زبان کے ہزاروں لاکھوں لفظوں میں سے ایک ہزار کے لگ بھگ ایسے لفظوں کا چننا جن میں روزمرہ کی بات چیت، کاروبار، پڑھنا لکھنا سب کچھ ہوسکے تاکہ ان لفظوں

کے سیکھنے اور یاد کرنے میں دوسرے صوبوں کے لوگوں کو آسانی ہو۔ دوسری مشکل یہ دور کرنی ہے کہ خود ہندستانی بولنے والوں کی تعلیم کے لیے ایک سہل اور آسان زبان کا معیار مقرر ہوجائے تاکہ ان محنت پیشہ اور کاروباری لوگوں کو تھوڑے سے وقت میں اپنی زبان کے بلند پایہ ادبی و علمی شاہکاروں کے ترجمے پڑھنے میں آسانی ہو۔ یعنی اگر وہ رامائن یا دیوان غالب پڑھنا چاہیں تو ایک ہزار لفظوں کے اندر اندر ان چیزوں کا ترجمہ ہوسکے اور وہ سمجھ سکیں۔

اس کوشش میں دو چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ اول یہ کہ ہم کوئی نئی زبان نہیں تصنیف کررہے بلکہ ہندستانی زبان کے رائج لفظوں کو ایک ہزار یا اس سے کم لفظوں میں محدود کرنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ ہمارا منشا بین صوبجاتی (Inter-Provincial) زبان کو ترقی دینے کا ہے۔ اس لیے لفظوں کے چننے میں اس بات کی پروا نہ کی جائے کہ ان کا پرانے زمانے میں سنسکرت سے تعلق تھا یا عربی سے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ عام رواج کی مُہر کن لفظوں پر لگ چکی ہے۔

بنیادی انگریزی کا یہ دعویٰ ہے کہ سنہ ۲۰۲۰ع تک یہ بین الملی یعنی (International) زبان ہو جائےگی۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب (The Shape of Things to Come, 1933.) میں یہ پیشین گوئی کردی ہے اور بڑے اہتمام سے بنیادی انگریزی کی ہر ایک کتاب میں یہ لفظ درج کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں سیاسی اقتدار کے زعم میں کہی جارہی ہیں؛ غیر انگریزی قوموں کو اس زبان سے وہ دلچسپی نہیں جو فرنچ یا جرمن سے ہے۔ فرانس کی زبان یورپ کی فارسی ہے۔ اس میں جو شیرینی اور سلاست ہے وہ کسی یوروپین زبان میں نہیں۔ جرمن زبان سائنس کی خزینہ دار ہے اور کسی سائنس والے کو اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لہذا ہم انگریزی کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کرنا چاہتے کہ ہم ابھی ہندستانی کو انٹرنیشنل زبان بنانا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی زبان انٹرنیشنل زبان بننے کی بہت زیادہ اہلیت رکھتی ہے اور ہندستان آنے والوں کو بہت آسانی سے یہ زبان آجاتی ہے اور جہاں جہاں تجارت یا مذہبی ضرورتوں کے لیے ہندستانی جاتے

ہیں وہاں کے باشندے ہندستانی زبان سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، ماریشش فیجی، جاوا، افغانستان، برما، تبت، ہانگ کانگ میں تاجروں کے ذریعہ سے اور ایران، عراق، حجاز، فلسطین اور شام میں زائروں اور حاجیوں کے ذریعہ سے ہماری زبان پہنچ گئی ہے۔ لیکن باوجود اس کے آج ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنی زبان کو اس طرح انٹرنیشنل بنائیں کہ فارسی، عربی یا جاوی لفظوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کریں اور بےضرورت ایسے لفظوں کو بنیادی ہندستانی میں داخل کریں جو خود ہمارے ملک میں عام طور پر رائج نہیں۔

بنیادی ہندستانی میں کتنے لفظ ہوں؟

ہمارا روزمرہ کا کار و بار سات آٹھ ہزار لفظوں سے چلتا ہے۔ لیکن بنیادی انگریزی لکھنے والوں نے دس سال کے تجربہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کام چلانے کے لیے آٹھ نو سو لفظوں کے بغیر چارہ نہیں۔ ہم بھی اس تجربہ کی بنا پر یہ کرسکتے ہیں کہ بنیادی انگریزی کی طرح ۸۵۰ لفظوں کا انتخاب کریں۔ ان لفظوں میں اگر سو انٹرنیشنل لفظ اور پچاس کسی مخصوص سائنس کی اصطلاحیں شامل کرلی جائیں تو ہم سائنس کا رسالہ آسانی سے نکال سکتے ہیں۔ گویا صرف ایک ہزار لفظوں میں ہم سب کچھ کہہ سکیں گے۔

ساڑھے آٹھ سو انگریزی لفظوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک گھنٹے میں تیس لفظ یاد کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح ایک ایسا شخص جس کی زبان انگریزی سے بہت زیادہ مختلف نہ ہو اگر ایک گھنٹہ روزانہ لفظوں کو سیکھے تو تیس گھنٹوں یعنی ایک مہینے میں پورے لفظ سیکھ سکتا ہے۔ اگر اس دعوے میں کچھ بھی حقیقت ہے تو ہم پورے بھروسے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی ہندستانی کے ۸۵۰ لفظوں کو ہندستان کے مختلف غیر ہندستانی بولنے والے صرف ۵ گھنٹوں میں یاد کرسکتے ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں:—

پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہندستان کی جتنی زبانیں اور بولیاں ہیں ان میں بنیادی لفظ تقریباً یکساں ہیں۔ صرف تلفظ کا فرق ہے جو آسانی سے ہندستانی زبان کے معیار پر آسکتا ہے اور جس طرح بنیادی انگریزی کے گراموفون ریکارڈ بنائے گئے ہیں اسی طرح پندرہ منٹ میں پورے ہندستانی لفظ سنے جاسکتے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ گوتم بدھ کی انقلابی تحریک نے ہندستانیوں کو ذات پات کے بندھنوں کے توڑنے میں بہت مدد دی تھی اور ہندستانیوں میں متحدہ قومیت کو بڑھا کر بین الملیت تک پہنچادیا تھا۔ مسلمانوں کا دور شروع ہونے سے پہلے اگرچہ قدامت پرستی نے پھر پیر جمالیے تھے لیکن پھر مساوات انسانی کا سبق دھرایا جانے لگا تھا اور شہنشاہی دربار کے علاوہ صوبوں کے حکام نے بھی ملکی بولیوں کو ترقی دینی شروع کی تھی۔ قدرتاً وہ بولی جو دہلی یا آگرے سے قریب تھی ہندستان کی عام زبان بننے لگی اور کبیر، نانک اور دادو کی قسم کے بزرگوں کو بے کھٹکے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملا۔ اس طرح "ہندستان" کی بولی پورے ہندستان میں پھیلنے لگی۔

لہذا اگر ہم ہندستان کی مختلف زبانوں کا مطالعہ کریں تو وہ زبانیں جو دہلی یا آگرے سے اثر پذیر ہوئی تھیں ان میں ایک خاص یکجہتی پائیں گے۔ صرف تلفظ اور کسی قدر گرامر کا اختلاف ہے جو چند گھنٹوں کی محنت میں دور ہوسکتا ہے۔ یعنی ہم مختلف صوبوں کے باشندوں کو ایک ہفتہ میں ہندستانی زبان اور گرامر سکھا سکتے ہیں۔

معمولی ہندستانی بولنے والوں کے لیے بنیادی ہندستانی کے فائدے

پوچھا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان ہندستانی ہے انھیں بھی بنیادی ہندستانی سیکھنا چاہیے یا نہیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے کہ نہ صرف

سیکھنا چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو آپس میں اسی کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے ایک بہت بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ دماغ پر بلاوجہ ہزاروں لفظوں اور گرامر کے مشکل اصولوں کا بار نہ پڑے گا اور ہر ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ہرقسم کی علمی اور ادبی معلومات سے فائدہ حاصل کرسکے گا۔ بچے بھی زبان کی پیچیدگیوں سے بچ جائیں گے اور تیزی سے علموں اور فنون کو حاصل کرنے لگیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب اس قسم کا کافی لٹریچر بن جائےگا تو غیرہندستانی بولنے والوں کو اس زبان کے سیکھ لینے میں کوئی مشکل باقی نہ رہے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایچ۔جی۔ واز کی طرح پیشین‌گوئی کی جائے تو سنہ ۲۰۲۰ ع میں نہیں بلکہ صرف بیس سال کے اندر یہ زبان ہندستان کے گاؤں گاؤں میں پھیل جائے گی۔

لیکن جہاں تک شعر و شاعری اور اونچے درجہ کی ادبی تصنیفات کا تعلق ہے وہ معمولی ہندستانی میں جاری رہیں گی تاکہ ہندستانی زبان کا فطری نشو و نما جاری رہے۔ اس لٹریچر کے سمجھنے کے لیے ایک ایسی لغت کی ضرورت ہوگی جو معمولی ہندستانی کے لفظوں کو بنیادی ہندستانی میں بیان کردے۔ بالفعل سات آٹھ ہزار معمولی لفظوں کی لغت بنیادی ہندستانی میں تیار کی جارہی ہے۔

لغت اور محاورات

شروع میں صرف سات آٹھ ہزار ایسے لفظوں کی لغت تیار کی جارہی ہے جو عام ادبی اور اخباری لفظوں پر حاوی ہو۔ لیکن اس سلسلے میں سینکڑوں لفظ ایسے مل رہے ہیں جو ہندستان کی مختلف ہندیوں میں تھوڑے سے اختلاف تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ ایسے لفظوں کو انٹر پراونشل (بین صوبجاتی) قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہندستانی میں ایک لفظ ہے "چاند"۔ اسے ایک ہندی میں چندر، دوسری میں چندرو، تیسری میں چندرماں، چوتھی میں چندا، پانچویں میں چھوم یا سوم کہتے ہیں۔ لیکن جس کسی خطۂ ملک میں آپ ہندستانی لفظ "چاند" بولیں وہاں

یہ لفظ سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس لیے ایسے ہندستانی لفظوں کو انٹرپراونشل کہتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز سامنے آرہی ہے۔ یعنی بہت سے ایسے لفظ ہیں جو مختلف صوبوں میں ایک ہی طرح بولے اور لکھے جاتے ہیں گویا انٹرپراونشل ہیں۔ لیکن ہرجگہ ان کا مفہوم الگ الگ ہے۔ مثلاً بنارسی ہندی میں دھنباد کے معنی ہیں شکریہ اور مرہٹی میں مبارکباد کے لیے یہ لفظ رائج ہے۔ اسی طرح ہندستانی میں پنچایت کے معنی ہیں مجلس مشورہ' لیکن مرہٹی میں جھگڑے کو کہتے ہیں۔ گجراتی میں راجی نامہ (راضی نامہ) استعفیٰ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور دکھل (دخل بمعنی قبضہ) کو مداخلت بیجا کے لیے بولتے ہیں۔ بہاری میں سوبھاگ سوھاگ کو کہتے ہیں لیکن اسی لفظ کے معنی ناگپور میں محنت کے لیے جاتے ہیں۔ اس اختلاف مفہوم کو صرف اس طرح ختم کیا جاسکتا ہے کہ کسی لفظ کے جو معنی ہندستانی زبان میں مقرر ہوگئے ہیں وہی معیاری معنی ہوں گے اور باقی معنی غیر فصیح قرار دیے جائیں گے۔

بہر حال اس قسم کے جتنے لفظ ہندستانی زبان میں موجود ہوں وہ سب انٹرپراونشل سمجھے جائیں گے اور مختلف زبانیں بولنے والوں کا فرض ہوگا کہ ان لفظوں کو ہندستانی مفہوم میں اپنے یہاں رائج کریں تا کہ ہندستانی زبان صحیح معنوں میں ملک کی عام زبان کہی جاسکے۔

معمولی ہندستانی میں جو محاورے رائج ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہندستان کی دوسری زبانوں میں آسانی سے ترجمہ ہوسکتے ہیں اور جو شخص صرف بنیادی لفظوں کے معنے ہی جانتا ہو وہ بھی انھیں سمجھ لےگا لیکن خود تصنیف نہیں کرسکتا۔ ابتدا میں ایک ہزار کے قریب قریب محاوروں کی فہرست بنادی جائے گی جن میں سے چار پانسو محاورے تو دیکھتے ہی سمجھ میں آجائیں گے اور باقی بھی ایسے ہوں گے جو استعمال اور بات چیت کرنے کی مشق کے بعد خود بخود زبان پر چڑھ جائیں گے اور اکثر تو ایسے ہوں گے جو سیاق بیان ہی سے سمجھ لیے جائیں گے۔ مثلاً لفظ (بننا) کے ایک تو معمولی معنی ہیں جو بنیادی ہندستانی میں استعمال

ہوں گے ۔ لیکن محاورے کے طور پر دوسرے لفظوں کے ملانے سے کئی ایسے پیچیدہ معنی پیدا ہوسکتے ہیں جو صرف معمولی سادہ معنی پر دلالت نہیں کرتے ۔ جیسے :۔

(۱) اتنا کیوں بنتے ہو ؟　　(۲) تم لاکھ جھگڑو لیکن کچھ بنا نہیں سکتے ۔

(۳) اتنا نہ بناؤ کہ رونے لگے ۔　　(۴) کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے ؟

(۵) کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہار حسن دکھا گئے !

(۶) ان بن ہو جانا ۔　　(۷) دونوں میں خوب بنتی ہے ۔

(۸) بنی کے سب ساتھی ہیں ۔　　(۹) تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم...

(۱۰) بناوٹی غصہ کرتا ہے　　(۱۱) بناوٹ کی خرابی ہے ۔

(۱۲) بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ۔　　(۱۳) بن کے بیٹھنا ۔

(۱۴) بنانا بگاڑنا خدا کے ہاتھ ہے وغیرہ ۔

اختصار سے طوالت کی طرف

بنیادی زبان میں صرف چند سو لفظوں سے کام لینا ہوگا ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں ان ہی لفظوں کے بہت سے ایسے مرکبات بنانے ہوں گے جو معمولی بنیادی میں مختصر طور پر صرف ایک ہی لفظ سے ادا ہوسکتے ہیں ۔ یا یہ کرنا ہوگا کہ اپنے مفہوم کو گھما پھرا کر بیان کریں تا کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ لفظوں کی فہرست سے ہم باہر نہ جاسکیں ۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کام بالکل اس استاد کا سا ہو جائے گا جو کسی شاعر یا ادیب و فلسفی کے مشکل مفہوم کو ابتدائی درجے کے بچوں کو سمجھانا چاہتا ہے اور ایسی آسان اور عام فہم زبان میں سمجھانا چاہتا ہے جو ان بچوں کی استعداد سے باہر نہ ہو ۔ گویا مختصر معانی کو طول دینا اور آسان کرنا بنیادی ہندستانی کا کام ہے ۔

مختصر لفظوں کو طویل اور آسان بنانے کے کئی طریقے ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ عام معنی کو خاص یا خاص معنی کو عام بنادیا جائے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی کلمہ کو مختلف معنوں میں استعمال کریں ۔

عام معنی کو مخصوص معنوں میں اس طرح استعمال کیا جاتا ھے کہ کسی کلمہ کو کل کی بجائے جُز کے لیے یا جماعت کی جگہ فرد کے لیے استعمال کریں ۔ مثلاً « تختی » عام لکڑی کی تختی کو کہتے ھیں ۔ اس کے مخصوص معنی بچوں کے لکھنے کی تختی کے ھوجاتے ھیں ۔ اسی طرح « قاعدہ » عام لفظ ھے لیکن خاص معنوں میں اس سے بچوں کی وہ ابتدائی کتاب سمجھی جاتی ھے جس سے وہ ابجد سیکھتے ھیں ۔ اسی طریقہ پر خاص سے عام بھی بنا لیتے ھیں ۔ مثلاً کاغذ ایک خاص لفظ ھے ۔ لیکن کہیں اس کے معنی « خط » کے ھیں کہیں حکم کے اور کہیں اخبار کے ۔

ایک ھی کلمہ کو مختلف قسموں کے کلموں کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ھے اور اس طرح ایک کلمہ بہت سے معنوں کا اظہار کرکے اپنی وحدت کو کثرت یا اختصار کو طوالت سے بدل سکتا ھے ۔ مثلاً «حور» اسم ھے؛ اسے صفت کے طور پر استعمال کریں تو اس کے معنی خوبصورت عورت کے ھوجاتے ھیں ۔ یا کھانا فعل ھے؛ اسے اسم کے طور پر استعمال کریں تو کھلائی اور خوراک یا غذا کے معنی پیدا ھوجاتے ھیں ۔ «پر» ایک حرف ھے جو مگر یا لیکن کا ھم معنی ھے لیکن اسم بن جاتا ھے اور پر پروانہ یا پر پرندہ ھوسکتا ھے ۔ اس کے علاوہ «اوپر» کے معنوں میں بھی استعمال ھوتا ھے ۔

بیسک انگلش یا بُنیادی انگریزی کے لفظ

اب بغیر کسی مزید تمہید کے ھمیں ان بنیادی لفظوں کی فہرست بنالینا چاھیے جن کی کم سے کم تعداد ھمارے روز مرہ کے علمی اور تجارتی کاموں کو چلا سکے ۔ یہ کام ایک حد تک انگریزی میں ھوچکا ھے اور اس سے ھمیں کافی مدد مل سکتی ھے ۔

بیسک انگلش کی ایک فہرست سنہ ۱۹۲۸ ع میں چنی گئی تھی جو سنہ ۱۹۲۹ ع میں شائع کی گئی ۔ اس میں بہت سے لفظ بحث طلب تھے اور انگریزی کے زباندان مختلف پہلوؤں سے ان پر بحث و نقد کرتے رھے ۔ کوئی کہتا تھا کہ افعال کا ھونا ضروری ھے یعنی ھر مفہوم کے ادا کرنے کے لیے جو افعال و مصادر پیدا ھوگئے ھیں

وہ فطری ہیں اور انھیں زبان کا جُزوِ اعظم ہونا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا کہ اسما زیادہ قدیم اور زیادہ ضروری ہیں۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ اسما سے ہمارا بہت زیادہ اور مفید کام ہوسکتا ہے، ان کی تعداد چھے سو سے کم نہ ہو اور افعال و حروف کی تعداد اتنی ہو کہ جن کے بغیر چارہ نہیں۔ غرض کہ جب بنیادی انگریزی کے پندرہ فی‌صدی مشکوک الفاظ بھی نکال دیے گئے تو سنہ ۱۹۳۱ع میں موجودہ فہرست پر سب کا اتفاق ہوگیا اور یہ شایع کی گئی۔

ذیل میں بنیادی انگریزی کے آٹھ سو پچاس لفظ درج کیے جاتے ہیں، ان کا ہندستانی ترجمہ بھی دیا جاتا ہے۔ جو حضرات اس فہرست کو ناکافی سمجھتے ہوں یا ہندستانی زبان کے بنیادی لفظوں میں نہ شمار کرتے ہوں ان سے درخواست ہے کہ اپنے تجویز کردہ لفظوں کی فہرست بحث و نظر کے لیے ارسال فرمائیں تاکہ ایک آخری اور مختتم فہرست شایع ہوسکے۔

A (آ۔ ء۔ ع)

آدمی	Man	آپ ۔ خود	Self
آئین (قانون)	Law	آرام	Rest / Comfort
آگ	Fire	آسمان	Sky
آگے	Forward	آٹا ۔ کھانا	Meal
آہستہ	Slow	آواز	Force / Sound
آج	To-day	آزاد	Free
آلہ	Apparatus	اب	Now
آلو	Potato	اب ھی (ابھی) (موجودہ)	Present
عام	General	اچھا	Good / Well
آم	Mango	اچانک ۔ یکایک	Sudden
آنا	Come	ادب ۔ عزت کرنا	Respect
آنکھ	Eye		

English	Urdu
Muscle	عضله (اذله)
Regret	افسوس
If	اگر - جب
Strange	عجب
Last / End	انتہا (آخر - ختم)
Different	علیحدہ
Off / Away	الگ - جُدا
Separate	جُدا
Certainly	البتہ - ضرور
Peace	امن - شانتی
In	اندر
Dark	اندھیرا - کالا
Egg	انڈا
Engine	انجن
Thumb	انگوٹھا
And / More / Other	اور - زیادہ
Woman	عورت
Sense	عقل
Wise	عقل والا
Foolish	بے عقل
Request	عرضی
Effect	اثر
Normal	اصلی
Hospital	اسپتال
Such / So	ایسا

B (ب)

English	Urdu
Cloud	بادل
Garden	باغ
Hair	بال
Bucket	بالٹی
Father	باپ
Rest	باقی - آرام
Fact / Event	بات
Talk	بات چیت (گفتگو)
Left	بائیاں - اُلٹا
Market	بازار - مارکٹ
Body	بدن
Bad	بد - بُرا
Baby	بچّہ
Sister	بہن
Discussion	بحث
Frequent	بہت دفعہ - بار بار (اکثر)
Goat	بکرا
Box	بکس
Make	بنانا
Shut	بند
Harbour / Monkey	بندر
Gun	بندوق

Daughter	بیٹی
Son	بیٹا
Married	بیاھا
Brother	بھائی - برادر
Steam	بھاپ
Even	بھی - تک
Sheep	بھیڑ
Send	بھیجنا - روانہ کرنا
Electric	بجلی (الکٹرک)
Cat	بلّی
Point	بندی (نقطہ)
Bed	بستر
Drop	بوند
Bone	بونگ - ھڈی
Bottle	بوتل
Conscious	بوجھ - سمجھ - ھوش
Old	بڈھا - پُرانا
Base	بنیاد

Design	بناوٹ
Big	بڑا
Level / Equal	برابر
Year	برس - سال
Brush	برش
Snow / Ice	برف
Growth	بڑھان - ترقی
Increase / Development	بڑھاؤ - ترقی
Button	بٹن
Bulb	بتی
Business	بیوپار
Statement	بیان
Middle	بیچ - (درمیان)
Between	بیچ میں
Seed	بیج
Ill	بیمار
Berry	بیر
Interest	بیاج

C. CH (چ - چھ)

Spoon	چمچہ - کاسک (قاشق)
Wide	چوڑا
Flat	چپٹا
(Spinning Wheel	(چرخہ
Spring	چشمہ - کمانی
Jelly	چٹنی - جیلی

Desire / Impulse	چاھنا - خواھش
Silver	چاندی
Rice	چاول
Behaviour	چلن
Start	چلنے کی جگہ
Bright	چمکیلا - چمک دار - روشن

Umbrella	چھتری	Thing	چیز
Sneeze	چھینک	Smooth	چکنا
Narrow	چھوٹا - (تنگ)	Stick	چپکنا - لکڑی
Touch	چھونا	(Sticky)	(لیسدار)
Because	چوں کہ	Ring	چھلا - حلقہ
Pipe	چلم - نل - پائپ	Print	چھاپ

D. DH (د - دھ)

Late	دیر	Grain	دانہ (غلّہ - اناج)
Slope	ڈھال (اُترائی)	Argument	دلیل
Substance	دھات	Breath	دم (سانس)
Skeleton	ڈھانچہ (پنجر)	Stick	ڈنڈا - (لکڑی)
Loose	ڈھیلا	Brain	دماغ
Heart	دل (من)	Danger / Fear	ڈر - خطر
Day	دن - روز	Drawer	دراز
Island	دوآب (دویپ) جزیرہ	Degree	درجہ
Far / Away	دور (الگ)	Door	دروازہ (دوار)
		Chemical	دوا
Friend	دوست	Ink	دوات (سیاهی - روشنائی)
Thin	دُبلا پتلا	See	دیکھنا
Pain	دُکھ درد	Give	دینا

E (ای)

Belief	ایمان دھرم	Invention	ایجاد
Feeling	احساس	Brick	اینٹ

F (ف)

Military	فوجی	Decision	فیصلہ
Steel	فولاد	Art	فن
		Army	فوج

G. GH. GH. (گ ۔ گھ ۔ غ)

Past / Went	گیا ۔ گزرا	Will	گا
Grass	گھاس	Cow	گائے
Skirt	گھانگرا ۔ لہنگا	Music / Song	گانا
Bell	گھنٹہ	Town	گاؤں
Horse	گھوڑا	Thick	گاڑھا
House / Building / Place	گھر ۔ مکان	Deep	گہرا
Watch / Hour	گھڑی گھنٹہ	Cushion	گدا
		Throat	گلا
Poor	غریب	Dirty	گندہ ۔ میلا
Wrong	غلط	Knot	گانٹھ ۔ گرہ
Clock	گھڑیال ۔ (کلاک)	Thunder	گرج
Mistake / Error	غلطی	Summer / Heat	گرمی
Anger / Angry	غصہ	Group	گروہ

H (ح ۔ ہ)

Hand	ہاتھ	Condition	حال
Digestion	ہاضمہ	Is	ہے (ہونا)
Plough	ہل	Drive	ہانکنا (چلانا)

Hammer	ہتوڑا
Move	ہٹنا - حرکت کرنا
Instrument	ہتیار - (آلہ)
Account	حساب کتاب
Become	ہوجانا
Be / Exist	ہونا
Am	ہوں
Order / Authority	حکم
Were / Was	تھے - تھا
Government	حکومت - گورنمنٹ
Light	ہلکا (روشنی)
(Us)	ہم کو - (ہمیں)
Our	ہمارا
Ever	ہمیشہ - سدا
Attack	حملہ
Laugh	ہنسی - (فارسی لاف)
Hook	ہنسیا (ہک)
Green	ہرا - سبز
Every	ہرایک - ہرکوئی - ہر
Move / Movement / Motion	حرکت (ہلنا)

I (ا)

Suggestion	اشارہ
Advertisement	اشتہار
Agreement	اتفاق
Unit	اکائی
These	ان - یہ
Reward	انعام
End / Last	انتہا - آخر - (انت سنسکرت) ختم۔

J. JH. (ج - جھ)

Where	جہاں - جدھر
Jewel	جواہر
Young	جوان
Answer	جواب
Ship	جہاز
Flag	جھنڈا (نشان)
False	جھوٹ
Awake	جاگنا
Net	جال
Expert	جان کار (ماہر)
Animal (Animus)	جانور
Knowledge	جاننا (عِلم)
As / So	جیسا - ایسا
Space / Position	جگہ

English	Urdu
Addition	جوڑنا - جمع کرنا
Boot / Shoe	جوتا (بوٹ - شو - سلیپر)
Crime	جُرم
Bent	جُھکا ہوا - ٹیڑھا
Sex	جنس
Who / Which	جو
Connection	جوڑ - میل

K. KH. <u>KH</u> (ک - کھ - خ)

English	Urdu
Work / Use / Act / Business	کام - کار
Industry	کاریگری
Factory	کارخانہ
Comb	کنگھی
Who	کون
Linen / Dress / Cloth	کپڑا
Do	کرنا
Bitter	کڑوا (زہر)
Attraction	کشش - کھینچنا
That	کہ - وہ
Insect / Worm	کیڑا
Ant	کیڑی (چیونٹی)
Kettle	کیتلی
Food / Meal	کھانا (خوراک)
Bad	خراب (بُرا)
Chalk	کھریا (چاک)
Store	کھتا
Cork	کاک
Prison	کال کوٹھری - قید خانہ
Black	کالا - سیاہ
Ear	کان
Bite / Cut	کاٹنا
Of	کا
When	کب (کس وقت)
Say	کہنا
How	کیسا - کیسے (کس طرح)
Cough	کف - کھانسی
Where	کہاں (کس جگہ)
Fiction / Story	کہانی - قصہ
To-morrow / Yesterday	کل
Little / Some	کچھ - ذرا - تھوڑا (سا)
Spring	کمانی (سپرنگ)
Camera	کیمرا
Room	کمرہ (کوٹھری - دالان)
Edge	کنارہ

Any Certain	کوئی	Curve	خم ۔ گولائی
Committee	کمیٹی	Play Amusement	کھیل تماشا
Angle	کونہ (زاویہ)	Farm	کھیت
Whip	کوڑا	Window	کھڑکی
Crush	کچلنا	Rough	کُھردرا
Family	کنبہ ۔ خاندان	Pleasure	خوشی
Dog	کُتّا	Canvass	کنوس
Well	کُنواں	Ray	کِرن
What	کیا ۔ جو	Book	کتاب
Why	کیوں	Library	کتاب خانہ
		To	کو

L (ل)

Girl	لڑکی	Red	لال ۔ سُرخ
Hang	لٹکنا	Get	لانا
Paste	لئی	Lip	(لب) ھونٹ
Transport	لے جانا	Word	لفظ ۔ بول
Take	لینا	Wave	لہر ۔ موج
Writing	لکھنا	Stick Wood	لکڑی (چھڑی)
List	لسٹ ۔ فہرست	Long Tall	لمبا (طویل)
Iron	لوھا		
Elastic	لچک ۔ لوچ	Flame	لو (لپٹ ۔ شعلہ)

M (م)

Money Property	مال ۔ (مال و زر)	Famale	مادہ (ناری)
Owner	مالک	Material Matter	مادّہ ۔ دھات

English	Urdu	English	Urdu
Strong	مضبوط	Seem	معلوم ہونا
Porter, Worker	مزدور	Mother	ماں
		Expert	ماہر (جان کار)
Sweet	میٹھا	Fish	مچھلی
Kind	مہربان	Help	مدد
Please	مہربانی کرکے	West	مغرب (پچھم)
Arch	محراب	Month	ماہ - مہینہ
Among, In	میں - درمیان	(I)	میں
		Fly	مکھی
Connection	میل - جوڑ	Bee	مکھی شہد کی
Table	میز	Rub	ملنا
Mix	ملانا	Mind	من (دل)
Minute	منٹ	Manager	منیجر
Example	مثال	Temple	مندر (معبد)
Twist	موڑنا	Approval	منظوری
Fat	موٹا	Current	موجودہ - رائج - لہر
Country	مُلک - دیس	Present	موجودہ - حال - (ابھی)
Possible	ممکن	Chance	موقع
Face, Mouth	منہ - چہرہ	Weather, Monsoon	موسم
Competition, Comparison	مقابلہ	Death	موت
		Die	مرنا
Square	مربع	Machine	مشین
Cock, Fowl	مرغا (مرغی)	East	مشرق (پورب)
Difficult	مشکل	Taste	مزہ

N . (ن)

English	Urdu	English	Urdu
Drain	نالی	Nose	ناک
Name	نام	Nail	ناخن

Mark	نقش - علامت	Measure	ناپ
Map	نقشہ	Orange	نارنگی
Male	نر - مرد	Female	ناری (مادہ)
Soft	نرم	No / Not	نا - نہیں (مت)
View	نظر	Natural	نیچرل
Theory	نظریہ	Disgust	نفرت
Low	نیچا (کمینہ)	Bathe	نہانا
Down	نیچے	Pipe	نل - نالی
Sleep	نیند	Salt	نمک
Sign	نشان	Number	نمبر (گنتی)
System / Organisation	نظام (طریقہ) (نیت)	Youth(See young)	نوجوانی
		Servant	نوکر
Loss / Damage	نقصان	Copy	نقل

OO (او)

Over / Up / On	اوپر - پر	Wool	اون - پشم

P. PH. (پ - پھ)

Wheel	پہیہ - چکر	Pocket	پاکٹ (جیب)
Representative	پنچ (نمائندہ)	Polish	پالش
Cheese	پنیر	Water	پانی
Reading	پڑھنا (پڑھائی)	Foot	پاؤں
Curtain	پردہ	First	پہلا
Teaching	پڑھنا - تعلیم	Birth	پیدائش - جنم
Care	پروا	Cook	پکانے والا - باورچی
Selection	پسند - چننا	Grip	پکڑ (گرفت)
Stone	پتھر	Mountain	پہاڑ

English	اردو
After, Back	پیچھے (پیٹھ)
Yellow	پیلا - زرد
Drink	پینا
Pencil	پنسل
Love	پریم محبت - پیار محبت
Dear	پیارا - عزیز
Complex	پیچ دار
Screw	پیچ
Tree	پیڑ
Stomach	پیٹ
Spade	پھاوڑا
Fruit	پھل
Stretch, Expansion	پھیلنا (پھیلاؤ)
Crack	پھٹنا (شگاف)
Flower	پھول
Pin	پن - سوئی
Plate	پلیٹ (رکابی)
Old	پُرانا (بڈھا)

Q (ق)

English	اردو
Rule	قاعدہ
Process	طریقہ
Able	قابل
Control	قبضہ - قابو
Step	قدم
Pen	قلم
Scissors	قینچی
Shirt	قمیص
Town	قصبہ
Debt	قرض - ادھار

R (ر)

English	اردو
Opinion	رائے
Road	راہ - راستہ
Guide	راہبر
Government, State	راج - حکومت - سلطنت
Tin	رانگ - رانگا
Night	رات
Remain	رہنا
Keep	رکھنا
Nerve	رگ
Colour, Paint	رنگ
Amount	رقم (کُل جمع)
Cord	رسی
Rail	ریل
Silk	ریشم
Sand	ریت - بالو
Relation	رشتہ

Stop	روک - رکاوٹ	Light	روشنی - اُجالا
Cotton	روئی	Bread	روٹی
		Cry	رونا - چلّانا

S. SH. (س - ص - ش)

Winter	سردی	Soap	صابون
Street	سڑک	Simple	سادہ
Question	سوال	Clean / Clear	صاف - ستھرا
Straight / Right	سیدھا	Science	سائنس
Learning	سیکھنا - علم	Snake	سانپ
Tray	سینی	Company / Together / With	ساتھ - سے - مع
Whistle	سیٹی		
Secretary	سکریٹری	Shade	سایہ - چھاؤں
By / From / With / To	سے	All	سب
		Reason	سبب
Politics	سیاست	Meeting	سبھا - جلسہ - میٹنگ
Picture	شبیہ - تصویر	True / Right	سچ - سچا
Sugar	شکّر (مُعرّب سُکّر)	Page	صفحہ
Person	شخص	Hard / Difficult / Stiff	سخت
Wine	شراب		
Shame	شرم	May	سکنا
Shelf	شلف - الماری	Safe	سلامت
Star	ستارہ	Society	سوسائٹی - سماج
Gold / Sleep	سونا	Sea	سمندر
Dry	سوکھا - خشک	Head	سر
Sun	سورج	Slip	سرکنا
Form	صورت	Chief	سردار

English	Urdu
Station	سٹیشن
Morning	صبح - سویرا
Hear / Hearing	سننا
Needle	سوئی

T. TH. (ت . تھ . ٹ . ٹھ)

English	Urdu
Lock	تالا - قفل
Copper	تانبا
Wire	تار
History / Date	تاریخ
Then	تب
Destruction	تباہی
Sail / Swim	تیرنا - پیرنا
Walk	ٹہلنا
Ready	تیار
Experience	تجربہ
Even / To / Till	تک (بھی)
Trouble	تکلیف - دکھ
Stem	تنا
Tight	تنگ
Scale	ترازو
Side / Direction / Across	طرف
Like	طرح
Way	طریقہ - راستہ
Wet	تر - گیلا
Oil	تیل
Sharp / Fast	تیز
Tired	تھکا - ماندا
Cold	ٹھنڈا
Regular	ٹھیک
Adjust	ٹھیک کرنا
Bag	تھیلا (بیگ)
Kick	(ٹھوکر) کک
Solid	ٹھوس
Chin	ٹھڈی
Ticket / Postage	ٹکٹ
Weight	تول - وزن
Hat-Topee	ٹوپی
Basket	ٹوکری
Train	ٹرین
Part / Bit	ٹکڑا
You	تم - آپ - جناب -

U (اُ)

English	Urdu
Jump	اچھلنا - کودنا
Lift	اٹھانا

North	اُتر۔ شمال
Sad	اُداس
White	اُجلا ۔ سفید

V. W. (و)

He That They	وہ
Same	وہی (وہ ہی)
Doer	والا۔ (کرنے والا)
Event	واقعہ ۔ بات
Promise	وعدہ (بچن)
Time	وقت

Y. (ے)

This These It	یہ ۔ اس
This very	یہی
Or	یا
Memory	یاد
Here	یہاں
Friend	یار ۔ دوست

Z. (ذ ۔ ز ۔ ض ۔ ظ)

Ornament	زیور گہنا
Responsible	ذمہ‌دار
Living	زندہ
Force	زور
Feeble	(کم) زور
Tyranny	ظلم
Certainly	ضرور
Impotant Necessary	ضروری
Need	ضرورت
Tyrant Cruel	ظالم
Tongue Language	زبان
Poison	زہر ۔ کڑوا
Wound	زخم
Land Earth Floor Ground	زمین
Chain Connection	زنجیر ۔ کڑی
Some Little a little	ذرا۔ تھوڑا ۔ کچھ

فہرست الفاظ پر ایک نظر

جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ھے اس فہرست میں یہ خیال رکھا گیا ھے کہ افعال بہت کم ھوجائیں اور اسما کی تعداد حتی‌الامکان زیادہ ھو اس لیے کہ اسما سے کئی قسم کے مشتقات بنانے میں انگریزی زبان میں آسانی ھوتی ھے اور چند افعال و حروف کو ملانے سے اسما کی زیادتی سے کارآمد اور بامحاورہ زبان بن‌جاتی ھے۔ ھندستانی میں قدرتی طور پر یہ آسانی موجود ھے۔ یعنی اس کے جتنے مصدر ھیں وہ سب اسم ھیں اور اسم کا کام دیتے ھیں۔

اس فہرست میں چھے سو اسم ھیں جن میں سے دو سو ایسے ھیں جن کی تصویر کھینچی جاسکتی ھے۔ مثلاً چاقو، گھنٹہ، جال، آلو، گاڑی، انگلی وغیرہ۔ چار سو ایسے اسم ھیں جو عام ھیں اور ان کی تصویر کھینچنا یا تو بہت ھی مشکل ھے یا ناممکن ھے مثلاً ھوا، کھانا، دوست، محبت، نفرت، وقت، فولاد، صابون، صفحہ، کاغذ، کپڑا، نقصان وغیرہ اس لیے کہ یہ لفظ کسی ایک خاص چیز کو نہیں بتاتے بلکہ ایک جماعت کے مختلف افراد یا اجزا کے لیے عام خیال پر حاوی ھیں۔

صفتوں کی تعداد ڈیڑھ سو ھے جن میں سے سو تو عام صفات ھیں؛ جیسے، زرخیز۔ تندرست۔ نیا۔ سرخ۔ ذمہ‌دار۔ اونچا۔ چکنا۔ گرم وغیرہ۔ اور پچاس ایسی ھیں جو پچاس عام صفات کے اضداد کو ظاھر کرتی ھیں مثلاً بیمار۔ پرانا۔ سبز۔ نیچا۔ کھردرا۔ ٹھنڈا وغیرہ جن کے مقابلے میں تندرست، نیا، سرخ، اونچا، چکنا گرم وغیرہ الفاظ عام صفات کی فہرست میں موجود ھیں۔

باقی سو کلمات افعال و حروف کو بتاتے ھیں۔ ان حروف میں ضمیریں۔ اشارے موصولات اور ملانے والے حرف سب داخل ھیں۔

ان لفظوں کے علاوہ اس فہرست میں ناپ تول کے لفظ، گنتی، دنوں اور مہینوں کے ناموں اور سکّوں کے ھندستانی ناموں کو شامل کرلینا چاھیے۔ ھم یہ جانتے ھیں کہ ھندستان کے ھر ایک صوبے میں ان چیزوں کے لیے تقریباً الگ الگ الفاظ ھیں۔ لھذا ھندستانی فہرست درج ذیل ھے:—

ناپ	انگل ، بالشت ، ھاتھ، گرہ ، گز، انچ ، فٹ ، فرلانگ، میل ، کوس وغیرہ کے رقبے کی ناپ کے مربع پیمانے بھی رائج ھیں جو حساب کی کتابوں میں تفصیل سے درج ھیں -
تول	تولنے کے لیے گاؤں میں الگ الگ من اور سیر ھیں اس لیے انگریزی تولہ جو بارہ ماشہ کا ھوتا ھے عام ھوگیا ھے - اسی سے اسی تولے کا سیر اور پانچ سیر کی پنسیری اور آٹھ پنسیری کا من بنا لیا جاتا ھے -
گنتی	جہاں تک گنتی کا تعلق ھے وہ خالص ھندستانی ایسی ھے کہ عام طور پر ھندستان بھر میں سمجھی جاتی ھے گو ھر جگہ بعض بعض عددوں کے تلفظ میں فرق ھوجاتا ھے - ان کی فہرست یہ ھے :- ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ، سترہ، اٹھارہ، انیس، بیس، اکیس، بائیس، تیئیس، چوبیس، پچیس وغیرہ تا سو - ھزار، لاکھ، کرور، ارب، نیل، پدم، سنکھ، مہا سنکھ -
دن	سنیچر، اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ -
مہینے	سب عربی، ھندی، انگریزی، زنانے، فارسی نام رائج ھیں - ان میں سے (چیت، بیساکھ، جیٹھ) (اساڑھ، ساون، بھادوں) (کنوار، کاتک، اگھن) (پوس، ماگھ، پھاگن) ھندستانی مہینوں کے نام کہے جاسکتے ھیں - ان ھی کی مختلف شکلیں دوسرے غیر ھندستانی مقاموں میں رائج ھیں -
سکّے	سکّے وھی رائج ھوتے ھیں جو حکومت چلائے - آج کل ھندستان میں تین قسم کے سکّے موجود ھیں؛ ایک انگریزی حکومت کے سکّے دوسرے مختلف ریاستوں کے سکّے اور تیسرے وہ سکّے جن کی قیمت اس کے ھموزن چاندی یا سونے کے برابر ھے اس لیے کہ وہ سکّے کہیں رائج نہیں، صرف پرانی سلطنتوں کی یادگار ھیں؛ مثلاً اشرفی اور ڈبل وغیرہ - انگریزی سکّے پائی ، پیسے ، آنے ، اکنّی ، دونّی ، چونّی، اٹھنّی ، روپیے پر مشتمل ھیں - گنی اور ساورن کا عام چلن نہیں - کاغذی نوٹ

مختلف قیمتوں کے چلتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہیں جیسے پُرانے زمانہ میں ہنڈیاں ہوتی تھیں -

حروف تہجّی

ہم نے اوپر کی فہرست میں ہندستانی ابجد کی ترتیب انگریزی الفابٹ کی ترتیب پر رکھی ہے - اس لیے کہ اگر ہم ہندستانی زبان کو ہندستان کے ہر صوبہ میں رائج کرنا چاہیں تو بغیر رومن رسم خط کے چارہ نہیں - بدقسمتی سے ہندستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ قسم کے رسم خط جاری ہیں - ان میں سے جو ہندی زبانوں یعنی گجراتی، مرہٹی، پوربی، بنگالی، اڑیہ وغیرہ کے موجودہ رسم خط ہیں وہ دیوناگری سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان میں خ، ذ، ز، ظ، ض، ژ، ش، غ، ف، ق موجود نہیں حالانکہ ان حرفوں سے سینکڑوں ہندستانی لفظ بن گئے ہیں اور روزمرہ کی بولی میں رائج ہیں - انگریزی میں (خ) (غ) اور (قاف) نہیں ہے لیکن دوسری یوروپین زبانوں میں (خ) اور (غ) موجود ہیں لہذا ان کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوسکتی - خود اردو رسم خط ہندستان کا سب سے زیادہ مکمل رسم خط ہے لیکن عصبیت اور قدامت پرستی کی وجہ سے اس رسم خط کا ہندستان میں عام طور پر قبول کیا جانا بہت ہی مشکل ہے اگرچہ نہ صرف یہ عربی، فارسی اور یوروپین حروف کو پورے طور پر ادا کرتا ہے بلکہ خالص ہندی اور سنسکرت حروف کو جو (ھ) کے ساتھ مخلوط ہوکر بنتے ہیں اور جو (ڈ) (ڑ) اور (ٹ) کی آوازوں کو ظاہر کرنے میں بھی پورے طور پر بتاتا ہے - اور جہاں تک (واؤ) کی اور (ے) کی چار چار قسم کی آوازوں کا تعلق ہے انھیں تو سوائے اردو کے دنیا کا کوئی رسم خط اتنے آسان طریقہ سے ظاہر ہی نہیں کرسکتا - ان آوازوں کی تفصیل اور ان کے لکھنے اور بولنے کے طریقوں کو کاتب الحروف نے "تین ہفتے میں اردو ابجد سکھانے والے نئے قاعدے" میں مکمل طور پر بیان کردیا ہے -

بہر حال اس فہرست میں جو لفظ ح، خ، ذ، ز، ظ، ض، ش، ص، ط، ع، غ، ف، ق سے شروع ہوتے ہیں وہ عربی، فارسی، ترکی، چینی اور فرنگی زبانوں سے آکر

ہندستانی بن گئے ہیں اور جن زبانوں سے یہ لیے گئے تھے ان میں یا تو ان کے معنی وہ نہیں ہیں جو ہم سمجھتے ہیں یا اکثر لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ قطعی بدل کر ہندستانی ہوگیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں دو چیزیں نوٹ کرلینا چاہیے: اول یہ کہ یہ ترجمہ زیادہ تر اسما (Nouns) کا ترجمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ ترجمہ میں بعض اسما کے ترجموں میں مصدری معنی دیے گئے ہیں؛ جیسے (Meal) کے معنی «کھانا» درج کیے گئے۔ اس کا ترجمہ خوراک یا غذا بھی ہے۔ لیکن علامت مصدری (نا) بڑھادینے سے اس لفظ میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور اسم اور فعل دونوں پر حاوی ہوسکتا ہے۔ بہر حال جو حضرات تنقید فرمائیں وہ ان چیزوں کو سامنے رکھیں اور جو مناسب مشورہ ہے اس سے استفادہ کا موقع دیں۔

حاصل مصدر

ہندستانی میں مصدر (Infinitive) اس اسم کو کہتے ہیں جو کسی کلمہ سے نہ نکلا ہو لیکن خود اس سے دوسرے اسم اور فعل بنائے جاسکتے ہوں۔ پھر اس کی دو قسمیں کی گئی ہیں: مفرد اور مرکّب یا وضعی اور غیر وضعی۔ اس کے آخر میں (نا) ہوتا ہے اور جب اس (نا) کو نکال دیا جاتا ہے تو امر کا صیغہ باقی رہ جاتا ہے۔ اسے مادّہ (Root) بھی کہتے ہیں۔ مصدر میں کسی فعل کا کرنا، ہونا یا سہنا سمجھا جاتا ہے۔ جو اسم مصدر کی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے مصدر ہی سے بنائے جاتے ہیں انھیں حاصل مصدر کہتے ہیں۔ ان سے مصدر کے معنی کی حالت و کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندستانی میں اکثر مصدر ہی کو حاصل مصدر کے طور پر استعمال کرلیتے ہیں لیکن بہت سے ایسے حاصل مصدر ہیں کہ صرف علامت مصدری (نا) کے دور کرنے سے بن جاتے ہیں؛ مثلاً کھیل، کود، دوڑ، روک، سوجھ، بوجھ وغیرہ اور بعض میں تو صرف (الف) کے کم کردینے سے بن جاتے ہیں؛ جیسے، مرن، چلن، اٹھان وغیرہ اور اکثر مادۂ مصدر پر (ا، ان، اپ، اٹی، آس، یا، ت، تی، نت، ول، وا، واس، ہٹ، لائی، ی) بڑھانے سے حاصل مصدر بن جاتا ہے۔ مثلاً پھیرا، اڑان، ملاپ، سمائی، پیاس، جلاپا، کھپت، بھرتی، لڑنت، پھٹول، بھلاوا،

بکواس ، بناوٹ ، گھبراهٹ ، رلائی ، هنسی هیں اسی طرح دو مصدری مادّوں کو بھی ملاکر
حاصل مصدر بنالیتے هیں؛ جیسے ، سمجھ بوجھ' مارپیٹ' دیکھ بھال وغیرہ۔

اس سلسله میں یه چیز قابل لحاظ هے کہ حاصل‌مصدر صرف مصدر هی سے نہیں
بنتا بلکه اسم صفت اور معمولی اسمائے نکره پر چند لاحقے بڑھانے سے بن جاتا هے ؛
مثلاً صفت پر (س ، ک ، ن ، هٹ ، ئی) بڑھانے سے مٹھاس ، ٹھنڈک ، چوڑان ، چکناهٹ ،
لمبائی ، هریالی وغیرہ اور اسم پر (پا ، پنا ، پن ، ی) بڑھانے سے بڑھاپا ، گنوارپنا ،
لڑکپن ، دوستی وغیرہ بن جاتے هیں -

ان حاصل‌مصدوں کے علاوہ فارسی اور عربی کے حاصل‌مصدر بھی هندستانی زبان
میں رائج هیں؛ مثلاً طلب ، خواهش ، احترام ، پاکیزگی وغیرہ۔ اس طرح نه صرف
هندستانی میں حاصل مصدروں کی بہت بڑی تعداد هوجاتی هے بلکه یه دشواری بھی
پیدا هوتی هے کہ تقریباً سب حاصل مصدر سماعی هیں - یعنی ان کے بنانے کا کوئی
مقررہ قاعدہ نہیں جس کی بنا پر قیاس کیا جاسکے اور حاصل مصدر بن جائے۔

لیکن جس طرح انگریزی میں مصدر (Infinitive) حاصل‌مصدر کے معنوں
میں استعمال هوتا هے اسی طرح هندستانی زبان کے بہت زیادہ مصدر بغیر کسی
تبدیلی کے حاصل مصدر بن جاتے هیں مگر بخلاف هندستانی کے انگریزی حاصل مصدر
(Noun of Action یا Verbal Noun) هر مصدر میں صرف ing بڑھانے سے
بن جاتے هیں اور اسی طرح یه آسانی هوتی هے کہ نو آموزوں کو گرامر کی دقت
نہیں هوتی -

همارا مقصد یه نہیں هے کہ هم بنیادی هندستانی کے لیے گرامر کے نئے اصول
وضع کریں ، البته هم یه کرسکتے هیں کہ جہاں‌تک ممکن هو ایسے مصدروں کا استعمال
کریں جو حاصل‌مصدر کا بھی کام دے‌سکیں؛ مثلاً هم یه کہه سکتے هیں کہ "رونا دھونا
اچھا نہیں اس سے کوئی فایدہ نہیں" لیکن "رونا دھونا" کی بجائے اگر هم کہیں
"رلائی دھلائی بےسود هے" تو وهی مفہوم ادا هوجاتا هے اور حاصل‌مصدر کی
وہ صورت پیدا هوجائےگی جو عام طور پر سماعی قاعدوں کے مطابق هندستانی میں رائج

ہے - بس اتنی دقت ہوگی کہ بنیادی ہندستانی سیکھنے والوں کو کوئی عام قیاسی قاعدہ نہ بتاسکیں گے اور انھیں زبان سیکھنے میں لفظوں کی کثرت کی وجہ سے دقت ہوگی - غرضیکہ ہمیں بنیادی لفظوں کے انتخاب میں اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے لفظوں کو چُنیں جو گرامر کے قیاسی قواعد کی پابندی کرسکیں تاکہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کو سیکھنے میں آسانی ہو -

موجودہ فہرست مکمل نہیں ہے

اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جہاں تک ہندستانی زبان کی خصوصیتوں کا تعلق ہے یہ فہرست پوری نہیں - ہمارے روزمرہ کے استعمال میں بہت سے ایسے لفظ داخل ہوگئے ہیں جن کے بغیر با محاورہ بول چال ناممکن سی ہوگئی ہے - فہرست الفاظ کے ناقص ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہندستانی گرامر اور اسلوب بیان میں اچھا خاصہ فرق ہے - مثلاً انگریزی افعال کے ساتھ حروف جر کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور اسما و صفات بھی مختلف حروف کے ساتھ مرکبات بنائے بغیر مفہوم کی وضاحت نہیں ہوتی -

ہندستانی میں بھی مرکب افعال استعمال ہوتے ہیں اور اس طرح ان کے معنوں میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے - شروع کرنے کے لیے (لگنا) (چاہنا) (والا) - ختم کے لیے (چُکنا) - اجازت کے لیے (دینا) - امکان کے لیے (سکنا) - مجبوری کے لیے (پڑنا) - مفاجات کے لیے (اٹھنا - بیٹھنا - پڑنا - دینا - ڈالنا - جانا) - تسلسل یا استمرار کے لیے (کرنا - کیا کرنا - رہنا - جانا) کے مختلف صیغے بڑھا دیے جاتے ہیں -

حروف جار (یعنی میں - سے - تک - کو - پر - لیے - واسطے وغیرہ) بھی اسموں اور ضمیروں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور مختلف معنی پیدا کرکے ان اسموں اور ضمیروں کا تعلق فعلوں یا صفتوں وغیرہ سے ظاہر کرتے ہیں - اسی طرح ان سے اور دوسرے حروف سے متعدد محاورے بنتے ہیں جو انگریزی گرامر کے اصولوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں -

ان باتوں کا لحاظ کرکے سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ جو حضرات بنیادی ہندستانی کے لفظوں کی فہرست میں تبدیلی کرنا چاہیں وہ پہلے یہ کریں کہ روزمرہ کی زبان کے لفظوں کی فہرست مرتب کرنے کے بعد یہ دیکھیں کہ وہ کون سے لفظ ہیں جو بار بار استعمال ہوتے ہیں اور موجودہ فہرست میں ان کے اضافہ کے بغیر چارہ نہیں ہے -

انٹر نیشنل لفظ International Words

بیسک انگریزی لکھنے والوں نے تقریباً پچاس لفظ انٹرنیشنل قرار دیے ہیں - ان کے علاوہ بارہ علوم کے ناموں کو بھی انٹرنیشنل مانا ہے - چونکہ ہندستان نیشن (Nation) نہیں ہے اور عام طور سے مشرقی اقوام کو یوروپین مصنفین اپنے سامنے نہیں رکھتے، ان کی دنیا یورپ اور امریکہ تک محدود ہے لہذا اس فہرست میں بعض لفظ ایسے ہیں جو ہندستان کے نقطۂ نظر سے انٹرنیشنل نہیں ہیں - یہاں ان لفظوں کا یا تو بہت کم استعمال ہے یا ان کی جگہ دوسرے لفظ رائج ہیں - مثلاً Automobile کی جگہ موٹر، Sport کے لیے کھیل، Sir کے واسطے جناب کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور Bar , Beef , Colony , Opera , Parrafin , Terrace صرف چند پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہیں - ٭

علوم کے بارہ نام دیے گئے ہیں - معلوم نہیں ہندستان والے ان ناموں کو انٹرنیشنل سمجھتے ہیں یا نہیں - مجھے تو ان کے مان لینے پر کوئی اعتراض نہیں - نام یہ ہیں :—

الجبرا - ارتھمیٹک - بیالوجی - کیمسٹری - جغرافی - جیومٹری - میتھےمیٹکس - فزکس - فزیالوجی - سائیکالوجی - زوآلوجی - اس پر میں ایک اور نام بڑھاتا ہوں ستارانومی -

ہندستان میں بعض اور لفظ عام طور پر سمجھے جاتے ہیں اور یہ انٹرنیشنل بنائے جاسکتے ہیں ؛ مثلاً گلاس - بوتل - بٹن - فونٹین پن - کالج - اسکول - میوزیم - پریزیڈنٹ - پٹرول - شوفر - ملیریا - کونین - توس - بٹر - وایولن - افیون (opium) - پلیٹی نم - آملیٹ - پاجامہ - قمیص - ماچس وغیرہ -

بنیادی ہندستانی کو کیسے ترقی دی جاے؟

ہندستان میں مشترکہ قومیت کا احساس شروع ہوگیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے قوانین کے ذریعے سے انگریزی کی جگہ ہندستانی زبان کو رائج کردیں گے۔ لیکن جب تک وہ زمانہ آئے ہمیں انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس دوران میں بنیادی لغت، بنیادی گرامر اور بنیادی زبان بنا لینا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ اس زبان میں عام دلچسپی کی کتابیں ترجمہ ہونے لگیں تاکہ وہ لوگ جن کی زبان ہندستانی نہیں ہے اسے سیکھنے کے بعد بھول نہ سکیں۔

خود ہندستانی بولنے والوں کے مدرسوں میں، عدالتوں میں اور قانونی مجلسوں میں بنیادی ہندستانی کو اس لیے رواج دینے کی ضرورت ہے کہ معیاری یا بلند ہندستانی کا تعلق عوام سے بہت کم ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ گاؤں والے بھی عام طور پر ہندستانی زبان بولنے لگیں تو شہری ہندستانی سے قریب لانے کا صرف یہ ذریعہ ہے کہ ہم خود بنیادی ہندستانی کو اپنے روزمرہ کے کاروبار میں استعمال کرنے لگیں اور دیہات کے پوربی، اودھی اور کھڑی بولی بولنے والوں کو ہندستانی زبان اختیار کرنے میں مدد دیں۔

کلکتہ اور بمبئی کے سنیما والوں کو بنیادی ہندستانی میں فلمیں تیار کرنے کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اس میں ان کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ عام ہندستانیوں کی زبان میں فلمیں تیار کریں گے تو انھیں دیکھنے والوں کی زیادہ تعداد ملے گی۔ پھر یہ بھی ہوگا کہ ایسی فلمیں تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرسکیں گی اور وہ لوگ بھی ان سے لطف اور فائدہ اٹھا سکیں گے جن کی مادری زبان ہندستانی نہیں ہے بلکہ انھوں نے بنیادی ہندستانی کے دو چار سو لفظ سیکھ لیے ہیں۔ "دو چار سو لفظ" اس لیے کہے گئے کہ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں بنیادی ہندستانی کے ہزار لفظوں میں سے چھے سات سو لفظوں کو سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ گویا ہندستان والوں کی بہت بڑی تعداد کو بنیادی ہندستانی کے ذریعے سے

مخاطب کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر ہندستان کا ہر ایک ریڈیو اسٹیشن اپنے روزانہ پروگرام میں دس منٹ بنیادی ہندستانی کے لیے وقف کردے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک والے اسے پسند نہ کریں اور ہندستان کی مشترک زبان کی ترقی نہ ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس طرح رفتہ رفتہ ریڈیو کی افادیت بہت بڑھ جائے گی اور بیرون ہند کے لوگ بھی بنیادی ہندستانی کی خبروں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ جاپان اور بعض دوسرے ملکوں نے محض اپنی تجارتی اور سیاسی غرضوں کی بنا پر ہندستانی زبان کو اپنی یونیورسٹیوں میں جگہ دے دی ہے اور ان کی فطری خواہش ہے کہ ہندستانی زبان کو خود ہندستانیوں کے منہ سے سنیں اور صحیح تلفظ ادا کرسکیں۔ اس کے علاوہ جو ہندستانی غیر ممالک میں ہیں وہ ریڈیو پر جب اپنی پیاری زبان سنتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی غریب‌الوطنی بھول جاتے ہیں اور محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے وطن ہی میں ہیں۔ غرضکہ ہر نقطۂ نظر سے ریڈیو کے ہرایک اسٹیشن سے بنیادی ہندستانی میں براڈکاسٹ ہونا مفید اور ضروری ہے۔

رومن رسم‌الخط

لیکن ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے لیے خواہ وہ "بنیادی" ہو یا "معمولی" صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی ہم اس کے لیے رومن‌رسم‌الخط (Roman Script) اختیار کرلیں اور اگر ہماری موجودہ قدامت‌پرستی اس شاہراہِ عمل سے روکتی ہو تو کم از کم یہ کوشش کی جائے کہ اردو اور ناگری کے ساتھ ساتھ رومن خط میں بھی ہر سرکاری اور غیر سرکاری چیز شایع ہو اور محکمۂ تعلیمات میں ہر طالب علم کو پورا اختیار ہو کہ وہ چاہے تو صرف رومن رسم‌خط کے ذریعے سے اپنی مادری زبان سیکھ سکے۔ اس طرح ہندستان میں لکھائیوں کا جو اختلاف ہے وہ بھی مٹ جائے گا اور "ہندستانی" زبان کو یہ فائدہ پہنچے‌گا کہ نہ صرف بنگالی، گجراتی، مدراسی، آسامی اور برمی ہماری زبان کو پڑھنے لگیں گے بلکہ لاکھوں یورپین، جاپانی اور چینی اور تقریباً سب ہندستانی عیسائی، فوجی، ریلوے ملازمین و مزدور ہماری زبان سیکھ جائیں گے اس لیے

کہ ان لڑکوں کو اتنی زبان کی دقت نہیں جتنی رسم‌الخط کی ھے اور سب ھندستانیوں کے لیے یہ چیز سو سال تک ممکن نہیں کہ ھمارے رھنماؤں کی امیدوں اور دعاؤں کو پورا کرسکیں یعنی ھندی اور اردو دونوں رسم‌الخط سیکھ لیں حتّٰی کہ بلند پایہ اردو اور ھندی کے بھی ماھر بن جائیں ۔ اس قسم کی تصور پرستی (Idealism) عموماً اس ارتجاعی ذھنیت کا نتیجہ ھوتی ھے جو ھر نئی چیز سے بھڑکنے کا نام مذھب سمجھتی ھے اور نقصان‌دہ تاریکی میں رھنما اساس وطنیت قرار دیتی ھے ۔

———

سنسکرت زبان

اور

اس کی شاعری کی ایک ھلکی جھلک

از

(پنڈت ونشی دھر ودیالنکار، لیکچرار جامعہ عثمانیہ)

انسانی زندگی کا سوال جتنا پیچیدہ ھے زبانوں کا سوال اس سے کم پیچیدہ نہیں ھے - جس طرح زندگی کے مسائل کو ایک عالم یا حکیم ایک طرح سے حل کرتا ھے اور دوسرا دوسری طرح اور اس طرح ایک کے بعد دوسرا نظریہ پیدا ھوتا رھتا ھے اور ان نظریوں کے ماتحت خیالات کے بہت سے ادارے بنتے چلے جاتے ھیں اور جس طرح باوجود ان تمام نظریوں کے زندگی کا مسئلہ ایک پہیلی ھی بنا رھتا ھے اور انسانی ذھنیت کو چنوتی دیتا رھتا ھے اسی طرح کسی زبان کا مسئلہ بھی مختلف طریقوں سے حل کیا جاتا ھے اور اس میں بھی ایک کے بعد دوسرا نظریہ آتا اور خیالات کے ادارے بنتے جاتے ھیں اور پھر بھی زبان کا مسئلہ ایک ایسی پہیلی بنا رھتا ھے جو انسانی دماغ کو ھمیشہ چکر میں ڈالے رکھتی ھے -

یہ بات خاص کر ان زبانوں کے لیے ٹھیک اترتی ھے جو پرانی ھیں اور جو عام طور پر بول چال اور استعمال کی دنیا سے ھٹ کر صرف ریسرچ (Research) کی دنیا کی ملکیت بن گئی ھیں -

بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے مشرقی زبانوں میں ریسرچ کی بنیاد مغرب کے عالموں کے ھاتھوں پڑی - اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ انھیں کی بےمثل تحقیق

اور جان‌توڑ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ علم کی دنیا میں ان زبانوں کی پوچھ پھر سے ہونے لگی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ ان لوگوں کی بدولت ان زبانوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں - جوں جوں ہمارے مشرقی عالم اس میں اپنا ہاتھ بٹارہے ہیں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی چلی جارہی ہیں - افسوس کی بات یہ ہے کہ مشرقی محقق بھی انھیں کی بنیاد پر بہت کچھ لکھتے ہیں کیوں‌کہ اس کے بغیر ان کی تحقیق عام طور پر مقبول نہیں ہوتی -

بہت سے لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب سنسکرت زبان کی بھنک یورپ میں پہنچی اس وقت کئی محققوں نے اس قسم کی کتابیں لکھیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ سنسکرت زبان کوئی زبان نہیں ہے - ہندستان کے چالاک برھمنوں نے سکندر اعظم کے ہندستان پر حملے کے بعد یونانی زبان کے نمونے پر نہ صرف سنسکرت ادب کو بلکہ سنسکرت زبان کو بھی بڑی ہوشیاری سے گھڑلیا -

They endeavoured to prove that not only Sanskrit literature, but also the Sanskrit language was a forgery made by the crafty Brahmans on the model of Greek after Alexandar's conquest.

اس کے بعد بھی جب سنسکرت کی بہت سی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہوکر یورپ میں پہنچ چکی تھیں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لارڈ بنٹنگ کے زمانے میں جب نئی تعلیم کی اسکیم بنائی جارہی تھی تو لارڈ میکالے نے سنسکرت زبان کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسی الماری سے جس میں سنسکرت کے ادب کی کتابیں بھری ہوں وہ الماری اچھی ہے جو بالکل خالی ہو -

اس کے بعد بہت سا زمانہ بیت گیا - آہستہ آہستہ سنسکرت زبان کا مطالعہ بھی بڑھتا گیا - سنسکرت زبان کی مقبولیت کے بڑھانے میں جرمن عالموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے - اس زمانے کے سنسکرت کے مشہور عالم Arthur A. Macdonell نے جو کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر تھے سنسکرت زبان کے بارے میں حسب ذیل لکھا ہے :-

"Since the Renaissance there has been no event of such world-wide significance in the history of culture as the discovery of Sanskrit literature in the latter part of the eighteenth century..........."

یعنی احیائے علوم کے بعد دنیا کی تہذیب کی تاریخ میں کوئی بھی واقعہ ایسی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ سنسکرت زبان کی دریافت ہے جو کہ اٹھارویں صدی کے پچھلے حصے میں ہوئی ہے۔

سنسکرت زبان کی دریافت کے بعد زبانوں کی بنیاد بہت کچھ سائنٹفک ہوگئی۔ اس سے جہاں ایک طرف Comparative Philology تقابلی لسانیات کا علم نکلا وہاں دوسری طرف ویدوں اور پرانوں کے مطالعہ کے بعد Comparative Mythology یعنی تقابلی دیومالا کی بنیاد پڑی۔ اسی طرح مرضیات میں Comparative Pathology یعنی تقابلی مرضیات کی بنیاد پڑی۔ اب جو نئی لغات تیار ہورہی ہیں ان کی بنیاد بھی بدل گئی ہے اور وہ تاریخی بنیاد پر تیار کی جارہی ہیں۔ اسی طرح اور بھی مختلف علموں کے مطالعہ پر سنسکرت زبان کا اثر پڑ رہا ہے۔

سنسکرت زبان کس طرح پیدا ہوئی اس کے بارے میں بالکل صحیح طور پر کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ لیکن اس میں بہت کچھ اٹکل پچو سے کام لیا گیا ہے اور لیا جاتا ہے اور اسی لیے بہت سے ایسے نظریے پیدا ہوگئے ہیں جن میں یکسانیت نہیں ہے۔ میں اس مضمون میں بالکل مختصر طور پر یہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ سنسکرت زبان جس میں ادبی تصانیف لکھی گئی ہیں کس طرح پیدا ہوئی اور اس کا ادب کس انداز پر ترقی پذیر ہوا، اس کی کیا خصوصیات تھیں، کن کن بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کو ایسے سانچے میں ڈھالا جس سے سنسکرت زبان دیوتاؤں کی زبان کہلائی اور ہمیشہ کے لیے امر ہوگئی۔ میں صرف سنسکرت کی اس زبان اور ادب کے بارے میں کچھ لکھوں گا جو ٹکسالی یا مستند سمجھی جاتی ہے۔ میں ویدوں

کی سنسکرت اور اس سے متعلق ادب کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا چوں کہ وہ ایک بالکل الگ مضمون ہے۔

یوریین سنسکرت عالموں کے حساب سے ہندستان کی یا اس کے ادب کی تاریخ اگر سلسلہ وار کہیں سے شروع ہوتی ہے تو وہ سکندر کے ہندستان میں آنے کے بعد سے ہے۔ اسی کی بنیاد پر سنسکرت زبان اور اس کے ادب کی بنیاد بھی اس کے لگ بھگ یا اس سے کچھ پرے ہٹ کر رکھی جاتی ہے۔ سکندر کا ہندستان پر حملہ سنہ ۳۲۶ ق۔م میں بتایا جاتا ہے۔ اگر مہاتما بدھ کی موت کی تاریخوں کا سنہ ۴۸۰ ق۔م میں پتہ نہ لگتا تو ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ ماہر شرقیات سنسکرت زبان کو سنہ ۵۰۰ ق۔م تک بھی شاید نہ لے جاتے۔ ان لوگوں کے خیال میں سنسکرت زبان کی بنیاد اسی کے آس پاس پڑی ہے۔ بہت سے دوسرے ماہر شرقیات اس کو سنہ ۵۰۰۰ ق۔م اور کئی اس سے بھی بہت قبل لے گئے ہیں۔ وقت کے بارے اتنی کھینچ تان ہورہی ہے اور اس کے لیے اتنی توڑ مروڑ کی جاتی ہے کہ اس معاملے میں قطعی طور پر کچھ کہنا ناممکن ہے۔ تاریخوں کا معاملہ اور اس کی بحث ایک ایسا گورکھ دھندھا بن گیا ہے جس میں ریسرچ کے بڑے بڑے عالم نئے نئے نظریے نکالتے رہتے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اب جو کھوجیں ہورہی ہیں ان سے یہ تاریخیں لگاتار پیچھے ہٹتی چلی جارہی ہیں۔

بہت سے محققوں کا خیال ہے کہ سنسکرت کی مستند زبان آہستہ آہستہ پراکرت زبانوں سے ترقی پذیر ہوئی یعنی سنسکرت پراکرتوں کی ہی ایک سنواری ہوئی اور منجھی ہوئی شکل ہے۔ پراکرت لفظ کے معنی ہیں قدرتی اور سنسکرت کے معنی ہیں بنائی ہوئی سنواری ہوئی۔ پراکرت کے معنی ہیں عوام اور پراکرت زبان کے معنی عوام کی زبان ہے اور سنسکرت لفظ کے معنی ہیں سنواری ہوئی یا شستہ زبان۔ ان ناموں کے معنے کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سنسکرت پراکرتوں ہی کی ایک سنواری ہوئی شکل ہے، کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ ایسا خیال رکھنے والوں کی رائے میں سنسکرت کا ادب پہلے پہل پراکرت زبان میں ہی

شروع ہوا - یہ پراکرت وہ پراکرت نہیں تھی جس نے علم قواعد کے ذریعہ پیچھے سے مستند شکل اختیار کی، بلکہ وہ پراکرت زبان تھی جو قدیم ترین تھی - ان لوگوں کی رائے میں مہاتما بدھ کے زمانے کے قریب قریب ھی سنسکرت زبان میں ادب کی تحقیق کی جانے لگی - مہاتما بدھ نے پراکرتوں کو فروغ دیا - اس لیے یہ سمجھا جاتا ھے کہ غیرمذھبی یا دنیاوی ادب پہلے پراکرت میں ھی بنا - وہ عالم یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ھیں کہ راماین اور مہابھارت بھی پہلے پراکرت ھی میں لکھی گئیں لیکن یہ باتیں جس آسانی سے کہہ دی جاتی اتنی آسانی سے ثابت نہیں کی جاسکتیں - ھماری معلومات اتنی کم ھیں کہ ان کی بنیاد پر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ سنسکرت پراکرتوں کی ھی ایک منجھی ھوئی شکل ھے -

اس طرح کے خیالات صرف Sylvan Lavy وغیرہ کچھ یورپ کے ماھروں کے ھی نہیں پرانے جینی عالموں کے بھی یہی خیالات ھیں - رودرٹ نے اپنے کاویا لنکار میں لکھا ھے :-

"प्राकृत संस्कृत मागध पिशाचभाषाश्च शौरसेनीच ।
षष्ठोऽत्र भूरिभेदो देश विशेषादपभ्रंश : ॥ "

اس شلوک میں اس نے سنسکرت سے پہلے پراکرت کا نام دیا ھے - اس کی بنیاد پر گیارھویں صدی کے ایک جین عالم نمی سادھو نے لکھا ھے :-

"प्राकृतं बालमहिलादि सुबोधं सकलभाषा निबन्ध-
भूतं वचनमुच्यते । तदेव च देशविशेषात् संस्का-
रणाच्च संस्कृता द्युत्तरविभेदानाप्नेति"

یعنی پراکرت وہ زبان ھے جو بالکل آسان ھے اور یہی علم قواعد کے مطابق بن کر سنسکرت بن جاتی ھے -

اس کے بعد وہ محقق آتے ھیں جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ھیں کہ سنسکرت زبان آریوں کی زبان یعنی ویدوں کی سنسکرت اور یہاں کے پراکرتوں کے میل سے بنی ھے - جس طرح اردو زبان فارسی، عربی اور ھندی کے میل سے پیدا ھوئی اسی طرح آریہ لوگ جب ھندستان میں آئے تو وہ زبان جو اپنے ساتھ لائے تھے

اور وہ زبانیں جو یہاں بولی جاتی تھیں ان کے میل سے سنسکرت پیدا ہوئی - اسی بات کو پرانے مصنفوں نے اس طرح ثابت کیا ہے - پرانے آریوں کی وہ زبان جو اپنے ساتھ لائے تھے یہاں کی زبان کے ساتھ ملی اور اس طرح پہلے پہل جو بھاشا پیدا ہوئی وہ پراکرت تھی اور یہ وہ پراکرت تھی جس میں کوئی قواعد نہیں تھے - یہی زبان جب قواعد کے تحت آئی اور اس نے جو شکل اختیار کی وہ سنسکرت ہے اور اسی کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ پراکرت سے سنسکرت پیدا ہوئی - راج شیکھر کے اس شلوک کا بھی اس میں حوالہ دیا جاتا ہے - ''यद् योनि: किल संस्कृतस्य......'' یعنی سنسکرت پراکرت سے پیدا ہوئی - بہت سے علم قواعد کے لکھنے والے یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ پراکرت زبان کے قاعدے قریب قریب وہی ہیں جو ویدک زبان کے تھے -

اس کے خلاف پراکرت زبان کے مشہور وہ نحوی ہیں جو پراکرت لفظ کے معنی یوں بیان کرتے ہیں :-

''प्रकृति: संस्कृतं तत्रभवं तत आगतम्...प्राकृतम्

(हेमचन्द्र)

''प्रकृति: संस्कृतं तत्र भवं प्राकृतमुच्यते (प्राकृतसर्वस्व)

''प्राकृति: संस्कृतं तत्र भवत्वात्प्राकृतं स्मृतम् (प्राकृतचन्द्रिका)

''प्रकृते: संस्कृतायास्तु विकृति: प्राकृती मता (षड्भाषाचन्द्रिका)

''प्राकृतस्य तु सर्वमेव संस्कृतं योनि: (प्राकृतसंजीवनी)

ان تمام حوالوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پراکرت وہ زبان ہے جو سنسکرت سے بگڑ کر بنی ہے - سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئی ' پراکرت سے سنسکرت پیدا نہیں ہوئی -

اس کے بعد میں سنسکرت کی پیدائش کے اس نظریے پر آتا ہوں جو کہ عام‌طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ویدک زبان ہی ترقی کرتے کرتے سنسکرت کی شکل میں بدل گئی - اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پانِنی نے جو سنسکرت زبان کے سب سے بڑے قواعد دان ہیں اور جن کی وجہ سے سنسکرت زبان مستند سانچے

میں ڈھل گئی، جگہ جگہ اپنے سوتروں میں ویدک بھاشا کا تو ذکر کیا ہے لیکن پراکرت بھاشا کا کہیں ذکر نہیں کیا ان کی اشٹادھیائی کو پڑھنے سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مستند سنسکرت زبان ویدک سنسکرت سے پیدا ہوئی اور اسی کی ایک سنواری ہوئی شکل ہے۔ ویدک زبان اور سنسکرت زبان کے لفظوں میں یکسانیت ہے اگر آپ ویدوں کی سنسکرت کو پڑھیں اور اس کے بعد سنسکرت کو پڑھیں تو دونوں کے ڈھانچے میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر آپ پراکرت کو پڑھیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں بہت فرق ہے۔ ویدک زبان اور سنسکرت زبان کا تلفظ ایک جیسا ہے مگر پراکرت کی بولی بگڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اس سنسکرت زبان میں کچھ الفاظ دوسری زبانوں کے مل گئے ہوں۔ لیکن اس سے زبان کے ڈھانچے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زبان کا ڈھانچہ لگ بھگ وہی ویدوں کی ہی زبان کا رہا۔ ہاں اس میں کچھ پھیر پھار ضرور ہوئے اور اس طرح سنسکرت زبان آہستہ آہستہ ایک مستند شکل میں بدل گئی نہ صرف پانینی کے اشٹادھیائی سے بلکہ سنسکرت کے ادب سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ویدوں کے بعد براہمن، آرنیک، اپنیشد اور پھر سوترگرنتھ ان سب میں ایک ہی زبان ہے جو ایک دریا کی طرح آگے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہی آخری نظریہ ہمیں صحیح معلوم ہوتا ہے اور آج کل کے ماہر شرقیات بھی زیادہ تر اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ ڈاکٹر کیتھ، ڈاکٹر میکڈونل، پروفیسر پشل وغیرہ بلکہ پرانے سنسکرت کے محقق بھی اسی نظریے کو صحیح مانتے ہیں اور جو بھی محقق سلسلہ‌وار اس زبان کا مطالعہ کرےگا اسی نتیجے پر پہنچےگا۔ ان باتوں میں بہت سی الجھنیں نہ صرف اس لیے پیدا ہوگئیں ہیں کہ ہمارے پاس اس کے لیے ذخیرہ بہت کم ہے اور نہ صرف اس لیے کہ ہزاروں برس پہلے کی پرانی چیزوں کو ٹھیک طور پر سمجھنے میں بہت کٹھنائیاں پیش آتی ہیں بلکہ اس لیے بھی ہوتی ہیں کہ آج کل کے محقق کوئی نئی بات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ محقق اگر کوئی

نئی بات نہ کہے گا تو شاید وہ محقق و عالم ہی نہ سمجھا جائے گا۔ اس لیے نئی بات کہنے کی دھن میں محقق روز بروز ریسرچ کی دنیا میں ایسی کھوج کیا کرتے ہیں جو سننے میں تو سچی سی معلوم ہوتی ہیں لیکن جب دلیلوں کی کسوٹی پر کسی جاتی ہیں تو سچی ثابت نہیں ہوتیں۔

اوپر کی تمام باتوں کے کہنے کا نچوڑ یہ ہے کہ سنسکرت زبان وہ زبان ہے جو پہلے ویدک بھاشا، ویدک زبان یعنی ویدک سنسکرت تھی۔ یہی زبان ترقی کرتے کرتے جب اس صورت میں آگئی کہ اس میں علم قواعد کے تحت ایک طرح کی ترتیب اور سگھڑ پنا آگیا تو اسے سنسکرت کہا جانے لگا۔ ہم اوپر سنسکرت لفظ کے معنے بتا چکے ہیں یعنی سنسکار کی ہوئی یا علم قواعد کی رو سے ترتیب میں لائی ہوئی سنواری ہوئی، سگھڑ بنائی ہوئی۔ یہ زبان ترقی کرتے کرتے اتنی میٹھی اور شستہ ہوگئی اور اس میں ایسے ادب کی تخلیق ہوئی کہ نقاد اسے دیوتاؤں کی زبان کہنے لگے۔

"संस्कृतं नाम दैवी वाक अन्वाख्याता महर्षिभि:"

یعنی مہارشی لوگ سنسکرت زبان کو دیوتاؤں کی زبان کہتے ہیں۔

اس زبان میں کس طرح ادب کی تخلیق شروع ہوئی اس کا صحیح طور پر پتا لگانا قریب قریب نا ممکن ہے۔ جس طرح ہزاروں کروڑوں لوگ پیدا ہوتے ہیں لیکن کسی ایک کا نام سیکڑوں صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی زندہ رہ جاتا ہے اسی طرح ادبی دنیا میں بھی ہزاروں ادیب پیدا ہوتے ہیں لیکن کچھ زمانے کے گزرنے کے بعد کوئی ایک آدھ ادیب ایسا ہوتا ہے جس کا نام اور کام زندہ رہ جاتا ہے۔ جس طرح ایک بڑا آدمی کروڑوں معمولی آدمیوں کے ناموں کو بھلا دیتا ہے اور ایسا کردیتا ہے کہ گویا جیسا کہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اسی طرح ایک بڑا شاعر ایک بڑا ادیب ہزاروں ادب کی خدمت کرنے والے ناموں کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیتا ہے۔ صدیاں بیت جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بس ایک ہی ادیب پیدا ہوا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایک سچے اور بڑے ادیب کے پیدا کرنے میں ہزاروں

ادیبوں کا هاتھ هوتا هے جو اسے پیدا کرکے خود مٹ جاتے هیں اور ان کے نام‌ونشان تک کا پتہ نہیں چلتا۔

یہی وجه هے کہ سنسکرت کے ادب کی تاریخ میں مہا کویوں کی یعنی بڑے شاعروں کی ادبی تصانیف هی همارے سامنے ایک‌دم آتی هیں۔ کیا شاعری میں کیا اور قصه کہانیوں میں غرض ادب کے جس حصے کا بھی آپ مطالعه کریں ایک‌دم آپ کو ایسے بڑے مصنفوں کی تصانیف ملیں گی جن کے ادبی زبان کے ڈھانچے کے بننے میں بہت سا زمانه گزرا اور جس کی بنیاد میں بہت سے ادیبوں کے نام بھلا دیے گئے۔

یہی سبب هے کہ سنسکرت ادب میں همارے سامنے سب سے پہلے شاعر رامائن کے لکھنے والے والمیکی آتے هیں۔ ان کی « رامائن » نے نه صرف اپنے سے پہلے شاعر کو اور ان کی ادبی کوششوں کو بھلا دیا بلکہ اپنے بعد کے آنے والے بہت سے شاعروں کو بھی اُبھرنے نہیں دیا کیونکہ جب تک کوئی رامائن کی ٹکر کی کتاب نه لکھتا تب تک والمیکی کے سامنے ٹھیرنا کٹھن تھا۔ اس لیے رامائن کے بعد اگر کوئی شاعر زنده رها تو وه مہابھارت کا مصنف ویدویاس تھا۔

والمیکی کی رامائن نے هندستانیوں کے دلوں پر بہت بڑا اثر پیدا کیا۔ سیکڑوں صدیوں کے گزر جانے کے بعد اس کا احساس همیں آج بھی هوتا هے۔ رام‌چندر کو اگر کسی نے زنده دنیا کی چیز بنائے رکھا تو وه والمیکی کے امر قلم نے۔ آج هم جو کچھ بھی رام‌چندر جی کے بارے میں جانتے هیں اور رام‌چندر جی جو کچھ بھی هیں وه والمیکی کی دماغ کے اپج هیں۔

والمیکی کو سنسکرت کا آدی کوی یعنے پہلا شاعر کہا جاتا هے۔ والمیکی کس طرح شاعر بنے، اس کے بارے میں یہ کہانی مشہور هے۔ کہتے هیں کہ ایک روز وه تمساندی میں اشنان کرنے کے لیے گئے هوئے تھے۔ وهاں پرندوں کا ایک جوڑا جنھیں سنسکرت میں کرونچ کہتے هیں آپس میں محبت کی کلولوں میں مست تھا۔ ایک چڑی‌مار آیا اور اس نے اپنے تیر سے اس جوڑے کے نر پرندے کو مار ڈالا۔ اس سے والمیکی کے دل کو سخت چوٹ پہنچی اور ان کے منہ سے یکایک بلا سوچے سمجھے یہ شعر نکل گیا:—

"मा निषाद प्रतिष्ठां त्वमगमः शाश्वतीः समाः ।
यत् क्रौञ्चमिथुनादेकमवधीः काममोहितम् ॥"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "اے چڑی‌مار تو کبھی خوش‌حال اور آباد نہ ہو اور ہمیشہ ذلت سے اپنی زندگی بسر کرتا رہ کیونکہ تونے محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے کھیلتے ہوئے اس پرندے کے جوڑے میں سے ایک کو مار ڈالا ہے"۔

کہنےکو تو والمیکی کے منہ سے یہ شعر نکل گیا لیکن اس کے نکلتے ہی والمیکی سوچنے لگے کہ یہ شعر میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ یہ تو شلوک ہے۔ اس میں وزن ہے - سنسکرت کے پرانے مصنفوں کی رائے میں Secluar غیر مذھبی سنسکرت کا یہ پہلا شلوک یعنی شعر ہے۔ اس کے بارے میں کالیداس نے رگھوونش میں لکھا ہے:

" श्लोकत्वमापद्यत यस्य शोक: "

یعنی جس کا سوگ شلوک میں بدل گیا۔ اسی طرح بھوابھوتی نے بھی والمیکی کو آدی کوی یعنی سنسکرت نظم کا بانی کہا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے مشہور شاعروں کی یہی رائے ہے۔

جس طرح کسی کے ھاتھ ایک دم کوئی بڑا قیمتی ھیرا لگ جائے اسی طرح والمیکی کو یہ شعر معلوم ھوا۔ گھر آکر والمیکی بار بار یہ سوچنے لگے کہ جو کچھ میرے منہ سے آج نکل گیا ہے اس میں ایک سنگیت یا نغمہ ہے اور ایسا سوچتے سوچتے کہا جاتا ہے کہ انھیں الہام سا ھوا کہ انھیں اسی طرح نظم میں رامچندر جی کی کہانی لکھنی چاہیے۔ والمیکی نے راماین لکھ کر رامچندر کو ھمیشہ کے لیے زندہ دنیا کی چیز بنادیا۔ اس طرح والمیکی نے سنسکرت ادب کی شاندار بنیاد رکھی۔ راماین میں والمیکی نے اپنے کرداروں سے جو معیار پیش کیے ھیں وہ ھندستان کی تہذیب کی بنیاد ھیں۔ کہتے ھیں کہ جب والمیکی کی راماین گائی جاتی تھی تو لوگوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔ راماین میں لکھا ہے کہ والمیکی نے اپنی راماین کو پہلے کُش اور لَو کو سکھلایا تھا اور جس وقت کُش اور لَو اس راماین کو رشیوں کی مجلسوں میں گاتے تھے تمام رشی محو ھوجاتے تھے۔ اس دن سے لے کر

آج تک راماین نے لوگوں کے دلوں پر جو سکہ بٹھایا تھا وہ آج تک بھی ویسے ہی قایم ہے۔

والمیکی کی زبان بالکل بول چال کی سنسکرت ہے۔ سیدھی سادی زبان ہے۔ اس میں کسی طرح کی بناوٹ نہیں ہے۔ اس میں جو تشبیہات پیش کی گئی ہیں وہ روزمرہ کی زندگی سے لی گئی ہیں؛ وہ خیالی یا کتابی نہیں ہیں۔ والمیکی کی راماین کی ایک ایک سطر میں والمیکی کا اپنا دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ پھر اس سیدھی سادی بےساختہ زبان میں جو خوبی، جو حسن، جو ادا، جو بانکپن، جو شان، جو لطافت اور جو موہنی پھونکنے کا منتر ہے وہ پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کا دل ہی جانتا ہے۔

ہندستان کی زبانوں کے مشہور پنڈت Grearson نے لکھا ہے کہ بائیبل کے بعد ساری دنیا میں اگر کوئی کتاب سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے تو وہ والمیکی کی راماین ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ والمیکی کی راماین نہیں ہے لیکن کسی کی بھی راماین کیوں نہ ہو اس کی عزت والمیکی کو ہی ملے گی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ کوئی بیس سال ہوئے جب کہ میں کشمیر کی ایک مجلس میں جو ایک باغیچے میں ہو رہی تھی کسی شاعر کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ جب میں نے کسی سلسلے میں راماین کا قصہ چھیڑا باغیچے کے سارے مالی اپنا کام چھوڑکر آ گئے اور تلسی‌داس کی راماین کے دوہے اور چوپائیاں سننے لگے۔ مجھے اس دن یہ احساس ہوا کہ راماین کا اثر اب بھی کتنا اچھوتا ہے۔

اگر میں والمیکی کی راماین کے بارے میں اور والمیکی کی شاعری کے متعلق ہی کچھ کہنا چاہوں تو یہی ایک الگ مضمون بن جائے گا۔ میں چلتے چلتے ایک دو شلوکوں کا ذکر کر دیتا ہوں جس سے آپ کو رام کی زندگی کی خصوصیت کا کچھ پتہ چل سکے گا۔

رامچندر تخت نشین ہونے والے ہیں۔ سارے راج میں خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ یکایک رام کو یہ سندیسا دیا جاتا ہے کہ راج گدی تو اس کے چھوٹے بھائی بھرت

کو دی جائےگی اور اسے چودہ سال کے لیے کسی جنگل میں جاکر رہنا پڑے گا۔
جس وقت یہ خبر رامچندرجی کو دی گئی والمیکی لکھتے ہیں :—

"राज्यमारो दुकाकस्य त्यजतश्च वसुन्धराम् ।
न मया लक्षितस्सस्य स्वल्पोड प्याजारविभ्रम ॥ "

اس کے معنی یہ ہیں کہ ' جس وقت رامچندرجی سے یہ کہا گیا کہ تمھیں کل صبح راج گدی دی جائےگی اس وقت اور جب انھیں یہ حکم دیا گیا کہ انھیں چودہ سال کا بنواس دیا گیا ہے تب ان کے چہرے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ نہ راج گدی کے وقت خوشی تھی اور نہ راج چھوڑنے کے وقت غم تھا '۔

اسی طرح جب کہ رانی کیکئی رامچندر کو راجا کا حکم سنانے میں پس و پیش کررہی ہیں اس وقت رامچندرجی کہتے ہیں :—

"तद्ब्रूहि सत्वंरदेवि राज्ञो यदभिकाङ्क्षितम् ।
करिष्ये प्रतिजानेच रामो द्विर्नाभिभासते ॥ "

' امّاں جان مہربانی کرکے مجھے جلد بتائیے کہ راجا کا کیا حکم ہے۔ آپ سچ مانیے کہ میں ویسا ہی کروں گا۔ رام دو باتیں کرنا نہیں جانتا، وہ تو ایک ہی بات کرتا ہے یعنی اس کے کہنے اور کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جو کہتا ہے وہ کرتا ہے '۔ والمیکی کے اس شعر کی گونج سارے سنسکرت اور ہندی کے ادب میں سنائی دیتی ہے۔

اس طرح راماین کے ہر ایک کردار کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اوپر جو ذرا سا میں نے ذکر کیا ہے وہ نمونے کے طور پر ہے۔

والمیکی کے بعد جو شاعر ہوئے ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت سے شاعر تو اپنے کلام کو راماین میں ہی ملاتے چلے گئے۔ کوئی شاعر جب تک والمیکی سے ٹکّر نہ لے سکتا اور یا ان کی راماین کے مقابلے کی کوئی کتاب نہ لکھتا تب تک وہ گنتی میں آہی کیسے سکتا تھا۔ راماین نے سارے شاعروں کو اپنے رنگ میں ایسا رنگا کہ جس نے جو کچھ لکھا راماین میں ہی ملتا گیا۔ جیسے ایک بڑی ندی ہزاروں چھوٹی چھوٹی ندیوں کو اپنے اندر ملالیتی ہے اور اس طرح آگے بڑھتی جاتی

ہے اسی طرح والمیکی کے بعد کے شاعر راماین کی گنگا کی لہروں میں بہ گئے۔ ان کا کہیں پتہ نہیں۔ راماین نے شاعری کے میدان میں اتنا بڑا معیار قائم کردیا تھا کہ اس کے مقابلے میں کچھ پیش کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس لیے راماین کے بعد بہت عرصے تک کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جو عام طور پر مقبول ہوا ہو اور جس کا نام سنسکرت ادب کی تاریخ میں زندہ رہ گیا ہو۔

راماین کے بعد اگر سنسکرت کے ادب کے میدان میں اور اس اونچے معیار کے سامنے کوئی تصنیف ٹھیرسکی اور عام طور پر مقبول ہوئی تو وہ مہابھارت تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہابھارت کا اثر عوام کے دلوں پر راماین سے شاید گہرا نہیں پڑا تو بھی مہابھارت نے سنسکرت کے ادب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ کئی محققوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مہابھارت راماین سے پہلے لکھی گئی ہے لیکن جو زبان کے پرکھیا ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ راماین کی زبان اور مہابھارت کی زبان میں کتنا فرق ہے۔ راماین کی زبان میں ایک قسم کا بھولاپن ہے اور مہابھارت کی زبان میں ایک قسم کی شوخی ہے۔ مہابھارت کی زبان بھی بول چال کی زبان ہے لیکن بہت ستھری اور سنواری ہوئی۔ راماین کی زبان میں مٹھاس ہے لیکن مہابھارت کی زبان میں مٹھاس بھی ہے اور لوچ بھی۔ پھر مہابھارت میں پیچیدگیاں بھی بہت ہیں۔ جو سوال راماین میں بالکل سادہ معلوم ہوتے ہیں وہ مہابھارت میں آکر بہت پیچیدہ ہوگئے ہیں۔

بہت سے عالم مہابھارت کو سنسکرت کی انسائیکلوپیڈیا کہتے ہیں۔ کوئی مسئلہ لے لیجیے، آپ کو مہابھارت میں ضرور اس کا ذکر ملےگا۔ اس میں سیاسیات کے ہر ایک انسانی مسئلہ کو تفصیل اور باریکی سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سینکڑوں کہانیاں قصے جو عوام میں مشہور تھے مہابھارت میں قلمبند ہوئے ہیں۔ انہیں وجوہ سے مہابھارت کی حیثیت راماین سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یوں تو دنیا کی کسی زبان میں راماین اور مہابھارت سے بڑی رزمیہ نظمیں نہیں ہیں۔

« بھگوت گیتا » جو سنسکرت ادب کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ھے مہابھارت کا ایک بہت ھی چھوٹا سا جز ھے - سچ تو یہ ھے کہ مہابھارت میں ایسی سینکڑوں گیتائیں بھری ھوئی ھیں لیکن وہ اتنی مقبول نہیں ھوئیں جتنی کہ بھگوت گیتا ھوئی ھے - بھگوت گیتا کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ھے کہ یہ ایک مذھبی مقدس کتاب بن گئی ھے - بھگوت گیتا کا اثر ھندستان کے باھر بھی پڑا ھے - امریکہ کے مشہور مصنف ایمرسن کے بارے میں یہ کہا جاتا ھے کہ وہ روز سویرے اٹھ کر بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ پڑھا کرتے تھے - جب ڈاکٹر رویندرناتھ ٹاگور امریکہ تشریف لے گئے تھے تو وھاں وہ اس مکان پر بھی گئے تھے جہاں ایمرسن رھتا تھا - انھوں نے ان کا کتب خانہ دیکھا اور اس میں سے ایک کتاب نکالی جس میں بہت سے نوٹ لکھے ھوئے تھے - یہ کتاب اور کوئی نہیں تھی بھگوت گیتا تھی - جب رویندر ناتھ ٹاگور نے ان کے بیٹے سے پوچھا کہ کیا مسٹر ایمرسن اس کتاب کو پڑھا کرتے تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ روز سویرے وہ اسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور یہ سب نوٹ انھیں کے اپنے ھاتھ کے لکھے ھوئے ھیں - سنسکرت میں بھگوت گیتا پر جتنی شرحیں ھوئی ھیں اور ھورھی ھیں اتنی شاید کسی اور کتاب پر نہیں ھوئیں - اسی سے اس کتاب کی مقبولیت معلوم ھوتی ھے - جیسا کہ میں پہلے ھی کہہ چکا ھوں مہابھارت میں سینکڑوں گیتائیں بھری ھوئی ھیں - اسی طرح مہابھارت میں بہت سی نیتیاں بھی ھیں جن میں کنک نیتی اور ودرنیتی بہت مشہور ھیں - ان نیتیوں میں اس بات کو کامل طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ھے کہ ایک انسان کو اپنی زندگی کس طرح بسر کرنی چاھیے -

مہابھارت کے معنے ھیں بڑا ھندستان - اس نام کی وجہ یہ ھے کہ مہابھارت کی لڑائی میں مدراس کے راجا سے لے کر قندھار تک کے راجا اور بنگال سے لے کر پشاور تک کے اس طرح سارے ھندستان کے تمام صوبہجات کے راجا شامل ھوئے تھے - کوئی یدھشٹر کی طرف تھا اور کوئی دریودھن کی طرف - مہابھارت کی لڑائی ھندستان کی پرانی لڑائیوں میں سب سے بڑی تھی اور اس وجہ سے لفظ

'مہابھارت' کے معنے بھی 'بڑی لڑائی' (Great-war) کے ہوگئے ہیں - مہابھارت کے بارے میں کئی ہندو گھروں میں ایسا وہم پھیلا ہوا ہے کہ جس گھر میں مہابھارت کی کتاب ہو اس گھر میں لڑائی ہوجاتی ہے -

حقیقت میں مہابھارت سنسکرت کے ادب کی ایک ایسی کتاب ہے جو ہر پہلو سے بےنظیر ہے - دنیا کے کسی زبان میں شاعری کی اس سے بڑی کوئی کتاب نہیں ہے - اگر کوئی پرانی ہندستانی تہذیب اور تمدن کا' پرانے آریوں کے ہر قسم کے کارناموں کا' اس کے عروج کا حال ایک کتاب سے جاننا چاہتا ہے تو وہ مہابھارت ہے - مہابھارت علم کا خزانہ ہے اور اس کی زبان میں اتنی مٹھاس اور روانی ہے اور اس کا طرز بیان اتنا جاذب ہے کہ ایک مرتبہ کتاب پڑھنا شروع کرنے پر پڑھنے والا سب کچھ چھوڑ سکتا ہے لیکن اس کتاب کو نہیں چھوڑ سکتا - مہابھارت کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کٹھن سے کٹھن اور بڑے سے بڑے زندگی کے مسئلوں کو اتنی سادگی اور گہرائی سے' اتنی آسانی اور باریکی سے اور ابتدا سے لےکر آخر تک اس خوبی سے سمجھایا گیا ہے کہ ایک معمولی ان‌پڑھ آدمی اور عالم دونوں کے لیے وہ ایک جیسی ہے اور پھر وہ ایسی پُرلطف ہے کہ جتنی دفعہ پڑھیے پھر پھر پڑھنے کی خواهش ہوتی ہے -

لارڈ Avebury نے جو سر آئیزک نیوٹن کے پڑوسی تھے اپنی مشہور کتاب Pleasures of Life میں کتابوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جو دنیا کے ہر تہذیب یافتہ آدمی کو چاہے وہ کہیں کا رہنے والا ہو ضرور پڑھنی چاہییں - اس فہرست میں انھوں نے مہابھارت اور راماین دونوں کتابوں کا نام لکھا ہے - سچ تو یہ ہے کہ جس طرح همالیه هندستان کی ایک بےنظیر چیز ہے اسی طرح راماین اور مہابھارت بھی ہیں - یہ بھی همالیه کی ان اونچی چوٹیوں کی طرح رہتا سر شان سے اٹھائے کھڑی ہوئی ہیں جہاں تک کسی کو پہنچ ہونی قریب قریب ناممکن ہے

صدیوں تک هندستان کے ادب میں راماین اور مہابھارت هی کو دهرایا جاتا رها هے اور دونوں کتابوں نے هندستان کے ادیبوں کے دلوں پر کچھ ایسا جادو کیا که انھوں نے اگر کچھ لکھا تو راماین اور مہابھارت کو لکھا اور یا پھر ان کے قصوں کو لکھا ۔ هندستان کے کسی صوبه کی کوئی زبان لے لیجیے اس میں جب کبھی ادب کی ابتدا هوئی هے تو انھیں دونوں کتابوں کی بدولت اور پھر بھی کوئی شاعر ان تک نہیں پہنچنے پایا ۔

" نه هوا پر نه هوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا "

کتنی شاعروں نے راماین اور مہابھارت کو نظم کیا لیکن تمام زور لگانے پر بھی والمیکی اور ویاس کا انداز نصیب نه هوا ۔

یه قدرتی بات تھی که مہابھارت کے بعد جلد کوئی شاعر سنسکرت ادب کے میدان میں سر اٹھا کر کھڑا نه هوسکا ۔ جس طرح هندستان میں تاج محل بننے کے بعد بھی عمارتیں تو بہت سی بنیں لیکن فن عمارت کی دنیا میں خاموشی سی قایم هے اسی طرح مہابھارت کے بعد شاعر تو بہت سے هوئے لیکن ادب کی دنیا میں خاموشی سی قایم رهی ۔

اس خاموشی کو توڑنے والا اور راماین اور مہابھارت کے مصنف والمیکی اور ویاس کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا هونے والا، سنسکرت کے ادب اور شاعری میں ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی شاعر آیا تو وه کالیداس هے ۔ اس کی زبان میں ایک حسینه کی دونوں طرف سے نوکدار بڑی بڑی آنکھوں کی مست شوخ اور بانکی چتون، اس کے پتلے نازک ترین هونٹوں کے بیچ سگھڑ دانتوں کی صاف میٹھی اور چلبلی مسکراهٹ ، اس کی مٹکتی چال اور ادائیں هیں که ایسا معلوم هوتا هے که کالیداس کی زبان میں سنسکرت زبان کی جوانی ابھر آئی هے ۔

یه تو ناممکن هے که مہابھارت کے بعد کالیداس سے پہلے کوئی شاعر نه هوا هو کیونکه کالیداس کی شاعری سے پہلے پچاسوں نئی بحریں پیدا هوچکی تھیں جن کا

پتہ راماین اور مہابھارت تک میں نہیں ملتا ہے - ان تمام بحروں کے بننے میں کافی وقت لگا اور کاویہ یعنی شاعری لکھنے کے جس اسلوب بیان کو کالیداس نے اختیار کیا ہے وہ بھی آہستہ آہستہ اس درجہ کو پہنچا - ہمارے پاس جو کچھ ذخیرہ ہے اس کی بنیاد پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مہابھارت اور راماین کے بعد سنسکرت زبان اور اس کے ادب میں جو ترقی ہوئی وہ پہلے پہل کالیداس کی شاعری میں ہمارے سامنے آتی ہے - Dr. Keith اور کئی اور محقق کالیداس سے پہلے اشوگھوش کو رکھتے ہیں- اشوگھوش نے بدھ مذہب کو اختیار کرلیا تھا - انھوں نے بدھ چرت نام کی ایک نظم کی کتاب سنسکرت میں لکھی ہے - ڈاکٹر کیتھ انھیں پہلی صدی عیسوی میں رکھتے ہیں اور کالیداس کو چوتھی صدی عیسوی میں - لیکن بہت سے ماہر شرقیات نے یہ ثابت کیا ہے کہ کالیداس پہلی صدی عیسوی سے قبل ہوئے ہیں - یہ مہاراجا وکرمادتیہ کے دربار کے شاعر تھے - اشوگھوش ان کے بعد کے شاعر ہیں - کچھ بھی ہو' یہ تو ماننا پڑے گا کہ اشوگھوش نے سنسکرت کے ادب پر وہ اثر نہیں چھوڑا جو کالیداس نے -

والمیکی اور ویاس تو رشی کہلاتے ہیں لیکن کالیداس سنسکرت کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں - انھوں نے اپنی شاعری سے سنسکرت کے ادب کو جو فروغ دیا اور اس نے جو زندگی پیدا کی وہ ان کے بعد بھی قایم رہی - والمیکی اور ویاس نے جو کتابیں لکھی تھیں اس میں چوبیس ہزار اور چھبیس ہزار شلوک تھے اور اتنے یا اس سے زیادہ شلوک لکھے بغیر ادب کی دنیا میں مقبولیت مشکل تھی - یہ سلسلہ بھی کالیداس نے توڑا - کالیداس نے چھوٹی چھوٹی نظموں میں وہ لطافت اور حسن پیدا کیا کہ شاعر بننے کے لیے بڑی بڑی کتابوں کے لکھنے کی ضرورت نہ رہی -

کالیداس کی زبان سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے زمانے تک سنسکرت زبان کی بہت ترقی ہوچکی تھی اور اس میں بہت سے علم و فن کی کتابیں لکھی جاچکی تھیں - ان کی بہت سی تشبیہات ایسی ہیں جن کی بنیاد علمی کتابیں ہی ہوسکتی ہیں -

ان کی کتابوں سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ اس وقت تک بہت سے علم جیسے رقص، موسیقی، دیومالا، سیاسیات، معاشیات، نجوم، سگن کا علم، ریاضی وغیرہ ترقی کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے بہت سے علموں کا تو وہ خود ماہر معلوم ہوتا ہے۔

ان کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریب قریب سارے ہندستان میں اچھی طرح نہ صرف پھر چکے تھے بلکہ انھوں نے یہاں کے مختلف صوبوں کے قدرتی نظاروں کا پورا پورا لطف اٹھایا تھا اور ان کے خاموش ترنم کو ایک شاعر کی حیثیت سے سنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اگر ایک طرف اپنے شاعرانہ انداز میں ہمالیہ کی تصویر کھینچی ہے تو دوسری طرف مالابار کی۔ ایک طرف سمندر کی تو دوسری طرف میدانوں کی۔ ایک طرف جنگلوں کی تو دوسری طرف بغیچوں کی۔ ایک طرف اگر سرجو ندی کی تو دوسری طرف سپرا، نربدا اور کاویری کی۔ ایک طرف پٹنہ کی تو دوسری طرف کانچی کی۔ ان کی شاعری اساڑھ کے بادلوں کی طرح سارے ہندستان کے آسمان میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیل گئی ہے جس کی زندگی پیدا کرنے والی بوندوں نے سنسکرت کے ادب کو نئی کھیتیوں کی طرح ہرا بھرا اور ہمیشہ کے لیے لہلہاتا بنا دیا ہے۔ ان کی نظموں میں ہندستان کے قریب قریب ہر حصے کا بیان ہونے کی وجہ سے کوئی کہتا ہے کالیداس کشمیر کے تھے کوئی کہتا ہے بنگال کے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ اُجین کے رہنے والے تھے کوئی انھیں شمالی ہندستان کا اور کوئی انھیں جنوبی ہندستان کا کہتے ہیں۔

ان کے زمانے کے بارے میں بھی کوئی ایک رائے نہیں ہے۔ آٹھویں صدی قبل عیسی سے لےکر پانچویں صدی بعد عیسی تک ان کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ اس کے باوجود بھی جبکہ بہت کچھ لکھا جاچکا ہے ابھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کالی‌داس کہاں اور کس زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

کالی‌داس کی شاعری میں آنکھ اور دل کا، زبان اور جذبات کا، مصوری اور موسیقی کا، سادگی اور شوخی کا، اصلی اور خیالی دنیا کا پرلطف اور حیرت انگیز

قدرتی اور قدرت سے بالاتر خدائی ملاپ ہوا ہے۔ سنسکرت زبان بڑی خوش نصیب ہے کہ اسے کالی‌داس جیسا شاعر ملا۔ سنسکرت نے کالی‌داس کو اور کالی‌داس نے سنسکرت کو بنا دیا۔ پھر کالی‌داس کی شاعری میں جو میٹھا، گدگدا، بانکا، پینا، تیکھا اور چبھتا ہوا فراق ہے وہ سنسکرت کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ تشبیہات کی دنیا کا تو وہ بادشاہ ہے۔ اس کی تشبیہیں سادی، انوکھی اور بڑے پتے کی ہیں۔

کالی‌داس نے سات کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں تین ڈرامے ہیں اور چار شاعری کی کتابیں ہیں۔ ڈراموں کے بارے میں میں اپنے اس مضمون میں کچھ نہ لکھوں گا۔ باقی چار کتابوں میں رگھوونش، کمار سنبھو، رت سنہار اور میگھ دوت ہیں۔ ان میں سب سے بڑا رگھوونش ہے۔ اس کے انیس باب ہیں۔ رگھو خاندان کے انیس راجاؤں کا اس میں بیان دیا گیا ہے۔ رگھوبنسیوں کا خاندان سورج بنسیوں کا خاندان ہے۔ مہاراجا دلیپ سے لےکر مہاراجا اگنی‌متر تک کے تمام مہاراجاؤں کا اس میں سلسلہ‌وار بیان ہے۔

ڈاکٹر ونیا کمار سرکار کی رائے میں ہندو مہاراجاؤں کی تہذیب کا، ان کی حکومت کا، سماجی حالات کا، رسم و رواج کا، ان کی بہادری کے کارناموں کا اور رعایا کو خوش‌حال رکھنے کے طریقوں کا اگر کسی کتاب سے پتا چلتا ہے تو وہ 'رگھوونش' ہے۔ یہ سچ ہے کہ 'رگھوونش' کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے تو بھی اس میں تاریخ کا اور خاص کر ہندؤں کی تہذیبی تاریخ کا بہت سا مسالہ ہے۔ اس میں رگھوونشی راجاؤں کی لڑائی کا بیان، ان کے زندگی کے اصول، طرز حکومت، لڑکیوں کا سوئمبر، شادیوں کی رسمیں، ان کا شکار کھیلنا اور دوسرے شغل وغیرہ قریب قریب ہر پہلو پر بڑی خوبی سے لکھا گیا ہے۔

رگھوونش کے چھٹے باب میں کالی‌داس نے اندومتی کے سوئمبر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ صرف کالی‌داس ہی کھینچ سکتے تھے۔ اندومتی ودربھ یعنی برار کے مہاراجا کی چھوٹی بہن تھیں۔ اس کے سوئمبر میں ہندستان کے تمام صوبجات کے راجا مہاراجا آتے ہیں۔ مہاراجا کے محل کے ایک عالی‌شان بڑے کمرے میں سونے

کی راج گدیوں پر ترتیب سے تمام راجا بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس وقت اندومتی پالکی میں سے اتر کر اس عالی‌شان کمرے میں پیر رکھتی ہے اس وقت راجاؤں کی آنکھوں اور دلوں کی جو حالت ہوتی ہے اور جس طرح اندومتی کا دھیان کھینچنے کے لیے ایسی حرکتیں خود بخود کرنے لگ جاتے ہیں جسے وہ شاید خود نہیں سمجھ سکتے تھے انھیں کالی‌داس نے بڑی خوبی اور حسن سے اپنی شاعری میں قلمبند کردیا ہے۔ ایک طرف ایک لڑکی تھی اور دوسری طرف ہندستان کے تمام راجا۔ لڑکی کیا تھی خدا کے حسن کے خیال کی زندہ مجسم تصویر تھی اور راجا کیا تھے بس ایک دل جو زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اپنی خواہش کو خاموشی کے ساتھ بتانا چاہتا تھا۔ سوئمبر شروع ہوتا ہے۔ ایک ایک مہاراجا کا پوری تعریفوں کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے اور اندومتی کچھ کہے بغیر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جن جن راجاؤں کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھتی چلی جارہی تھی ان راجاؤں کی جو حالت ہو رہی تھی اس کا بیان شاعر نے یوں کیا ہے:—

"संचारिणी दीपशिखेव रात्रौ,
यं यं व्यतीयाय पतिंवरा सा।
नरेन्द्र मार्गाट्ट इव प्रपेदे,
विवर्णभावं स स भूमिपाल ॥"

جس طرح رات کے وقت شاہراہ پر چلتی ہوئی ایک لالٹین جن محلات کے پاس سے گزرتی جاتی ہے اور انھیں گھپ کالے اندھیرے میں چھوڑتی چلی جاتی ہے، اسی طرح اندومتی جس جس مہاراجا کے پاس سے آگے بڑھ گئی اس اس راجا کا منہ کالا پڑتا چلا گیا۔ جیسے ایک لالٹین کی روشنی کے سامنے راستے کا ایک مکان رات میں چمک اٹھتا ہے اور جب وہ روشنی آگے نکل جاتی ہے تو وہ مکان اندھیرے میں کالا سیاہ ہو جاتا ہے اسی طرح وہ دیے کی لو کی طرح جگمگاتی اندومتی پہلے جس راجا کے پاس کھڑی ہوتی تھی اس کے منہ پر خوشی کی چمک دوڑ جاتی تھی لیکن جوں ہی وہ آگے بڑھ جاتی تھی اس کا منہ مایوسی سے کالا پڑ جاتا تھا۔ اس شعر میں لالٹین کی تشبیہ سے شاعر نے جو پتے کی بات کہی ہے اس کا لطف بیان سے باہر ہے۔

قصه بہت لمبا ھے۔ اسی طرح سارے سوئمبر کا بیان شاعر نے بڑے شاعرانه طریقے سے کیا ھے۔ آخر میں اندومتی مہاراجا رگھو کے بیٹے اج کے گلے میں جےمالا پنہاتی ھے۔ ساتویں باب میں جب اج اندومتی کو ساتھ لےکر دھوم دھام سے اپنی راج‌دھانی ایودھیا میں آتے ھیں اور ان کی سواری شہر کے بڑے بڑے راستوں سے گزرتی ھے اس وقت مکانوں میں بیٹھی ھوئی عورتیں اپنے مکان کی کھڑکیوں میں کس طرح دوڑ دوڑ کر آتی ھیں اس کا نظارہ کالی‌داس نے اپنی قلم سے اس باب میں دکھایا ھے۔ کوئی عورت اپنے بال بنا رھی تھی وہ ویسے ھی بالوں کو پکڑے کھڑکی میں کھڑی ھوکر ایک ٹک دیکھنے لگی۔ کوئی مہاور لگا رھی تھی وہ اپنے گیلے مہاور سے فرش کو لال کرتی ھوئی دوڑ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ھوگئی۔ کوئی ساڑی باندھ رھی تھی اسے اج کو اور اندومتی کو دیکھنے کی اتنی زبردست خواھش تھی که وہ آدھی ساڑی باندھے اپنے ھاتھوں سے کمر میں لٹکتی ھوئی ساڑی کو پکڑے کھڑکی میں آکر کھڑی ھوگئی ھے۔ راستے بھر کے مکانوں کی کھڑکیوں میں تمام عورتیں ھی عورتیں کھڑی تھیں۔ ان کے گورے لال منه اور کالی آنکھوں سے ایسا معلوم ھوتا تھا که تمام کھڑکیوں میں لال کنول کھلے ھوئے ھیں جن پر آنکھوں کی شکل میں کالے بھنورے منڈلا رھے ھیں۔

"विलोलनेत्र भ्रमरैर्गवाक्षा : सहस्रपत्राभरण इवासन्"

اسی طرح رگھوونش کے ھر ایک باب میں اس نے ایک ایک چیز کو لیا ھے اور اس کی ایسی مکمل تصویر کھینچی ھے که وہ ادبی دنیا کی ایک انمول ملکیت بن گئی ھے۔

ان کی دوسری کتاب «کمار سنبھو» ھے اس کی کہانی کو انھوں نے پرانوں سے لیا ھے۔ اس میں سترہ باب ھیں جس میں کل آٹھ کالی‌داس کے لکھے ھوئے کہے جاتے ھیں۔ باقی کسی دوسرے گم‌نام شاعر نے اس میں ملا دیے ھیں۔ «کمار سنبھو» میں کالی‌داس نے مہادیو اور پاربتی کی شادی کا بیان کیا ھے۔ یه کتاب ھمالیه پہاڑ کے بیان سے شروع ھوتی ھے کیونکه پاربتی ھمالیه کی بیٹی تھی۔ شیوجی نے اپنی پہلی بیوی ستی کے مرنے کے بعد یه مصمم ارادہ کرلیا تھا که وہ اب شادی نہیں کریں گے۔ لیکن

دیوتاؤں کی خواہش تھی کہ وہ شادی کریں - اس لیے راجا اندر نے کام‌دیو کو بلایا اور کہا کہ کچھ ایسا کرو کہ شیوجی کے دل میں پھر محبت کی چاہ پیدا ھوجائے - کام‌دیو اس کام کے لیے تیار ھوگئے اور وہ بسنت یعنی موسم بہار کو اپنے ساتھ لے کر شیوجی کے دل کے رخ کو بدلنے کے لیے وھاں آئے جہاں شیوجی اپنی ریاضت اور تپسیا میں لگے ھوئے تھے - چاروں طرف بہار کا موسم چھا گیا' تمام چرند' پرند محبت کی رنگ رلیوں میں مست ھوگئے - ھندو پرانوں میں لکھا ھے کہ کام‌دیو پھولوں کے تیروں سے مارتا ھے - ایک دن جبکہ بہار کا موسم پوری جوانی پر تھا کام‌دیو ایک پیڑ پر چھپ کر بیٹھ گئے - ٹھیک موقع پر جب پاربتی ان کے سامنے کھڑی تھی کام‌دیو نے اپنے پھولوں کے تیر کا وار کیا اور سچ مچ ایک لمحے کے لیے شیوجی کا دل بھی ڈانواں ڈول ھوگیا - مگر وہ جھٹ سنبھل گئے اور جو انھوں نے غصے میں بھر کر آنکھ اٹھائی تو ان کے تیسری آنکھ سے آگ نکل پڑی اور بچارہ کام‌دیو جل بھن کر راکھ ھوگیا - پاربتی مایوس ھوگئی - پاربتی کہنے لگی کہ لوگ کہتے ھیں خوبصورتی بڑی چیز ھے لیکن جس خوبصورتی سے میں شیوجی کا دل بھی نہ جیت سکی اس خوبصورتی پر لعنت ھے - وہ اپنا سب گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں چلی گئی اور جوگن بن گئی - کھانا' پینا چھوڑ دیا - بھری برسات میں سخت گرمی اور کڑاکے کی سردی میں کھلے بدن رھی - اس نے اتنی سخت تپسیا کی کہ آخر شیوجی جو اس کی جوانی اور حسن کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں پسیجے تھے ھل گئے اور وہ ایک طالب‌علم کا بھیس بنا کر گئے اور پاربتی سے پوچھا کہ وہ شیوجی سے کیوں شادی کرنا چاھتی ھے - شیوجی کی اس نے بہت برائی کی - کہا "اس شیوجی سے تم شادی کرنا چاھتی ھو جو مسان میں رھتے ھیں' ھڈیوں کی مالا پہنتے ھیں' جن کے گلے میں سانپ رھتے ھیں' جو ننگے بدن رھتے ھیں - لیکن پاربتی جواب دیتی ھے کہ 'ھاں' وہ انھیں سے شادی کرنا چاھتی ھے اور وہ ان کی کسی قسم کی برائی کو نہیں سن سکتی' - آخر میں دونوں کی شادی ھوتی ھے - جہاں حسن' کام‌دیو کے پھول اور بہار کا موسم فتح نہیں پاسکے وھاں پاربتی کی ریاضت فتح پاتی ھے - اس میں سے

ایک ایک سین کالی‌داس نے جس فن اور استادی کے ساتھ جس میٹھی، نازک، پرلطف چلبلی اور شفاف زبان میں جس ادبی حسن کے آخری درجے کے معیار میں کھینچا ہے وہ لاجواب ہے۔ آخر میں جب شیوجی شادی کے لیے راضی ہوجاتے ہیں تو کالی‌داس نے ایک ایسی میٹھی سی چٹکی لی ہے جس سے ان کی زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں :-

''तस्मिन् संयमिनामाधे जाते परिणयोन्मुखे ।
जहु : परिग्रह ब्रीडाँ प्राजापत्यास्पीखन, ॥

یعنی جب شیوجی جیسے دل پر قابو رکھنے والے بڑے رشی شادی کرنے کے لیے تیار ہوگئے تو بچارے چھوٹے رشیوں کی جو شادی کرنے میں شرماتے تھے۔ شرم چلی گئی۔ وہ کہنے لگے کہ جب شیوجی نے شادی کرلی تو ہم شادی کرنے میں کیوں شرم کریں اس میں جو لطیف مذاق اور زندہ دلی ہے اسے آپ محسوس کرسکتے ہیں۔

ان کی 'رت سنہار' کتاب میں ہندستان کے تمام موسموں کی بڑی شستہ زبان میں تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس کے انگریزی میں بہت سے ترجمے ہوئے ہیں اور اسی کے نمونے پر بعد میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد کالیداس کی اس کتاب پر آتا ہوں جو دنیا کی ادبی تصانیف میں سے ایک ہے اور وہ ہے 'میگھ دوت'۔ اگر کالیداس اپنی زندگی میں صرف ایک یہی کتاب لکھتے تو بھی وہ سنسکرت زبان کے سب سے بڑے شاعر کہلاتے۔ اس کا تخیل بالکل اچھوتا ہے۔ اس کی زبان اتنی بےساختہ اور منجھی ہوئی ہے کہ اس کی بحر بھاری بھاری بادلوں کی سست چال سے چلنے والی ہے اور اس میں جو نغمہ ہے وہ نکلتا تو بحر میں سے ہے لیکن جب وہ شعر کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کا اثر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ میگھ دوت میں جس طرح یکش "آساڑھ کے پہلے دن کے بادل کو اپنے محبت کا سندیسا دیتا ہے، جس طرح اسے اپنے گھر تک پہنچنے کا راستہ بتاتا ہے، جس طرح اپنے گھر اور اپنی بیوی کی پہچان بتاتا ہے، جس طرح اس سارے راستے کا بیان کرتا ہے، جہاں سے

بادل جائے گا اور مختلف جگہوں پر پہنچنے سے بادلوں کا جو دیکھنے کے لایق نظارہ بنے گا اس کی جھلک کو دکھاتا ہے اور پھر اپنے دل کی حالت اور وہ سندیسا جو لکھا تو ضرور سنسکرت زبان میں گیا ہے لیکن ہر دل ہر زبان اور ہر دیس کے لیے یکساں ہے ۔ میگھ دوت کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کس کمال تک پہنچ سکتی ہے ۔اگر کبھی ادبی دنیا کے عجائبات گنے جائیں گے تو ان میں میگھ دوت بھی ایک ہوگا ۔

کالیداس کے بعد اشوگھوش آتے ہیں۔ انھوں نے بدھ چرت لکھا ہے جو پورا نہیں ملتا ۔ اس میں انھوں نے تمام بدھ کی زندگی نظم میں لکھی ہے ۔ اس کی زبان پرلطف اور بالکل سادی ہے ۔کہتے ہیں کہ ان کے لکھے ہوئے ایک ڈراما کا مسودہ ملا ہے لیکن وہ بھی پورا نہیں ہے ۔ اشوگھوش کے بعد بہت سے شاعر ہیں ۔ ان میں بھٹی کا نام مشہور ہے ۔ انھوں نے بھٹی کاویہ نام کی مشہور کتاب لکھی ہے ۔ اس میں لکھی تو انھوں نے رام کی زندگی ہے لیکن ایسے زبان میں لکھی ہے جس سے سنسکرت کے عام قواعد کا ۔ استعاروں کا ، بلاغت کا آسانی سے علم ہوجائے ۔ اسی وجہ سے یہ کتاب سنسکرت کے ادب میں مشہور ہے ۔ بھٹی کے بعد بہت سے شاعر ہوئے لیکن جس شاعر نے سنسکرت میں ایک انوکھی چیز پیدا کی اس کا نام بھاروی ہے ۔ ان کی صرف ایک کتاب ملتی ہے ۔ اس کا نام ’کرات ارجونیہ‘ ہے ۔ اس کے اٹھارہ باب ہیں ۔ اس کی کہانی مہابھارت سے لی گئی ہے لیکن شاعر نے اسے اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ اس کی اپنی بن گئی ہے ۔ سنسکرت میں بھاروی اس لیے مشہور ہیں کہ وہ جو بات کہتے ہیں وہ بڑی گہری اور وزن‌دار ہوتی ہے ۔ اس نے ایسے بہت سے مصرعے لکھے ہیں جو کہاوتوں کی شکل میں بدل گئے ہیں ۔ اتنے پر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ سنسکرت کے ادب میں بھاروی کی جو عزت ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی کہانی کا خاکہ مہابھارت سے لیا ہے تو بھی اس نے اس میں تازگی اور نیا پن پیدا کرلیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ’گیتا‘ کے بعد سنسکرت کے ادب میں اگر کوئی کتاب ہے جو ایک انسان میں مردانگی کے جذبات پیدا کرسکتی ہے تو وہ بھاروی کی کرات ارجونیہ ہے اس کا پہلا

باب یہاں سے شروع ہوتا ہے ۔ یُدھشٹر نے اپنے ایک جاسوس کو بھیجا ہے کہ پتہ لگا کر آؤ کہ دریودھن کس طرح راج کررہا ہے ۔ جاسوس آتا ہے اور تمام خبریں سناتا ہے پاس میں درویدی بیٹھی ہوئی تمام حالات کو سن رہی ہے' سنتے سنتے اسے اس وقت کا خیال آجاتا ہے جب کہ وہ راجا تھے۔ جاسوس کے چلے جانے کے بعد درویدی یُدھشٹر سے کہتی ہے کہ ہم وہی ہیں جو راج محلوں میں رہتے تھے اور آج جنگلوں میں پڑے ہیں ' ہمیں صبح اٹھانے کے لیے نگاڑے (نقارے) اور طرح طرح کے باجے بجتے تھے ' بھاٹ اور بندی گانے گاتے تھے لیکن آج گیدڑوں کی کان پھاڑنے والی چلاہٹ ہمیں روز صبح جگاتی ہے ۔ اے راجا تم لڑائی کرو اور اپنا راج واپس لو اور اگر یہ نہیں ہوسکتا تو ڈاڑھی اور جٹائیں بڑھالو اور دنیا ترک کردو ' کشتری کہلانا بند کردو ۔ اسی طرح اگلے باب میں بھیم‌سین اسی طرح کی باتیں کرتا ہے ۔ تیسرے باب میں جب ارجن ہتھیاروں کو حاصل کرنے کے لیے جانا چاہتا ہے اس وقت کا سین شاعر نے خوب کھینچا ہے ۔ درویدی بالوں کو کھولے ہوئے ارجن کو دروازے تک پہچانے کے لیے آتی ہے اور کہتی ہے :

"दुश्शासनामर्स रजो विकीर्ण-
रेभिस्सना थैरिव भाग्यनाथै : ।
केशै: कदर्थीकृत वीर्यसार :-
कच्चित् स एवासि धनञ्जयस्त्वम्" ॥

یعنی کیا تو وہی ارجن ہے جس کی باہوں کی طاقت کے سامنے دشاسن نے میرے ان بالوں کو میرے پتیوں کے ہوتے ہوئے مجھے اناتھ سمجھ کر غصے میں آ کر کھینچا تھا اور تم چوں نہیں کرسکے تھے ۔

اس کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے ہیں اور شاعر کہتا ہے کہ ارجن ان آنسوؤں کو اپنے راستے کی توشے کی طرح اپنے ساتھ لے گیا ۔ اس کتاب کا سب سے پر زور باب گیارھواں ہے ۔ اس میں جو باتیں کہی گئیں ہیں ان سے بھاروی نے سنسکرت کے ادب میں ہمیشہ کے لیے جگہ قایم کرلی ہے ۔ ان کے اس باب کے شعروں اور شلوکوں میں وہ گرمی بھری ہوئی ہے کہ شاید کبھی آگ بھی ٹھنڈی پڑسکتی

ہے لیکن اس کے شعروں میں جو آگ ہے وہ کبھی بجھ نہیں سکتی۔ بھاروی کا کرات ارجونیہ انسان کو سمجھ دار اور بہادر بنانے والا ہے۔

بھاروی کے بعد ماگھ آتے ہیں۔ ماگھ جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بڑے سنسکرت زبان کے عالم تھے۔ ان کو سنسکرت زبان پر جتنا عبور حاصل تھا بہت کم کو ہوا ہے ان کی ایک کتاب ملتی ہے جس کا نام شیشوپالی‌ودھ ہے۔ اس کی کہانی کا خاکہ بھی مہابھارت سے لیا گیا ہے۔ ماگھ کے بارے میں سنسکرت میں یہ شعر مشہور ہے:

"नव सर्गे गते माघे नव शब्दो न विद्यते"।

یعنی اگر کوئی شخص ماگھ کی کتاب کے نو باب پڑھ جائے تو اسے سنسکرت میں کوئی نیا تلفظ ہی نہیں ملےگا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت زبان پر ان کو کتنا عبور حاصل تھا۔ اس کتاب کے بیس باب ہیں۔ ماگھ کا طرز بیان پرزور اور اس کی زبان شستہ اور بامحاورہ ہے۔

ماگھ کے بعد کئی شاعر ہوئے لیکن ان میں سے شری ہرش کا نام بہت مشہور ہے۔ انھیں نے نیشدھ چرت نام کی مشہور کتاب لکھی ہے۔ اس کے لیے انھیں بہت سا مسالہ مہابھارت سے ملا ہے۔ نل اور دمینتی کی کہانی کو جو اہمیت ہے وہ نیشدھ چرت کی وجہ سے ہے۔ اس کے بائیس باب ہیں لیکن کہتے ہیں کہ شری ہرش نے ساٹھ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک سو بیس باب لکھے تھے۔ شری ہرش نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ جس طرح ایک حسین عورت ایک بچے کے دل کو نہیں کھینچتی اسی طرح میری شاعری کا لطف معمولی آدمی نہیں اٹھاسکتے۔ شری ہرش کو اپنی زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے کئی شلوکوں کے بتیس اور اس سے بھی زیادہ معنے نکالے جاتے ہیں۔

اس طرح ہم بارھویں صدی تک آپہنچتے ہیں۔ میں نے صرف بڑے بڑے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بیچ میں اور ان کے بعد بہت سی شاعری کی چھوٹی بڑی، کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے کئی بہت زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ جیسے

بھرتری ہری کی تین شتکیں ہیں - 'نیتی شتک'، 'شرنگار شتک' اور 'ویراگیہ شتک'، شتک کے معنی ہیں سو - یعنی جس میں سو شلوک ہوں - اسی طرح بہت سے ستوتر قصیدے وغیرہ سنسکرت میں لکھے گئے جن سے زبان منجھتی چلی گئی - زبان کی ترقی اتنی ہو چکی تھی کہ شاعر لفظوں کو بڑی خوبی سے لکھنے لگے چاہے اس کے معنے میں کوئی خوبی پیدا نہ ہو، لیکن لفظوں کی کچھ ایسی بناوٹ ہو جس سے بہت سے معنے نکل آئیں - یہ بات تب ہی ممکن ہے جبکہ زبان پختہ ہوجائے - وہ ایسی حالت کو پہنچ جائے کہ اس میں اتنا لچکیلا پن آجائے کہ جدھر چاہیں موڑ لیا جائے اور اس سے جو اور جتنے معنے چاہیں نکال سکیں - اس شاعری کا نہ سہی لیکن لفظوں کا بہت بڑا فن ہے کہ بات تو کچھ نہ ہو لیکن لفظ ایسے ہوں کہ اس سے سیکڑوں معنی پیدا ہوجائیں - اس فن میں راگھو پانڈویہ کے مصنف کوی‌راج نے کمال حاصل کیا ہے - یہ کتاب اسی شلوک میں لکھی گئی ہے جس میں راماین اور مہابھارت لکھی گئی ہے - لکھنے کا یہ کمال ہے کہ دونوں مہابھارت اور راماین ایک ہی شلوک میں سے نکل آتی ہیں اور پھر مزہ یہ کہ لفظوں میں کچھ کھینچ تان نہیں کرنی پڑتی -

کچھ بھی ہو اس طرح کی شاعری میں جذبات کا مزہ نہیں مل سکتا اور اس طرح زبان پیچدار الجھنوں والی بنتی چلی گئی - لکھنے والوں کے پاس خیالات نہیں تھے جذبات نہیں تھے - تھی سو ایک زبان - اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا لفظوں پر ہی شاعری کا دارومدار تھا - اس طرح سیکڑوں چترکاویہ سنسکرت میں بن گئے؛ جیسے لکڑی پر نقاشی کی جاتی ہے اسی طرح یہ ایک قسم کی لفظوں کی نقاشی تھی -

ہم سمجھتے ہیں کہ تیرھویں صدی تک سنسکرت کے ادب میں اسی طرح کا سلسلہ چلتا رہا - لیکن اس کے بعد ہندستان کے حالات میں فرق پڑا اور اس کا اثر سنسکرت زبان میں بھی دکھائی دیتا ہے - حالات کے بدلنے سے سنسکرت کی شاعری میں بھی تبدیلیاں ہوئیں - میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ فارسی کا اثر تھا - فارسی کے مطالعہ سے سنسکرت میں نئی بحریں پیدا ہوئیں قافیہ اور ردیف بھی سنسکرت کی شاعری میں داخل ہوا اور اس کی وجہ سے سنسکرت میں ایک نیا سنگیت پیدا ہوگیا -

شاعری میں نئے انداز پیدا ہوگئے اور نئے خیالات کا بھی اثر پڑا اور طرز میں فرق پڑ گیا - پہلے وَرن چھند یعنی لفظوں کی بحریں زیادہ مروج تھیں پھر ماتراچھند یعنی بحریں حرفوں پر نہیں بلکہ علامتوں کی گنتی پر آ گئیں - پہلے بحروں میں قافیہ ردیف نہیں تھے' بلینک ورس تھی یعنی نظم عاری اب نظم میں ردیف' قافیہ بھی جاری ہوگئے - اسے انتیہ انوپراس کہتے ہیں -

میں سمجھتا ہوں کہ آریا سپت شتی میں آریابٹر میں جو دو دو سطروں میں ایک ایک مضمون باندھا گیا ہے اس میں بھی شاید فارسی کے شعروں کے انداز کا کچھ اثر تھا - انھیں سپت شتی میں سے ہندی "ستسیان" بنیں - دو دو سطروں یا چار سطروں میں ایک مضمون باندھا جانے لگا - آریا بحر کی جگہ دوھوں کا استعمال ہوا - پنڈت راج جگناتھ کے بھامنی ولاس میں بھی اس کا کچھ اثر دکھائی دیتا ہے - کبھی وہ تالاب' کبھی بھنورے' کبھی پھول' کبھی ہوا' کبھی ہنس یا طوطے کو تعاقب کرکے ایک ایسا شلوک لکھ دیتے ہیں جو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر صادق آجاتا ہے - یہ شاہجہاں کے دربار کے شاعر تھے اور داراشکوہ ان کے سرپرست تھے -

سنسکرت میں جو نیا سنگیت بحر اور قافیہ اور ردیف جاری ہوئے وہ جَےدیو کے گیت گووند میں نظر آتے ہیں - یہ بنگال کے رہنے والے تھے - کہتے ہیں کہ یہ راجا لکشمن سین کے درباری شاعر تھے - ان کو بارھویں یا تیرھویں صدی کا شاعر کہا جاتا ہے - انھوں نے سنسکرت میں جس سنگیت کو جاری کیا وہ بالکل نیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے بحروں پر نیا اثر پڑا ہے - سنگیت کے لحاظ سے سارے سنسکرت کے ادب میں گیت گووند کے جوڑ کی دوسری کتاب نہیں ہے -

میں نے اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سنسکرت کی ادبی زبان کس طرح پیدا ہوئی' اس کی شاعری کا ارتقا کس انداز پر ہوا اور کن بڑے شاعروں نے اسے ایسی شکل دی کہ وہ آگے آگے ترقی کرتی چلی گئی - میں نے اس مضمون میں سنسکرت کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر کچھ نہیں لکھا ہے - خاص کر قصہ کہانی' سنسکرت کی نثر اور اس کا ارتقا اور نثر کے بہترین لکھنے والوں

کے بارے میں بھی میں نے کچھ نہیں لکھا - پھر قصہ کہانی بھی ایک قسم کی نہیں، بہت قسم کی ہیں - ان میں سے کئی قصوں کا اثر تو قریب قریب دنیا کی ہرایک زبان پر پڑا ہے - کبھی وقت ملا تو میں ان کے بارے میں سلسلہ‌وار اپنے خیالات آپ کے سامنے پیش کروں‌گا - اس مضمون میں تو میں نے سنسکرت زبان اور اس کی شاعری کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے -

(یہ مقالہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے کوآپریٹیو یونین میں پڑھا گیا تھا -)

مقالات گارساں دتاسی

(۲)

(ترجمہ از پروفیسر عزیز احمد صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن)

۴۔ سرکاری سررشتۂ تعلیم کو ہندستان نے بالکل اپنا لیا ہے۔ ہندستانی اس کے عادی ہوچکے ہیں اور اسے خوشی سے قبول کرچکے ہیں۔ ثبوت کے لیے میرے پاس اودھ کی پرانی حکومت کی مثال موجود ہے جس کی رپورٹ (سنہ ۱۸۷۱ع و سنہ ۱۸۷۲ع) مجھے اس محکمے کے ناظم مسٹر کولن براوننگ (Colin Browning) نے بھیجی ہے۔ یہ رپورٹ جو بڑی احتیاط سے مرتب کی گئی ہے اور جو فولیو تقطیع کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اودھ کے سررشتۂ تعلیم کی اصلی حالت کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ میں یہاں ان تمام تفصیلات کو نقل کروں جو انھوں نے پیش کی ہیں اور جن میں انھوں نے میرے «مقالات» کے طریقۂ بیان کو پسند کیا ہے، لیکن ان میں سے چند اطلاعات اس قابل ہیں کہ میں نے انھیں اپنی یادداشت میں درج کرلیا ہے۔ مثلاً یہ کہ زمانے میں تعلیم کا رواج ہوتا جارہا ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جو بہت مفید اور قابل تعریف ہے اور ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم ہمارے یہاں کے اس طرز تعلیم سے بہت ملتا جلتا ہے جس کو ہم "Lecon particulières" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ خانگی طریق تعلیم عام نسوانی مدارس کی ترقی میں حارج نہیں ہوتا۔ اس طریقے سے جو عورتیں تعلیم پاتی ہیں ان کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو نارمل اسکولوں کی تعلیم‌یافتہ معلّمات کی۔

بنگال میں بھی پردہ‌نشین خواتین میں تعلیم بہت ترقی کررہی ہے۔ پندرہ سو سے زیادہ خواتین اپنے گھروں ہی میں روزانہ سبق لیتی ہیں ان میں سے زیادہ‌تر ان

ہندستانیوں کی بہو بیٹیاں ہیں جنھوں نے سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے یا مشنریوں کی بیویاں اور لڑکیاں ہیں۔ شمالی ہندستان میں بھی تعلیم نسواں کی یہی حالت ہے[1]۔

'اینگلو ورنیکلر مڈل کلاس' اسکول جن کا مقصد یونیورسٹی کے ایسے ایسے طلبہ کو تیار کرنا ہے جو انگریزی میں جوابات نہیں دینا چاہتے ہیں گورنمنٹ کے عطیہ کی مدد سے امریکن اور انگریز مشنریوں کی زیر نگرانی قائم ہیں اس سہولت کی وجہ سے ان ہندستانیوں کی تعداد جو انگریزی سیکھ رہے ہیں گھٹ گئی ہے۔ لیکن گورنمنٹ نے اپنے وعدے کے مطابق ان اسکولوں کے تعلیم‌یافتہ لوگوں میں سے دو سو نو کو ملازمتیں دی ہیں۔

بہ‌کثرت طلبہ اردو اور ہندی سیکھ رہے ہیں۔ فارسی' عربی اور سنسکرت کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے۔ مسلمان جن پر اکثر الزام عاید کیا جاتا ہے' ہندوؤں سے زیادہ ان ذرایع تعلیم سے فائدہ اٹھارہے ہیں جو حکومت نے فراہم کیے ہیں۔ ہندو طلبہ کی تعداد چالیس ہزار تین سو پچپن ہے اور مسلمان طلبہ کی تیرہ ہزار نو سو اٹھارہ یعنی ایک چوتھائی سے زیادہ حالانکہ اودھ میں مسلمانوں کی آبادی پوری آبادی کے دسویں حصے سے بھی کم ہے۔ صرف اس ایک صوبے میں مختلف ذرایع سے سرکار نے اس کام کے لیے دو لاکھ تینتیس ہزار تین سو تینتالیس روپے عطا کیے ہیں۔ ہائی اسکول بھی ابتدائی اور ثانوی مدارس کی طرح ترقی کررہے ہیں۔ زبانوں کی حد تک پتہ چلتا ہے کہ انگریزی اور اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمہ ہوتا رہتا ہے' نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ اردو سے انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے اور ہندی اور فارسی کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ سنہ ۱۸۷۱ع کے ختم تک ان مدارس فوقانیہ میں دو ہزار دو سو طلبہ زیر تعلیم تھے جن میں سے آٹھ سو ستتّر مسلمانوں کی تعداد ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کلکتہ یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان کی تیاری کررہے تھے۔

---

1 Indian Mail ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

جن مقامات پر اعلیٰ درجہ کے سرکاری مدارس موجود ہیں وہاں محض واقعات کی رفتار کے باعث دیسی مدارس بند ہوتے جارہے ہیں - پھر بھی ان کی تعداد اچھی خاصی ہے - صرف لکھنؤ میں چوراسی کے قریب ایسے مدارس موجود ہیں -

صوبجات شمال مغربی میں تعلیم کو ہمیشہ فروغ حاصل رہا ہے - ڈیوک آف آرگائل نے الہ آباد کے مرکزی کالج کے قیام کی منظوری دی ہے جس کی بنیاد پڑچکی ہے[1] -

سررشتۂ تعلیم صوبۂ بمبئی کی رپورٹ بابت سنہ ۱۸۷۱-۷۲ع سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں مدارس کی تعداد میں چھے سو چالیس کا اضافہ ہوگیا ہے اور طلبہ کی تعداد میں بیس ہزار آٹھ سو ستاسی کا - چودہ ملین آبادی کے لیے تین ہزار چھے سو اٹھانوے مدارس موجود ہیں جن میں اٹھانوے ہزار نو سو ستر طالبعلم تعلیم پاتے ہیں -

پونا کا سول انجنیرنگ کالج جس کا رپورٹ میں ذکر ہے، طبی کالج، کلیۂ قانون فنون کے کالج اور مدارس اور دیگر تمام ادارہ جات علم بہت اچھی حالت میں ہیں -

حیدرآباد دکن میں سر سالار جنگ نے ایک بہت قابل مسلمان عنایت الرحمن خاں کو جو پہلے دہلی کالج میں پروفیسر تھے، ناظم تعلیمات مقرر کیا ہے[2] -

میسور میں جو کالج آنجہانی مہاراجا نے قایم کیا تھا اس میں اب پانچ سو سے زاید طلبہ ہندستانی، کنڑی اور انگریزی کی تعلیم پارہے ہیں - گزشتہ مارچ کی پہلی تاریخ کو جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کرنل میلسن[3] (Malleson) نے کی تھی - انھوں نے اعلان کیا کہ نوجوان مہاراجا نے نوے روپے کی دو تھیلیاں عطا فرمائی ہیں اور وہ خود اسی طرح کی تین اور ان نادار طالبعلموں کی مدد کے لیے دینے

---

۱ علیگڑھ اخبار مورخۂ ۲۴ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع -

۲ ان صاحب کے متعلق ایک مضمون میری ''تاریخ ہندوی و ہندستانی'' میں ملاحظہ فرمائیے -

۳ Allen's Indian Mail ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع -

والے ہیں جن کے امتحانات کے نتایج اچھے رہے - انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی مسلّمہ قابلیت رکھنے والا ہندستانی نوجوان اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے انگلستان جانا چاہتا ہے تو وہ خود اس کے ذرایع فراہم کریں گے[۱] -

مہاراجا بلرام پور نے سالانہ بارہ ہزار روپیہ کا عطیہ ایک میڈیکل کالج کے قیام کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے - کالج کا تعلق بلرام‌پور ہسپتال لکھنؤ سے رہے گا[۲] -

ہندستان میں تعلیمی ترقیوں کی رفتار مستقل ہے - سنہ ۱۸۷۰ع کے بعد سے ایک ملین سے زیادہ طلبہ سرکاری مدارس میں زیر تعلیم ہیں اور چونکہ ہندستان کی تین چوتھائی آبادی اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی استطاعت نہیں رکھتی اس لیے ان طلبہ کی تعداد جو تعلیم پارہے ہیں اس لحاظ سے اچھی خاصی ہے - تمام مدارس سرکاری نگرانی میں ہیں - ان میں خاص مدارس، امدادی مدارس، ''ورنیکلر'' مدارس، قانون، طب، انجنیرنگ کے مدارس اور نسوانی مدارس شامل ہیں - ان موخرالذکر مدارس کا وقت آنے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی خانگی زندگی پر بہت اہم اثر پڑے گا - صرف بنگال میں سنہ ۱۸۶۹ع میں لڑکیوں کے لیے دو سو چالیس مدارس تھے جن میں نو ہزار پینتیس طالبات تعلیم پاتی تھیں- ختم سال سنہ ۱۸۷۰ تک بمبئی میں سڑسٹھ ہزار نو سو چار لڑکے اور لڑکیاں مدارس میں تعلیم حاصل کررہی تھیں- اسی سال صوبۂ شمال مغربی میں دو لاکھ ایک ہزار لڑکے اور دس ہزار لڑکیاں زیر تعلیم تھیں - چند سال سے صوبۂ متوسط میں طلبہ کی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے - کلکتہ یونیورسٹی میں جو لندن یونیورسٹی کے نمونے پر قائم کی گئی ہے، سنہ ۱۸۶۶ع میں پندرہ ہزار کے قریب طالب علم تھے اور اب تو ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا ہے - انھیں نتائج کے باعث بمبئی اور مدراس میں بھی یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں - ہندستان کا سب سے زیادہ سرسبز تعلیمی ادارہ غالباً کلکتہ کا میڈیکل کالج ہے جو سنہ ۱۸۳۴ع میں سر ولیم بینٹنگ (Sir William Bentinck) کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا - اس کا

---

۱ علیگڑھ اخبار ۲۸ فروری سنہ ۱۸۷۳ء - ۲ Allen's Indian Mail ۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ع -

سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ جو طالب علم اپنی ذات پات اور تعصبات کو چھوڑ دیتے ہیں انھیں اس کے ذریعے اپنی فنی قابلیت سے عوام‌الناس کو فائدہ پہنچانے کا موقع دیا جاتا ہے۔

لاہور کا میڈیکل کالج بھی ترقی کر رہا ہے اور حیدرآباد دکن کے مدرسۂ طبیہ سے جس میں پوری تعلیم ہندستانی میں دی جاتی ہے، دو نہایت معزز خاندانوں کے چشم و چراغ نوجوانوں نے ڈاکٹری کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کے وزیر سالار جنگ نے ایک خاص دربار میں جو اس موقع کے لیے ۱۴ فروری سنہ ۱۸۷۳ع کو منعقد کیا گیا تھا، ان کو اسناد عطا کیں[۱]۔

صوبۂ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات مسٹر کیمپسن (Kempson) نے ان مدارس کے لیے جو سرکاری امداد کے طالب ہیں کچھ شرائط مقرر کی ہیں اور ان کے لیے اس طرح کے آئین و ضوابط بنائے ہیں جن میں ہر ذرا سی تفصیل کو پیش نظر رکھا ہے[۲]۔

اندور کا مدرسہ ترقی کر رہا ہے۔ چار سال کے اندر طلبہ نے انگریزی کی تحصیل میں اتنی ترقی کی ہے جس کی نظیر اس کے پہلے چھے یا سات سال میں نہیں ملتی۔ ہندی سے غافل ہوئے بغیر وہ انگریزی لکھ بول سکتے ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں ان کے رہبر پنڈت دھرم‌نارائن ہیں جو اس ادارے کے میر منشی ہیں اور دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں[۳]۔

اسلامیہ کالج امرتسر کی حالت جو حال ہی میں قایم ہوا ہے، امید افزا ہے۔ تعلیم پانچ جماعتوں پر منقسم ہے جن میں بتدریج تقریر، خفی اور جلی خوشنویسی قرآن و تفسیر، انشائے اردو و فارسی، گلستان بوستان اور قصاید عرفی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ جماعتوں کے بےاستطاعت طلبہ کی کھانے کپڑے سے مدد کی جاتی ہے۔ مزید معلومات کے لیے پرنسپل صاحب کی مہیا کی ہوئی اطلاعات ملاحظہ فرمائیے[۴]۔

---

۱ انڈین میل یکم اپریل سنہ ۱۸۷۳ع۔

۲ Supplement to the Institute Gazette ۴ جون سنہ ۱۸۷۳ع۔

۳ اخبار انجمن پنجاب ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع۔

۴ پنجابی۔ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

چونکہ اس کالج کو کھلے ایک سال ہوچکا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو علم اور مذہب کی ترقی کے طالب ہیں اس کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں تاکہ اس ادارے سے انھیں اطمینان حاصل ہو اور وہ اس کے استحکام اور ترقی کی کوشش کریں ۔ پس معلوم ہوا کہ بحمداللہ اس کالج کا افتتاح ماہ مبارک رمضان سنہ ۱۲۸۸ھ (دسمبر سنہ ۱۸۷۱ع) میں ہوا ۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی وہ اعلی تعلیم ہے جو روحانی اور دنیوی کمال تک پہنچائے اور ان لوگوں کے لیے جو مختلف وجوہات سے یا محض سہل انگاری کی وجہ سے قعر جہالت میں گرے ہیں اور اسی طرح پڑے ہوئے ہیں کہ حکام وقت ان کو ملامت کرتے ہیں، علم کی تحصیل اور اس کے نور کے ذریعے فائدہ رسانی کا باعث ہو ۔ دو پروفیسر فارسی اور ریاضی سکھاتے ہیں ' ایک حافظ قرآن کی تدریس پر مامور ہے اور علوم عربیہ کی تعلیم کالج کے ڈائرکٹر کے سپرد ہے ۔

"ابتدا میں محض چند لڑکے عربی پڑھتے تھے اور آمدنی کے ذرایع بہت کم تھے ۔ لیکن خدا کے فضل سے کچھ عرصے کے بعد کافی تعداد میں طلبا تعلیم پانے لگے اور اخراجات کے لیے چندے وصول کیے گئے ۔ اس کالج کے افتتاح کی اطلاع کی ہر جگہ تشہیر کی گئی تھی اور توقع تھی کہ اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلےگا پھر بھی بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے جن کی تفصیل بہت طویل ہے' شروع میں جس ترقی کی امید تھی حاصل نہ ہوسکی' نہ چندے وصول ہوئے اور نہ کافی تعداد میں طالب‌علم شریک ہوئے ۔ لیکن خدا کی رحمت لامتناہی ہے' استقلال کو کام میں لایا گیا اور طالب‌علم شریک ہوتے گئے اور درس لیتے گئے ۔ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور لفظ بہ لفظ ہندستانی میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں اور تاریخ اسلام اور عربی زبان کی تعلیم پاتے ہیں (۷۳) طالبعلموں کے نام رجسٹر میں درج ہیں جن میں سے ۲۳ شہر سے باہر کے رہنے والے ہیں باقی شہر کے ہیں ۔ چندے بھی کافی تعداد میں وصول ہوئے ہیں ۔"

مولوی سیداحمد خاں کی تجویز کہ علی گڑھ میں مسلمانوں کے لیے ایک عظیم‌الشان کالج قائم کیا جائے اب تک کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن وہ ہے راہ مستقیم پر اور بہت جلد «یونیورسٹی» کا لقب اختیار کرلے گی۔ اس مشہور مسلمان کی ان تھک کوششوں کے طفیل اس ادارے کے لیے چندے کی تعداد گزشتہ مئی تک بہتّر ہزار روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔ پھر بھی یہ رقم ناکافی ہے جیسا کہ سید صاحب نے اپنی تقریر میں جو اسی زمانے میں کی تھی بیان کیا تھا۔ اس پُرجوش مصلح کا مقصد کئی لاکھ روپے جمع کرنے کا ہے جن کا فراہم کرنا بہت دشوار ہوگا کیونکہ جو لوگ فطرت انسانی سے واقف ہیں انھیں یہ معلوم کرکے تعجب نہ ہوگا کہ اس برگزیدہ انسان پر بھی جس نے اپنے آپ کو اپنے ہم‌مذہبوں کے مذہبی اور دنیوی مفاد کے لیے وقف کردیا ہے بعض لوگ تہمتیں عاید کرتے ہیں۔ اس بحث پر علی گڑھ اخبار[1] نے ایک عربی شعر نقل کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے «جو درخت زمین سے یوں ہی اُگ نکلتے ہیں وہ تو بھلے چنگے رہتے ہیں مگر لوگ اسی درخت کو پتھر مارتے ہیں جو بارآور ہوتا ہے»۔

ان تمام حملوں کی طرف توجہ کیے بغیر جو اس پر کیے جاتے ہیں، یہ مرد مسلمان اپنے راستے سے نہیں ہٹتا اور اپنے خیالات پر قائم ہے۔ نوروز سال ہجری سنہ ۱۲۹۰ھ (مطابق ۲۸ فروری سنہ ۱۸۷۳ع) کے موقع پر اس نے ایک مضمون لکھا جو ۱۴ مارچ کے علی گڑھ اخبار کے بارہ کالموں پر مشتمل ہے۔ جابجا دلچسپ حوالے ہیں۔ اس کا مقصد ہندستان کے تیس ملین مسلمانوں کو جوش دلانا ہے کہ وہ اپنی مذہبی، علمی اور ادبی پستی کو چھوڑیں اور ایک عظیم‌الشان اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد کا خواب دیکھیں جس میں ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم کے ذریعے ان کی ذہنی زندگی نشوونما پائے گی۔

کمیٹی کے ان ارکان میں جن کا کام انگلستان میں چندہ وصول کرنا ہے جہاں یہ کام ہمدردی سے کیا جارہا ہے، خصوصیت سے قابل ذکر میرے دوست

---

۱ شمارۂ ۲۳ مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔

ٹی ۔ ایچ لارڈ اسٹینلے آف آلڈرسلی (T. H. Lord Stanley of Aldersley)، سر چارلس ٹریولین (Sir Charles Trevelyan) اور مسٹر ایڈورڈ ٹامس[1] (Mr. Edward Thomas) ھیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چندے کی وصولی میں کامیابی کا سہرا ان لوگوں کے سر رھےگا ۔

ایک اور تجویز پٹنہ میں مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی یا اعلی پیمانے پر ایک کالج کھولنے کی ھے ۔ صوبۂ بہار میں مسلمان بڑی کثرت[2] سے آباد ھیں اور اردو بولتے ھیں[3] ۔

بنگلور ضلع سہارنپور میں حال ھی میں ایک مدرسۂ اسلامی کا افتتاح کیا گیا ھے جس کے لیے چندے کی کوشش کی جارھی ھے[4] ۔

ارکاٹ میں ایک ابتدائی مدرسے کے لیے جو خاص طور پر مسلمانوں کے لیے کھولا گیا ھے سرکاری اظہار خوشنودی کی اطلاع ملی ھے[5] ۔

حکومت پنجاب ان کتابوں کے مضامین اور طرز نگارش کی طرف سے غافل نہیں ھے جو مدرسوں کی درسیات میں داخل ھیں ۔ ایک کمیٹی اس لیے مقرر کی گئی ھے کہ ان کتابوں کی جانچ کرے اور ان میں سے جو ناقص ھوں ان کی اصلاح کرے یا بجائے ان کے دوسری کتابیں تجویز کرے اور جو کتابیں ناقص قراردی جائیں‌گی ناظم تعلیمات ان کی اصلاح کرےگا[6] ۔ اس کمیٹی میں دو ھندو اور دو مسلمان شامل ھیں جو اپنی زبانوں میں بھی بہت قابل ھیں اور انگریزی میں بھی قابل ھیں ۔

صوبۂ شمال مغربی میں بھی ایک کمیٹی اسی غرض سے قایم کی گئی تھی کہ وہ نصاب کی کتابوں کی جانچ کرے ۔ مسٹر ایم۔ایس ھاول (M. S. Howell) جن کی

---

۱ علی‌گڑھ اخبار ۱۸ جولائی سنہ ۱۸۷۳ء ۔

۲ اس صوبے کی آبادی (۲۲۳۰۰۰۰۰) ھے جس میں سے (۱۰۰۰۰۰۰) مسلمان ھیں ۔ اخبار انجمن پنجاب ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع ۔ ۳ Blochmann, "School Geography of India." -

۴ اخبار انجمن پنجاب ۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۱۳ ع ۔ ۵ اخبار انجمن پنجاب ۱۰ جون سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

۶ بمبئی میں ناظم تعلیمات اس وقت تک کتابوں کو مدارس میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا جب تکہ وہ خود انھیں پسند نہ کرے ۔

قابلیت صرف اردو هی میں مسلّم نہیں بلکہ عربی و فارسی میں بھی مسلّم ھے، اس کے سکریٹری ھیں[1] ۔

حکومت بنگال نے بھی انھیں مقاصد کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی ھے ۔ اس کمیٹی میں مسٹر کولن براؤننگ (Mr. Colin Browning) ناظم تعلیمات، درگا پرشاد اور دو مشنری شامل ھیں ۔

مزید برآں جابجا عام کتب خانے کھلتے جارھے ھیں ۔ صرف صوبۂ بمبئی میں (۱۶۷) کتب خانے ھیں ۔ کئی مشہور ھندستانیوں کی کوشش سے بنارس میں بھی ایک کتب خانہ کھلا ھے[2] جس کے لیے مہاراجا وزیانگرم نے چھے هزار روپیہ کا عطیہ دیا ھے ۔

حکومت نے طے کیا ھے کہ ھندستان کی هر بڑی عدالت میں قانون کتب کا ایک کتب خانہ کھولا جائے[3] ۔ لندن میں ان ھندستانیوں کے لیے جو وھاں جاتے ھیں ایک کتب خانے کا افتتاح کیا گیا ھے اور وہ ابھی سے ھندستانی کتابوں سے مالامال ھے ۔

مسلمانوں کی بیداری نہ صرف علمی و ادبی نتائج بلکہ مذھبی اثرات سے بھی ظاہر ھورھی ھے[4] ۔ حکومت انگریزی بھی ان کی طرف عنایت کی نظروں سے دیکھ رھی ھے کیونکہ لارڈ نارتھ بروک (Lord Northbrook) نے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کے ذرایع اختیار کیے ھیں اور وہ اس طرح کہ ان کے لیے ادب اور تمدن اور اپنی السنۂ ماضیہ کی تحصیل کے ذرایع فراھم کیے ھیں ۔ بمبئی میں ان زبانوں کی تحصیل کا انتظام کیا گیا ھے، کلکتہ اور ھگلی میں مدرسے کھولے جارھے ھیں اور کئی اور مدرسے کھولنے کی تجویز ھے ۔ طالب علموں کے لیے رقمیں عطا کی گئی ھیں[5] ۔

---

۱ علی گڑھ اخبار ۱۹ اگست سنہ ۱۸۷۳ ع -

۲ علی گڑھ اخبار ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع اور پنجابی ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع -

۳ پنجابی ۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع ۔ علی گڑھ اخبار ۳۰ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع -

۴ اس سال میں چین کے مسلمانوں کے متعلق کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکتا جیسے کہ میں نے گزشتہ سال سنائی تھی کیونکہ نہ صرف یہ کہ صوبۂ یونان کی بغاوت فرو کردی گئی بلکہ پنتھائیوں کو مکمل شکست ھوئی اور وہ بہت بیدردی سے (بر حاشیہ ۶۴۴)۔

اس صدی کی ابتدا میں بنگال کے مسلمانوں ہندوؤں سے میل جول کی وجہ سے ضلالت کی حالت میں مبتلا تھے اور بہت سی قابل الزام رسمیں انھوں نے اختیار کرلی تھیں - مگر ادھر تین سال سے وہابیت کی اصلاحی کوششوں کے طفیل ہندستانی میں بکثرت مذہبی ادب ان کے لیے فراہم ہوسکا اور بہت سی عربی اور فارسی کتابیں عوام کے لیے عام فہم بناکر پیش کی گئیں اور اب پھر وہ مذہب میں پکے ہوتے جارہے ہیں - ہندوؤں کے عقیدے کا اثر ان پر بھی پڑا ہے لیکن باوجود اس کے کہ یہ مسلمان بھی ان ہندوؤں کی طرح مغربی تعلیم کی پیداوار ہیں پھر بھی مسلمانوں میں پیداواری طبعی طور پر پیدا ہوئی ہے اور عوام‌الناس میں پھیل رہی ہے - ایک نئی تصنیف جس کی خوبیوں کو ہمارا عیسائی تمدن پوری طرح تسلیم کرسکتا ہے، حضرت محمد کے متعلق حال ہی میں لکھی گئی ہے - سید امیرعلی[1] نے اس کتاب میں بجا طور پر محامد نبوت بیان کیے ہیں - اس کتاب کا نام "A Critical examination of the life and teachings of Mohammad" ہے - کتاب کے فاضل نوجوان مصنف مشہور شاعر ہند میرتقی کے بھتیجے ہیں - ان کا ارادہ مغلیہ سلطنت کے متعلق بھی ایک کتاب لکھنے کا ہے - اپنے گزشتہ "تبصرے"[2] میں مجھے ہندستانی کے متعلق ان کے خیالات شایع کرنے کا موقع ملا تھا - جب وہ ہندستان جارہے تھے تو راستے میں پیرس میں مجھے ان سے گفتگو کا موقع ملا اور اس زبان کے متعلق میرے خیالات میں ان کے مباحث کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی -

---

(بقیہ حاشیہ ۶۴۳)

تہ تیغ کیے گئے- چینیوں نے ان کے سردار سلیمان کو بھی قتل کردیا اور انھیں وحشیوں نے ان کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں اور ان کے مقلدین پر بھی بہت مظالم کیے -

• انڈین میل ۱۵ جولائی اور ۵ اگست سنہ ۱۸۷۳ ع-

۱- انڈین میل مورخۂ ۱۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ع میں اس ہندستانی نوجوان کے متعلق ایک دلچسپ مضمون نکلا ہے -

۲ La-langue et la litterature hindoustanies بابت سنہ ۱۸۷۲ ع صفحۂ ٦ و ۷-

اگرچہ ہندو مغربی علوم میں ترقی کررہے ہیں مگر خود اپنے علوم کی طرف کافی توجہ نہیں کررہے ہیں۔ علی گڑھ اخبار[1] میں ایک ہندو نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے۔ مسلمانوں کی یونیورسٹی کے قیام کی اطلاع نے اس کے جذبۂ حب وطن کو بیدار کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے: «ایک ملک میں جہاں علیحدہ علیحدہ دو قومیں موجود ہوں اگر ان میں سے ایک اپنی دماغی ترقی کی کوششیں کرتی رہے اور دوسری غافل رہے تو موخرالذکر قعر مذلت میں گر جائےگی۔ درحالیکہ ہمارے ہموطن مسلمان اپنے علوم کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ہم ہندو بدنصیبی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ اس عظیم ادارۂ تعلیم میں جس کو مسلمان قایم کررہے ہیں یوں تو سبھی انسانی علوم سکھائے جائیں‌گے لیکن خصوصیت سے مذہبی تعلیم پر توجہ کی جائےگی۔ بلکہ یہ کہنا ایک حد تک غلط نہ ہوگا کہ یہی مقصد ان کے پیش نظر ہے۔ مسلمان کے مذہبی علوم اسی حالت پر قایم ہیں اور اب پرانی شوکت کے ساتھ محض ان کی اشاعت کا سوال باقی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے علوم مذہبی کے محض نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی تقریباً معدوم ہیں۔ لیکن یہ حالات غفلت کا بہانہ نہیں بن سکتے' بلکہ ان کی وجہ سے وہ (ہندو) اور بھی زیادہ قابل الزام ہیں۔ کیا وہ یہ پسند کریں‌گے کہ ان کی ہموطن قوم ایک روز اپنے مذہب کی روشنی سے آزادی حاصل کرے اور وہ اسی طرح اس ملک میں جہاں انھوں نے ایسا شاندار ماضی گزارا ہے' ذلّت اور جہالت میں مبتلا رہیں؟»

«اڈیٹر صاحب! میں خود ہندو ہوں اور میرا طرز خیال مسلمانوں کا سا نہیں۔ سرکاری تعلیم سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں‌کہ وہ ضروریات دنیوی

[1] شمارۂ ۲۲ نومبر سنہ ۱۸۷۲ء۔

کے لیے ہے ۔ اپنی مذہبی تعلیم کی ذمہ‌داری خود ہم پر عاید ہوتی ہے اور ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے جو مجوّزہ اسلامی یونیورسٹی کے قایم کرنے والے مسلمان کررہے ہیں۔ ایک خاص مذہبی ادارۂ تعلیم قایم کرنے کے لیے ہمیں سرکاری ادارہ جات تعلیم سے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ پانچ یا چھے گھنٹے تک دنیوی علوم کی مسلسل تعلیم دینے کے بعد سرکار ایک گھنٹے کے لیے ہندو طلبا کو قابل پنڈتوں سے مذہبی تعلیم دلانے سے انکار نہیں کرسکتی۔ اوقات درس کے بعد ایک تو کیا کئی گھنٹے کی مذہبی تعلیم کا انتظام گورنمنٹ کی زیر نگرانی ہوسکتی ہے ۔ اس طرح ہم بھی خدا کی رحمت سے مستفید ہوسکیں‌گے اور ایک مستحکم اتحاد قومی کی بنیاد پڑسکےگی ۔

'' میں خوب جانتا ہوں کہ میں جس رائے کا یہاں اظہار کر رہا ہوں وہ فوری توجہ سے محروم رہےگی لیکن جس طرح نقّارخانے میں طوطی کی آواز بھی کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے اسی طرح مجھے توقع ہے کہ میرے ہم مذہب اس تجویز کو جو میں پیش کررہا ہوں دل سے قبول کریں‌گے اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ حکومت ہماری اس خواہش کو ناراضی کی نظر سے نہ دیکھےگی کہ ہم محض یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے تھوڑی بہت مذہبی تعلیم پا جائیں اسی طرح جیسے کہ اقامت‌خانوں میں انھیں پوجا کرنےکی اجازت ہے تاکہ وہ مغربی تعلیم کے اثر سے ان مذہبی اصول کو بھول نہ جائیں جو ان کے رہنما ہیں اور وہ سب ہندو جو اپنی ملت کی معاشرتی ترقی دیکھنا چاہتے ہیں اس تجویز کو پسندیدہ نظر سے دیکھیں گے''۔

''اخبار الاخیار'' مورخۂ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع میں پنڈت اندرا نراین سکریٹری انجمن کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جس میں انھیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اس خط میں جو پہلے ''اودھ اخبار'' میں شائع ہوا تھا جس میں اس کی بہت تائید کی گئی تھی' یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندستان کے ہر ضلع میں ایک کمیٹی قایم کی جائے جو ہندوؤں کے حقوق کے متعلق کام کرے اور ان کو حصول تعلیم

کے لیے ولایت بھیجنے کے لیے چندے فراہم کرے[1] اور ہندستان میں یتیم طالب علموں کے لیے مدارس قایم کیے جاسکیں۔

پنڈت اندرا نراین مرزا پور اور بنارس میں کمیٹیاں قایم کرچکے ہیں اور ان کی تقلید میں دو مشہور ہندوؤں نانک بخش اور مادھوپرشاد نے ایک کمیٹی پٹیالہ اور دوسری اودھ میں قایم کی ہے۔ سنٹرل کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں ہوگا۔ پنڈت جی کہتے ہیں کہ ہر طرح کی کوشش و محنت کی ضرورت ہے کہ ہندوؤں کا نام صفحۂ ہستی پر باقی رہ جائے۔ اس کے لیے صرف علوم و فنون کی تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ مذہبی عقاید کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے چندے فراہم کرکے سنسکرت کی قدیم کتابوں کے ہندی ترجموں کی اشاعت کی ضرورت ہے تاکہ لوگ ان کی پیروی کریں۔

بریلی کے مشہور ہندو بابو لکشمی نراین نے اس مکتوب کی پیروی میں (جس کا میں حوالہ دے چکا ہوں) اور سر سید احمد خاں کی تقلید میں ہندوؤں کے لیے ایک اینگلو اورینٹل کالج قایم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے لیے جو چندے انھوں نے روھیلکھنڈ اور دھلی میں جمع کیے ہیں[2] ان کی تعداد بیس ہزار روپے کے قریب ہے۔ دوسری طرف باشندگان احمدآباد نے اپنے شہر میں ایک کالج قایم کرنے کے لیے بھی چندوں کی فراہمی شروع کردی ہے[3]۔

بمبئی میں میرے پرانے پارسی دوست مانک جی کرست جی نے اپنے ہم وطنوں میں تعلیم نسواں کے متعلق جو آزاد خیالات پھیلانے کی کوشش کی تھی اس میں وہی کامیابی ہورہی ہے جس کی وہ کوشش مستحق تھی۔ اس شہر میں پارسی لڑکیوں کے لیے چار مدارس قایم ہیں جن میں تقریباً چھے سو پچاس طالبات زیر تعلیم ہیں[4]۔ اس میں

---

۱ مہاراجا ہولکر والی اندور نے پچاس ہزار روپیہ کی رقم عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے تاکہ ان ہندستانیوں کے لیے جو یورپ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا چاہتے ہیں' لندن میں ایک اقامت‌گاہ قایم کی جاسکے۔ (علی‌گڑھ اخبار ١٦ مئی سنہ ۱۸۷۳ ع)۔

۲ علی‌گڑھ اخبار ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۳ علی‌گڑھ اخبار ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع۔

۴ انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع۔

کوئی کلام نہیں کہ بمبئی میں پارسیوں اور انگریزوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں اور ان دونوں قوموں میں اکثر باہم شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سال چھے انگریز لڑکیوں نے جن میں سے دو ایک کرنل کی بیٹیاں ہیں، پارسیوں سے شادیاں کیں[1]۔ پارسی یقیناً اپنی اصلاح کررہے ہیں۔ اکثر لوگ ان کی رسوم پر اور ژند زبان پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں سکتے لیکن اس دقت کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے اپنی مذہبی کتابوں کے ایسے اڈیشن تیار کیے ہیں جن میں ان کی مادری زبان گجراتی[2] کے ترجمے بھی ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

یورپی تمدن باوجود مخالف تعصّبات کے برابر ترقی کررہا ہے، چنانچہ راج کوٹ کے ٹھاکر صاحب نے لڑکیوں کے ایک مدرسے کے جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کی اور خود انعامات تقسیم کیے[3]۔

ایک ہندستانی سیٹھ بابو گنگا پرشاد مسر نے بڑی مستقل مزاجی سے بریلی میں عورتوں کے لیے ایک طبی مدرسے کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس کا افتتاح روہیلکھنڈ کے کمشنر نے کیا اور اس موقع پر ہندستانی میں تقریر کی جس کے بعد بابو صاحب نے خود بھی ہندستانی میں تقریر کی۔ اس مدرسے میں فن جراحت کا پروفیسر ایک انگریز ڈاکٹر کاربن (Dr. Corbyn) ہے[4]۔

مسلمانوں نے حکومت کی پیش‌قدمی کا انتظار نہیں کیا اور لاہور میں قاضی شمس‌الدین کی سعی و محنت سے مسلمان عورتوں کے لیے ایک مدرسہ جولائی سنہ ۱۸۷۲ع میں قائم کیا گیا ہے۔ اس مدرسے کی معلمات قابل اور تجربہ‌کار ہیں۔ ان کی سعی سے اس ادارے میں چھبیس لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جائےگا۔ تعلیم تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے درجے میں قرآن اور اس کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ پڑھایا جاتا ہے اور آداب و اصول شریعت

۱ علی‌گڑھ اخبار ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔ ۲ ایلز انڈین میل ۲۷ مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔
۳ علی‌گڑھ اخبار مئی سنہ ۱۸۷۳ع۔
۴ علی‌گڑھ اخبار ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔ ۵ پنجابی ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

کی تعلیم دی جاتی ہے اور اردو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ آداب گفتگو سکھائے جاتے ہیں اور حساب بھی سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے درجے میں قرآن اور اردو کی تعلیم جاری رہتی ہے۔ تیسرے درجے میں صرف قرآن کی تدریس ہوتی ہے اور قواعد اردو سکھائے جاتے ہیں۔ دستکاری کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور ان طالبات کے لیے جو کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتیں کالج کی طرف سے کتابیں مہیا کردی جاتی ہیں۔

ہندستان میں لاتعداد عورتیں مغربی تعلیم کی روشنی سے محروم ہیں، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ فطرت نے انھیں نہایت ملیح حسن اور ایسی سادہ طبیعت عطا کی ہے جو بہت سی خامیوں کی تلافی کرتی ہے۔ مدراس ایتھینم[1] (Madras Athenæum) نے ان کی جو تصویر کھینچی ہے ملاحظہ ہو۔ "وہ لوگ جو ہندستان کی منتخب خواتین سے واقف ہیں ضرور اس کا اقرار کریں گے کہ بہت سی باتوں میں ان کا جواب نہیں۔ وہ سمجھ دار ہوتی ہیں اور ہمدرد ہیں، خوبصورت ہیں اور ملیح۔ ان کی چال سبک اور لطیف ہوتی ہے۔ ان کے جسم کی حرکت ایک شاعرانہ کیفیت رکھتی ہے۔ ان کے دل نازک ہوتے ہیں اور ان کی زبان شیریں۔ اپنے شوہروں سے ان کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ ان کی سیاہ آنکھوں سے ان کی نگاہیں اس طرح نکلتی ہیں جیسے ان میں آگ کی شعاعوں کی سی کیفیت ہو۔ اپنے بچوں سے بےانتہا محبت و شفقت ہوتی ہے اور وہ بارہا اس کے موثر ثبوت دے چکی ہیں۔ ہم اجنبی اگر ہندستانی عورتوں کی صحیح طور پر قدر نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انھیں اچھی طرح نہیں جانتے۔ ان کے مشرقی آداب کسی طرح مغربی عورتوں سے کم باقرینہ، قدرتی اور با اخلاق نہیں ہیں تو پھر کیا ہمیں یہ خواہش کرنی چاہیے کہ وہ تصنّع کے ساتھ مغربی آداب سیکھیں؟ کیا ہمیں اس کی توقع کرنی چاہیے کہ وہ اپنا خوشنما لباس بدل دیں، اپنی روحانی طبیعت کو تبدیل کردیں اور اپنی پیدائش اور اپنے ملک کو بھول جائیں؟"۔

---

[1] Allen's Indian Mail ۵ مئی سنہ ۱۸۷۳ع -

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع کو وائسرائے گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ پہلی مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کی اور پہلی مرتبہ یونیورسٹی نے اس خوبصورت اور وسیع ہال کو استعمال کیا جو اس کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس ہال پر (۴۳۰۰۰) پونڈ خرچ ہوئے ہیں۔ ایک گھنٹے تک لارڈ نارتھ بروک نے بڑے دلچسپ طریقے پر سامعین کی سمع نوازی فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کو محض ایک امتحانی محکمہ نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس کا کام تعلیم دینا بھی ہے۔ انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ بہت جلد تقابلی لسانیات اور طبیعی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ انھوں نے اس امر پر خاص طور سے زور دیا کہ قومی زبان میں ادب کو فروغ دینے کی بہت سخت ضرورت ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بجا طور پر مسٹر مارش‌مین (Mr. Marshman) اور سر ولیم میور (Sir W. Muir) کی بہت تعریف کی۔

ایک اور موقع پر لارڈ نارتھ بروک نے ہندستانی معلّمات کے ایک نارمل اسکول کے جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کی۔ اس اسکول کا تعلق برھمو سماج سے ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلکتہ کے "پریسیڈنسی کالج" کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔ تیس ہزار پونڈ کے قریب اس عمارت پر خرچ ہوں گے اور حکومت اس کالج پر سالانہ بیس ہزار پونڈ خرچ کرے گی تاکہ یہاں تین سو طالب‌علم تعلیم پا سکیں۔

۵۔ سنہ ۱۸۷۳ع میں ادبی انجمنوں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ خصوصیت سے میں پشاور اور جالندھر کی انجمنوں کا ذکر کروں گا۔ آخرالذکر علوم اخلاقی و سیاسی کے لیے ایک طرح کی اکادمی ہے جو اسی طرح کے دیگر اداروں کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پریسیڈنٹ اور سکریٹری ہندو ہیں۔ وائس پریسیڈنٹ مسلمان ہے۔ اس انجمن میں جو بڑی کاوش سے قائم کی گئی بیس ممبر ایسے بھی ہیں جن کا شمار اس حصۂ ملک کے انتہائی معزز آدمیوں میں ہوتا ہے۔ مہینے میں

دو بار اس کے جلسے ہوتے ہیں اور « پنجابی[1] » میں اس کی خبریں شایع ہوتی ہیں۔

حیدرگڑھ میں ایک انجمن حال ہی میں قائم ہوئی ہے جس کے سب ارکان مسلمان ہیں۔

دہلی میں جہاں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں، انھوں نے ایک « انجمن تہذیب » قائم کی ہے جس کا نام « سوشل کلب » بھی ہے۔ اس انجمن کے ضوابط وآئین « پنجابی[2] » نے شایع کیے ہیں۔ صدر انجمن سید نصرت‌علی صاحب قیصر ہیں جو ایک مطبع موسوم بہ « نُصرت المطابع » کے مہتمم بھی ہیں۔

بنارس میں ہندوؤں کی ایک اصلاحی انجمن « ہندو نیشنل امپروومنٹ سوسائٹی » قائم ہوئی ہے۔ اخبار علیگڑھ[3] نے اس کے متعلق تفصیلات شایع کی ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد یہ ہیں کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کو فروغ دیا جائے، علوم و فنون کی نظری و عملی تعلیم کی ترویج کی جائے، صنعتی مدرسے قائم کیے جائیں، انگریزی سے مفید اور اچھی کتابوں کے دیسی زبان میں ترجمے کیے جائیں۔ اس کے خاص ارکان میں بابو ہریش‌چندر مدیر « کبی بچن سدھا » اور پنڈت شیونرائن جلسۂ تہذیب لکھنؤ کے مشہور معتمد شامل ہیں۔

الہ‌آباد میں نوجوان، تعلیم یافتہ اور بےتعصب ہندوؤں نے ایک انجمن مباحثہ قائم کی ہے جس کا تعلق میور سنٹرل کالج سے ہے۔ اس میں فلسفیانہ مباحث پر بحثیں کی جائیں گی[4]۔ اسی شہر میں ۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۳ع کو لارڈ نارتھ بروک نے ایک میوزیم اور ایک کالج کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔

اجمیر (راجپوتانے) میں منشی امین چند کی مساعی سے ایک انجمن مقاصد رفاہ عام کے لیے قایم کی گئی ہے جس کا انگریزی نام « سوشل ایسوسی‌ایشن » ہے۔ اس انجمن نے جو معزز ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے، اپنا پروگرام شایع کیا ہے جس کی نقل « اخبار انجمن پنجاب » میں چھپی ہے[5]۔

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔ ۲ شمارۂ ۲۳ مئی سنہ ۱۸۷۳ء۔
۳ شمارۂ ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ء۔ ۴ علیگڑھ اخبار ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ء۔
۵ شمارۂ ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۳ء۔

بمبئی میں ایک نیا «جلسہ[1]» بھی وقوع میں آیا جس کا مقصد ہندستانیوں کی بہتری کی تدابیر اختیار کرنا اور ارا کین جن خیالات کو مناسب سمجھتے ہوں ان کی خواہش کے مطابق ان کو ترویج دینا ہے۔ سر جمشید جی۔جی بھائی اور روسائے بمبئی نے اس میں شرکت کی ہے۔

لکھنؤ، گونڈہ اور سیتاپور کی انجمنیں جو «جلسۂ تہذیب» کے نام سے مشہور ہیں، اپنے وقایع ایک رسالے کی شکل میں شایع کرتی رہی ہیں۔

لاہور کی «ست سبھا» یا «دھرم ست سبھا» جس کے خاص کارپرداز منشی بہاری لال ہیں، «پنجاب ریفارم ایسوسیایشن» کی طرح ہندوؤں کی ان رسوم کی اصلاح میں کوشش کررہی ہے جو مذموم اور مخرب اخلاق ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے امرتسر میں خاص طور پر ایک کمیٹی قائم کی ہے[2]۔ اسی قسم کی ایک کمیٹی احمدآباد میں قائم ہوئی کہ ہندوؤں کی شادیوں کے وقت جو غیر مہذب گیت گائے جاتے ہیں بند کردیے جائیں[3]۔

انجمن پنجاب برابر ترقی کررہی ہے۔ سیکرٹری نے انجمن کے قیام کے وقت یعنی سنہ ۱۸۶۱ع سے چار سال کی (۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع تک) جو رپورٹ دی ہے اس سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے[4]۔

انجمن اسلامیہ لاہور نے ۳۰ مئی سنہ ۱۸۷۳ع کو شاہی مسجد میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں شہر کے مسلمان رؤسا نے بہت مدد پہنچائی۔ انجمن ایک مدرسے کو چلارہی ہے جس میں علوم دینیات، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ طے پایا ہے کہ مشہور عالم مولوی حافظ ولی‌اللہ جن کے ہزارہا شاگرد اس شہر اور نزدیک و دور کے مقامات میں موجود ہیں اس مدرسے کے اولین معلم نامزد کیے جائیں۔ انجمن چاہتی ہے کہ مدرسہ بھی اکتساب نور کرے اور شاہی مسجد جیسی

---

۱ اس کا نام "Western Indian Association" ہے (اخبار انجمن پنجاب ۹ مئی سنہ ۱۸۷۳ع) "جلسہ" انجمن کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲ انڈین میل یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

۳ علیگڑھ اخبار ۱۹ اگست سنہ ۱۸۷۳ع۔

۴ اخبار انجمن پنجاب ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

خوبصورت مسجد جو مسلمانوں کے لیے ان کے سلاطین سلف کی شان و شوکت کی یادگار ہے پھر ان کے لیے حقیقی روحانی فیض کا سرچشمہ بن جائے ۔ حافظ صاحب بھی ہر طرح کی سعی کریں گے اور ان کے ماتحتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ان تمام مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو انجمن کے پیش نظر ہیں اور مدرسے اور مسجد کو نمو دیں ۔ نامور رؤسا، معزز مسلمان، بڑے بڑے تاجر سب اس اسلامی انجمن میں دلچسپی لے رہے ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ترقی کرےگی اور اس‌قدر اہمیت حاصل کرےگی کہ پنجاب بھر کے مسلمانوں کو اس سے فیض پہنچےگا[1] ۔ لاہور کے مسلمان اس سے بالخصوص مستفید ہوں گے جو فی‌الوقت مشہور و مخلص ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) کی جدائی پر افسوس کررہے ہیں جن کا ہندستانی زبان و ادب پر بہت بڑا احسان ہے ۔ خرابیٔ صحت کے باعث دو سال کی رخصت لے کر موصوف ۳ جنوری کو لاہور سے روانہ ہوگئے ہیں اور دہلی، الہ‌آباد اور بمبئی سے ہوتے ہوئے یورپ تشریف لائیں گے ۔ بحیثیت صدر انجمن لاہور موصوف نے ایک انجمن کی جانب سے ایک ایڈریس پرنس آف ویلز کی خدمت میں پیش کیا تھا[2] ۔ وی‌آنا کی نمایش میں پیش کرنے کے لیے وہ بہت سی چیزیں لے جارہے ہیں جو انھوں نے کشمیر میں حاصل کی ہیں ۔

برہم سماج میں دن بدن نئے پیرو شامل ہوتے جاتے ہیں ۔ اب تو وہ ایک مذہب بن‌گیا ہے ۔ ہر ہفتے اتوار کے دن سماج کے وہ ممبر جو کلکتہ میں رہتے ہیں جن کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے اپنے مسلک کی پیروی کے لیے اپنے مندر میں جمع ہوتے ہیں[3] ۔ ان کی عبادت‌گاہیں بنگال، بمبئی، پنجاب، اودھ اور سنا جاتا ہے کہ مدراس میں بھی بن رہی ہیں ۔ ہزاروں مرہٹے اور گجراتی، مدراس کے سیکڑوں باشندے ۔ بکثرت پنجابی اور ہندستانی اس کے اصول کی پابندی کر رہے ہیں اور اس کی اشاعت کی کوشش کر رہے ہیں[4] ۔

---

۱ یہ حصہ اخبار انجمن پنجاب ۴ اپریل سنہ ۱۸۷۳ ع سے ماخوذ ہے ۔
۲ علیگڑھ اخبار ۷ فروری سنہ ۱۸۷۳ ع اور ایلنز انڈین میل بابت ۲۴ فروری سنہ ۱۸۷۳ ع ۔
۳ اخبار انجمن پنجاب شمارۂ ۳ اگست سنہ ۱۸۷۳ ع ۔ ۴ ایلنز انڈین میل شمارۂ ۹ جون سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

بابو کیشب چندر سین نے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع کو فصیح انگریزی میں الہ آباد میں ہندستان پر انگریزوں کے اثر کے موضوع پر ایک دلچسپ تقریر کی جس کا خلاصہ میں پیش کرتا ہوں:

پہلے تو انھوں نے گراں قدر فوائد کا اعتراف کیا جو انگریزوں سے ہندستان کو پہنچے، مثلاً حفاظت جان و مال، ظلم سے نجات، مساوات و انصاف، ذرائع حمل و نقل کی آسانیاں، ریل گاڑیاں، نہریں، تار برقی اور سب سے بڑھ کر تعلیم کا فائدہ جو بہرحال مغربی تمدن سے روشناس کراتا ہے۔ "لیکن ایسی تعلیم بےفائدہ ہے جو ترقی کا دروازہ تو کھولتی ہے مگر جو نتائج اس سے حاصل ہوسکتے تھے نہیں ہو سکے۔ ہندستانی لوگ چند سال تک تو تعلیم حاصل کرتے رہتے ہیں کہ وہ اعزاز اور مرتبہ حاصل کرلیں جس کی ان کو خواہش ہے لیکن اس کے بعد وہ بالکل بہیمانہ خصائل اختیار کرلیتے ہیں۔ خودغرضی اور کاہلی میں مبتلا ہوکے تعلیم کا صرف وہ حصہ ان میں باقی رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ناقص تعلیم پر مغرور رہیں اور اپنے ہم‌وطنوں کو جن کو اس کا موقع نہیں ملا حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ ان میں اگر فاتح قوم سے کوئی مشابہت پائی جاتی ہے تو صرف نقائص میں۔ اپنے فاتحین کی کوئی خوبی ان میں نہیں۔ مغربی تمدن محض کتابوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ مشہور انگریزوں سے زیادہ ملیں اور ان کے ساتھ اسی اخلاقی فضا میں سانس لیں۔ ہندستانی اور انگریزی سوسائٹی کا باہم خلط ملط ہونا اس وجہ سے مشکل ہے کہ مقدم‌الذکر کا سلوک عورتوں کے ساتھ وہی رہےگا جو پہلے تھا۔ عورتوں کی تعلیم ہی اس صورت حال کو آہستہ آہستہ بدل سکتی ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ہوگئی ہے۔ اس کے لیے استقلال کی ضرورت ہے جس کی بدولت خدا کے فضل سے جو تمام انسانی نسلوں کا خالق ہے، توقع کی جاسکتی ہے کہ نتیجہ امید افزا نکلےگا[1]"۔

---

[1] علی‌گڑھ اخبار ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ء۔

بابو کیشب‌چندرسین کے سفر الہ‌آباد کا نتیجہ شمالی ہند کے لیے ایک برہم سماج کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ الہ‌آباد کی شاخ اس نئی سماج میں ضم کردی جائےگی۔ صوبۂ شمال مغربی میں اس انجمن کو مقبول بنانے کے لیے پابندی اور محنت کے ساتھ کتابچے شایع کیے جارہے ہیں[1]۔

بابو کیشب‌چندرسین نے پہلے بنارس میں مندر بہاری کا سنگ بنیاد رکھا تھا[2]۔ لکھنؤ میں بھی انھوں نے گزشتہ سال ۲ اکتوبر کو ایودھیا برہم سماج کے مندر کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر کثیر ہندو اور انگریز خوانین اور حضرات موجود تھے۔ شام کو قیصر باغ میں انھوں نے برھما مت کے اصول اور خاص نکات پر انگریزی میں ایک تقریر کی[3]۔

سب کو معلوم ہے کہ کیشب‌چندر ہندوؤں میں ذات پات کی تفریق کے مخالف نہیں ہیں، لیکن اگر مجموعی طور پر اس کو باقی رہنے دیا جائے تب بھی ہر ذات کے اندر مزید بکثرت تقسیمیں بالکل مہمل ہیں۔ چنانچہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر سورت میں دو سو سات ذاتیں ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے اپنی خصوصیات کی وجہ سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ اب ذات پات کا فرق محض تصوری ہوکر رہ گیا ہے کیونکہ حکومت انگریزی کے قیام کے بعد سے برہمن، چھتری، ویش اور شدر اپنے موروثی پیشوں کے پابند نہیں ہے بلکہ اب ایسے پیشوں کو اختیار کر چکے ہیں جو ان کے آباواجداد کے پیشوں سے بہت مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے میں انھیں قابل الزام نہیں سمجھتا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ پکے مشرقی یورپ کی اچھی تجویزوں کو ہمیشہ اختیار نہیں کرتے۔ امیر کابل نے یورپ کی اکثر دول کی پیروی میں فوجی خدمت لازمی قرار دی تھی لیکن یہ حکم اس‌قدر غیر مقبول ثابت ہوا کہ مجبوراً اس کو اٹھا لینا پڑا[4]۔ انگلستان میں

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع - پنجابی ۴ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع -
۲ اخبار انجمن پنجاب ۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ ع -	۳ انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ ع -
۴ علی‌گڑھ اخبار ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۷۳ ع -

ابھی تک اس کا رواج ہے اور فرانس میں ایک عرصے تک رہ چکا ہے چنانچہ کوئی شخص فرانسیسی افواج کو فتوحات کی حد تک ملامت نہیں کرسکتا۔[1]

بابو پرتاب‌چندر کی بمبئی میں موجودگی روشن خیال ہندوؤں کی نظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ ان میں خدا پرستی کی تبلیغ کررہے ہیں۔ مذہب پر جو تقریریں وہ کررہے ہیں ان سے وہ قوت پھر بیدار ہورہی ہے جو برتھما سماج کی اصلاح کے بعد سے خوابیدہ ہو چلی تھی اور بغیر ان کی کوشش کے رفتہ رفتہ مفقود ہوجاتی۔ خدا پرستی کی سماج کی دوبارہ تنظیم عمل میں آئی ہے اور دسمبر سنہ ۱۸۷۳ع میں اس کا ایک اجلاس اس کے اصول و آئین مرتب کرنے کے لیے ہوا۔ سماج میں آزادی سے بحث کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ بحث سماج کے بنیادی اعتقادات کے خلاف نہ ہو۔ اعتقادات یہ ہیں: خدا کے وجود اور روح کی بقا پر اعتقاد، عبادت کی ضرورت نیکی اور بد میں امتیاز اور آنے والی زندگی میں جزا وسزا۔ شبدھ پترکا کے نام سے سماج کا ایک رسالہ مرھٹی میں شایع ہوتا ہے[2]۔

کئی نامی ہندو بت‌پرستی کے انسداد میں کوشاں ہیں۔ ان میں سے پنڈت دیانند سرسوتی کا شمار بہت پرجوش آدمیوں میں ہوتا ہے۔ بنارس میں ایک اصلاحی انجمن قائم کرکے وہ اپنے نام کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہیں جہاں اب وہ مستقل طور پر مقیم ہیں اور اپنے خیالات کی تبلیغ نہ صرف ہندی اور بنگالی بلکہ انگریزی اور سنسکرت میں بھی کرتے ہیں[3]۔

کلکتہ میں انھوں نے ایک بڑا جلسہ کیا تھا جس میں عیسائی، مسلمان، ہندو، برھمو سبھی شریک تھے۔ اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ گندی تحریرات کو روکا جائے[4]۔

خواتین بھی ان معاشرتی تحریکات میں حصہ لے رہی ہیں جو انھیں ان زنجیروں سے نجات دلانے والی ہیں جن میں وہ اب جکڑی ہوئی ہیں۔ بعض خواتین نے اس نقطۂ نظر سے مضامین بھی لکھے ہیں اور ڈھاکہ کی ایک ہندو خاتون نے ایک نظم

---

۱ انڈین میل ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۷۱ع۔
۲ اخبار عالم میرٹھ ۱۶ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔
۳ پنجابی ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۷۳ع۔
۴ پنجابی ۲ فروری سنہ ۱۸۷۳ع۔

«عورت اور چڑیا» کے نام سے لکھی ہے جس میں اپنی قید کو چڑیا کے قفس سے تشبیہ دی ہے۔ اس نظم کا ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل (Rev. Dr. Murray Mitchell) نے نظم میں ترجمہ کیا جو گزشتہ فروری کو شایع ہوا[1]۔

پکے ہندو ان تحریکات استدلال کے شاکی ہیں جن کو ہم سماج والے پھیلا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اس دقت کے متعلق «ہریش‌چندر میگزین»[2] میں ایک مضمون میں لکھتا ہے:—

«ہمارا مذہب جو دنیا کے تمام مذاہب سے برتر ہے اور جس کا ہمسر کوئی اور مذہب نہیں ان لوگوں کے نزدیک محض وہم پرستی ہے۔ انھوں نے مذہب کو جو معاشرت اور ان افراد کے درمیان جن پر وہ مبنی ہے ’واحد کڑی ہے‘ بالکل بدل دیا ہے۔ وہ نہ عیسائیت کے پیرو ہیں اور نہ اسلام کے پھر بھی وہ ہندومت سے متنفر ہیں اور چونکہ میرے خیال میں ہندومت اور تمام مذاہب کا جوہر کہلانے کا مستحق ہے، اس لیے وہ ان لوگوں کو جو ہندو نہیں ہیں بےدین نہیں قرار دیتا۔ ہندو مذہب یہ سکھاتا ہے کہ ایک سچا ہندو حقیقی معنوں میں «عیسائی» ہے اگرچہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کی ذات پر ایمان نہیں لاتا۔ یہی ایک مذہب ہے جو بتاتا ہے کہ حقیقی مذہب متقدمین میں رائج تھا اور نسل انسانی کے وجود میں آنے کے ساتھ یہ سب پر روشن ہوا۔ ہم مشنریوں سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہی یہ بتائیں کہ حضرت عیسیٰ کے پیش نظر ہندو تھے یا نہیں تھے جبکہ انھوں نے یہ کہا کہ «بہت سے لوگ مشرق سے آئیں گے اور ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے ساتھ اپنی سلطنت میں داخل ہوں گے»[3]۔

بابو کیشب‌چندر متر (جو کیشب‌چندر سین سے مختلف آدمی ہیں) نے غازی‌پور میں اس مسئلے پر تقریر کی کہ انگریز ہندستانیوں سے خلط ملط بڑھانے سے کیوں احتراز کرتے ہیں۔ اس امر کو وہ اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ میل ملاپ یا اس کا

---

۱ یہ نظم پہلے Indian Anti Quary میں چھپا اس کے بعد علیحدہ شایع ہوا۔
۲ شمارۂ اول - صفحہ ۱۵ -
۳ سینٹ میتھو (آٹھواں باب گیارھویں آیت)

فقدان ان کے نزدیک حاکم اور محکوم قوم کے مابین محبت یا نفرت کا باعث ہو سکتا ہے - انھوں نے دونوں اقوام کے مابین اتحاد کی خواہش ظاہر کی اور توقع ظاہر کی کہ یہ خواہش پوری ہوکر رہےگی -

انھوں نے بیان کیا کہ ان دو اقوام کے درمیان، جو اس قدر مختلف ہیں اور جن کے تمدن اس قدر مختلف ہیں۔ ربط ضبط بڑھانے کے لیے باہمی دلچسپی اور باہمی ہمدردی کی بڑی ضرورت ہے اور یہ وہ چیزیں ہے جو فی‌الوقت مفقود ہیں کیوں‌کہ دونوں اقوام کے خصائل، خیالات اور معاشرتی دلچسپیاں مذہبی اصول کی وجہ سے ایک دوسرے کے متضاد ہیں - مثلاً یہ کہ ہندو مذہب، بدھ مذہب، اسلام اور عیسائیت باہم‌دگر متضاد ہیں - بابو صاحب کے خیال میں فطری مذہب محض یہ ہے کہ خدا کی سرپرستی میں ایک سچی برادری سب کے لیے قائم کی جائے - صرف یہی چیز ذات پات کو مٹاسکتی ہے اور امارت و مدارج کے فرق کو مفقود کرسکتی ہے - بابو صاحب کے خیال میں وہ وقت دور نہیں جب‌کہ یہ فطری مذہب تمام تعلیم‌یافتہ انسانوں کا مذہب ہو جائےگا اور حقیقت میں دنیا کی حکومت انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے - صفحۂ ہستی پر لوگ اس طرح رہیں‌گے جیسے ایک بڑا سا گھرانا اور ہر جگہ امن اور صلح کل کی حکومت رہےگی، لیکن اس لیے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں ضروری ہے کہ ہم خدا سے اپنے تعلق کو پہچانیں اور آنے والی زندگی اور اس کی نعمتوں کا تصور کریں جو ہمارے نیک اعمال کی وجہ سے حاصل ہوں‌گی - ایک چیز جو استدلالیت، افادیت اور نبوتیت کے خلاف کہی جاسکتی ہے کہ مذہب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے روحانی برادری حاصل ہو سکتی ہے - کیا ان جدید نظریات کے حامی ہمیں محسوس کرا سکتے ہیں کہ ہماری ارواح میں ایک ابدی زندگی ہے کہ ہمیں چاہیے کہ دوسروں میں بھی جو دل و جان سے ہمارے سچے بھائی ہوں ہم اپنے آپ ہی کی جھلک دیکھیں؟[1] -

---

[1] یہ ان مضامین کا بہت مختصر سا خلاصہ ہے جو علیگڑھ اخبار مورخۂ ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء اور ۱ اپریل سنہ ۱۸۷۳ء کو شایع ہوئے

سکھ بھی ایک مذہبی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں جو ہندستان میں رونما ہو رہی ہے ۔ سندھ کے سکھوں نے ایک سبھا بنائی ہے جو گورونانک کی تعلیم کی اشاعت میں سعی کرے گی اور ان کے معجزوں پر جو انھوں نے اپنے نبوت میں دکھلائے روشنی ڈالے گی[1]

اس انجمن کے ممبروں نے جس کا نام بڑی خصوصیت سے برھمو دھرم رکھا گیا ہے، اس سال بڑے جوش سے ایرانیوں کی طرح ایرانی عید نوروز پارسیوں کی طرح منائی ۔ اس تقریب میں جو جلوس کلکتہ میں نکالا گیا اس میں تین جھنڈیاں تھیں جن کو ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک عیسائی اٹھائے ہوئے تھا، اس جشن کے سلسلے میں پندرہ سو آدمیوں کے روبرو بابو کیشب چندر نے ایک تقریر کی[2]۔

جرنل آف دی نیشنل انڈین اسوسی ایشن[3] (Journal of the National Indian Association) جو ماہ بماہ شایع ہورہا ہے، ایک دلچسپ تقریر کا ذکر کرتا ہے جو مسٹر الٹوڈس پریچارڈ (Mr. Iltudus Prichard) نے سوشل سائنس اسوسی ایشن (Social Science Association) کے ہال میں ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ع کو انجمن کے قیام (جو سنہ ۱۸۷۰ع میں قائم ہوئی) کی یادگار کے سالانہ جلسے میں ہندستان میں تعلیم کے موضوع پر کی۔ اس مشہور و معروف شخص نے پہلے تو National Association کے ارتقا کا ایک خاکہ کھینچا، یہ انجمن ہندستان میں معاشرتی ترقی کے لیے قائم کی گئی ہے ۔ اس کے بعد مقرر نے سامعین سے اس مبحث کا ذکر کیا جس میں ایک فریق عام دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاھتا ہے اور دوسرا فریق انگریزی کا حامی ہے ۔ اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ عوام‌الناس میں تعلیم کی ترویج کے لیے عام دیسی زبان زیادہ کارآمد ثابت ہوگی مگر اعلی طبقوں میں تعلیم کے لیے انگریزی مناسب ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے اردو کا ذکر کیا اس زبان کی آفرینش و ارتقا

---

۱ پنجابی ۲ جولائی سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

۲ پنجابی ۲ فروری سنہ ۱۸۷۳ع ۔

۳ شمارۂ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع ۔

کی تاریخ دھرائی اور زور دیا کہ سائنس اور جدید فلسفے کی اشاعت و ترویج کی اس زبان میں خاص صلاحیت ہے کیونکہ بڑی سہولت سے یہ زبان سنسکرت اور عربی الفاظ کو جذب کرسکتی ہے جو فنی اصطلاحات کے کام آ سکتے ھیں۔ اردو کی اس تعریف میں مشہور عالم ھندستانی میجر آٹلی (Major Ottley) نے ان کی ھمنوائی کی۔

مسٹر پری‌چارڈ نے ھندستانیوں کے لیے دیسی ادب کی فراھمی پر زور دیا، ایسا ادب جو بیک وقت صحیح‌الاثر ھو اور جو سستی قیمت پر خریدا جاسکے۔ انھوں نے بتایا کہ سنہ ۱۸۷۲ع میں تعلیم کی حد تک ھندستان میں کیا کیا خاص باتیں پیش آئیں۔ بہت ھمدردی کے ساتھ انھوں نے اس تجویز کا ذکر کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کالج قائم کیا جائے اور حکومت مدراس کے اس اقدام کی تعریف کی کہ انھوں نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو وہ جگہیں دیں جن سے وہ محروم تھے کیونکہ اس پریسیڈنسی میں اس وقت صرف انیس مسلمان عہدہ‌دار تھے اور چار سو سترہ ھندو۔ انھوں نے یہ خواھش ظاھر کی کہ لندن میں ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جس کا تعلق ھندستانی جامعات سے ھو اور جہاں ھندستانی اپنی تعلیم مکمل کرسکیں اور سول سروس میں شریک ھوسکیں اور شرکت کے لیے انھیں دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

مسٹر پری‌چارڈ کی تقریر گویا اسوسی‌ایشن کے نظام‌العمل کی تشریح ھے جو ھندستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں علی‌گڑھ اخبار مورخۂ ۱۳ جون سنہ ۱۸۷۳ع میں شایع ھوئی۔

۶ - قرون وسطیٰ میں جب کہ کلیسا اس قدر امیر تھا اور پادری اس قدر کثیر تعداد میں موجود تھے، کلیسا نے مشنری فرائض اپنے ذمے نہیں لیے۔ اس زمانے میں بجز ژاں دَ موں کارواں (Jean de Mont-Corvin) کے مشن کے جو چین گیا تھا کسی کا ذکر پڑھنے میں نہیں آتا۔ تین سو سال کے بعد لوگوں کی اس قابل قدر کام پر نظر پڑی اور چند سال کے عرصے میں اس نے غیر معمولی ترقی کی، نہ صرف

رومن کیتھولک کلیسا نے اس کی طرف توجہ کی بلکہ روسی کلیسا، انگلیکن کلیسا اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے انگریزی مشنری اس وقت تک نہیں بھیجے جاتے جب تک وہ اس ضلع کی زبان میں، جہاں انھیں کام کرنا ہے، ایک سخت امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے۔ سنہ ۱۸۷۲ع میں چھے سو چھے مشنری تھے جو پانچ سو بائیس مقامات پر کام کر رہے تھے۔

ہندستان میں سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک ملین رومن کیتھولک عیسائیوں کے علاوہ دوسرے عیسائی فرقوں میں تین ارب اٹھارہ ہزار تین سو ترسٹھ دیسی عیسائی تھے۔

میرے پیش نظر سنہ ۱۸۷۲ع کے متعلق Punjab Book and Tract Society اور Punjab Auxiliary Bible Society کی سالانہ رودادیں ہیں۔ یہ پانچویں روداد ہے اور دونوں روئدادیں حسب سابق ریورنڈ رابرٹ کلارک (Rev. Robert Clarke) نے مرتب کی ہیں۔ از راہ مہربانی انھوں نے مجھے ایک نسخہ بھیجا ہے اور اس کے ساتھ (Lahore Divinity School) سے متعلق (Rev. T. Vulpy French) کا "سالانہ مراسلہ" (Annual Letter) ان روئدادوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے کام کے حلقے میں شامل ہے کیونکہ ان کا بڑا حصہ دیسی عیسائی ادب کے متعلق ہے جو دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔ مشنری بھی جدید ادب کی ترقی میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور مغربی خیالات سے اس کے اسلوب میں ترمیم کررہے ہیں۔

ان دونوں انجمنوں کا مرکز لاہور ہے۔ یہیں مختلف انجمنوں کی شایع کردہ کتابوں اور رسالوں کا ذخیرہ ہے خصوصاً ان اردو اور ہندی کتابوں کا جو انجمن برائے رسالہ‌جات الہ‌آباد اور مشن پریس لدھیانہ نے شایع کیے ہیں۔

ریورنڈ مسٹر کلارک کی رپورٹ کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں مختلف مشنریوں اور تازہ عیسائی شدہ دیسیوں کی مراسلت ہے۔ موخرالذکر میں سب سے

برلن کی مشن نے آٹھ ہزار عیسائی شدہ دیسیوں کا ذکر کیا ہے۔

زیادہ قابل ذکر عمادالدین[1] ہیں جو بہت سرگرمی سے اس پُرجوش کوشش میں مصروف ہیں کہ اپنے قدیم ہم‌مذہبوں کو حقیقت کا راستہ دکھائیں۔

بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کے مذہبی رسالہ‌جات جو دیسیوں میں تقسیم کیے جارہے ہیں ان سے کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے لیکن جس رپورٹ کا میں ذکر کررہا ہوں اس کے معائنے سے اس امر کے کئی ثبوت مل سکتے ہیں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔

اردو کے عیسائی رسالہ‌جات میں جن کی تعداد پچانوے کے قریب ہے اور جن میں سے بعض لاطینی حروف میں ہیں میں 'تاریخ کلیسا' مرتبۂ سر ولیم میور اور چند نئی تصنیفوں کو خصوصیت سے قابل ذکر سمجھتا ہوں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کتابیں اور رسالہ‌جات جو حال میں شایع ہوئے ہیں زیادہ‌تر ان کتابوں کے نئے اڈیشن ہیں جو پہلے مشن کے پچیس چھاپہ خانوں سے شایع ہوچکی ہیں۔

امدادی انجمن برائے اشاعت کتب مقدس پنجاب کی پانچویں رپورٹ میں سوائے اس کے کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں کہ عہد نامۂ جدید اور انجیل کے مختلف حصوں کی طلب اور اشاعت بہت بڑھ گئی ہے اور انہیں اردو' ہندی اور پنجابی میں شایع کیا جارہا ہے۔ اس رپورٹ کی بنیاد جس خاص مقولہ پر ہے وہ مجھے بہت پسند ہے:

"انسان کا گوشت گھانس کی طرح ہے اور اس کی خوبیاں ایسی جیسے کھیتوں کے پھول۔ گھانس سوکھ جاتی ہے' پھول مرجھا جاتے ہیں لیکن ہمارے خدا کا لفظ ہمیشہ باقی رہتا ہے"[2]۔

راجپوتانے کے مشن کی گزشتہ سال کی رپورٹ کے بعد اب اس کا علم ہوتا ہے کہ وہاں تیرہ مشنری ہیں جن میں سے تین طب کے ماہر ہیں۔ وہاں انھوں نے

---

۱ ان کی دلچسپ سوانح حیات, تاریخ ادب ہندوی و ہندستانی' جلد دوم صفحۂ ۱۳ سے ملاحظہ فرمائیے۔

۲ اسایا باب ۴۰ آیت ۶ و ۸۔

بہتر مدارس کھولے ھیں جن میں بارہ ھزار بیالیس لڑکے اور لڑکیاں پڑھ رھی ھیں اور اڑتیس آدمی اب تک عیسائی بن چکے ھیں[1]۔

رومن کیتھولک فرقے کا ایک خوبصورت کلیسا آگرے میں جو اکبر اعظم کا پایۂ تخت رہ چکا ھے پہلے ھی سے موجود ھے' اب حال ھی میں ایک اور خوبصورت سا کلیسا جبل‌پور میں بنایا گیا ھے جس میں عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ھے۔ ایک اور عظیم‌الشان گرجا اله آباد میں جو صوبۂ شمال مغربی کا پایہ تخت ھے' بنایا گیا ھے[2]۔

ھمیں چاھیے کہ ان نیک مشنریوں کی ھمت بڑھائیں اور ان سے کہیں "اے معزز گروہ چاو وھاں جہاں خدا کی شوکت اور دنیا کی نجات تمھیں آنے کی دعوت دے رھی ھے" —— "تمام مخلوق میں اعلان کردو کہ قوموں کے دیوتا خراب اصل کے ھیں"۔

خود کو اپنے فرایض پر آمادہ کرنے کے لیے مشنریوں کو چاھیے کہ اسقف ھیبر (Heber) کے مقدس بھجن کے یہ الفاظ اپنے آپ سے دھرا کر کہیں :—

"ھم وہ ھیں کہ ھماری روحیں' بلندی کی عقل و فراست سے روشن ھو چکی ھیں۔ بھلا کیا ھم تاریکی میں گرفتار آدمیوں کو زندگی کا چراغ دکھانے سے دریغ کریں"۔

مشنریوں کے ایک جلسے میں جو الہ‌آباد میں ۲۴ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع کو ھوا بمبئی کے ریورنڈ جے۔ ولسن (Rev. J. Wilson) نے ایک یادداشت ھندوؤں میں تبلیغ[2] کے طریقے پر پڑھی۔ ریورنڈ آر۔سی۔ ماتھر (Rev. R. C. Mather) اور جگدیش نے بھی اسی موضوع پر روشنی ڈالی۔ ریورنڈ عمادالدین نے مسلمانوں میں تبلیغ کے طریقوں پر ایک تقریر کی اور ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل (Rev. Dr. Murray Mitchel) نے بھی اسی مبحث پر گفتگو کی اور خصوصیت سے مسلمانان بنگال کے مسئلے پر[3]۔

---

۱ اخبار انجمن پنجاب ۱۸ مارچ سنہ ۱۸۷۳ع۔

۲ یہ 'On Preaching to the Hindus' کے عنوان سے شایع ھوتا ھے۔

۳ علی‌گڑھ اخبار ۳ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع و ایلنز انڈین میل ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۳ع۔

کرسچین ورنی کیولر سوسائٹی آف انڈیا ("Christian Vernacular Society of India") قایم شدہ سنہ ۱۸۵۸ع کا پانچواں جلسہ گزشتہ مہینے پُرجوش انگلیکن کاونٹ شافٹس بری (Shaftesbury) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریورنڈ جے۔ ایچ ٹتھ کومب (Rev. J. H. Tithcomb) نے اپنی رپورٹ میں ذکر کیا کہ سوسائٹی نے معلمین کی تین درسگاہیں قایم کی تھیں جن سے دو سو مدرس فارغ التحصیل ہوکر نکلے ہیں جو مختلف مدارس کے صدر ہوں گے جن میں سات ہزار بچے پڑھ رہے ہیں اور سوسائٹی کی کوششوں سے ہندستانی اور ہند کی دوسری زبانوں میں انجیل کے چار ملین نسخے تقسیم کیے جاچکے ہیں۔

اسقف اعظم یارک اور لارڈ لارنس (Lord Lawrence) کی تقریروں کے بعد ڈاکٹر مریےمچل نے جو حال ہی میں ہندستان سے وارد ہوئے ہیں چشم دید شہادت کے طور پر یہ بیان کیا کہ اس سوسائٹی سے ہندستان کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس کے مدرسے انتہائی بہتر طور پر کام کررہے ہیں لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ روحانی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے میں سوسائٹی کی تمام تر خدمات ایسی ہیں جیسے پانی کے ٹب میں ایک قطرہ[1]۔

بہت سی مشنری خواتین بھی ہیں جو ڈاکٹری تعلیم حاصل کررہی ہیں تاکہ اس طرح انھیں زنانے میں جانے کا موقعہ ملے اور بوقت واحد ارواح و اجسام کا علاج کرسکیں۔ بمبئی میں اور خصوصیت سے شمالی ہند میں ان کی کامیابی مشاہدے میں آچکی ہے[2]۔

اس سال (سنہ ۱۸۷۳ع) اسقف کلکتہ نے پنجاب کا سفر کیا۔ لاہور میں انھوں نے پینتیس ہندستانیوں کو عیسائی کیا جن میں سے چار یوریشین تھے۔ اثنائے قیام میں سینٹ جین کے مذہبی کالج میں جس کے ناظم ریورنڈ ٹی۔ وی فرنچ (Rev. T. V. French) ہیں اور جہاں ہندستانی اردو میں تعلیم دی جاتی ہے، اسقف نے طالب علموں کے سامنے نہایت روانی سے اسی زبان میں تقریر کی۔ امرتسر میں بھی انھوں نے

---

۱ ایلنز انڈین میل ۱۹ فروری سنہ ۱۸۷۳ع۔　۲ انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع۔

۳ Colonial Church Chronicle شمارۂ جون سنہ ۱۸۷۳ع۔

هندستانی هی میں تقریر کی اور پانچ دیسیوں کو پادریوں کے عہدے پر فایز کیا[۱] - رانچی میں کول مشن کے مرکزی گرجا میں انھوں نے رسوم تقدیس انجام دیں اور هندی میں تقریر کی جو یہاں عام طور پر رایج ہے - سات هندستانیوں کو پادریوں کے درجے پر مامور کیا اور دو سو باون آدمیوں کو عیسائی بنایا، عشائے ربانی میں سات سو آدمی شریک تھے[۲] -

عیسائیت کی سب سے زیادہ اشاعت چھوٹا ناگپور کے پہاڑی اضلاع اور علاقۂ سنتھال کے ان پرانے اصل باشندوں میں هوئی ہے جو نہ مسلمان هیں اور نہ هندو اور جن کے مذهبی اعتقادات بہت بھونڈے هیں - حکومت کو مشنریوں کی حفاظت کرنی پڑی کیونکہ اس حصے کی آبادی نیم وحشی ہے -

اپنے علاقے میں اسقف مدراس نے اپنے گزشتہ سفر ٹراونکور میں اٹھارہ سو آدمیوں کو عیسائی بنایا - کوٹا گام میں دو یورپین اور تین هندستانیوں کو پادری مقرر کیا اور اس موقع پر دو سو چالیس آدمی ان کے هاتھ پر عیسائی هوئے -

علاقۂ مدراس میں پینتالیس انگلیکن کلیسا هیں -

اسقف بمبئی نے گزشتہ جنوری و فروری میں سندھ کا دورہ کیا - کراچی میں انھوں نے ستانوے آدمیوں کو عیسائی بنایا، یہ سچ ہے کہ ان میں سے زیادہ‌تر انگریز سپاهی هیں - بندیلکھنڈ میں انھوں نے ایک مشن قایم کی[۳] - نومبر میں وہ ناگپور میں کلکتہ اور مدراس کے اسقفوں سے ملنے والے هیں تاکہ اپنے علاقوں کی از سر نو تقسیم کریں[۴] -

کلیسائے سینٹ جین (مشرقی کلیسا) کی عشائے ربانی کے ملیالم ترجمے کو مرکزی اسقف Mar Athanasios نے تسلیم کرلیا ہے اور اب اس فرقے کے کلیساؤں میں

---

۱ Colonial Church Chronicle شمارۂ جولائی سنہ ۱۸۷۳ع -

۲ Colonial Church Chronicle شمارۂ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع -

۳ Colonial Church Chronicle جون سنہ ۱۸۷۳ع -

۴ ایلنز انڈین میل ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۳ع -

بجائے اصل کے جو سُریانی زبان میں ہیں اور جس کو ایمان لانے والے نہیں سمجھ سکتے، رائج کیا گیا ہے[1] ۔

میں بارہا اس کا ذکر کرچکا ہوں کہ بہ کثرت ہندو اپنا مذہب بدل کے مسلمان ہوتے جاتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس طرح وہ حقیقت سے قریب‌تر ہوجاتے ہیں ۔ مسلمان بادشاہوں کے عہد حکومت میں یہ تبدیلی مذہب بہت زیادہ رائج تھی لیکن فیروزشاہ جیسے نیک دل بادشاہ کے زمانے میں یہ تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی[2] ۔

دیسی اخباروں سے اس قسم کی ایک اہم تبدیلی مذہب کی اطلاع ملتی ہے ۔ راجگڑھ کے راجا نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا ہے اور اپنا نام بدل کے نواب عبدالواسع خاں بہادر رکھا ہے اور حکومت ہند نے بھی اس تبدیلی کو منظور کرلیا ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کی رعایا نے بھی قانون محمدی کو تسلیم کرلیا ہے اور یہ ریاست جو پہلے ہندو تھی اب مسلمان ہوگئی ہے[3] ۔

ایک اور ہندو مسلمان ہوکر اپنا نام محی‌الدین رکھا ہے اور بہت سے نومسلموں کی طرح ایک کتاب اپنے قدیم مذہب کی تردید میں لکھی ہے جس کا نام «لذّت الہند» ہے ۔

اگرچہ ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم مسلمان عیسائی مذہب اختیار کرتے ہیں پھر بھی اس سلسلے میں کئی نامی مسلمانوں کے نام مل سکتے ہیں ۔ وہ مسلمان جو اپنے نبی کی رسالت پر پورا ایمان رکھتے ہیں عیسائی مشنریوں کے حملوں کی تردید کرتے رہتے ہیں ۔ دہلی میں الفت‌حسین نے اردو میں دو سو صفحے کی ایک کتاب «جواب با صواب» کے نام سے چھاپی ہے جس میں عیسائیوں کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ اسلام پر کرتے ہیں ۔ لاہور میں حافظ ولی‌اللہ نے امام‌الدین

---

۱ Colonial Church Chronicle جون سنہ ۱۸۷۲ء اور Missionary Enterprize in the East از ریورنڈ آر - کالنس -

۲ دلچسپ تفصیلات کے لیے Sir Henry Elliot کی "Mohammedan historians of India" ملاحظہ ہو جس کو فاضل پروفیسر Dowson نے شایع کیا ہے -

۳ اخبار عالم میرٹھ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۲ء - پنجابی ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ء -

کی کتاب « تحقیق الایمان » کے جواب میں ایک کتاب «صیانت الاسلام و وسواسات الشیطان » کے نام سے شایع کی ھے ۔ وھیں « پنجابی » کے اشاعت خانے سے ایک مذھبی مناظرہ کی ایک اور کتاب « بطلان اصول مذھب عیسوی » کے نام سے شایع ھوئی ھے جو مولانا محمد رکن الدین کے فیضان کا نتیجہ ھے ۔ مصنف کو اس کا دعویٰ ھے کہ عیسائی تصنیفات کے ذریعے ھی عیسائی مذھب کی تردید کی گئی ھے ۔

لاھور ھی سے مشہور کامل علم مناظرہ مولوی سید محمد ابوالمنصور نے اسلام کے خلاف ایک تصنیف کی تردید شایع کی ھے جس کو لکھنؤ کے دو مشنریوں نے لکھا تھا جن میں سے ایک مسلمان رہ چکا تھا ۔ « پنجابی » نے اس کتاب پر ۱۴ جون اور ۲۶ جون کی اشاعتوں میں دو مضامین لکھے ھیں جن کا میں ذکر کرنا چاھتا ھوں ۔

« انعام عام در جواب آئینۂ اسلام » مضمون نگار لکھتا ھے « سمیویل جونس اور رجب علی مشنریوں کی کتاب «آئینۂ اسلام» کی—جو امریکن مشن پریس لکھنؤ سے شایع ھوئی ھے—تردید ھے ۔ ان مشنریوں نے مسلمانوں میں دو سو پچاس فرقے کیے ھیں اور لکھا ھے کہ شروع اسلام ھی سے یہ حال تھا اور ان کا دعویٰ ھے کہ عیسائی فرقوں کا یہ حال نہیں ۔ مصنف نے ان اعتراضات کا جامع اور فیصلہ‌کن جواب دیا ھے ۔ مشنریوں نے غلط طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ھے کہ ان فرقوں میں سے آٹھ خدا کو نہیں مانتے ، چودہ رسول کو نہیں مانتے اور اسی طرح سینتیس حلقۂ اسلام سے بالکل خارج ھیں ۔ مولوی صاحب نے جواب میں اپنے دلائل میں یہ ثابت کیا ھے کہ عیسائیوں میں اٹھاسی فرقے موجود ھیں جن میں سے آٹھ روح القدس کو نہیں مانتے ، پچیس حضرت عیسیٰ کی الوھیت کے قایل نہیں ، آٹھ (مسلمانوں کی طرح) حضرت عیسیٰ کے مصلوب ھونے کے قایل نہیں ، سولہ عہد نامۂ قدیم و جدید کے آسمانی کتاب ھونے پر ایمان نہیں رکھتے اور باقی پینسٹھ فرقے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ھیں ۔ مصنف نے ان کتابوں کے حوالے دیے ھیں جن کے مستند ھونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ مصنف نے جو محنت برداشت کی ھے اس کی تحسین ھمارا فرض ھے کیوں‌کہ اس کتاب کے لیے انھوں نے مختلف زبانوں کی کتابوں سے حوالے جمع کیے ھیں ۔ برخلاف اس کے

« آئینۂ اسلام » میں جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں صفحات و سطور کی تشریح نہیں کی گئی ہے ۔ لیکن ابوالمنصور کی تصنیف میں صفحات، سطور اور جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی اشاعت کے سال اور مقام کی بھی تشریح کی ہے جس سے اس تصنیف کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مشنری پھر جواب دینے کی جرأت نہ کرسکیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ اس کے بعد وہ مناظرے سے دست بردار ہوجائیں گے » ۔

بنگلور میں مسلمانوں کی ایک انجمن « انجمن اسلامیہ » خاص اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کو عیسائیت کے پروپیگنڈے سے بچائے بلکہ عیسائیوں کو بھی مذہب اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرے جس کی ان کے لیے بہت سخت ضرورت ہے ۔ سوسائٹی کا پہلا اجلاس ۲۲ مئی کو ہوا ۔ ہندستانی اخبار « قسم الاخبار » کے اڈیٹر صاحب کے ساتھ منشی محمد قاسم صاحب بانئ انجمن کو معتمد نامزد کیا گیا اور اس کے صدر مشہور واعظ مولوی عبدالحی صاحب قرار دیے گئے ۔

ایک اور واعظ قاضی مولوی حاجی محمد سراج صاحب نے جو شہرت میں ان سے کسی طرح کم نہیں، بمبئی میں مذہب اسلام پر اس خوبی سے وعظ کیا کہ تین یوروپین مسلمان ہوگئے اور انھوں نے اپنے نئے مذہب کے اعتبار سے اپنے نام بدل دیے[1] ۔ ایک اور بڑے انگریز یعنی سرسہ ضلع بریلی کے ڈپٹی کمشنر کے مسلمان ہونے کی بھی اطلاع ملتی ہے مگر ان کی حد تک یہ صحیح ہے کہ اس تبدیلی مذہب یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس ارتداد کی تہ میں ایک جگہ شادی کرنے کا مقصد کام کررہا تھا[2] ۔

۷۔ « مالک نے کہا میں تجھے سکون دوں گا ۔ تونے میرے کرم کو حاصل کرلیا ۔ میں تجھے تیرے نام سے پہچانتا ہوں اور میں تجھے ہر چیز میں مسرت بخشوں گا »

---

۱ ''پنجابی'' ۵ جون سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

۲ پنجابی مورخہ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ ع ۔ ۳ اخبار انجمن پنجاب ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۷۳ ع ۔

مجھے امید ہے کہ یہ سکون بخشنے والا وعدۂ خداوندی ان مرحوموں کے لیے پورا ہوگا جن کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔

یکم جنوری سنہ ۱۸۷۳ع کو مشہور مستشرق کاونٹ یوسیب دَ سال (Euseb de Salles) کا جو کہ جنرل کاونٹ دَ سال کے عزیز تھے چھہتّر سال کی عمر میں اپنے وطن مون پیلیے (Mont Pellier) میں انتقال ہوگیا۔ موصوف کئی سال سے بڑی مشقت سے السنۂ جدید مشرقیہ کے اسکول میں میرے ہندستانی درسوں میں شریک رہتے تھے۔ سنہ ۱۸۲۸ع میں وہ اس مدرسے کے چند اول ترین طالبان علم میں سے تھے۔ ان کے ساتھ بیرن کارویل دَساں‌مارتاں دَ توستیں دو مانوآر (Caruel de Saint-Martin de Toustain du Manoir) بھی شامل تھے۔ ہندستانی کے درسوں سے انھیں بہت زیادہ دلچسپی تھی کیونکہ انھوں نے ہندستانی نسل کی ایک بہت قابل خاتون جن کی مادری زبان ہندستانی تھی یعنی سارا کریتندن (Sarah Cretenden) سے، جو کاونٹ ایوان دَ لا تراں‌بلے Even de la Tremblaye کی بیوہ تھیں، شادی کی تھی۔ یہ شریف خاتون چالیس سال یوسیب دِ سال کے نکاح میں رہیں اور وفاداری سے ان کی تمام سیاحتوں میں ان کا ساتھ دیا۔ ان کے شوہر کے انتقال کے کچھ عرصہ پہلے ان کا بھی انتقال ہوا اور اسی کا صدمہ ایک بڑی حد تک ان کے شوہر کی موت کا باعث ہوا۔

یوسیب دَ سال نے میرے استاد سیلوستر دَ ساسی (Sylvestre de Sacy) اور کاسین د پرسےوال (Caussin de Perceval) سے عربی سیکھی تھی چنانچہ وہ الجزائر کو فتح کرنے والی فوج کے پہلے مترجم مقرر ہوئے اور اس کے بعد مارسیلی (Marseille) میں داں گابریے تاوئی[1] (Don Gabriel Taouil) کی جگہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے جہاں تیس سال کے عرصے میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت کثیر تھی۔

---

[1] یہ مشہور مصری اور ان کے ہم‌وطن داں دافائی موناکی (Don Rephael Monachis) سلوستر دَ ساسی کے بعد سنہ ۱۸۱۴م میں میرے استاد رہے۔

محض الجزائر میں حسن خدمت کے صلے میں یہ جگہ انھیں دی گئی اور انھیں مشہور مصری سکاکینی پر ترجیح دی گئی جنھوں نے داں کبرے کی جگہ کام کرنا شروع کردیا تھا۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کوئی جگہ پانے والا ہوتا ہے اور وہ اسے نہیں ملتی۔

یوسیب دَ سال ہر فن میں کامل تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں علوم مشرقیہ، فلسفے اور طب پر لکھی ہیں اور ایسے ناول لکھے جن میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئے۔ ان کے "سفر نامہ ہائے مشرق" نہ صرف غایت درجہ دلچسپ بلکہ سبق آموز ہیں۔ اپنی "تاریخ عام نسل ہائے انسانی" (Histoire Generale des races Humaines) میں انھوں نے اپنی سیاحتوں میں اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر انجیل مقدس کے اس بیان کی تائید کی ہے کہ نسل انسانی کی بنیاد ایک ہی ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ ان کے دوست مسٹر بیرن گاستان دَ فلوت (Gaston de Flotte) نے جو ان کی خداداد قابلیت کے معترف ہیں اور خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی مجموعۂ اضداد طبیعت سے محبت رکھتے تھے، گزت دو می دی (Gazette du Midi) میں ایک مضمون لکھا ہے جو خیالات اور تحریر کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

ھنری کرتس (Henri Kurtz) جو مشہور مستشرق تھے ۲۵ فروری کو فوت ہوئے۔ یہ بھی میرے درسوں میں شریک رہ چکے ہیں مگر آخری زمانے میں یعنی سنہ ۱۸۵۴ع تا سنہ ۱۸۵۵ع۔ اس کے بعد بھی ہندستانی کی تحصیل سے انھیں دلچسپی رہی اور ان کے پیرس چھوڑنے کے کئی سال بعد تک مجھ سے ان سے خط و کتابت رہی۔ بویریا میں اپنے آزاد خیالات کی وجہ سے انھیں جن مصائب کا شکار ہونا پڑا اور سوئٹزرلینڈ میں وہاں کی نام نہاد کلیسائی جماعت سے ان کی جو مخالفت ہوئی ان سے یورپ کی پبلک ان کی تصنیفات اور بحیثیت پروفیسر ان کے کام کے مقابلے میں زیادہ واقف ہے۔ وہ ضلع آرگووی (Argovie) کے اسکول کے پروفیسر اور شہر آراؤ (Aaraw) کے کتب خانے کے مہتمم تھے اور اسی شہر میں ان کا انتقال ہوا۔

۱۴ اپریل کو بمقام پیرس کپتان ہنری بلاس لینچ (Henri Blosse Lynch) کا انتقال ہوا۔ تقریباً بیس سال سے وہ پیرس ہی میں مقیم تھے اور یہیں ان کے قابل فرزند کا انتقال ہوا۔ کپتان صاحب انگریزی بحری فوج میں کماندار تھے۔ ہندستانی السنہ اور فارسی عربی میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ یہ سب زبانیں انھوں نے کلکتہ میں سیکھی تھیں اور ان میں بےتکلفی سے بات چیت کرسکتے تھے۔ ایشیا کے بیش‌تر شہروں کا دورہ کرنے کی وجہ سے انھیں یہ خصوصیت حاصل ہوگئی تھی کہ بہت اہم امور میں وہ حکومت انگریزی کی طرف سے ترجمے اور تفہیم کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔ بہت سی اہم مہمات خلیج فارس، سندھ، شام، برما (جہاں وہ فتح رنگون سنہ ۱۸۵۱ع میں شریک تھے) اور پیرس میں ان کے سپرد کی گئی تھیں۔ پیرس میں ایرانی سفیر سے وہ صلح کی سلسلہ جنبانی کررہے تھے جس نے بالآخر ۴ مارچ سنہ ۱۸۵۷ع کے معاہدے کی شکل اختیار کی۔

وہ قابل تھے اور خودستائی سے پرہیز کرتے تھے۔ میرے ہندستانی درسوں میں ان سے بہت مدد پہنچی۔ یہ شخص جو ہر ایک کو اپنا ممنون بنا لیتا، اپنے تمام ملنے والوں کا ممدوح تھا، اس کا انتقال میرے ایک بہترین برطانوی دوست کے ضایع ہوجانے کے مترادف ہے۔

پیرس ہی میں اسّی سال کی غیرمعمولی عمر میں یکم مئی کو میرے بہت ہی پرانے درس لینے والوں میں سے ایک آگستان کرسٹوف لامارپکو (Augustin-Christophe Lamare-Picquot) کا انتقال ہوگیا جو بڑے ان‌تھک سیاح اور مشہور ماہر حیوانیات و نباتات تھے۔ میرے ساتھ وہ اکثر ان ہندستانیوں سے ملنے جاتے تھے جو پیرس سے گزرتے تھے تاکہ انھیں ہندستانی بولنے کا موقع ملے۔ ان سے میرے مراسم دوستانہ اور محبت کے تھے۔

۱۸ اکتوبر کو لندن میں (بمقام الگزنڈرا ہوٹل، ہایڈ پارک کارنر) مسٹر ڈبلیو۔ فاکس (W. Fox) کا انتقال ہوگیا جو نواب بنگال کے معتمد خاص تھے اور جن سے انھیں اس‌قدر محبت تھی کہ ان کے انتقال کے بعد وہ مع اپنے بیٹے اور اپنے

درباریوں کے ان کے جنازے کے ساتھ گئے اور ان کا رنج و الم دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ میں پیرس میں جب نواب سے ملنے جاتا تھا تو مرحوم سے بھی ملاقات ہوتی تھی اور میں دیکھتا تھا کہ کس قدر روانی سے وہ ہندستانی میں گفتگو کرسکتے ہیں۔ وہ بہت نیک دل اور با اخلاق آدمی تھے اور سب لوگ جو انھیں جانتے تھے ان کی وفات پر متاسف ہیں۔

ہم اس پُرحسرت فہرست کو ایک انگریزی بھجن کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں جو یوحنا کے ایک مشہور حصے سے ماخوذ ہیں:۔

"(حقیقی) مسرت ان مرحوموں کو حاصل ہے جو اپنے خدا کی ہستی میں بڑے لطف سے فنا ہوگئے ہیں۔ اب وہ تمام مشقتوں سے آزاد ہیں اور حفاظت سے خدا کی نگہبانی میں آرام کررہے ہیں۔ روح القدس نے انھیں خوش نصیب اور ہمیشہ کے لیے خوش نصیب قرار دیا ہے[1]۔"

Happy are the faithful dead,
In the Lord who sweetly die;
They from all their toils are freed,
In God's keeping safely lie.
There the spirit has declared
Blest, unalterably blest.

مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری

(۴)

(از نورالحسن صاحب ہاشمی ایم - اے، علیگ)

۲ فروری سنہ ۱۹۰۵ع آج کل برف بہت گر رہی ہے اور ہوا بہت تند چلتی ہے جس سے بےحد سردی ہے اور کثرت برف سے مٹر، چنا، ارہر اور آلو جاتا رہا اور جو ظروف پانی سے بھرے ہوئے صحن میں رکھے تھے ان میں بھی برف جم گیا اور گڑھا تالاب مخدوم پور کا ایک حصہ اس سے منجمد ہوگیا - آج کل نہایت شدت کی سردی ہے کہ میری کوٹھی کے اندر انگلیاں ٹھٹھری جاتی ہیں اور صبح و شام دونوں وقت اپنی کوٹھی میں انگیٹھی روشن کرایا کرتا ہوں جب چین پڑتی ہے -

۶ مارچ سنہ ۱۹۰۵ع آج شب کو میر جدید پوتے میر انیس لکھنؤ نے چودھری محمد جان صاحب تعلقہ‌دار کے امام باڑہ میں مرثیہ مصنفہ خود پڑھا جن کا یومیہ ایک رات ٹھیرنے کا پچاس روپے قرار پایا تھا - باوصف طلب میں شریک مجلس نہیں ہوا کہ اب مجھے خوشی دنیاوی کا کوئی لطف باقی نہیں اور بحالت افسردگی ایّامِ زندگانی بسر کیے جارہا ہوں - برخورداران مصطفیٰ علی و مجتبیٰ علی شریک ہوئے تھے - سنا گیا کہ کچھ اچھا نہیں پڑھا -

۲۹ جنوری سنہ ۱۹۰۶ع

میلہ کنبھ الہ‌آباد میں جو ابھی ختم ہوا ہے بیس لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۰۶ع کو کثرت اژدحام سے دس آدمی ہلاک ہوئے اور اٹھارہ سخت مجروح ہوئے۔

۱۰ مارچ سنہ ۱۹۰۶ع

چونکہ نوردیدہ انجمن دختر برخوردار سعیدالدین کم‌عمری یعنی عمر انیس سال میں بیوہ ہوگئی لہذا برخلاف رسم قدیمہ یہ تجویز کیا ہے کہ اس کا عقد ثانی کرایا جاوے۔

۱۷ اپریل سنہ ۱۹۰۶ع

لکھنؤ کے چہلم کی خبر جو ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۰۶ع کو تھا، یہ معلوم ہوئی کہ سنیوں اور ہندوؤں کے تعزیے نہایت دھوم دھام سے اٹھے اور گشت کیا۔ منشی احتشام‌علی ولد منشی امتیازعلی مرحوم کی اراضی میں دفن ہوئے جو اب پھول کٹورہ کے نام سے موسوم ہوئی ہے۔ راستہ میں شربت و پانی کی سبیلیں قایم تھیں۔ مجمع ہمراہ تعزیوں کے اس‌قدر تھا کہ ایسا تال‌کٹورہ کی کربلا میں شاید کبھی نہ ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ سے سوا لاکھ تک آدمیوں کا مجمع تھا۔ اثنائے راہ کربلا میں جان محمد نے ایک ہوٹل قایم کیا تھا جہاں ہر شخص کو مفت کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ گھوسیوں نے چھے سو من دودھ کا بندوبست کیا جو شربت میں ملایا گیا تھا۔ منشی احتشام‌علی نے کربلا پھول‌کٹورہ میں تقسیم طعام کا بندوبست کیا تھا جو ہرایک کو دیا جاتا تھا۔ گول دروازہ لکھنؤ سے پھول‌کٹورہ کربلا تک تین کوس کا فاصلہ ہے۔ اثنائے راہ میں بیس پچیس سبیلیں ہر قسم کی تھیں جن میں برف پڑا ہوا تھا۔ کربلا میں ہر قسم کے فرقہ و طبقہ کے لوگ از رؤسا تفریح‌کناں تھے۔ برخلاف اس کے تال‌کٹورہ شیعوں کی کربلا میں سنّاٹا تھا حتیٰ‌کہ غلام‌حسین عرف بُتّن صاحب کا تعزیہ جو بارہ بجے نہایت مجمع کے ساتھ اٹھتا تھا وہ چار بجے شام تک بوجہ نہ ملنے مزدوروں کے نہیں اٹھ سکا۔ لکھنؤ اہل‌تشیع سے یہ بڑی غلطی ہوئی جو انھوں نے قید لگائی تھی کہ سُنّی و ہندو جو اپنے تعزیے تال‌کٹورہ کی کربلا میں لے جائیں وہ ننگے سر برہنہ پیر ہوں۔

ایسی حماقت پر ان کو شکست فاش ملی کہ سُنّی و ہندو متفق ہوگئے اور انھوں نے بالاتفاق یہ کارروائی کی۔

۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع

آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع وقت شب کو ہز آنر سر لاٹوش صاحب لفٹننٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ کی جانب سے بمقام نینی تال ان کی کوٹھی کے سامنے محفل میلاد شریف منعقد ہوئی اور اس جلسہ کا اہتمام صاحب بہادر کے حکم اور ان کے اہتمام سے ہوا تھا۔ محفل کی آراستگی و شیشہ آلات کی روشنی اور آدمیوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ مولانا حاجی حافظ ولایت حسین صاحب جو الہ آباد سے بلوائے گئے تھے جب آپ جلسہ میں تشریف لائے تو لاٹ صاحب نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور تخت پر بیٹھنے کی اجازت دی اور سب اہل مجلس کو تاکید فرمائی کہ کوئی ہماری تعظیم کو نہ اٹھے۔ مولوی صاحب نے تین گھنٹے کے قریب مولود پڑھا۔ لاٹ صاحب نے ایک گھنٹہ سے کچھ زاید بہت دلچسپی سے بیان سنا، اس کے بعد اٹھ کر مولوی صاحب سے ہاتھ ملایا اور یہ کلمات فرمائے کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ میں شریک کیا۔

۲۱ نومبر سنہ ۱۹۰۷ع

چونکہ زمانہ قحط سالی ہے جس سے ہرایک شے گراں و کمیاب ہے اور سب سے بڑی کمیابی گھاس کی ہے جو بالکل میسر نہیں آتی اور مویشی مرے جاتے ہیں لہذا ہندو مسلمان دونوں اپنے مویشی قصائیوں کے ہاتھ فروخت کررہے ہیں اور گوشت کا نرخ آج کل سستا یعنی دو پیسے فی سیر فروخت ہوتا ہے اور ان کا چرسہ معمول سے زیادہ قیمت پر بکتا ہے آج کل قصابوں کی اس قدر تعداد بڑھ گئی ہے کہ ہرایک ادنیٰ قسم کے مسلمان نے یہ پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ آج کل مویشیوں کی وبا ہے۔

۲۶ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ع

آج نرخ غلہ بازار سندیلہ میں حسب ذیل ہے:—

گندم	آردگندم	نخود	دانہ نخود	ماش
۷ سیر	ساڑھے ۶ سیر	۸ سیر	ساڑھے ۸ سیر	۵ سیر

دال ماش	مونگ	دال مونگ	ارہر
ساڑھے ۴ سیر	ساڑھے ۷ سیر	ساڑھے ۶ سیر	۹ سیر

دال ارہر	جوار	باجرہ	آرد باجرہ	چاول
ساڑھے ۶ سیر	۹ سیر	ساڑھے ۸ سیر	ساڑھے ۷ سیر	۶ سیر

جو	آرد جو	مکائی	دھان	نمک	گھی
۹ سیر	۸ سیر	۱۰ سیر	۱۱ سیر	۱۹ سیر	۱ سیر ۳ چھٹانک

روئی	قند سیاہ	سرسوں	روغن سیاہ
سوا ۳ سیر	۶ سیر	ساڑھے ۵ سیر	۲ سیر ۲ چھٹانک

۱۳ فروری سنہ ۱۹۰۸ع سنا گیا ہے کہ چوک لکھنؤ میں شیعہ و سنی میں سخت مقابلہ ہوگیا۔ سنت جماعت لوگ حسب الحکم ڈپٹی کمشنر لکھنؤ چاریاری مرثیہ پڑھتے جاتے تھے اور شیعہ لوگوں نے خلاف اجازت تبرّا کہنا شروع کردیا۔ پولس نے مزاحمت کی۔ باہم پولس اور شیعوں کے لڑائی شروع ہوگئی۔ سنت جماعت نے موقع پاکر شیعوں کو خوب مارا حتیٰ کہ ان کا ایک آدمی مرگیا اور پولس کے لوگ شیعوں کے حملہ سے مجروح ہوئے۔ حکام وقت فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ ایک سو سے زاید شیعہ گرفتار ہوکر زیر حراست پولس ہوئے۔ اب تحقیقات ہورہی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

۱۱ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع .... بعدہ راجا صاحب نے مجھے ایک کتاب دیوان حافظ مطلاّ مع تصویر بادشاہان سابق دکھلائی جو ایک سو برس کی لکھی ہوئی ہے۔ نواب بنگش فرخ آباد کے کتب خانہ کی ہے جس کو موصوف الیہ نے بقیمت ایک سو تیس روپیہ خرید کیا ہے۔

۱۱ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع آج ساڑھے چھے بجے صبح کو مسماۃ محمودن اہلیہ بابو معزالدین اشرافٹولہ نے بعوارض چند عمر ۵۰ سال قضا کی۔ متوفیہ کے مزاج میں جھنک اور مالیخولیا پیدا تھی۔ ایک روز متوفیہ مجھ سے کہنے لگیں کہ دنیا میں ڈیڑھ عقل ہے۔ ایک مجھ میں ہے اور نصف تم میں۔ لیکن

اس میں شک نہیں کہ وہ ذی ہوش عورت تھی اور معاملہ کی بہت صاف۔

۲۳ نومبر سنہ ۱۹۰۸ع آج لارڈ منٹو صاحب وائسرائے کشور ہند ایک نہایت عمدہ رام بھج ہاتھی بلرام پور پر سوار ہوکر لکھنؤ مچھی بھون کی راہ سے گزرے۔ ہاتھی مذکور کو ہرایک قسم کا طلائی و نقرئی زیور پہنایا گیا تھا حتیٰ کہ اس کے پیروں میں چاندی کے پازیب تھے اور اس کے عقب میں ۱۶۰ تعلقدار ہاتھیوں پر سوار تھے۔ ہرایک ہاتھی خوب سجا ہوا تھا۔

۲۵ جنوری سنہ ۱۹۰۹ع سر ہویٹ صاحب لفٹنٹ گورنر اضلاع متحدہ آگرہ واودھ نے سر وگبجے سنگھ صاحب مہاراجا بلرام پور و پریسیڈنٹ انجمن تعلقداران کی شبیہ کا افتتاح فرمایا جو بارہ‌دری قیصر باغ میں رکھی گئی ہے۔ اس شبیہ کی تیاری میں چوبیس ہزار روپیہ خرچ ہوا جس کو مسٹر کانسکوب جان نے بنایا اور اس کی بیٹھک کی تیاری میں چار ہزار روپیہ صرف ہوئے جس کو بابو درگاپرشاد سنگ تراش لکھنؤ نے تیار کیا۔

۱۳ مارچ سنہ ۱۹۰۹ع آج لکھنؤ میں تعزیہ چہلم تمثیل باغ سے اٹھا جس کے آگے مرثیہ چاریاری پڑھا جاتا تھا جس کی گورنمنٹ نے قبل آغاز مہینہ محرم ممانعت کردی تھی کہ تعزیہ کے سامنے چاریاری مرثیہ نہ پڑھا جاوے مگر برخلاف اس کے جب سُنّی لوگ چاریاری مرثیہ پڑھتے ہوئے چوک لکھنؤ سے گزرے تو پولس کے لوگوں نے گول دروازے کے پاس سب کو گرفتار کرکے کوتوالی میں کردیا اور جس شخص نے دس روپے کی ضمانت پیش کی اسے چھوڑ دیا گیا۔ باقی لوگ حوالات بھیج دیے گئے۔ پولیس کے ساتھ سٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر لکھنؤ اور بابو سری رام آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کارروائی میں کسی بڑے شخص کی تحریک ہے۔ ورنہ ادنیٰ کم بضاعت لوگوں کو ایسی جرأت نہ ہوتی جو حکم گورنمنٹ کے خلاف کارروائی کرتے۔ مجمع کی تعداد سات آٹھ سو کے قریب سُنی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ فعل سُنّیوں کا بالکل جاہلانہ ہے؛ ان کو خلاف‌ورزی و سرتابی گورنمنٹ کے حکم سے ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

یکم اپریل سنہ ۱۹۰۹ع جن سُنّیان لکھنؤ نے حکم گورنمنٹ کی خلاف‌ورزی کی اور چہلم کے روز تعزیہ کے ساتھ چاریاری مرثیہ پڑھتے ہوئے چوک سے گزرے ان کو مسٹر جاپلنگ صاحب سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ نے تین تین مہینہ قید سخت کی سزادی۔ ۲۹ مارچ سنہ‌الیہ کو ان لوگوں کے خلاف حکم سنایا گیا۔

۸ اپریل سنہ ۱۹۰۹ع آج کے اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ ۵ اپریل سنہ ۱۹۰۹ع کو مسٹر وارٹن صاحب سیشن جج لکھنؤ نے اپیل سُنّیوں کا جنھوں نے چاریاری مرثیہ پڑھا تھا خارج کردیا اور تین ماہ کی سزا مجوّزہ سٹی مجسٹریٹ صاحب لکھنؤ بحال رکھی۔

۱۹ جولائی سنہ ۱۹۱۱ع آج صحبت مشاعرہ مقبرہ منشی سید فضل‌رسول صاحب بر وقت گیارہ بجے دن منعقد ہوئی اور رات تک شعرا اپنا کلام پڑھتے رہے۔ لکھنؤ، سیتاپور، ہردوئی، شاہجہاں‌پور وغیرہ سے شاعر لوگ آئے ہوئے ہیں اور اپنا کلام آبدار سنا رہے ہیں۔ چونکہ بعض شاعروں نے سید التفات‌رسول تعلقہ‌دار کو اپنے ڈھنگ پر لگا لیا ہے اس وجہ سے یہ مشاعرہ ایام عرس میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے اور بعض شاعروں کو خرچ آمد و شد بھی دیا جاتا ہے ایک شاعر لکھنوی مستقل طور پر ملازم تعلقہ جلال‌پور ہیں جو پندرہ روپیہ ماہوار علاوہ کھانے کے تنخواہ پاتے ہیں۔ وہ تعلقہ‌دار صاحب کی جانب سے غزلیں تصنیف کردیا کرتے ہیں اور وہ غزلیں مشاعرہ میں پڑھی جاتی ہیں۔

آج مجھے ایک نئی رسم دریافت ہوئی جو میرے اور دوسرے گھروں میں رائج ہوئی جو پہلے میری سماعت میں نہیں آئی تھی وہ یہ ہے: ۲۱ رجب کو بوقت شب میدہ، شکر، گھی اور دودھ ملاکر ٹکیاں پکائی جاتی ہیں اور اس پر حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا فاتحہ ہوتا ہے اور ۲۲ رجب کی صبح کو وہ عزیز اقارب کو بلاکر کھلائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے ہرایک گھر میں لوگ بلاکر کھلائے جاتے ہیں۔ ٹکیاں باہر نکلنے نہیں پاتی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہوا ہے اس کا

عام رواج ہرایک مقام پر ہوتا ہے۔ میری یاد میں کبھی اس کا تذکرہ بھی سماعت میں نہیں آیا اور یہ فاتحہ ہرایک گھر میں نہایت عقیدت‌مندی کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور یہ رسم برابر بڑھتی جاتی ہے۔

۱۳ نومبر سنہ ۱۹۱۱ع | حکیم عبدالولی لکھنوی اور حکیم محمد اجمل دہلوی یہ چاہتے ہیں کہ ویدک اور طب یونانی کی شرکت ہو اور حافظ عبدالرشید خلف حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کا یہ منشا ہے کہ دونوں کی شرکت نہ ہو۔ اسی وجہ سے یہ جلسے بارہ‌دری قیصر باغ لکھنؤ میں ہورہے ہیں۔ شرکت کے متعلق بہتوں کو اصرار ہے۔ اب دیکھا چاہیے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

مقامی حالات ختم ہوئے، اب یہاں سے ذاتی حالات پیش کیے جاتے ہیں۔ حقیقت میں مولوی صاحب کی یہ ڈائری محض اپنے زمانہ کی ایک دل‌چسپ تاریخ نہیں بلکہ ایک ذاتی سوانح عمری بھی ہے۔ دلی کیفیات اتنے عریاں تو نہیں جتنے (Pepys) کے ہیں مگر مولوی صاحب نے کوئی بات چھوڑی نہیں ہے اور خفیف سا پردہ جو قایم رہا ہے وہ محض اس لیے کہ ان کو یقین تھا کہ میری ڈائری ہرکس و ناکس کے مطالعہ میں آنا چاہیے اور آئے گی۔ ذیل کے اقتباسات سے ان کی پوری زندگی کے حالات' حلیہ' کیریکٹر' عادات' خیالات و جذبات' سلوک' آپس کی رنجشیں خصوصاً خالہ‌زاد بھائی سے جو تعلقہ‌دار تھے' لڑکوں کے خطوط کا خلاصہ جو لندن سے آتے تھے' روزمرہ کے تجربے غرض کہ ہر بات بہت مفصل اور واضح ہے۔ آخر میں ان کی بیوی کی موت کا اثر ان پر تکلیف‌دہ حد تک نمایاں ہے اور اسی زمانے میں وہ چند آرزوؤں کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے تھے جس کا بیان دل‌چسپی سے خالی نہیں اور ڈائری میں افسانویت پیدا کردیتا ہے یہاں تک کہ وہ جان بحق ہوجاتے ہیں۔ میں نے ان کے خاندان کے موجودہ افراد سے ان آرزوؤں کا مطلب پوچھا مگر وہ لوگ بھی نہ بتاسکے۔ بعض کا خیال ہے کہ کہیں باہر جانا چاہتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ کسی عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر چاہتے یہ تھے کہ تحریک دوسری طرف سے ہو۔ غرض کہ بڑی بےقراری اور بےچارگی رہی ہے اور خاتمہ افسوس ناک طریقہ پر ہوتا ہے جو فنی نقطۂ نظر سے دل‌چسپ ہے۔ مولوی صاحب پہلے خوابوں فالوں اور نجوم پر بڑا اعتقاد اور بھروسہ رکھتے تھے لیکن پتہ چلے گا کہ رفتہ رفتہ کیوں‌کر ان چیزوں سے ناامیدی اور مایوسی ہوتی گئی۔ مولوی صاحب موصوف اپنے خوابوں میں خصوصیت سے اعتقاد رکھتے تھے تمام ڈائری ان کے دل‌چسپ خوابوں سے بھری پڑی ہے جن کی تعداد سیکڑوں پر پہنچتی ہے اور جو ایک ماہر نفسیات کے لیے دل‌چسپ مراد کا کام دے سکتے ہیں۔ مولوی صاحب ہر سال کے اختتام پر

اپنی زندگی اور دنیا کے حالات پر ریویو ضرور کیا کرتے تھے جو خالی از دلچسپی نہیں ھیں - ذیل کے اقتباسات میں بھی بہت باتیں (اکثر دلچسپ بھی) بخوف طوالت چھوڑ دی گئی ھیں -

۱۹ نومبر سنہ ۱۸۶۷ع | آج میں نے ٹوپی گول مخملی اودی خدابخش خیاط سے تیار کرائی جو نہایت خوش‌نما اور قابل محفل ھے -

۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ع | زبانی اکبر علی معلوم ھوا کہ کرامت حسین آج کل مجھ سے ناخوش ھیں - بظاھر کوئی وجہ معلوم نہیں ھوتی، شاید الطاف برادرانہ ھو -

۷نومبرسنہ ۱۸۶۸ع | مجھے آج کمال افسوس رھا کہ باوصف اس قدر سن آنے کے میں نے اب تک کوئی لیاقت حاصل نہیں کی لہذا کمال عاجزی سے درگاہ خدا میں دعا کرتا ھوں کہ مجھے لیاقت عطا فرمائے تاکہ میں اپنے ھم‌چشموں سے شرمسار نہ ھوں -

۷فروری‌سنہ ۱۸۶۹ع | غلام علی کاشتکار موضع مخدوم‌پورہ نے بلا وجہ مجھ سے گستاخی کی - لہذا ایک طمانچہ اس کے مارا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنے اس فعل سے نادم ھوا کہ خلاف تہذیب میں نے ایسا کیا -

۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ع | آج میں حسب تحریک منشی فضل‌رسول صاحب بوقت شام لکھنؤ پہنچا - وقت ملاقات کے منشی صاحب نے فرمایا کہ میں تم کو بمقابلہ عنایت حسین و کرامت حسین و فضل حسین و حامد حسن کے چند وجہوں سے اچھا جانتا ھوں - اول تم جھوٹ نہیں بولتے ھو؛ دوسرے، مزاج میں جہالت نہیں؛ تیسرے مغلوب‌الغیض نہیں ھو؛ چوتھے معاملہ فہم ھو - اس وجہ سے میں چاھتا ھوں کہ اپنے علاقے کا جو کورٹ ھونے والا ھے تم کو سربراہ‌کار مقرر کراؤں اور اس میری خواھش کو ضرور حکام منظور کریں‌گے -

۶ مئی سنہ ۱۸۷۰ع | آج کل محکمۂ ریل میں کام کی کثرت ھے - اس وجہ سے ۸ بجے رات کو مجھے مہلت ملتی ھے - ۱۰ بجے سے رات تک کام کرتے کرتے طبیعت مضمحل ھوجاتی ھے -

یکم جولائی سنه ۱۸۷۰ع تقریب ختنه میں میں نے عمده هندستانی کھانا پکوا کر دونوں وقت مارٹین صاحب کو بھیجا جس کو تناول فرماکر بہت خوش هوئے۔ مجھ سے کہا که اس تقریب میں کتنا روپیه صرف هوا۔ میں نے ایک هزار روپیه ازروئے حساب بتلایا۔ بہت تاسف کیا که تم نے ایک سال کی تنخواہ ایک چھوٹی سی تقریب میں خرچ کر ڈالی - یه طریقه ناپسندیده هے۔

۳۰ ستمبر سنه ۱۸۷۰ع آج میں نے پنڈت گوردیال کو پانچ روپے دیے که جو قمر نحس زائچه میں بیٹھا هے اس کی نحوست کے انسداد کے لیے کچھ جپ کریں۔

۱۱ دسمبر سنه ۱۸۷۰ع آدمی هر دلعزیز اسی حالت میں هوسکتا هے جب خودغرضی اس کی ظاهر نه هو اور هرایک کے ساتھ بخلق پیش آئے اور ان کے اغراض کے پورا هونے میں مساعی رهے۔

۱۱ جولائی سنه ۱۸۷۲ع خبر برخاستگی دفتر ریل دریافت کرکے مجھے کمال تشویش لاحق هوئی۔ نهیں معلوم که اب آب و دانه کہاں لے جائےگا اور اس حالت پریشانی میں خواجه معین‌الدین چشتی قدس الله سره کے دیوان میں فال دیکھی - اشعار ذیل برآمد هوئے جس سے هر آینده امید کامیابی کی پائی جاتی هے :

گرچه از جائے برون است و لیکن بخدا — که شب و روز درون دل ما جا دارد

عاقبت چهرهٔ دلدار عیاں خواهد بود — هر که آئینه زنگار مصفا دارد

حسن آں ماه چو خورشید پدید است معین — محرم آن است که او دیدهٔ بینا دارد

۲۳ جون سنه ۱۸۷۳ ع آج جان صاحب ٹھیکه‌دار اینٹ کو شهر کانپور میں دو هزار روپے دیے۔ بعد لینے روپے کے صاحب موصوف نے کمره کے کواڑ بند کرلیے جهاں سوائے میرے اور ان کے دوسرا شخص نه تھا۔ مبلغ دس روپے بطورنذر کے پیش کیے اور اس کے قبول کرنے میں ازحد اصرار کیا۔ میں نے کہا یه امر میری عادت کے خلاف هے اور میں ایسے نذرانه کو کسی حالت

میں جائز نہیں رکھتا لیکن اس نے نہ مانا ' جبریہ زر مذکور دے کر بہت شایستگی کے ساتھ رخصت کیا۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ بحالت سخت انکار ناراض ہو کر کوئی شکایت حاکم سے کردے تو اس کا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے چار و ناچار قبول کرکے ایک ربع اس کا محتاجوں کو تقسیم کردیا۔

۱۸ اگست سنہ ۱۸۷۵ع منشی مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی و آفتاب‌الدولہ رئیس لکھنو نے محل‌سرا نوتعمیر کا ملاحظہ کیا اور ہرایک چیز کو بغور دیکھا اور پسند فرمایا۔ یہ دونوں صاحب منشی فضل‌رسول صاحب کے ان دنوں مہمان ہیں۔

۲۵ نومبر سنہ ۱۸۷۵ع آج والدہ مصطفیٰ علی حویلی نوتعمیر میں آئیں۔ زائچہ آنے مکان کا درج ذیل ہے:

۲۵ نومبر سنہ ۱۸۷۵ع ایک بج کر ۳۰ منٹ

مطابق ۲۵ شوال سنہ ۱۲۹۲ھ یوم پنجشنبہ

۱۶ اگست سنہ ۱۸۷۸ع مولوی ظہور احمد نے خشت ہائے چبوترہ مزار حسن میاں صاحب واقعہ مسجد قدیم اپنے پاخانہ زنانہ میں صرف کیں۔ میں نے منع کیا کہ یہ فعل ناجائز ہے۔ جواب میں ناخوش ہوئے کہ یہ فعل ناجائز نہیں ہے۔ میں نے سکوت کیا اور اس جملہ پر کفایت کی کہ خدا مبارک کرے۔

۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ع آج یہ نصیحت "سوچ سمجھ کر بات کرو کہ پشیمان نہ ہو" مصطفیٰ حسین سے لکھا کر شیشہ کے چوکھٹے میں رکھ کر اپنے کمرہ نشست‌گاہ میں آویزاں کی تا کہ ہر وقت کے دیکھنے سے مجھے اور دوسروں کو نصیحت نیک حاصل ہو۔

۸ مارچ سنہ ۱۸۸۲ع

چونکہ میں تعلقہ جلال‌پور سے تنخواہ کے سوائے نذر تک نہیں لیتا ہوں اور کوئی چیز فصلی باغات و دیہات کی اپنے مکان پر آنے نہیں دیتا ہوں اس وجہ سے میری طبیعت کو کسی وقت کسی قسم کی پژمردگی و تردد لاحق نہیں رہتا اور نہایت بےخوفی اور مستقل مزاجی سے کام تعلقہ جلال‌پور انجام دیتا ہوں -

۲۳ اپریل سنہ ۱۸۸۵ع

آج کل تین قسم کے میں کام انجام دیتا ہوں :- کار مجسٹریٹی متعلقہ سندیلہ، خاص انتظام علاقہ‌داری جلال‌پور، کارروائی میونسپلٹی سندیلہ - اس وجہ سے مجھے بہت کم فرصت رہتی ہے تاہم میں کام سے گھبراتا نہیں ہوں اور کمال مستقل مزاجی سے ان کو انجام دیتا ہوں -

۵ اکتوبر سنہ ۱۸۸۵ع

آج کل خواب خوش میرے معائنے میں آتے ہیں - خدا ظہور نیک فرمائے کیونکہ یہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں اچھے خواب دیکھتا ہوں تو اس کا ظہور اچھا ہوتا ہے اور جب برے دیکھتا ہوں تو برا -

۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۸۷ع

محمد حسین عرف چھوٹن ساکن درگاہ بعمر ۷۰ سال فوت ہوئے اور کل جائداد منقولہ و غیرمنقولہ اپنی مع خانہ سکونت بیچ کھائی - افیون کا استعمال زیادہ تھا - ایک مرتبہ عطاری کی دکان کی تھی اور کل اشیا شیریں بجائے بیچنے کے خود ہی چکھ گئے -

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۸۷ع

ابتداءً میری جائداد آبائی و موروثی کچھ نہ تھی حتیٰ کہ مکان سکونت بھی مشترک تھا جس میں چند اعزّہ کے گھروں سے کھڑکیاں تھیں؛ اس سے مکان غیر محفوظ اور موجب تکلیف کا متصور تھا - ابتداء میری ملازمت مدرسہ سندیلہ میں ہوئی اور اسی وقت سے مجھے شوق حصول ریاست کا پیدا ہوا اور میں نے معاملات رہن بیع کرنا شروع کیے - اولاً ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۷ع کو ایک قطعہ اراضی زرعی موسومہ کسہا تعدادی ۵ بیگہ واقع موضع مخدوم‌پور مملوکہ میر احمد بخش صاحب مرحوم مخدوم‌زادہ درگاہ مبلغ ۱۵ روپے پر رہن رکھا جس کا حاصلات مبلغ ۴ روپے سالانہ تھا - اس کے بعد جوں جوں

میری تنخواہ میں ترقی ہوتی گئی میں ریاست پیدا کرتا گیا اور اس کے حصول میں بباعث کمی زر کے اپنے اوپر بہت تکلیف گوارا کی لیکن شوق کو کسی نہج سے کم نہیں کیا اور اس بات کا ہمیشہ خیال ملحوظ خاطر رہا کہ اس قدر جائداد غیر منقولہ پیدا کر لینا چاہیے کہ بوقت بےکاری معین اپنی مصارف روزینہ کی ہوسکے اور قیام سندیلہ بحالت بےکاری مجبوراً ترک کرنا نہ پڑے ۔ ہزار ہزار شکر پروردگارعالم کہ اس نے اپنے فضل سے میرے ان خیالات کو پورا کیا اور بقدر میرے صرف کے جائداد غیر منقولہ مجھے حاصل ہوئی جس سے ایام بیکاری بآسانی بسر ہو رہے ہیں ۔ میں نہایت مناسب تصور کرتا ہوں کہ جس قدر جائداد غیر منقولہ علاوہ زر نقد اور زیور جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے، حوالہ قلم کروں اور جس قدر تمتع منافع زر تمسکی سے حاصل ہوتا ہے اس کو بھی لکھوں تاکہ میرے جانشیناں کو معلوم ہو کہ ہمارے مورث نے اکیس سال کی مدت میں کس قدر ترقی کی جس سے اکثر رؤسا قصبہ ہذا وغیرہ خوش روزگار کو باعث حسد متصور ہے ۔ دس پندرہ برس قبل جائداد غیر منقولہ کی اتنی قدر نہ تھی جیسی کہ اس وقت ہے اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت کم قیمت پر حاصل ہوئی ۔ اگر وہ زمانہ حال میں بہ نرخ بازار فروخت کی جائے تو کوئی محل شک کا نہیں ہو سکتا کہ دو چند قیمت اس کی ملے ۔

میزان جملہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ

چوالیس ہزار پانچ سو سڑسٹھ روپے سات آنے چار پائی

۲۵ جنوری سنہ ۱۸۸۸ع

میں نے جو خط مبارکباد حصول خطاب منشی نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار محررہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۸۸ع کو بھیجا تھا وہ اودھ اخبار ۲۴ جنوری سنہ الیہ نمبر ۱۳۹ میں طبع ہوا ہے ۔

۱۲ فروری سنہ ۱۸۸۸ع

اخبار خیرخواہ عالم دہلی محررہ ۸ فروری سنہ ۱۸۸۸ع اور اخبار دبدبۂ سکندری رام پور محررہ ۶ فروری سنہ ۱۸۸۸ع میں میرے باغ و کنواں واقعہ موضع برکاپور کی بہت تعریف لکھی ہے ۔ میں نے یہ دونوں چیزیں محض واسطے رفاہ عام کے بنوائی ہیں ۔

۱۷ فروری سنہ ۱۸۸۸ء	آج میں نے فال اپنی بہبودی کی کتاب سکندر نامہ میں دیکھی جس کا یہ جواب نکلا ۔ شعر :

مبارک بوَد فال بر رُخ زدن		نہ بر رُخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن

۱۵ مارچ سنہ ۱۸۸۸ء	صبح کے وقت خواب دیکھا کہ نازنین اہل فرنگ ناکتخدا ایک کمرہ نفیس میں بالتفات مجھ سے پیش آئیں اور اپنے

دونوں رخساروں پر بخوشی بوسے دیے ۔ یہ خواب ایسا ہے کہ کبھی مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن حصول کامرانی اور دولت اس کی تعبیر ہے ۔

۲۳ اگست سنہ ۱۸۸۸ء	تجربہ سے ظاہر ہوا کہ دھبہ ہائے ذیل اشیا مندرجہ تحت سے دھوئے جائیں تو معدوم ہو جاتے ہیں ۔ اگر

گھی کا دھبہ پڑ جائے تو سجّی سے جاتا رہتا ہے ، تیل کا دودھ سے ، روشنائی کا دھی سے ، پان کی پیک کا شکر سے ۔

۷ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ء	دو بجے رات میں سو رہا تھا ۔ ایک کھنکھجورہ نے میری بائیں پنڈلی میں ایسا کاٹا کہ خواب مفقود اور سوزش

سے پریشان ہوگیا ۔ وہ موذی اس وقت مارا گیا جو رزائی میں لپٹا تھا ۔ یہ پہلا مرتبہ ہے کہ مجھے اس سے ضرر پہنچا ۔ سوزش اس کی مساوی نیش بھڑ کے ہوتی ہے ۔ مقام ماؤف پر استعمال عرق پیاز سے افاقہ ہوا جو اس کا علاج مجرب ہے ۔

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ء	آج کل منشی فضل حسین کسی کو نوکر رکھتے ہیں تو اولاً اس سے اقرار لیتے ہیں کہ مظہرعلی (یعنی

راقم) کے مکان پر نہ جانا اور نہ ان سے کوئی تعلق رکھنا یا ملاقات کرنا ۔ ان کا یہ ظن غالب ہے کہ ان کے ملازمان موقوف شدہ علانیہ اور اکثر خفیہ مجھ سے رسم رکھتے ہیں اور میرے خیرخواہ ہیں اور عموماً کل باشندگان سندیلہ کی نسبت انھیں خیال میری ہمدردی کا ہے اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ مرتبہ باوصف تعلقہ‌دار

ہونے کے مجھے کیوں حاصل نہیں ہے - یہ خیالات منشی صاحب بجائے خود درست نہیں ہیں - یہ بات صرف تعلقدار صاحب دولت ہونے سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ رنگ ہی دوسرا ہی ہے جو ہر شخص کو سرسری طور سے نصیب نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اپنے نفس پر اس‌قدر قادر نہ ہو کہ لوگوں سے بلحاظ ان کی منزلت و مرتبہ حال کے پیش آنا ' ان کے مقاصد متوجہ ہوکر سننا اور انجاح مرام میں دریغ نہ کرنا ' ان کے حق میں بوقت موقع کلمہ خیر بولنا ' بوقت استفسار ان کو صلاح نیک دینا ' کسی حاجت‌مند کو بترش‌روئی جواب نہ دینا اور خاص خاص حالتوں میں ان کی دردمندی کرنا ' اکثر مواقع پر ضبط و تحمل کو روا رکھنا ' دشمن کے ساتھ حتی‌الامکان دوستی کا برتاؤ کرنا اور جب عاجز و معذور ہو تو انتقام نہ لینا ' بعض محل پر مصلحتاً اپنا نقصان جائز رکھنا ' ہرایک سے بلا کسی قید کے باخلاق و محبت پیش آنا ' نیک نیتی و خوش چلنی اختیار کرنا ' ایفائے وعدہ میں کوشش کرنا ' غلط بیانی سے احتراز کرنا ' امور معاملاتی میں لغویت کو راہ نہ دینا ' سوچ سمجھ کر بات کہنا ' بلاوجہ کسی کی غیبت و ہجو نہ کرنا ' دشمنوں کے گھٹانے میں توجہ بلیغ رکھنا ' اپنے اختیار و اقتدار پر مغرور نہ ہونا ' مسلک صلح کل اختیار کرنا - جب یہ باتیں اختیار کی جائیں تو اس وقت مرتبہ ہردل‌عزیزی حاصل ہوسکتا ہے - اگرچہ ان سب پر میں ہنوز قادر نہیں ہوں لیکن کوشش کرتا ہوں کہ اپنے نفس کو اس جانب راغب کروں -

۳۰ جنوری سنہ ۱۸۸۹ع

آج کئی روز سے بشب خوابہائے خوش نظر آئے ہیں - دو روز سے تو اپنے کو بمقام بلند اور گھوڑے پر سوار دیکھا اور آج صبح ہاتھی عماری‌دار پر سوار اور ہمراہی میں بہت سا مجمع اور جلوس نظر آیا دیکھیے کہ اس کا ظہور کب ہوتا ہے - میں اپنی عقیدت سے لکھتا ہوں کہ میرے خوابوں کا ظہور کبھی دیر کبھی جلد ضرور ہوتا ہے جس کے امتحانات اور تجربے متواتر ہوچکے اور ہوتے جاتے ہیں لیکن ابھی تک یہ امر امتحان طلب ہے کہ کس موسم و تاریخ و دن کا خواب سریع‌الظہور اور بطی‌الظہور ہوتا ہے -

۱۸ مارچ سنہ ۱۸۸۹ع

.........یہ عجب کارروائی ہوئی کہ بندہ خدا کی عرضی اور معزولی محمد یحییٰ! میں جہاں تک خیال کرتا ہوں تو یہ نتیجہ محمد یحییٰ کے اس ظلم کا ہے جو انھوں نے حافظ باسط علی واجب الرحم کو بلاوجہ ۱۰ مارچ سنہ الیہ کو صدمہ پہنچایا اور اس ظلم و ستم رسیدہ نے آہ سرد کھینچ کر اور سنگ شکیبائی اپنے سینۂ بےکینہ پر رکھ کر خواہان داد رسی اپنے منتقم حقیقی سے ہؤا جو استدعا فوراً مستجاب ہوئی جس کی تصدیق اس شعر سے ہوتی ہے :—

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

۵ مئی سنہ ۱۸۹۰ع

آج صبح کو حاجی وارث علی شاہ صاحب رئیس دیوان نے بطیب خاطر خود مجھے یاد کیا ۔ میں فوراً مکان عبدالعلی موسیٰ پور میں جا کر قدم بوس ہوا ۔ شاہ صاحب نے خلاف عادت خود سر و قد میری تعظیم کی اور نہایت تپاک سے اپنے قریب بٹھلایا اور بعد دریافت خیریت و امور معمولی کے رخصت کیا ۔ وجہ طلب میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ شاہ صاحب نہایت مکرم و محترم بزرگ ہیں ۔ ہزارہا مرد و زن دیہ بدیہ شہر بشہر آپ کے مرید ہیں ۔ آپ سوائے مریدوں کے اور کسی سے کم ملاقات کرتے ہیں ۔ یہ محض آپ کی توجہ و عنایت خاص ہے جو اس صورت سے راقم کو اعزاز بخشا ۔

۱۸ جولائی سنہ ۱۸۹۱ع

امور تقدیری میں انسان کی کوشش فضول ہے لیکن تاہم قناعت پر انحصار نہیں ہوسکتا........

۷ اگست سنہ ۱۸۹۱ع

تجربات پیہم سے مرتبہ یقین حاصل ہے کہ ہر شے نیک و بد کا معاوضہ اس دنیا میں فوری ملتا ہے مگر انسان کو اس کی ادراک کے لیے چشم بصیرت کی احتیاج ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی بابت کسی کو تنبیہ نہیں اور کوئی شخص اپنے اعمال پر غور نہیں کرتا ۔

۵ جولائی سنہ ۱۸۹۱ء

انسان کا دنیا سے بہ نیکنامی گزر جانا اس زندگی سے بہتر ہے جو بہ بدنامی زندہ رہے۔ جب کسی شخص کی عمر قریب بعمر طبعی پہنچے تو اس کو اپنے خدائے لم یزل سے یہ ہی دعا کرنا چاہیے کہ انجام بخیر ہو اور کوئی بدنامی اپنے ساتھ قبر میں نہ لےجاوے۔ میں اس وقت جو اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو تعالےٰ شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے بہت قسم کی نعمت‌ہائے دنیاوی مجھے عطا فرمائی ہیں اور کوئی تمنّا ایسی باقی نہیں رہی کہ جس کا میں آرزومند ہوں اور یوں انسان جب تک زندہ ہے اس کی تمنّاؤں کا تکملہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اب میری خواہش دلی یہ ہے کہ قبل پیش آنے کسی بدنامی یا حزن و ملال، رنج و غم فکر و تردد کے اگر سفر آخرت مجھے پیش آوے تو اس سے بڑھکر کوئی آرزو مجھ کو پیش نہاد نہیں۔ بحالت موجودہ کل سامان آسایش دنیاوی اس کی عنایت سے حسب ذیل مجھے حاصل ہیں: مکان نہایت آراستہ و پیراستہ بہمہ وجوہ مرتب؛ دیہات متعدد، ریاست قبضہ بقدر ضرورت، حکومت، قبضہ، حوصلہ افزائی، رؤسا درجہ اعلیٰ، وقار روبروے حکام وقت، محبت‌ہائے دلی من جانب اہالی قصبہ، وقعت روبروے ہمچشمان خود...

۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۹۱ء

میری طویل علالت سے جس کو ایک سال کا زمانہ ہوا اعزہ و احباب عیادت کرتے کرتے اکتا گئے اور تیمارداری سرانجام دہی خدمات سے گھبرا گئے ہیں۔ خود اول علالت دوسرے طوالت سے پریشان ہوں کہ ایسی چیز کی زیادتی جو باعث تکلیف دہی ہو داخل بےقدری ہے۔

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۹۱ء

انسان اس وقت اپنے مراتب و مناصب میں ترقی کرسکتا ہے جب کہ جھگڑا فساد بلاسود سے اپنے کو محفوظ رکھے اور حتی الامکان مشرب صلح کل اختیار کرے اور اپنے سے بلند مرتبہ لوگوں سے ملنے اور اظہار غرض میں احتیاط کرے اور جو بات زبان سے نکالے اس کو اولاً بخوبی سمجھ لیوے اور غلط بیانی کو علی الخصوص معاملت میں ہرگز راہ نہ دے۔

متانت، سنجیدگی و تہذیب کا شیوہ اختیار کرے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کو اپنے حصول مقاصد میں بالضرور کامیابی حاصل ہوگی اور نگاہ عوام میں ذی‌وقار متصور ہوگا۔

۳۱ جنوری سنہ ۱۸۹۲ع آج میں نے ایک روغن مجربہ برادرم سید حافظ علی ولد رحم‌رحمٰن خان صاحب اپنے درد شانہ میں ملا۔ اس سے اس قدر تخفیف ہوئی کہ میں اپنا دست چپ بلا تکلف سر تک بلند کر سکتا ہوں۔ نقل نسخہ واسطے استفادہ ناظرین کتاب ہذا درج ذیل کیا جاتا ہے :-

نسخہ روغن دافع درد ریاحی۔

لہسن	فرفیون	برگ سداب تازہ	عقرقرحا	پیپل	روغن کنجد یا زیتون
۱ تولہ	۳ ماشہ	ایک تولہ	۴ ماشہ	۳ ماشہ	پاؤبھر

کل چیزوں کو کوٹ چھان کر روغن تلی میں پکائیے اور جب ایک ثلث رہ جائے اس کو چھان کر مقام ماؤف پر مالش کرے۔

۲۲ مارچ سنہ ۱۸۹۲ع مالیخولیا، خبط و بےخوابی وغیرہ کے کئی سبب ہیں اور ان میں خاص خاص وجہیں یہ ہیں :- طبیعت پر زیادہ زور دینا ؛ دوسرے، ورزش نہ کرنا اور جسم سے کم کام لینا ؛ تیسرے، مزاج میں استقلال اور عزم کا نہ ہونا ؛ چوتھے، خطرناک طریقوں سے کام کرنا ؛ پانچویں، دن رات خیال کرنے اور سوچنے کی بیہودہ عادت پر چلنا۔

۱۲ اپریل سنہ ۱۸۹۲ع بابو نوروز علی تحصیلدار سندیلہ کا بظاہر بےمروتی و خشن مزاجی سے کوئی دوست نظر نہیں آتا ...... میں نے اس قسم کا آدمی چھوٹے قد کا کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اپنے راز کو علانیہ افشا کرے۔

۲۴ جون سنہ ۱۸۹۲ع تجربہ سے لکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص سونٹھ صاف چھنی ہوئی بقدر ایک ماشہ و نمک سیاہ ایک ماشہ باہم مخلوط کرکے بعد کھانے آم کے استعمال کرے تو ان کی تحلیل میں کوئی توقف نہ ہوگا کسی ضرر کے بغیر ہضم ہو جائیں گے۔

۹ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء

تجربہ‌کار کا لفظ اسی شخص کی نسبت استعمال ہونا چاہیے جس نے اولاً ہر چیز کو بہ‌نظر غور دیکھا ہو اور بطور خود اس کی نسبت پوری فکر کی ہو؛ دویم، کتابوں کی سیر بہ‌نظر تعمق کرچکا ہو؛ سویم ہم‌عصر لوگوں کی تحریرات کو جو کسی امر خاص کی بابت ہوں غور کیا ہو۔ تجربہ‌کاری کچھ اس بات سے متعلق نہیں ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہوگئی ہو اور وہ ان فضائل سے بےبہرہ ہو۔ اگر جوان آدمی میں ایسے خصائل حاصل ہوں تو وہ بھی تجربہ‌کار کے شمار میں آسکتا ہے۔ جو شخص بلا واقف‌کاری بلا صلاح و مشورت کے کوئی کام کرےگا وہ ہمیشہ غلطی میں پڑےگا۔

۱۷ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء

میں نے بوقت پانچ بجے خواب دیکھا کہ میں ایسے گھر میں بیٹھا ہوں جو مشابہ مکان زنانہ منشی سید فضل‌حسین تعلقہ‌دار کے ہے اور غرب رویہ سہ درے کے جنوبی در میں بیٹھا ہوں۔ ایک عورت نوجوان حسین و جمیل سے میرا عقد ہوا ہے جو سرخ رنگ کی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے اور عطر وغیرہ لگائے ہوئے مجھ سے تعشق پیدا کرنے کی غرض سے شمالی رویہ سہ درے سے نکل کر صحن تک آتی ہے اور پھر سہ درے میں چلی جاتی ہے۔ اس کے عطربیز بال سرد پوشاک سے میرے دماغ کو تازگی اور خوشبو پہنچتی ہے۔ میں جانتا ہوں اس سے بوقت شب وصل نصیب ہوگا۔ اس وقت گویا شام ہو رہی ہے لیکن مجھے اس قدر افسوس ضرور ہے کہ وہ صاحب عقل و فہم نہیں ہے۔ اسی وقت میری آنکھ کھلی اور میں نے اٹھکر بعد وضو نماز صبح ادا کی۔

۱۳ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء

میرے خاندان کا یہ موروثی خاصہ ہے کہ ابتداءً تعلیم و تعلم کا ضرور شغل رہتا ہے بعدہ چاہے وہ جیسا معزز عہدہ حاصل کرے چناں‌چہ میں اپنے چشم دید تین پشت کا ذکر کرتا ہوں کہ ۔۔۔۔

۲۱ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء

مجھے گولڈاِسمتھ مشہور ادیب کا قول نہایت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ ضرور عام پسند

ہوگا ۔ [خوش اطوار لوگوں کو بھی بعض وقت افکار و آلام لاحق ہوتے ہیں مگر یہ صرف اس لیے کہ وہ اپنے اللّٰہ کی نعمتوں کے لیے زیادہ تر اس کے مشکور ہوں یعنی نعمت کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ کچھ تکلیف برداشت کرنے کے بعد اس کو حاصل ہو ۔] یہ نہایت سچا قول قابل عمل ہے ۔

۱۵ اپریل سنہ ۱۸۹۳ء

جس شخص کو اپنے دانت مدت تک قائم رکھنا منظور ہو اسے لازم ہے کہ پان خوری کا استعمال کم اور خلال کی عادت نہ کرے ورنہ میرا تجربہ ہے کہ چونہ مسوڑوں کو کاٹ دیتا ہے اور خلال کرتے کرتے دانتوں کے درمیان فرق پیدا ہو جاتا ہے جس سے چند روز میں انہیں جنبش ہونے لگتی ہے اور بالاخر گر جاتے ہیں اور انسان روٹی و دیگر لذائذ دنیوی سے محروم ہو جاتا ہے ۔

۱۶ جون سنہ ۱۸۹۳ء

جب میں کم سن تھا (مجھے خوب یاد ہے سنہ ۱۸۵۶ء سے) قسم کھانا جیسا اس کا آج کل ضرورت و بلاضرورت عام رواج ہے مطلقاً ترک کردیا تھا اور کبھی سہواً اس کا اتفاق نہیں ہوتا ہے اور میں بہت برا جانتا ہوں کہ لوگ معمولی بات چیت میں بلاضرورت اس کے عادی ہیں جس سے ان کی بےاعتباری متصور ہے اور جب مجھے کبھی کسی عدالت میں اتفاق رائے شہادت کا ہوتا ہے تو وہاں بھی حتی‌الامکان انہیں الفاظ کا استعمال کرتا ہوں [کہ اپنے علم و یقین سے سچ کہوں گا جھوٹ نہ کہوں گا] لیکن قسم کا کھانا اللّٰہ اور رسول کی بالکل میں نے چھوڑ دیا ہے ۔ خدا سے امید ہے کہ وہ ان باقی ایام زندگی میں بھی وہی عادت قائم رکھے گا ۔

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۹۳ء

انسان کو لازم ہے کہ ہمیشہ اپنے سے بڑے رتبہ والوں سے ملتا رہے تو اس کی ذات کو فائدہ اور موجب اس کے وقار کا ہوگا ۔ ورنہ دوسری حالت میں باعث ضرر ۔

۲۱ مئی سنہ ۱۸۹۴ء

کس نیاموخت علم تیر از من　　که میرا عاقبت نشانه نکرد

یہ قول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا بہت صحیح و

درست ہے اور جہاں تک میں نے تجربہ کیا یہ مثل میرے حق میں بہت صادق آتی ہے۔ میں اپنے تجربہ سے لکھتا ہوں کہ جس شخص کے ساتھ میں نے سلوکات کیے اور اس کی بہبودی کا باعث ہوا بالآخر اس سے ضرور میری ذات و مال کو ضرر پہنچا جس کی چند مثالیں میں ذیل میں حوالہ قلم کرتا ہوں:—

۱۳ مئی سنہ ۱۸۹۴ء آج مرزا یعقوب حسن صاحب تحصیلدار کے مکان پر منشی سدیوشن نرائن صاحب حاکم بندوبست تحصیل سندیلہ سے ملاقات ہوئی تحصیلدار صاحب نے میرا ڈپٹی صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ صاحب رئیس سندیلہ نہایت لائق اور وقت کے فلاسفر ہیں۔ کوئی وقت ان کا فضول و رایگاں صرف نہیں ہوتا۔ سرکاری کاموں کی طرف بہت دلچسپی ہے۔ آنریری مجسٹریٹی کام مثل تنخواہ‌دار مجسٹریٹ کے بہت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

یکم جون سنہ ۱۸۹۴ء انسان کو لازم ہے کہ ہمیشہ محنت کی عادت رکھے۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس سے عزت و حرمت حاصل ہوتی ہے اور ہر ایک کی نگاہ میں باوقعت دیکھا جاتا ہے۔ کل کام چاہے جیسے مشکل ہوں بآسانی درست ہوجاتے ہیں اور ہمیشہ وہ اطمینان کے ساتھ بسر کرتا ہے اور اپنے وقت فرصت کو نہایت عزیز رکھتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے اور کاہلی اس کے برعکس ہے جو صاف تر علامت ادبار ہے اور اس کے کل کام ناقص و خراب ہوتے ہیں اور عزت حاصلہ گھٹ جاتی ہے اور کاہل کو بباعث کاہلی ہر وقت فرصت رہتی ہے اس وجہ سے وہ کسی کے وقت کی قدر نہیں کرتا۔ خوب غور کرنا چاہیے کہ ایسا شخص بہت کم ترقی کرے گا اور ہمیشہ نگاہ ذلت سے دیکھا جائے گا۔ اگر شخص کاہل امیر ہے تو چند روز میں وہ مفلس ہوجائے گا اور اگر مفلس ہے تو گداگری کرے گا۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ء دنیا میں تین قسم کے دشمن ہوتے ہیں: اول وہ لوگ جو زبان کی بدولت ہوجاتے ہیں مثلاً زید اپنے مکان پر بیٹھ کر

بلاوجہ بکر کی غیبت کرے تو بکر ضرور زید کا دشمن ہوجائےگا۔ دوم، معاملات و مقدمات کی دشمنی جو زن و زر و جائداد سے متعلق ہے۔ تیسرے، حاسد جو کسی کی ترقی دیکھ نہیں سکتا۔ قسم اول کے دشمن تو زبان روکنے سے گھٹ سکتے ہیں جس کا انسداد ضروری و لابدی ہے۔ دوسری قسم کے اس وقت دشمنی چھوڑدیں گے جب ان سے معاملہ سہولت و ملائمت کرلیا جاوےگا۔ تیسری قسم کے براہ حسد جان و مال کے دشمن ہیں، ان کی دشمنی کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ہاں سلوکات مناسب وقت سے شاید کچھ خفت ہوجائے اور علانیہ دشمنی نہ کریں۔ ان میں اول اہل خاندان علی‌الخصوص کم مایہ بھائی‌بند، دوسرے اہل محلہ، تیسرے بستی کے لوگ ہیں۔ یہ مرض لادوا ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا بجز اس کے کہ اپنے قادر مطلق سے یہ دعا مانگتا رہے۔ اللّٰہم اجعلنا محسوداً و لا تجعلنا حاسداً۔

۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۹۴ع ......میں خود ہی اپنی ذات سے تمام اوقات مصروف رہتا ہوں حتّٰی کہ سوائے رات کے نصف تک چارپائی پر نہیں لیٹتا اور زیادتی محنت سے بےوقت شب دماغ تپکنے لگتا ہے لیکن باوصف ان سب باتوں کے میں تکملہ کام کا اپنے آرام پر مقدم تصور کرتا ہوں۔ خدا میری اولاد کو بھی یہی ہدایت کرے۔

۲۹ اپریل سنہ ۱۸۹۵ع تجربہ کی باتیں:— چنار کے پتّے جلانے سے دیمک دور ہوجاتی ہے۔ ہلدی یا ہینگ پانی میں گھس کر چیونٹیوں کے بل میں ڈال دو، فوراً بھاگ جاویں‌گی۔ گندھک و لہسن کی دھونی سے بھڑ بھاگ جاتی ہے۔ جس کو زنبور کاٹے بفور کاٹنے کے تین کف دست دھنیا کھلادو یا سرکہ سے برف میں تر کرکے کپڑا جائےگزیدہ پر لگادو فوراً تخفیف ہوگی۔

۱۹ مئی سنہ ۱۸۹۵ع شب گزشتہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک مشہور دولت‌مند آدمی کے محل‌سرا میں بیٹھا ہوں اور اس مکان کے محاذ میں ایک کمرہ ہے جس میں ایک معشوقہ حسین بیٹھی ہے جو نگاہ شوق سے میری جانب دیکھ رہی ہے۔ ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۹۴ع اسی قسم کی خوابیں بلاکسی

خیال کیے میں دیکھ رہا ہوں اور کوئی مہینہ ناغہ نہیں جاتا ہے کہ دو ایک مرتبہ نہ دیکھتا ہوں دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے۔

۹ جولائی سنہ ۱۸۹۵ع | آنبوں کی فصل۔ اگر تم چاہو کہ تمہارے آنب کے درخت ہر سال بارآور ہوں تو ہر سال بور آنے کے پہلے کمزور شاخوں کی پنگیاں توڑ کر پھینک دو کہ بجائے بور آنے کے ان میں نئے نئے اور کلے نکلیں۔ نئی شاخیں دوسرے برس پھولتی اور پھل لاتی ہیں۔

۲۷ جولائی سنہ ۱۸۹۵ع | دنیا میں وقت ایک نہایت عمدہ نعمت ہے۔ جو شخص اس کی قدر کرتا ہے وہ نعمت حاصل کرتا ہے اور جو ضائع کرتا وہ تکلیف و خرابی میں مبتلا رہتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کی زیادہ قدر کی حتّٰی کہ موسم گرما میں دن کو بہت کم سویا اور وہ بھی وقت کسی نہ کسی شغل میں صرف کیا جس کا یہ خوش نتیجہ پیدا ہوا کہ میرے کل کام متعلقہ نہایت آسانی سے طے ہوگئے جس کا بہت نیک پھل مجھے ملا اور یہ ہی سبب ہے کہ میں ہر ایک کام غیر معلوم سے بہت جلد واقف ہوگیا اور عوام میں میری قابلیت مشہور ہوئی۔ لہذا وقت ضرور قابل قدر ہے۔

۱۴ اگست سنہ ۱۸۹۵ع | ایک ڈاکٹر حاذق نے بر وقت وفات نسبت حفظ صحت تین نصیحتیں پیش کیں جن کی پابندی سے انسان تندرست رہ سکتا ہے اور زیادہ عمر تک زندہ۔ (۱) صفائی طبیعت (۲) ورزش (۳) کم کھانا لیکن میرے خیال میں اس کے ساتھ نیک‌چلنی کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ سب ہیچ۔ میرے نزدیک نیک‌چلنی اول درجے کی علامت صحت ہے اور وہ تینوں باتیں اس کی فروعات میں داخل ہیں۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۵ع | آج کل ۵۹ انسان اور ۳ حیوان جملہ ۶۲ جانوں کی (علاوہ دیگر مصارف ضروریہ) پرورش و پرداخت میری ذات سے متعلق ہے اور بجز آمدنی مسلم موضع کھوکیرہ و چند ریزہ ملکیت کے اور کوئی دوسرا سلسلہ آمدنی کا نہیں ہے......پس یہ تردد میری روح کو ہر وقت صدمہ

پہنچا رہا ہے اور بعض وقت اس کی پریشانی مجھے از خود رفتہ کردیتی ہے لیکن پھر اس کی شان رزاقی پر بھروسہ کرکے اپنی طبیعت غیرمطمئن کو اس ہندی مثل سے : "جب دانت نہ تھے تب دودھ دیو جب دانت بھئے کا ان نہ دے ؟" تسکین دیتا ہوں۔

۲ اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ع

میں اپنے تجربہ سے لکھتا ہوں کہ جب خدا کسی شخص پر بلائے ادبار نازل کرتا ہے تو پہلے اس کی شے لطیف عقل کو زایل کردیتا ہے کہ وہ راست کو کج اور کج کو راست، حسن کو قبح اور قبح کو حسن علیٰ ھذا کل باتوں کو الٹی سمجھنے لگتا ہے اور اس کی ذاتی صفائی اور خانہ‌داری وغیرہ کے امور میں اسی نہج کے فتورات اور دوستوں کی قلّت دشمنوں کی کثرت ہونی جاتی ہے پس ایک بارگی وہ کشتی بحر فنا میں ایسی غرق ہوتی ہے کہ پھر اس کا ابھار نہیں ہوسکتا جیسا کہ واجدعلی شاہ بادشاہ اودھ گزر چکا ہے اور جیسا سندیلہ میں............

۴ نومبر سنہ ۱۸۹۵ع

جس کے سر میں درد ہو اس کو پچھلے پیروں آہستہ آہستہ چلنا چاہیے، ۱۰ منٹ میں درد سر رفع ہو جائےگا۔

۶ نومبر سنہ ۱۸۹۵ع

میں نہایت راستی سے لکھتا ہوں کہ میں نے جس کام کو شروع کیا اس کے تکملے میں نہایت کوشش کے ساتھ مصروف ہؤا اور اپنے خدا سے اس کے اتمام کی نسبت دعا کرتا رہا۔ بالآخر وہ کام ضرور خوش‌اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہوا۔ ملک ھسپانیہ میں ایک مثل ہے خدا سے مانگو اور ھتوڑے کو بھی لوہے پر مارتے رہو ورنہ صرف دعا مانگنے سے لوہا کبھی نرم نہیں ہوسکتا۔

۸ فروری سنہ ۱۸۹۶ع

انسان کو لازم ہے کہ وہ انحطاط عمر و قویٰ میں اپنی طبیعت کو کھانے و پینے و سونے جاگنے و رفع ضروریات میں بہت سنبھل کر بحالت اعتدال رکھے اور بہ پابندی اوقات ہر ایک کام انجام دیتا رہے ورنہ اس کی تندرستی کبھی قائم نہیں رہ سکتی اور بقیہ ایام زندگانی بلطف بسر نہیں لے جاسکتا۔

۴ مئی سنہ ۱۸۹۶ء

۴۲ سال کا زمانہ ہوا جب سے میں نے نماز کی پابندی کی۔ اسی وقت سے درود شریف ہر نماز کے بعد ایک صد بار و سبحان اللہ بحمدہ ۲۵ بار و سورۂ مزمل ایک بار برابر پڑھتا رہا ہوں........اور چھتیس سال سے یا مظہر العجائب بالخیر بعد نماز عشا کے ۳۶۰ بار ورد میں ہے جس کے اول و آخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھتا ہوں اور ۳۰ سال گزشتہ سے چہل کاف بعد نماز صبح و مغرب ایک بار پڑھا کرتا ہوں۔ ان اوراد کی برکت ورد سے مجھے بہت بڑا نفع دنیاوی حاصل ہوا اور ہو رہا ہے۔

۲۳ اگست سنہ ۱۸۹۶ء

........اور آج صبح کو بوقت رخصت مجھ سے کہا کہ جو حاجت ہو بیان کرو کہ میں اس کے پورا ہونے میں کوشش کروں۔ بجواب اس کے میں نے کہا کہ دعائے خیر۔ کہا کچھ اور مانگو۔ میں نے کہا کہ جو کچھ مجھے مانگنا ہوتا ہے وہ میں اپنے رب العالمین سے مانگا کرتا ہوں اور میں اسی کی ذات پر پورا بھروسا رکھتا ہوں اور شاکر ہوں۔ شاہ صاحب میری اس گفتگو سے بہت متعجب ہوئے۔

۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۶ء

مرد لوگ اسرار محبت کے سمجھنے میں بہت کند ذہن ہیں اور اس بات میں حد سے زیادہ غلطیاں کرتے ہیں اور اسی باعث جنس ذکور کے اشخاص ہمیشہ یہ پوچھتے رہتے ہیں کہ مردوں کو کیونکر معلوم ہو کہ ایک عورت ان سے محبت کرتی ہے یا جس عورت کی محبت اس کو پیدا ہوئی ہے وہ اس کے بارے میں کیا خیال رکھتی ہے۔ واقعی یہ امر کچھ آسان نہیں ہے دو باتوں سے یہ امر اور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ اول تو سچی محبت میں ایک عجیب غریب بات یہ پائی جاتی ہے کہ جس مرد کو کسی عورت سے سچی محبت ہوجاتی ہے۔ تو وہ محبت اس کے مزاج کو منکسر بنادیتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دوسری باتوں کے اعتبار سے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہو اور دوسرے اشخاص کی نسبت جو باتیں دیکھتا اور سنتا ہو ان کو بطور قاعدہ کلیہ نیچی نگاہ سے دیکھتا ہو لیکن جہاں اس کے دل میں کسی عورت کی محبت خالص پیدا ہوئی پھر۔ وہ اپنے اوصاف

کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے اور اس بات کے امتیاز کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہ جاتی کہ آیا وہ عورت بھی اس کی محبت کا خیال رکھتی ہے یا نہیں رکھتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو سابقہ کسی ایسے جنس اناث کے آدمی سے پڑتا ہے جس کا خیال سب کے پیشتر یہ ہوتا ہے کہ محبت کے خیال کو جہاں تک ممکن ہو چھپائے رہے۔ جتنا ہی زیادہ کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہوگی اس قدر وہ اس بات کو ثابت کرتی رہے گی کہ اس کو کچھ بھی محبت نہیں ہے اور اس بات کو صرف وہی مرد جو بہ‌نسبت اپنے دیگر ہم‌جنسوں کے زیادہ چالاک و ہوشیار ہوتے ہیں دریافت کرسکتے ہیں کہ اکثر وہ تمام نفرت کی علامتیں جن کو کوئی عورت کسی مرد کی نسبت ظاہر کرتی ہے عین محبت کی علامتیں ہوتی ہیں۔

۱۳ نومبر سنہ ۱۸۹۶ع | علی‌الصباح بوقت نماز میں نے خواب دیکھا کہ ایک دولت‌مند کی محل‌سرا میں داخل ہوا اور مالکہ مکان نے (جو اب زندہ نہیں) میرے داخلے محل‌سرا کو بنظر مسرت و عزت دیکھا اور ایک معشوقہ دل‌نواز کو جو مجھ سے پردہ کرتی ہے اجازت دی کہ بالاخانہ پر چلی جائے جس کی اوٹ اس نے خود کی لیکن بوجہ غیرکافی ہونے پردہ کے اس کا نصف جسم اسفل صاف نظر آتا تھا جو اطلس کا کلی‌دار پائجامہ جس کی ہر کلی میں گوٹہ و پائنچوں میں لچکہ ٹکا تھا پہنے تھی اور اس کے کڑوں اور چھڑوں نقرئی کی آواز میرے کانوں تک آتی تھی۔ بعدہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیرت میں ہوں کہ یہ کس قسم کی خوابیں ہیں جن کو میں چار سال سے برابر دیکھ رہا ہوں اور جس کا قبل از خواب کوئی وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا ظہور ہوتا ہے۔

۹ جون سنہ ۱۸۹۷ع | آج مجھے دریافت سے معلوم ہوا کہ میرے یہاں ۱۱ لڑکیاں واسطے پرورش و خدمت کے اس قحط سالی میں حاصل کی گئیں........

۱۱ نومبر سنہ ۱۸۹۸ع | اگرچہ قبل اس کے میں چند مرتبہ لکھ چکا ہوں لیکن اب بھی اس کا حوالۂ قلم کرنا غیرمناسب نہیں جانتا کہ

علی‌الصبح مشی کرنا انسان کی تندرستی کے واسطے بہت مفید ہے چنانچہ میں چند سال سے اس کا عادی ہورہا ہوں۔

۲۳ نومبر سنہ ۱۸۹۹ع | ۲۱ نومبر سے سات ستارے برج برجھکہ میں فراہم ہوگئے ہیں جو ۲۵ نومبر تک اسی برج میں رہیں گے۔ دیکھا چاہیے کہ اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔ نجومیوں کا مقولہ ہے کہ جب سابق اسی طور پر سات ستارے ایک برج میں جمع ہوئے تھے تو کروکشیتر کے میدان میں کورو پانڈوں کے درمیان سخت لڑائی ہوئی تھی جس میں لاکھوں آدمیوں کا قتل‌عام ہوا تھا۔ جو ستارے بالفعل برج عقرب میں موجود ہیں ان کے اسم درج ذیل ہیں: آفتاب، مشتری، زحل، مریخ، زہرہ، عطارد، راہ۔ منجملہ ان کے تین ستارے تحت‌الشعاع آفتاب میں غرق ہیں یعنی ان کی قوت بالکل زائل ہوگئی۔ وہ یہ ہیں مشتری، مریخ، زحل۔

۱۳ مئی سنہ ۱۹۰۲ع | "موسم اچھا ہے تاج‌پوشی کا زمانہ قریب آگیا۔ مہمانوں کی آمد آمد ہو رہی ہے۔ ان کے ٹھہرنے کے لیے مکانات منتخب ہوچکے ہیں۔ یہ جلسہ قابل‌دید ہوگا دیکھا چاہیے کہ دیکھنے میں آتا ہے یا نہیں۔ ایک شخص معمولی مقام سے اگر دیکھنا چاہے تو ایک گنی کم از کم پڑے گی مجمع سے دیکھنا نہایت مشکل اور سخت مشکل سے خالی نہیں۔ علی‌الصباح اگر جائیے اور دن بھر بھوکا پیاسا کھڑا رہے تو شاید دیکھنے کو مل سکے"۔ از خط مصطفیٰ‌علی لندن

۲۳ جون سنہ ۱۹۰۲ع | "یہاں ایک بیرسٹر کی آمدنی فی گھنٹہ چھے سو روپیہ ہے۔ اس قدر روپیہ خدا جانے کس گھر میں رکھتے ہوں گے۔ چاروں طرف تخت نشینی کی دھوم دھام ہے۔ لوگ سودائی ہورہے ہیں۔ ایسے تماشائی شاید کہیں ہوں"۔ از خط مصطفیٰ‌علی لندن

۲ جنوری سنہ ۱۹۰۳ع | کل کے دربار جشن تاج‌پوشی ہردوئی میں میری کرسی صف اول میں تھی اور آنریری مجسٹریٹوں کے سلسلے میں پہلی تھی اور میری کرسی کے پیچھے وکلا اور اہل‌کاروں وغیرہ کی کرسی تھی

جس کا ہر آئینہ مجھے فخر ہے کہ ایسا اعزاز اپنے ہم رتبہ اور ہم چشموں میں مجھے حاصل ہوا۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء

"سید علی بلگرامی کو انڈیا آفس میں ایک جگہ مل گئی ہے۔ مترجم کاغذات عربی و فارسی ہیں اور تین سو پونڈ تنخواہ سالانہ ہے"۔ از خط مصطفیٰ علی لندن۔

۲۴ اپریل سنہ ۱۹۰۲ء

میں اس مقام پر پھر حوالہ قلم کرتا ہوں کہ مشی واسطے قیام تندرستی کے نہایت عمدہ علاج ہے خصوصاً صبح شام کی مشی۔ نوجوانوں اور بڈھوں اور ہر عمر کے آدمیوں کو لازم ہے کہ اس کی مزاولت کریں اگر چاہتے ہیں کہ ان کی تندرستی قائم رہے۔ ہزاروں دواؤں سے یہ نسخہ عمدہ اور حکم اکسیر کا رکھتا ہے۔

۱۸ فروری سنہ ۱۹۰۰ء

"رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں کانپور کے کیچڑ کی بہت ہجو کی ہے اور سید اسمٰعیل حسین منیر نے اپنی کلیات میں الہ آباد کے کیچڑ کی۔ میرے خیال میں لندن کا کیچڑ بھی کچھ ان جگہوں سے کم نہیں۔ یہاں سے ایک میل پر ایک مقام ہے جس کا نام ڈلچ ہے۔ پختہ سڑک کا نشان تک نہیں تمام کچی سڑکیں ہیں۔ کیچڑ اس غضب کا ہوتا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے تب بھی ٹخنے دھنس جاتے ہیں مگر ہندستان میں کسی انگریز کے منہ سے اس کی برائی نہ سنیےگا۔ ساری برائیاں و خرابیاں گویا ہندستان ہی میں ہیں"۔ از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

۱۹ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء

"جو میمیں بخدا ہمارے پیشاب کا برتن صاف کرتی ہیں وہی ہندستان میں پہنچ کر ہم کو کتّے سے بدتر سمجھنے لگتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ کیا انقلاب ہے۔ سوائے ہندستانیوں کی خوبی قسمت کے اور کیا کہا جائے۔ ہندستان آ کر یہ برتاؤ کیونکر برداشت ہوگا"۔ از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۰۰ع

"یہاں سال میں صرف دو موسم ہوتے ہیں، گرمی و جاڑا۔ رہی برسات وہ جاڑے کے ساتھ ہے۔ پانی برسنے کی کوئی تعداد و شمار نہیں۔ دن کو دس مرتبہ برسا اور رات کو بیس مرتبہ۔ جنوبی سمندر سے بادل اٹھے، برس پڑے۔ شمالی سمندر سے بخارات دو چار ہاتھ اونچے ہوکر پھٹ پڑے۔ مشرقی چینل نے کچھ کمک بھیج دی کبھی مغربی بحر ذخار نے بدلیوں کے مشکیزوں سے چھڑکاؤ کردیا۔ رات دن یہی ہوا کرتا ہے"۔ از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

۳ اپریل سنہ ۱۹۰۰ع

لندن عجیب مقام ہے یہاں بندر بندریا کا بھی ناچ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نقص ہے کہ عورتیں مردوں سے اسی بے تکلفانہ طور سے ملتی ہیں جیسے مرد سے مرد۔ لڑکے و لڑکیاں حد سے زیادہ آزاد ہیں۔ دن کو کوئی مرد گھر میں نہیں رہتا، چاہے کام پر جائے چاہے سیر تماشے کو۔
از خط مصطفےٰ علی۔ لندن

"کل اور پرسوں لڑائی کا سوانگ مثل چاچر کے بنایا گیا تھا۔ میں بھی دیکھنے گیا تھا اور اس قدر مجمع تھا کہ بیان سے باہر۔ یہاں بھی وہی بے تکاپن معلوم ہوتا ہے جیسا ہندستان میں ہے۔ اگر فرق ہے تو اسی قدر کہ یہاں کسی‌قدر صاف ستھرا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ لکھنؤ سے زاید سیر و تماشے کے شایق ہیں۔ ذرا سی بات میں خلقت ٹوٹ پڑتی ہے" از خط مرتضےٰ علی۔ لندن

۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ع

"جتنی آفات سماوی ہیں وہ لندن کے لیے بنی ہیں۔ کبھی کھرا پڑ رہا ہے، کبھی برف گررہا ہے، کبھی پانی برس رہا ہے۔ اگر ان میں کچھ نہیں ہے تو ابر غلیظ ہی محیط آسماں ہے۔ کھانوں میں یہاں گائے کی زبان اور بیل کی دم بڑی نعمت خیال کی جاتی ہے"۔ از خط مرتضےٰ علی۔ لندن

(باقی آئندہ)

نواب صمصام الدولہ میر عبدالرزاق، شہنواز خاں (وزیر مملکت دکن)

از

(مولوی محمد حسین صاحب محوی، صدیقی اردو لیکچرار مدراس یونیورسٹی)

گزشتہ حکومت مغلیہ کا آخری دور اگرچہ بہت انتشار کا دور تھا پھر بھی اس میں بہت سے ایسے اہل کمال پیدا ہوئے جو اپنے کمالات اور کارناموں کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ انھیں میں نواب صمصام الدولہ میر عبدالرزاق شہنواز خاں بھی ہیں جو اپنے علمی ذوق خاص کر تاریخ دانی اور سخن فہمی میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، جنھوں نے وزارت جیسی سرکاری اہم ذمہ داریوں اور بےانتہا مصروفیتوں کے باوجود ذوق علمی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ زمانے کی ناموافقت اور آئے دن کے خوفناک ہنگاموں کے باوجود علمی خدمت کرتے ہی رہے۔

صمصام الدولہ نے فن سیر میں بڑی واقفیت و مہارت بہم پہنچائی تھی، خاص کر ہندستان کے سلاطین تیموری اور ان کے عہد کے امرا کے حالات گویا ازبر نوک زباں پر تھے۔ نسب دانی میں انھیں کچھ ایسی مہارت خداداد حاصل تھی کہ اس عہد کے اکثر لوگ اپنے بزرگوں کے نام اور حالات ان سے پوچھتے اور تحقیق کرتے تھے[1]۔

ان کو تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں:

---

[1] صفحہ ۲ دیباچہ مآثرالامرا جلد اول از میر عبدالحی فرزند صمصام الدولہ۔

" سن رشد و تمیز کے آغاز ھی سے علوم درسیہ متداولہ میں بہت زیادہ وقت صرف ھوتا تھا پھر بھی میں سیر و تاریخ کی تلاش اور مطالعہ کا بہت شوق رکھتا تھا ' جب کبھی فرصت ھاتھ آجاتی حسب امکان اگلے سلاطین کے حالات پڑھ کر عبرت حاصل کیا کرتا اور بلند مرتبہ مشاھیر امرا کے سوانح سے ضرور کچھ نہ کچھ سبق لیتا تھا۔ کبھی موزوں سخن شعرا کے واقعات سے روحانی لطف بہم پہنچاتا تھا یہاں تک کہ اپنی عمر کے تیسرے عشرے میں (یہاں سے زندگی کے دور میں نیا انقلاب ھوتا ھے) زمانے نے پیشۂ ملازمت کی کشاکش میں ڈال دیا اور وقت کا بیشتر حصہ معاش کے حصول میں صرف ھونے لگا۔ اس نے بےفکری اور خوش حالی کے بعد دوسرے ھی مشاغل میں ڈال دیا ' اوراق کے چھونے کا بھی موقع نہ رہا اور کتاب کی دوستی و آشنائی ختم ھوگئی۔ پھر بھی کبھی کبھی اپنے جمع کیے ھوئے ذخیرے کو صاف لکھ لینے کا خیال دل میں گزرتا اور کھٹکتا رھتا تھا[1]"۔

بہرحال جتنا بھی وقت ملا اور حالات نے جس قدر بھی ساتھ دیا صمصام الدولہ نے اپنا گرانبہا حصۂ عمر تالیف و تصنیف اور مطالعۂ کتب یا اسی قسم کے اور عمدہ کاموں میں گزارا اور اپنی دو تین علمی یادگاریں ایسی چھوڑ گئے جو آپ اپنی نظیر ھیں۔ ان میں ایک تو " مآثرالامرا " ھے دوسری " بہارستان سخن " جس کو اب تک ناقدری زمانہ کی بدولت طبع اور شائع ھونے کی عزت حاصل نہیں ھوئی۔ تیسری کتاب کا نام انھوں نے اپنی دوسری کتاب کے دیباچے میں ' موائدالفوائد ' بیان کیا ھے۔ پہلی تصنیف اپنے موضوع کے لحاظ سے معرکہ آرا اور نہایت درجہ قابل قدر ھے ' ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی جانب سے عرصہ ھوا کہ تین موٹی موٹی جلدوں میں چھپ کر معدوم ھونے سے محفوظ ھوگئی ھے اگرچہ آج کل بھی کمیاب بلکہ عام طور پر نایاب ھے۔

یہ کتاب ان کے فرزند میر عبدالحی خاں صمصام الملک نے ان کی وفات کے بعد مرتب کی ھے۔ اس کے شروع میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (رح) نے مصنف کے حالات زندگی لکھے ھیں۔ مولانا آزاد دور آخر کے بڑے نامور عالم ' مصنف اور شاعر گزرے

---

۱ دیباچۂ مصنف مآثرالامرا جلد ۱ صفحہ نمبر ۲ -

ہیں اور مصنف کے نہایت گہرے دوست تھے۔ انھوں نے تحریر حالات میں کسی شاعرانہ مبالغہ یا دوستانہ مدح سرائی سے کام نہیں لیا بلکہ صداقت کے ساتھ حق دوستی ادا کیا اور صحیح حالات پیش کردیے ہیں۔

صمصام الدولہ کے اجداد اور اصل وطن

ان کا اصل سلسلہ مقام خواف کے بلند مرتبہ سادات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ میر کمال الدین اکبر بادشاہ کے عہد مبارک میں خواف سے روانہ ہوکر ہندستان پہنچے اور سلطنت کے اعلیٰ درجہ کے ملازمین کی سلک میں شامل ہوئے۔ ان کے بیٹے "میرک حسین" جہانگیر بادشاہ (رح) کے زمانۂ حکومت میں سلطانی نوکری سے سرفراز ہوئے۔ پھر ان کے فرزند دل‌بلند میرک معین‌الدین نے شاہ جہاں بادشاہ (رح) کے دور سلطنت میں امانت‌خاں کا خطاب اور ایک اعلیٰ منصب پاکر سربلندی حاصل کی۔ حضرت اورنگ‌زیب عالم‌گیر کے دور فرماں روائی میں انھیں لاہور، ملتان، کابل اور کشمیر کی دیوانی کا مرتبۂ بلند ملا اور جس وقت شاہزادۂ شاہ‌عالم ملتان کی صوبہ‌داری کے اعلیٰ منصب پر نامزد ہوئے، امانت‌خاں موصوف ان ممالک کی مذکورہ دیوانی کے ساتھ نیابت صوبہ‌داری کے بلند منصب پر بھی فایز کیے گئے۔ یہ بزرگ اپنے خطاب کے موافق نہایت امانت و دیانت کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان کی دیانت کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ دیوانی کے دنوں میں ایک بار بادشاہ سلامت کا فرمان ان کے نام شرف صدور لایا کہ "فلاں شخص کو بارگاہ شاہی میں بھیج دیا جائے"۔ امانت‌خاں نے اس آدمی کو بلا کر حکم شاہی سنایا؛ اس نے کہا: "اگر حضور میری آبرو کے ذمہ‌دار ہوں تو میں جاتا ہوں"۔

امانت‌خاں نے فوراً جواب دیا "بھلا میں اس شخص پر کیسے بھروسا کرسکتا ہوں جس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ایسا ویسا کیا ہو (یعنی عالم‌گیر بادشاہ) اور تمھارا کفیل کیونکر ہوسکتا ہوں"۔

یہ خبر سرکاری مخبروں نے بادشاہ سلامت تک پہنچادی کہ "حضور کی نسبت امانت‌خاں کا یہ خیال ہے"۔ بادشاہ سلامت سخت برہم ہوگئے؛ انھیں جاگیر، منصب اور

دیوانی خالصہ سے معزول کردیا ۔ امانت خاں کچھ دنوں بے کار رہے ۔ پھر بادشاہ کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ شخص خدا سے ڈرا اور میرا ذرا بھی ملاحظہ نہ کیا، کیا خوب آدمی ہے ۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ پھر ان کو نوازا اور امانت خاں کی اس مبارک صفت خدا ترسی نے ان کو بحال کرادیا ۔ منصب، جاگیر اور خالصہ کی دیوانی کو پھر رونق امتیاز بخشی اور ان کی بلند شخصیت ایک حد تک بادشاہ کے ذہن نشین ہوگئی ۔ جن دنوں بادشاہ سلامت ہندستان میں تھے اور دکن کے صوبہ دار خان جہاں خان بہادر کوکلتاش تھے، دکن کی وزارت، دیوانی، بخشی گیری اور وقائع نگاری کی اہم خدمتیں امانت خاں کو مرحمت ہوئیں ۔ ان کا یہ مرتبہ تھا کہ خود صوبہ دار خان جہاں خاں اکثر ان کے گھر آتے رہتے تھے ۔ اس کے بعد اورنگ آباد کی نظامت بھی انھیں کے سپرد ہوگئی ۔

ان کے بیٹوں میں سے چار نے بلند مراتب پائے :-

۱ ۔ میر عبدالقادر دیانت خاں ۔

۲ ۔ میر حسین امانت خاں[۱] ۔

پہلے صاحبزادے دیوانی اور دوسرے دیوانی خالصہ کے بلند منصب پر سرفراز ہوئے ۔ پھر امانت خاں بندر سورت کے حاکم اعلیٰ مقرر ہوئے ۔ ان کی وفات کے بعد یہ خدمت دیانت خاں کو سپرد ہوئی ۔ یہ پہلے بھی دکن کی دیوانی پر مامور ہوچکے تھے ۔ حکومت سورت کے بعد پھر دوبارہ اس عہدے پر سرفراز ہوئے ۔ تیسرے فرزند میر عبدالرحمن وزارت خاں تھے، گرامی تخلص تھا، انھوں نے مالوہ اور بیجاپور کی دیوانی کے منصب پر سربلندی حاصل کی ۔ شعر برجستہ کہتے تھے صاحب دیوان ہوئے ہیں ۔

---

۱ امانت خاں مذکور کی اولاد بہت ہوئی اور اتنی کثرت سے بڑھی کہ اس قبیلے کا ایک بہت بڑا محلہ اورنگ آباد میں آباد ہوگیا ۔ دکن کی دیوانی اور ان ممالک کی اکثر اعلیٰ خدمات کا سلسلہ اسی خاندان کے ارکان سے وابستہ رہا اور ایک دنیا نے اس عالی و بزرگ خاندان کے فیض سے بہت کچھ حاصل کیا۔

صمصام الدولہ کے دادا

چوتھے بیٹے محمد کاظم خاں صمصام الدولہ کے حقیقی دادا تھے۔ امانت خاں کی وفات کے بعد بادشاہ خلد مکاں عالمگیر نے ان کے پس ماندوں اور متوسلوں میں سے ہرایک کو ان کی حالت اور حیثیت کے موافق منصب اور عطائے خدمات میں ترقی دی۔ یہ بزرگ بھی اضافۂ منصب کے ساتھ پہلے صوبۂ بیجاپور کے عہدۂ "بیوتاتی" پر، اس کے بعد جالناپور صوبۂ اورنگ آباد کی فوجداری پر فائز اور عزت یاب ہوئے۔ ساتھ ہی کچھ اور پرگنے بھی جالناپور کے ساتھ ملادیے گئے تھے۔ پھر دارالسلطنت لاہور کی دیوانی پر سرفرازی پائی۔ اس زمانے میں ان کے خاندان کی ترقی و عروج کا بازار رونق پر تھا۔ محمد کاظم خاں مئے نوشی کے عادی تھے اور وزیرخاں شاہجہانی کے ایک نواسے دارالسلطنت کے سوانح نگار تھے۔ انھوں نے رپورٹ میں یہ حال لکھ مارا، ملاحظہ کے بعد بادشاہ سلامت نے ارشدخاں سے پوچھا جو اس وقت دیوان خالصہ تھے اور فرمایا کہ "امانت خاں کی اولاد میں اس قسم کی باتیں قیاس سے دور اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں لیکن سوانح نگار بھی ہمارا خانہ زاد ہے وہ کیوں جھوٹ لکھنے لگا"۔ پھر ذرا سوچ کر اپنی انتہائی شریعت نوازی اور سخت احتساب کے باوجود ان کے والد مرحوم کے حالات سے حسن ظن اور ان کی بہترین خدمات کے حقوق کا پاس کرکے داروغہ کو ارشاد ہوا کہ جواب میں لکھ دو "دونوں خانہ زاد ہو ایسا نہیں چاہیے کہ تم ایک خانہ زاد دوسرے خانہ زاد کے بارے میں ایسی ناپسندیدہ اور بری باتیں ہمارے حضور میں پہنچائے"۔

محمد معظم بہادر شاہ کے سب سے بڑے فرزند شاہزادہ محمد معزالدین ایک بار صوبۂ ملتان کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ وہاں جاتے ہوئے لاہور میں ٹھیرے۔ خان موصوف شرف یاب بارگاہ ہوئے تو شاہزادے صاحب نہایت مہربانی و لطف اور کمال اکرام و قدردانی سے پیش آئے۔ دو تین روز کے اندر کچھ اس قدر دونوں میں موافقت اور خصوصی روابط ہوگئے کہ شاہزادے نے بہت اصرار اور منت کے ساتھ ان کو اپنے ہمراہ چلنے پر مجبور کیا اور اس کے لیے بادشاہ سلامت کے پاس درخواست بھیجی۔ شاہی روبکاری سے ملتان و ٹھٹھہ اور اسی کے ساتھ بھکر اور سیوستان وغیرہ ملاکر

اس وسیع علاقے کی دیوانی، ساتھ ہی فوج کی دیوانی خان موصوف کو عطا ہوئی۔ چونکہ دونوں بادہ‌خوار تھے خوب گاڑھی چھنتی تھی، بزم خاص کے محرم اور مصاحب تھے، غیرمعمولی مراسم بڑھ گئے تھے۔ مگر اس پر بھی کاظم‌خاں کو اپنی شان سیادت اور شرافت کا پاس رہا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے امرا اور اعیان دولت اپنی مستورات کا شاہی محل میں آنا جانا امارت کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے لیکن میر کاظم‌خاں نے اسے پسند نہ کیا۔ شاہزادہ موصوف ایک بار خان موصوف کی حویلی کے باغ میں اپنی پرستاران خاص کے ساتھ بطور سیر تشریف لائے اور ایک رات دن وہیں رہے، ان تعلقات کے باوجود خان موصوف نے اپنی مستورات کے لیے اس رواج کو جائز نہ رکھا۔

بلوچ کی مہم کا سر کرنا شاہزادے کا ایک نمایاں کام تھا جس پر حضرت خلدمکاں فخر کرتے تھے۔ وہاں کی فوجیں بالکل پامال اور اس جماعت کی جمعیت کا شیرازہ پاش پاش ہوجانے کے بعد شاہزادے نے چاہا کہ اپنے کسی قابل اعتماد مقرب کی سرکردگی میں بلوچ کی نگرانی کے لیے اپنی فوج مقرر کردیں تاکہ پھر یہ لوگ سر نہ اٹھائیں۔ کئی افسروں سے شاہزادے نے فرمایا لیکن اکثر نے اس خدمت سے انکار کیا مگر خان موصوف اپنے ولی نعمت کے ارشاد پر فوراً تیار اور اسی وقت روانہ ہوگئے۔ بلوچ کی نیک اعتقاد جماعت محض ان کی سیادت کے ادب سے اپنا اسباب و سامان سب جہاں کا تہاں چھوڑکر بھاگ کھڑے ہوئے اور باوجود قوت و جرأت کے مقابلہ نہ کیا۔

شاہزادے نے بادشاہ کو تمام حال لکھ بھیجا، وہاں سے منصب کی ترقی اور خانی کے خطاب کا مزید اضافہ پاکر ناموری حاصل کی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد بادشاہ کے دونوں بیٹوں میں بادشاہی کے لیے جھگڑا ہوا۔ محمد معظم پیشاور سے اپنے بھائی سے نبرد آزمائی کے لیے بڑھے چلے آرہے تھے، ملتان سے ان کے بیٹے شاہزادہ معزالدین بھی اپنے باپ کے ہمراہ ہوگئے اور اپنی جگہ نیابت صوبےداری پر خان موصوف کو چھوڑا۔ جس زمانے میں بادشاہ خلدمنزل دکن میں تھے خان کاظم

معزول ہو کر لاہور چلے آئے تھے۔ دکن بےحد دور ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتے تھے۔ کم و بیش دو تین سال بےکاری کے عالم میں یہیں گزارے۔ آمدنی کچھ نہ تھی اور خرچ بہت زیادہ تھا جو امارت کا لازمہ اور دولت‌مندوں کا وطیرہ ہے۔ آدمی نہایت دیانت‌دار اور امانت والے تھے، ناجایز آمدنی کچھ نہ تھی۔ تمام جاگیر و جائیداد کی آمدنی ارباب نشاط پر خرچ ہوتی تھی۔ ہر صنف کے ارباب نشاط باقاعدہ ملازم اور تنخواہ‌یاب تھے۔ جاگیر کی آمدنی کے علاوہ بیٹوں کی نقد آمدنی بھی سب صرف کرڈالتے تھے۔

مقام ساڈھورا میں جو سرھند کے مضافات میں ہے، بادشاہ اور شہزادے کے حضور میں باریاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے صوبہ پنجاب کی جاگیروں کی نگرانی اور دوسرے شاہزادے کی بخشی‌گیری کے عہدے پر تقرر فرمایا۔ ان شہزادے کا لقب جہاندارشاہ تھا۔ جب یہ بادشاہ ہوئے تو خان موصوف چارہزاری منصب پر فائز ہوئے لیکن اپنے فطری استغنا، بےپروا مزاجی اور زمانہ‌سازوں کے رنگ ڈھنگ، طور طریق سے بےلگاؤ ہونے اور نئے نئے امرا کے برسر اقتدار آجانے کی وجہ سے جو ان کے شناسا نہ تھے، خاص کر کوکلتاش خان کی کینہ‌وری کی وجہ سے جو ہمیشہ دوستی کے پردے میں ان کا کام بگاڑنے میں رہا کرتا تھا، ان کی بہبودی اور ترقی کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی جیسی یہ چاہتے تھے، بلکہ ناقدردانی زمانہ اور اپنی افسردہ دلی کے سبب دربار کا آنا جانا اور سلام و مجرا کا سلسلہ تک ختم ہوگیا۔ ایک روز بادشاہ کی سواری جارہی تھی، اتفاق سے آمنا سامنا ہوگیا۔ اگلے الطاف اور مہربانیوں کی بنا پر دریافت حال ہوئی۔ بیکاری اور پریشان حالی کا ذکر سن کر بادشاہ سلامت نے افسوس کیا اور کوکلتاش خان پر سرزنش ہوئی۔ پھر صوبۂ گجرات و لاہور کی صوبیداری تجویز فرمائی گئی لیکن رشوت کا بازار گرم تھا؛ مشکل سے قلعہ‌داری لاہور کی سند مل سکی۔

فرخ سیر کے آخری عہد میں صوبۂ کشمیر کی دیوانی عطا ہوئی۔ پھر وہاں سے معزول ہو کر دھلی آ گئے۔ چند سال بیکاری و پریشانی میں گزارے۔ آخر سنہ ۱۱۳۵ھ میں ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں وفات پائی۔

صمصام الدولہ کے والد

انھیں کے ایک بیٹے میر حسن علی صمصام الدولہ کے والد بزرگوار تھے لیکن قدرت نے انھیں نشوونما پانے اور دنیا میں رہ کر عزت و سربلندی حاصل کرنے کی فرصت نہ دی۔ صرف انیس بیس سال کی عمر تھی کہ عین آغاز جوانی میں بہ مقام لاہور سنہ ۱۱۱۱ ھ میں وفات پائی۔

نواب صمصام الدولہ

اپنے باپ کی وفات کے پندرہ روز بعد نواب* صمصام الدولہ ۲۹ رمضان سنہ ۱۱۱۱ ھ کو دارالسلطنت لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام میر عبدالرزاق خان تھا۔ ان کے چچا وغیرہ لاہور میں ہی رہتے تھے لیکن خاندان کے زیادہ تر لوگ اورنگ آباد میں تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے نوجوانی کے زمانے ہی میں لاہور سے اورنگ آباد آ گئے اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے پھر نہ جاسکے۔ یہیں پر رہ پڑے تھے۔ ابتدا میں نواب آصف جاہ (طاب ثراہ) کی پیش گاہ سے سنہ ۱۱۳۵ ھ میں ایک معمولی منصب پر سرفراز ہوئے، مگر پھر تھوڑے ہی دنوں بعد صوبہ برار کی دیوانی بادشاہی پر مقرر کیے گئے اور مدتوں اس بلند عہدے پر مامور رہ کر نہایت عمدگی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے اس شان کے ساتھ کہ ایک بار خود نواب آصف جاہ نے فرمایا کہ «کار میر عبدالرزاق نمکے دارد»۔

سنہ ۱۱۵۰ ھ میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے نواب آصف جاہ کو حضور میں طلب کیا۔ نواب موصوف اپنے فرزند سعید نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کو اپنا نائب بنا کر دکن سے دارالخلافہ کو روانہ ہوئے، انھوں نے صمصام الدولہ کو برار سے اورنگ آباد بلا لیا۔ دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی۔ رفیق خاص اور مصاحب و محرم بن گئے۔ نواب نظام الدولہ نے اپنی سرکار کی دیوانی اور شاہی دیوانی دونوں عہدوں پر سرفراز فرمایا۔ شہنواز خاں ان دونوں اعلیٰ خدمتوں کو پورے استقلال سے سرانجام دیتے رہے، دیانت و امانت کا بدرجۂ کمال ثبوت دیا، رشوت ستانی کا یک قلم خاتمہ کر دیا۔

---

* صفحۂ ۲۳ جلد ۳ مآثر الامرا۔

نواب آصف جاہ جب ہندستان سے دکن واپس ہوئے تو بہکانے والوں نے نواب نظام الدولہ کو اپنے والد بزرگوار کی مخالفت پر آمادہ کیا مگر صمصام الدولہ اس کے بالکل خلاف تھے بلکہ برابر موافقت پر ابھارتے رہتے تھے۔ لیکن افسوس ان کی ایک نہ چلی ۔ آخر ایک دن باپ اور بیٹے میں جنگ ہوکر رہی۔ صمصام الدولہ اپنے آقا نواب نظام الدولہ کے ہاتھی پر ان کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کی فوج نے آصف جاہ اول کی فوج سے شکست کھائی۔ شہنوازخاں مدت تک نواب آصف جاہ کے معتوب رہے اور گوشہ نشینی اختیار کی، مگر وہ اس گوشۂ عزلت میں مآثرالامرا کی تصنیف میں مصروف رہے۔ پانچ سال کا زمانہ اسی عزلت میں گزارا۔ یہ محلہ قطب پورہ اورنگ آباد میں رہتے تھے[1] ۔

آخر نواب آصف جاہ نے سنہ ۱۱۶۰ھ میں ان کا قصور معاف اور عتاب دور کیا۔ پھر حسب سابق برار کی دیوانی پر مامور فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد نواب آصف جاہ نے وفات پائی اور نواب نظام الدولہ باپ کی مسند پر بیٹھے۔ نواب صمصام الدولہ کو برار سے طلب کیا اور پہلے کی طرح پھر اپنی سرکار کی دیوانی پر سربلند فرمایا۔ وہ پورے استقلال کے ساتھ عہدۂ دیوانی کی ذمہ داری کو انجام دیتے تھے جو دکن کے چھے صوبوں کی وزارت کا نام تھا ۔

نواب نظام الدولہ کو احمدشاہ فرماں روائے ہندستان نے شاہ جہاں آباد دہلی میں طلب کیا۔ وہ صمصام الدولہ کو اپنا نائب بناکر روانہ ہوئے۔ چلتے وقت اپنی انگوٹھی ان کو عنایت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ یہ "مہر سلیمانی ہے"۔ نواب نظام الدولہ ابھی دریائے نربدا تک نہیں گئے تھے کہ انھیں واپسی کا حکم ہوا، حکم پاتے ہی دکن واپس چلے آئے۔

جس وقت نواب نظام الدولہ ملک ارکاٹ (مدراس) پہنچے اور اپنے باغی بھانجے مظفرجنگ پر فتح پائی تو نواب صمصام الدولہ نے بہت سمجھایا بجھایا کہ اس سرزمین میں حضور کا زیادہ ٹھیرنا مصلحت نہیں ۔ انوارالدین خاں شہامت جنگ گوپاموی

---

[1] صفحہ ۲ جلد نمبر ۱ ۔

کے بیٹے محمد علی‌خاں کا انگریزوں کی معیت و رفاقت میں یہاں چھوڑدینا کافی ہے۔ یہ پھولچری کے فرانسیسی نصاریٰ کی سرکوبی اور تنبیہ کے لیے بہت ہیں۔ لیکن افسوس نواب نظام‌الدولہ نے ان کی بات نہ سنی۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے جو محض اپنے نفسانی اغراض کے لیے اس ملک میں ٹھیرنا چاہتے تھے اور جنھوں نے محض اپنے جزوی نفع کے لیے انتظام کلی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں، نواب نظام‌الدولہ کو یہاں ٹھیرنے پر راضی کرایا۔ آخر وہیں شہادت پائی۔ مظفرجنگ فرماں‌روائے دکن قرار پائے لیکن وہ بھی چند روز بعد شہر کڑپہ کے قریب قتل کردیے گئے۔ اب نواب صلابت جنگ امیرالملک نواب آصف جاہ کے دوسرے بیٹے مسند ریاست پر زینت آرا ہوئے اور فتح و فیروزی کے ساتھ کڑپے کے اطراف سے شہر کرنول کے حدود میں پہنچے۔ یہاں تک نواب صمصام‌الدولہ لشکر کے ہمراہ رہے۔ کرنول میں لشکر سے جدا ہوکر جلد سے جلد اورنگ‌آباد پہنچے۔ (میر غلام‌علی آزاد بلگرامی بھی انھیں کے ہمراہ تھے)۔ کچھ دنوں بالکل خانہ‌نشین رہے۔ ۹ رجب سنہ ۱۱۶۵ھ کو نواب امیرالملک کے پاس حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا۔ حضور میں پہنچنے کے بعد حیدرآباد کی صوبہ‌داری پر شرف امتیاز پایا۔ تھوڑے دنوں بعد پھر معزول ہوکر اورنگ‌آباد چلے آئے اور کنج تنہائی اختیار کیا۔ جب خود نواب امیرالملک اورنگ‌آباد تشریف لائے تو ماہ صفر سنہ ۱۱۶۷ھ کی چوتھی تاریخ کو انھیں یاد فرمایا۔ خلعت اور وکیل مطلق کا اعلیٰ عہدہ عطا ہوا۔ اس کے علاوہ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا بلند ترین منصب اور صمصام‌الدولہ کا خطاب بھی مرحمت فرمایا گیا۔ یہ سرفرازی حاصل کرکے نواب صمصام‌الدولہ چار سال تک نہایت قابلیت سے اپنی اہم ذمہ‌داری بجالاتے رہے۔ اپنی تدبیر و رائے کی خوبی سے مملکت کے تمام جزئی و کلی امور کو عجیب رونق بخشی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بے‌اسبابی کے باوجود ایک طلسم باندھ دیا اور معاملات کو ایسا چمکایا کہ عقلمندوں کی عقلوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا، کیونکہ جس وقت وکالت ان کے حوالے کی گئی تھی نواب امیرالملک کی سرکار ایک عجیب حالت میں تھی۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ بے‌زری کی وجہ سے گھر کا سامان بیچنا پڑتا تھا۔ نواب صمصام‌الدولہ نے

کچھ ایسے حسن تدبر سے کام لیا کہ بگڑی بات بنادی۔ انتظام حکومت جو درھم برھم ھوچکا تھا پھر منظم و باقاعدہ ھوگیا، سر پھرے باغی حلقہ بگوش اطاعت اور کج طبع لوگ سیدھے ھوگئے، ملک میں عجب امن و امان رونما ھوگیا، تمام رعایا اور خدا کی مخلوق عدالت و انصاف کے سائے میں عجیب آرام و آسودگی سے رھنے لگی۔ اپنی وکالت کے چار سال میں ملک کا آمد و خرچ برابر کردیا اور فرماتے تھے کہ خدا نے چاھا تو اگلے سال آمدنی خرچ سے بڑھ جائےگی۔ وکالت مطلق کے عہدے پر نواب صمصام الدولہ کے مقرر ھونے کے تھوڑے ھی عرصہ بعد امیرالملک کے رایات فوجی حرکت میں آئے اور رگھو بھوسلہ کی تنبیہ کے ارادے سے برار کی جانب متوجہ ھوئے۔ رگھو کی گوشمالی کرکے پانچ لاکھ روپیہ اس سے بطور پیشکش کے وصول کیا گیا پھر برار سے نرمل کا رخ کیا۔ وھاں کا زمیندار سریا راؤ نواب آصف جاہ اول کے عہد سے سرکشی و بغاوت پر آمادہ تھا، کئی بار سرکاری فوج کو غارت کرچکا تھا، نواب صمصام الدولہ اپنی حکمت عملی سے اس کو مقید کرکے اس کے ملک کو سرکار عالی کے ضبط و تصرف میں لے آئے۔ اپنی وکالت کے پہلے سال میں انھوں نے یہ دو بہترین کام کیے اور کامیاب ھوئے۔ برسات کا موسم حیدرآباد میں گزارا۔ وکالت کے دوسرے سال سنہ ۱۱۶۸ ھ میں نواب امیرالملک کو میسور کی طرف لے گئے، وھاں کے راجا سے پچاس لاکھ روپیہ پیشکش کا حاصل کیا اور برسات کے آغاز موسم میں ھی حیدرآباد واپس آگئے۔ انھیں دنوں میں دھلی کے بادشاہ عالم‌گیر ثانی نے نواب صمصام الدولہ کے لیے ماھی و مراتب بھجوائے اور کسی صاحب نے یہ تاریخ کہی :—

۱۱۶۸ ھ

از شاہ ھند آمد ماھی و ھم مراتب

وکالت کے تیسرے سال سنہ ۱۱۶۹ ھ میں راؤ بالا جی کی کمک کی۔ اس کی تفصیل یہ ھے کہ راؤ بالا جی نے شہر سانور کا محاصرہ کیا تھا۔ سانور کے پٹھانوں نے حصار شہر کو اس قدر مضبوط کردیا اور ایسی بہادری دکھائی کہ بارھا حصار سے باھر ایسی مورچال باندھی کہ راؤ بالا جی عاجز آگیا اور مجبور ھوکر نواب صمصام الدولہ سے

امداد طلب ہوا۔ سبحان‌اللہ کیا خدا کی شان ہے کہ وہی راؤ بالا جی جو دکن اور ہند کے کتنے ممالک اپنے قبضہ و تصرف میں لے آیا تھا' جس نے بادشاہ دہلی اور ارکان سلطنت میں زلزلہ ڈال دیا تھا' انھیں اپنی طاقت سے لرزا دیا تھا' آج وہ نواب صمصام‌الدولہ کی طرف رجوع ہوتا اور ان کے دامن امداد کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہ ہے حسن تدبر۔ آخر نواب صمصام‌الدولہ نواب امیرالملک کو بالا جی کی کمک پر لے جاتے ہیں' لشکر کو سانور پہنچاتے ہیں اور مورچال قائم کرکے توپ خانے سے ایسی آگ برساتے ہیں کہ افغانوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں' چہروں کے رنگ اڑجاتے ہیں اور وہ صلح کا دروازہ کھٹکھٹانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اس مہم کو سر کرنے اور سانور کے پٹھانوں کا معاملہ طے ہونے کے بعد نواب صمصام‌الدولہ نے چاہا کہ نصاریٰ کا خاتمہ کردیا جائے[1]۔ نواب امیرالملک نے نواب صمصام‌الدولہ کے ارشاد سے تمام نصاریٰ کو نوکری سے بر طرف کردیا۔ نصاریٰ نوکری سے برطرف اور لشکر سے جدا ہوکر سیدھے حیدرآباد کو روانہ ہوئے اور حیدرآباد کو اپنے قبضہ و اختیار میں لاکر قلعہ بند ہوگئے۔ نواب امیرالملک نے ان کے پیچھے پہنچ کر محاصرہ کرلیا۔ قریب دو مہینے کے محاصرہ رہا۔ باہم لڑائیاں ہوئیں۔ آخر سر برآوردہ لوگوں کے نفاق کی بدولت صلح کرنا پڑی۔ عمدۃالملک اور حیدر جنگ نے آکر ملاقات کی۔

محاصرہ کے زمانے میں نصاریٰ کی جاگیروں کا انتظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ عمدۃالملک اور حیدر جنگ نے رخصت لے کر اپنے معاملات جاگیر یعنی راج بندری اور سیکاکول کے لیے سامان سفر باندھا۔ نواب صمصام‌الدولہ نے برسات کا زمانہ حیدرآباد

---

[1] نواب نظام‌الدولہ ناصر جنگ اپنے بھانجے مظفر جنگ کی سرکوبی کے لیے ملک ارکاٹ کو گئے تھے' مظفرجنگ نے پھولچری (پانڈیچری) کے فرانسیسیوں کی امداد سے ان کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ پھر یہ کڑپہ اور کرنول کے پٹھانوں کی حوصلہ افزائی سے بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ نظام‌الدولہ شہید ہوے۔ اس سے پہلے بدبخت اپنی مخصوص بندروں (ساحل‌گاہوں) میں رہتے تھے اور اپنی حد کے باہر پاؤں نہیں نکالتے تھے مگر نواب نظام کی شہادت کے بعد ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ ملک گیری کی لذت جو پائی تو ارکاٹ کے بعض حصوں پر قبضہ کرلیا۔ جنوبی ہند کے بعض علاقوں کو نصاریٰ (انگریز) دبا بیٹھے۔ یہ انگریز بنگالے پر بھی قابض ہوگئے تھے۔ قلعہ سورت کو بھی لے بیٹھے تھے اور یہی نصاریٰ کے ہندستان پر تسلط کی ابتدا ہے۔

القصہ نواب نظام‌الدولہ کی شہادت کے بعد مظفرجنگ نے فرانسیسی نصاریٰ کو نوکر رکھ لیا اور اپنا رفیق بنالیا۔

میں بسر کیا اور اپنی وکالت کے چوتھے سال (سنہ ۱۱۷۰ھ) میں حیدرآباد سے نکلے۔ رام‌چند مرہٹہ نواب آصف جاہ کے عہد سے بھالکی وغیرہ محالات (جو صوبۂ بیدر کے علاقے میں واقع تھے) لاکھوں کا علاقہ اپنے تصرف میں رکھتا تھا۔ مگر اپنے بےسلیقہ‌پن اور بےحیثیتی کے سبب نوکری کے فرائض انجام دینے سے قاصر رہتا تھا۔ نواب صمصام‌الدولہ نے چاہا کہ اس کا علاقہ اس سے چھین لیں۔ رام‌چندر اسباب جنگ کی تیاری میں مشغول ہوگیا، آخر ایک حرکت مذبوحی کے بعد اسے حلقہ بگوش اطاعت ہونا پڑا۔ اس کا تمام علاقہ بھالکی کے سوا سرکار عالی کے ضبط و تصرف میں آیا۔ نواب صمصام‌الدولہ نواب امیرالملک کے ہمراہ برسات کے شروع موسم میں اورنگ‌آباد چلے آئے اور انھیں دنوں ایک فوج بھیج کر قلعۂ دولت‌آباد کا محاصرہ کیا اور قلعے کو سادات بخارا سے چھین کر اپنے قبضے میں لےلیا۔ یہ لوگ عالم‌گیر بادشاہ کے عہد سے موروثی قلعہ‌دار تھے۔ اس کے بعد فلک شعبدہ باز نے ورق الٹنا شروع کیا اور کینہ و حسد پر کمر

(بقیہ حاشیہ ۷۱۲)

ان کے قتل کے بعد یہ نصاریٰ نوکری کے طور پر نواب امیرالملک کے ہم رکاب ہوگئے۔ سیکاکول اور راج بندری کو اپنی جاگیر میں لے لیا اور عجیب اقتدار بہم پہنچالیا کہ گویا اب حکم انھیں کا تھا۔ نصاریٰ کا سردار موسیو بوسی سیف‌الدولہ عمدۃالملک کے خطاب سے سرفراز اور عمدۃالملک کی سرکار کا صاحب اختیار صدر جنگ ہوا۔

حیدرجنگ کا نام عبدالرحمن تھا اور اس کا باپ خواجہ قلندر بلخی بلخ سے ہندستان آ کر نواب آصف جاہ کے عہد میں اچھا اقتدار و اعتبار پیدا کرچکا تھا۔ وہ مچھلی بندر کا فوج‌دار تھا اور مچھلی بندر میں چند نصاریٰ سے واقف ہوچکا تھا بلکہ ان سے دوستی پیدا کر لی تھی اور جب اس کے ذمہ سرکاری محاسبہ نکلا تو وہ اس دوستی کے تعلق کی وجہ سے بھاگ کر ان نصاریٰ کی پناہ میں چلا گیا۔ اس وقت حیدر جنگ کم عمر تھا فرانسیسیوں کا حاکم اسے عزیز رکھتا تھا۔

مظفر جنگ جب رئیس ہوا تو کورندور کپتان نے نصاریٰ کی ایک جمعیت موسیو بوسی کی سرداری میں مظفر جنگ کے ساتھ کردی اور عبدالرحمن کو بھی موسیو بوسی کے ہمراہ اس لیے کردیا کہ گویا وہ مسلمانوں اور نصاریٰ کا جامع ہے۔ یہ شخص جوہر قابل تھا۔ اس نے بہت زبردست ترقی کی۔ فرنگیوں کی سرکار کا انتظام (حل و عقد) اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسداللہ حیدر جنگ خطاب پایا۔

باندھ کر نواب صمصام الدولہ کی شکست پر آمادہ ہوگیا اور وہ تمام عقل و ہوش جو صمصام الدولہ رکھتے تھے ان سے چھین لی۔

بات یہ ہے کہ سرکارعالی کے ذمے فوج کی تنخواہوں کا روپیہ بہت زیادہ چڑھ گیا تھا۔ بدمعاشوں نے سپاہ کو ورغلا دیا۔ فوج نے تقاضے کا ہنگامہ برپا کردیا نواب صمصام الدولہ چاہتے تو آسانی سے دو لاکھ روپے کا انتظام کردیتے اور یہ فتنہ دب جاتا۔ مگر بات یہ ہے کہ زوال دولت کا وقت آ پہنچا تھا، آپ نے کچھ اس کی پروا نہ کی۔ آخر ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۰ھ کی چھٹی تاریخ کو فوج کے سپاہی نواب آصف جاہ کے فرزند نواب شجاع الملک بسالت جنگ کو ان کے گھر سے نکال کر نواب امیرالملک کے حضور میں لے آئے اور مجبور کیا کہ نواب صمصام الدولہ کو معزول کرکے وکالت مطلق کا خلعت انھیں عطا کیا جائے۔ عجیب عام بلوہ ہوگیا تھا۔ شہر کے بازاریوں اور بدمعاش لوگوں نے یہاں تک چاہا کہ نواب صمصام الدولہ کے گھر پر ٹوٹ پڑیں اور لوٹ ڈالیں۔ مگر کچھ ایسے اسباب ظہور میں آئے کہ ان کا یہ ناپاک ارادہ پورا نہ ہوا اور بلوہ شام تک موقوف رہا۔ رات کو یہ بلوائی متفق ہوگئے۔ نواب صمصام الدولہ نے سوچا کہ اگر کل انھوں نے یورش کی تو ان کے مقابلے میں آکر لڑنا ناممکن ہے، چپکے سے نکل جانا چاہیے۔ آدھی رات کو ہاتھیوں پر ضروری سامان و اسباب لادا اور گھر کے لاکھوں روپے کے قسم قسم کے نفائس اور بیش بہا نوادر کو وہیں چھوڑ دیا اور خود تمام گھر والوں مردوں، عورتوں کو لےکر قلعۂ دولت آباد روانہ ہوگئے۔ کوئی پانسو سوار اور پیادوں نے رفاقت کا حق ادا کیا، مشعلیں روشن تھیں، ہتھیاربند گھروں سے نکلے اور شہرپناہ کی دیوار کے ظفر دروازے کا رخ کیا۔ دروازے کے محافظ مقابلے کی تاب نہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ نواب صمصام الدولہ کے ساتھی دروازے کا قفل توڑکر شہرپناہ کے دروازے سے نکلے اور صبح کے قریب ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۰ھ کی آٹھویں تاریخ کو دولت آباد پہنچ گئے۔ گھر کا کچھ سامان غارتگروں کی لوٹ کھسوٹ میں اور زیادہ حصہ سرکار عالی کے ضبط و تصرّف میں آیا۔ تھوڑے دنوں بعد ایک سرکاری فوج نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کیا اور لڑائیاں ہونے لگیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب صمصام الدولہ نہایت پسندیدہ صفات سے متصف اور عمدہ خصائل سے آراستہ تھے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ اور محبوب نظر لوگوں کو بھی مخلوق کی نظر سے گرا دیتا ہے اور آخرت کے مرتبے بلند کرنے کے لیے دنیا کی امتحان‌گاہ میں کسی نہ کسی بلا میں مبتلا کردیتا ہے۔ اسی کا پورا منظر نواب صاحب موصوف کے معاملے میں مشاہدہ ہوا کہ باوجود ان خوبیوں اور برگزیدگیوں کے جو صمصام الدولہ کی ذات میں جمع تھیں، ساری خدا کی مخلوق کیا امیر اور کیا فقیر، کیا درباری اور کیا بازاری، سب ان سے پھر گئے اور پکڑو مارو کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہ لاتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے وفا کی راہ میں ثابت قدم رہ کر ان کی دوستی کو بحال رکھا مگر کس کی مجال تھی کہ دم مارے یا اس حالت کو ختم کرنے کا تہیّہ کرے۔ صرف ایک آزاد بلگرامی کی ذات گرامی تھی جس نے آشوب قیامت کی پروا نہ کی، تمام عالم کی مخالفت سے بےنیاز ہوکر نواب شجاع الملک سے کئی ملاقاتیں کیں اور باہمی صلح کی بنیاد ڈالی۔ بار بار قلعے میں جاکر صمصام الدولہ سے ملے، گفتگوئیں کیں اور بڑی سحرکاری و افسوں طرازی سے کام لےکر قلعے کے محاصرے کو اٹھوا دیا۔ ابھی مصالحت کی شرطیں تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں کہ نواب نظام الدولہ ثانی ناظم صوبۂ برار ایلچ‌پور سے اورنگ‌آباد تشریف لائے۔ نواب امیرالملک نے ان کو اپنی ولی‌عہدی کے بلند ترین منصب پر ممتاز فرمایا اور نظام الملک آصف جاہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ انھوں نے مولانا آزاد بلگرامی کو طلب فرماکر اس بات پر مامور کیا کہ صمصام الدولہ کو منا کر راضی کرلیں اور ان کے طومار مطالب پر ان کی استدعا کے موافق دستخط فرما کر مولانا کے حوالے کیا۔ مولانا اس کو لےکر قلعے میں پہنچے اور صمصام الدولہ کو حاضر حضور ہونے پر آمادہ کیا۔ نواب آصف جاہ نے اچھے اچھے سرداروں کو استقبال کے لیے بھیجا۔ نواب صمصام الدولہ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۱ھ کی پہلی تاریخ کو قلعے سے برآمد ہوئے اور اس کے بیرونی حصے میں استقبالی سرداروں سے ملاقات کی۔ اسی روز نواب آصف جاہ ثانی اور نواب امیرالملک سے شرف ملاقات حاصل کیا اور بہت سے مراحم شاہانہ سے سرفراز ہوئے۔

ان ہی دنوں میں بالاجی راؤ مخالفت کے ارادے سے اورنگ آباد کے قریب پہنچا۔ اس نے اپنے بیٹے بسسواس راؤ کو مقدمۃ الجیش (ہراول) بناکر بھیجا۔ ادھر راجا رام چندر اپنے وطن سے نواب امیرالملک کے آستانے پر حاضری کے ارادے سے آرہا تھا وہ اورنگ آباد سے تین کوس کے فاصلے پر بمقام سندکھیڑہ پہنچا تھا کہ بالاجی راؤ مرہٹہ نے وہیں اس کو گھیر لیا اور اس کا قافیہ تنگ کردیا۔ نواب آصف جاہ ثانی یہ خبر سن کر اورنگ آباد سے سندکھیڑہ نہضت فرما ہوئے اور راجا رام چندر کو اس ہلاکت سے چھڑایا۔ اثنائے راہ میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، مگر ہر معرکے اور ہر موقع پر آصف جاہ ثانی نے اپنی جگرداری اور بہادری کے جوہر دکھائے اور دشمنوں کی بڑی تعداد کو اپنی آتش بار تلوار سے جلا کر خاک سیاہ کردیا۔ نواب صمصام الدولہ ہم رکاب تھے، اسی دوران میں خبر ملی کہ عمدۃ الملک موسیٰ بوسی اور حیدر جنگ اپنی جاگیرات کے کام سے فارغ ہوکر نواب امیرالملک کے حضور میں حاضری کا قصد رکھتے ہیں اور حیدرآباد پہنچ چکے ہیں۔ حیدر جنگ نے نواب صمصام الدولہ کو متواتر خط لکھے اور اس قدر اخلاص ظاہر کیا کہ موصوف کو اس کے اخلاص پر پورا پورا بھروسا ہوگیا۔ اس کے مکر اور اندیشۂ فریب سے پوری غفلت عمل میں آتی رہی۔ فتح مند لشکر سندکھیڑے سے واپس ہوکر شاہ گڑھ کے اطراف میں پہنچا تھا کہ حیدر جنگ حضور میں پہنچا۔ دونوں مل کر پورا لشکر ہیئت مجموعی کے ساتھ اورنگ آباد میں آگیا۔ شہر کے شمالی حصے میں خیمے لگ گئے۔

نواب صمصام الدولہ نے اپنے تمام اختیارات کی باگ حیدر جنگ کے ہاتھ میں سونپ دی۔ وہ بڑی خوشامد درآمد اور چاپلوسیوں سے پیش آیا، مگر مکر و فریب کا جال بچھادیا۔ نواب صمصام الدولہ کے جو احباب اس کے دھوکے سے آگاہ ہوچکے تھے ہرچند انھوں نے صراحت و کنایت کے ساتھ نواب صاحب کو خبریں دیں، مگر انھیں یقین ہی نہ آیا۔ بلکہ دشمن کے منافقانہ اخلاص پر بھروسا کرکے دوستوں کی خیرخواہی کا کچھ اعتبار نہ کیا۔ رجب سنہ ۱۱۷۱ھ کی چھبیسویں کو نواب امیرالممالک باغ بیگم واقع اورنگ آباد کی سیر کو تشریف لے گئے۔ وہاں حیدر جنگ نے اپنے مکر و فریب

کا سامان تیار کرلیا تھا، نواب صمصام الدولہ اور نواب یمین الدولہ کو بھی بلا بھیجا،
حسب طلب وہ بھی گئے۔ حیدر جنگ نے دونوں کو وہیں نظربند کردیا اور اپنے
لشکر میں لاکر الگ الگ خیموں میں رکھا۔ پھر صمصام الدولہ کے چاروں بیٹوں کو
طلب کرکے انہیں بھی باپ کے ساتھ ایک ہی خیمے میں مقید کردیا جن کے نام یہ
ہیں: میر عبدالحی خان، میر عبدالسلام خان، میر عبدالنبی خان، میر عبدالغنی خان۔ خیمے کے
آس پاس نصاریٰ کو پاسبان بنا کر بٹھا دیا۔ نواب صمصام الدولہ کا گھربار جو کچھ بھی دوبارہ جمع
ہوا تھا لوٹ ڈالا۔ مستورات سادات کو گھر سے نکلوادیا۔ نواب صمصام الدولہ کے ان رشتہ داروں
اور وابستگان دامن کو جو ذرا کچھ حیثیت رکھتے تھے، پکڑوا کر سخت قید و بند میں
ڈال دیا اور ان سے بہت کچھ روپیہ وصول کیا۔ بزرگ سادات پر ایسا ستم گزر گیا کہ واقعۂ
کربلا تازہ ہوگیا تھا لیکن یہ حرکتیں حیدر جنگ کے لیے بھی کچھ مبارک ثابت نہ
ہوئیں۔ نواب آصف جاہ ثانی اس فکر میں تھے کہ اس کا نقش حیات بھی صفحۂ روزگار
سے جلد تر دھو ڈالیں اس لیے کہ حیدر جنگ نے نواب صمصام الدولہ سے بدعہدی اور
غدّاری کی تھی۔ اس کی طرف سے اطمینان اٹھ گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ حیدر جنگ
نے نواب صمصام الدولہ کو قید کرنے سے پہلے ہی نواب امیرالملک کو بےپروبال کردیا
تھا۔ نواب آصف جاہ ثانی برار سے ایک زبردست فوج اپنے ہمرکاب لائے تھے اور
انھوں نے تمام مالی و ملکی معاملات اور مہمات کا انتظام اپنے قبضہ و اختیار میں
لے لیا تھا۔ حیدر جنگ نے دیکھا کہ نواب آصف جاہ کی بدولت میرے تسلط کا نقش
ٹھیک بیٹھتا نظر نہیں آتا، اس خیال سے وہ نواب موصوف کی شکست کی فکر
میں پڑ گیا۔ طرح طرح کے حیلے سازی سے ساری فوج کو نواب سے جدا کردیا اور
آٹھ لاکھ روپیہ سپاہ کی تنخواہ کا اپنے پاس سے ادا کرکے نواب کو تنہا کردیا۔ پھر نواب
صمصام الدولہ کو قید کرکے دونوں طرف سے بالکل سکون و فراغ پالیا۔ وہ چاہتا یہ
تھا کہ نواب آصف جاہ کو حیدرآباد کی صوبہ داری کے بہانے سے وہاں بھیج دے اور
قلعۂ گولکنڈہ میں نظربند کر رکھے، پھر پورا میدان اپنی جولانی کے لیے صاف ہے۔
لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر اس کی تدبیر پر ہنس رہی ہے۔ رمضان المبارک

سنہ ۱۱۷۱ھ کی تیسری کو حیدرجنگ نواب آصف‌جاہ کے خیمے میں آیا، نواب موصوف پہلے ہی اپنے خاص مشیروں سے اس کے قتل کا منصوبہ قرار دے چکے تھے۔ محفل خاص کے حاضرین نے وہیں حیدر جنگ کو پکڑ کر ذبح کرڈالا۔ نواب آصف‌جاہ تنہا ایک گھوڑے پر سوار ہوکر لشکر سے نکل آئے، فرنگیوں کا سارا توپخانہ محو حیرت اور بیکار رہا۔ نواب نے وہ جرأت دکھائی کہ رستم و افراسیاب کے کارنامے منسوخ کردیے۔ حیدر جنگ کے ذبح ہونے کی خبر پاتے ہی عمدۃالملک موسیٰ بوسی اور دوسرے اعیان لشکر کے ہوش اڑگئے۔ اس افراتفری میں بدمعاشوں نے صمصام الدولہ اور ان کے بیٹے میر عبدالغنی کو شربت شہادت پلادیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ حیدر جنگ جو دراصل ان سادات کا قاتل تھا، وہ ان شہید سادات سے چار گھڑی پہلے قتل ہوچکا تھا۔ نواب صمصام الدولہ نے اپنے کانوں سے اس کا قتل ہونا سنا اور فرمایا کہ اب ہماری سلامتی بھی نظر نہیں آتی۔ پورے استقلال کے ساتھ قبلہ‌رو ہو بیٹھے۔ اتنے میں ایک ہندو لچھمنا نامی ان نصاریٰ کے رفقا میں سے آیا اور انہیں شہید کرڈالا۔ باپ بیٹے دونوں اپنے آبائی مقبرے میں دفن ہوئے جو شہر کے جنوب جانب شاہ نور قدس سرہ کی درگاہ کے پاس ہے۔ یمین الدولہ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے جو شاہ نور کے گنبد کے پائینتی ہے۔ یہ بھی بڑے درجے کے امیر اور صمصام الدولہ کے رشتہ‌دار تھے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے ان تینوں کی تاریخ شہادت اس آیت سے نکالی۔ «وجوہٌ یومئذ مسفرۃ» (۱۱۷۱)۔

صمصام الدولہ کی تاریخ شہادت اس قطعہ میں کہی ہے:-

رفت صمصام الدولہ ز جہاں سیوم ماہ شریف رمضان
سال ایں واقعہ آں سید خود گفت: ما کشتۂ عبدالرحمن

۱۱۷۱ھ

یہ مستزاد رباعی بھی تاریخ میں نظم فرمائی:-

صمصام الدولہ - آں امیر والا دانش آگاہ

ناحق شدہ کشتہ در کمین‌گاہ دغا ۔۔۔ وا مظلوماہ
آزاد بعرض می رساند تاریخ ۔۔۔ یاران شنوید
کردند شہید ناکساں سید را ۔۔۔ انا للہ

۱۱۷۱ھ

لچھمنا زمیندار سیکاکول کی جنگ میں مارا گیا ۔ محمد حسین جماعت‌دار فرقہ گاردیان جو اپنی جماعت کے ساتھ نواب صمصام‌الدولہ اور ان کے عزیزوں اور ان کے رفیقوں کی نگرانی پر مقرر تھا اور بہت بدسلوکیاں عمل میں لاتا تھا اپنی جماعت کے ساتھ مارا گیا ۔ تھوڑے ھی دنوں میں خون سادات رنگ لایا اور قدرت نے دشمنوں سے پورا انتقام لے لیا ۔

عام اخلاق و عادات

نواب صمصام‌الدولہ جامع‌الکمالات تھے، تمام علوم مروجہ سے واقف اور ہر فن کے مسائل اپنے حافظے کے خزانے میں حاضر رکھتے تھے، شعر فہمی میں انھیں یکتائی کا دعویٰ بجا تھا ۔ فارسی زبان کے مصطلحات خوب جانتے تھے ۔

حق تو یہ ھے کہ اس بے نظیر امیر کی خوبیاں اس‌قدر ھیں کہ ان کا زبان قلم سے ادا ھونا دشوار ھے اور صفحات کاغذ کی وسعت اس کے احاطے سے قاصر ھے، خدا کی قسم زمانے کی آنکھوں نے ایسے جامع کمالات امیر نہ دیکھے ھوں‌گے اور اس بوڑھے خرّانٹ آسمان کو ایسے اعلیٰ حیثیت صاحب دولت کو کبھی اپنی نگاہ کی میزان پر تولنے کا موقع نہ ملا ھوگا ۔

نشو و نما کے آغاز ھی سے آثار سربلندی و ترقی ان کی پیشانی سے نمایاں تھے اور بلند اقبالی و خوش طالعی کے انوار ان کی جبین حال سے جلوہ گر تھے ۔

صمصام‌الدولہ خود اپنی نسبت فرماتے تھے کہ "میں دو چیزوں کا دعویٰ رکھتا ھوں: ایک تو عدل و انصاف کہ معاملے کی باریکیوں اور تہوں تک جیسا کہ چاھیے پہنچ جاتا ھوں اور حق کو باطل سے الگ الگ کردیتا ھوں دوسرے شعر فہمی ۔

مولانا آزاد نے ان کی شعر فہمی کا ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ ایک روز صمصام الدولہ نے کہا کہ فیضی کا یہ مطلع مشہور ہے آپ نے سنا ہی ہوگا:

مرا براہ محبت دو مشکل افتاد است
کہ خوں گرفتہ ام دیار قاتل افتاد است

ظاہری معنی کے لحاظ سے ایک مشکل تو عاشق کا خون گرفتہ ہونا ہے دوسری مشکل محبوب کا قاتل ہونا، بس نجات دشوار ہے۔ مگر میرے دل میں ایک اور مطلب آیا ہے، وہ یہ کہ ایک مشکل یہ کہ عاشق خون گرفتہ تو ہے ہی لیکن ایسا نہ ہو کہ معشوق کے سوا کوئی اور اسے قتل کرڈالے۔

دوسری مشکل یہ کہ یار قتال واقع ہوا ہے لیکن یہ نہ ہو کہ عاشق کے سوا اور کسی کو قتل کرڈالے؛ یہ دونوں باتیں عاشق کو ناگوار ہیں اور یہی اس کی بےپناہ مشکل کا سبب ہیں۔

سبحان اللہ کیا سخن فہمی ہے، عجیب بات پیدا کی ہے۔ نثر میں منشی بےبدل اور زبردست انشاپرداز تھے، ان کی انشا خطوط نویسی میں ایک خاص انداز رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے منشآت (خطوط) جمع نہ ہوئے ورنہ دیکھنے والوں کو سرمہ جواہر کا کام دیتے۔

تاریخ دانی میں بھی یکتائے عصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص کر امرا اور سلاطین تیموریۂ ہند کے بارے میں گویا وہ "نسّابۂ وقت" تھے۔ اس کا ثبوت ان کی کتاب مآثرالامرا ہے کہ اس کی قدر و قیمت کچھ صاحب فن ہی جان سکتا ہے۔

عربی اور فارسی کتابوں کا ایک زبردست کتب خانہ فراہم کیا تھا اور ان میں سے اکثر کتابوں کا مقابلہ اور تصحیح خود کی تھی، افسوس کہ اس ہنگامے میں ان کا کتب خانہ درہم و برہم ہوگیا۔

"ان کے اوصاف حمیدہ اس قدر ہیں کہ زبان تقریر بیان سے ادا نہیں کرسکتی؛ مثلاً، علوّ مزاج اور متانت رائے میں ارسطو کو ان کا شاگرد کہہ سکتے ہیں۔ وقار، تمکین، دُزددلی اور غمخواریٔ خلائق، عدل و انصاف اور آنکھوں کی حیا، وفا و صفا،

صدق و دوستی ان سب خوبیوں کا مجموعہ تھے ۔ جھوٹ سے بہت ناخوش ہوتے تھے اور جھوٹ بولنے والے کا ذرا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے ۔ سخاوت کا یہ عالم کہ جو کچھ روپیہ انھیں ملتا اسی وقت اس میں سے دسواں حصہ حقداروں کے لیے نکال دیتے ۔ ' دہ یکے ' کا خزانہ الگ تھا یہ روپیہ اسی مد سے حقداروں پر صرف ہوتا تھا ' غرضکہ ایسے امیر تھے جن کو امارت زیب دیتی تھی ۔ جس وقت مسند پر بیٹھتے بےتکلف ان کو نشان امارت زیب دیتی تھی اور ریاست کا شکوہ ان کی پیشانی سے عجیب رونق اور جلوہ دکھاتا تھا ۔

ہفتے میں دو دن عدالت کے لیے مقرر کر رکھے تھے ۔ جمعہ اور منگل کو وہ مدعی اور مدعاعلیہ دونوں کو اپنے حضور میں طلب کرکے بہ‌نفس نفیس تنقیح کے لیے متوجہ ہوتے تھے ۔

ملک کے نظم و نسق کے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے ۔ رات اور دن میں کبھی بھی ملکی مشورہ کے لیے کوئی خلوت نہ تھی ' نہ کوئی مشیر تھا ۔ زمانے کے بڑے بڑے عقلمند ان کی بلندنظری اور وفور عقل پر آئینۂ حیرت بن کر رہ جاتے تھے ۔ صبح کی نماز سے فارغ ہوکر مہمات ملکی کی طرف متوجہ ہوجاتے ' دوپہر کو قیلولہ (آرام) کرتے ' ظہر کی نماز پڑھ کر پھر حکومت کے کاروبار میں لگ جاتے اور آدھی رات تک بلکہ اس سے بھی زیادہ مالی و ملکی کاموں میں مشغول رہتے تھے ۔ طرح طرح کے صاحب حاجت لوگ اپنے معاملات کے بارے میں خود روبرو حاضر ہوکر اپنے معاملات کا سوال جواب کرتے ' کسی واسطے کا دخل نہ تھا ۔ دیوان میں بڑی شان جبروتی سے بیٹھتے اور خلوت میں بالکل سادہ دلی اور پورے انبساط و بےتکلفی سے میل جول رکھتے تھے ۔

نواب سالار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ نواب صمصام الدولہ نے قلعۂ دولت‌آباد سے واپس آنے کے بعد مجھ سے کہا کہ ایسا معلوم ہوچکا ہے کہ یہ جو کچھ اسباب ظاہری میرے پاس جمع ہوگیا ہے کچھ نہ رہے گا ۔

میں نے کہا : یہ کیونکر معلوم ہوا ۔

کہا : مجھے یہی معلوم کرایا گیا ہے ۔

نواب مذکور یہ بھی کہتے تھے کہ جس روز وکالت کا منصب ان سے لیا گیا تھا، عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ میں اور ایک بڑا گروہ رات کو نواب صمصام الدولہ کے گھر میں سویا۔ ہم لوگوں کو خوف کی وجہ سے کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ میں نواب صمصام الدولہ سے بہت سویرے ملا، انھوں نے کہا کہ آج رات خوب اطمینان سے سونا نصیب ہوا۔

انھیں کی ایک اور روایت ہے کہ نواب صمصام الدولہ نے مجھ سے کہا کہ قلعے جانے سے پہلے میں نے اپنے فراش خانے کی موجودات کا جائزہ لیا تو دو سو سے زائد قالین اور دریاں برآمد ہوئیں اور جس روز میں قلعۂ دولت آباد میں گیا ہوں تو کوئی ایک فرش بھی پاس نہ تھا۔ مگر اس حالت میں بھی میرے دل میں ذرہ برابر کوئی تغیّر نہ آیا۔

مولانا آزاد بلگرامی ان کی نیک دلی اور باضابطگی کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ: جس وقت نواب صمصام الدولہ ملک آرکاٹ میں تشریف لے گئے اور مظفر جنگ پر فتح پائی، اس ملک کے عمال حضور میں طلب ہوئے اور عہدۂ دیوانی کے تعلق کی وجہ سے نواب صمصام الدولہ کے خیمہ کے دروازے پر خیمہ نصب کرکے ان کو جگہ دی گئی تھی۔ ایک روز میں نواب صمصام الدولہ کے خیمے سے نکلا تو ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: حاجی عبدالشکور تحصیل دار (عامل) معزول کہتا ہے کہ "میں اس وقت پہرہ داروں کی نگرانی اور قبضے میں ہوں۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ آپ ذرا یہاں تک تکلیف فرمائیے۔ عامل مذکور سے میری جان پہچان نہ تھی۔ لیکن نہ جانا بھی شیوۂ مروت کے خلاف معلوم ہوا۔ میں گیا تو اس نے پہرہ والوں کی سختی اور قید کی شدت کی شکایت کی۔ اسی وقت میں پلٹ کر نواب صمصام الدولہ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ حاجی عبدالشکور نامی ایک عامل تحصیل داروں کے زمرے میں دروازے پر حاضر ہے ذرا اس کو آپ اپنے حضور میں بلوائیے۔ نواب صاحب نے فرمایا: یہ ضابطہ نہیں ہے کہ جس تحصیل دار کے ذمے مطالبہ ہو وہ سامنے بلایا جائے۔

میں نے کہا : میں یہ نہیں کہتا کہ مطالبہ معاف کردیا جائے ۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ایک بار وہ پیش ہوجائے ۔

نواب صاحب انکار کرتے رہے اور میں اصرار کرتا رہا ۔ آخر نواب نے اسے بلایا اور اس کی حالت کا مشاہدہ کیا ۔ دیکھتے ہی انھیں اس پر بہت ترس آ گیا ۔ فرمایا کہ کل نواب نظام‌الدولہ کے دروازے پر حاضر ہو اور اپنے چوبدار کو تاکید کردی کہ جس وقت یہ شخص حاضر ہو مجھے فوراً خبر کی جائے ۔ دوسرے دن حاجی محمد عبدالشکور آستانے پر حاضر ہوا، چوبدار نے خبر پہنچائی ۔ نواب صمصام‌الدولہ نے نواب نظام‌الدولہ سے عرض کی کہ یہ حاجی عبدالشکور نامی ان تحصیل‌داروں کے زمرے میں ہے جن کے ذمے سرکاری مطالبہ باقی ہے، وہ حضور میں حاضر ہوا ہے ۔ میر غلام‌علی (آزاد بلگرامی) نے مجھ سے کہا کہ ایک بار اس کو اپنے روبرو طلب کرلیجیے میں نے کہا کہ وہ محاسبہ‌دار عامل روبرو نہیں بلایا جاسکتا، خلاف ضابطہ ہے ۔ میں نے بہت کچھ انکار کیا مگر میر صاحب نے مجھے نہ چھوڑا، مجبوراً میں نے اس کو اپنے روبرو بلایا ۔ اب میں بھی حضرت سے صرف اتنی ہی عرض رکھتا ہوں کہ صرف ایک بار وہ شخص حضرت کے روبرو آجائے ۔ نواب نظام‌الدولہ نے حکم فرمایا کہ حاضر ہو ۔ جیسے ہی دروازے کے اندر وہ داخل ہوا اور نواب نظام‌الدولہ کی نظر اس کی ہیئت پر پڑی، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوّے سال کا بڈھا بالکل جھکا ہوا دبلا پتلا ایک کرتا پہنے، سر پر سبز پگڑی، لاٹھی اور تسبیح ہاتھ میں لیے صورت بالکل ولیوں جیسی اور نہایت قابل رحم حاضر ہے ۔ نواب نظام‌الدولہ نے اسے اپنے پاس طلب فرماکر پاس بٹھالیا ۔ بہت سی باتیں پوچھیں اور اس کے فرد مطالبہ پر معافی لکھکر دستخط کردیے اور یومیہ وظیفہ مقرر کردیا ۔ اپنی سرکار سے اسے سواری عنایت فرمائی اور رخصت کیا ۔

یہ جو کچھ محاسن نواب صمصام‌الدولہ کے زیب بیان ہوئے ہیں یہ سمجھیے کہ مینہ کی ایک بوند اور سورج کی ایک جھلک ہے ۔ اللہ تعالےٰ ان مرحوم کو اپنی خاص رحمت سے نوازے اور ان کو بہشت بریں کی صدر جگہ مزین فرمائے ۔

اولاد صمصام الدولہ کے چار بیٹوں کا پتہ چلتا ہے جن کے نام یہ ہیں: میر عبدالحی خاں۔ میر عبدالسلام خاں۔ میر عبدالنبی خاں۔ میر عبدالغنی خاں۔

آخری دونوں بیٹے باپ کی شہادت کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ پہلے دونوں محفوظ رہے اس وجہ سے کہ میر عبدالحی خاں کسی وجہ سے ایک روز پہلے باپ سے الگ کردیے گئے تھے، عبدالسلام کو بیمار ہونے کی وجہ سے خیمے سے نکال کر عمارت میں بھیج دیا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی زندگی تھی، اس لیے خدا نے دشمنوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ باپ سے انھیں الگ کردیا جائے۔ مولانا بلگرامی کو ان دونوں کے محفوظ رہنے پر ایک عجیب دلچسپ نکتہ سوجھا گویا ان کے دل میں القا ہوا کہ «الا اسماء تتنزل من السماء» کے مصداق اسم حی و سلام نے کام کیا اور ہرایک نے اپنے مسمّیٰ کو لیا۔ حی نے عبدالحی کو زندہ اور سلام نے عبدالسلام کو سلامت رکھا۔

ان چاروں فرزندوں میں سے میر عبدالحی کے حالات ملتے ہیں جو بہت دنوں زندہ رہے۔ انھوں نے سن تمیز کو پہنچ کر مدارس سرکاری میں علوم درسیہ کی تحصیل کی۔ فنون ادبیہ اور علوم عربیہ، حکمت عملی و حکمت نظری سب حاصل کیے۔ سنہ ۱۱۶۲ ھ میں منصب اور خانی کے خطاب سے سربلند ہوکر نواب ناصر جنگ ثانی کی طرف سے صوبۂ برار کی دیوانی اور محالات جاگیر کی متصدی گری پر مامور ہوئے۔ صلابت جنگ کے عہد میں اورنگ آباد کے ناظم رہے۔ نواب صمصام الدولہ کی شہادت کے بعد جب لشکر سرکار حیدرآباد گیا تو میر عبدالحی خاں کو بھی ہمراہ لے گئے اور عرصے تک قلعۂ گولکنڈہ میں نظر بند کرکے رکھا۔ میر عبدالسلام اپنی بیماری کی وجہ سے اورنگ آباد ہی میں رہے۔ انھیں قلعۂ دولت آباد میں بھیج دیا گیا۔ بہت دنوں تک یہ بےچارے بےکار اور بےیار و مددگار رہے۔

نواب امیرالممالک ملکی نظم و نسق کے لیے مچھلی بندر تشریف لے گئے تھے، ان کی واپسی پر حیدرآباد کے قریب یہ دونوں مصیبت زدہ بھائی ان سے ملے مگر کچھ کامیاب نہ ہوئے۔ آخر جب نواب آصف جاہ حسب سابق ولی عہدی کی مسند پر بیٹھے اور

ملکی و مالی معاملات کی باگ اپنے اختیار و اقتدار میں لی تو ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۲ھ کی پندرھویں کو میر عبدالحی خاں قلعۂ گولکنڈہ سے نکلوائے گئے ۔ گویا انھیں از سرنو زندگی بخشی ۔ میر عبدالحی خاں کا خطاب پہلے شمس الدولہ دلاورجنگ تھا ۔ قلعے سے نکلنے کے بعد صمصام الملک کا خطاب اور چھے ہزاری پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا ۔ بےحد مورد الطاف و عنایات ہوئے ۔ صوبجات دکن کی دیوانی بھی غطا فرمائی اور رزم و بزم میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ وہ شعر بھی کہتے تھے ۔ صارم تخلص تھا ۔ میر عبدالسلام خاں بھی حسب الحکم دولت آباد کے قلعے سے نکالے گئے اور اپنے گھروالوں کے ساتھ رہنے سہنے لگے ۔

انھیں میر عبدالحی خاں صمصام الملک نے اپنے باپ کی کتاب مآثرالامرا کی ترتیب اور تکمیل کی ہے ۔ « مقدمہ در فہرست کتاب » کے شروع میں لکھتے ہیں :-

« جاننا چاہیے کہ اس نسخے کے بانی کی قلم کے لکھے ہوئے چند ترجمے مسودات میں افراط و تفریط واقع ہو جانے کی وجہ سے ناقص تھے حتی المقدور ان کی تکمیل اور اصلاح کی کوشش کی گئی اور اس کے ختم ہونے پر ان لوگوں کے ناموں کی فہرست شامل کی گئی جن کے حالات اس کتاب میں مذکور ہیں اور جن ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے ان کے نام کے بعد قاف (علامت الحاق) سرخ روشنائی و شنجرف سے لکھ دیا گیا ہے تا کہ تمیز ہوجائے کہ یہ حالات مرتب کے شامل کیے ہوئے ہیں ۔ نیز ان بزرگ کے اور مجھ ہیچ مداں کے بیان اور تحریر میں فرق و امتیاز معلوم ہوسکے[۱] ۔ یہ کام سنہ ۱۱۸۲ھ میں شروع کیا گیا تھا اور سنہ ۱۱۹۴ھ میں ختم ہوا اور اس کی تاریخ یہ ہے :-

زہے ادیب مصاحب مآثرالامرا

۱۱۹۴

پورا قطعہ دیباچۂ مآثرالامرا صفحہ ۵ جلد نمبر ۱ میں موجود ہے ۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اس لیے اس پر طویل تبصرے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔

---

۱ صفحہ ۴۲ مآثرالامرا جلد اول ۔

بہارستان سخن نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں کی دوسری تصنیف ہے جو ان کے علوم ادبیہ اور فنون شعریہ سے واقف اور ماہر ہونے کے زبردست دلیل اور فن شعر و ادب کے متعلق معرکہ آرا کتاب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کس قابلیت کا انسان تھا۔ فارسی زبان میں فنون ادبیہ پر غالباً اس سے زیادہ جامع اور بسیط کتاب اور نہ ہوگی خاص کر اس کا نصف اول بہت وسیع معلومات کا حامل ہے۔ اس کتاب میں ۱۴ فصلیں ہیں۔ آخری فصل صرف نامور اور زبردست شاعروں کے حالات میں ہے اور یہ تقریباً نصف کتاب پر حاوی ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو چالیس شاعروں کا تذکرہ ہے۔ فردوسی سے لے کر اب کے زمانے تک جو ممتاز شاعر گزرے ہیں، صرف انھیں کو لیا ہے۔ حالات حتی الامکان بسیط اور مفصل لکھے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انتخاب بہت اچھا دیا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ انھیں خود اپنی سخن فہمی کا دعویٰ تھا اور بجا تھا۔ خاص کر بیدل سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ متاخرین کے حالات قابل قدر ہیں کیوں کہ یہ ہندستان کی آخری تاریخ عہد مغلیہ کے بڑے مورخ تھے۔

نصف اول میں ۱۲ فصلیں ہیں۔ یہ فنون ادبیہ میں سے نظم و نثر وغیرہ کے متعلق ہیں؛ مثلاً، ۱ ابتدا ایجاد شعر۔ بیان کلام منظوم۔ ۲ فصل عروض۔ ۳ قافیہ۔ ۴ اقسام شعر۔ اداب انشا۔ ۵ صنائع بدائع۔ ۶ بلاغت و فصاحت۔ ۷ معما و نغز۔ ۸ علم انشا۔ ۹ آداب کتابت۔ ۱۰ خط و خطاطی۔ ۱۱ حروف، اعراب و نقاط، الفاظ۔ املا کا بیان اور اس کی تقسیم۔ ۱۲ قواعد لغت فارسی کے بیان میں۔ ان سب کا تعلق اگرچہ فارسی زبان سے ہے۔ لیکن اردو کے شعرا، ادیبوں اور خوشنویسوں کے لیے بھی بہت مفید و کارآمد باتیں ہیں جن کا جاننا ہر ادیب و شاعر اور انشاپرداز کے لیے ضروری ہے۔ غالباً اردو زبان میں بھی ہنوز کوئی جامع کتاب ان فنون پر نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ یہ نادر اور ضروری کتاب اب تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی اور پردۂ گمنامی میں رہی۔ اس کا ایک نسخہ حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں بھی ہے لیکن وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

اس کی تصنیف کا مصنف کو کیوں خیال پیدا ہوا، اس کو دیباچے میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں مجموعہ موائد الفوائد لکھ رہا تھا، (اس مجوعہ میں مسائل دینیہ، مسائل شرعیہ اور آداب و اخلاق کو مختصر طور پر بڑی بڑی کتابوں سے انتخاب کیا ہے تاکہ بڑی کتابوں کی ورق گردانی سے لوگوں کو نجات ہو) اس مجموعے میں ایک فصل جواز شعر پر میری قلم سے نکلی تھی اور چونکہ یہ قاعدہ ہے کہ بات سے بات نکل آتی ہے، اسی سلسلے میں مجھے اس فن کے بعض متعلقہ علوم ؛ مثلاً، عروض، قافیہ، صنائع شعری اور کچھ اس کے متعلقات انشا و املا وغیرہ کے متعلق اور اسی کے ساتھ کچھ شعرا کے حالات لکھنا وقت کے لحاظ سے ناگزیر ہوگیا۔ یہ فصل اپنی متعلقہ فصلوں کے ساتھ ایک جداگانہ نسخے کے برابر ہوگئی۔ بعض سخن سنج عزیز دوستوں نے اس خیال سے کہ فارسی زبان کے جاننے والے جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اس سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے، مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ مجموعۂ موائد الفوائد تکمیل کو پہنچے، بہتر ہوگا کہ اس رسالے کو مرتب اور مکمل کردیجیے اس لیے کہ یہ رسالہ چمن شعر کا ایک انمول پھول اور اس چشمۂ فن کا ایک شیریں گھونٹ ہے۔ آخر ایسا ہی ہوا، اس کا نام بہارستان سخن رکھا گیا"۔ اس رسالے کا کوئی تذکرہ نہ مآثرالامرا میں خود مصنف نے کہیں کیا اور نہ ان کے فرزند میر عبدالحی صارم نے اپنے دیباچے میں، نہ مولانا آزاد نے اپنی تمہید اور مصنف کے سوانح میں کچھ حوالہ دیا، غرض کہ کہیں پتہ نہیں چلتا حالانکہ اس کتاب (بہارستان) میں نواب آصف جاہ کے حالات سنہ ۱۲ جلوس کے آغاز تک کے لکھے ہیں اور یہ ان کی دیوانی کے زمانے یا اس سے پہلے کے ہیں۔

موائد الفوائد | جس کا اوپر ذکر دیباچہ میں کیا ہے۔ یہ کتاب معدوم ہے۔ اس کے بارے میں اب تک کوئی بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔

حالات نے اجازت دی تو آیندہ بہارستان سخن پر ایک مفصل مضمون رسالۂ اردو میں پیش کیا جائیگا۔

غالب کے متعلق سنہ ۱۸۶۸ع کا ایک انگریزی خط

(از ڈاکٹر سید سجاد صاحب - ایم - اے، پی ایچ - ڈی - استاد جامعہ عثمانیہ)

یہ خط جو ذیل میں بجنسہٖ طبع کیا جاتا ہے ہمیں دس بارہ سال پہلے دھلی کے ایک قدیم کتب‌خانے میں ملا تھا - دھلی میں شاید غدر سے پہلے سے اور اس کے بعد ایک انگریزی اخبار نکلتا تھا جس کا نام «مفصلائٹ» Mofussilite تھا - نہیں معلوم کہ اس کا ایڈیٹر کوئی انگریز تھا یا ھندستانی - ھمارے پاس اس کے دو بڑے بڑے اوراق کا ایک تاؤ ھے جس میں دیگر اخباری مواد کے سوا «کارس‌پانڈنس» کی سرخی کے تحت میں زیر بحث خط بھی چھپا ھے - اس کے لکھنے والے نے اپنے نام کو پردے میں رکھا ھے اور اصل نام کی بجائے لفظ Ixion لکھا ھے - خط کی عبارت سے اندازہ ھوتا ھے کہ راقم‌الخط کوئی ھندستانی وکیل یا بیرسٹر تھا جو ذی‌علم اور فارسی‌داں بھی تھا - اس کے مضمون کا تعلق اس مقدمہ سے ھے جو ازالۂ حیثیت عرفی کے لیے مرزا غالب نے اپنے ایک مخالف کے خلاف دھلی کی عدالت میں دائر کیا تھا - «اکسیون» نے خط میں بعض اشارے ایسے کیے ھیں جن سے ثابت ھوتا ھے کہ خود یہ صاحب مرزا صاحب کی جانب سے مقدمہ میں بہ‌حیثیت گواہ پیش ھوئے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ شہر کے معززین میں تھے ان کو کچھری کے حاکم کے روبرو معمولی آدمی کی طرح کھڑے ھوکر اپنا بیان دینا پڑا تھا - اس بات کی انھوں نے خط میں شکایت

بھی کی ھے بلکہ اس خط کو لکھ کر جو انھوں نے اخبار میں چھپوایا تو اس کی اصل محرک یہی شکایت ھے -

اوراق اخبار کے حاشیہ میں کسی صاحب نے جو مقدمہ کے حالات سے بخوبی واقف معلوم ھوتے ھیں پنسل سے یہ الفاظ لکھے ھیں - " بمقدمۂ مرزا نوشہ و مولوی امین‌الدین" مگر مطبوعہ خط کے متن میں مولوی امین‌الدین کا نام درج نہیں ھے - مرزا غالب کو مستغیث لکھا ھے، فریق ثانی کا نام ندارد ھے - تاھم اس خط کے آخری الفاظ "قاطع‌القاطع" اور اس کے قبل کے جملے سے یہ صاف ظاھر ھوتا ھے کہ استغاثہ " قاطع‌القاطع " کے مؤلف کے خلاف پیش کیا گیا تھا اور یہ مؤلف دراصل مولوی امین‌الدین تھے - قاطع‌القاطع کا ایک نسخہ ھمارے پاس موجود ھے - یہ کتاب اس خط سے دو سال قبل سنہ ۱۸۶۶ع میں مطبع مجتبائی دھلی میں طبع ھوئی تھی - اس پر مصنف کا نام امین‌الدین امین لکھا ھوا ھے - شروع میں تین صفحے کا دیباچہ آتا ھے جس میں برھان‌قاطع اور اس کے مصنف کے متعلق کلمات ذیل مرقوم ھیں :-

"در تحقیق لغات فارسی و عربی و غیر آنہا محیط اعظم است
بےپایاں و سر دفتر فرھنگ است - نزدیک لغت آشنایاں
و جامع آں محمدحسین تبریزیست"

مولانا حالی مرحوم نے اصل لغت برھان قاطع اور مرزا غالب کی قاطع برھان اور درفش کاویانی کی جامع بحث اپنی کتاب یادگار غالب میں بڑی خوبی اور بےلاگ طریق سے لکھی ھے اور اسی سلسلہ میں ان کتابوں اور رسائل کا ذکر کیا ھے جو مرزا صاحب کے رد میں لکھے گئے تھے لیکن یادگار کے صفحہ ۳۹ پر جب امین الدین اور ان کی کتاب کا نام آتا ھے تو اس مقدمہ کا جو خط ھذا کا موضوع ھے کوئی حوالہ نہیں ملتا - مرحوم لکھتے ھیں :-

"مولوی امین الدین کی کتاب " قاطع القاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے - کسی نے کہا حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا - مرزا نے کہا " اگر کوئی

گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے ؟ "۔

لیکن اس مقام سے ڈیڑھ دو صفحہ آگے چل کر مولانا مرحوم نے اس قضیے کے سلسلے میں ایک مقدمے کا ذکر کیا ہے جس کی روئداد وہ اس طرح بیان فرماتے ہیں :-

" مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو قاطع برھان کے جواب میں لکھا گیا تھا اور جو فحش دشنام سے بھرا ہوا تھا ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخرکار انھوں نے راضی‌نامہ داخل کردیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلّی کے بعض اہل قلم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی‌الواقع ان سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں ؟ انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت ! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی ؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا :-

ہرچہ درنگری جز بجنس مائل نیست　　عیار بیکسئی من شرافت نسبی است

یہ مقدمہ داخل دفتر ہوگیا "۔

مولوی حالی کا لکھا ہوا یہ حال انگریزی خط کے ابتدائی اور آخری حصہ کے مطابق ہے' اس میں صرف امین الدین کے نام کی کسر ہے۔

بظاھر مولوی صاحب کو یہ خیال نہ رہا کہ گو مرزا غالب نے قاطع‌القاطع کا جواب نہیں لکھا لیکن اس کے مؤلف پر توہین کا مقدمہ چلایا تھا۔

یہ امر دلچسپ ہے کہ مولوی حالی نے اپنے اوپر کے بیان میں جن " اہل قلم " کی طرف اشارہ کیا ہے جو قاطع‌القاطع کے ہتک‌آمیز الفاظ اور اقتباس پر شہادت کے لیے عدالت میں طلب کیے گئے تھے ان میں سے چھے مشہور اشخاص ہمارے اس خط میں نام بنام بیان کردیے گئے ہیں۔ ان میں یہ چار غالب کے طرفدار تھے :-

(۱) لاله پیارے لال[۱] - هیڈ ماسٹر دهلی نارمل اسکول اور سکریٹری دهلی لٹریری سوسائٹی (یه بڑے خوبیوں کے بزرگ گزرے هیں - سنه ۱۸۶۴ع میں دهلی سے لاهور جانے لگے تو غالب نے لکها تها " بس اب میں نے جانا که میرا دلی میں کوئی نہیں هے " ماسٹر صاحب کا نام نامی دهلی کے تعلیم یافته طبقه میں اب تک مشہور هے)

(۲) حکیم لطیف حسن - فرسٹ اورینٹل ماسٹر دهلی کالجیٹ اسکول[۲] -

(۳) مولوی نصیرالدین - فرسٹ اورینٹل اینڈ میتھمٹیکل ماسٹر دهلی نارمل اسکول -

(۴) حکم چند - دهلی کے مشہور مضمون نگار اور فارسی کے عالم -

اور دو صاحب غالب کے مخالف تھے - یعنی :-

(۵) مولوی ضیاءالدین (ان مرحوم کو سر ولیم میور کی تحریک پر غالباً ڈبلن یونیورسٹی سے ڈاکٹر کا اعزازی خطاب ملا تها) اسسٹنٹ پروفیسر عربی دهلی کالج -

(۶) مولوی سدیدالدین - سابق پروفیسر عربی، هائی کالج -

انگریزی عبارت کی دوسری سطر سے ظاهر هوتا هے که اخبار مفصلائٹ میں اس خط سے قبل غالب کے مقدمے کی کوئی اور چیز بهی چهپی تهی - اسی طرح اواخر خط میں مسٹر اکسیون نے بعد تصفیه مقدمه پوری مسل شایع کرنے کا وعده کیا تها، اگر دهلی میں یا دهلی سے باهر کسی صاحب کے پاس اس اخبار کے کچھ پرچے هوں تو ان میں اس مقدمے کی مزید کیفیت تلاش فرمائیں -

انگریزی اخبار کا اصل مضمون حسب ذیل هے :-

---

۱ ماسٹر پیارے لال اور ڈاکٹر ضیاءالدین کے ضروری حالات کے لیے "مرحوم دهلی کالج" مصنفۂ مولوی عبدالحق صاحب ملاحظه کی جائے -

۲ کالجیٹ اسکول - هائی کالج اور دهلی کالج کے ناموں سے پایا جاتا هے که اس زمانے میں دلی میں تین تین کالج تهے -

CORRESPONDENCE.

Our columns are open to all but we do not hold ourselves responsible for anything that appears in our correspondence.-Ed. Mof.

TO THE EDITOR OF THE MOFUSSILITE.

Dear Sir,

You have, I observe, in your issue of the 30th instant taken notice of the libel case now under inquiry before the Assistant Commissioner, Delhi, in which Mirza Asudullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated Persian scholar and the poet Laureate of India, is plaintiff.

The following are some further particulars relating to the same; they will, I hope, be interesting to your readers and expose at the same time the acts of injustice to which people in the Punjab are subject. The small army of Maulavis and Munshis, alluded to in your issue, consists of Lala Piyare Lall, Headmaster Delhi Normal School and Secretary Delhi Literary Society; Hakim Latif Husain first Oriental Master Delhi Collegiate School, and Maulavi Nasiruddin, first Oriental and Mathematical Master, Delhi Normal School; Hookum Chand, the famous Essayist and Persian scholar of Delhi. Maulavi Ziyauddin, Assistant Professor of Arabic, High College; and several others of less note. The first four gentlemen approved as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th intant: of the witnesses for the defence; only one, Maulavi Ziyauddin, was examined on Tuesday, when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an awurda, of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulavi Ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair, *on the dais next to himself, while taking his evidence.* This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian Courts, is, no witness, ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition, "Nek Hairanam vo sakht parishan." What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect. The witness, to whom injustice and a gratuitous insult has been offered, by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in Society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governor of the Punjab and took precedence of the gentleman to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole *missul* for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." (Sic.)

Yours truly,
IXION.

March, 1868

تاج محل

[سکندر علی وجد بی۔اے (عثمانیہ) ایچ، سی، ایس]

اے بارگاہ حسن ترا فیض عام ہے دریاے مہر و لطف رواں صبح و شام ہے
تو کشتۂ وفا کا سہانا پیام ہے فانی زمیں پہ نقش بقاے دوام ہے

جادو نگاہ عشق کا پتھر پہ چل گیا
الفت کا خواب قالب مرمر میں ڈھل گیا

گلریز یاں کوئی دل خونابہ بار ہے اس باغ بےخزاں میں ہمیشہ بہار ہے
پانی پہ عکس قلب صفت بیقرار ہے جمنا ترے شباب کی آئنہ دار ہے

ہیبت سے تیری دلکشی بےپناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

یہ زرد و نرم دھوپ یہ پرکیف وقت شام کندن بنے ہوئے در و دیوار و سقف و بام
خورشید کر رہا ہے تجھے آخری سلام وہ قلب شرق چیر کے نکلا مہ تمام

جونہی رواں سفینۂ مہتاب ہوگیا
تو موج خیز قلزم سیماب ہوگیا

بہزاد عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ ہے روکش عروس چمن ہر جبین سنگ
کلیوں کا وہ نکھار، وہ گلہاے رنگ رنگ فانوس شمع کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ

رنگینیاں ہیں جوہر اہل کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

تو نقش آرزو ہے مجسّم زمین پر آنکھوں نے تیرے حسن کی مے پی ہے اسقدر
اک سرخوشی ہے قلب میں سرشار ہے نظر بیٹھا ہوں پائے وقت کی آہٹ سے بےخبر

ارزاں قدم قدم پہ سکون حیات ہے
تیری حریم ناز میں دن ہے نہ رات ہے!

تبصرے

ادب

آب حیات کے لطیفے

تذکرۂ آب حیات میں شعرا کے جو قصے اور لطیفے جا بہ جا آ گئے ہیں، حضرت مصنف مرحوم کے پوتے آغا محمد اشرف صاحب ایم-اے، نے مندرجہ بالا عنوان سے ان کو یکجا کر کے چھاپ دیا ہے۔ قصوں کے پرلطف و رنگین بنانے میں آزاد مرحوم کو خاص ملکہ حاصل تھا اور ان کے حسن بیان کے یہ نمونے ہماری ادبیات عالیہ میں شامل ہیں لیکن ان کو جمع کرنے کے ساتھ محمد اشرف صاحب نے اپنے بھائی محمد باقر صاحب کا ایک مضمون بھی جو آزاد مرحوم کے حالات پر لکھا گیا اور اورینٹل کالج میگزین میں بطور ضمیمہ چھپا تھا، اس مجموعے میں شریک کر دیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ لاہور میں جہاں ضروری اور غیر ضروری سبھی طرح کی چیزیں اس کثرت سے چھپتی رہتی ہیں، مولوی محمدحسین آزاد کی کوئی سوانح‌عمری جو ان کی شایان شان ہوتی، شائع نہیں ہوئی، لیکن اب جب خود مرحوم کے پوتے ادبی خدمت کا شوق اور پاکیزہ علمی ذوق رکھتے ہیں، امید رکھنی چاہیے کہ آزاد کی نظم و نثر کا مجموعہ اور ان کی مفصل سوانح کے چھپنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ زیر تبصرہ کتاب چھوٹی تقطیع کے پونے دو سو صفحات پر بہت اچھی مجلد شائع ہوئی ہے اور سوا روپیہ قیمت میں تقریباً سستی ہے۔

شیخ مبارک علی تاجر کتب، لوہاری دروازہ، لاہور سے طلب کی جائے۔ (ہ)

سیرت اقبال

تصنیف مولوی محمدطاہر صاحب فاروقی، صدر شعبہ فارسی و اردو آگرہ کالج۔ شایع کردہ قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور۔ ع: "بگو کہ سیرت اقبال، دولت باقی" سے تاریخ تصنیف ۱۳۵۷ پر نکالی ہے اور ممکن ہے اسی سے کتاب کا نام سیرت اقبال تجویز کیا گیا ہو ورنہ ۴۳۸ صفحات کے اس مجلد میں اقبال کے ذاتی حالات صرف ۶۹ صفحات میں آگئے ہیں۔ ان میں بھی کوئی ایسی تفصیل یا خاص معلومات نہیں ہیں جو اخبارات و رسائل میں شایع نہ ہوچکی ہوں، لیکن تصنیف کا مقصد خود فاضل مصنف نے تعارف میں تحریر فرما دیا ہے کہ اب تک کوئی ایسی تصنیف شایع نہیں ہوئی جسے پڑھ کر علامہ کی تعلیمات کا خاکہ ذہن میں آجائے اور جو قارئین کو اقبال کی کتابوں کے مطالعے کی جانب رہ نمائی کرسکے۔ میں نے اس مقصد کو سامنے رکھ کر سیرت اقبال، لکھی ہے۔

مصنف نے یہ مقصد ایک عقیدت‌مند مدّاح بن کر پورا کیا ہے، اقبال کا مرتبہ ان کی نظر میں یہ ہے:

"اقبال بے شبہ اس عصر کے واحد "مصلح اور مجدّد" تھے۔ وہ غزالی و رازی بھی تھے، عطار و سنائی بھی، سعدی و رومی بھی، حالی و اکبر بھی اور میر و غالب بھی۔ تصوف و حکمت، عشق و موعظت، اثر و رجائیت اور اصلاح و مجدّدیت کا یہ اجتماع دنیائے ادب کے اس خاتم الشعرا ہی کے لیے محفوظ رکھا گیا تھا" (صفحہ ۱۳۹)۔

تغزل کے عنوان کے نیچے لکھتے ہیں: (صفحہ ۴۱۵) "قدیم و جدید اساتذہ کے دواوین کو دیکھیے۔ ان کے دیوانوں کے ہزاروں ورق الٹ جائیے تب کہیں ان کے تیر و نشتر دستیاب ہوتے ہیں۔ ابتدا سے لے کر اب تک ایسے باکمال صاحبان ذوق غزل‌گو جن کے منتخبات میں بھرتی کے چند شعر بھی مشکل سے ملیں اور سارے کا سارا کلام انتخاب ہو صرف پانچ نظر آتے ہیں:- خواجہ میر درد، مرزا غالب، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور فانی بدایونی"۔ لفظ "منتخبات" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید

فاضل مصنف کو لکھتے لکھتے اپنے مبالغے پر خود تنبّہ ہوا ہے۔ پھر بھی اقبال کو عطّار و رومی سے بھڑانا یا مجدّد وقت قرار دینا جو مسلمانوں میں ایک اصطلاحی معنی رکھتا ہے ' ' مریداں می پرانند ' کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے واقعی فضائل بھی کچھ کم نہیں ہیں کہ فرضی محاسن سے ان کی آرائش کی جائے۔ پوری کتاب اسی قسم کے والہانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ مرحوم کی جملہ تصانیف کا ۲۰۰ صفحات میں تعارف کرنے کے بعد آخر میں کوئی ڈھائی سو صفحات کا "تبصرہ" کیا گیا ہے جس میں ان کی تعلیمات عالیہ کی مختلف عنوانات میں تقسیم اور ہر عنوان پر منتخب اشعار کا اقتباس دیا گیا ہے۔ بعض جگہ یہ اقتباسات فاضل مصنف کی شرح سے بھی زیادہ طولانی ہوگئے ہیں اور ان کے برمحل ہونے میں بھی گفتگو کی گنجائش نکل آئی ہے۔ بایں‌ہمہ ہمارے خیال میں یہ کتاب طلبۂ کے لیے ضرور مفید ہوگی۔ اس کی کتابت و طباعت نیز جلد بندی اعلی درجے کی ہوئی ہے اور ان سب خوبیوں کے لحاظ سے تین روپے آٹھ آنے میں کچھ زیادہ گراں نہیں معلوم ہوتی۔ (ہ)

قتیل اور غالب

مرزا غالب مرحوم سوائے امیر خسرو کے اور کسی ہندی‌نژاد کی فارسی‌دانی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اسی کے ساتھ اپنی فارسیت پر بھی ناز تھا حالانکہ خود تورانی نژاد اور ہندستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندستان کے فارسی ادیبوں میں جن سے مرزا صاحب سخت ناراض تھے ' ایک قتیل مرحوم ہیں جو فریدآباد (قریب دھلی) کے ایک روشناس کھتری یا کایستھ خاندان کے فرد اور بعد میں مسلمان ہوکر لکھنؤ جا بسے تھے۔ ان کے شاگرد اور ماننے والے مشرقی ممالک میں بہت تھے اور مرزا کو کلکتے کے زمانۂ قیام میں ان لوگوں کے ساتھ جو مناقشے کرنے پڑے وہ کافی شہرت رکھتے ہیں ' لیکن مرزا نے ایک فاضل شخص کے مرنے کے بعد جو کچھ توہین کی ہو ' وہ اس کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی جو اب قتیل مرحوم کے ایک پرجوش

ہم وطن نے مرزا غالب کی مذمت کی ہے۔ مندرجہ عنوان رسالے کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان اعتراضات کا جواب دیا جائے جو غالب نے قتیل پر کیے تھے لیکن لائق مصنف (سید اسدعلی صاحب انوری فریدآبادی، بی۔ایس۔سی، علیگ) نے شروع میں غالب کے ذاتی اخلاق و حالات کی جو بحثیں چھیڑدی ہیں، آدھی کتاب ان ہی سے سیاہ ہے۔ انوری صاحب کا یہ خیال کہ لوگوں نے غالب کو بت بنا رکھا ہے اور ان کی ہر بات کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، لائق اصلاح ہے۔ مذہب غالب پرستی کے سب سے بڑے منّاد، بجنوری مرحوم نے بھی ان کی صرف شاعری کے معجزات بیان کیے ہیں، ذاتی عظمت و بزرگی سے کچھ واسطہ نہیں رکھا۔ بےشبہ یادگار غالب میں مولوی حالی مرحوم نے شاگردانہ عقیدت‌مندی اور کچھ اس اخلاقی تعلیم کی بنا پر کہ اپنے مُردوں کا ذکر بھلائی سے کرو، غالب کی زندگی کے صرف اچھے پہلو پیش کیے ہیں، لیکن اس پر کسی کو اتنا بگڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ اب تصویر کے صرف برے خال و خط کو چمکا چمکا کے دکھائے۔

لائق مصنف کو مرزا غالب کے قتیل پر صرف آٹھ اعتراضات مل سکے اور ان کی اس رسالے میں بہت خوبی اور قابلیت سے تردید کی گئی ہے بلکہ ایک اعتراض جس کی صحت کو انوری صاحب نے تسلیم کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بھی مرزا غالب کی زبردستی ہے۔ قتیل کا شعر ہے:—

یک وجب جائے بکوئے تو ز خوں پاک نبود
کشتہ بر کشتہ بتاں بود دگر خاک نبود

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ یہ خاک نبود، ”خاک بھی نہ تھا“ کا ترجمہ ہے اور فارسی محاورے کے خلاف اور غلط ہے لیکن جیساکہ انوری صاحب نے خود بھی ایک جگہ خیال ظاہر کیا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ کوئے یار میں ذرا سی جگہ بھی خون سے پاک نہ تھی اور سوائے کشتوں کے وہاں کوئی چیز حتّیٰ کہ خاک بھی نہ رہی تھی۔

بہرحال، کتاب محنت و تلاش سے لکھی گئی ہے اور اہل ادب کے لیے دلچسپی

کا سرمایہ ہے - چھوٹی تقطیع کے ۱۳۰ صفحات اور اچھے کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہے اور مکتبہ جامعہ، دہلی سے آٹھ آنہ قیمت پر ملتی ہے - (ہ)

ارمغان باز

یہ تراب علی خاں صاحب بازؔ حیدرآبادی کے منتخب کلام کا مختصر مجموعہ ہے - بازؔ صاحب حیدرآباد کے نوجوان اور اچھے کہنے والے شعرا میں شمار ہوتے ہیں - شاعری پرانے طرز کی ہے - نئے شعرا کی تقلید میں بھی دو ایک نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں - زبان کہیں کہیں دکنی اور شمالی ہندستان کے محاورے کے خلاف لکھتے ہیں - مشق اور مطالعے کے علاوہ اگر بازؔ صاحب خود اپنے ادنی اور اعلی کلام میں امتیاز سے کام لیں تو ہمیں امید ہے کہ وہ شاعری میں نام پیدا کرسکیں گے - ہمارے خیال میں خود ان کا تخلص متین شعرا کے لیے کچھ بہت موزوں نہیں ہے - کتابچے کی قیمت چار آنے اور حضرت مصنف کا پتہ :

کاشانۂ باز، بازار گھانسی میاں، (حیدرآباد دکن) تحریر ہے - (ہ)

مضامین محمد علی

مولوی محمد سرور صاحب بی - اے، استاد جامعہ ملیہ نے اس مجموعہ میں مولانا محمدعلی مرحوم کے تقریباً ستر مضمون جو مختلف ایام میں اخبار «ہمدرد» میں چھپے، خاصی ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کردیے ہیں - شروع میں ایک مختصر مقدمہ میں فاضل مرتب نے کتاب کا مقصد یہ بتایا ہے کہ پڑھنے والے اس آگ کی حقیقت سمجھیں جو قومی اور ملی زندگی کے اس نمائندے اور قائد کے سینے میں بھڑک رہی تھی - ان کو یقین ہے کہ «ملت کے خزاں دیدہ چمن کے اس دور میں «قافلۂ بہار» کے حُدی‌خواں محمدعلی کی صدائیں ہمارے لیے بانگ‌درا کا کام دے سکتی ہیں - مضامین مختلف عنوانات میں تقسیم ہیں - جیسے «آپ بیتی» «مسائل ملی»

« مسلمان اور کانگریس » وغیرہ ۔ جامعہ ملیہ دہلی پر جو مضامین ہیں ان میں ایک جگہ اس ادارے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اگر پھر کبھی میدان بدر کی فوج درکار ہو تو یہ مدرسہ ۳۱۳ جاں‌باز مجاہدین فراہم کردے ۔ (صفحہ ۳۹۲) ۔ لیکن اب جب کہ جامعہ کا مسلک « اہمسا » اور اس کے پیشوا مہاتما گاندھی تسلیم کرلیے گئے ہیں، اس قسم کے مضامین اور متروک مقاصد کی اشاعت جامعہ ملیہ کی طرف سے موزوں نہیں معلوم ہوتی ۔ یوں بھی مولانا محمدعلی مرحوم ذہانت و قابلیت کے علاوہ جوش جذبات کا موّاج دریا تھے اور ان کی طغیانی میں بعض اوقات کسی محل و مصلحت کی پروا نہ کرتے تھے ۔ مرتب کو زیادہ احتیاط سے انتخاب کا موقع حاصل تھا ۔ بہر حال مرحوم کی اخباری انشاپردازی کی ایک اچھی یادگار تیار ہوگئی اور امید ہے کہ ان کے عقیدت‌مندوں میں مقبول ہوگی اور سیاسیات ہند کے طلبہ اس سے بخوبی استفادہ کر سکیں گے ۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۵۹۰ صفحات پر مجلد اور مولانا مرحوم کی تصویر کے ساتھ شایع ہوئی ہے اور ڈھائی روپیہ قیمت میں مکتبہ جامعہ، دہلی سے دستیاب ہوسکتی ہے (ن)

تاریخ و تذکرہ

شاہ نعمت‌اللہ ولی

یہ بزرگوار اپنے قصیدے یا قصیدوں کی وجہ سے جن میں قیامت تک کی پیشین‌گوئیاں بیان کی جاتی ہیں، ہندستان میں بھی خوب شہرت رکھتے ہیں ۔ حلب میں پیدا ہوئے اور آخر زمانہ قصبہ ماہان (علاقہ کرمان) میں گزرا ۔ سو سال سے کچھ زیادہ عمر پا کر سنہ ۸۳۴ھ میں رحلت کی اور وہیں مدفون ہوئے ۔ بعض عقیدت‌مندوں نے شاید ان کی پیشین‌گوئیاں سن کر زندگی ہی میں مہدی موعود بھی سمجھ لیا تھا مگر حضرت شاہ نے خود اس کی تردید فرمادی ۔ شاہ کے اصلی حالات

اور کلام پر خوش اعتقادی اور افسانہ پسندی نے بہت سے رنگین پردے ڈال دیے ھیں
اور ان کے قصیدے میں تو خواھی نخواھی کچھ اسی اھتمام سے تعریفیں کی گئی ھیں
جیسے توراۃ و انجیل میں۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ کتنی ھی بگاڑی جائے، شکر ھے
کہ مٹائی نہیں جاسکتی۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے حالات بھی خود ان کی تصانیف کے
علاوہ ھم‌عصر تواریخ و تراجم سے جمع کیے جاسکتے ھیں اور خوشی کی بات ھے کہ
محمدحفیظ صاحب نے اس خدمت کو محنت و شوق سے انجام دیا اور گو ان کی رسائی
برٹش میوزیم کے بعض نادر مخطوطات تک نہیں ھوسکی تاھم جو کچھ مواد مل‌سکا
اسے ناقدانہ نظر سے پرکھا اور شاہ کے حالات میں یہ اردو رسالہ مرتب کیا جس میں
ان کی سیرت اور سوانح کے علاوہ پیشین‌گوئی والا قصیدہ اور فارسی کا اور کلام
بھی شامل کردیا ھے اور قصیدے کی صحت پر دل‌چسپ و پرمغز بحث لکھی ھے۔ جن
حضرات کو شاہ نعمت اللہ ولی کے حالات اور اس قصیدے سے دل‌چسپی ھو ان کے
مطالعہ کرنے کے قابل ھے۔ کتاب کی ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت مع محصول‌ڈاک
۱۴ آنے پیشگی بنام راج‌نرائن سنگھ صاحب درگاہ شاہ ارزاں، ڈاک‌خانہ مھندرو،
پٹنہ کے پتے سے بھیجنے پر دستیاب ھوسکتی ھے۔ (ہ)

افسانۂ پدمنی

سلطان علاءالدین اور پدمنی کے افسانے کو سب سے پہلے ملک محمدجائسی نے
ایک مستقل نظم کی صورت میں لکھا اور اپنی ھندی مثنوی کا نام "پدماوت" رکھا
جو ھندستان کے ادبیات عالیہ میں شمار ھوتی ھے۔ اگرچہ اب اس کی پرانی ھندی کو
سمجھنے والے صرف مدرسوں اور کتب‌خانوں میں مل‌سکتے ھیں، لیکن مصنف نے جو
ایک عارف باللہ صوفی بھی مانے جاتے ھیں، اپنی کہانی کے آخر میں خود یہ بھی لکھ
دیا ھے کہ یہ قصہ محض تمثیل ھے اور اس میں چتوڑگڑھ سے مراد خود انسان کا جسم
اور وھاں کا راجا رتن‌سین، نفس‌ناطقہ یا جان ھے، سنگل دیپ سے تلمیحاً دل اور

پدمنی رانی سے عقل سلیم مراد ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہ‌ایں‌ہمہ فرشتہ نے جس کا ادبی ذوق کبھی کبھی تاریخی فراست پر غالب آجاتا ہے اس قصے کو تاریخ میں جگہ دی اور چونکہ اس میں ایک مسلمان بادشاہ کے اخلاق پر حرف آتا ہے، لہذا کرنل ٹاڈ نے بڑے شوق سے اور مصنوعی کاغذوں کے حوالے سے اسے اپنی کتاب ”وقائع راجستان“ کی زینت بنایا۔ مصنف ”قصص ہند“ کو ایسا مسالا کہاں ملے، انھوں نے اسے اردو میں نمک مرچ لگاکر پیش کردیا، مگر افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب جنھوں نے امیر خسرو کی خزائن‌الفتوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اس افسانے کو تاریخی اور عقلی اعتبار سے غلط محض سمجھنے کے باوجود ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے کہ شاید چتوڑگڑھ کے قلعہ میں واقعی کوئی پدمنی موجود تھی! یہ ہمارے اس قومی انحطاط کی ایک نظیر ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ محض غیر مسلموں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے گزشتہ اکابر کی تعریض و تنقیص کرنے میں کسی دیانت و معقولیت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ شاید زیادہ تر اسی جماعت کی اصلاح خیالات کے لیے، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے فاضل دوست مولوی محمد احتشام‌الدین صاحب حقی دہلوی نے اس موضوع پر چند محققانہ مضامین لکھے اور اب ان میں مناسب ترمیم اور اضافے کرکے مستقل کتاب کی صورت میں شایع کردیا جس میں مثنوی پدماوت، فرشتہ کی تحریر اور ٹاڈ وغیرہ کے مفتریات کی تفصیل سے قلعی کھولی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ ساری داستان تاریخی اعتبار سے کوئی وقعت اور اصلیت نہیں رکھتی۔ لائق مصنف کا استدلال جس‌قدر مضبوط و محکم ہے، طرز بیان بھی ویسا ہی پرقوت اور منشیانہ ہے اور تاریخ ہند کے طلبہ سے بڑھ کر ادبی ذوق رکھنے والوں کے واسطے یہ رسالہ مطالعہ کے قابل ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۴۸ صفحات پر صاف ستھرا چھاپا گیا ہے اور ایک روپیہ قیمت میں جناب مصنف سے تراہہ بہرام خاں، دہلی کے پتے سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ (ہ)

نئے رسالے

انجمن

انجمن اسلامیہ ہائی اسکول، جبلپور کے طلبہ نے انجمن کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے جس میں زیادہ تر اس مدرسے کے طلبہ ہی مضمون لکھا کریں گے۔ یہ مقصد بہت مفید ہے اور پہلے پرچے میں جو مضامین چھاپے گئے ہیں وہ بھی دلچسپ اور طلبہ کے مناسب حال ہیں۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ مضامین کی زبان عام طور پر اچھی اور شستہ ہے۔ امید ہے کہ لائق اساتذہ خصوصاً صدر انجمن محمد عبدالستار صاحب کی سرپرستی اور صدر مدرسہ مولوی عطاءالرحیم صاحب کی نگرانی میں جو جبل پور کی انجمن ترقی اردو کے بھی صدر ہیں یہ رسالہ اور زیادہ ترقی کرے گا۔ اس کی قیمت درج نہیں ہے لیکن ہمارے خیال میں جبلپور کے باہر بھی طلبہ اسے منگائیں تو پڑھ کر خوش ہوں گے۔ اس غرض سے صدر مدرس صاحب موصوف سے مراسلت کرنا مناسب ہوگا۔ (ہ)

رفیق نسواں

جریدہ زار لاہور سے عورتوں کا یہ نیا رسالہ حمیدہ خانم صاحبہ کی ادارت اور باجی رشیدہ لطیف صاحبہ کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ مدیرہ کے والد طالب علی صاحب پابند قریشی، پہلے سے رسالہ تعلیم نکالتے ہیں۔ انھوں نے "عرض حال" سے نئے رسالے کا آغاز فرمایا ہے مگر یہ بات دوسرے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوئی کہ "یہ رسالہ اخلاقی، اصلاحی اور علمی" ہوگا اور اس میں "کوئی نظم، افسانہ یا مضمون، عریاں جذبات یا محسوسات سے ملوث نہ ہوگی"۔ مقصد تو بہت خوب ہے مگر رسالے کو کامیاب بنانے کے لیے محنت اور قابلیت کی بہرحال ضرورت ہوگی۔ پہلے پرچے میں ایک نظم "جام صہبا" درج ہے اور اس میں محبت کی تعریف، میں

دو چار عاشقانہ شعر بھی نکل آئے ہیں ۔ ان افسانوں یا مضمونوں کا تو مضائقہ نہیں جو «ماخوذ» ہیں لیکن خود فاضلہ مدیرہ کا افسانہ «موتیوں کا ہار» دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا کہ بالکل اسی مضمون کا قصہ چند سال پہلے غالباً تہذیب نسواں میں چھپا تھا ۔ رسالے میں زبان کی بھی غلطیاں نظر آئیں ۔ امید ہے کہ اس کی اصلاح پر توجہ فرمائی جائے گی ۔ حجم ۶۰ صفحہ ۔ لکھائی چھپائی متوسط ۔ قیمت سالانہ تین روپے ۔ پتہ: موہنی روڈ ۔ لاہور ۔ (ہ)

خاص نمبر

منزل

(افسانہ نمبر)

یہ رسالہ محلہ بلّی ماراں دہلی سے نکلتا ہے اور یہاں کے مشہور خاندانی اطبا کی مدح و ثنا، تصاویر، ادویہ کے اشتہارات (جن میں بعض فحش ہیں) دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے ان حضرات کی سرپرستی حاصل ہے ۔ اس خاص نمبر میں چند افسانے اور نظمیں شامل ہیں ۔ نوجوان اڈیٹر حبیب اشعر صاحب کی تصویر بھی زیب سرورق ہے ۔ رسالے کا «بدل اشتراک» یعنی قیمت سالانہ دو روپیہ اور فی پرچہ ساڑھے تین آنہ ہے ۔ (ہ)

ادب لطیف

(افسانہ نمبر)

اس خاص نمبر میں چند مضمون افسانہ نگاری پر دو منظوم قصے اور کوئی اٹھارہ چھوٹے بڑے افسانے جمع کیے گئے ہیں ۔ حکیم احمد شجاع صاحب اور ناکارہ حیدرآبادی کے ظرافت آمیز فسانے ہمیں پسند آئے ۔ بعض دوسرے افسانے بھی پر لطف ہیں مگر ان میں زیادہ‌تر یورپی تمدن و تہذیب کے نقشے نظر آتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ اس مصنوعیت کا اثر زبان اور طرز تحریر پر بھی پڑے بغیر نہیں رہا حالانکہ لائق مدیر نے اہتمام

کیا ہے کہ اس نمبر میں سب طبع‌زاد افسانے جمع کیے جائیں ۔ مجموعی طور پر پرچہ دل‌چسپ ہے ۔ لکھائی چھپائی اچھی اور قیمت دس آنے ۔ ۱۰، سرکلر روڈ، لاہور کے پتے سے مل سکتا ہے ۔ (ہ)

نیرنگ خیال

(حرب و ضرب نمبر)

چھوٹی تقطیع کے ۲۰۸ صفحات پر شایع ہوا ہے اور اس میں چالیس مضامین شامل ہیں ۔ جنگ، مختلف ممالک کی جنگی تیاریاں، بڑی طاقتوں کے ساز و سامان وغیرہ موضوعات پر بہت سی مفید معلومات جمع کی گئی ہے لیکن مضامین کا علمی معیار اخبارات کے مضامین سے کچھ بہت اونچا نہیں ہے ۔ رسالے کا کاغذ بھی ادنیٰ درجے کا ہے ۔ قیمت آٹھ آنے ۔ پتہ: بیڈن روڈ، لاہور ۔ (ہ)

معین

(عرس نمبر)

معین ہفتہ‌وار اخبار ہے جو اجمیر سے شایع ہوتا ہے اور خواجہ صاحب کے نام پر اخبار کا نام رکھا ہے ۔ عرس کے موقع پر اس کا ایک عرس نمبر شایع کیا گیا ہے جو خاصا ضخیم ہے ۔

اس نمبر میں مختلف صاحبوں نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، ان کے مشن اور تبلیغ، روحانی کمالات اور اقوال پر مضامین لکھے ہیں ۔ عقیدت‌مندوں کے لیے اچھا مجموعہ ہے ۔ (ا)

انجمن کی چند تازہ ترین مطبوعات

چند

تنقیدات عبدالحق

یعنی

اردو کے محسن اعظم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (ھند) کے بعض دلچسپ و پرمغز تنقیدی کا مجموعہ۔ تنقید ادیب کی جان ھوتی ھے اور اس کا مطالعہ بے راہ روی سے بچاتا اور خیال میں وسعت پیدا کرتا ھے لیکن جناب مولوی صاحب کی تنقید اپنی علمیت اور لطف بیان دونوں اعتبار سے خاص امتیاز رکھتی ھے۔ دوسرے اس مجموعے میں تنقیدیں بھی وہ انتخاب کی گئی ھیں جو بجائے خود علمی تحقیقات کے مقالے ھیں اور جن سے بعض مدعیان فضیلت کے مبلغ علم و تحقیق کا صحیح اندازہ ھوسکتا ھے۔ جیسے ڈاکٹر گریہم بیلی صاحب (لندن یونیورسٹی) کی کتاب اردو لٹریچر پر یا مولوی احمدالدین صاحب کی کتاب سرگزشت الفاظ پر۔ پوری کتاب ارباب ذوق اور اردو ادب کے طلبہ کے پڑھنے کے لائق ھیں۔

تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم اسّی صفحے، قیمت صرف آٹھ آنے۔

اِخوانُ الصّفا

عربی زبان کی مشہور کتاب ھے جس میں حکایات و مقالات کے پیرائے میں بڑے بڑے علمی مسائل اور معارف ادا کیے گئے ھیں۔ اسے فورٹ ولیم کالج میں مولوی اکرام علی صاحب مرحوم نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ متعدد بار شایع ھوئی لیکن بعد کے نسخے بہت غلط چھپے ھیں اور ان میں بہت کچھ تحریف ھوگئی تھی۔ انجمن نے قدیم اور جدید سب نسخے بڑی کوشش سے جمع کیے اور نہایت کاوش سے ایک صحیح نسخہ مرتب کرکے شایع کیا ھے۔ اس کتاب کی زبان سوا سو سال پہلے کی ھے اور اسے بجنسہٖ قائم رکھا گیا ھے۔ یہ بہت دلچسپ کتاب ھے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ھے کہ اسے عالم اور عامی دونوں پڑھ سکتے ھیں۔

قیمت مجلد بارہ آنے، غیر مجلد آٹھ آنے۔

حکایات رومیؒ (حصّۂ اول)

مولانا رومیؒ کی مثنوی شریف میں حکایات، محاضرات و مطائبات کے پیرائے میں اخلاق و نفسیات کے باریک مسائل کو نہایت عمدگی سے سمجھایا گیا ھے۔ انجمن ترقی اردو نے ان حکایات کا یہ انتخاب بڑے اھتمام سے اردو میں ترجمہ کرایا ھے۔ زبان نہایت سلیس اور شگفتہ رکھی گئی ھے تاکہ بچّے اور معمولی خواندہ لوگ بھی ان کہانیوں کو شوق سے پڑھیں اور حضرت مولاناؒ کے روحانی فیوض سے مستفیض ھوں۔ یہ کتاب دو قسم کے کاغذ پر چھاپی گئی ھے۔ قیمت مجلد (معمولی کاغذ) بارہ آنے، (عمدہ کاغذ) ایک روپیہ۔ غیر مجلد (معمولی کاغذ) نو آنے، (عمدہ کاغذ) بارہ آنے۔

انجمن ترقی اردو (ھند)، دریا گنج، دھلی۔